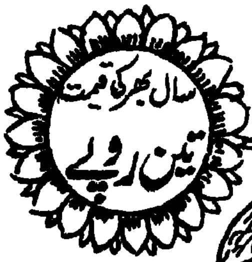


اردو زبان کا منفرد علمی و ادبی جریدہ

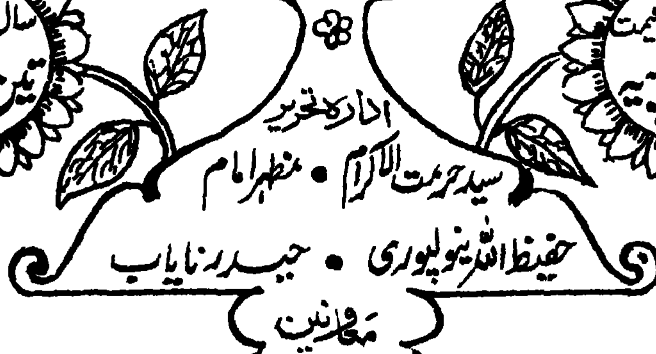


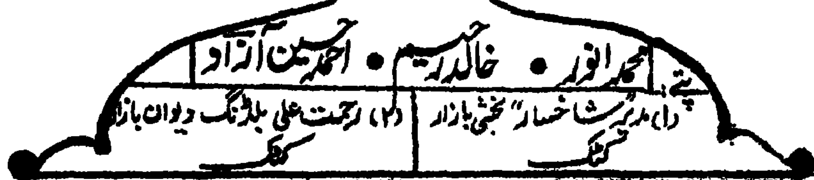
تیسری جلد | مشترکہ شمارہ | نمبر ۲-۳











امجد نجمی۔ مدیر، مالک و ناشر نے 'لیبل لیتھو پریس' رمنا روڈ۔ پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر 'شاخسار' بخشی بازار کٹک-۱ سے شائع کیا

ترتیب

نقشِ اوّل

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

(اصغر گونڈوی)

جو لوگ "شاہکار" کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ جانتے ہوں گے کہ جہاں اس میں کلاسیکل شعراء کی بہترین تخلیقات پیش کی جاتی ہیں، وہیں جدید شعراء کی بھی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم ادب میں رفتار کے قائل ہیں، جمود کے نہیں۔ ادب کی رفتار کو ایک ایسی نہر کی رفتار کے ساتھ تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ جس کا ہر قطرہ بذاتِ خود ہر مقام پر متحرک ہے لیکن اسی حرکت کے عمل سے ہی پوری نہر میں تسلسل برقرار رہتا ہے، جہاں یہ قطرہ تھک جاتا ہے، وہیں اس کی رفتار کو موت آتی ہے۔ یہ اصول صرف ادب میں نہیں بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں میں مثلاً سماجی اور سیاسی سطح پر بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ادب میں تسلسل برقرار رکھنے کے لئے کلاسیکل ادب کا شعور ضروری ہے اور اس کی رفتار کے لئے نئے نئے تجربات کی شرط لازمی ہے۔ آج کل اردو کے جدید شعراء شعر کم کہتے ہیں اور تجربہ زیادہ کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں تجربوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ان کی تخلیقات کہاں تک شعر کہلانے کی مستحق ہیں۔ "شاہکار" کے اجراء کا مقصد صرف نئی شاعری کی نمائندگی نہیں بلکہ نئے ذہن کی تربیت بھی ہے۔ جو رسالے محض نئی شاعری کی نمائندگی کر رہے ہیں، وہ بھی اہم ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں کیونکہ اگر نئے لکھنے والوں کی ہر طرح کی تجرباتی تخلیقات شائع کر کے ان کی ہمت افزائی کی گئی تو ممکن ہے آگے چل کر وہ بہتر اور پائیدار تخلیقات پیش کرنے کے قابل بن سکیں۔ لیکن "شاہکار" کا مقصد کچھ اور ہے۔ یہ نئے شاعروں کی بہترین تخلیقات منتخب کر کے پیش کرتا ہے اور دیگر ملکی اور غیر ملکی جدید شاعری کے کامیاب نمونے اردو ادب کو عطا کرتا ہے۔

نئی شاعری کے نام سے ناک بھوں چڑھا لینے والوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سماجی حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئے ماحول کے مطابق نئی ادبی تخلیقات پیش کرنے کے لئے دنیا کے ہر گوشے میں کوششیں ہو رہی ہیں اور اردو ادب اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ بین الاقوامی ادب ایک ایسے کارواں کی طرح ہے، جس میں ہر راہرو آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہماری رفتار اگر سست رہی، تو ہم اس کارواں سے پیچھے پڑ جائیں گے۔ تاریخی اعتبار سے زمانۂ قدیم کے ادب کی اہمیت بہت زیادہ ہے لیکن ادب جو بذاتِ خود وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے، اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جدت اور قدامت کے درمیان خلیج بہت

زیادہ ہے، یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ سائنس نے جو صرف مقامات کے فاصلوں کو کم کردیا ہے۔ ایسی بات نہیں۔ اس نے ذہنی سطح پر وقت
کے فاصلوں کو بھی کم کردیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جدید شاعری میں علامت پسندی، پیکریت وغیرہ جتنی بھی اہم ادبی تحریکات معرضِ وجود
میں آئیں، کسی نہ کسی شکل میں دانتے، شیکسپیر، بیدل، یا غالب کی شاعری سے ہم آہنگ ہیں نئے ذہن کا انفرادی غم جدید ماحول
پروردہ ہونے کے باوجود میر کے انفرادی غم سے بہت زیادہ مختلف بھی نہیں۔

آج کے دور میں تاج محل یا کونارک کے مندر کی تعمیر کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس فن کارانہ خلوص کی ضرورت ہے جس نے
حق کاروں سے تاج محل یا کونارک بنوایا۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت سے انکار کفرانِ نعمت ہے۔ لیکن یہ اقبال کی شاعری کا
کا زمانہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ دور ہے، جو اپنے اندر کئی اقبال پیدا کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب کا کہنا ہے
کہ "کونارک کا مندر منہدم ہو گیا ہے اور ہم اس ماضی گفتہ پر اشک باری کر رہے ہیں۔ لیکن یہ امر ہمیں آگے بڑھنے
ترغیب دینے سے قاصر ہے" غالباً ڈاکٹر مہتاب بھول رہے ہیں کہ اگر کونارک کے سنگی مجسموں میں اڑیسہ کا قدیم انداز رقص
محفوظ ہوتا، تو دورِ جدید کے اڑیسی رقص کا تصور ہی ناممکن تھا۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ ہمیں ماضی کے خزانوں سے براہِ راست
تقلید کی راہوں میں نہیں، بلکہ بالواسطہ استفادہ کرنا چاہیئے۔

چونکہ یہ وہ زمانہ ہے، جس میں جدید شاعر کے ذمہ صرف تخلیقی عمل نہیں۔ بلکہ روایتی ذہنیت سے بھی مقابلہ کرنا
ہے۔ اس لئے اسے اپنے تنقیدی شعور کو بھی بیدار رکھنا ہوگا۔ اس کا یہ تنقیدی شعور چند غیر اہم مفروضات میں مقید نہ ہو
کر سائنس، علم النفس اور دیگر علوم جدیدہ پر مبنی ہونا چاہیئے۔ جب تک ہماری نئی تنقید علوم جدیدہ کے اصول پر قائم
نہ ہو سکے گی۔ تب تک یہ نئی شاعری کا ادبی مقام متعین کرنے سے قاصر رہے گی اور تب تک ہماری نئی شاعری بھی
ادھر اُدھر بھٹکتی رہے گی اور اسے وہ مقام حاصل نہیں ہو سکے گا، جو کلاسیکل شاعری کو حاصل ہو چکا ہے۔

فی الحال جدید شاعری کا بہت بڑا بحران یہ ہے کہ اکثر موقعوں پر نیا شاعر شاعری کو اپنے جذبات کے پُرخلوص
اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ الفاظ کی نقاب میں اپنے مافی الضمیر کو چھپانے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ جہاں ادب میں تخیل کا افلاس
موضوع کی خامکاری یا جذبات کا فقدان سر ابھارنے لگتا ہے، وہاں شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی
ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

ع کان نے سب کچھ سنا، دل پر اثر کچھ بھی نہیں

آج شاعر اور قاری کے مابین ذہنی فاصلہ کافی بڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیا شاعر ترسیل و ابلاغ کی منزلیں طے
نہیں کر سکا ہے۔ اس فاصلے کا سبب غالباً یہ ہے کہ قاری اپنے ماحول میں جو کچھ دیکھتا ہے، اس نئی شاعری میں پا نہیں رہا ہے
نئی شاعری میں ذہنی انتشار کے عناصر ضرور پائے جاتے ہیں، جو اس دور کا جائز ردِ عمل ہیں۔ لیکن نئی شاعری ان عناصر
کی متوازی آمیزش (SYNTHESIS) کے قابل نہیں ہو پائی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض جدید نظموں میں وحدتِ تاثر کا فقدان
نظر آتا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ جدید سائنسی انکشافات اور خلائی سفر نے ذہنِ انسان کو نئے رومان سے دوچار کیا ہے
مغرب کے مفکرین آج سوچ رہے ہیں کہ اس نئے رومان کے ردِ عمل کے طور پر آئندہ بہترین ٹریجڈی لکھی جائے گی حالانکہ بیسویں
صدی میں اب تک ٹریجڈی رو بہ تنزل تھی۔ ٹریجڈی کی طرح نئی شاعری کو بھی اس سائنسی رومان سے استفادہ کرنا ہوگا۔

نئی شاعری موثر اور پائدار ثابت نہیں ہو سکے گی۔

بعض جدید ادیبوں میں جو ایک طرح کا احساس برتری پایا جاتا ہے، وہ تخلیقی ذہن کے لئے بہت ہی مہلک ہے۔ کسی ادیب پر تنقید کرنا ہو تو اس کی تخلیقات کو پچاس سال پہلے کا ادب قرار دے کر اسے نظر انداز کر دیا جا رہا ہے۔ لیکن پچاس سال پہلے کا دور تو اقبال اور ٹیگور جیسے شعراء کا دور تھا۔ کیا جدید شاعری ان کے مقابلے کا کوئی شاعر پیش کر سکی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، تو جدید ذہن کو اپنی اس نفسیاتی گرہ (COMPLEX) سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

حالانکہ میں نئی شاعری کے مستقبل سے غیر مطمئن نہیں ہوں، پھر بھی میرے خیال میں، مجموعی طور پر اردو کی نئی شاعری بنگالی اور اُڑیا کی نئی شاعری سے ابھی پیچھے ہے۔ اڑیا اور بنگالی کی بہترین جدید نظموں کا اُردو میں ترجمہ ہو تو یہ اردو کے نئے شاعروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں "شاخسار" نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔

امجد نجمی

شعراء سے التماس!

ایک عرصہ سے اردو شعراء "تاج محل" کو کثرت سے موضوعِ نظم بنائے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ تخلیقات منتشر ہیں۔ اس لئے میں ان کو کتابی صورت میں یکجا کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں ھند پاک کے تمام شعراء سے ملتمس ہوں کہ وہ اس کتاب کے لئے اپنی نظم جلد از جلد ارسال فرما کر

شکریہ کا

موقع دیں

شجاع خاور

۱۷۲۲ رود گران اسٹریٹ۔ لال کنواں۔ دہلی ۶

ڈاکٹر سید محمد حسنین

غلط کار قلم کاری

اردو کے قدیم نثری ادب کا، جو ۱۸۵۷ء سے کم و بیش پچاس پچیس سال بعد کی مختصر مدت تک محیط ہے۔ اگر ہم جائزہ لیں، تو اپنی ادبی کم مائیگی ہمیں شدید طور پر محسوس ہوگی۔ اس سرسری نگاہی سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہمارا اگلا نثری سرمایہ طویل داستانوں اور مضامین جیسی بے وضع و بے ضابطہ نگارشات پر مشتمل تھا۔ چلتے پھرتے اخلاقی واقعات و حکایات اور نیم مذہبی نقطوں کی پیش کش کے لئے سود مند وسیلے قصص و داستانیں تھے۔ ہر قسم کے اہم و غیر اہم سنجیدہ فکر کے اظہار کا سب سے سہل ذریعہ مضمون تھا۔ ہمارے نثر نگاروں کے سامنے کسی کہانی (فرضی یا حقیقی) اور کسی تاثرات (وقتی یا دور رس) کی قلمبندی کے لئے بس یہی دو مروجہ اسالیب بیان تھے۔ اکا دکا کسی بھرپور اور مجسم صنف کا وجود لق و دق صحرا میں، دو چار نخلستان کی مثالیں ہیں۔

تنقید اور تحقیق کی بات دور کی ہے اور بہت دور کی۔ ہمارا اگلا نثار کہانی (fiction) کی صورتوں سے بھی ناآشنا تھا۔ مضمون کی نوع بہ نوع شکلوں کی شناخت اس کے فہم سے بالا تھی۔ اردو لسانی طور پر ارتقا کے ابتدائی منازل ہی سے طے کر رہی تھی، بہر حال اس کا ثقافتی و ادبی سرمایہ صنفی ترقی لحاظ سے قطعاً بے ترتیب، بے وضع، ناہموار اور غیر منظم تھا۔ زبان بڑی حد تک شعری اظہار خیال کا بار اٹھا سکتی تھی مگر نثری ابلاغ کے لئے یہ ناپختہ اور ناتواں تھی۔ در اصل یہ وہ دور تھا جب ہم تحریروں کی فنی ساخت یا ان کی صنفی ضابطگی سے لاعلم تھے اور صحیح معنوں میں تحریر کی ادبی اور غیر ادبی تشکیل کی شناخت کا واضح تصور نہ رکھتے تھے۔

علم کی گوناگوں ترقی سے ہمارے ذہن کے بند دریچے کھلے اور کھلے دریچوں سے تھوڑے تھوڑے وقفوں پر براق روشنیاں بھی آتی گئیں۔ احساس، بیداری اور عالم شعور کے بعد ہم میں غیر جانب دارانہ غور و فکر کی عادت آئی۔ اپنے وجود، زندگی اور دوسرے تہذیبی مسائل کے ساتھ ہم نے اپنی زبان و ادب کو بھی نئے انداز سے دیکھا اور نئے روپ میں دیکھا۔ پیروی مغرب سے ہم نے فن کاری کے گر جانے اور قلم کا آرٹ پہچانا۔ ہم نے سمجھا کہ ہر تحریر نہ ادب ہو سکتی ہے اور نہ ہر قسم کی قلم بندی کو قلم کاری[1] کا مرتبہ و مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

ادب انسان، مہذب و متمدن انسان، کی حسی و ذہنی کاوشوں کا تحریری عکس ہے۔ یہ عکس مگر کسی بات یا خیال کی محض قلم بندی نہیں۔ نوشت و خواند ہر انسان کی مہذب و با ادب

---

[1] ملاحظہ ہو "قلم کاری ـــ تحریر کی صنفی ساخت" مطبوعہ رسالہ "سبا" دور، لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۶۶ء

اجی زندگی کی علامت ہے۔ ہر پڑھا لکھا انسان، لیکن ادیب
کھلاتا اور ضبط تحریر میں لائی ہوئی ہر مؤثر و جاذب نظریات
ل ادب نہیں۔ ادب کو نگارشات کا جنگل قرار دینا بے ادبی
کھلی بدتہذیبی ! ــــ ادب، زندہ اور صحت مند ادب
تحریریں اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ مخصوص صورت
ل، مخصوص تراش و خراش اور مخصوص وضع و قطع کی حامل
ا ہیں۔ نہ صرف ظاہری یا ہئیتی بلکہ باطنی و بطنی طور پر بھی
ی زبان و ادب پر تحریروں کا اپنا مقام و مرتبہ ہوتا ہے
پنا خاص جسم و خاص مزاج رکھتی ہیں۔ مجہول النسب
ر کی طرح تحریریں بھی مجہول المصرف ہو سکتی ہیں
ہوتی ہیں۔ ادبی پذیرائی کے باوجود اکثر تحریریں
حقیقات کی شکل میں سالم وجود بھی حاصل کر لیتی
، اصل النسل نہیں ہوتیں۔ یہ مجہول یا یہ کم نسبی
ریروں کی صورت و سیرت کی ناہمواری ہے اور ان
فنی بے ضابطگی۔ یہ کم نسلی تحریروں میں خیال اور
کی غیر مناسب جہت اور اسفل وابستگی ہے۔ ادب
نا ہوں یا نثری اس کی ہر تحریر کی صحیح النسبی شرط ہے
النسبی تحریر کی فنی ساخت اور ان کی صنفی ضابطگی
ہر تحریر اپنی مخصوص صورت اور سیرت یا مخصوص
اور موضوع کے بموجب کسی صنفی گروپ سے نسبی
رکھتی ہے۔ جسم و مزاج کی اسی مناسبت و وابستگی
ریہ میں صنفی ضابطگی آتی ہے اور تعمیری وجاہت جھلکتا
پیش کردہ بات یا خیال (خواہ یہ کسی نوعیت کا ہو)
ا پیرہن میں ملبوس ہو کر "ادب پارہ" یا "فن پارہ"
ت حاصل کر لیتا ہے ـــ ! یہی فن کا کمال ہے اور
ی کا آرٹ، جس کا نہایت موزوں نام "قلم کاری" ہے
آشفتہ بیانی میری، روشنائی، لکھنؤ کی
راتیں ـــ عہد حاضر کی چند قابل مطالعہ مطبوعات

ہیں۔ ان تصنیفات کے مطالعہ سے اساسی طور پر یہ سوالات
اٹھتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی، سجاد ظہیر اور سردار جعفری جیسے
ذی علم و مستند اہل قلم، جن کی ادبی شخصیت کی مختلف پہلو
ارباب نقد کے سامنے واضح ہو چکے ہیں، کی ادبی نگارشات کا
"صنفی مقام" کیا ہے؟ ــــ یہ معروف زمانہ تخلیقات بساط ادب
کے کس نثری خانہ کی مستحق ہیں ــ؟

بداهتہً یہ جواب ہوگا ــ

'شعر میں کہتا ہوں بہتے تم کرو

اور ارتجالاً یہ کہا جائے گا کہ میکانکی ناپ طول کا یہ طریقہ کار
صریح نامناسب ہوگا۔ یہ مطبوعات اگر کسی صنفی مقام کی حقدار
نہیں، نہ ہوں۔ لاریب ! یہ ہوشمند۔ خادمانِ لوح و قلم کی
کاوشیں ہیں۔ ان مصنفین کے آئین قلم بندی یا ان کے
آداب نگارش کے بارے میں دو رائے ہرگز نہیں۔ دلائل کے
طور پر یہ بہانہ بھی ڈھونڈا جائے گا کہ عہد گذشتہ میں بھی، جو
پچاس ساٹھ برس سے زیادہ پیچھے نہیں، اس قسم کی 'غیر صنفی'
تخلیقات کی مثالیں عام ملتی ہیں۔ وہ اہل قلم بے شعور نہ
تھے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے دلکش پیرایہ میں اور موثر
طور پر اسے لفظی ملبوسات عطا کر دیتے تھے۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ وہ آئین قلم بندی
اگلے وقتوں کے بزرگوں کو ہی زیب دیتا تھا کہ ان دنوں
زبان و ادب کے ارتقار کا عہد طفلی تھا۔ قلم بندیاں اس
عہد میں نوعمری کی خوش فعلیاں تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب
" خوش گوئی " کو "شاعری" کا مطلب حاصل تھا اور رنگہ
'نقل' سبحان اللہ و استغفر اللہ سے دو چار قدم آگے نہ چل سکتی
تھی ! آج سائنس اور ٹکنالوجی کا غلبہ و اثر ہے۔ نئے
ایجادات و جدید آلات سے اب بال کی کھال ہی نہیں اُتاری
جاتی، بلکہ خردبینی خلیوں (Micarospic — cills)
کے انجر پنجر بھی بکھیر دیئے جاتے ہیں۔ معاملہ سائنس کا ہو یا

پروفیسر انور سیوانی

آبِ حیات — ایک مطالعہ

محمد حسین آزاد کی تصنیف 'آبِ حیات' اردو نظم کی تاریخ کی کتابوں میں پیشرو کی حیثیت رکھتی ہے۔ آزاد نے اس کے سرورق پر لکھا ہے "مشاہیر شعرائے اردو کے سوانح عمری اور زبان مذکور کی عہد بعہد کی ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان"۔ جو نام بتایا ہے۔ آبِ حیات میں شاعروں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ نثر نگاری اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ نثاروں میر شیر علی افسوس مصنف باغِ اردو اور آرائشِ محفل، میر امن مصنف باغ و بہار اور مترجم اخلاقِ محسنی گلکرائسٹ مصنف انگریزی زبان میں اردو قواعد اور نثری تلوجی کوی مصنف پریم ساگر اور بیتال پچیسی کے علاوہ میر انشاء اللہ خاں مصنف قواعد اردو، مولوی شاہ عبد القادر مترجم قرآن شریف اور مولوی اسمٰعیل صاحب کا تذکرہ سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ لیکن آزاد نے "آبِ حیات" میں جس طرح سے شاعروں کے حالات اور ان کے کلام سے متعلق اپنی رائیں تحریر کی ہیں۔ اس طرح نثر نگاروں کے حالات اور ان کی تصنیفات سے متعلق اپنی رائے نہیں تحریر کی ہے۔ ایک مدت تک اردو داں طبقہ کے مزاج پر شاعری حاوی رہی ہے اور دو بھی خصوصیت سے غزلوں کی شاعری۔ نثر نگاروں کی تصانیف کو وہ ادبی حیثیت حاصل نہ تھی، جو شاعروں کی دیوانوں کو حاصل تھی غالباً اسی لئے آزاد نے اردو نثاروں کے حالات اور اردو نثر کی تاریخ لکھنا اتنا اہم نہ سمجھا جتنا شاعروں کے حالات اور نظم کی تاریخ کو شاعری اور خصوصیت سے غزل کی شاعری ادب کا مترادف لفظ سمجھی جاتی تھی، اس لئے آزاد کے قبل اور بعد کے تذکروں میں نثر نگاروں کا حال لکھنا ضروری نہ سمجھا گیا۔

آزاد کا شمار جدید اردو ادب کے معماروں میں ہوتا ہے۔ جدید اردو ادب کے بانی سید احمد خاں، حالی، آزاد، نذیر، شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، سب کے سب اصلاح پسند تھے۔ ان کے پیشِ نظر تعمیری مقاصد تھے۔ انہوں نے اردو ادب کے مختلف اصناف کو ترقی پذیر زمانہ کے رجحانات کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی جد و جہد کی۔ مغربی ادب اور خاص طور سے انگریزی ادب سے براہ راست یا بالواسطہ اثر قبول کر کے انہوں نے اردو زبان کی صلاحیتوں کا مصرف لے کر اس میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی اُردو ادب کے ساتھ ان کا طرز عمل اصلاحی اور تعمیری تھا انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسل کے لئے اظہار بیان کے نئے ممکنات پیدا کئے۔ جدید اردو ادب کی تشکیل میں آزاد نے اپنے ہمعصروں کا ہمیشہ ساتھ دیا — آزاد کی آبِ حیات نے اردو نظم کی تاریخ نگاری کے لئے ایک نئی راہ نکالی۔ اُن کے بعد اُردو ادب کی جتنی تاریخیں لکھی گئیں۔ اُن پر آبِ حیات کا اثر صاف ظاہر ہے۔

آزاد کو اپنے ہمعصروں کی طرح اس بات کا احساس تھا کہ جدید اُردو ادب کی تشکیل کے لئے اس کے مختلف اصناف کو اُن کے پرانے ڈھرے پر لے چلنا ٹھیک نہیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ اردو ادب عربی یا فارسی کی مقلد رہ کر اپنے اندر

وسعتیں پیدا نہیں کرسکتا ۔ عربی فارسی سے یوں بھی تعلق کم ہوتا جا رہا
تھا ۔ ملک پر انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کی وجہ سے عام طور
سے ہندوستانی احساس کمتری میں مبتلا تھے ۔ انگریزی ادب کی
تصنیفات سے واقفیت سے کہ وہ ذہنی طور پر بھی متاثر ہوئے
اپنے ہمعصر حالی کی طرح آزاد نے اردو ادب کی ترقی کے لئے انگریزی
ادب سے استفادہ حاصل کرنا ضروری خیال کیا ۔ آبحیات کے
تمہیدی دیباچے میں وہ لکھتے ہیں :

" نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں
سے روشنی پہنچی ہے، وہ ہمارے تذکروں کے اس
نقص پر حیرت رکھتے ہیں کہ ان سے کسی شاعر کی زندگی
کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا ہے، نہ اس کی طبیعت
اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے، نہ ان کے کلام
کی خوبی اور صحت وسقم کی کیفیت کھلتی ہے ۔ نہ یہ
معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کلام میں کن کن باتوں میں
کیا نسبت تھی ۔ انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور
سال فوت تک بھی نہیں کھلتا "

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

" انگریزی زبان ترقی و اصلاح کا طلسمات ہے "

آزاد کو انگریزی ادبیات سے کما حقہ آگاہی نہ تھی ۔ اس کے
جود انہوں نے انگریزی ادب سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا
ات کی تصنیف میں انگریزی ادب کی تاریخ نگاری کے اصول
وہ زیادہ فائدہ نہ اٹھاسکے ۔ اردو ادب کے قدیم تذکرے ہی
ان کے پیش نظر تھے ۔

آبحیات سے قبل اردو نثر و نظم کی کوئی مسلسل تاریخ ترتیب
دی گئی تھی ۔ شاعروں کے حالات تذکروں میں پائے جاتے تھے ۔
کو قدیم تذکروں کی خامیوں کا احساس تھا ۔
انہوں نے ان خامیوں کی اصلاح کی ۔ وہ
نظم کی تاریخ لکھنے کا عزم رکھتے تھے ۔ لیکن باوجود اپنی کاوشوں
کے وہ آبحیات کو تذکرہ سے زیادہ بہتر مقام دلانے کے مستحق
نہیں ۔ قدیم تذکروں کی خامیوں کو دور کرکے انہوں نے تذکرہ
نگاری کو ایک نئی راہ دکھائی ۔ بعد کے اردو ادب کی تاریخ مرتب
کرنے والوں کو ان سے رہنمائی ملی ۔

قدیم تذکروں میں شاعروں کے حالات حروف تہجی کے لحاظ
سے ترتیب دیئے جاتے تھے ۔ اس سے یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا
تھا کہ کون سا شاعر کس عہد سے تعلق رکھتے تھے ۔ نتیجے کے طور پر
کسی عہد کے شعراء کے کلام کی خصوصیات کا پتہ لگانا مشکل ہو
جاتا ہے بعض تذکرہ نویسوں نے کل شعراء کو تین ادوار سے منسلک
کیا ہے ۔ متقدمین، متوسطین اور متاخرین ۔ ہر دور کے شعراء
کا حال حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کر دیا ہے ۔ یہاں بھی
انتشار اور پراگندگی کا وہی حال ہے ۔ جو پہلے قسم کے تذکروں
میں پایا جاتا ہے ۔ آزاد نے قدیم تذکروں کے اس نقص کو دور
کیا ۔ انہوں نے اردو شاعری کے مختلف دور قائم کئے ۔ ہر دور
کی زبان اور شاعری کی خصوصیات بیان کیں اور ہر دور کے
شاعروں کے حال، اُن کے سن ولادت اور سن وفات کا لحاظ رکھتے
ہوئے تسلسل سے بیان کیا ۔ اس طرح زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے
اردو نظم کی تاریخ ترتیب دینے کا کام آسان ہوگیا ۔

اُردو شاعری کو انہوں نے پانچ ادوار میں تقسیم کیا ۔ اُردو
شاعری کے ادوار قائم کرنے کا خیال غالباً انہیں انگریزی ادب
کی تاریخ کی ترتیب کا حال جان کر ہوا ۔ لیکن وہ انگریزی ادب
کی تاریخ نگاری کے اصول سے فائدہ نہ اٹھاسکے ۔ اُردو شاعری
کے ادوار انہوں نے الفاظ کے استعمال اور طرز بیان کی عہد بعہد
کی تبدیلیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا ۔ الفاظ کے استعمال اور طرز بیان
کی تبدیلیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی زبان کے ادب کی تاریخ
کے دور قائم کرنا درست نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری
میں الفاظ کو ہمیشہ اہمیت رہی ہے ۔ موضوع بیان اور نفس مضمون

کا لحاظ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد نے اردو شاعری کے مروجہ اصول کی روشنی میں اُردو نظم نگاری کے پانچ دور قائم کئے۔ ادب کی تاریخ صرف الفاظ کی تبدیلیوں اور سنون کا لحاظ کر کے مختلف ادوار میں تقسیم نہیں کی جاتی۔ ادب کی تاریخ میں تبدیلیوں کا تعین کرنے کے لئے بہت سے دوسرے عوامل کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ طرز بیان کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خیال و فکر کی دنیا میں مختلف رجحانات کے واضح تصورات کی بنیاد پر ہی ادب کی تاریخ کے مختلف دور متعین کئے جاتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال کی تبدیلی ادب کی تاریخ میں کوئی اہم مقام نہیں رکھتی۔ آزاد نے اردو شاعری کے تاریخ دور قائم کرنے میں الفاظ کے استعمال اور اُن طرز بیان کی تبدیلیوں اور شاعروں کے سن ولادت اور سن وفات کا لحاظ رکھا ہے۔ جہاں تک ادبی رجحانات اور تحریکات کا تعلق ہے، ان قائم کئے ہوئے مختلف ادوار میں کوئی قابل لحاظ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے آب حیات میں قائم کردہ اردو کے شعری ادب کے ادوار کی تقسیم درست نہیں کہی جا سکتی۔

آب حیات کے ابتدائی ابواب میں اردو زبان کی تاریخ برج بھاشا پر فارسی کے اثرات اور اردو نظم کی تاریخ کا بیان ہے۔ اردو زبان کی تاریخ بیان کرنے کے ضمن میں ہندوستان کی مختصر تاریخ اور یہاں کی قدیم زبانوں، سنسکرت، پراکرت وغیرہ کا بیان بھی آگیا ہے۔ آزاد نے لکھا ہے: "اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔" حال کی تحقیقات کی روشنی میں آزاد کا یہ بیان بحث طلب ہے۔ اردو زبان کی تخلیق اور ابتدائی نشو و نما کے مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ کچھ محققین کا دعویٰ ہے کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب اور دہلی کے نواح کا علاقہ ہریانہ ہے اور اردو زبان کی تخلیق ہریانی اور فارسی زبانوں کے امتزاج سے ہوئی۔ دوسروں کا دعویٰ ہے کہ اُردو کی ابتدائی صورت دکن کی مقامی بولیوں اور شمالی ہندوستان کی بولیوں میں فارسی کے امتزاج سے وجود میں آئی۔ اسی طرح گجرات اور ملک کے دوسرے خطوں کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اُردو زبان کی تخلیق اور اُس کی ابتدائی نشو و نما ان کے خطوں میں وقوع پذیر ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان کی تخلیق اور اس کی تخلیق کا عمل ہندوستان کے مختلف حصوں میں وہاں کی مقامی بولیوں اور فارسی کے امتزاج سے ہوا۔

زبان اردو کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آزاد نے ہندوستان کی مختصر تاریخ بھی بیان کر دی ہے۔ ضمناً ایران کے حالات کا بھی ذکر کر دیا ہے اور سنسکرت اور ایرانی زبان کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُردو زبان کی تعمیر میں مختلف زبانوں سے جو الفاظ لئے گئے ہیں ان کا بیان بھی ملتا ہے۔ برج بھاشا پر عربی، فارسی کے اثرات کا بھی تذکرہ ہے۔ آب حیات کے ابتدائیہ بعنوان زبان اُردو کی تاریخ کا تعلق دراصل تاریخ اور لسانیات سے ہے۔ اُردو ادب یا نظم کی تاریخ میں اس کا ہونا چنداں ضروری نہیں۔

آب حیات کے باب دوم بعنوان "نظم اردو کی تاریخ میں" شاعری کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالباً افلاطون کی نظریہ شاعری سے متاثر ہو کر آزاد کہتے ہیں:

"فلاسفۂ یونان کہتے ہیں کہ شعر خیالی باتیں ہیں
جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں"

اس کے بعد یہ کہتے ہیں:

"قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر
جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، وہ
اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے، اس
خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔"

تعجب ہوتا ہے آزاد کے نتیجہ کے استنباط پر جبکہ وہ خود ہی کہتے ہیں کہ قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر شاعر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ایسی حالت میں شعر خیالی بات کیسے ہو گیا۔ واقعیت اور اصلیت موجودات اور اس کے واقعات ایک ہی چیز ہیں۔ وہ کہتے ہیں اُس کو (شاعر کے اظہار بیان کو)

کی پابندی نہیں۔ یہاں ان کو بتلانا چاہیئے کہ سچ سے ان کی [مرا]د کیا ہے۔ شعری صداقت اپنی حقیقت رکھتی ہے۔ اس لئے یہ [کہ]نا کہ شعر کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں، درست نہیں۔

آزاد شعر کی خصوصیت بیان کرنے پر اپنے طور پر فطری شاعر کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ ضمناً وہ اپنے استاد ذوق کا حال بیان کر دیتے ہیں۔ امیر خسرو کی پہیلیوں اور مکرنیوں وغیرہ کا بیان [ک]رتے ہوئے وہ خالق باری کو ان کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ حالی کی تحقیقات سے خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں۔

آزاد کی نظر اردو کی مروجہ شاعری پر ہے۔ وہ اس کی خامیوں کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"یہ اظہار قابل افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی پھندوں میں پھنس گئی ہے۔ یعنی مضامین عاشقانہ، میخواری، مستانہ پن، گل و گلزار، وہمی رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصل موہوم پر خوش ہونا، دنیا سے بیزاری۔ اس میں فلک کی جفا کاری، غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصلی ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں، تو بھی خیالی استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔"

آگے چلکر وہ کہتے ہیں:

"جو ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان نہ نکال سکے گویا ایک ٹوٹا ہوا قلم ہے، جس سے پورا حرف نہ نکل سکے۔"

آزاد ادب کی افادی حیثیت کے قائل ہیں۔ حالی کی طرح آزاد مقصدی شاعری کو رواج دینا چاہتے ہیں۔ انہیں ادب اور سماج کے قریبی تعلق کا احساس ہے۔

آبحیات کا سب سے اہم حصہ وہ ہے، جس میں شاعروں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ دراصل آبحیات کی تصنیف کا مقصد ہی تھا کہ اس میں شاعروں کے حالات بیان کئے جائیں۔ آزاد لکھتے ہیں: "غرض خیالات مذکورۂ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں، یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں، انہیں جمع کرکے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو۔ اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی تصویریں سامنے آ کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہو۔

آزاد، اپنے اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔ شاعروں کی جیتی جاگتی تصویریں جیسی آزاد نے پیش کی ہیں، وہ بے مثال ہیں۔ شاعروں کے خدوخال ان کے عادات و اطوار، پوشاک اور ان کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ جس طرح آزاد نے پیش کیا ہے، اردو کا کوئی دوسرا تذکرہ نگار اس معاملے میں ان کی برابری نہیں کر سکتا۔ حق تو یہ ہے کہ انہوں نے شعراء کی قلمی تصویریں پیش کرکے ان کو حیات جاوداں عطا کر دی ہے۔

تاریخی شواہد و واقعات کے بیان میں آزاد سے اکثر لغزشیں ہوئی ہیں۔ ان کے کچھ بیان کردہ واقعات سنی سنائی باتوں پر مشتمل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ناقدین کا کہنا کہ آزاد نے خیال کے طوطا مینا اڑائے ہیں، کچھ سچائی ضرور رکھتا ہے۔ میر کی سیرت، یا انشا کے آخری دور حیات کے بیان سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ تاریخی شواہد سے درست نہیں۔ آزاد نے یہاں زیادہ تر سنی سنائی باتوں سے کام لیا ہے ـــــ آزاد کے زمانے کا لحاظ رکھتے ہوئے اور تحقیقات کے راستے میں جتنی دشواریوں کا سامنا انہیں کرنا پڑا ہوگا، آبحیات میں بیان کئے گئے واقعات کی صحت پر ضرورت سے زیادہ زور دینا حقائق سے چشم پوشی ہوگی۔

آزاد میں واقعات کو بیان کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ جن واقعات کو وہ بیان کرتے ہیں، وہ بڑے پر اثر ہوتے ہیں واقعات کو ڈرامائی انداز میں وہ اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ ان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ آزاد عبارت آرائی کی دھن میں کبھی کبھی سنی سنائی باتوں کو بھی اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ ان میں اور واقعات میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ آزاد کے بیان کردہ واقعات تاثراتی کوائف کے حامل ہوتے ہیں۔

آزاد کے بیان کا لہجہ ایسا ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن
واقعات کو بیان کرتے ہیں ان پر یقین رکھتے ہیں اور انہیں اس بات
پر بھروسہ ہے کہ قارئین کو بھی ان واقعات کی سچائی پر یقین ہے۔
طرز بیان کے لحاظ سے آبحیات اپنی مثال نہیں رکھتی۔
لیکن عبارت آرائی کا جو انداز، شاعروں کے حالات بیان کرنے
کے لئے انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ آبحیات جیسی شاعروں کے
سوانح اور اردو نظم کی تاریخ کی کتاب کے لئے موزوں نہیں
کہا جا سکتا۔ سوانح اور تاریخ کے بیان میں عبارت آرائی مناسب
نہیں۔ واقعات کے بیان میں متعین اور بلا واسطہ معنی ادا کرنے
والے الفاظ کا استعمال اور طرز بیان کی ضرورت ہے۔ آزاد کی تحریر
انشاء کے لئے اپنا جواب نہیں رکھتی لیکن آبحیات جیسی کتاب کے
لئے یہ قطعی موزوں نہیں۔ اس سے آبحیات کی تاریخ ادب کی حیثیت
سے اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

آبحیات کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ اردو ادب کی تاریخ
نگاری میں یہ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعروں کے حالات
کے ساتھ ساتھ آزاد نے ان کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار کیا
ہے۔ یہ رائے بیشتر طور پر ان کے کلام کی خوبی اور صحت وسقم کے
حدود کے اندر ہے۔ یہ رائے عروض و بدیع و بلاغت کی خصوصیات
تک محدود ہے۔ اردو میں تنقید کا فن ترقی کر گیا ہے۔ عالمی
ادبیات سے استفادہ اٹھا کر اردو ادیبوں نے تنقید میں زیادہ
گہرائی اور وسعت پیدا کی ہے۔ تنقید کے فن کا لحاظ رکھتے ہوئے
شعراء سے متعلق آزاد کی رائیں نکتہ چینی سے زیادہ حیثیت نہیں
رکھتیں۔ ایک بات ایسی ہے جو آزاد کو ان کے پیشرو تذکرہ
نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ آبحیات میں "نظم اردو کی تاریخ" کے
عنوان والے باب میں آزاد نے شاعری سے متعلق کچھ بنیادی باتوں
پر روشنی ڈالی ہے۔ ان سے قبل کسی اردو ادیب نے شعر و شاعری
سے متعلق بنیادی باتوں پر اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ حالی کا مقدمۂ
شعر و شاعری جس میں شاعری سے متعلق بنیادی باتوں کو تفصیل
سے بیان کیا گیا ہے۔ آبحیات کے بعد کی تصنیف ہے۔ کچھ ناقدین
نے آزاد کا شمار اردو کے نقادوں میں کیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے
کہ انہوں نے شعر و شاعری کے متعلق اجمال سے اور اردو کی مروجہ
شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور شعراء کے کلام
کے بارے میں اپنی رائیں دی ہیں۔ آزاد ادب کی نئی تحریکوں سے
متاثر ہوئے تھے۔ اس سے ان کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے
لیکن شاعری سے متعلق ان کی رائیں سطحی نوعیت کی ہیں۔ شاعروں
کے کلام سے متعلق جو رائیں انہوں نے پیش کی ہیں ان میں وہ اپنے
ہمعصروں سے زیادہ امتیاز حاصل نہ کر سکے۔ شاعروں کے کلام کی
خصوصیات، ان کی خوبیاں اور نقص وہ مروّجہ عروض اور فصاحت
و بلاغت کے اصولوں سے متعین کرتے ہیں۔ ان کی رائیوں کو نکتہ چینی
سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں۔ ادب کے بارے میں ان کے نظریات
بہت حد تک حالی اور شبلی سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کا ماحول
وہی تھا جس میں حالی اور شبلی کے ادبی نظریات کی تشکیل
ہوئی تھی۔

زمانہ اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے آزاد نے جو کچھ کیا ہے
اسے بلاشبہ اردو ادب کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جائے گا۔ اپنے
بعد کے تذکرہ نگاروں اور اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں
کی رہنمائی کر کے انہوں نے تاریخی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ آبحیات
کے بعد جتنے تذکرے اور اردو ادب کی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان پر
آبحیات کا اثر صاف ظاہر ہے۔ حد تو یہ ہے کہ عصر حاضر میں بھی
اردو ادب کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بیشتر مصنفوں
نے اردو شاعری کے دور قائم کرنے میں بڑی حد تک آبحیات ہی کی
تقلید کی ہے۔ آبحیات کی اس تقلید نے اردو ادب کی تاریخ
نگاری پر ایک غیر صحت مند اثر ڈالا ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو
ادب کی تاریخ ترتیب دینے والے مصنفین ترقی یافتہ زبانوں
کی تاریخ نگاری کے اصولوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اردو ادب
کی تاریخ تحریر کیا کریں۔

شیخ محمود یالیسری

جدید اُڑیا ادب

ایک کے دور کا خاتمہ :-

اٹھارہویں صدی کا اُڑیا ادب اوپندر بھنج کا مرہون منت ہے۔ طویل نظم گوئی میں اوپندر بھنج کا مدمقابل کوئی بھی نہ تھا۔ اس کے جتنے بھی ہم عصر شعراء تھے۔ وہ سب سنسکرت کے ماہر تھے۔ اوپندر بھنج، جدومنی، بل دیو اور ابھی منیو وغیرہ کو سنسکرت پر کافی عبور تھا۔ اس وقت نظموں میں ہیرو اور ہیروئن سے آواگون کا ذکر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ عشق و محبت، ہجر و وصال کو نظم میں ہمیشہ جگہ دی جاتی تھی اور پڑھنے والوں کو بھی انہیں چیزوں سے دلچسپی رہتی تھی۔ اس دور سے قبل کی شاعری میں زیادہ تر مذہب کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مگر اٹھارہویں صدی کا ادب مذہبی جامہ اتار کر افادی پہلو پر زیادہ زور دینے لگا۔ رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں سے لکھنے والوں کو کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اس وقت کا شاعر سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرنے لگا اور الفاظ کی بندش طرز بیان، تشبیہات و استعارات کو شاعری کا کمال سمجھنے لگا۔ انہیں چیزوں سے اس وقت کے شاعر کے عمیق مطالعہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اوپندر بھنج نے اپنے بارے میں صاف کہہ دیا تھا کہ اس کی نظموں کا صرف وہی لوگ مطالعہ کریں جنہیں ثقیل الفاظ کے معنی سمجھنے کی صلاحیت ہوگی یا جو ادبی اور لسانی حیثیت سے عالم مانے جاتے ہوں گے۔ اوپندر بھنج عوامی شاعر نہیں تھا۔ اس کی شاعری صرف راجاؤں، مہاراجاؤں کے لئے مخصوص تھی۔ جن کے سامنے تشریح کے لئے دربار کے بڑے بڑے شعراء موجود تھے۔

اٹھارہویں صدی کے ادب میں ایک اور خصوصیت نظر آتی ہے، وہ ہے موسیقی کا استعمال۔ حالانکہ اوپندر بھنج کی نظموں کو ایک خاص طبقہ ہی سمجھ سکتا تھا۔ مگر ان میں موسیقی ہونے کی وجہ سے عوام بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ جدومنی، ابھی منیو وغیرہ بھی اسی طرح عوام تک پہنچ سکے تھے۔ اٹھارہویں صدی کا ادب اپنے اندر موسیقی رکھنے کی وجہ سے پالا، داس کاٹھیا اور گوٹی پوؤ ناچ وغیرہ جیسی انجمنوں میں اپنی جگہ حاصل کر سکا تھا۔ اس میں مذہبیات کچھ کم نظر آتی تھیں، ادبی اور افادی پہلو زیادہ۔ دین کرشن کی نظم "رس کلولا"، اوپندر بھنج کی "بیدیہی بلاس"، "ابھی منیو" کی "بید گدھا چنتامنی" اور جدومنی کی "پورنا چندرا" وغیرہ انہیں افادی پہلوؤں کی غمازی کرتی ہیں۔

اس دور کے ادب میں جنسیت اور شہوت پرستی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان میں فحاشی زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اوپندر بھنج کی فحش نگاری پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کے ہمنواؤں نے کافی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت کو بحث و مباحثہ کے لبادہ میں چھپایا نہیں جا سکتا۔ یہ ایسا تاریک پہلو ہے، جو خود بخود سامنے آجاتا ہے۔

اٹھارویں صدی کی ایک دالی طویل نظمیں اسی طرح اڑیا ادب کو ترقی کے زینے پر لئے جا رہی تھیں کہ سماج میں ایک نئی قسم کی تبدیلی رونما ہوئی۔ اُڑیا ادب کی طویل رزمیہ نظمیں

عوام سے دور رہ کر اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھیں ۔

دورِ جدید کی آمد :-

جدید اڑیا ادب کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس دور کے سماجی پس منظر پہ نظر رکھنا ضروری ہے
مغلوں اور مرہٹوں کے بعد اڑیسہ انگریزوں کے زیر حکومت رہا ۔ انگریز اڑیسہ فتح کرنے سے ۵۰ سال قبل بنگال فتح کر چکے تھے ۔ بنگال ہی انگریزوں کی حکومت کا سنگ بنیاد تھا جہاں سے وہ ہندوستان کے دوسرے حصوں تک پہنچ سکے انگریز اپنی حکومت کے ساتھ تعلیمی نظام بھی لے کر آئے ۔ انگریزوں نے پرائمری تعلیم سے لے کر انٹرنس تک ایک نئے تعلیمی نصاب کو مروج کیا ہے ۔ اس وقت جدید تعلیم سے مزین ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ ابھرا ۔ جو جدید اڑیا ادب کا خالق کہلانے کا مستحق ہے ۔

جدید اڑیا ادب کی تخلیق کا آغاز، درحقیقت ۱۸۸۰ء سے ہوا ۔ اس سے قبل جو کتابیں بھی لکھی گئی تھیں، وہ سب کی سب اسکول کے نصاب کے لئے تھیں ۔ تاریخی لحاظ سے اگر ہم جدید اڑیا ادب کے دور کو "انگریزوں کے دور کا "اڑیا ادب" کہیں تو بیجا نہ ہوگا ۔ جدید اڑیا ادب کی تخلیق کے میدان میں یوں تو چھوٹے بڑے بہت سارے ادیبوں کا ذکر آتا ہے ۔ مگر ان میں سے چار شاعروں یا ادیبوں کا مقام سب سے زیادہ بلند اور نمایاں ہے ۔ یہ ہیں رادھا ناتھ، مدھوسودن، گنگا دھر اور فقیر موہن ۔ یہی وہ چار فنکار ہیں، جو جدید اڑیا ادب کے رہنما کہلاتے ہیں ان میں سے رادھا ناتھ کو جدید اڑیا ادب کا خالق قرار دیا جاتا ہے ۔ یہ چار معاصر قلمکاروں کی رائیں جدا جدا تھیں لیکن نصب العین یکساں تھا ۔ رادھا ناتھ کا زاویۂ نظر مغرب کی جانب تھا ۔ مدھوسودن کا مشرق کی طرف، گنگا دھر کا اصول سادھارن تھا اور فقیر موہن کی نظر، سماج اور وقت کے تقاضوں پر مرکوز تھی ۔

" دور بھنج " کے اختتام اور دورِ رادھا ناتھ، کی آمد جدید اڑیا ادب کی جانب پہلا قدم تھا ۔ شاعر اعظم رادھا ناتھ کی تعلیمی اداروں سے ۴۰ سال کی ایک طویل مدت کی وابستگی جدید اڑیا ادب کی ترقی کے لئے مفید ثابت ہوئی ۔ رادھا ناتھ کی تعلیم صرف ایف ۔ اے تک تھی ۔ مگر وہ انگریزی، بنگالی، سنسکرت، ہندی اور قدیم اڑیا ادب سے بھی واقف تھا مختلف ادب کی خوبیوں سے رادھا ناتھ نے اڑیا ادب کو مالا مال کیا ۔ اسی وجہ سے رادھا ناتھ دورِ جدید کا خالق کہلاتا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ اپنی نظموں میں مغرب اور مشرق کے امتزاج کی وجہ سے اسے تنقید نگاروں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اس کی نظموں میں غیر ملکی عناصر کے ساتھ مشرقی روایت کی ہم آہنگی ۔ اس کے فن کارانہ شعور کی پختگی کا پتہ دیتی ہے ۔ جہاں اس کی نند کشوری، اوشا، پاربتی، کیدار گوری اور چندر بھاگا وغیرہ نظموں میں غیر ملکی چھاپ نظر آتی ہے ۔ وہیں چلیکا، مہاجاترا، تلسی، استوبکو اور میگھدوت وغیرہ میں خالص ہندوستانی تہذیب و تمدن کا عکس جھلکتا ہے رادھا ناتھ سے قبل اڑیا ادب میں منظر نگاری کا وجود نہیں کے برابر تھا ۔ مگر رادھا ناتھ نے اس کو فروغ دیکر اڑیا کو ایک نئی راہ دکھائی ۔

اسی دور کا صوفی شاعر مدھوسودن پر رادھا ناتھ اثر بہت گہرا پڑا ۔ مدھوسودن نے کٹک میں ایف ۔ ا پڑھنے کے زمانے میں برہما مذہب کو اپنا لیا تھا اس کا ا کی ادبی زندگی پر بھی بہت گہرا پڑا ۔ مدھوسودن نے شاستروں کو اپنا کر فلسفیانہ ادب کی تخلیق کی ۔

رادھا ناتھ اور مدھوسودن کے علاوہ اس ایک اور ادیب رام شنکر رائے ہے ۔ اس نے دو نا اور " بن باسینی " لکھے ہیں " پدما مالنی " سے ...

میں بہت زیادہ مقبول ہوا تھا۔ رام شنکر کا ڈرامہ 'کانچی کاویری' اڈیا ادب کا پہلا ڈرامہ کہلاتا ہے۔

جدید اڈیا ادب کا تیسرا مشہور شاعر گنگا دھر مہر —
رادھاناتھ کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے گنگا دھر ایک عظیم شاعر بن سکا۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۳ء تک کا زمانہ گنگا دھر کی ادبی زندگی کا دور اول کہلاتا ہے۔ اسی زمانے میں اس نے 'اندومتی'، 'اتکل لکشمی'، 'کیچک بودھ'، وغیرہ طویل نظمیں لکھیں۔ گنگا دھر کی ادبی زندگی کا دوسرا دور ۱۹۱۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں اس نے لافانی نظموں 'تپسوینی' اور 'پرنا نو بلری' کی تخلیق کی۔

یوں تو اڈیا نثر کی جھلک رادھاناتھ، مدھوسودن اور رام شنکر کی تصنیفوں میں بھی مل جاتی ہے۔ مگر فقیر موہن کو ہی نثر کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اس کے چار مشہور ناول 'چھومان آٹھ گنٹھ'، 'لچھما'، 'ماموں'، اور 'پرائسچیت' ہیں۔ ان ناولوں میں اس دور کی سماجی اور سیاسی زندگی کی خوبصورت عکاسی نظر آتی ہے۔ ان چار ناولوں میں اڑیسہ کی عوامی زندگی کے دو سو سالہ سماجی اور تاریخی پس منظر کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ مختصر افسانوں کے میدان میں فقیر موہن کا افسانہ 'ریبتی'، اڈیا ادب کا پہلا افسانہ کہلاتا ہے۔ یہ افسانہ سب سے پہلے ۱۸۹۸ء میں رسالہ 'اتکل ساہتیہ' میں شائع ہوا تھا۔ فقیر موہن ۱۹۱۸ء تک زندہ رہا اور اس نے اس دوران میں ۲۱ افسانے لکھے۔

۱۹۰۸ء میں رادھاناتھ کا انتقال ہوا اور ۱۹۰۹ء میں اتکل منی گوپبندھو داس کی کوششوں سے ستیہ بادی میں شانتی نکیتن کی طرح ایک 'بن ودیالیہ' کی بنا پڑی، جو بعد میں 'ستیہ بادی ادب' کی محرک ثابت ہوئی۔ اس وقت ہندوستان میں آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں '[illegible]' کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ ستیہ بادی کے پنج سکھا

یعنی پانچ دوست گوپبندھو داس، نیل کنٹھ داس، گوداورش مصرا، اچاریہ ہری ہر، اور کرپا سندھو مصرا بھی گاندھی جی کے ساتھ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے لگے۔ انہوں نے ستیہ بادی کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا۔ ۱۹۱۴ء میں ایک رسالہ "ستیہ بادی" معرض وجود میں آیا۔ ستیہ بادی ادب کا دور دورہ ۱۹۳۰ء تک رہا۔ اسی دوران گوپبندھو داس نے ہزاری باغ جیل میں 'بندی کی آتما کتھا' جیسی لافانی نظم کی تخلیق کی۔ اس کے علاوہ اس نے 'دھرم پدا'، 'کارا کویتا'، 'پچی کیتا'، 'ابوکاش چنتا'، وغیرہ نظمیں لکھیں۔ نیل کنٹھ داس نے 'کونارکے'، 'داسی نایک'، 'پرانزیونی'، 'کھارو بیلا'، کی تخلیق کی۔ گوداورش مصرا کی نظم 'کلیکا'، 'آلیکھیکا'، 'چو یونی'، معرض وجود میں آئیں۔ کرپا سندھو نے 'کنارک' اور بار بانی لکھی۔ باسودیو نے 'شانتی دھارا'، اور 'ویر بھارت'، لکھیں اور لنگ راج نے سیاسی مضامین لکھے۔

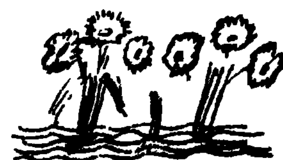
۱۹۲۸ء میں اتکل منی گوپبندھو داس" کا انتقال ہو گیا۔ ستیہ بادی کے پنج سکھا بکھر گئے۔ ستیہ بادی ادب کا خاتمہ ہو گیا۔ ستیہ بادی ادب کسی نئے ادب کا حامل نہیں تھا۔ بلکہ یہ رادھاناتھ کی تعمیر کردہ عمارت پر ہی قائم تھا۔ یہ قومی یکجہتی اور تحریک آزادی پر مبنی ہونے کی وجہ سے عوام میں اس کی قدر وقتی طور پر کافی بڑھ گئی۔

۱۹۳۰ء کے بعد سے بنگالی ادب کی تقلید میں ایک نئے ادب کی بنا پڑی، جسے 'ادب سبز' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ "ادب سبز" کا زمانہ اڈیا ادب میں (Roma- nlaic revival) کا دور کہا جاتا ہے۔

انگریزی کے نقاد 'ایل۔ ایف۔ اسکاٹ' نے رومانیت کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، وہ سب اڈیا ادب میں ۱۹۲۱ء سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس ادب کی نمائندگی پہلے من موہن، سچی ناتھ، بنجا موہن، پریا ناتھ، [illegible] وغیرہ نے کی۔ اور بعد میں

نزی چرن، اتّو داشنکر، بیکنیٹھ ناتھ وغیرہ نے بھی ان کا ساتھ
ا۔ یہ "ادب سبز" کا کارواں تھا۔ مایادھر کی تخلیق میں
ی رومانیت کا عکس پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ مہیشور نائک،
سچیدانند اور رادھاموہن گڑنایک کی نظموں میں بھی رومانیت
ی جھلک نظر آتی ہے۔ رادھاناتھ، مدھوسودن اور
یقر موہن حالانکہ دورِ جدید کے بانی کہلاتے ہیں۔ مگر تینوں کے
تخلیقی شعور اور زاویہ نظر میں یکسانیت کی بجائے ایک
طرح کا اختلاف و انحراف پایا جاتا ہے۔ اڑیا ادب میں یہ
پہلا موقع تھا کہ "ادب سبز" کے کارواں نے منظم طریقے پر ادب
کی ترویج و ترقی کے لئے ایک انجمن "سبوج ساہتیہ سمیتی"
کی بنا ڈالی۔ اسی انجمن کی طرف سے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۵ء
تک ۱۵ سال کے عرصہ میں کافی تعداد میں نظم و نثر کی کتابیں
شائع ہوئیں۔ ان میں "سبز کویتا"، "باسنتی"، "امرچیتا"،
"دوادوسی"، "موبتی پوچھے"، "پوجارینی"، "پورنیما"،
"دیشرو ڈاکو"، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اب "ادب سبز" میں کچھ تبدیلیاں نظر آنے لگی ہیں
۱۹۵۰ء کے بعد سے "ادب برائے ادب" کی طرف سے ہٹ
کر "ادب برائے زندگی" کی جانب بھی چند قلمکاروں کے قلم
چلنے لگے ہیں۔ جدید ترین ادب کے رہنماؤں میں "سچی راوترائے"
"گوپی ناتھ مہانتی"، "اننت پٹنایک"، "رادھا موہن گڑنایک"
اور گوداورس، مہاپاترا (آنجہانی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔
ان حضرات کی تخلیقات کے پیش نظر وثوق کے ساتھ کہا جا
سکتا ہے کہ جدید اڑیا ادب کا مستقبل نہایت ہی تابناک
ہے۔



بقیہ اقبال اور اُس کی شاعرانہ صلاحیت

شاعر اعظم حضرت اقبال اور شعر و ادب کے خزاں آلودہ
گلشن میں احساسات اور خیالات کی شگفتہ اور دلپذیر
بہاروں سے رنگ برنگ کے غنچے کھلا کر دماغ عالم کو معطّر
کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کو وطنیت اور قومیت کے محدود
دائروں سے نکال کر اس کے اندر عزم و حوصلہ، حریت
و عمل، خودی اور خود اعتمادی کے جذبات کو بیدار کرنے
کے لئے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ کی سنگلاخ سرزمین میں
پیدا ہوئے اور بحسن و خوبی اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل
کر کے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو راہِ دارالبقا کو کوچ کر گئے۔ ان
کے جیسا اعلیٰ پیمانے کا مفکر، خلق و مساوات کا مدرس،
جذباتِ انسان کا مفسر، قصرِ اصلاح کا معمار، حق و صداقت
کا محقق، نقش دوئی کا منکر، خودی کا پیمبر، اخوت کا پیکر،
کامرانی کا علمبردار، "قافلۂ امن کا سالار، دوربیں، دوررس،
نکتہ شناس، بہی خواہ، جملہ معائب سے آگاہ کرنے والا
رموز قدرت کو سمجھنے والا، قوم و وطن کی ناگفتہ بہ حالت
پر آنسو بہانے والا شاعر پیدا کرنے کے لئے اس برّاعظم
کو مدتوں لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شیخ تجمل علی فہمی (علیگ)

اقبال اور اُس کی شاعرانہ صلاحیت

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال عالم ایجاد میں عین اس وقت جلوہ افروز ہوئے، جبکہ سلطنت مغلیہ کو زوال نصیب ہو چکا تھا۔ شاہی دربار دہلی، لکھنؤ اور دکن کی پرانی روایتیں اور چہل پہل تتر بتر ہو گئی تھیں۔ نئے ساز اور نئے سامان آرائش سے نئی بساط کی ترتیب دی جا رہی تھی۔ ادب برائے نشاط کا سفینہ ادب برائے ادب سے گذرتا ہوا ادب برائے زندگی کے ساحل پر آکر ٹھہرا ہوا ہے۔ ہندی اقوام کو جاہل اور غیر متمدن سمجھا جانے لگا تھا۔ مسلمان اپنے آباؤ اجداد کے کارہائے نمایاں کو بھول کر کسمپرسی کے عالم میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس وقت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ایک ایسے مرد مومن کی جو للکار کر حب الوطنی اور ملی تقاضائے حیات کا نعرہ بلند کرے اور کھوئی ہوئی عظمت و رفعت اور ان خوبیوں کا احساس دلائے، جو کبھی قوم و وطن کے دامن میں پوشیدہ تھیں۔

فخر فطرت سر محمد اقبال نے سن صغیری سے عجیب و غریب کرشمات دکھلائے کہ اہل بینش کی نگاہیں تسخیر ہو گئیں۔ آرنلڈ کی طرح دوربین اور نکتہ شناس پروفیسر کو ان کے ذہن رسا کا اعتراف کرنا پڑا۔ حالی اکبر اور داغ جیسے گراں پایہ شاعر ان کی عظمت کے معترف ہو گئے۔

اقبال نے اپنی عمر کے ذینہ بہ زینہ پر قدم رکھا ہی تھا کہ علمی تحقیقات کا جذبہ ان کے دل میں ابھرا۔ اس کے پیش نظر انہیں اپنی تولدگاہ جہاں کا ہر ذرہ ان کی نظر میں دیوتا کے برابر تھا۔ چھوڑ کر تعلیم یافتہ ملکوں کا دورہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں "اقبال کو علمی منازل طے کرنے میں اچھے اچھے رہبر ملے اور بڑے بڑے علماء سے سابقہ پڑا، جن میں ڈاکٹر میک ٹیگرٹ براؤن، نکلسن اور سارلی قابل ذکر ہیں۔

اقبال کی شاعری کا آغاز تعلیم کے ابتدائی دور میں شروع ہو چکا تھا۔ حضرت داغ دہلوی سے استفادہ کرنے کے بعد ان کی طبیعت نے خود ہی ایک شاہراہ مستقبل کی جستجو کر لی۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا انکشاف اس وقت ہوا جب انہوں نے لاہور کے ایک مشاعرہ میں اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا: ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

۱۸۹۹ء میں ایک نظم جس کا عنوان "نالۂ یتیم" تھا انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں بڑے سوز و گداز کے ساتھ پڑھی، جس سے ان کی شہرت ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد جذبۂ حب الوطنی نے سر ابھارا جس کا سہارا

لے کر "ہمالہ" "نیا شوالہ" "ترانۂ ہندی" "تصویرِ درد"
اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" جیسی کامیاب اور پُرتاثیر
آفریں نظمیں لکھیں۔ جن کی مثال بین الاقوامی ادب میں بھی
مشکل سے نظر آئے گی۔

اقبال، وطن کو خوشحال اور آسودہ دیکھنے کے لئے
بے چین تھے۔ اس لئے وہ ہر ایک کو کاہلی اور سستی کے عیوب
سے پاک کرکے قوم اور وطن کی ترقی کے لئے جد وجہد کرنے
کی ترغیب دیتے تھے اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہمیں مندرجۂ ذیل
اشعار سے ملتا ہے۔ ؎

تڑپنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانا

ان کی شاعری کی ابتدا ایسے دور سے ہوئی، جبکہ
ملک کی ابتری اور بدحالی اپنی معراج تک پہنچ چکی تھی قوم
کو اپنے نقصان کا کچھ بھی احساس نہ تھا۔ انہوں نے اس بیچارگی
کا یوں ماتم کیا ہے۔

؎ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ایسے نازک دور میں انہوں نے شعلہ نوائی سے اپنی
قوم کو ابھارنے کی حتی الامکان کوششیں کیں:

؎ اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

اقبال کو اپنی تصانیف میں سب سے زیادہ پسند زبورِ عجم
تھی۔ اس لئے وہ پوری دنیا کو ایک قوم سمجھتے ہوئے پیغام
دیتے ہیں: ؎

اگر ہو شوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

شاعری کی ابتدائی دور گزرتے ہی اقبال نے پیمبرانہ
شان اختیار کرلی، حضرت گرامی فرماتے ہیں:

؎ در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیمبری کرد و پیمبری نتواں گفت

سفید پوش آقاؤں کے ملک کا دورہ کرکے ان کی دوربین
اور دوررس نگاہ نے یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ قومیت انسان
کے درمیان فساد پیدا کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے گروہ، جماعتیں
اور قومیں محض اس لئے قائم کی جاتی ہیں کہ ان کے در پردہ سرمایہ
دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام برقرار رہے۔ ان کی تہذیب
و تمدن جو بظاہر بڑے دلفریب معلوم ہوتے ہیں اور جس پر عمل پیرا
ہونے کے لئے ملک والے بے چین ہیں، جو قطعی طور پر انسانیت
کش ہے۔ ایسے دیکھ کر زندگی سے لبریز جو پیغام دیا ہے
ملاحظہ فرمائیے: ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

وہ ایک اتحادِ پائیدار کے تجسس میں نکلے اور بہت جلد اس
نتیجہ پر پہنچ گئے۔ نظامِ اسلام کی روشنی میں ایک عالمگیر برادری
ہی اس ڈوبتے سفینہ کو کنارے لگا سکتی ہے، جو بحرِ ضلالت
کے تھپیڑوں میں پھنسی ہوئی ہے: ؎

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

یہ خیال آتے ہی انہیں غالب کی زبان میں کہنا پڑا: ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اور انہوں نے ایک ہی ضرب میں وطنیت کے بت کو پاش پاش
کردیا: ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس کے بعد انہوں نے نت نئے پیکروں میں زندگی، حوصلہ مندی
اور ذوقِ عمل کا پیغام دینا شروع کیا اور ان کے ہمعصر اور

قمر ماہ کو جو طوفانِ حوادث سے دوچار ہوتے ہوئے بھی وہ
پُرانا راگ الاپتے چلے جارہے تھے۔ مخاطب ہو کر کہنے لگے ؎

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانوں کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی پھر مزہ کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

اس دور کے مولوی اور ملاؤں کی کج نگاہی، لایعنی واہی اور
خام خیالی سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں؛

؎ مجھ کو تو سکھادی ہے، افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

اقبالؒ کا خیال تھا روحانی خودی انسان کو عروج پر پہنچا
دیتی ہے۔ قومی خودی آئندہ نسلوں کو زندہ اور طاقتور
بننے کا پیغام دیتی ہے اور انسانی خودی ہر طرح کے امتیازات
کو مٹا کر ترقی کا راستہ ہموار کرتی ہے: اسی لئے وہ ہر ایک
سے کہتے تھے: ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کا یہ انمول موتی ہمارے دل کے دریا میں پوشیدہ ہے
اس کی تلاش کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں؛ ؎

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزان ہے شمارِ سحر و شام ابھی

انہیں کامل یقین تھا کہ اگر ہم نے صدقِ دل سے
جانفشانی کے ساتھ اس کی تلاش کی، تو وہ انمول دولت
ضرور ایک دن ہمارے ہاتھ لگ جائے گی ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ہیں جس دن یہ نایاب موتی مل جائے گا۔ اسی دن ہماری زندگی
کا باغ رشکِ ارم بن جائے گا؛ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبالؒ، ایک اسلامی شاعر تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی اسی
انداز پر ہوئی تھی۔ اس لئے جنگ طرابلس چھڑ جانے پر وہ بیچین
ہوگئے اور" فاطمہ" "شکوہ" جیسی بلند پایہ نظمیں لکھیں۔ جن
کی للکار سے ہزاروں مردہ طبیعتوں میں جان آگئی۔ نظم "مسجدِ قرطبہ"
بھی ان کے اسلامی شاعر ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کے
باوجود ان کی گرم گستہ نگاہ سارے عالم پر رقص فرما تھی۔

بعض حکماء کا کہنا ہے کہ اقبالؒ صرف مسلمانوں کے رہبر
تھے۔ ان کی شاعری بھی صرف ملّتِ اسلامیہ کے مفاد سے متعلق
ہے۔ لیکن یہ قطعی الزام ہے۔ کیونکہ میں آگے کہہ چکا ہوں کہ وہ
پوری دنیا کو ایک قوم سمجھتے تھے۔ جن کی تصدیق یوں کیجئے:
جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں کہ" اقبالؒ رومی کی رہنمائی میں جب
فلکِ قمر پر پہنچے ہیں، تو ان کی ملاقات ایک عارفِ ہندی
سے ہوتی ہے۔ اقبالؒ نے اس عارفِ ہندی کے متعلق عنوان
میں یہ لکھا ہے کہ ؎

اہلِ ہند اُو را جہاں دوست می گویند

مترجمین اور شارحین کلامِ اقبالؒ نے "جہاں دوست"
کا بالکل سامنے کا ترجمہ کر کے اس کے معنی "وشوامتر" لکھ
دیئے ہیں۔ حالانکہ اس عنوان کے تحت اقبالؒ کا شعر ہے:

؎ موی بہ سر بستہ و عریاں بدن
گردِ او مارِ سفید سے حلقہ زن

اور پھر ملاقات کا فلکِ قمر پہ ہونا اس بات کی بہت بڑی دلیل
ہے کہ "جہاں دوست" سے مراد "وشوامتر" نہیں، بلکہ
شیو جی مہاراج ہیں اور پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اقبالؒ کی
عظیم غیر مسلمانی شخصیتوں سے ملاقاتوں میں ایک فرق نظر
آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "ڈیوائن کامیڈی" کے مصنف اکثر
و بیشتر غیر عیسائیوں کا ذکر توہین آمیز طریقے سے کیا ہے

اور جو شخصیت جتنی بڑی نظر آتی ہے۔ اس کا ذکر اتنا ہی نفرت اور حقارت سے کیا ہے۔ اس کے خلاف اقبال نے غیر مسلم اکابر کے ذکر میں اپنی عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کئے ہیں جن کی خوشبو سے عالم انسانیت ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ ان اکابرین میں "شیو جی مہاراج" اور "بھرتری ہری" کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اقبال ایک بین الاقوامی شاعر تھے۔ ان کا دامن فرقہ پرستی کے عیب سے بے نیاز تھا۔ بلا امتیاز قوم و مذہب وہ ہر ایک کو خلوص و مساوات کا پیغام دیتے تھے۔ قوم و وطن کی آسودگی ان کا نصب العین تھا۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ: ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جب تک خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اس لئے وہ دنیا سے نقش دوئی کو مٹانے کی جد و جہد کرتے تھے۔ وہ سارے عالم کو پیغام دیتے تھے کہ آپس کے تفرقات اور نفرت سے قطع تعلق کرنے کے ساتھ ساتھ موتی کی طرح ایک ہی لڑی میں منسلک ہو جاؤ اور اپنی یکجہتی کی بہار سے فضائے عالم کو سرسبز و شاداب کر دو، اسی میں انسان کی طرح زندگی بسر کرنے کا راز پنہاں ہے' وہ جس طرح مسلمان کو کہتے تھے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کا نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی' دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی' قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اسی طرح دوسری قوم کو کہتے تھے:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں' نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے، مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کی تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں، منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کا پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی' بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مندرجہ بالا دلائل ان کو غیر متعصب قرار دینے کے لئے کافی ہیں۔ جن لوگوں نے اُن پر انگشت نمائی کی ہے۔ وہ ان کے مقصد زندگی اور مقصد عمل کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور بعض حکمار نے اُن پر الزام تراشا ہے کہ وہ شاعر نہیں ایک مبلغ تھے۔ شاعری کی جملہ اصناف سخن ان کے کلام سے واضح ہوتی ہیں۔ انہوں نے شاعری کو تبلیغ کا ذریعہ بنا کر اس کی روح کو پژمردہ کر دیا۔

یہ حقائق سے چشم پوشی ہے۔ کیونکہ اقبال نے اُردو شاعری کو بام شہرت تک پہنچایا اور اس کو فلسفیانہ بلند آہنگی کی وہ دولت عطا کی جس سے وہ ناآشنا تھی۔ اس کے دامن کو شائستہ اور بلیغ الفاظ و محاورات کے جواہر پاروں سے بھر دیا۔ جن کی بدولت اردو ادب نے اقصائے عالم کی نگاہ میں درجۂ رفعت حاصل کر لیا اور خود دور حاضر کے شعرائے کرام کے مشعل راہ بن گئے۔ اقبال کو خداداد قوت گویائی ملی تھی۔ جس کی تاثیر ہمارے درماندہ قوم کے حق میں کیمیا ثابت ہوئی۔ ان کی شاعری زندگی کی تمام پہلوؤں پر ایک مبصرانہ تنقید ہے۔ دنیا میں جب تک انسانیت زندہ ہے۔ اس شاعر اعظم کو فراموش نہیں کر سکتی۔

میر کا سوز و گداز۔ درد کی تاثیر دل آویزی' غالب کی جدت اور نکتہ آفرینی۔ میر کی نازک خیالی، ذوق کی روانی شکسپیر کی نفرت نگاری' ملٹن کی پرواز فکر' شبلی کی شیریں کلامی

نیٹشے کی حکایت شعاری کلام اقبال میں جمع ہیں۔ جن کی الگ الگ بحث تفصیل طلب ہو گی۔ ان کے کلام میں دورِ جدید کی مجملہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جن میں تاثیر، روانی، رنگینی شگفتگی اور فلسفیانہ مسائل بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جدید تراکیب نادر تشبیہات اور لطیف استعارے اور اسلوب بیان کی دلکشی کا جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کے چند اشعار بغرض توثیق و تصدیق پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن سے ان کی کامیابی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

شانِ تغزل: ؎

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

اسلوب بیان یا اندازِ بیان کی دلکشی: ؎

عشق کی تیغ جگر دار اڑائی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

سرمایہ دار کی مذمت: ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

شاعرانہ شوخیاں: ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

زندگی کے حقائق اور معارف کے دلپذیر انداز: ؎

؎ جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

؎ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

فارسی تراکیب سے معمور اشعار: ۔

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

وحدۃ الوجود: ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

جو اقبال کی شاعری سے جھوٹے گل و بلبل کی امید رکھتے ہیں، وہ ان کے نظریہ سے بے بہرہ اور ناواقف ہیں۔ باوجود ان خصوصیات کے اقبال کے کلام میں کہیں کہیں شاعرانہ حسن کی کمی کھٹکتی ہے۔ جس کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ ؎

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

مگر یہ شاعرانہ نقائص ایسے نہیں ہیں۔ جن کی بنا پر وہ کامیاب شاعر کہلانے کے مستحق سمجھے نہیں جائیں۔

حوادثاتِ زمانہ سے لرزنا نہیں، مقابلہ کرنا ان کا مسلک تھا۔ ان کا ایمان تھا ؏

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

اس لئے وہ اقصائے عالم کو پیغام دیتے تھے: ؎

اے طائرِ فرزانہ رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہو تو طوفاں ہو

وہ کبھی اور کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ ان کا قول تھا: ؎

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینہ دل کے لئے گردِ ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

آخری وقت میں اقبال اشتراکیت سے بیحد متاثر ہو گئے تھے۔ اس دور کی نظمیں "لینن کی دعا، خدا کے حضور میں" فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا" اس کے مستند دلائل ہیں۔

چند اہم خطوط

(۱)

اقبال کا خط امجد نجمی کے نام

جناب من ۔ السلام علیکم

آپ کے اشعار کے لئے سراپا سپاس ہوں ۔ امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا ۔ شعر کے لئے بہترین ہدایت یہ ہے کہ بہترین اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے ۔

مخلص :۔ محمد اقبال

۱۲ دسمبر ۲۴ء

(۲)

الیاس برنی کا خط امجد نجمی کے نام

جناب مکرم ۔ السلام علیکم

میں نے اقبال کی تمام نظمیں یکجا تالیف نہیں کی ہیں ۔ بلکہ مختلف حصوں میں مختلف نظمیں درج ہیں ۔ آپ نے جن نظموں کا حوالہ دیا ہے ، وہ چوتھے سٹ میں درج ہو رہی ہیں

الیاس برنی

۳۰ مئی ۲۳ء

(۳)

محمود طرزی کا خط مظہر امام کے نام

آج سے تقریباً چھ ہفتہ قبل ایک شاعر قسم کے علامہ تشریف لائے اور فرمایا کہ اعجاز صدیقی صاحب کا خط آیا ہے انہوں نے آغا حشر کا فوٹو مانگا ہے ۔ میں نے دوسرے روز وہ فوٹو انہیں دیدیا ۔ کل بمبئی سے "شاعر" آیا تو سرورق پر ایک مختصر ترین بلاک چھپا ہوا تھا ۔ جو یاروں نے اس فوٹو سے بنوایا ہوگا ۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فوٹو سے جو فوٹو لیا گیا تھا اسے Reduce کر دیتے تو تصویر پوری آتی اور بلاک بھی خوبصورت ہو جاتا ۔ مگر نہیں ۔

خیر اب نجمی صاحب کا مضمون پڑھا اس میں شک نہیں کہ موصوف نے بہت دیدہ ریزی سے اسے ترتیب دیا ہے ۔ مگر ایک موقع پر تحریر فرمایا ہے کہ شکسپیر کی طرح وہ اداکار بھی تھے اور ہدایت کار بھی ۔ یہ حقیقت ہے کہ اداکاری بغیر کوئی بھی ہدایت کار نہیں ہوتا ۔ لیکن یہ استثنیٰ حشر مرحوم کے ساتھ ہے کہ انہوں نے اسٹیج پر کبھی اداکاری نہیں کی ۔ ہاں وہ ہدایت کار تو ایسے تھے کہ کسی کو اس سلسلہ میں ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا ۔ وہ ڈائرکشن کے وقت اگر طغرل اور قہرمان کو ایکٹنگ بتا رہے ہیں ، تو اسی وقت شمسہ اور تسنیم کو بھی پورے ناز و ادا کے ساتھ سکھا رہے ہیں ۔ اگر ایک طرف خیر صلا کی بیوی کو چٹاک مٹک کی تعلیم دے رہے ہیں ، تو وہیں ماشاء اللہ کو بھی مزاحیہ ایکٹنگ بتا رہے ہیں ۔ میرے پاس ان کے غیر مکمل فلم کی تین تصویریں ہیں ۔ جن میں وہ ایک کردار ادا کر رہے ہیں ۔ لیکن بعد میں انہوں نے انکار کر دیا اور یہ فلم نہیں بن سکا ۔

نجمی صاحب نے "سلور کنگ" ، خوبصورت بلا ، سور داس

تمام جوانی کے مکالمے پیش کئے ہیں۔ کاش وہ عشق و فرض کے
کسی سین کا ایک مختصر حصہ دے دیتے تو اندازہ ہو جاتا کہ اس ڈرامہ
میں انہوں نے خود کو کس منزل پر دکھایا ہے۔ سوردا س میں جو ہندی
کے الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ بعید عام فہم ہیں، جبکہ انتہائی سین
میں نائلہ کی زبان سے انہوں نے سنسکرت کا ایک ایسا طویل
مکالمہ ادا کرایا ہے کہ سنسکرت کے ملتجی کو بھی اسے ادا کرتے وقت
چکر آ جاتا ہے۔

نجمی صاحب نے ناواقفیت کی بنا پر تحریر فرمایا ہے کہ حشر
نہایت عسرت کی حالت میں بنارس سے بمبئی گئے۔ حالانکہ یہ واقعہ
ہے کہ حشر مرحوم کے والد آغا غنی شاہ گو امیر کبیر نہیں تھے مگر شال
کی تجارت کرتے تھے اور ان کا خاندان خوشحال تھا۔

پھر بھی نجمی صاحب کی کوشش قابل داد ہے۔ میری طرف
سے انہیں مبارکباد پیش کر دیجئے۔

تانیث و تذکیر کی بحث میں آپ نے ایک نہایت حسین نظریہ
پیش کیا ہے کہ حسین چیزوں کو مونث کہنا چاہیئے اور اس میں آپ نے
چاند کو بھی لپیٹ لیا ہے۔

فریدہ کی دعائیں قبول کیجئے۔ حالانکہ دعاؤں کی قبولیت
ہمارے اور آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔

والسلام والدعا

آپ کا محمود طرزی

(۴)

مظہر امام کا خط امجد نجمی کے نام

۱۷ اپریل ۱۹۶۰ء

محترمی نجمی صاحب آداب و خلوص

آپ اور کرامت صاحب کے کارڈ موصول ہوئے۔
"طلوع سحر" کا مطبوعہ فرما بھی ملا ہے۔ بعض غلطیاں رہ گئی ہیں
جو بہت افسوسناک ہیں۔ مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ آپ دونوں
حضرات توجہ کے ساتھ دیکھا جائیے۔ آپ نے "گنج خضری" اور
"ہر ساحل" کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی غلطیاں
ہیں۔ غلطیوں کی ایک فہرست آپ لوگ تیار کر لیجئے۔ میں نے
توجہ سے نہیں پڑھا ہے اور نہ مجھے اس کا موقع ہے۔

ٹریننگ کی مصروفیات کے باعث لوگوں سے ملنے جلنے کا
موقع کم ملتا ہے۔ پھر بھی اب تک جن قابل ذکر لوگوں سے ملاقات
ہو چکی ہے، ان کے نام یہ ہیں:-

نیاز فتح پوری، سجاد ظہیر، روش صدیقی، ساغر نظامی،
عرش ملسیانی، سہیل عظیم آبادی، نریش کمار شاد، سلام
مچھلی شہری، جگن ناتھ آزاد، ہنس راج رہبر، ڈاکٹر محمد حسن
رفعت سروش، بسمل سعیدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، عتیق
حنفی، مظفر شاہ (اسسٹنٹ ایڈیٹر آج کل)، شہریار
پرواز (ساغر کے چھوٹے بھائی، آل انڈیا ریڈیو کے اردو جریدہ
کے ایڈیٹر)، حمیدہ سلطان، ذکیہ سلطانہ نیر، طاہرہ حسن،
پریم ناتھ در (افسانہ نگار)، خلیق انجم (مرتب معراج العاشقین)
نشتر خانقاہی (ایڈیٹر شاہراہ)، یوسف دہلوی، یونس دہلوی،
ادریس دہلوی، الیاس دہلوی، خوشتر گرامی، ترلوک چند کوثر
کشور زیدی (علی عباس حسینی کی صاحبزادی)، وقار احمد رضوی
افضل پشاوری (مجاز فیم)، طاہر صدیقی (ایڈیٹر ہمدرد دواخانہ)
منموہن ناتھ گپت اور موہن سنگھ سنگر (ہندی ادیب)

دہلی میں خواجہ احمد فاروقی کے علاوہ کوئی اور نمایاں
شخصیت نہیں رہ گئی ہے جس سے ملنا ضروری ہو۔ "پیام مشرق"
کا دفتر یہاں سے چند قدم کے فاصلہ پر ہے۔ لیکن اب تک وہاں
نہیں جا سکا ہوں۔ امروز فردا میں ناز انصاری سے ملوں گا۔

اب کام کی باتیں سنئے۔ پرسوں آل انڈیا ریڈیو کے جلسے
میں نیاز صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ کچھ

سرسری باتیں ہوئیں۔ پھر جلسے کی مصروفیات میں سب لوگ منتشر ہوگئے۔ کل ہی عرشی صاحب سے ملنے 'آج کل' کے دفتر گیا۔ پرسوں ہی میں مظفر شاہ صاحب نائب مدیر 'آج کل' سے ملاقات ہوگئی تھی اور انہوں نے بڑے اصرار سے دفتر بلوایا تھا۔ دفتر میں تقریباً تین گھنٹے تک عرشی صاحب سے بڑی دلچسپ گفتگو ہوتی رہی دن کا کھانا بھی میں نے وہیں ان کے ساتھ ہی کھایا۔ آپ کی کتاب کا نسخہ میں نے انہیں پیش کیا۔ بڑی خندہ پیشانی سے وہ لے لینے کو تیار ہوگئے۔ آپ کا مضمون "سرقہ اور توارد" میں نے ان کے حوالے کر دیا ہے۔ قطعی اور آخری فیصلہ تو وہ مضمون پڑھ کر ہی کریں گے۔ لیکن سرسری طور پر دیکھنے کے بعد انہوں نے اس کی اشاعت کا "ننانوے فیصدی" یقین دلایا ہے۔ مضمون وہاں چھپ گیا تو کم از کم چالیس روپے ملیں گے ہی ممکن ہے ۵۵ اور ۶۰ بھی مل جائیں۔ اگر انہوں نے نہیں چھاپا تو پھر ہم لوگ اسے "نگار" میں بھیج دیں گے۔ میں اس مضمون کو "نگار" ہی میں دینا چاہتا تھا، جیسا کہ آپ سے گفتگو ہوئی تھی لیکن میں نے سوچا نیاز صاحب سے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو اور پھر اگر آسانی سے کچھ پیسے مل سکتے ہیں، تو کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے عرشی صاحب سے دوران گفتگو میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ترجمے کے لئے اصل مصنف کی اجازت ضروری ہے۔ آپ نے ڈاکٹر مہتاب کی کتاب سے جو ترجمہ کیا ہے وہ 'آج کل' میں چھپ تو سکتا ہے مگر ڈاکٹر مہتاب کی اجازت چاہیئے۔ اگر آپ کو اس دوران میں موقع مل جائے، تو اجازت ضرور لے لیجئے۔ انتساب کے لئے بھی ان سے اجازت لے لیجئے۔ اچھا رہے گا۔

آج کارونیشن ہوٹل میں نیاز صاحب سے ملاقات ہوئی۔ غیر معمولی طور پر دلچسپ، بے تکلف، اور صاف گو انسان ہیں۔ ان سے مل کر صحیح معنوں میں مسرت ہوئی۔ ان کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ اس لئے ایک گھنٹہ بیٹھ کر ہی ان سے رخصت ہوگیا ورنہ ان کی باتوں کے سحر اور کشش سے چھوٹ جانا بہت مشکل ہے میں نے انہیں آپ کی کتاب کا نسخہ دکھایا۔ آپ کے متعلق پوچھتے رہے۔ کلام دیکھ کر انہیں یقین ہی نہ آیا کہ آپ کا اصلی وطن اڑیسہ ہے۔ جب میں نے یہ یقین دلایا تو کہنے لگے کہ ان کا کلاسیکل شاعری کا مطالعہ بہت گہرا معلوم ہوتا ہے۔ کلام دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فوراً رائے دینے پر رضامند ہوگئے انہوں نے فرمایا کہ "اگر رائے دینا ضروری ہو تو میں ضرور دوں گا، ویسے اس کی ضرورت کیا ہے۔ اچھا کلام خود داد حاصل کر لیتا ہے۔" کل شام کو وہ لکھنؤ واپس جا رہے ہیں، اس سے پہلے ہی وہ رائے لکھ کر دیں گے۔ ۸ رمئی کو وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ تقریباً دو ماہ وہاں رہیں گے۔ اچھا ہوا ان سے ملاقات ہوگئی، ورنہ ان کی رائے کے لئے کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا۔

معلوم ہوا ہے کہ کٹک کے کسی پروفیسر صاحب نے میرے خلاف ایک سخت مراسلہ "آثار" کو بھیجا ہے۔ بہت گالیاں دی گئی ہیں۔ ایک جگہ مجھے "علامہ مظہر امام دربھنگوی" کہا گیا ہے۔ جلد ہی شائع ہوگا۔ لیکن آپ لوگ ہرگز ہرگز اس کا جواب نہ دیجئے گا۔ اگر کوئی خواہش ظاہر کرے تو اسے روک دیجئے گا۔ پتہ نہیں "آثار" کے اس شمارے کی مزید کاپیاں کٹک آئیں یا نہیں، جس میں کرامت صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا۔

مخلص
مظہر امام

حفیظ اللہ نیولپوری

اڑیسہ کا منڈا قبیلہ — ایک مطالعہ

رامائن کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ راون کے خلاف جنگ کرنے کے لئے رام چندر جی کے ساتھ ایک قبیلہ نکلا گیا تھا۔ یہ قبیلہ اس زمانہ میں کھیروار کے نام سے مشہور تھا اس زمانے کے منڈا۔ کرمی۔ برہور اور سنتھال لوگوں کو کھیروار کہا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں یہ قبیلہ کانیا کی ترائی میں سکونت گزیں تھا۔ دراوڑوں کے زمانہ سے قبل منڈا قبیلہ کے لوگ اپنے کو ہور۔ ہورو یا ہو ([illegible]) یعنی آدمی کے نام سے متعارف کیا کرتے تھے۔ کانیا میں ان پر جب مظالم ڈھائے جانے لگے اور انہیں امن وسکون کی زندگی میسر نہ ہو سکی تو یہ لوگ مختلف علاقوں کو ہجرت کر گئے اور خصوصاً جنگلی علاقوں میں سکونت پذیر ہوئے۔

اڑیسہ کے مور بھنج کے علاقہ میں منڈا قبیلہ کے جو لوگ رہتے ہیں انہیں بھومج بھی کہا جاتا ہے اور مختلف قبائلی محققین انہیں ما بھوم اور رانچی کے تمار زیہ خاندان سے بتاتے ہیں۔ یہاں تمار۔ بھنڈورا اور پاٹ کوم تھانہ کے علاقہ میں ان کے عزیز و اقارب بھی پائے جاتے ہیں۔ پاتال، جاتم اور ککر نامی گروہ اسی قبیلہ کے افراد سمجھے جاتے ہیں۔ املیا، پاتلا، مردان، ہلاد، ہماپام، کرد کنٹا، اور ککر وغیرہ گاؤں سے یہ لوگ آئے ہیں اسی وجہ سے ان مقامات کے ناموں کی مناسبت سے ان لوگوں میں خاندانی تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔

ماگھ بکرمی کے پورنیما سے ان لوگوں کے یہاں سال نو کا آغاز ہوتا ہے اور مکر سکرانت کے ایک دن قبل یہ لوگ "یوم آخر" مناتے ہیں۔ صبح سویرے گاؤں کے لوگ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور سجنے کے درخت پر بیٹھا چڑھاتے ہیں اس موقع پر عام طور سے لوگ گرام، جنگا دیوتا اور باتو بنگا دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے اور درخت کی جڑ میں زہریلہ کنجے کے پاس مناسب جگہ منتخب کرکے سرخ مٹی سے گھوڑا اور ہاتھی تیار کرکے دیوی، دیوتاؤں کی سواری کے طور پر ان کی پوجا کی جاتی ہے اور دھن کے نام پر سفید مرغ اور سفید بکرا قربان کرتے ہیں۔ گرام دیوتا کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ یہ دیوتا ان کے گاؤں کو جنگلی جانوروں اور آفاتی بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے مکر سکرانت کے روز اس قبیلہ کے تمام لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں اور سبھوں کے گھر پہلا اندرسے تلے جاتے ہیں۔ مرغ اور بکری کا گوشت بھی پکتا ہے صبح سویرے طلوع آفتاب سے قبل یہ لوگ اندرسہ، بھوجا، چوڑا اور ہانڈیا (دیسی شراب) تیار رکھتے ہیں غسل کرکے

نئے کپڑے پہنتے ہیں اور تب کھانے پینے میں مشغول ہوتے ہیں ۔
مور بھنج کے علاوہ میں کچھ ادیباسی اور سنتھال لوگ بھی یہ تہوار مناتے
ہیں کھانے پینے سے فارغ ہو کر یہ لوگ مضبوط لاٹھیاں جمع کرتے
ہیں ۔ اور شیشم یا کیند کی لکڑی کا گیند بنا کر ان لاٹھیوں سے شام
تک گیند کھیلتے ہیں ۔ ان کے کھیل کا یہ قدیم منظر موجودہ
دور کے کرکٹ جیسے مہذب کھیل کا نمونہ پیش کرتے ہیں ۔

قبائلی گاؤں کے مکھیا کو منڈا کہا جاتا ہے جب شام
کے وقت کھیل ختم ہو جاتا ہے تو تمام لوگ گاؤں کے منڈا
کے گھر پر جمع ہوتے ہیں اور گیند توڑ کر منڈا کے گھر میں پھینک
دیا جاتا ہے ۔ منڈا کے خاندان کی کنواری لڑکیاں تیل لگا کر
لوگوں کا پیر دھوتی ہیں اور شراب سے سب کی ضیافت
کی جاتی ہے اور بڑی دیر تک تفریح طبع اور ضیافت کا سلسلہ
جاری رہتا ہے ۔ اس کے بعد تمام لوگ اپنے اپنے گھروں
کو روانہ ہوتے ہیں ۔

رات کے وقت گاؤں کے جوان مرد اور عورتیں کسی
خاص درخت کے نیچے یا گاؤں کے چوپال کے سامنے رقص
کرتے ہیں ۔ ڈھول ، باجہ اور شراب و شباب کی مستی میں
مدہوش ہو کر ان کا رقص اس وقت گیتوں میں بڑا ہی دلکش
ترنگ پیدا کرتا ہے ۔ اور اس وقت فضا کی سحر کاری سے یہ منظر
بڑا ہی خمار آلود بن جاتا ہے ۔ دیکھنے والوں کے دلوں میں
ڈھول کے تھاپ کے ساتھ خود بخود رقص و سرود کی امنگ
پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس وقت کا رقص فطرتی حسن و جاذبیت
کا دلکش منظر پیش کرتا ہے ۔ ان کے گیت میں دل کی اتھاہ
گہرائی اور امنگوں کے اعلیٰ و ارفع احساسات کی بہترین
عکاسی ہوتی ہے ۔

عام طور سے مرد باجہ بجاتے ہیں اور گیت گاتے
ہیں اور عورتیں ساز اور گیت کی لے پر رقص کرتی ہیں ۔
گاؤں کے معمر لوگ اس رقص و سرود میں شریک تو نہیں
ہوتے لیکن اس دلکش و جذبات انگیز منظر سے بہت ہی محظوظ
ہوتے ہیں ۔

اس قبیلہ کے لوگ رقص کے وقت کسی خاص قسم کا لباس
نہیں پہنتے لیکن مختلف قسم کے رنگ برنگے پھولوں کے ہار
رقص و سرود کے موقع پر منڈا قبیلہ کی دوشیزاؤں کے
زیب گلو ہوتے ہیں اور ان کے سیاہ اور چمکیلے گیسو بھی سفید
پھولوں سے مزین ہوتے ہیں ۔

دوسرے دن علی الصباح گاؤں کے کاشتکار
سال نو کے آغاز کے نیک شگون کے طور پر کھیت پر تین مرتبہ
ہل چلاتے ہیں کھیت کی واپسی پر کاشتکاروں کی لڑکیاں
ہلدی پانی سے ان کے پیر دھوتی ہیں اور ہل پر گوندھا ہوا
آٹا اور سیندور لگاتی ہیں اس کے علاوہ بیلوں کی سینگ
پر بھی تیل اور سیندور لگایا جاتا ہے ۔

منڈا قبیلہ میں ایک عجیب سا رواج یہ ہے کہ جب
ان کے گھر میں بچہ تولد ہوتا ہے تو ہنسوے سے اس کے ناف
کے نیچے داغ دیتے ہیں ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ بچپن میں ایک
مرتبہ داغ دینے سے بقیہ حیات ہر طرح کی پیٹ کی بیماری
سے آدمی محفوظ رہتا ہے ۔ اس قبیلہ میں تین سے پانچ
سال تک کے بچوں کے کان چھیدے جاتے ہیں عام طور سے اس موقع پر بھی
اچھی خاصی تقریب ہوتی ہے مکانات لیپ پوت کر صاف کئے جاتے ہیں اور
برآمدے پر ایک چوکہ بنایا جاتا ہے اس چوکہ پر بٹھا کر بچوں کے کان چھیدے جاتے
ہیں ۔ اس موقع پر بچوں کو نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور جس چوکہ
پر بچہ بیٹھتا ہے اس کے نیچے ایک مخصوص پیمانہ سے ناپ کر دھان
رکھا جاتا ہے اور اس پر ایک لوٹا رکھ دیا جاتا ہے لوٹے میں آم کا ایک
ڈال رکھا جاتا ہے اور اس کے سامنے دیا جلایا جاتا ہے بچے کے دونوں
طرف دو آدمی بیٹھ کر تیز کانٹے سے اس کے کان چھیدتے ہیں کان چھیدنے کے بعد
مرغ کا خون کان پر لگا دیتے ہیں اور کان چھیدنے والے پر ہلدی پانی چھڑکتے
ہیں اور تیل لگا کر تمام حاضرین کے پیر دھوئے جاتے ہیں یہ تقریب منڈا سماج میں بہت

اہمیت رکھتی ہے اس موقع پر گاؤں کے تمام لوگوں
کے کھانے پر مدعو کیا جاتا ہے۔ کھانے پینے اور رقص و
سرود کے ساتھ یہ تقریب بڑے دھوم دھام کے ساتھ
منائی جاتی ہے۔ ہر گھر کی لڑکیاں کان چھدوانے والے بچے
کو بطور تحفہ دھان پیش کرتی ہے اور اس کے سر پر تیل مالش
کرتی ہیں۔

منڈا قبیلہ کی یہ رسم بڑی ہی دلچسپ ہے اگر کسی لڑکی یا
لڑکے کو پہلے اوپر کے دانت نکلتے ہیں یا ٹوٹتے ہیں تو یہ لوگ
اسے منگ نما سمجھتے ہیں اور روائتی طور پر کسی کتے یا
کتیا کے ساتھ اس بچی یا بچے کا عقد کر دیتے ہیں۔ یہ تقریب
عام شادیوں کی طرح رسماً منائی جاتی ہے۔ تیسرے
دن صبح گاؤں کے کسی دوسرے مقام پر پروہت آتا ہے۔
گاؤں کے لوگ اور دا چاول۔ مرغ۔ انڈا اور سیندور
وغیرہ نذرانے کر وہاں جمع ہوتے ہیں اور سب مل کر جنگل کے
دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایسا نہ کرنے پر
جنگل میں شیر کا شکار بن جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ جو
لوگ اس پوجا میں شریک نہیں ہوتے عام طور پر جنگل میں
جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جو بچے اور بچیاں اس دن بھی مخصوص جگہوں
پر اسی طرح کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر دیسی شراب بھی پوجا
کے لئے رکھی جاتی ہے۔ پروہت جنگل سے کئی قسم کی جڑی بوٹیاں
لاکر ایک خاص قسم کا معجون تیار کرتا ہے۔ گاؤں کے تمام لوگ یہاں تک
کہ گائے بیل اور بکریوں کو بھی معجون کھلایا جاتا ہے اور مرغ تاگے
سے جڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو باندھ کر بچے کے گلے میں بطور
تعویذ پہنا دیا جاتا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق اس دوا
اور تعویذ سے سال بھر کے لئے ہر طرح کی وبا سے وہ لوگ
محفوظ رہتے ہیں۔ اسی عقیدے کے تحت گاؤں کے اطراف میں
دم کئے ہوئے سرسوں کا بھی چھینٹے ہیں۔ اسی قبیلہ میں مزید ایک
رواج یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ہر طرح کی بلاؤں سے محفوظ رہنے کی
غرض سے سال نو کے آغاز پر ایک طلسمی پودا (Miracle Plant)
لگایا جاتا ہے اور سال گذشتہ کا لگایا ہوا پودا اکھیڑ کر پھینک
دیا جاتا ہے۔

ان تمام مراسم سے فارغ ہونے کے بعد اس قبیلہ کے
لوگ گرمی کے موسم میں چار ماہ تک شادی بیاہ کی تقریبوں میں
مصروف رہتے ہیں اور موسم باراں کے آغاز پر زراعت و کاشت
پر لگ جاتے ہیں۔

منڈا قبیلہ کی شادی کی رسم دوسرے قبائل سے
مختلف اور بہت ہی دلچسپ ہوا کرتی ہیں۔ اس قبیلہ کی رسم
کے مطابق شادی کی بات چیت طے کرنے سے قبل لڑکی کو دیکھ کر
پسند کرتے ہیں۔ اگر لڑکی پسند آئی تو اس کی جنم پتری بھی
دیکھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک رسم بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ شادی
کے بعد دولہا دلہن کی ازدواجی زندگی خوشگوار گزرے گی یا
نہیں۔ یہ جاننے کے لئے اس قبیلہ کی سب سے معمر عورت نہا دھو کر
ایک برتن میں پانی رکھتی ہے اور اپنے دیوتاؤں کا نام لے کر اس
پانی میں دوب کا ایک تنکا ڈالتی ہے اور اس کے بعد دولہا کے
نام پر چاول کا ایک دانہ اور دلہن کے نام پر سرسوں کا دانہ پانی
میں ڈال کر منتر پڑھتی رہتی ہے۔ برتن میں دوب کا تنکا چاول کا
دانہ اور سرسوں الگ الگ پڑے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد
جب چاول کا دانہ اور سرسوں دونوں طرف سے آکر دوب کے
تنکے سے مل جاتے ہیں تو باہمی رشتے کے لئے اسے ایک نیک شگون
سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد دولہا کی طرف سے ایک شخص وکیل
کی حیثیت سے دلہن کے گھر جاتا ہے اور باقاعدگی سے نسبت
پیش کرتا ہے اور دلہن والوں کی مرضی سے دولہا کے والدین
کو آگاہ کرتا ہے معاملات میں فریقین کی رضامندی کے بعد
دولہا کے گھر سے ۲-۳ آدمی معاملات طے کرنے کی غرض سے دلہن کے
گھر جاتے ہیں۔ دلہن کو دیکھتے ہیں اس کے زائچہ سے دولہا کا زائچہ
ملاتے ہیں اور شادی کی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔

دلہا کی طرف سے جو لوگ معاملہ طے کرنے کے لئے جاتے ہیں انہیں [illegible] (گھر جا کر لڑکی دیکھنے والے) کہا جاتا ہے۔ دلہن کے گھر کی لڑکیاں ان کا پیر دھوتی ہیں اور انہیں چونا اور تمبا کو پیش کرتی ہیں۔ پھر قبیلہ کے خاص خاص لوگ لڑکی کے گھر آتے ہیں۔ وہاں سبھوں کو شراب پیش کی جاتی ہے۔ اس کے بعد کا منظر بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ دلہن کے لوگ قبائلی زبان میں گیت گا کر دلہا کے لوگوں سے وہاں آنے کی وجہ دریافت کرتے ہیں اور دلہا والے بھی گیت کے ذریعہ اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان گیتوں میں صاف مقصدیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ اشاروں کنایوں میں سوال و جواب ہوتے ہیں۔ عام طور پر گیت میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے گھر پر ایک سانڈ ہے بڑا ہی چکنا اور بھرپور اس کے لئے ایک گائے چاہیے جس کے پیٹھے کی چربی دھوپ کی کرنوں میں چمکتی ہو اور اس کی آنکھوں میں ہرن کی سی بے چینی نگاہیں ہوں وغیرہ وغیرہ۔

شادی کے سلسلے کی تمام باتیں گیت ہی میں طے پاتی ہیں اور تب لڑکی آکر سب کو سلام کرتی ہے اور اس کی رضامندی کا اعلان کیا جاتا ہے۔

اس قبیلہ کی شادی کا اصل طریقہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے شادی کے موقع پر دلہن کو دلہا کے گھر لے جایا جاتا ہے اور وہاں دونوں کو بالمقابل پتوں سے بنی ہوئی بڑی بڑی کھلیوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ دلہا کی بہن اور قریبی رشتہ دار کی دوشیزائیں دلہن کو تیل اور ہلدی لگاتی ہیں اور دلہن کی رشتہ دار کنواری لڑکیاں دلہا کو تیل اور ہلدی لگاتی ہیں۔ اس کے بعد دلہا دلہن کی پیشانی اور مانگ میں سیندور بھرتا ہے اور دلہن بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ پھر دونوں کے ملبوسات میں باہمی گرہ ڈالی جاتی ہے۔ تب دلہا دلہن کو گود میں اٹھا کر سات مرتبہ گھر کے اندر جاتا اور باہر آتا ہے جس وقت یہ رسم جاری رہتی ہے دلہا اور دلہن کے سروں پر سرخ کپڑے سے سایہ کیا جاتا ہے

۱—

بنگالی - امیتابھ بسو

ترجمہ :- پروفیسر کرامت علی کرامت

میں نے دیکھا ہے تجھے

میں نے تجھ کو موسمِ بارش کی پہلی صبح دیکھا ہے ہاتھوں میں خوشے دہقان کے
اور گیاہِ سبز پہ
شبنمی بوندوں کی شکلوں میں بھی دیکھا ہے تجھے
پھول کی وادی میں بھی پایا ہے تجھ کو جلوہ گر
ہاتھ میں اکتارا لے کر نغمہ زن پایا ہے تجھ کو
دشت وصحرا، باغ وبستاں ہر جگہ
موسمِ سرما کی شامِ دلنشیں میں جبکہ ہوتا ہے غروبِ آفتاب
تب تجھے دیکھا ہے میں نے کھیت میں ہاتھوں سے پکڑے چند خوشے دہقان کے
جس جگہ بہتی ہے ندی ٹیڑھی میڑھی راہ میں جذبات برانگیختہ
اس جگہ بھی تو رہا ہے جلوہ ریز
الغرض بنگال میں اور گھاٹ میں
اے حسین! تیرا ہی حسنِ جاودانی کھل گیا ہے ہر جگہ



فریب

سبطِ نبی صمیم

پرلولی میں یونہی
سگرٹوں کے دھوئیں اور چائے کے ہر گھونٹ میں
تلخیوں کو ڈبو کر ـــــ میں اکثر
حسین خواب میں گم رہا ہوں!

آج بھی پرلولی میں
وہی سبز پنکھے کی آواز
چائے کی بھاپ اور سگرٹوں کا دھواں ہے۔
مگر آج میں زندگانی کو نزدیک سے دیکھنا چاہتا ہوں!

مرے چار سو قہقہے ہیں
مگر آج اِن قہقہوں میں
خوشی کا ذرا سا بھی عنصر نہیں ہے
(غالباً اس مسرت کو محسوس کرنے کے قابل نہیں ہوں)
غمِ زیست کی جھلکیاں ہیں نمایاں!
مرے چار سُو کھوکھلے قہقہے ہیں!

ملے پرلولی کیفے

ندا فاضلی

پیٹ

وہ!
صرف پیٹ ہے
چھ فٹ کا ایک لمبا پیٹ
نہ اس کا
سر ہے!
نہ آنکھیں!
نہ ہاتھ پاؤں ہیں۔
مگر وہ زندہ ہے۔
تمہیں یقین نہ آئے تو دیکھ لو مجھ کو

موت کی نہر

پیار، نفرت، حسد، دیا، احساں
قوم، بھاشا، وطن، دھرم، ایماں
عمر! گویا چٹان ہے کوئی
جس پہ انسان کوہکن کی طرح
موت کی نہر کھودنے کے لئے۔
سیکڑوں تیشے آزماتا ہے۔
ہاتھ پاؤں سے چلائے جاتا ہے

علیم اللہ حالی

خلا

ان میں کیا ہے کہ رہیں، کچھ تو نہیں۔ کچھ بھی نہیں
ان خلاؤں میں بھلا عمر بسر کیا ہوگی۔
کتنی دور آئے ہیں کس سمت نکل آئے ہیں
ان خلاؤں میں کہیں کوئی ٹھکانہ بھی نہیں
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں۔
نہ کوئی سنگ نشاں ہے نہ کوئی نقش قدم
کوئی اندازۂ منزل ہے، نہ جادہ کوئی
ان میں کیا ہے کہ رہیں، کچھ تو نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

وہ تمنا بھی نہیں دل میں جو حسرت بن جائے
وہ حقیقت بھی نہیں جس کو فسانہ کہہ دیں
ایک ناکام سی کوشش ہی سہی کچھ بھی سہی
ایک خواہش جسے تسکین کی حسرت رہ جائے
اک طلب ایسی جو تکمیل سے سرشار نہ ہو
خواب جو خواب میں بھی تشنۂ تعبیر رہے
ایسی وحشت ہی کہ دور اور بیاباں ہو جائے
تشنگی ایسی کہ تسکین گریزاں ہو جائے
ان خلاؤں میں مگر کیا ہے۔ یہاں کچھ بھی نہیں
ان خلاؤں میں بھلا عمر بسر کیا ہوگی

رونق دکنی سیمابی



دل کے فانوس میں یادیں جو سلگ اٹھتی ہیں
اپنے دامن میں کثافت لئے اٹھتا ہے دھواں
ہوک سی اٹھتی ہے، پلکوں میں نمی آتی ہے
دھندلا دھندلا سا عیاں ہوتا ہے ایوانِ حیات
بام و در جس کے دلاتے ہیں یقین احساس

میرا بچپن، مری معصوم تمنائیں بھی
وقت کا لے کے سہارا یہیں پروان چڑھیں
تھام کے انگلی کسی کی یہیں چلنا سیکھا
چل کے پگ پگ یہیں گر گر کے سنبھلنا سیکھا
پھول آغازِ جوانی کے یہیں مہکے ہیں
عقل اور ہوش کے ساغر بھی یہیں چھلکے ہیں
فہم و ادراک نے، بازو نے تدبر تھاما
علم کی ضو نے اندھیروں میں جلائی مشعل

چل پڑا تھا سوئے منزل میں بصد عزم و یقیں
اُف! شرانگیز زمانے سے یہ دیکھا نہ گیا
میری راہوں میں بچھائے گئے کانٹے کیا کیا
ہر قدم پر مجھے پتھر کے دیئے پسپائی نے
ہوئیں ناکردہ گناہوں کی سزائیں تجویز
غیر تو غیر تھے اپنے بھی بنے بیگانے
چھپ اندھیروں میں تمنا کا افق ڈوب گیا

ٹیس اٹھتی ہے کہیں، درد کہیں ہوتا ہے ❖ اب تو ذہنوں میں بھی احساس یقیں ہوتا ہے

وفا ملک پوری

مراجعت

(۱)

یاد ہے آج بھی اک موسمِ سرما کی وہ رات
تم تھیں اور میں تھا، جوانی تھی کوئی اور نہ تھا
تپتی باہیں تھیں سلگتے ہوئے رخسارے تھے
حسن کے شعلے، دہکتے ہوئے انگارے تھے
عشق اس آگ کی قربت سے جلا جاتا تھا
رات تھی سرد، مگر جسم پھُکا جاتا تھا

(۲)

پھر مجھے لے گئیں تم اجنبی راہوں کی طرف
جن میں ہر گام پہ ملتے تھے نشیب اور فراز
میں تمہارے ہی اشارے پہ چلا جاتا تھا
جیسے گم گشتہ، تھکا ماندہ، مسافر کوئی
تپتے صحراؤں میں بے چین ہو سائے کے لئے

(۳)

اور ہم پہنچے جب اک وادیٔ تاریک کے پاس
دور محسوس کیا ایک اجالا میں نے
اپنے جذبات کے طوفاں کو سنبھالا میں نے
تھی جو آمادہ ہوس آگ بجھانے کے لئے
خود کو اس آگ کے شعلوں سے نکالا میں نے
میں نے ناموسِ محبت کو بچانے کے لئے
اپنی ہر خواہشِ بے باک کو پامال کیا
میں نے دوشیزگیٔ حسن کی قیمت سمجھی
اور کچھ آبروئے عشق بڑھائی میں نے

(۴)

حیف اس سوزِ محبت کو نہ سمجھا کوئی
کر سکا درد کا میرے نہ مداوا کوئی

(۵)

میں جو پیاسا تھا زمانے سے وہ پیاسا ہی رہا
کون جانے یہ مری پیاس بجھے گی کہ نہیں؟

حیدر نایاب

۱۹۹۹ء : ایک خواب!

(۱)

تحریکِ قلب وقت کرشمہ دکھا گئی
تکمیلِ آرزوئے بشر مسکرا گئی
تنویرِ صبحِ شوق زمانے پہ چھا گئی
تجدیدِ نو بہار گلستاں کو بھا گئی
ہر رنگ عصر روش کو نیا بانکپن ملا
اہلِ چمن کو حُسنِ فروغِ چمن ملا

(۲)

اِک ایک کر کے آتے گئے کتنے انقلاب
اِک ایک کر کے کھُل گئے آزادیوں کے باب
سلمائے روزگار پہ آیا نیا شباب
کہنہ روایتوں کو ملا اور ہی جواب
اربابِ جور خستہ تن و خستہ جاں ہوئے
محکوم جو تھے از سرِ نو حکمراں ہوئے

(۳)

ایٹم نے وہ دکھائے زمانے کو راستے
بازیگرانِ وقت کے دل کانپنے لگے
ذرّوں کے ٹوٹنے سے وہ شعلے بھڑک اٹھے
آثارِ حشر آئے نگاہوں کے سامنے
دنیا پہ رازِ عظمتِ ادراک کھل گیا
سارا غبار رخ سے زمانے کے دھل گیا

(۴)

جنگ و جدل کی راہ سے ٹلنے لگا بشر
امن و اماں کے سانچے میں ڈھلنے لگا بشر
ایوانِ تیرگی سے نکلنے لگا بشر
اپنا لباسِ کہنہ بدلنے لگا بشر
ہیں منزلیں اب اور ہی فکر و نگاہ کی
علم الیقیں نے پائی جگہ اشتباہ کی

(۵)

نوعِ بشر پہ کھل گئے شانِ بشر کے باب
چھوٹے بڑے ہیں کچھ نہ رہا فرق و اجتناب
باطل نے چہرہ اپنا چھپایا تہہِ نقاب
طالع ہوا زمیں کی خوشیوں کا آفتاب
دنیا میں پھیلنے لگا پھر امن کا پیام
احباب مل کے پینے لگے دوستی کا جام

(۶)

لمحاتِ نو دمیدہ کا پرچم ہوا بلند
حکمت شعار و لوگ بھرنے لگے زقند
ڈالی زمیں نے مہ و مریخ پر کمند
صد نازِ تاج و تخت ہے جمہور کی پسند
عالم فروز خوابوں نے تعبیر پائی ہے
خوش ہو کے زندگی کی جبیں جگمگائی ہے

(۷)

ہر سمت جلوہ گر ہیں شمات فکر و فن
عقلِ سلیم و ذہنِ جواں پر ہے بانکپن
مٹنے لگی ہے چادرِ گیتی کی ہر شکن
نازاں ہے آب و گل کی فسوں سازِ انجمن
فانوسِ آگہی میں ہیں روشن نئے چراغ
دل ہے سحر طرازِ اجالوں کا باغ باغ

(۸)

بہنے لگا ہے فکر کے دھاروں پہ آدمی
پہنچا ہے دو جہاں کے کناروں پہ آدمی
جلوہ فگن ہے چاند کے غاروں پہ آدمی
ڈیرے لگا رہا ہے ستاروں پہ آدمی
سمٹی ہوئی ہیں لمحوں میں صدیوں کی ممکنات
مٹھی میں آدمی کی مقید ہے کائنات

(۹)

سارے جہاں کے لوگ ہیں آپس میں بھائی بھائی — مذہب جدا جدا ہیں، اصولوں میں ہے اکائی
ملکوں کے درمیاں کبھی ہوتی نہیں لڑائی — ہر فرد کی کمائی ہے، کل قوم کی کمائی

آسودۂ حیات ہر انساں ہے دوستو!
ہر صبح، نازِ محفلِ امکاں ہے دوستو!

جی-ایم-راہی-فتح پوری

کاشانۂ نیاز فتحپوری

یہ شکستہ مسکنِ ویراں جو ہے پیشِ نظر
جس کے ذرّے نوحہ خواں ہیں، جس کا منظر دل شکن
اس صدف کے دل میں پنہاں گوہرِ نایاب تھا
اس کے ہر ذرّے میں ہے کیفیّتِ سوز و گداز
مخزنِ فہم و فراست، وہ نیازِ ذی شعور
عالم و ناقد، مفکّر، دوربین و نکتہ رس
وہ معلّم، وہ مدرّس، وہ محقق ذی وقار
لفظ و معنی کا مرصّع ساز کہیئے وہ نیاز
جس کی رفتارِ قلم تھی موجۂ بادِ صبا
تشنگیٔ ذوقِ نظّارہ تھی جس کی بے پناہ
جس کا ہر تارِ نفس کچھ اس طرح بے چین تھا
عقل جس کی رازدانِ عالمِ اسباب تھی
جس کی عظمت پہ نہ کوئی حرف آیا وہ نیاز
گلشنِ علم و ادب کا ناخزاں دیدہ گلاب
بارہا پھینکی تھی جس نے چاند تاروں پر کمند
وہ نیازِ نکتہ سنج و فلسفی، شوریدہ سر

دل تڑپ جاتا ہے جس کی خستہ حالی دیکھ کر
اس پہ قرباں تھی کبھی تاروں کی روشن انجمن
یہ گلستانِ ادب شاداب ہی شاداب تھا
جس سے ظاہر ہو رہی ہے سربلندیٔ نیاز
جس کی تصنیفات روشن ہیں مثالِ کوہِ نور
کاروانِ فکر کی راہوں میں آوازِ جرس
جس کے اسلوبِ نگارش سے سنورتا تھا نگار
علم و فن میں صاحبِ اعجاز کہیئے وہ نیاز
جو بذاتِ خود بس تحریر تھا جلوہ نما
جس کے افکارِ درخشاں پر تھے قرباں مہر و ماہ
کشمکش ہی زندگی کا جیسے نصب العین تھا
جس کی فطرت غالباً کیفیتِ سیماب تھی
اک مکمل دور ساتھ اپنے جو لایا وہ نیاز
رنگ و نکہت کا مرقّع، شاعرِ عہدِ شباب
جس نے پائی تھی ازل سے فطرتِ مشکل پسند
جس کی شرحِ آرزو کرتی تھی ذہنوں پر اثر

چُپ ہوا ہے جب سے راہی عندلیبِ نغمہ زن
محفلِ علم و ادب ہے اک خزاں دیدہ چمن

ظہیر اللہ نور

نوخیز نازک کلی

سرمئی شام، صحنِ چمن، مہکی مہکی فضا
مجز سکوں آفریں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
کوئی بھی ساتھ میرے نہ تھا

دفعتہً سامنے میرے اِک شاخ پر
سرسراہٹ ہوئی
ایک ننھی سی نوخیز نازک کلی
دیکھتے دیکھتے کھل پڑی
میرے خوابوں خیالوں کی نیلم پری
اس کلی سے نکل کر بہکنے لگی
میرا حساس دل کانپ اٹھا، ڈر گیا
وہ نظر کے تصادم سے بل کھا گئی
دیکھتا کیا ہوں اب ایک ناگن تھی وہ
کہکشاں کی طرح
شادماں، شادماں

پیار کی میٹھی میٹھی کسک میں نے محسوس کی
اب میں مسحور تھا
نشۂ جذبِ الفت سے مخمور تھا

دور سے اِک سپیرے نے آواز دی
اور وہ چل پڑی
رات دامن میں ظلمت لئے آگئی
پھول کمہلا گئے، شاخ مرجھا گئی
رُک گئی تھی ہوا۔ اور زہرآب تھی سونی سونی فضا

چند لمحوں میں اک عمر کا رکا رواں
ایسا گزرا، رہا کچھ نہ اُس کا نشاں
اور اب کچھ عجب حال ہے
جب کہیں کوئی نوخیز نازک کلی
میری نظروں کے آگے کھِلی
ڈوب جاتا ہے دل
کانپ جاتا ہوں میں

پروفیسر لطف الرحمٰن

وہ گھڑی کبھی نہ آئے

تری زندگی میں ہمدم وہ گھڑی کبھی نہ آئے
وہ گھڑی جو آرزوؤں کے لہو کا جام مانگے
وہ گھڑی کہ فصلِ گل کا جو لباس چاک کردے
جو کلی کلی کے دل کو غمِ بے بسی سے بھر دے

اسی فصلِ بے اماں میں کہ جو سو گئے ہوں سائے
تو خموشیوں کے سینے سے صدائے درد آئے
کسی رات کوئی پاگل جو خزاں کے گیت گائے
تری نیند ٹوٹ جائے، کوئی یاد جاگ جائے
تجھے آکے جو ستائے
یہ خدا کرے کہ تجھ پر وہ گھڑی کبھی نہ آئے
وہ گھڑی کبھی نہ آئے
وہ گھڑی کبھی نہ آئے



بدیع الزّماں خاور

تضاد

توڑ کر جب حسین چراغوں کو
چاند تاروں کی آس کرتا ہے
صبح کے بعد، اس کی دنیا میں
صرف اماوس کی رات آتی ہے
چھیڑ کرتی ہے تیرگی اُس سے
دُور رہتی ہے روشنی اُس سے

ساعتِ عیش چاہتا ہے، مگر
اکثر اوقات اپنے لمحوں کو
آدمی خود اُداس کرتا ہے!!

ھم ناتھ دت قاصر

غزل

مظلوم کے دکھ سے نہیں ترسندہ ترا شہر
پھر عالم ہستی میں ہے کیوں زندہ ترا شہر

اے کاش یہاں بوئے وفا بھی کہیں ملتی
مانا کہ ہے جنت کا نمائندہ ترا شہر

دولت کے پرستاروں پہ نازاں تری گلیاں
آمد سے فقیروں کی ہے شرمندہ ترا شہر

تو حسن سراپا ہے، تو مہتاب زمیں پر
تیری ہی تجلی سے ہے تابندہ ترا شہر

جو چاہتا ہے بخت سے مل جاتا ہے اس کو
جوئندہ ترا شہر ہے، یابندہ ترا شہر

دنیا میں ٹھکانا ہے یہی اہل نظر کا
دائم رہے کوچہ ترا، پائندہ ترا شہر

روداد وفا تھا دل قاصر کا فسانہ
لیکن نہیں اس قصے کا شنوندہ ترا شہر

(قافیہ کی زیر کو زبر سے بدل کر)

تو مامن و ماوا ہے زمین اور زماں کا
اب جائے کہاں چھوڑ کے یہ بندہ ترا شہر

قبضہ ہے دلوں پر ترا، آنکھوں پہ تسلط
دائم ترے آگے ہے سرافگندہ ترا شہر

جمعیت خاطر ہے یہاں اہل نظر کی
اللہ کرے ہو نہ پراگندہ ترا شہر

مخمور سعیدی

غزل

دن تو سو طرح کی باتوں میں گزر جاتا ہے
شام ہوتی ہے تو دل، اور بھی گھبراتا ہے

اب بھی اک رنگ سا احساس میں گھل جاتا ہے
جب تری گلبدنی کا کبھی دھیان آتا ہے

کوئی جھونکا کسی خوشبو کا جو آ جاتا ہے
مدتوں دشت خیالات کو مہکاتا ہے

کس کا سایہ ہے جو اس غمکدۂ ویراں میں
پرسش غم کو مری، روز چلا آتا ہے

وہم ہے اپنے ہی دل کا، کہ تصور تیرا
واقعی بیکسی عشق کو بہلاتا ہے؟

اشک آنکھوں سے برس جائیں، تو شاید کھل جائے
غم کا بادل ــ افق جاں پہ جو منڈلاتا ہے

مطمئن ہوں غم حالات کے باوصف، ہنوز
کوئی جیسے مرے حالات کا غم کھاتا ہے

کب رہا ہوں میں غم دل کے سفر میں تنہا
اک تصور ہے، جو ہمراہ لئے جاتا ہے

تو نہیں ہے تو ترے غم کے سہارے جی لوں
خلوتوں میں کوئی جیسے مجھے سمجھاتا ہے

دل میں ہلکی سی بھی آہٹ نہیں ہونے پاتی
غم کچھ اس طرح دبے پاؤں چلا آتا ہے

کیا کہا؟ کوئی نہیں! کوئی تو ہوگا مخمور
اس اندھیرے میں تمہیں راہ جو دکھلاتا ہے

نازشؔ پرتاپگڈھی

غزل

زخم کو میں نے سدا پھول کہا ہے یارو
یہ سیاست ہے کہ جینے کی ادا ہے یارو

کس جگہ قافلۂ زیست رکا ہے یارو
آدمی میرؔ کا دیوان بنا ہے یارو

زیست ہے فرض، جئے جاتے ہیں ہم لوگ مگر
زندگی ہے کہ یہ جینے کی سزا ہے یارو

ہم میں واقف ہو جو کوئی تو کرے ذکرِ خلوص
میں نے یہ لفظ کتابوں میں پڑھا ہے یارو

دوستی یوں تو بڑی چیز ہے دنیا میں مگر
دوست کے نام سے جی ڈر سا گیا ہے یارو

صرف ماحول و زمانہ ہی پر الزام نہیں
عشق کو ہم نے بھی مایوس کیا ہے یارو

اک ہمارے ہی زمانے میں ہوا قحطِ رجال
ورنہ ہر دور کو منصور ملا ہے یارو

کوئی اتنا بھی نہیں ہے کہ جو محسوس کرے
قافلہ الٹے قدم لوٹ رہا ہے یارو

ورنہ ہوتے کہیں نزدیک ہی وہ جانِ حیات
دل دھڑکنے کی ادا بھول رہا ہے یارو

اپنی دھرتی ہی بھلی، جس پہ نہیں کوئی کمی
آسمانوں پہ تو صرف ایک خدا ہے یارو

لطف یہ ہم سے الجھنے کی اجازت ہے مگر
سوچتا ہوں یہ جزا ہے کہ سزا ہے یارو

زندگی کے یہ کڑے کوس حقائق کی یہ دھوپ
شاعری سایۂ دیوار نما ہے یارو

ہم نے دل کے کئی زخموں کو کریدا تا دیر
جب کہیں جا کے کوئی شعر لکھا ہے یارو

لفظ و معنی کی یہ توہین کہ نازشؔ ہم نے
دشمنوں کو بھی لکھا اور کہا ہے "یارو"

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے ÷ درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

مہدی پرتاپگڈھی

غزل

دل کا ہر زخم نیا داغ بنا ہے یارو
پھر بھی تم سے مجھے امیدِ وفا ہے یارو

یہ حقیقت تو بہاروں کو بھی معلوم نہیں
انگنت غنچوں کا دل خون ہوا ہے یارو

مسکراؤ نہ مری چاک گریبانی پر
یہی اس دور میں جینے کی سزا ہے یارو

کوہکن ہے نہ کہیں حسنِ جمالِ تیشہ
قافلہ وقت کا کس جا پہ رکا ہے یارو

دل ملے ہیں تو کسی تاج کی بنیاد پڑی
دل جو ٹوٹے ہیں تو افسانہ بنا ہے یارو

اک ذرا حرارتِ رندانہ تو دیکھو میری
میں نے جینے کے لئے زہر پیا ہے یارو

وہ کشاکش ہے کہ ہر سانس ہو جیسے نشتر
وہ خموشی ہے کہ دم گھٹنے لگا ہے یارو

اتنے مایوس ہو کیوں وقت کے انداز سے تم
خون ٹپکا ہے تو پھر نغمہ بھی گیا ہے یارو

اپنا مہدی تو نہیں ہے ذرا دیکھو بڑھ کر
دار پہ وقت کا منصور کھڑا ہے یارو

شاہد ماہلی

غزل

یارو سنگ نہ اٹھے ہر اک بام و در کہیں
بجلی گری ہے، خرمنِ احساس پہ کہیں

ٹکرا کے دل میں رہ گئی آوازِ بازگشت
نالے نہ ہو گئے ہوں مرے بے اثر کہیں

لے کر کدھر کو جائیں امیدوں کا کارواں
ملتی نہیں ہے دور تلک رہگزر کہیں

جذبات ہو سکی ہیں نہ یارو کبھی اسیر
روکے سے رک سکی ہے نہ فکر و نظر کہیں

پوچھا کئے ہیں ہر در و دیوار سے پتہ
اب تک ترا سراغ نہ پایا مگر کہیں

یوں تو ہزار رنگ میں گذرے ہیں گلبدن
لیکن ٹھہر سکی نہ ہماری نظر کہیں

بھٹکے ہیں لے کے دوش پہ تنہائیوں کا بوجھ
لینے نہ دے گا چین مذاقِ سفر کہیں

شاہد گذر ہی جائے گی یہ شامِ سوگوار
کچھ ایسی ہی اداس نہ نکلے سحر کہیں

حسن زیدی

غزل

...ں جفا کی ہم کو جفا راس آگئی
...ب وہوائے شہرِ وفا راس آگئی

...وہ کہ آج ہم بھی شہیدِ وفا ہوئے
...ب دوست کی ہمیں بھی جفا راس آگئی

...ھے تھے لوگ عشق پیامِ قضا بھی ہے
...وں ہی سہی ہمیں یہ قضا راس آگئی

...زندگی کی دھوپ بھی پرتو بہار کا
...ب تیرے گیسوؤں کی گھٹا راس آگئی

...ں خرد کے کام نہ آیا ثباتِ راہ
...ں جنوں کو لغزشِ پا راس آگئی

...سن پھر اُس کو منع ہو لے چمن سے کیا
...ں کو ہوائے دشتِ بلا راس آگئی

عنوان چشتی

غزل

روح میں خوشبو لہراتی ہے، دل پہ رنگ برستا ہے
جب کوئی انجان سا چہرہ آنکھوں میں آ کر بستا ہے

ایک برس اس شہر میں لوگو، زہر پیو یا تشنہ رہو
امرت پی کر جو آتا ہے ناگ وہ بن کر ڈستا ہے

میری آنکھوں کی جھیلوں کی ویرانی پر دھیان نہ دو
غم کا بادل وہ بادل ہے، کھل کر بھی جو برستا ہے

اپنے خوابوں کا آئینہ دیکھ کے شرما جاتا ہوں
جیسے کوئی دور سے میری حسرتِ دل پر ہنستا ہے

صحرا صحرا پیاس مری لہراتی ہے شعلہ بن کر
ساگر ساگر اُن کے کرم کا بادل خوب برستا ہے

ماہ وشوں کے چہروں کا اک بہتا دریا ہے کہ نہیں
چشتی صاحب شہرِ دلی، دیدہ و دل میں بستا ہے

سید محسن نقوی

غزل

نکہتِ زلف بنوں، رنگِ وفا ہو جاؤں
کوئے احساس میں جاؤں تو صبا ہو جاؤں

جاگتے دن میں سلگتی نظر آئے جو حیات
بھیگتی رات کی برفیلی ردا ہو جاؤں

اشک، تنویرِ گریبانِ سحر ہے جب سے
زخم، کہتا ہے ترا رنگِ قبا ہو جاؤں

"قصرِ شیریں" میں رہوں بن کے خموشی کا مزار
"شہرِ فرہاد" میں تیشے کی صدا ہو جاؤں

کنجِ زندانِ عناصر میں ہوں انساں کا جمال
اس حسیں قید سے نکلوں تو خدا ہو جاؤں

میں بھی پلکوں پہ جلالوں غمِ ہستی کے چراغ
میں بھی منجملۂ اربابِ وفا ہو جاؤں

اپنے احباب نے بخشے ہیں مجھے پھول سے زخم
اپنے احباب سے کس طرح خفا ہو جاؤں

اس کے دل میں بھی اتر جاؤں غزل کی صورت
ٹوٹتے ساز کی پُر درد نوا ہو جاؤں

یوں کوئی جرم کروں تجھ کو بھی پیار آجائے
یوں گنہگار بنوں تیری رضا ہو جاؤں

اس کے کوچے سے گزرنے کے لئے اے محسن
بارہا میں نے یہ سوچا ہے "صبا" ہو جاؤں

ڈاکٹر حمید شاہین

غزل

فرما رہے ہیں "غم ہے ہمیں روزگار کا"
منہ تک رہے ہیں گردشِ لیل و نہار کا

رِسنے لگا ہے خونِ گلِ داغدار سے
شاید سلگ رہا ہے نشیمن بہار کا

یارو سبک خرامیِ رہبر کے ساتھ ساتھ
نقشہ بدل نہ جائے کہیں رہگزار کا

دیکھا ہے ہم نے بادۂ احمر کا استعمال
اک عکسِ ناتمام ہے تیرے خمار کا

ہے زلفِ نارسا بھی شریکِ شبِ فراق
پہلو نظر نے ڈھونڈھ نکالا قرار کا

شاہین ممکنات کی حد سے بعید ہے
پابندِ انقلاب نہ ہونا بہار کا



قبال منہاس

غزل

...یرانیوں میں دل کی تجھے ڈھونڈتا ہوا
...لکوں پہ آ رکا ہے ستاروں کا قافلہ

...اس طرح صبا سے کہی تیری داستاں
...ر پھول مسکرا کے مجھے دیکھنے لگا

...کو گماں ہوا کہ یہ تیری گلی نہ ہو
...رزوں نے جس جگہ مرا دامن پکڑ لیا

...و کہیں سے ڈھونڈ کے یادوں کی روشنی
...یک ہو گیا ہے محبت کا راستہ

...ھو کہ منزلوں کا اجالا ہے منتظر
...ب سے رواں ہے رات کے جنگل میں یہ صدا

...سے کوئی چراغ اندھیرے میں جل اٹھے
...کے قریب آکے کوئی یوں ٹھہر گیا

...ں نے بڑے خلوص سے ٹھکرا دیا مجھے
...سال سوچتا ہوں کہ وہ شخص کون تھا

ثریا محمود ندرت

غزل

محبت راز یہ سمجھا گئی ہے
حقیقت بھی فریب آگہی ہے

ہر اک شمع تمنا بجھ چکی ہے
مگر حد نظر تک روشنی ہے

جنوں تو خیر کیا جانے سنورنا
خرد کی زلف بھی الجھی ہوئی ہے

نہ جانے کس سے سیکھا ہے یہ انداز
جگا کر مجھ کو دنیا سو گئی ہے

سر منزل پہنچ کر دھیان آیا
یہ بھی اک قسم کی گم کردگی ہے

انہیں بھی کھینچ لائی خلوت شوق
کمی ہے کچھ تو اب اپنی کمی ہے

محبت کی ہے فطرت ہی انوکھی
یہ ساحل پر بھی طوفاں چاہتی ہے

خوشا بخشش کہ دل کی ہر تمنا
تمہارے غم کے سایہ میں پلی ہے

نگاہ شوق کو کیا ہو گیا ہے
انہیں پا کر بھی ان کو ڈھونڈتی ہے

نہیں معلوم کس منزل کی جانب
محبت مجھ کو لے کر چل پڑی ہے

نہ کوئی مرحلہ نہ رات نہ منزل
کہاں دنیا بھٹک کر آ گئی ہے

حبابؔ ہاشمی فتحپوری

غزل

چلا ہوں پھر مکان و لامکاں سے کھیلتا ہوا
شبِ سیہ میں نجم و کہکشاں سے کھیلتا ہوا

شبِ فراق میں تری فغاں تو خود شریک ہے
شبِ فراق کاٹ دے فغاں سے کھیلتا ہوا

نکال دی اسی نے جوئے شیر سنگلاخ میں
گذر گیا جو تیشۂ گراں سے کھیلتا ہوا

مصائبِ جہاں نہیں ہیں کچھ بھی اس کے واسطے
جو چل پڑا مصائبِ جہاں سے کھیلتا ہوا

ابھی نہ روک لے ندیم اپنے پائے عزم کو
گذر بھی جا تو عرصۂ جہاں سے کھیلتا ہوا

شہید وہ ہے جو لہو سے گلستاں کو سینچ دے
جو مسکرائے خنجر و سناں سے کھیلتا ہوا

حبابؔ تیری زندگی تو کس قدر ہے مختصر
چلا ہے پھر بھی موجۂ رواں سے کھیلتا ہوا

محبوب انور

غزل

مئے نشاط میں ڈوبی ہوئی بہار چلے
نسیمِ صبح کے لہجے میں ذکرِ یار چلے

میں آگیا ہوں پئے غم تمہاری محفل پر
کچھ اور دیر ذرا جامِ خوشگوار چلے

بکھر گئے تھے جو سجدے تمہاری ٹھوکر سے
اُٹھا کے ان کو جبینوں میں دلفگار چلے

کسی کی یاد کی بارش سے بھیگتا ہے بدن
کہو اِدھر سے نہ غمہائے روزگار چلے

ضیائے ماہ سے ہوتی نہیں سحر پیدا
اندھیری رات کا بہتر ہے کاروبار چلے

جنوں کی آنچ سے صحرا دہک رہا ہے ہنوز
کہو یہ انورِ خستہ سے اشکبار چلے

اوج اعظمی

غزل

(حضرت فراق گورکھپوری سے معذرت کیساتھ)

لاکھ پردے میں رہا کیجئے گا
نگہ شوق کو کیا کیجئے گا

حق خودی کا نہ ادا کیجئے گا
خود کو جبتک نہ خدا کیجئے گا

پیچ و خم راہ وفا میں ہیں بہت
ذرا بچ بچ کے چلا کیجئے گا

اپنا ثانی نظر آئے نہ اگر
آئینہ دیکھ لیا کیجئے گا

یہ ادا اور یہ انداز خرام
کیا کوئی حشر بپا کیجئے گا

ہیں ہمیں راز غم دل کے امیں
اپنا غم ہم کو عطا کیجئے گا

آپ جب غیر سمجھتے ہیں مجھے
پھر کسے اپنا کہا کیجئے گا

گرد دامن نہ بنانا ہو اگر
مجھ کو خاک کف پا کیجئے گا

چھوڑیئے مجھ کو طبیب مشفق
کیا دوا اور دعا کیجئے گا

کھو کے دل کو مرے ہاتھوں سے حضور
عمر بھر ہاتھ ملا کیجئے گا

طبع نازک پہ گذرتا ہے گراں
نالہ کو نغمہ نما کیجئے گا

ہم فنا ہو کے بھی ہونگے نہ فنا
آپ کس طرح فنا کیجئے گا

اوج ہر جور و جفا کے بدلے
آپ بس مہر و وفا کیجئے گا

سید شکیل دسنوی

غزل

آؤ کیوں یوں بیٹھے ہو تم بہ چشم نم تنہا
کب کسی سے کٹتا ہے زندگی کا غم تنہا

اب تو جیسے دل اپنا اجڑا سا شوالہ ہے
رہ گئے ہیں یادوں کے اس میں کچھ صنم تنہا

اس قدر پریشان ہے گردش زمانہ کیوں
مجھ کو ویسے کافی ہے آپ کا کرم تنہا

ڈھونڈیئے تو یادیں بھی دور تک نہیں ملتیں
اس قدر کوئی ہوگا اس جہاں میں کم تنہا

کتنے ٹکڑے خوابوں کے آس پاس بکھرے ہیں
دیکھتے ہیں اک اک کو ہم بہ چشم نم تنہا

شہر دل کی گلیوں میں اب تو خاک اڑتی ہے
دستکیں ہر اک در پر دے رہا ہے غم تنہا

بچھڑیں سب امیدیں بھی جاں بلب ارادے بھی
غم کے تپتے صحرا میں چل رہے ہیں ہم تنہا

بیسؔ الہ آبادی

غزل

ساقی ہے، مئے ناب ہے، موسم بھی نیا ہے
سب کچھ ہے مگر تلخیٔ غم حد سے سوا ہے

ٹھوکر سے بھی پیدا نہیں ہوتی کوئی جھنکار
جو ساز ہے اس بزم میں بے صوت و صدا ہے

یہ جشنِ چراغاں ہے، کہ ہے سیلِ سیاہی
جلتے ہیں چراغ اتنی ہی تاریک فضا ہے

کیا جانیں کہاں قافلہ جا کر یہ رُکے گا
رستے کا ہے کچھ علم نہ منزل کا پتا ہے

کیا حال بتا سکتا ہے دنیا کا وہ بیسؔ
دُنیا میں جو رہتے ہوئے دنیا سے جدا ہے

جوگندر پال



میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ساحرہ کی تصویر مکمل کر کے ہی دم لوں گا۔

وہ میرے سامنے قالین پر بیٹھی تھی، اس قدر زندہ جیسے اس کے بدن میں سانسوں کا ذخیرہ ابد تک ختم نہ ہوگا اور یکسر ساکن، گویا ایک جامع تصویر۔ اور میں اس کی پینٹنگ تیار کر رہا تھا۔ اپنے محسوسات کو برش میں اٹھا کر انہیں کئی رنگوں میں بھگو بھگو کر کینوس میں بھر رہا تھا۔

ساحرہ ذرا سی ہلی تو میری پیٹھ پر بے شمار آنکھوں میں بیٹھی ہوئی اس کی شبیہہ بھی ہل ہل گئی۔ میرے برش کے ملائم بالوں میں بھیگا بھیگا رنگ والا تصور فرش پر گر کر ضائع ہو گیا اور میں منہ موڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

اور وہ ہنسنے لگی۔

اور میری جھلاہٹ بیچاری بھی اس کی ہنسی سے رام ہو کر ہنس پڑی۔

اور میں سوچنے لگا۔ اے کاش تخلیق کے کسی انجانے معجزے سے میں یہ من موہنی ہنسی بلا سوچے سمجھے جھٹ پٹ کینوس پر اتار سکوں، جھٹ پٹ، جیسے ساحرہ بلا سوچے سمجھے اتنے بھلے انداز میں ہنس پڑی ہے۔ پر کیسے، مجھے تو ہر رنگ کو تیار کرنے سے پہلے برش کی ہر جنبش سے پہلے گھنٹوں سوچنا پڑتا ہے، ہر تاثر کی تکمیل کے لئے پسینہ بہانا پڑتا ہے۔

ساحرہ پھر اپنے پوز میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی گاڑھی ہنسی نے مسکان میں سمٹ کر اب ایک ہلکے ہلکے بے نام سے رنگ کا دوپٹہ اوڑھ لیا تھا، کچھ گلابی، کچھ سفید، کچھ پیلا اور کچھ ــــــ نہ جانے اس رنگ کا کیا نام تھا۔

پل پل بدلتے ہوئے رنگوں کے یہ امر، کسی سوچے سمجھے فنی پلان کے بغیر یہ بھرپور، تاثر، ہر لمحہ کسی نئے رنگ کا یہ زندہ سحر، یہ میری محبوب ساحرہ، یہ شبیہہ! یا اللہ تو کتنا عظیم فن کار ہے! تیری ہر تصویر کو ہر لحظہ ہر رنگ پر پوری قدرت ہے۔ اے لافانی تخلیق کار، تو صرف اسی لئے خاموش ہے کہ تو نے اپنا سارا زور بیان اپنی اپنی تخلیق کو سونپ دیا ہے، کچھ اس طرح سونپ دیا ہے کہ وہ از خود بولتی ہے۔ اے خالق، اے فن کار، میرا اسلام!۔

"رک کیوں گئے؟" مجھے ساحرہ کی آواز سنائی دی۔

اور میں نے اس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ لی۔

"میری طرف دیکھ کیا رہے ہو؟" مسکان گاڑھی ہو رہی تھی "ادھر اپنی تصویر کی طرف دیکھو۔"

لیکن میں اس کی جانب تکتا رہا۔

ساحرہ مجھے انتہائی عزیز تھی، میری خواہش تھی کہ اپنی

تصویر میں شگفتگیِ گل کا یہ سماں دائمی کر دوں اور کئی برس بعد میرے اس جواں سال تصور کی بدولت ہر سال نظریں سبھی شباب کا تماشہ کرتی رہیں ۔ اور فنا کے بعد میری روح جہاں بھی جائے یہ پُر بہار تصور اپنے ساتھ لے جائے۔

ساحرہ مجھے محبوب ترین تھی اور اس تصویر میں، میں اپنی ساری محبت سارا شعور جذب کر دینا چاہتا تھا۔

"پھر رک گئے ؟"

میں نے اپنا برش اٹھا کر تصویر کی طرف نگاہ کی اور اس کا جائزہ لے کر مجھے اطمینان نہ ہوا ۔ ساحرہ کے چہرے کی شباہت تو نمایاں تھی، مگر ساحرہ کا باطن، اس کا نمایاں حسن درون میری ساحرہ ابھی تک تصویر میں ظاہر نہ ہو پائی تھی ۔ میں نے ساحرہ کی آنکھوں کا تصور کر کے تصویر کی آنکھوں میں جھانکا اور بے بسی سے نادیر انگلیوں میں برش لئے رکا رہا۔ رک رک کر اس کی نظر کے نواح کے خوابناک، نم آلودہ، چھلکاؤ جلنے بنتا رہا۔

"لطیف ؟"

میں اپنے کام میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ جس وجود کے نقوش بنا رہا تھا۔ اسی کی موجودگی سے غافل تھا۔

"او بابا ـــ لطیف ؟"

"ہاں ـــ ں ! ؟"

"چھوڑو یہ تصویر۔" وہ پشیمانی ہوئی سی نظر آتی تھی "ادھر میری طرف دیکھو۔"

"ساری عمر تمہارا یہی روپ دیکھنے کے لئے تو یہ تصویر اتار رہا ہوں ۔ اب بھی ـــ بوڑھا ہو کر ـــ مر کر بھی ـــ"

"نہیں" وہ اپنے پوز سے نکل آئی، تو اس کا نیا پوز دو گنا معلوم ہونے لگا "بڑھاپے میں میرا بوڑھا چہرہ ہی زیادہ اچھا لگے گا اور جب ہم مر جائیں گے، تو ہماری روحیں بے نام ہو کر بے شکل ہو کر ہی زیادہ اچھی لگیں گی۔

"بہت اچھا، میری خوبرو فلسفی" میں نے تصویر کی طرف متوجہ ہونا چاہا ـــ اب تم پھر اپنے پوز میں فٹ ہو جاؤ۔

"نہیں، پہلے میری بات سنو"

"سناؤ" میں نے سوچا کہ ایک ہی طرح بیٹھی بیٹھی بے چاری تھک گئی ہو گی۔

"تم کھڑے کھڑے پہاڑوں کی، آسمانوں کی، صرف جامد نظاروں کی تصویریں بنایا کرو ۔ انسان بھی کوئی تصویر بنانے کی شے ہے ؟ جو شے تغیر پذیر ہو۔ اس کی تصویر کا کیا بنانا ـــ؟"

"نہیں ساحرہ" میں نے اسے بتایا "جامد شے تو خود ہمیشہ ایک ہی حالت میں کھڑی رہتی ہے ۔ اس کے بنانے، نہ بنانے سے کیا ہوتا ہے ؟ میرے نزدیک آرٹ کا یہی کمال ہے کہ زندگی کی ہر ہیئت کو اس کے بدل جانے سے پہلے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے ۔ لمحوں کو جاوداں کر دے، کھڑے کھڑے پہاڑ اور آسمان، ٹھہرا ٹھہرا سمندر ۔ یہ سب مجھے بیجان لگتے ہیں ۔ میں اپنا ماڈل ہمیشہ فانی مخلوق میں ڈھونڈتا ہوں، میری ہر پینٹنگ اس خوف سے برآمد ہوتی ہے کہ یہ جاندار مر جائیگا اور اسی خوف سے میرا فن دل و جان سے اسے لافانی بنانے میں جٹ جاتا ہے ـــ اچھا اب تم ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ جاؤ"

میں نے اپنا منہ تصویر کی طرف موڑ کر پھر برش اٹھا لیا ۔ لیکن یکایک اس کی جانب مڑ گیا "مجھے تسلیم ہے ساحرہ کہ زندگی کی ہر تحریک صرف ساکن حالت میں ہی تصویر کے خطوط میں مقید ہوتی ہے، پر تصویر ہی میں رواں دواں زندگی کا قیام بھی نقل و حرکت کا ہم معنی ہے ۔ بلکہ اس عمل سے نقل و حرکت کا تاثر شدید ہو جاتا ہے ـــ نہیں ساحرہ" میں نے اسے بولنے سے روک لیا "مجھے جامد نظاروں سے قطعی دلچسپی نہیں۔ مجھے اپنے دل پسند موضوعات صرف جاندار چہروں میں ہی مہیا ہوتے ہیں ۔ میری تصویروں میں غیر متحرک خاموش چہرے

جی اپنجیں، یہی میرا آدرش ہے۔"

مگر ساحرہ کی تصویر کی طرف سر اٹھا کر مجھے اپنے آدرش کی توانائی کے باوجود کلا کے انحطاط کا احساس ہونے لگا۔ یہ ساحرہ یقیناً وہ ساحرہ نہ تھی۔ جو میرے دل و دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"خوبصورت تصویریں اتنی چپ کیوں ہوتی ہیں لطیف؟" ساحرہ نے اپنی تصویر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اچانک سوال کیا۔

"سب تصویریں خاموش نہیں ہوتیں ساحرہ!" میں نے کہا "صرف وہی تصاویر چپ لگتی ہیں۔ جن کے مصور زیادہ بولنے کے عادی ہوں۔" میں نے گویا اپنے آپ کو کوسنے کے انداز میں اسے بتایا۔

"نہیں تم غلط کہہ رہے ہو!" اس نے بدستور اپنی تصویر پر نظر جمائے رکھی "خوبصورت تصویریں اس لئے خاموش رہتی ہیں کہ انہیں اپنی خوبصورتی کی خبر نہیں ہوتی" اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ جانا چاہا۔ لیکن میں نے اسے وہیں بیٹھی رہنے کا اشارہ کیا۔ "میں اپنا مقابلہ تمہاری اس تصویر سے کر رہی تھی یہ مجھ سے بدرجہا حسین ہے۔ کیونکہ اپنے آپ کو بھول کر اپنے محبوب سے متعلق سوچ رہی ہے۔ مگر مجھے ہمیشہ یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ تم میرے متعلق کیا سوچتے ہو۔ بھلا بتاؤ کہیں یہ تصویر تمہاری شکایت کا اظہار تو نہیں لطیف؟"

"فنِ لطیف کسی شکایت کے اظہار کا متحمل نہیں ہوتا، بلکہ فن کار کی سپردگی سے وجود پذیر ہوتا ہے۔" لیکن مجھے شبہ ہونے لگا کہ ساحرہ کا اندازہ درست ہے، شائد اسی لئے میری یہ تصویر ساحرہ کی تصویر نہیں بن رہی کہ میں نے ابھی تک اپنے آپ کو کلی طور پر اس کے سپرد نہیں کیا۔ میں آنکھیں کینوس پہ گاڑ کر تصویر کی تہوں میں غوطے کھانے لگا — اور میرا برش اس کی پلکوں کے نیچے چھاؤں کی پرحدت خنکی آباد کرنے لگا۔

"اور یہاں — جہاں اس کی ٹھوڑی، ہونٹوں کے دونوں کناروں کی طرف آ رہی ہے، یہ ٹھوڑی ساحرہ کی نہیں، اس کی ٹھوڑی تو گویا کسی ایرانی رقاصہ کی طرح اپنے بازو ادپر ہونٹوں کے کناروں کی طرف پھیلا کر مسکرا رہی ہوتی ہے اور لب ہلتے ہی ناچنا شروع کر دیتی ہے۔ میرا برش اس کی ٹھوڑی اور لب چھونے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے ساری تصویر کا جائزہ لیا۔

"نہیں"

"نہیں کیا؟" ساحرہ بول اٹھی "اچھی بھلی تو ہے بالکل میری طرح"

"ہاں تمہاری طرح، لیکن تم آپ نہیں!" وہ بچاری گذشتہ دو ماہ سے میرا ماڈل بنی ہر دم سیدھی بیٹھے بیٹھے کر صرف اکڑ ہی نہ رہی تھی۔ بلکہ اسے میرے آرٹ کے نظریئے سن سن کر بور ہونے کے باوجود ان میں دلچسپی ظاہر کرنا پڑتی تھی۔

"تم خود بھی بالکل اپنی طرح ہی ہو ساحرہ، لیکن تم میں اور اس تصویر میں یہ فرق ہے کہ تصویر صرف تمہاری مشابہت کی حامل ہے اور تم خود آپ ہو۔ میری یہ تصویر محض تمہارے جسم کا بوجھ اٹھائے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔"

"اپنے جسم کا بوجھ تو مجھے بھی اٹھانا پڑتا ہے۔"

"نہیں زندہ تصویر کا بدن اس کا بوجھ نہیں ہوتا، اس کی ذات ہوتا ہے۔ جب تم اٹھتی بیٹھتی یا چلتی پھرتی ہو تو تمہاری اپنی ذات یہ سب کچھ کرتی ہے۔ مگر میری یہ تصویر اپنی ذات اور صفات کی حامل نہیں۔ صرف تمہارے وجود کے بوجھ سے لدی ہوئی ہے۔ لیکن میں اسے مکمل کر کے، زندہ کر کے ہی دم لوں گا آج ہی — ابھی —!

"تھوڑا اور صبر کرو" اور میرا برش اس کے وجود کے آس پاس حیات آگیں فضا کے خطوط کو گہرا کرنے لگا، اس کے نتھنوں کے سامنے ایسا ماحول پیدا کرنے لگا، جیسے وہ واقعی سانس لے رہی ہو۔

"بہت خوب!" کچھ توقف کے بعد اس کی پرتحسین آواز سن کر میرا انہماک ٹوٹ گیا۔

مجھے اب یوں لگ رہا ہے کہ میں یہاں نہیں ہوں، وہاں ہوں،

تمہاری تصویر میں — سچ، میں اب ایک نہیں رہی، دو ہوگئی ہوں"
میں مسکرانے لگا۔

"ہر لمحہ شرر داعی ہوتا ہے۔ ساحرہ گھبراؤ نہیں۔ میری تصویر زندہ ہوگئی، تو پھر بھی ایک ہی رہو گی۔ میرے فن کی تکمیل کے بعد تم میں اور اس میں کوئی امتیاز نہیں رہے گا۔"

میں اس کی طرف جی بھر کے دیکھنے لگا۔ "لیکن ابھی تک تمہارا نقش میرے احساس سے ویسے کا ویسا ہی باہر نہیں آیا، نہ معلوم کیوں؟"

"کیونکہ میں وہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں میرے برش کے نرم و نازک بال تمہاری سالمیت کو ضرور سمیٹ لیں گے۔" اور میں نے اپنی سبھی حسّیں یکجا کر کے کینوس پر چھوڑ دیں۔

اس کی ناک اب واقعی سانس لے رہی تھی۔ میں نے برش کی جنبش سے سینے کی گولائیوں کو بھی ہلا کر کچھ اس طرح ٹھہرا دیا کہ سانس کے تناسب سے ذرا ذرا ہلتی نظر آئیں۔ پھر اس کی آنکھوں کی تاب کو اور میٹھا کر دیا اور پھر پیشانی کی جلد میں ادراک کے تاثر کو گیلا کر کے اس میں نسوانی خوف اور خوشی کا ہلکا ہلکا سماں سمو دیا، جیسے تاریکی اور اجالے کا نکاح پڑھا جا رہا ہو۔

اور اب میرا برش اندھے اندھے راستوں سے باہر آ پہنچا تھا سیدھی راہ پر آ کر اسے معلوم ہونے لگا تھا۔ منزل تو یہیں دو چار ہاتھ پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تیز گام ہوگیا۔

"ساحرہ! بس چند ساعت اور!"

میرے چھپے چھپے رنگ اب آڑ سے باہر نکل آئے تھے۔ آپس میں گلے مل کر ابدی رفاقت کے پیمان باندھ رہے تھے۔ ان کا ملاپ نہایت فطری معلوم ہوتا تھا، جیسے محبت کرنے والے نفوس آپس میں جھجک برت کر یک قالب ہو جائیں، تو انہیں تعجب ہو کہ فوراً ہی کیوں نہ گھل مل گئے۔

ساحرہ کی تصویر نے آخر اپنی ذات کا سراغ پا لیا تھا۔ وہی خد و خال، وہی روح، سراپا، وہی گویا ابھی ابھی وہ حسب عادت

تھوڑی دیر چپ رہ کر منہ کھول دیگی۔ اس کی رگوں میں خون دوڑ رہا تھا، بالوں سے خوشبو آ رہی تھی، قطعی ساکن ہونے کے باوجود اس کے بدن میں لبالب زندگی بھر گئی تھی۔ روح اور قالب ایک ہو گئے تھے۔

اور میں نے برش اٹھا کر نقش آخر کے لئے اس کا ایک جائزہ لیا، لیکن اب اس زندہ جاوید شبیہ میں کسی مبہم ترین نقش کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

"ار — ار — رر! برش پرے کرو بابا!"

"او — و!!"

میں دراصل اپنی تصویر سے منہ موڑے محویت کے عالم میں یہاں ساحرہ کے سامنے کھڑا تھا!

احمد جمال پاشا

عزیز ماموں

جی ہاں! عزیز ماموں ہمارے ماموں تھے۔ مگر ہمارے کیا وہ سبھی کے ماموں تھے۔ نام کی رعایت سے سب ان کو "عزیز ماموں" یا "ماموں" کہتے۔

ہم بھی انہیں ماموں کہتے۔ حالانکہ سچ پوچھیے، تو وہ ناتے رشتے میں ہمارے ماموں نہیں بلکہ نانا ہوتے تھے۔ خیر ہمیں چھوڑیے ہمارے ایک اور بزرگ کو لیجیے جن کے وہ رشتے میں چچا ہوتے تھے۔ مگر وہ بھی ان کو ماموں کہتے اور وہ صاحبزادے جو ان کے نواسے تھے، وہ بھی ان کو ماموں کہتے۔ نیز جو صاحب ان کے پڑوس میں رہتے اور جن سے ان کا زیادہ سے زیادہ رشتہ مالک مکان اور کرایہ دار کا تھا، وہ کرایہ دار صاحب بھی ان کو ماموں ہی کہتے وہ آسامی، جو عمر میں اگر ان سے زیادہ نہ تھے، تو کم بھی نہ تھے وہ بھی ماموں ہی کو پوچھتے ہوئے آئے۔

شاید ماموں کو بھی یہ احساس تھا کہ یہ سب مجھے بلا شرکت غیرے اپنا ماموں سمجھتے ہیں اور وہ سمجھنے کے بعد بھی ایک مشفق اور مہربان ماموں کی حیثیت سے سب سے ملتے۔

جب عمر زیادہ ہو جائے تو بجائے اس کے کہ آپ کے بزرگ ہوں، آپ خود لوگوں کے بزرگ ہو جاتے ہیں۔ یہی معاملہ "عزیز ماموں" کے ساتھ تھا۔ وہ سب کے بزرگ تھے اور سب ان کے خورد، پھر یہ بزرگی اور خوردی کا رشتہ بھی ایسا تھا کہ ہم سب ان میں ایک عجیب قسم کی، روحانی مسرت محسوس کرتے۔

مسرت کا لفظ میں نے اس لئے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ میں نے آج تک کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا، جو ماموں کے پاس سے ہنستا بولتا، خوش خوش نہ لوٹا ہو۔ کیا بچے، جوان، بوڑھے مرد، یا عورت، لڑکی یا لڑکے سب ہی تو انہیں ہر وقت گھیرے رہتے۔

عزیز ماموں، مجمع سے گھبراتے نہیں، وہ بہاریہ آدمی تھے جتنے زیادہ لوگ ہوتے، وہ اتنا ہی زیادہ خوش ہوتے اور ہنستے بولتے۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے شعر سناتے۔ پھر خود ہی ان کے مطلب بتاتے۔ معمولی سی معمولی بات میں ایسا نکتہ پیدا کر دیتے کہ لوگ بے اختیار حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگتے۔

میں نے عزیز ماموں کے پاس بڑے سے بڑے پڑھے اور کڑھے کو بالکل مبتدی کی طرح منہ کھولے حیرت سے ان کی باتیں سنتے دیکھا اور گھنٹوں بیٹھنے کے بعد بھی ہمیشہ دل میں یہی حسرت رہی کہ کاش ہم عزیز ماموں کے پاس بیٹھے ان کی سنا کریں اور وہ کہا کریں۔"

دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں، جس پر وہ گھنٹوں بے تکان بول یا بحث نہیں کر سکتے۔ پھر کمال یہ کہ کیا مجال جو ذرا بھی بے لطفی کہیں سے بھی پیدا ہو سکے۔

عزیز ماموں بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ مضامین غیب

سے آ رہے ہیں اور منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔

وہ جو مہاتما گاندھی فرما گئے ہیں کہ شخصیت اور سیرت پر نام کا بڑا اثر پڑتا ہے " تو صاحب واقعی وہ صحیح معنوں میں اسم بامسمیٰ اور ہر دلعزیز تھے۔ خیر اب تو وہ اللہ کے پیارے ہو چکے ہیں اور ہمارے پاس ان کی یاد ہی یاد رہ گئی ہے۔ پہلے وہ عزیز تھے۔ اب ان کی یاد عزیز ہے اور ان کی باتیں عزیز ہیں۔

عزیز ماموں کی یاد کے ساتھ ان کا خوبصورت ہنستا اور مسکراتا ہوا نورانی چہرہ نظروں میں گھومنے لگا۔

ماموں کی تعریف یہ تھی۔ کیا مجال، کیسا ہی روتا بلکتا آدمی ان کے پاس کیوں نہ جائے مگر ہنستا ہوا خوش خوش لوٹتا تھا۔ پھر ملاقاتی بھی ان کے بھانت بھانت کے تھے۔ بچے، جوان، بوڑھے، گھر اور خاندان کے لوگ، شہر اور باہر کے لوگ سب انہیں گھیرے رہتے۔

ماموں کا کمال یہ تھا کہ جو ایکبار ان سے مل لیتا، پھر زندگی بھر کے لئے ان کا گرویدہ اور مرید ہو جاتا، نہ جانے ان کے پاس کونسی بوٹی اور کیا جادو تھا کہ آدمی کیسا روٹھا ہو، خفا ہو، ناراض ہو، ادھر ان کا سامنا ہوا اور ہوا رام۔

گھر کے بچے ہوں، یا سیاسی لیڈر، صوفی، سنت ہوں یا عالم فاضل ماموں کے آگے سب بچے ہی معلوم ہوتے۔

ماموں بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ایسی ٹھوس اور دلچسپ باتیں کرتے کہ بس دل چاہتا کہ یہ باتیں ہی کیا کریں اور ہم سنا کریں۔ پھر کیسی ہی ٹیڑھی یا پیچیدہ بات کیوں نہ ہو مگر ایک لطیفہ میں سب کو ہنسا کر بات آئی گئی کر دیتے۔ پھر کمال یہ کہ ابھی کسی سیاست داں سے سیاست پر لمبی چوڑی بحث ہو رہی ہے تو تھوڑی دیر بعد کسی ریاضی داں، یا ماہر فلکیات کو قائل کیا جا رہا ہے کہ بندہ پرور! آپ جس نظریے کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ جناب من! آئین سٹائن سے آگے تو بڑھیے ـــــ!

پھر معلوم ہوا کہ تصوف کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی لڑکے سے سن انیس سو ایک میں جو کرکٹ ٹیم انگلینڈ اور ویسٹ انڈیز سے میچ کھیلی تھی اس کے کھلاڑیوں کا اس سال کے بہترین کھلاڑیوں سے اس طرح مقابلہ کر رہے ہیں گویا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جب سے ہوش سنبھالا، تب سے اب تک صرف کرکٹ ہی کھیلتے رہے۔ اس کے بعد کوئی حکیم صاحب ہو گئے، تو حکمت اور ڈاکٹری کے نازک فرق اور طریقہ علاج کے موجودہ مسائل سے بحث اس بے تکلفی سے شروع کر دی گویا پہلے آپ ڈاکٹر اور حکیم ہیں اور بعد میں کچھ اور۔ لطف یہ کہ شہر کا سب سے بڑا ڈاکٹر یا وید منہ کھولے ان کی باتیں سنتا اور ان کی حیرت انگیز معلومات پر انگشت بدنداں ہے

جو بھی ماموں سے ملنے جاتا وہ اس کی اتنی تعریف کرتے، اتنی تعریف کرتے کہ آنے والا مارے خوشی کے پھول کے کپا ہو جاتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر شخص یہی سمجھتا کہ ماموں سب سے زیادہ ہم کو چاہتے ہیں۔ یہ آج تک نہ فیصلہ ہو سکا کہ ماموں کس کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ مگر ایسا کوئی نہ تھا۔ جس کو یہ خیال بھی ہوگا کہ وہ ہمیں نہیں چاہتے، یا کوئی کہے کہ وہ اچھے آدمی نہیں۔ اچھا بھی واقعی وہی ہوتا ہے جس کو سب اچھا کہیں۔

ان میں سب سے بڑی کشش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سب کی سنتے تھے اور جس مذاق اور میدان کا آدمی ہوتا اس سے اسی دائرے میں بات کرتے اور ایسی باتیں کرتے کہ آنے والا اپنے میدان کا کتنا بڑا ماہر کیوں نہ ہو مگر طفل مکتب بنا ہوا ہے ان کی باتیں، نکتے کی سنتا اور گرہ میں باندھتا۔

اکثر یہ ہوتا کہ دو مخالف گروہ کے لوگ الگ الگ ان کے پاس اپنا دکھڑا سنانے آتے، ماموں ان کی بھی سنتے اور ان کی بھی۔ ان سے بھی کہتے کہ "آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔ اور ان سے بھی کہتے کہ "آپ بھی بالکل ٹھیک کہتے ہیں"۔ مگر اس ٹھیک

شوکت عظمی

سُونی مانگ بھری کلائی

شادی کے دس سال گذر چکے تھے، نسرین کی ازدواجی زندگی میں ہر طرح کی مسرت تھی، ہر چیز میسر ہو چکی تھی لیکن ہزار تعویذ گنڈے اور منتوں مرادوں کے باوجود اس کے ہاں اولاد نام کی بے مثل بیش بہا خوشی کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کا چمن ہرا بھرا تھا، برگ برگ سبز تھا، ہر شاخ شاداب تھی۔ لیکن وہ مالی ہی کیا جہاں نہیں یہی کہ ہر طرف پتے ہی پتے ہوں۔ دور دور تک ابھی پھول کا نام و نشان نہ ہو۔

کل تک گلچیں کی آرزو بس یہی تھی کہ اس کے چمن میں ایک پھول کھلے، اور روش روش اس کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک اٹھے، پرندے آ آ کر اپنے بسیرے، بلبلیں نغمہ زن ہوں۔ لیکن اب باغ اور کیاری سے پرے عورت کی دوسری اور سب سے بڑی خواہش کچھ اور تھی۔

"اے رب، سارے جہان کے مالک! تو نے میری گود ہری نہیں کی، شکوہ نہیں۔ میری مانگ سُونی مت کر، مجھے سدا سہاگن رہنے دے۔"

گلچیں نے پھول کے بجائے باغباں کے لئے دعا مانگی۔

باغباں ـــــ چمن کی روح رواں، اس کی زینت۔ جس کے بغیر سونا کسی ندی کا کنارا، صحرا کا ویرانہ ہے۔ شاخوں میں لچک، پنکھڑیوں کی نزاکت، اور کیاریوں کا نکھار، سب اسی کے دم سے ہے۔

"بیٹا! بڑی کھوئی کھوئی سی ہو۔ ابھی سے بیٹھی ہو، لاؤ کلائی بڑھا۔ آج بہت جگہ جانا ہے ـــ" منہارن بوا نے کہا۔

نسرین چونک پڑی۔

"ہاں! ہاں! خالہ بی ـــ" اس نے اتنا ہی کہا اور اپنی کلائی بڑھا دی۔

صرف ایک دو چوڑیاں اس کے ہاتھوں میں باقی رہ گئی تھیں جو زیادہ دن ہو جانے کی وجہ سے بے رنگ ہو چکی تھیں۔ منہارن بوا نے اپنی کمر میں پڑی چابی کے گچھے نکال کر کئی چابیوں کے بیچ پڑی ایک بڑی چابی سے پرانی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ پھر اس کی جگہ اس نے عنابی رنگ کی بھر بھر ہاتھ چوڑیاں ڈال دیں ـــــ نسرین نے چوڑیوں کے رنگ پر کوئی اعتراض نہیں کیا، جیسا کہ اکثر پہلے کیا کرتی تھی۔ بس خاموشی سے چوڑیاں پہن لیں۔ گویا اس کا خیال تھا: بھرے ہاتھ، سہاگ چوڑیاں، اچھا شگون ہے ـــ سہاگ نشانی ہے ـــ اس سے اس کا سہاگ جلد بھلا چنگا ہو جائے گا، اس کی خوشیاں واپس لوٹ آئیں گی۔ ایک عورت کے لئے سہاگ سے بڑھ کر اور ہے ہی کیا۔ اس کے سوا وہ سوچ ہی کیا سکتی ہے۔

منہارن بوا چلی گئی۔ پہلے کی طرح اس نے دنیا بھر کی گپیں نہیں لگائیں۔ سچ مچ انہیں بہت جگہ جانا ہو گا نہیں تو وہ ٹھہرتیں۔ منہارن بوا کو نسرین کبھی چائے شربت پلائے بغیر واپس نہیں جانے دیتی تھی۔ وہ نہیں بیٹھیں، نسرین نے بھی چائے کے لئے نہیں پوچھا۔ اس وقت اس کے خیالات بہت زیادہ پریشان تھے۔ وہ سوچنے لگی۔

' دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ سائنس ترقی پر ہے۔ موت پر بھی قابو پالیا گیا ہے۔ زندگی پر آدمی کا بھی اختیار ہے۔ میرا نسیم بھی موت کے منہ سے واپس آ جائے گا ـــ میری ماں بننے کی خواہش خدا نے پوری نہیں کی تو میرا سہاگ ضرور امر رکھے گا۔'

"دلہن بٹیا! جی تو اچھا ہے۔ بڑی اداس اداس لگ رہی ہو۔ اللہ نہ کرے کچھ برا تو نہیں ـــ" نسرین کچھ نہ بولی۔ اللہ رکھے کی بوڑھی ماں نسرین کو خاموش دیکھ کر [illegible] دیوار سے لگ کر وہیں چپ چاپ بیٹھ گئی۔ دیکھنے سے وہ بھی

بڑی پریشان نظر آ رہی تھی۔

اللہ رکھے کی ماں اکثر اس کے گھر آجایا کرتی تھی۔ بڑی غریب تھی بیچاری۔ اس کا بیٹا اللہ رکھے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں وہ روزانہ نسرین کے ہاں کنویں سے پانی لانے کے لئے آیا کرتا تھا۔ جب شہر میں نل لگ گیا تو اس کی ضرورت نہیں رہی، پھر بھی وہ پرانی مالکن کے گھر آجایا کرتا تھا۔ اُسے دیکھ کر نسرین کی ممتا جاگ اٹھتی تھی۔ اگر وہ بھی وقت پر ماں بن جاتی تو اس کا بیٹا بھی اتنا ہی بڑا ہو جاتا۔ کچھ ہی دن ہوئے نسرین نے اللہ رکھے کو اپنی کھڑکی سے سامنے کے راستے پر گزرتے دیکھا تھا۔ اتنے دنوں میں اللہ رکھے کھنچ کر تاڑ کی طرح لمبا ہو گیا تھا۔ چاروں طرف سے بھرا بدن، وہ اپنی عمر سے بھی زیادہ لمبا تڑنگا گبرو جوان نظر آنے لگا تھا۔ نسرین کو خوشی ہوئی وہ بہت جلد نحیف ماں باپ کا سہارا بن گیا تھا۔

"بیٹا! تیرا سہاگ سہاگ جیتا رہے۔ میرا بڑا اسی [illegible] والا کہتا ہے۔ کل تیرے کا جگ ہے میرا اللہ رکھو بچ جائے گا۔ بڑھاپے کا سہارا ہے بیٹا، اسی سے آنکھوں تلے اجالا ہے۔۔۔ ڈاکٹر بڑی بھاری انجکشن لگتا ہے۔ کہتا ہے اسی سے وہ ٹھیک ہو سکتا ہے نہیں تو۔۔۔ یہی ایک سہارا ہے [illegible] کا۔۔۔"

"کیا کہہ رہی ہو اللہ رکھو بیمار ہے۔۔۔؟"

"ہاں بیٹا، صرف اکیس روپے ادھار دیدو۔ نہیں تو میرا لال۔۔۔ تم لوگوں کا ہی تو کھا پی کر اتنا بڑا ہو رہا ہے۔"

نسرین سوچنے لگی

آٹھ دس دس روپئے وہاں ہر روز نوٹ لئے چپے لگی۔ پھر ان کا کیا ہوگا۔۔۔ ظہیر کہہ رہے تھے انہیں بھی دوا کی اشد ضرورت ہے۔ طبیعت پھر بگڑ گئی ہے ظہیر دوا کے لئے روپئے لینے آئیں گے۔

بڑی مشکل سے سلائی کے بچائے ہیں۔ اگر اسے روپئے دے دیئے تو پھر ان کی دوا کا کیسے انتظام ہوگا۔

"بیٹی اب میرے پاس گہنا زیور بھی تو نہیں۔ کوئی کچھ نہیں دیتا۔ تیرے ہی سے آسرا لے کر آئی ہوں۔ مجھے تیری بھی حالت ٹھیک نہیں لگتی۔۔۔ لیکن خدا پر بھروسہ ہے کل تک کمائی ضرور دے گا،۔۔۔ تو کل ہی لوٹا دوں گی۔ آس لگ گئی ہے۔"

"کل۔۔۔؟"

"ہاں بیٹیا! کل ضرور۔۔۔ وہ جو پہاڑی تلے والا چھوٹا ہسپتال ہے نا، وہاں ادھر ہی کے کسی جوان کی حالت نازک ہے۔"

"تو۔۔۔۔ ت۔۔۔۔ تو۔۔۔ کیا۔۔۔؟"۔۔۔ نسرین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور زمین لگتی سی لگی۔ پہاڑی تلے والی عمارت میں جو چھوٹا ہسپتال کے نام سے مشہور تھا، اس میں اس کا شوہر شمیم ہی اکیلا بھرتی تھا۔ ایک الگ قسم کی بیماری ہونے کی وجہ سے اسے بالکل علٰحدہ اسی عمارت میں رکھ دیا گیا تھا۔۔۔ وہ یہ سن کر لرز اٹھی۔ اس نے گھبرائی ہوئی صورت سے اللہ رکھو کی ماں کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹیا، بڈھے میں اب طاقت نہیں کمزور پڑ گیا ہے پہلے بڈھا قبریں کھودتا تھا اب مُردے نہلاتا ہے۔ روپئے ہو جاتے ہیں۔ اس سال تقدیر ہی پھوٹی تھی آم کی فصل اچھی نہیں ہوئی نہیں تو ہم صبر پھیلنے پر کاروبار پھیلا رہتا۔ یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔"

نسرین بالکل سکتے میں آ گئی۔ پہلے تو اس کے جی میں آیا کہ بڑھیا کے بال پکڑ، جوتی لگا گھر سے باہر نکال دے۔ اس کا اس کی چکنی باتوں سے جی جل گیا تھا۔ وہ غصہ سے اندر ہی اندر تپنے لگی تھی۔ پھر اس کی نگاہوں میں لمبا تڑنگا گبرو جوان اللہ رکھو کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ کل تک جو اس کے ہاں آیا کرتا تھا۔ اسی کے سامنے بڑا ہوا تھا۔ ماں نہ ہونے کے باوجود اس کے اندر چھپی ممتا تڑپ اٹھی تھی۔ وہ اس خود غرض بڑھیا کی کسیلی باتیں بھول گئی۔ اسے اللہ رکھو کی نئی سرخ جوانی پر ترس آگیا۔ اس کے تیور کچھ ملائم پڑ گئے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد اس کے سامنے اپنے سرتاج کا جوان چہرہ آگیا۔ اسے اپنی مانگ کے سیندور کی دمک ماند پڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ سہاگ رنگ پھیکا پڑتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ آگے کا تصور کر کے لرز اٹھی۔ اس کے دانت نچلے ہونٹ پر جم گئے۔

وہ مسلسل کچھ دیر تک خاموش رہی۔ پھر اس نے منشیین کے بکس سے دو پیسے نکال کر بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے ہلکے سے کہا۔

"تیرے میرے دونوں جلیں ـــ"۔ اور سسکی لے کر رو پڑی۔

بڑھیا روپئے لے کر خاموشی سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ظہیر آیا۔

ظہیر ـــ ! اس کا منہ بولا غریب بھائی ساتھ ہی شمیم کا دوست جو نسرین پر اپنی حقیقی بہن سے بھی زیادہ پیار نچھاور کرتا تھا شمیم کے ہسپتال داخل ہونے پر روز آرہا تھا ہمیشہ کی طرح اس دن بھی آیا۔

" لاؤ، روپئے دو نسرین ! ـــ"

" نہیں ہیں ـــ"

" کل تم نے کہا تھا ہیں ـــ"

" میں نے کل غلط کہہ دیا تھا" ـــ وہ بے دلی سے بولی۔ ظہیر کو یہ طرز گفتگو اچھی نہیں لگی۔ وہ کچھ نہ بولا۔ ادھر ادھر کی پوچھ کر واپس چلا گیا۔

دوسرے دن آٹھ بجے تھے ظہیر آیا۔ چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی، بال بکھرے تھے، آنکھوں میں ویرانی پھیلی ہوئی تھی، لب خشک ہو چکے تھے۔ ظہیر کا حلیہ دیکھ کر وہ سہم اٹھی ـــ وہ کافی دیر تک بالکل خاموش کھڑا رہا۔ نسرین کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ظہیر کے لب کھلے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اس نے اتنا ہی کہا۔

" تمہارا سب کچھ لٹ گیا نسرین ـــ" ـــ وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آئے۔ وہ جیسے تھی ویسے ہی کھڑی رہی۔ ظہیر سوچنے لگا۔

" کوئی دوسری عورت ہوتی تو ابھی اپنی کلائی دیوار پر مار لیتی۔ آنسوؤں سے اب تک سارا چہرہ بھیگ گیا ہوتا، اتھرے گھر کی در و دیوار ہل گئی ہوتی ـــ یہ بہری بہن، بہن نہیں ہے۔ اس نے میرے مرنے والے دوست سے بے وفائی کی ہے۔ اس کے لئے اس کے دل میں ذرا بھی درد نہیں۔ تف ہے میں بھی کیسا بھائی ہوں ـــ"

اس کے جی میں آیا بڑھ کر گلا گھونٹ دے۔ نسرین سے اس طرح کے اطمنان کی امید نہیں تھی۔ ظہیر کے دل میں پیار کی جگہ نفرت نے لے لی تھی۔

اس طوفان کے کچھ ہی دیر بعد قبرستان کی سی خاموشی میں ایک آواز سکوت توڑتی چلی گئی اور پہلے سے بھی بڑا طوفان اٹھاتی چلی گئی۔

" دلہن چاچی ! دلہن چاچی !! اللہ رکھو مر گیا" ـــ

گلی کا چھوٹا سا لڑکا دروازے پر آیا اور چلا گیا۔ نسرین زور سے سسکی، لے کر رو پڑی۔ اس نے اپنی کلائی پختہ فرش پر دے ماری پہلی مار میں کچھ چوڑیاں چور ہو گئیں اور کچھ باقی رہ گئیں۔ اس نے دوسری بار فرش پر ہاتھ مارنا ہی چاہا تھا کہ ظہیر کا بھرپور زناٹے دار طمانچہ اس کے بائیں رخسار پر پڑا۔ وہ دوسری جانب الٹ گئی ـــ اور الٹتی ہی چلی گئی۔

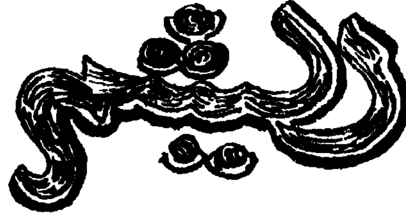
اب وہ اداسیوں کے اس منزل پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں دل و دماغ اور پریشانیوں کا گذر نہ تھا۔ جہاں کوئی جذبہ کوئی خیال مزید پریشانیوں کا باعث نہ بن سکتے تھے۔

کل منہارن بوا میرے ہاں چوڑیوں کا ڈالا لے کر آئی تو نسرین منہ پر چتر سے ڈالے اپنی گود میں کپڑے کا ایک گڈا دبائے اور اسے آنچل سے لڑکے کی طرح چھپائے اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گھسی۔ اور آتے ہی رٹ لگانے لگی۔

" منہارن خالہ، منہارن خالہ !! مجھے بھی یہ لال ریشمی چوڑیاں پہنا دو ـــ دیکھو کتنا اچھا میرا بابو ہے۔ آج کے ماموں بھی کیسے ہیں بھانجے کو بھی پیار نہیں کرتے........" اور نہ جانے کیا کیا بکتی رہی۔

پھر منہارن بوا نے لال چوڑیاں اس کی کلائیوں میں ڈال دیں، اس کی کلائیاں بھر دیں۔ ہاں ! اس کی کلائی اب بھی بھری ہے وہ سدا سہاگن ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال



میں نے اس کو پہلی مرتبہ زینتھ (Zenith) ہوٹل میں دیکھا تھا۔ چاندنی میں ڈوبا ہوا اس کا حسین چہرہ میرے ذہن کے پردے پر نقش ہو کر رہ گیا۔ پتلے پتلے ہونٹ جیسے سرخ گلاب کے تر و تازہ پھول کی سرخ نازک پنکھڑیاں۔ نیلی نیلی آنکھیں کسی جھیل سے زیادہ گہری اور نرگسی پھول کی طرح پرکشش و دلفریب، ستواں ناک۔ شب دیجور کی طرح سیاہ، اور گھنے بال جدت لباس میں وہ خاصی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

اس وقت ہوٹل شباب پر تھا۔ تمام سیٹیں بھر چکی تھیں۔ ایک بہت ہی دلکش موسیقی ہال کے چاروں طرف تیر رہی تھی اتنی پیاری کہ سننے والا جھوم جھوم جائے۔ میں نے سامنے ہال کا سرسری جائزہ لیا۔ بیرے دوڑ دوڑ کر کھانا لگا رہے تھے۔ عجیب گہما گہمی تھی۔ چند سیکنڈ یونہی خیالی میں گذر گئے۔

کار کے ہارن کی آواز نے میرے خیالوں کو منتشر کر دیا۔ تھوڑی دور تک پیروں کی چاپ سنائی دیتی رہی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور پھر ایک لمحہ بعد ایک حسین و خوبصورت سی لڑکی ہوٹل کے بڑے ہال میں کھڑی چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی پیشانی پر بے شمار موتی بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کسی نازک سے پھول پر شبنم۔ پسینے سے وہ تر بتر تھی کوئی کرسی نہ پا کر جب اس نے اپنی نگاہیں مجھ پر ٹھہرائیں تو میں گھبرا سا گیا۔ کیونکہ میں برابر اس کو تک رہا تھا۔ میری نظریں خود بخود جھک گئیں اور شرمندہ ہو گیا۔ شرمندگی کا احساس مجھے نہ جانے کہاں تک کھینچ لے گیا۔ اور چونکا اس وقت جب وہ مجھ سے ہم کلام ہوئی تھی۔

"کیا میں بیٹھ سکتی ہوں" تھکی سی آواز سے اس نے پوچھا۔

"جی..... جی..... جی ہاں — جی ہاں شوق سے"

اور وہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بلا مقصد ہوٹل کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر اپنے اس پرس سے جو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھی ایک رومال نکال کر چہرے پر بکھرے ہوئے موتیوں کو سمیٹنے لگی۔ گرمی واقعی شباب پر تھی!

"بیرا" اس نے پاس سے گذرتے ہوئے بیرے کو پکارا۔

"یس مادام!" (Yes Madam)

"کولڈ ڈرنک (Cold drink) پھر وہ

چونکتے ہوئے بولی۔

"اگر میں آپ کو کوکا کولا پیش کر دوں تو...... یا گولڈ اسپاٹ..... بتائیے..... ؟"

"اوہ..... " میں گھبراتا ہوا بولا "ایسی بھی کیا ضرورت ہے.... دراصل میں........" ابھی میں اپنا جملہ بھی پورا نہ کر پایا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ دی اور بہت پرتکلف لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی

تکلفات کی میں عادی نہیں۔ اس لئے کسی کو تکلف کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو خون کھول جاتا ہے۔"

پھر وہ بیرے کو آرڈر دیتے ہوئے بولی۔

آپ نے برا تو نہیں مانا۔......... ویسے آپ کی تعریف ؟"

مجھ ناچیز کو آذر کہتے ہیں۔ آپ کی تعریف کن الفاظ میں کی جائے ؟"

بہت معمولی تعریف ہے ہر بساط خانے کی دکان پر ملتا ہے۔ ریشم ۔۔۔ مجھ کو ریشم کہتے ہیں۔ اتنا کہہ وہ ہنسنے لگی اور میں تھوڑی دیر کے لئے کھلتی ہوئی کلیوں کے تصور میں کھو گیا۔

وقت اپنی پرانی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا ... میں بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظریں ڈالتا ۔۔۔ پھر گیٹ پر۔ میری اس حرکت کو وہ بغور تک رہی تھی۔ اور محو حیرت تھی۔ آخر جب نہ رہا گیا تو پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"معاف کیجئے ۔۔۔ شاید آپ کسی کے منتظر ہیں۔"

"جی ہاں ۔۔۔ میرا ایک دوست رزمی مجھ سے اس وقت آنے کو کہہ گیا تھا۔ آتا ہی ہوگا۔ ہمیشہ کا لیٹ کمر (late comer) ہے کالج کے زمانے سے....." بات کٹ گئی۔ کیونکہ ریشم کا کوئی دوست اس سے باتیں کر رہا تھا اور وہ میری طرف سے بالکل غافل سی ہو گئی تھی۔ اچانک موسیقی تبدیل ہوگئی۔ اب چاچاچا کے لئے لوگ تیاریاں کر رہے تھے۔ ہال کے چاروں طرف جدھر نظر اٹھائیے رومان ہی رومان بکھرا ہوا ہے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"ایکسکیوز می، مسٹر آذر ۔۔۔ میں ذرا ڈانسنگ روم تک جا رہی ہوں۔ کیا آپ بھی شوق رکھتے ہیں ؟"

جی نہیں..... مجھے تو ناچنا بھی نہیں آتا پھر شوق چہ معنی دارد"

"اچھا ۔۔۔" اور موتی جیسے دانت باہر نکل پڑے۔ ریشم کی نازک اور مختصر سی کمر میں اپنا ہاتھ ڈالے وہ آگے بڑھ گیا اور میں حیرت کے ملے جلے جذبے سے اس کو جاتا ہوا تکتا رہا۔ مجھے کچھ حسد بھی ہوا...... کیونکہ میں اپنے دل میں ریشم کے لئے جگہ پا رہا تھا۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی۔

تیز بلبوں کی روشنی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کی جگہ بے جان ہلکے نیلے بلب روشن ہو چکے تھے۔ لیکن اب ہوٹل اور زیادہ رومان انگیز ہو گیا تھا اور میں ریشم کے تصور میں کھویا رہا۔ چونکا اس وقت جب میں نے اپنے شانے پر بوجھ محسوس کیا۔ پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو رزمی کو موجود پایا۔ میرا سارا غصہ اس کی ایک پیاری اور معصوم مسکراہٹ سے کافور ہو گیا۔ ہم دونوں بہت دیر تک اپنے میں گفتگو کرتے رہے گفتگو کے دوران ریشم کا ذکر بھی آیا۔ میں جب بھی ریشم کا نام اپنے منہ سے ادا کرتا تو ایک عجیب طرح کی فرحت اور مسرت کا احساس ہوتا اور زبان لڑکھڑانے لگتی ۔۔۔ رزمی میری اس حالت سے خوب خوب لطف اندوز ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ریشم بھی آگئی اس نے جب اپنی کرسی بھری پائی تو لوٹنے لگی۔ میں نے اس کو آواز دی اور وہ رک گئی۔ رزمی اور میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور تب وہ اپنی کرسی پر بیٹھی۔ میں نے رزمی کا تعارف کرایا۔

"آپ ہیں مسٹر رزمی میرے دوست۔ اور شہر کے

سب سے بڑے بیکدار — اور آپ — آپ ریشم کہلاتی ہیں
آج ہی میری فرینڈ ہوئی ہیں۔"

"اوہ — بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر —" ریشم نے اپنا نازک سا ہاتھ بڑھایا

"جی مجھے بھی۔" رزمی جیسے خواب میں بولا ....

دوسرا دن میرے لئے پہاڑ بن گیا۔ کسی طرح کٹتا ہی نہ تھا۔ خیر جیسے تیسے رات ہوئی۔ اس دن میں نے خود کو بہت سجایا سنوارا تھا۔ ہزاروں ارمانوں کی کلیاں دل میں چھپائے جب میں ہوٹل پہنچا تو ریشم کو موجود پایا۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ میں پہلے کاؤنٹر پر گیا۔ ایک پیکٹ کیپسٹن کی لی اور ڈنر کا آرڈر دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"کیا میں ——" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اوہ — بصد شوق بصد شوق ..!" جیسے اس نے آنکھیں بچھا دیں۔

اور جب میں بیٹھ گیا تو اس نے میری طرف گلاب کا ایک تازہ پھول بڑھایا جس کو میں نے بہت ہی شرماتے ہوئے قبول کر لیا۔ "عزت افزائی کا شکریہ" میرے اس کہنے پر وہ ہنس پڑی —اور دیر تک ہنستی رہی۔

"اس میں عزت افزائی کی کیا بات ہے؟"

"یہ تو وہی جان سکتا ہے جس کی عزت کی جائے۔"

"اچھا—" اور وہ مجھے نرگسی آنکھوں سے گھورتی رہی۔

"اس کو میں جان سے عزیز رکھوں گا" میں نے ریشم جیسے پھول کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"اس نازک سے پھول کو —کیا بات پائی ہے آپ نے اس میں

"یہ — یہ — میرے — . —"

میری زبان کانپ گئی اور میں کچھ نہ کہہ سکا۔ رات کی سیاہی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ مجھے برابر تکے جا رہی تھی اور میں شرم سے گڑا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ کئی مرتبہ سوچا بھی اظہار حقیقت کر دوں۔ لیکن ہمت جواب دے جاتی۔ اسی درمیان اس نے خود مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"یہ میری خوش قسمتی ہوگی —"

"آپ کی شادی ہو چکی ... ہے یا نہیں؟"

"جی" میں جیسے کہ دیوانہ ہو گیا —"ابھی نہیں"۔

ابھی کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ رزمی آگیا۔ اور میری بیٹھ پر ایک دھپ رسید کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ پھر بہت ہی آزادانہ باتیں کرنے لگا۔ ریشم اس کی باتوں پر لوٹ لوٹ جاتی اور جب وہ چپ ہو جاتا تو فرمائش کرتی — کہ باتیں کرتا ہی رہے۔ پھر جب وہ باتیں کرنے لگتا تو اپنا سر پیٹ لیتی۔

"اف! بس بھی کیجئے رزمی صاحب دیکھئے کمبخت ہنسی رکتی ہی نہیں۔ پیٹ درد کرنے لگا۔"

کئی دن گزر گئے — ایک دن رزمی ملا۔ وہ چوک پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس نے ایک آواز لگائی

"ابے او عاشق نامراد — یہ زندہ نعش کدھر کو — مردہ نعش تو قبرستان جاتی ہے؟"

"بس — پرستان — زندہ نعش جو ٹھہرا"

"ابے لڑکے تو — بڑا خوش نظر آرہا ہے؟"

"ریشم کے یہاں تم کو نہیں چلنا کیا۔ اس نے کھانے پر بلایا تھا نا؟"

"اوہ — کیسے جا سکتا ہوں۔ یہ حضرت جو موت کے فرشتہ کی طرح سر پر سوار ہیں۔"

خیر میری طرف سے معذرت چاہ لینا۔ لیکن یا...
دینی پڑتی ہے تمہاری نظر انتخاب کی۔ بھابی کہنے کا شرف
کب حاصل ہوگا؟"

"چپ رہو یار۔ کہیں کوئی سن نہ لے۔" میں نے
شرماتے ہوئے کہا۔

اور جب میں ریشم کے ڈرائنگ روم میں داخل
ہوا تو وہ سجی سجائی ایک صوفے پر نیم دراز کسی انگریزی
رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ واقعی کمرہ بڑی نفاست
سے سجایا گیا تھا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے میرا استقبال
کیا اور دوسرے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

وہ آئیں گھر کو ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس نے سگریٹ اور لائٹر میری طرف بڑھایا۔ اور
مجھ کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ کلاک نے ۸ بجنے کا اعلان
کیا وہ اٹھی اور قریب ہی رکھے ریڈیو کو آن کر دیا۔ اس
وقت کسی نئی فلم کے گانے آ رہے تھے ہر گانے کے اختتام پر
وہ تبصرہ ضرور کرتی۔

"دیکھئے نا آذر صاحب کیسا واہیات گانا ہے یہ
یہ بھی کوئی گانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنسوؤں کے
سمندر ہی بہہ رہے ہیں۔ گانا تو وہ ہے جس سے پیار و محبت
کی ہلکی ہلکی پھواریں گریں۔ عشق و محبت کی وادیوں میں ڈوبا
ہوا ہونا چاہیے۔"

اس کی اس بیباکی پر انگشت بدنداں میں اس کو
تک رہا تھا ۔۔۔ اس کی مسکراہٹ نہ جانے کیوں اتنی دلکش
ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ ہنستی رہے اور میں دیکھتا رہوں
...دیر بعد اس نے نوکر کو پکارا۔ نوکر کے آنے پر کھانے کا
آرڈر دیتے ہوئے بولی "پاس کی دکان سے مکھن بھی لے لو۔"
اس نے مجھ کو ایک نظر گھور کر دیکھا ۔ اور چلا گیا ۔۔۔ وقت گذرتا
رہا ۔ ہم دونوں نے پتہ نہیں کتنی باتیں کر ڈالیں ۔ وہ اب
اپنے صوفے سے اٹھ کر میرے ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اور پھر
جب نوکر کھانا لایا تو ہم نے ڈٹ کر کھایا۔ رات ڈھل رہی تھی
آہستہ آہستہ میں نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نظر ڈالی ۱۲
بج چکے تھے۔ دل نے اس سے جانے کی اجازت چاہی لیکن وہ
مچل سی گئی اور پھر مجبوراً مجھ کو رکنا پڑا۔ پھر مجھ کو دوسرے کمرے
میں لٹا کر شب بخیر کہتی ہوئی چلی گئی۔ آخری جملے دیر تک میرے کانوں
میں گونجتے رہے "کوئی ضرورت ہو تو کال بیل دبا دیجئے گا کنیز حاضر ہو جائیگی"
میں بڑا خوش تھا۔ ریشم سے اس قدر باتیں ہوئی تھیں کہ شاید اب
کوئی بات ایسی نہ رہ گئی تھی کہ پھر کی جا سکے۔ ریشم ہی کو خیالوں میں
بسائے نہ جانے کب میں نیند کی آغوش میں سو گیا۔

صبح میں ذرا دیر سے بیدار ہوا۔ آٹھ بج چکے تھے
ایک انگڑائی لیتا ہوا جب میں اٹھا تو ریشم کی تصویر سامنے
ہی پڑ گئی۔ اور میں نے آنکھیں میچ لیں۔ مجھے پسینہ سا
آ گیا۔ بالکل برہنہ ریشم تصویر میں مسکرا رہی تھی ......
میں انگشت بدنداں اس تصویر کو تک رہا تھا ....
اور ایک الجھن میں گرفتار تھا۔ ..... سلیپنگ سوٹ
بدلنے کے لئے میں باتھ روم تک گیا اور جب میں نہا
دھو کر باہر نکلا تو ریشم کہیں نظر نہیں آئی .... ابھی
میں پکارنا ہی چاہتا تھا کہ رامو میرے پیچھے آ کر کھڑا ہوا....

"کیوں بابو کیا بات ہے۔"

"ریشم کہاں ہیں تمہاری مالکن"

"جی بابو جی کہہ گئی تھیں کہ وہ ذرا دیر میں آئیں گی۔
ضروری کام آن پڑا ہے اور مجھ کو کہہ گئی ہیں کہ خوب خاطر داری
کروں ... کیونکہ ...... وہ رک گیا .... پھر بولا... کیوں
بابو آپ بہت امیر ہیں کیا۔ شاید کروڑپتی ......

"تم کو کیسے معلوم ہوا ...." میں حیران اس کو
تکنے لگا۔

"بی بی جی کہہ رہی تھیں"...... بابو آپ ان کا
انتظار کریں ...... ہو سکتا ہے ابھی آ جائیں اور...

نسیم محمد جان
ایم۔ایس۔سی

ریت کی دیوار

وکیل صاحب کے سکھائے ہوئے جملے کریمن بار بار دہرا رہی تھی۔ آج اسے جج کے سامنے بیان دینا ہے اپنے ہی بیٹے اکرم کے خلاف۔ پوری امید ہے کہ اکرم کو سزا مل جائے گی اور ملنی ہی چاہئے۔ غلطی اسی کی تھی۔ موقع پا کر گھر میں گھس آیا اور اس سے پہلے کہ کریمن کچھ سمجھ پاتی اس نے دو چار ڈنڈے لگا دیئے۔ وہ تو قسمت تھی کہ بچ گئی، ورنہ اس نے تو جان سے ہی مار ڈالا تھا۔ کریمن کی جگہ دنیا کی کوئی بھی ماں ہوتی، تو وہی کرتی جو کریمن کر رہی تھی۔ وکیل صاحب کے الفاظ عدالت میں دہرانے ہی پڑیں گے اور اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آج کل بالکل صحیح بیان دے کر بھی تو کسی مجرم کو سزا نہیں دلائی جا سکتی ہے۔ وہ تو یہ کہیئے کہ اکرم پیسے والا نہ ہوا ورنہ معاملہ عدالت تک پہنچنے کے پہلے ہی رفع دفع ہو گیا ہوتا۔ پچھلے سال ہی تو مکھیا کے بیٹے نے اپنی بیوی کو تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا اور پیسوں کے بل پر صاف بچ نکلا۔ گاؤں کے ایک آدمی کی بھی ہمت نہ پڑی کہ پولیس کو صحیح بیان دے ورنہ کون تھا جسے حقیقت کی خبر نہ تھی اور فائدہ بھی کیا تھا؟ مرنے والی مر چکی تھی کسے شامت آئی تھی، جو مکھیا جی سے دشمنی مول لیتا۔ ممکن ہے اکرم کو عمر قید کی سزا ہو جائے۔ گاؤں والے تو یہی سمجھتے ہیں کہ جھگڑے کی وجہ زمین ہے، مگر کریمن جانتی ہے کہ دراصل اکرم کو یہ ناپسند ہے کہ اس کی ماں نے باپ کے مرنے پر دوسری شادی کیوں کر لی اور میاں غفور سے یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ ان کی بیوی اپنے پہلے شوہر کی اولاد سے اس قدر محبت کرتی رہے۔ کریمن بھی تو مجبور ہے

اکرم اس کی نشانی ہے جس سے اُسے بے پناہ محبت تھی، جس کی یاد ہر لمحہ ستاتی ہے، جو زندہ نہ رہنے پر بھی دل و دماغ پر اس طرح چھایا ہوا ہے۔ جیسے ابھی ابھی پاس سے اٹھ کر دروازے سے باہر گیا ہو۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے محبوب کی جیتی جاگتی نشانی کو جان سے عزیز نہ رکھتی اور پھر اکرم کی صورت اس کے پہلے شوہر منظور سے کتنی ملتی جلتی تھی۔ بالکل وہی آنکھیں، گول اور گھنی بھنویں۔ جب اکرم چار پانچ سال کا تھا، تو کریمن اسے دیکھتے دیکھتے جذبات سے مغلوب ہو کر چومنا شروع کر دیتی تھی اور اس وقت تک پاگلوں کی طرح چومتی رہتی جب تک کہ معصوم اکرم رونے نہ لگتا۔ میاں غفور بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ کریمن اب بھی ذہنی طور پر منظور کے ہی قریب ہے۔ سچی بات بھی یہی تھی۔ منظور کو کریمن نے اس وقت اپنایا تھا جب ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی کا ہو جائے اور کوئی اس کا ہو اور میاں غفور سے اس کی شادی اس وقت ہوئی تھی جب زندگی بوجھ بن گئی تھی۔ دراصل میاں غفور تو صرف ایک مزدور تھے۔ اس کی زندہ لاش کو ڈھونے کے لئے۔ غفور چاہتا کہ کریمن صرف اس کی ہو کر رہے۔ ماضی کی ہر یاد اس کے ذہن سے ایک خواب کی طرح نکل جائے اور اپنی ناکامی کا ذمہ دار اکرم کو ہی سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسی کی وجہ سے کریمن اپنے ماضی کو گلے لگائے بیٹھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اکرم اور غفور کے درمیان نفرت کا جذبہ خود رو پودے کی طرح پھیلتا گیا۔

مصیبت تو یہ تھی کہ ایک کریمن کو صرف ماں سمجھتا تھا، تو دوسرا صرف اپنی بیوی۔

اکرم کے دوستوں کا کہنا تھا کہ وہ غفور کو ہی ٹھکانے لگانے گیا تھا۔ مگر جب اس نے اپنی ماں کو دیکھا تو ایک خوابیدہ خیال جو ذہن کے کسی گوشے میں پڑا تھا اچانک جاگ اٹھا۔ سارے فساد کی جڑ تو یہی ماں ہے، کیوں نہ اسے ہی ختم کر دیا جائے۔ اگر یہ زندہ رہی تو پھر کسی غفور سے شادی رچائے گی۔"

کریمن خود بھی دوسری شادی کے خلاف تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد جب ہوش میں آئی، تو اس کا خیال تھا کہ بقیہ زندگی بھائی کے یہاں گذار دیگی۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد وہ وہاں بوجھ بن گئی، تو اس کی سہیلی مجیدن نے اسے سمجھایا کہ وہ دوسری شادی کرلے۔ بھائی جو کچھ بھی کرے گا وہ احسان ہی ہوگا۔ شوہر چاہے ساری دنیا کی دولت کا انبار بھی لگا دے فرض ہی سمجھا جائے گا۔ احسان اور فرض میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بس یہی سمجھو کہ ایک بھیک ہے، تو دوسرا حق۔ بات کچھ معقول معلوم ہوئی اور کریمن دوبارہ سہاگن ہو گئی۔ شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد کریمن یہ محسوس کرنے لگی کہ میاں غفور اکرم کو باپ کی شفقت نہ دے پائیں گے۔ اکرم اور غفور کے جھگڑوں میں وہ کبھی اکرم کو پیٹتی، تو خود کو کبھی برا بھلا کہتی۔ مگر جب معاملات اس حد تک سنگین ہو گئے کہ اکرم گھر چھوڑ کر غفور کے پرانے دشمن بھولا کے یہاں رہنے لگا، تو کریمن نے میاں غفور کا ہی ساتھ دیا۔

ہاں ایک رات کریمن نے جب مچھلی پکائی، تو اس سے رہا نہ گیا۔ کسی بہانے مچھلی سے بھرے پیالے کو آنچل سے چھپائے اکرم تک پہنچ گئی۔ مگر اکرم نے اسے اٹھا کر پھینک دیا اور ایک بھدی سی گالی دیتے ہوئے اس نے اسے ماں ماننے سے انکار کر دیا۔ کریمن گھر آنے پر کئی برسوں کے بعد جی بھر کر روئی تھی۔

اکرم کا کہنا تھا کہ زمین اس کے باپ کی ہے، اسے ملنی چاہئے اور میاں غفور کا کہنا تھا کہ زمین اس کے بیوی کے نام کی ہے۔ اس لئے اس زمین پر وہی قابض رہے گا۔ بھولا نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بات یہاں تک بڑھ گئی کہ کریمن موت اور زندگی کے درمیان ہچکولے کھاتی ہسپتال پہنچ گئی۔

وکیل صاحب کے کہنے کے مطابق کریمن کو یہ بیان دینا تھا کہ اکرم نے اس روز صبح کو ہی میاں شریف اور نعیم کے سامنے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔ میاں شریف اور نعیم تو ٹھیک کر لئے گئے تھے۔ دو اور گواہوں کو بھی تیار کر لیا گیا تھا۔ ایک کو کہنا تھا کہ جب وہ گھاس کھود رہا تھا، تو اکرم ڈنڈا لئے کریمن کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ دوسرے کو یہ کہنا تھا کہ جب وہ اپنی گائے تلاش کر رہا تھا، تو اس نے اکرم کو تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔

صبح کے سات بج رہے تھے۔ صرف ایک گھنٹے کے بعد شہر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ کریمن کھانا پکا رہی تھی کہ گاؤں کی بوڑھی تمیمہ آنکلی اور دعائیں دینے لگی۔

"جاؤ بیٹی، خدا کامیاب کرے، سچ کی جیت ہمیشہ ہوتی ہے۔ اکرم سی اولاد خدا دشمن کو بھی نہ دے"

"ہاں اماں! میں تو اس کے نام سے ہی پناہ مانگتی ہوں" اور سر سے آنچل ہٹاتے ہوئے زخم کے نشان دکھا کر کہنے لگی:

"کتنا گہرا زخم تھا۔ جب اس کمبخت نے اس ماں کو ماں نہ سمجھا، جس کے پیٹ سے جنم لیا تھا۔ جس نے رات دن ایک کر کے پالا، تو مجھے کیا جائے جیل، پڑے پھانسی۔ ایسی اولاد ہی کس کام کی، جو جان کی گاہک ہو۔"

دونوں کی گفتگو سن کر میاں غفور بھی کمرے سے نکل کر آگئے اور کریمن سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"گھبرا نہ جانا۔ عدالت میں بہت سے لوگ ہوں گے۔ خوب ڈٹ کر جواب دینا۔ یاد ہے نا!"

ہاں ہاں اچھی طرح یاد ہے' یہی نا کہ اکرم نے شریف
اور نعیم کے سامنے صبح کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی شام
کو اس نے ڈنڈے مارے' اس وقت سبز قمیص پہنے ہوئے تھا "
ڈنڈا لگتے ہی میں بیہوش ہو گئی ۔

ماں بیٹے کو سزا دلانے عدالت کے کمرے میں آ گئی تھی۔
میاں غفور کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اکرم کٹہرے میں لایا
جا چکا تھا۔ اس کی آنکھیں ماں کے چہرے پر جمی گئی تھیں
کریمن ہر ممکنہ کوشش کے باوجود اکرم سے نظریں نہ ملا پائی
تھی۔ اتنے میں وکیل نے سوالات شروع کر دیے۔

"تمہارا نام؟"

"کریمن"

"کس دن تمہیں چوٹ لگی تھی؟"

"اتوار کے دن"

"کیا وقت ہوا ہوگا"

"شام ہو گئی تھی"

"اکرم تمہارا اپنا بیٹا ہے نا؟"

"جی ہاں"

اور پھر اچانک کریمن کی نظروں کا تصادم اکرم سے ہو گیا
وہ گھبرا سی گئی۔ اسے چکر آنے لگا۔

"تم نے مارنے والے کو پہچانا تھا۔ کیا وہ اکرم تھا؟"

"جی جی نہیں میرا اکرم کہاں تھا' وہاں تو مجھے نعیم
کی گائے نے چبوترے پر مار گرایا تھا"

اور پھر میاں غفور اپنے گھر کے آنگن میں آپے سے باہر
ہو رہے تھے۔ جوتوں اور لاتوں کی بارش [illegible]
بری طرح پٹ رہی تھی۔ جب میاں غفور مارتے مارتے تھک
جاتے تو کہنے لگتے:

"جھوٹ' اتنا بڑا جھوٹ ...... اس کمینے کے لئے
...... جس نے ...... جان سے ہی ...... مار
ڈالا تھا ......"

اور دم لے کر پھر اپنا غصہ کریمن پر اتارنے لگے۔ آخر
ایک بار میاں غفور نے پوری طاقت سے دھکا دیا' تو وہ
گرتے ہی بیہوش ہو گئی۔ ہاں گرنے سے قبل اس کے منہ سے یہ
ضرور نکلا تھا:

"میں اکرم کی ماں ہوں اور تمہاری بیوی ہوں
دونوں میں کسی کو بھی برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی"

بقیہ عزیز ماموں

بتانے کے ساتھ ساتھ ایسا ٹھیک بھی کر دیتے کہ جھگڑا بھی ختم
ہو جاتا اور بات بھی رہ جاتی۔ آنے والے الگ الگ ہو کے
آتے۔ اور گلے مل کر خوشی خوشی ہنستے بولتے ساتھ جاتے۔

ان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ عید بقر عید ہو' یا
ہولی' دیوالی یا کرسمس۔ بس معلوم ہوتا کہ اگر تہوار ہے
تو سب سے زیادہ انہی کے یہاں۔ آج تک فیصلہ نہ کر سکا کہ
ان کے یہاں عید ملنے لوگ زیادہ آتے ہیں یا ہولی۔

مشرقی تہذیب' اخلاق اور وضعداری بھی ان پر ختم
سمجھئے۔ جب ماموں کسی سے ملتے تو ظاہر ہے ملنے والا رسماً کہتا۔
"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" اس پر ماموں جان مسکرا کر
کہتے "جناب مجھے ملنے سے زیادہ ہمیشہ ملتے رہنے میں خوشی
ہوتی ہے"۔ اور واقعی بات بھی یہی تھی' وہ ہجوم میں جیتے اور
ہجوم میں مرتے۔ نہ زندگی میں ملنے والوں کی کمی رہی اور نہ مرنے
کے بعد مٹی اور پرسہ دینے والوں اور یاد کرنے والوں کی اور
انہیں ان گنت یاد کرنے والوں میں ایک میں بھی ہوں۔
شاید ایسے ہی یادگار زمانہ لوگوں کے لئے کہا گیا ہے

ع "یاد رکھنا' فسانہ ہیں ہم لوگ"

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو ۔ لکھنؤ)

ظہیر نیازی روہتاسوی

خالص گھی اور گائے

منگلم ایک اسسٹنٹ انجینئر تھا۔ مگر مجھ سے وہ یوں پیش آیا تھا جیسے وہ میرا لنگوٹیا یار ہو! میں اس کے ماتحت کام کرنے والا ایک الیکٹریشین تھا۔ لوگوں کو ہمارے دوستانہ تعلقات سے رشک و حسد اور بری طرح جلن ہوتی تھی۔ منگلم جنوبی ہند کا رہنے والا تھا۔ مگر شمالی مشرقی ہند میں اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا تھا۔ اس لیے اس علاقہ کی زبان پر بھی اسے عبور حاصل تھا۔ اس کی زندہ دلی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی اور اسی خوبی نے مجھے اس کا ایک طرح گرویدہ بنا رکھا تھا۔ یوں بھی اس کی شخصیت، بھڑک ڈک اور ایک خاص نکھار سے بھرپور تھی ——! اگرچہ وہ سیاہ فام تھا!!

ہماری کوٹھی میں منگلم کو آئے ہوئے ابھی سال بھر بھی نہ ہوا تھا۔ مگر اتنی قلیل مدت میں اس نے میرے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے بڑے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ میرے علاوہ جن لوگوں سے اس کے گہرے تعلقات تھے ان میں ایک بوڑھے اکاؤنٹینٹ گنگولی بھی تھے۔ گنگولی بابو سے میں نے ہی اسے ملایا تھا۔ یہ بابو جی خود میرے پتاجی کے گہرے دوست رہ چکے تھے۔ گنگولی بابو پتاجی ہی کی کوٹھی کے بہت پرانے نوکر تھے۔ پتاجی تو منگلم کے یہاں بسنے کے کچھ ہی دنوں بعد وہ پرلوک سدھار گئے تھے:

اور پتاجی کی موت نے جو جگہ خالی کی اسے گنگولی بابو کی شفقتوں نے پر کر دیا تھا!!

میں اس کوٹھی ہی میں پیدا ہوا تھا۔ گنگولی بابو کی سب سے بڑی لڑکی سنیتا میری ہم عمر تھی لہٰذا انہوں نے سنیتا کے ساتھ ہی مجھے بھی گود کھلایا تھا ——!

منگلم کمپنی کی طرف سے لوکل پرچیز کرنے کلکتہ جایا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں دفتر میں اس کا سابقہ گنگولی بابو سے اکثر پڑا کرتا۔ ایک دن ان کی رسائی ان کے کوارٹر تک بھی ہو گئی۔ رسائی کی خاص وجہ یہ تھی کہ منگلم جنوبی ہند کے رقص کا ایک اچھا رقاص بھی تھا۔ اور گنگولی بابو کی لڑکیاں رقص سیکھ رہی تھیں۔ جب انہوں نے منگلم سے اپنی لڑکیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہا۔ مجھے عرصے سے ایک معقول استاد کی ضرورت رہی ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہوگی جو آپ میری لڑکیوں کو اپنی شاگردی کے لیے قبول فرما سکیں —! تو منگلم کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ مگر منجھے ہوئے استاد کی نقل اتارتے ہوئے بھی انتہائی نزاکت بھری انکساری سے کہا:

اجی میں کس لائق ہوں جی۔ پھر بھی آپ کی سیوا کر سکا

کوشش کروں گا

گنگولی بابو عینک چڑھی آنکھوں سے جھانکتے بڑی
معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے :
"میری نہیں لڑکیوں کی !"

"ابھی ایک ہی بات ہے جی !" یہ کہتے ہوئے منگم
نے بھی ہنسی نکال دی ! ایسے میں مجھے منگم ٹھیک اس بوڑھے
سیٹھ کی طرح لگا جو اپنی توند کے آگے روپیوں کی تھیلی
رکھے کسی نوخیز دوشیزہ کا سودا اس کے مجبور باپ سے کر رہا ہو۔
منگم میرا دوست ضرور تھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس
گھر میں قدم جمائے جس میں سنتیا رہتی ہو۔ سنتیا جو میرے
بچپن کی ساتھی تھی اور جس کی جوان سانسوں نے دل کی بے بایاں
دھڑکنوں اور امنگوں نے بھی یہی عہد کیا تھا کہ وہ زندگی بھر میری
ساتھ رہے گی ۔ اس کی رگ رگ میں میں اور صرف
میں سمایا رہوں گا ! ۔

لیکن منگم کو تو وہاں رقص کا جادو چلانا تھا ۔
اور وہ جادو اس نے چلایا ـــ جی بھر کے چلایا !!

منگم جتنا زندہ دل تھا اتنا ہی رنگین مزاج بھی : ۳۰ ، ۳۵
کے درمیان کا وہ ایک کالا اور موٹا مگر گٹھے ہوئے جسم کا مضبوط
آدمی تھا ۔ اس کی شخصیت میں کوئی شاعرانہ ڈھنگ کی کشش
نہ تھی ۔ پھر بھی وہ کبھی موقع اور مقام پر لڑکیوں کے، خوبرو دوشیزاؤں
کے اکھاڑے میں راجہ اندر بنا پھرتا تھا ۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا
والی بات تھی اس کے ساتھ ۔ لوکل پرچیز سے ہونے والی انکم
اور بڑی تنخواہ کو وہ ان لڑکیوں کے پیچھے ہی اڑا دیتا ! ان لڑکیوں
کے ساتھ ان کے خاندان والے بھی منگم کی فراخدلی سے فیض
حاصل کرنے میں پیش پیش رہتے !۔

مثلاً منگم ہر دوسرے تیسرے دن پکچر دیکھنے جاتا ۔
اور اپنے ساتھ اگر دو لڑکیوں کو بھی ساتھ لے جاتا تو ان لڑکیوں
کے ساتھ ساتھ دس ایسے افراد بھی پیچھے لگ جاتے جو ان کے والدین،
بھائی یا کوئی اور قریبی رشتہ دار ہوتے ـــ منگم نے اپنی
رنگ لیلیوں کے لئے بعض قدر حربے استعمال کر رکھے تھے
ان میں پکچر بازی کامیاب ترین حربہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ
کام کرنے والے بڑے چھوٹے آفیسر یا کلرکوں کو سنیما دکھانے
کے لئے دعوت دیتا، ترغیب دلاتا ۔ لوگ اس کی اس
دعوت کا شکار ہو جاتے اور اپنے ساتھ انہیں اپنی فیملی
کو بھی منگم ہی کے پیسے پر سنیما دکھانے میں ذرا بھی جھجک
نہ ہوتی ان میں سے کچھ لوگ ظاہری رواداری یا خالص
بناوٹی ڈھنگ سے سنیما ہال کی ٹکٹ کھڑکی کے قریب
جا کر اپنی جیب ٹٹولنا شروع کرتے بھی تو منگم انہیں ایک
ادائے خاص سے روک دیتا ۔

"ابھی رکھئے بعد میں حساب کر لیں گے !"

اور یہ "بعد میں" کبھی نہ آتا ! ہاں وہ سکوں کے
روپ میں ایسے دانے ڈال کر لڑکیوں یعنی خود اپنی زبان
میں چڑیوں کو پھانس پھانس کر اپنا "کھرا" حساب
ضرور صاف کر لیتا تھا۔ اور بات بھی کہ کتنی ہی چڑیاں
اس کے بچھائے ہوئے جال میں خود اپنی مرضی سے ہی پھنستیں تو
ان میں چند ایک ایسی بھی تھیں جو دھوکے کا شکار ہو جانے
کے بعد بھی شکاری کو چکمہ دے کر اڑ جایا کرتیں ! ـــ یہ سب
کچھ وہ مجھے بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتا تھا ۔ وہ مجھ
سے کچھ نہ چھپاتا تھا یہی وجہ تھی کہ میں اس کی رنگین مزاجیوں
سے نالاں ہوتے ہوئے بھی اس کے بارے میں یہ رائے
رکھتا تھا کہ وہ دل کا صاف ہے اور مجھے امید تھی کہ
اس کی اصلاح ہو سکتی ہے ۔ اسی لئے میں اس کا دوست
بنا ہوا تھا اور ہمیشہ موقع کا متلاشی رہتا کہ اس سے اصلاحی
باتیں کروں ۔ ایک دن مجھے یہ موقع مل گیا ۔ میں نے باتوں
باتوں میں کہا :

"منگم صاحب شادی کیوں نہیں کر لیتے"

"جب بازار میں خالص گھی مل جائے تو گھر میں گائے
پال کر اس کی سیوا کیوں کی جائے ؟"

"تو تم بازاری لڑکیوں کو خالص گھی اور بیوی کو کھرنا یو ہجو منی گائے سمجھتے ہو؟"

"اور سمجھا بھی کیا جائے؟"

"خیر یہ اپنا اپنا نظریہ ہے مگر آج کل بازار میں بھی خالص گھی کہیں دستیاب نہیں!"

"تم لوگوں کو دستیاب نہیں ہو سکتیں ایسے تو تو سب مال پیور اور فریش ہی ملتا ہے پیارے میں اپنی تنخواہ پانی میں نہیں بہاتا!"

"مگر تم جو ایک موٹی رقم رنگ رلیوں کی نذر کر دیتے ہو اس سے کئی افراد پرورش پا سکتے ہیں۔ اور نہیں تو چھوٹی بچتوں میں لگا دو۔ اس سے تمہارا مستقبل بھی شاندار طریقہ سے محفوظ رہے گا اور دیش کا بھی فائدہ ہوگا!"

"ارے یار پرکاش تم تو لیکچر دینے لگے۔ شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ گرانی اور قحط سالی کے اس دور میں مجھے اپنے عشق و معاشقے پر کنٹرول کر دینا چاہئے۔ تو سنئے سر یمان جی، یہی نہیں ہو سکتا۔ دیکھتے نہیں کھانے کو نہیں ملتا، مگر سینما ہال میں اکثر ہاؤس فل کی تختی لگی رہتی ہے!"....

اور اسی قسم کی دوسری اور باتوں کو چھیڑ کر اس نے میری ناصحانہ باتیں مخلصانہ مشورے اپنے سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیں!

گنگولی بابو کے یہاں رقص کرنے پاکر انہیں جب سے منگلم آنے جانے لگا۔ میں سنیتا اور پورے گنگولی گھرانے سے دور دور ادھر کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ سنیتا کی دونوں چھوٹی بہنوں نے تو گنگولی بابو نے شکایتیں کیں اور خود سنیتا نے بھی بار ہا اس تبدیلی کی وجہ جاننا چاہی میں ادھر ادھر کے جواب میں یوں ہی بہانا بنا کر رہ گیا مگر سنیتا کو ٹال دینا آسان نہ تھا۔ پھر میں خود مزدوا سے مل کر منگلم کے بارے میں سب کچھ بتا دینے کے لئے بے چین ہو رہا تھا اس لئے میں نے اس سے کہا ـــــ"

"میں نے تمہارے یہاں آنا جانا بالکل کم کر دیا ہے۔ اور بہت ممکن ہے میں تمہارے گھر بالکل ہی نہ آؤں ....."

"مگر کیوں پرکاش، کیوں؟" وہ تڑپ اٹھی اس کی صورت بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی!"

"وجہ کوئی خاص نہیں!" میں ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "ہاں میں تم سے پہلی اور آخری بار کہنا چاہتا ہوں کہ منگلم سے ہوشیار رہنا!" اتنا کہہ کر میں خلاء میں گھورنے لگا۔ وہ کچھ منٹوں تک مجھے مبہوت سی دیکھتی رہی پھر ایک نشتر کی طرح چیک اٹھی۔

"تمہارا مطلب ....." اس کے ماتھے کی سلوٹیں کچھ اس رنگ میں ابھریں کہ میں خلاء سے نہ جانے کتنی بڑا لکو واٹ کی طاقت اور تیزی سے پلٹا اور نگاہیں رخ محبوب پر جم کر رہ گئیں!

"میرا مطلب ہے! تم رقص سیکھتی ہو .... ضرور سیکھو مگر صرف کام سے کام رکھنا ....."

"تم شاید کہنا چاہتے ہو استاد کوئی ایسی ویسی فطرت کا آدمی ہے۔ مگر تم مجھے کیا کچا دھاگا سمجھتے ہو جو کسی کے چھوتے ہی ٹوٹ جاؤں گی۔ کیا تم نے مجھے بچپن سے اب تک اچھی طرح جانا پہچانا نہیں کیا تم میری نس نس کی حرکات و رفتار سے واقف نہیں ......"

"تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں جبھی تو تم سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہوں!"

"تو اسی پیار کی قسم تم اس گھر سے رشتہ نہ توڑو!"

..... سنیتا نے یہ آخری حملہ کر کے گڑگڑاتے ہوئے کہا تھا۔ مگر اس کے باوجود میں اس کے گھر کئی ماہ تک نہ گیا۔

اور وہ میرے گھر جب جب آئی میری بوڑھی ماں ہی اسے ملی۔ میں گھر پر موجود ہوتا نہ اس سے ملاقات ہوتی ایک آدھ بار راستے میں یا کہیں کسی تقریب میں ملاقات ہوئی بھی تو باتیں نہ ہو سکیں۔ میں ہی کترا کترا کر نکل گیا۔ ان سب موقعوں پر میں نے ہر بار یہی محسوس کیا میری بے رخی نے اسے بری طرح مجروح کر ڈالا ہے۔ مگر میں کیا کرتا مجبور تھا باتیں کرتا تو منگلم سے متعلق بھی کرنا پڑتیں۔ اور سنیتا ایسے میں مجھے غلط بھی سمجھ سکتی تھی۔ پھر بھی ایک بیقراری تھی جو دل ہی دل مجھے تڑپاتی رہتی یہ جاننے کے لئے کہ منگلم اس کے ساتھ کیا گل کھلا تا ہے؟

اس دوران میں نے منگلم سے بھی ملنا جلنا کم کر دیا تھا صرف ڈیوٹی ہی پر ہلکی پھلکی باتیں ہو جاتیں وہ میری اس تبدیلی کا سبب جاننا چاہتا اور میں ٹال جاتا۔

سنیتا سے میرا کیا رشتہ ہے یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اپنے پیار کی تشہیر کا میں شروع ہی سے قائل نہ تھا۔۔۔!

منگلم کا سایہ تک بھی میری سنیتا پر نہ پڑے یہی میری آرزو، یہی میری تمنا اور یہی میری کوشش و کاوش تھی۔ مگر سایہ تو سایہ اس کا پورا وجود ہی سنیتا اور گنگولی گھرانے پر چھایا ہوا تھا۔ اب میں کس زبان سے گنگولی بابو کے سامنے منگلم کے کالے کارنامے سناتا جبکہ میں نے ہی اپنی زبان قینچی کی طرح چلا چلا کر اس کے قصیدے پڑھے تھے گنگولی بابو کے سامنے۔

یوں میں نے ایک معمولی جھٹکے سے ایک دفعہ منگلم ہی کو اشاروں میں کہا تھا:

"دیکھنا بھئی اپنا جادو گنگولی گھرانے پر نہ چلانا ورنہ میرا بوڑھا کاکا ماتھا پیٹتا رہ جائے گا۔۔۔۔!"

مگر وہ بھلا اس جملے کو سیریس موڈ میں کیوں قبول کرتا بس مذاق سمجھ کر ٹال گیا!

ایک بار الیکٹرک شاول کی کارگزاری دکھانے کے لئے منگلم گنگولی گھرانے کو کوئلے کی کھلی میکانائزڈ کان میں اتار لایا۔ اصل میں وہ ان لوگوں کو الیکٹرک شاول نہیں بلکہ اپنی کارگزاری یا اپنے کارنامے دکھانا چاہتا تھا خصوصاً سنیتا کو۔ سنیتا کی دونوں بہنیں سمترا، سچترا، ایک چھوٹا بھائی اور خود گنگولی بابو بوڑھی بیوی اور اپنے بڑھاپے کا بوجھ لئے نئے زمانے کی نئی مشینوں کی زیارت کا شوق لئے منگلم کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

گنگولی خاندان میکانائزڈ کواری کی سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں دوڑتی پھرتی ڈمپروں اور ان کو لوڈ کرنے والی شاولوں اور دیگر مشینوں کو بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ سنیتا میری، میرے سامنے تھی مگر میں اس سے باتیں نہ کر سکا تھا۔ اس سے ایک بار نظریں چار ہوئیں۔ پھر پتہ نہیں کیوں نگاہیں جھک جھک گئیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ منگلم سب سے زیادہ سنیتا ہی میں دلچسپی لے رہا ہے اس وقت اس الیکٹرک شاول پر الیکٹریشین کی حیثیت سے میری ہی ڈیوٹی تھی۔ اور اپریٹر کی حیثیت سے کرنیل سنگھ کی۔ کرنیل مشین آپریٹ کر رہا تھا۔ اسے منگلم نے روک کر اس کی جگہ آپریٹنگ سیٹ پر اپنے کو جما لیا اور شاول چلا کر سب کو دکھانے لگا۔ سنیتا سے اس نے کہا تم باکیٹ میں آؤ میں اوپر کھڑا کر دوں جیسے لوز میں مدھو بالا "انسان جاگ اٹھا" میں کھڑی تھی!"

سنیتا نے نفی میں سر ہلا دیا!"

"اچھا تو پھر آؤ، آپریٹ کر کے دیکھو۔ ادھر سے یہ تو

الکٹرک پاور سے چلتا ہے سامنے تو صنف نازک کی انگلیاں
بھی بڑے نزاکت سے آپریٹ کر سکتی ہیں - آؤ دیکھو نا!"
جاؤ بیٹی حرج ہی کیا ہے جاؤ!"
گنگولی بابو بھی جب بول پڑے تو سنیتا منگل کی
طرف بڑھی مشین بہت اونچی اور بڑی دیو پیکر تھی ۔ لگی ہوئی
سیڑھی کے ذریعہ منگل نے سنیتا کے بازوؤں کو تھاما اور
اوپر اٹھا لیا - پھر اندر لے گیا اپریٹنگ سیٹ پر پہنچنے سے
پہلے کیبن سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر میں نے
دیکھا کہ منگل نے سنیتا کے چہرہ کو اپنی ہتھیلیوں میں لیا
اور چوم لیا .... پھر سرگوشی میں بولا :-

" دیکھو تم اک ذرا سا بھی مشین چلا دو گی تو تمہارے
علاوہ میرا بھی نام ہو جائے گا - نیچے ڈیوٹی پر موجود ڈمپر
آپریٹر بھی خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے کہ ایک ہندوستانی
لڑکی نے شاول چلایا یا چلاؤ گی نہ ڈارلنگ ......"

کہتے کہتے اس نے سنیتا کو دوبارہ چوم لیا - سنیتا مجھے
نہ دیکھ رہی تھی مگر میں بائیں طرف کی کیبن سے ان
دونوں کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا میرے لئے یہ منظر
انتہائی ناقابل برداشت تھا میرا جی چاہا کہ منگل کا گلا
گھونٹ دوں - مگر خود ہی خون کے گھونٹ پی کر رہ جانا پڑا
ہاں میں نے اتنا کیا کہ کینٹنگ پینل بورڈ سے گڑبڑ سی پیدا
کر دی - پھر اتفاق سے پاور بھی آف ہو گیا۔

میلو مشین سے اترو صاحب! یہ اچھا ہوا کہ پاور
آف ہو گیا ورنہ آپ کو بڑے صاحب کے سامنے تو کچھ
جواب دینا ہی پڑتا کہ مشین روک کر کام حرج کیوں کیا؟"
میں نے منگل سے کہا - سنیتا نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا
چاہا - مگر میں نے اس طرف نظریں اٹھائیں ہی نہیں جھکی جھکی
پلکوں کی اوٹ سے بس اسے چوری چوری دیکھتا رہا - جیسے
چوری اس نے نہیں میں نے کی ہو یا کرائی ہو - !

منگل نیچے اترا اس کے پیچھے سنیتا اور سنیتا کے
کے پیچھے میں - تھکا تھکا سا، بجھا بجھا سا، لٹا لٹا سا!!

جوں توں ڈیوٹی ختم کر کے منگل کے چھوٹے سے بنگلے
پر شام ڈھلے ہی جا دھمکا -

ارے پرکاش تم تو جیسے گھر کا راستہ ہی بھول
گئے تھے! - آؤ آؤ!! منگل نے لپک کر میرا استقبال کیا
میں ایک صوفے پر جم گیا اور بغیر کسی تمہید کے منگل کو مخاطب کیا۔

"سنیتا تمہیں پسند ہے نا؟"

"اچھا مال کسے پسند نہیں ہوتا!" سگریٹ کے
دھوئیں کے ساتھ منگل کا جواب فوراً ہی ابل پڑا!

" دیکھو یار تم عورتوں کو مال کہنا چھوڑ دو خصوصاً
سنیتا جیسی پیاری لڑکی کو!"

کیا تمہیں بھی وہ بہت پیاری لگتی ہے؟" منگل نے
اس سوال کے ساتھ آخر میں دکھتی رگ کو پکڑ ہی لیا، مگر
میں خاموش رہ کر ٹالتے ہوئے بولا -

"خیر یہ بتاؤ سنیتا سے تمہارے عشق کا معاملہ
کہاں تک جا پہنچا ہے؟"

" وہاں تک، جہاں تک دو نوجوان دلوں کو
پہنچنے کی ضرورت پڑتی ہے "

" ہوں!" میں ہوں!" کی آواز کے ساتھ اندر
ہی اندر ڈوبتا چلا گیا ....

"کیوں تمہیں خوشی نہیں ہوئی کہ تمہارا یار آج کل
خالص گھی کھا رہا ہے؟"

منگل کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے
کانوں میں گرم پگھلتا ہوا سیسہ کی طرح تیر گیا - میرا
جی ایک دم سے مشتعل ہوا کہ منگل کا منہ نوچ لوں -
مگر میرے دماغ نے اسی وقت دوسرے سمت انتہائی تیزی

سے کام کرنا شروع کر دیا ۔ اور اسی وقت میں ایک منٹ کی بھی تاخیر کئے بغیر وہاں سے اٹھا اور سنیتا کے گھر کی طرف دوڑا ـــــ!

سنیتا مجھے دیکھ کر کچھ نہ بولی اس کی آنکھیں پہلے ہی بھیگی بھیگی پلکیں ایک کرب کے ساتھ اٹھیں اور پھر ساون بھادوں کی برسات کی طرح برس پڑیں میرے سینے میں اپنا سر چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی! طویل ہچکیاں . . . . طویل تر سسکیاں!!

"نہ رو سنیتا! میں سب کچھ جان گیا ہوں . . . . ."

"یہ بھی کہ . . . . کہ میں ماں بننے والی ہوں . . . .؟"

اور مجھے تو کاٹو تو جیسے لہو نہیں بدن میں! میں ایک دم سے سکتے میں آ گیا ـــــ!

سنیتا ماں بننے والی ہے، تو منگلم اتنا آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے ایک انتہائی زبردست شاک لگا! میری اپنی سنیتا، دوسرے کسی غیر کی بیوی، غیر کے بچے کی ماں بنے گی . . . . . . ایسے منحوس دن دیکھنے سے پہلے میری موت ہی کیوں نہ آ جائے . . . . . . جی چاہا کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ ڈالوں . . . . . مگر میں نے اپنے کو سنبھالا اور منگلم کے گھر سے جو خیال لے کر نکلا تھا، اسے تقویت پہنچانے کے لئے اپنے آپ کو اندر سے مضبوط کرنے لگا۔

"سنیتی!" میں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور بولا ـــــ "سنیتی تم منگلم سے شادی کر لو!"

"پرکاش!" وہ ایک دم سے تڑپ اٹھی! "یہ تم کہہ رہے ہو پرکاش، میرا نہیں تو کچھ اپنا ہی خیال کیا ہوتا آخر تمہارے دل پر کیا گذرے گی؟ . . . . . اس کمینے نے مجھے دھوکے سے لوٹا . . . . . . اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جان بوجھ کر میں جیون ساتھی بن جاؤں اس کی؟"

"ہاں اس نے تمہیں دھوکے ہی سے لوٹا ہوگا میں اس کی فطرت سے بھی واقف ہوں اور تم سے بھی! وہ تم ہی تھیں جسے گنگولی کاکا اپنی ترقی کے لئے بڑے صاحب کے بنگلے پر چڑھانا چاہتے تھے پر تم نہ چڑھ سکیں . . . . . . اور سمترا سچترا جیسی ادھ کھلی کلیوں کو بڑے صاحب کے ہاتھوں مسلوا کر کاکا نے اپنی ترقی لے لی کاکا ہی کا ہاتھ تمہارے اس معاملے میں بھی ہے! میں ایک پل کو رکا پھر بولا "کاکا بھلا یہ کب چاہتے کہ ایک معمولی الیکٹریشین ان کا داماد بنے۔ داماد بنانے کیلئے انہوں نے منگلم کو استاد کے روپ میں تم پر سوار کیا۔ اور اس نے یہ سواری خوب خوب کی۔ پھر میں رک کر سنیتا کو ایک بار اور پیار سے بولا۔ اب منگلم سے شادی کر لینے میں ہی بہتر ہے سنیتی!" اور اس کے گال تھپتھپا کر دوبارہ منگلم کے بنگلے کی طرف دوڑ گیا۔

منگلم کے پاس پہنچتے ہی میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا:

تم سنیتا سے شادی کر لو۔

"شادی" وہ ایک دم سے چونکتا ہوا اچھل پڑا پھر اپنی پرانی دلیلیں دہرانے لگا ــ میں نے بڑی متانت سے اس کی ساری کمزور دلیلوں کو کاٹ کاٹ دیا اور آخر میں بولا:

تم سنیتا کے پیٹ میں پل رہے بچے کے باپ ہو اس حقیقت کا علم سنیتا کے علاوہ اس کے گھر والوں کو بھی ہے اب شادی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں!"

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ جو ایک دم سے غیر سنجیدہ کھلنڈر مزاج تھا اس وقت سر تھام کر تمام نشیب و فراز کو اپنی نظروں کے سامنے رقص کرتا دیکھ ہچکولے کھانے لگا

در میرے سامنے ہتھیار ڈالتا نظر آیا ! ـــ میں نے مسرتوں کے موڈ میں اس سے کہا ـــ

ویسے تم ہی بتاؤ اپنا جوٹھا کھانا، دوسروں کو کھلانا ان کی تہذیب ہے ؟"

ارے پرکاش، تم پھر ایلیشی دینے لگے .... ارے یہ کی تو تہذیب یہی ہے۔ میں نے ہی کتنی تھالیاں جوٹھی ہیں جو ایک دن بیوی کے روپ میں شوہر کو بھیج دی جائیں گی ۔ اور وہ زندگی بھر جوٹھی کھاتے ہوئے بھی یہی سمجھتے ہیں یا پھر "قناعت" کرنے پر مجبور رہیں گے کہ وہ اور ہی تر کھا رہے ہیں ..... ! پھر وہ سگریٹ کے دھوئیں کا مرغولہ بناتا ہوا خلا میں کچھ دیر گھورتا رہا اور عرصے بولا تو بولا :-

"خیر! خیر چھوڑو ان باتوں کو میں نے تمہاری بات مانی ہے۔ سنیتا بیشک میری بیوی بننے کے لائق ہے اس سے بہتر کوئی اور میری نظر میں نہیں !"

اور چند ہی دنوں کے اندر سنیتا منگلم کے گھر پہنچا کر بھیج دی گئی ۔ شادی سے صرف ایک دن پہلے میں نے سنیتا سے کہا تھا ـــ "آئندہ بچہ بھی منگلم کے ہی نطفے کا اور اسی کوکھ میں پرورش پائے یہی میری دعا ہے !"

اور جب سال بھر بعد سنیتا کے پیدا ہوئے بچے کے لئے کھلونے لے کر منگلم کے بنگلے پہونچا تو سنیتا اپنی ہیں پیارے سے منے کو لئے ہوئے تھی اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا ۔ دونوں کی زندگی مسرتوں کے بوجھ تلے دبی نظر آرہی تھی ! ! میں نے ازراہ مذاق منگلم سے کہا ـــ

"کیوں کیسی گذر رہی ہے پیارے خالص گھی ....؟"

وہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ میری بات کاٹتا ہوا بولا ـــ نہیں بھئی ۔ اب خالص گھی کے لئے بازار نہیں جانا پڑتا اب گھر میں ایسی پوتر گائے آگئی ہے جو مجھے آوارہ گردوں کی طرح ادھر اُدھر منڈلانے نہیں دیتی اب تو میں گھر کی اسی گائے کی پوجا کرتا ہوں ـــ !!"

بقیہ صفحہ ۷۷ کا

پھر اس کا سر نہ اٹھ سکا ۔ اس کے احساس پر وہ کاری ضرب لگی کہ وہ تڑپ اٹھا ـــ اور اسی دن اس نے اپنے شہر نگاراں کو خیرباد کہہ کر ایک بے نشان منزل کی راہ لی ـــ پھر کوئی اس کے نقش قدم بھی نہ پا سکا ـــ !!

اسلم صاحب اسے بہت دور چلا گیا ـــ لیکن وہ اسے نہ بھول سکی بلکہ اب تو وہ اسے اور شدت سے یاد آنے لگا ۔ وہ رات کی تنہائیوں میں سرد آہیں بھرتی اور سوچتی ہے ـــ اس نے کیوں ایسی بات کی کہ اسلم اس سے اتنی دور چلا گیا ـــ وہ اب اسلم کے لئے رات کی تنہائیوں میں سرد آہیں بھرتی ہے ۔ اور اس کی یاد سے اپنی راتوں کو سجا لیتی ہے تبھی اس کے منہ سے نکل جاتا ہے ـــ "اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر"!!

محترمہ اے ۔ بی انجم

اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

اس نے کتابیں میز پر پھینکتے ہوئے ہر روز کی طرح اپنی مرمریں باہوں کا گھیرا بھابی کے گلے میں ڈال دیا۔

"کیا بات ہے آج کچھ نڈھال سی معلوم ہو رہی ہو؟"

"بہت تھک گئی ہوں بھابی!"

"آرام کرو میں چائے بنواتی ہوں"

نہیں بھابی ابھی نہ اٹھو نہ جانے کیوں آج دل ڈوبا جا رہا ہے۔"

اب سمجھی۔ بھابی کی مسکراہٹ ایک سوالیہ جملے کی طرح کسی حادثہ کی غمازی کر رہی تھی۔

نہیں۔ نہیں۔ یہ آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ میں تو اچھی بھلی ہوں۔ اس نے بھابی کی مسکراہٹ کو اپنے قہقہوں میں سمونا چاہا لیکن بے جان قہقہے ان مسکراہٹوں کی تاب نہ لا سکے۔ نکہت نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "میری بنو تم اس حسین دنیا سے ہمکنار ہونا چاہتی ہو جہاں تجربات کی روشنی اپنے دریچوں سے ایک زندگی کو روشنی بخش رہی ہے۔ جہاں امنگوں کو آبِ حیات ملتا ہے خیالوں کو جلا نصیب ہوتی ہے اور دل کی تاریک وادی میں رنگین تصورات کی شفق دئے جلاتی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود کو کسی کی نذر کر دیا جائے ـــ بولو تیار ہو؟"

نہیں ـــ ایک وقار تھا، ایک عزم تھا، اس کے انکار میں۔ "یہ دل میرا ہے اور صرف میرا رہے گا۔" مجھے کسی کی غلامی منظور نہیں۔ اور بھابی رہا نذرِ جان کا سوال تو اس کے لئے عمر پڑی ہے۔ کیا زندہ رہنے کے لئے یہ ضروری ہے؟ زندگی تنہا بھی تو گزاری جا سکتی ہے۔"

نہیں میری بنو! تم ابھی نادان ہو تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ تنہائی زندگی کو ڈس لیتی ہے صوفیا! برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔"

بھابی آپ کیوں ایسی باتیں کرتی ہیں۔ آج تک میں نے اپنی زندگی کا کوئی راز آپ سے چھپایا ہے؟ ماں کے مرنے کے بعد آپ نے مجھے یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ میں ماں کے پیار بھرے آنچل کے سائے سے محروم ہو چکی ہوں۔ تم سے اپنے دل کی کوئی بات چھپا سکتی ہوں؟"

"تم نے کبھی محبت میں دھوکا تو نہیں کھایا؟"

"جی! ـــ بھابی نے اس کی پلکوں پر جھلملاتے تارے دیکھ لئے۔ اسی وقت بچوں کا ایک ریلا کمرے میں انٹی کی جے گان گاتا ہوا داخل ہوا۔

"انٹی ہم بڑی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔"

"امی! اس نے مجھے مارا ہے"

"امی! چلو کھیلنے" ـــــــ وہ مچل گئے۔

اور نکہت کی ایک تلخ ڈانٹ نے بچوں کے جذبات کو سرد کر دیا تھا کہ اسی لمحہ صہبا کی مسکراہٹ سے وہ کرن پھوٹی جس نے نکہت ہی کے دل کو ضیا بار نہیں کیا، ان ننھے ننھے پودوں میں بھی وہ جان پیدا کر دی جس کے لئے وہ بیتاب تھے۔

"چلو میں چلتی ہوں ـــــــ" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

تھوڑی دیر پہلے کی اداس اور سنجیدہ صہبا نہ جانے کہاں گم ہو گئی اس کی جگہ ایک نئی صہبا تھی جس نے بچوں کے کھیل میں بچوں ہی کی طرح شرارت کا روپ دھار لیا تھا۔

یہ دیکھ کر نکہت مسکرا دی ـــــــ وہ سوچنے لگی۔

یہ صہبا کیسی لڑکی ہے ـــ؟ یہ کیسی پہیلی ہے ـــ؟ ابھی کتنی سنجیدہ تھی۔ پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ خیالوں میں اداسی کا بادل امڈا آ رہا تھا۔ اور اب بچوں کی ٹولیوں میں کودتی پھرتی نظر آ رہی تھی۔ جیسے اس نے کبھی غم کی دہلیز پہ قدم ہی نہ رکھا ہو۔ مصائب سے کبھی سرگوشی نہ کی ہو۔ تلخیٔ حیات سے کوسوں دور ہو۔

نکہت اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اندر سے آواز دے کر اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ابھی رات صہبا نے عجیب بہکی بہکی باتیں کیں مگر صبح وہ بہت ہشاش بشاش تھی ایک تازہ گلاب کی طرح جس نے بہاروں کی گود میں شگفتگی پائی ہو۔ نسیم سحر کی گدگدی سے لطف اندوز ہوتی ہو اور سورج کی شعاعوں کے سرخ شعلوں نے لعل بدخشاں جیسا حسن عطا کیا ہو اس کے سارے گھر میں مسرت کے خزانے لٹائے۔ بھابی کو بہن کا پیار ملا بھابی کو نند سے قدر و منزلت ملی اور بچوں کو وہ سب کچھ حاصل تھا جس کے وہ مستحق تھے۔ آج کی صبح اپنے ساتھ نہ جانے کسی خوشی کا پیغام لائی تھی جو بھیا اور بھابی کے لئے موجب مسرت تھی اور باعث حیرت بھی! اور اب صہبا چائے کا انتظام کر رہی تھی

"صہبا"! اس کے سامنے اسلم کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"اوہ اسلم بھائی آپ؟ اس نے کہا آداب عرض ہے! واہ خوب آئے آج۔ آپ نے کئی دنوں کے بعد زحمت فرمائی ہے؟ خالہ امی کی طبیعت کیسی ہے؟ شمع تو مزے میں ہے نا؟ شادی کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے آج تو خیر سے آپ میں بھی کچھ تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں۔ بڑی خوش قسمت ہوگی وہ لڑکی جس سے آپ کی شادی ہوگی! وہ اسلم کو بولنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی اس کی مسلسل بکواس سے اسلم چیخ پڑا ـــــــ صہبا!"

اسلم اتنی زور سے چیخا کہ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔

اللہ اسلم بھائی آپ کی چیخ نے تو میرے کان کے پردے اڑا دیئے! اس نے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا ـــــــ یہ تند و توانا چیخ شاید ناشتہ کی زیادتی کی مرہون منت ہے لیکن ایسا بھی کیا کہ ناشتہ آپ کے سامنے ہو اور آپ ـ ـ ـ" اس نے بہت مشکل سے اپنے جذبات سے پر قابو پایا تھا ـــ "مجھے سمجھنے کی کوشش کرو صہبا!" اس کے جملے میں بے اعتنائی بھی تھی اور پیار و محبت کے زمزمے کی رعنائی بھی۔

"بس اتنی سی بات پر آپ برس پڑے؟ ـــــــ"

"مذاق بند کرو صہبا ـــــــ میں سنجیدہ ہوں"

"ایں ـــ تو آپ کو اسلم بھائی کے بجائے سنجیدہ بھائی کہا کروں۔ اچھا بھلا نام بدل ڈالا آپ نے خیر ـــ اچھا ہم یہی کہہ کر پکارا کریں گے ـــ جیسی آپ کی مرضی ـــ جس میں آپ کی خوشی!"

"کیا سچ مچ تم میری مرضی اور خوشی کا احترام کرتی ہو ـــ؟"

" اے کیوں نہیں!"

" تو میرے سوالوں کا جواب دو۔ میں آج اسی کے لئے آیا ہوں!"

" ارے اسلم بھائی آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں حساب میں ہمیشہ سے صفر ہی رہی۔ آپ کسی اور سے حل کرا لیجئے نا۔"

" صہبا خدا کے لئے مذاق بند کرو۔ ایک لمحہ سنجیدگی سے ذرا غور کرو۔ میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو — آخر تم مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہو۔ اگر مجھے محبت نہیں دے سکتی ہو تو نفرت تو نہ کرو۔ مجھ سے میری زندگی کا حق نہ چھینو — دو گھڑی سکون سے باتیں تو کر لیا کرو۔ میں جانتا ہوں صہبا تمہارے ارادے بہت بلند ہیں۔ خیالات بہت اونچے ہیں وہاں تک میری رسائی نہیں۔ مگر زندگی کا یہ مطلب تو نہیں۔ انسان صرف اپنے لئے جئے۔ صرف اپنی خوشیوں کا احترام کرے۔ زندگی تو وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ اگر تمہاری نگاہ التفات کسی مایوس کی زندگی بدل سکتی ہے تو کیا تم اسے اپنی خوش قسمتی نہ سمجھو گی۔ کیا تم یہ نہیں کر سکتی کہ میری زندگی زندگی بن جائے!"

اسلم بھائی میں بہت مجبور ہوں — صہبا تڑپ اٹھی جیسے اس کے دل کا سارا درد ابھر آیا ہو — خدا کیلئے یہاں سے چلے جائیے۔ بھائی جان آتے ہی ہوں گے۔ میں کچھ نہیں کر سکتی — سمجھے نہیں۔ میں آپ کے ساتھ قطعی مذاق نہیں کرتی میں تو خود اپنی زندگی سے مذاق کر رہی۔ جو خود اپنی زندگی کو خوشگوار نہ بنا سکا ہو وہ دوسرے کے چمن میں کیسے بہار لا سکتا ہے۔ ہر وقت میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر کا یہ مطلب تو نہیں کہ میری زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلے ہیں۔ میری قہقہوں میں زندگی کی دھنک نہیں جسے خوشی سے تعبیر کریں۔ خوشی میں غم کی کسک زندگی کی بہاروں میں ایک ایسا کانٹا ہے جو ہر لمحہ چبھتا رہتا ہے۔ کاش — کاش میں کچھ بتا سکتی — صہبا کی نگاہ سے اسلم اوجھل ہو چکا تھا اور اس کے قہقہوں کے زیر و بم [illegible]ے بدلے سے انداز لئے ہوئے تھے جس نے ہر وقت زندگی کے ساز کو درد آفریں بنائے رکھا —

اور پھر — ایک دن اس کے بھیا نے اس کی شادی ایک ذی وقار خاندان کے اکلوتے لڑکے سے کر دی سب کو خوش اور مسرور رکھنے والی صہبا آج سب کے دل کو ایک درد بخش کر چلی گئی۔ کسی کی دنیا کو پامال کر کے اپنی آرزوؤں کو پروان چڑھانے اپنی خوشیوں کی منزل پانے —

اس کی خیریت کے خط برابر آتے رہے۔ بھابی اور بھیا کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ انہیں فرض کی ادائیگی سے نجات جو مل گئی تھی۔ صہبا بھی خوشیوں سے ہمکنار تھی۔ سب کچھ تو تھا اس کے پاس۔ پیار کرنے والا شوہر سکھ بھری زندگی کے لئے آرام و آسائش کے سامان لیکن کل کی بات کون جانتا تھا۔

اور آج — صہبا کی بھابی کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ اس کے بھیا دیوانوں کی طرح مکان کے ہر در و دیوار سے ہمکلام تھے اور اسلم کے ہاتھوں میں صہبا کی بدقسمتی کا تار یوں لرز رہا تھا جیسے پُرسکوت لہروں کو کسی نے چھیڑ کر منتشر کر دیا ہو اور سکون و قرار لٹ گئے ہوں۔

صہبا کے شوہر کا انتقال — لیکن بھابی یہ ہوا کیسے — انہیں کیا ہو گیا تھا؟" اسلم کہہ رہا تھا — "صہبا یہ غم کیسے برداشت کر سکے گی۔ اسے وہاں سے لے آنا چاہئے۔ اس کی زندگی کو کسی ہمدرد کی ضرورت ہے۔ سسرال کے طعنے وہ کیسے برداشت کرتی ہو گی۔ ابھی تو اس کے ارمانوں کی کلیاں پھول بنے والی تھیں۔ ابھی تو صہبا نے مسکرانا سیکھا تھا۔ ابھی تو اس نے شوہر کی آغوش میں سکون کی سانس بھی نہ لی تھی کہ وہ داغ مفارقت دے گیا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی

ـندگی کی بہاریں خزاں کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ نکہت ـ دریچے میں
بچے ماں کو روتا دیکھ کر آپا کے پاس چلے گئے تھے۔ اسلم چلا گیا
صہبا کے بھیا شام کی ٹرین سے جانے کی تیاری
کرنے لگے۔

شام کو اسلم پھر آگیا۔ کھویا کھویا، اداس
اداس۔ سب لوگ بڑے کمرے میں جمع تھے۔ سبھی کے
ذہن کسی گہری سوچ میں حیران اور پریشان تھے ——
یہ کیا ہو گیا —— کیسے ہو گیا —— ؟ باہر کچھ آہٹ
ہوئی۔ سب کی نظریں اٹھ گئیں۔ سامنے لٹی ہوئی صہبا
کھڑی تھی!! درد و غم کا مجسمہ —— ایک بے جان
لاش ——!!

بھابی چیخ مار کر لپٹ گئیں۔ صہبا کیا ہو گیا میری
گڑیا —— یہ کیا ہو گیا تمہیں ——؟!

بے جان مورتی کو صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ اس کی آنکھیں
بھیا اور بھابی نے صہبا کی تسلی کے لئے نہ جانے کتنے عنوانات
کا سہارا لیا لیکن کھوکھلے الفاظ سے صہبا کی دلجوئی کیا
ہوتی۔ اس کا تو سنگار لٹ چکا تھا۔ دفورِ غم میں اسے
کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ اسلم نے پانی کے چھینٹے مارے صہبا نے
بے جان آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور آنسوؤں کی
دو موٹی سی لکیر اس کے مرجھائے ہوئے گالوں پر رینگ
گئی وہ اب بھی خاموش تھی —— ساکت و
صامت تھی!

اسلم آتا رہا۔ صہبا کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش
کرتا رہا لیکن صہبا کا غم کم نہ ہوا۔ محفلوں کی رنج روان
اب ایک کمرے میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ دنیا سے بے نیاز
لوگوں سے بیگانہ۔ سب کے غموں کو بانٹنے والی صہبا
اب صرف اپنے غموں کو ڈھونڈنے کی ناکام جدوجہد
کرتی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔

لیکن آخر کب تک —— ؟ موت بھی تو
بس کی نہیں اور جینے کے لیے سہاروں کی ضرورت ہوا کرتی
ہے۔ وقت دل کے زخموں کو بھرنے کے لئے سب سے بڑا
مرہم ہے مستقل غم غم کے احساس کو کم کر دیتا ہے۔ صہبا بھی
حالات سے سمجھوتہ کرنے لگی تھی، اور دیر سویر گھر کے کاموں میں
ہاتھ بٹانے لگی تھی۔

ایک دن وہ لان میں کھڑی پھولوں کی کیاریوں
کو دیکھ رہی تھی کہ اسلم آگیا

"صہبا ——!"

"جی ——"

"یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"ان پھولوں کو دیکھ رہی تھی جو مالی کی بے پروائی سے
اپنی زندگی سے مایوس ہو رہے ہیں۔"

"کیا پھولوں کی تازگی کے لئے مالی کا ہونا ضروری
ہے؟"

"اگر مالی نہ ہو تو ان پھولوں کی پیاس کون بجھائے گا۔
ان کی حفاظت کون کرے گا؟"

اور انسان بھی تو ایک پھول کے مانند ہے۔ اس بارے
میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"انسان ہر حال میں جی سکتا ہے"

"نہیں صہبا! زندہ رہنے کے لئے بھی سہارے کی
ضرورت ہوتی ہے"

"لیکن زندہ رہنے کی چاہ ہو تب نا!"

پھول مرجھانے پر شاخ کو عزیز ہوتا ہے کہیں مرجھانے
پر شاخیں انھیں جدا کر دیتی ہیں۔
جب تک تیز و تند ہوا کا جھونکا نہ آئے ——"

"بھلا اپنا آشیانہ کسے عزیز نہیں۔ کوئی منزل پا کر
منزل سے دور ہونا چاہتا ہے؟"

"اگر منزل کھونے کے بعد پھر منزل مل جائے تو!"
اسے خوش قسمتی کہا جا سکتا ہے۔"

"کیا بہار کے بعد خزاں ضروری ہے ؟"

"ہاں ورنہ بہار کے حسن کا راز راز ہی رہ جائے"

اور خزاں کے بعد بہار ؟"

خوشبوؤں کا پیغام لاتی ہے ۔ زندگی بخشتی ہے"

اور صہبا ۔۔ " اسلم کی آواز کانپ رہی تھی ۔۔۔"

"میں آج بھی صرف تمہیں ۔۔۔" کہتے کہتے رک گیا پھر بولا " صہبا زندگی سے پیار کرو ۔ تمہاری زندگی کی دوسروں کو بھی ضرورت ہے ۔۔۔"

صہبا کی شادی کے چرچے گھر میں ایک بار پھر ہونے لگے ۔ اسلم کے ساتھ ! وہ بالکل خاموش تھی اس کی اداسی پہلے سے اور گہری ہو گئی تھی ۔ اسلم کی خوشی کی انتہا نہ تھی کتنی مرادوں کے بعد یہ منزل قریب آئی تھی ۔

شادی کے صرف چند دن رہ گئے تھے ۔ آج صہبا ہر روز سے زیادہ خاموش تھی صبح سے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی ۔ بھابی سوچ رہی تھیں یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو ! اتنے میں صہبا آ گئی

"بھابی ۔۔"

"کیا ہے صہبا ۔۔ ؟"

میں کچھ کہنا چاہتی ہوں ۔۔

بھابی کا ماتھا ٹھنکا ۔ دل دھڑک اٹھا ۔ لیکن انہوں نے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا ۔۔ " کیا ۔۔ ؟"
نکہت اس سے آگے کچھ اور نہ کہہ سکی ۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا ۔ وہ صہبا کی فطرت کو بخوبی جانتی تھی کہ جس بات سے وہ منکر ہو جائے پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں منوا سکتی !"

نکہت کے کانوں میں صہبا کے الفاظ ہتھوڑے بن کر برس رہے تھے ۔۔۔ " بھابی خدا کے لئے میری بدقسمتی کو اسلم کے ساتھ وابستہ نہ کرو ۔ اس نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے اس کی زندگی برباد نہ کرو ۔ اسے روشنی کی ضرورت ہے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی نہیں ۔ مجھ پر بھی رحم کرو بھابی ۔ ایسا نہ ہو کہ میں ساری عمر اس خیال میں تڑپتی رہوں کہ میں نے اسلم کے ساتھ زیادتی کی ہے ۔ جب میرے اچھے دن تھے تو اسے ٹھکرا دیا اور جب میرے برے دن آئے ہیں تو اس کی دنیا اپنی تاریک قسمت سے اندھیری کرنا میری خود غرضی ہو گی ۔ دھوکا ہو گا فریب ہو گا !"

"لیکن صہبا سوچو" ۔۔۔ نکہت کہنے لگی ۔۔۔ " غور کرو ۔۔۔ اس پر رحم کرو ۔۔۔ وہ اب بھی تمہیں اپنی زندگی کہتا ہے !"

" وہ نادان ہے !" صہبا نے کہا ۔۔۔۔ کچھ دنوں میں یہ جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا ۔ میں تو ایک باسی پھول ہوں بھابی ! اسے خوشبو نہ بخش سکوں گی ۔ میں اس کے ارمانوں کا خون نہیں کرنا چاہتی ۔۔۔۔ اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے ۔ مجھے یوں ہی تڑپ تڑپ کر مر جانے دو ۔ تڑپنے میں لذت ہے سسکنے میں میرے لئے زندگی ہے ۔۔۔ اسلم کو کسی اچھے سہارے کی ضرورت ہے جو اس کی زندگی کو زندگی بنا سکے ۔ ایک زندہ لاش کو وہ کب تک گھسیٹے گا !"

صہبا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔۔۔۔ پھر بھابی سے بولی ۔۔۔۔

مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیجئے بھابی میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی ۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میرا منحوس سایہ اس پر پڑے ۔۔۔ وہ دیوتا ہے بھابی تم دیکھتی نہیں کہ میری اتنی بدنصیبیوں اور تیرہ بختیوں کے باوجود بھی وہ مجھے کس خوشی سے اپنانے کو تیار ہے ۔ کیا یہ اس کے کردار کی بلندی نہیں ۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتی ۔۔۔۔ میں اس دل کو کیا کروں جو اب کسی کو اپنی دنیا میں بسانے کو تیار نہیں ۔ میں اس خیال کو کیا کروں کسی طرح ہمیشہ کے لئے بچھڑنے والے شوہر کو فراموش کرنا ہی نہیں ۔۔۔۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تاکہ میں ان کے خیال ہی سے پیار کر سکوں اور جی سکوں ۔ یہ حق بھی مجھ

نہ چھینو کہ میں اس کا تصور بھی نہ کرسکوں۔ میں کسی لمحہ ان کے خیال کو اپنے دل سے دور کرنا نہیں چاہتی ــــ اپنے دل سے دور نہیں کرسکتی ــــ کیا اسلم کے دامن سے بندھ جانے کے بعد میں انہیں یاد کرسکوں گی؟ کیا یہ اسلم کے ساتھ دھوکا نہ ہوگا۔ خدا کے نزدیک گناہ کی مرتکب نہ ہوں گی ــــ یہ شادی نہیں ہوگی بھابی! کبھی نہیں ــــ میری تقدیر میں خوشی نہیں۔ مقدر نے میرا دامن کانٹوں سے بھر دیا ہے تو اسے پھولوں سے اب کوئی نہیں بھر سکتا۔ یہ کانٹے پھول کیسے بن سکتے ہیں ــ!"

نکہت خاموش تھی ــــ ہر بار کی طرح وہ اس بار صہبا کے کردار اور خیالات کی گتھیوں کو سلجھانے میں لگی ہوئی تھی ــ اور باہر اسلم کھڑا پھر ایک بار اپنی بدنصیبی پر مسکرا رہا تھا ــــ بے اختیار ہوکر وہ کمرے میں چلا آیا۔ بھابی کو نظر انداز کرکے وہ صہبا سے کہہ رہا تھا ــــ مجھ پہ رحم کرو صہبا ــــ تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے! تمہارے بغیر میں ایک پل بھی جی نہ سکوں گا۔"

اسلم بھائی زندگی ہے تو بہرطور گذر جائے گی ــ"
مگر مجھے مجبور نہ کیجیے میں کوئی اور قدم اٹھاؤں

"بولو ــ بولو آگے کہو صہبا!"

مجھے خودکشی پر مجبور نہ کیجیے۔ مجھے اپنی زندگی اپنی ذات سے نفرت ہے اپنے وجود سے نفرت ہوچکی ہے۔ یہ زندگی جو نہ صرف میرے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی باعث آزار بن چکی ہے اسے ختم کردوں گی ــــ میرے بھیا! وہ میرے سامنے نہیں آتے۔ میری بے بسی ان سے دیکھی نہیں جاتی۔ بھابی قدم قدم پر بچھی جاتی ہیں وہ میری خوشیوں کو واپس لانے کے لئے پریشان ہیں۔ اور آپ ــــ؟ اتنی بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ ان سارے احسانوں کے بوجھ کو میں کس طرح اٹھا سکوں گی۔ اسلم بھائی اب میرے پاس اتنی سکت نہیں ہے اب میں اس جان کو ختم کردوں گی ــ!

نہیں تم زندہ رہوگی!! ــــ اسلم ایک نئے عزم کے ساتھ بول اٹھا ــــ "یہ میری زندگی کی بہت بڑی آرزو تھی کہ تمہیں اپنی بنا لوں۔ لیکن آج اس آرزو نے دم توڑ دیا ــ میں جا رہا ہوں تاکہ تم جی سکو۔ اگر زندگی میں کبھی میری ضرورت محسوس ہو تو اپنے اس پرستار کو یاد کرلینا میں حاضر ہوجاؤں گا کہتے ہیں چاہت میں اثر ہوتا ہے ــــ یہ کتنی غلط بات ہے۔ ــ" اسلم ایک بھیانک قہقہہ لگا رہا تھا۔ بھابی حیرت سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ صہبا رو رہی تھی۔

اسلم نے صہبا کے سر پہ ہاتھ رکھا ــ روؤ نہیں صہبا ــ!" زندگی ہے غم و مسرت کا مختصر اور طویل افسانہ "مجھے دیکھو جس کی قسمت میں دو چار دن کی یادوں کے اور بے نام سی آرزو کے سوا کچھ نہیں رہا اور اب ــــ؟ تم اسے بھی چھین لینا چاہتی ہو اور بھول جانے کی بات کر رہی ہو ــ میں اور تمہیں بھول جاؤں ــ؟ جذبات پر اختیار ہے۔ مگر اس دل کا کیا کروں جو کسی طرح مانتا ہی نہیں اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ گلا رندھ گیا۔ اس دل پر صرف تمہاری تصویر نقش ہوچکی ہے۔ وہ کبھی نہیں مٹ سکتی لیکن تم کیوں رو رہی ہو صہبا! ایک بار صرف ایک بار کہہ دو کہ تم نے مجھ سے نفرت نہیں کی۔ تاکہ میں سکون سے مرسکوں!"

اسلم بھائی صہبا پھوٹ پڑی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ زندگی میں پہلی بار آج بھابی نے اس کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

اسلم بھائی ــــ میں ــــ میں ــــ
خدا کے لئے اب کچھ نہ کہیے ــ کچھ نہ سنئے ــ ورنہ ــ" جیسے اس کے دل نے سب کچھ کہہ دینا چاہا ہو جس کا رازدار صرف اس کا دل تھا۔ مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ مگر صہبا کے الفاظ اسلم کے دل پر بجلی کی طرح کوند گئے اور وہ اس اظہار تمنا پر اتنا مشتعل ہوا کہ

(باقی آئندہ)

کہانی

فرار کے بعد

احمد مشکور

جیل کے برآمدے میں ٹہلتا ہوا مضطرب جیلر اچانک ٹھٹک گیا۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور قیدی کی کوٹھری کے سامنے رک کر بولا۔

"کرشن ۔ اس وقت رات کے نو بجے ہیں۔ کل صبح چھ بجے تمہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے گا"۔۔۔۔ ۔۔۔۔ یہ عمر اور موت کی سزا افسوس ۔"

"مگر مجھے اپنی موت کا کوئی غم نہیں ۔۔" کرشن سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر بولا۔

"کیا تمہاری دق کی مریض ماں اور کنواری بہن کل تمہیں پھانسی کے تختے پر لٹکتے دیکھ سکیں گی۔

"بس کیجئے جیلر صاحب" کرشن نے درمیان میں اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا ۔۔ "ایسی دل شکن باتیں نہ کیجئے ۔۔"

"پھر ۔۔" جیلر نے کہا ۔۔ "پھر تم میرا کہنا مان لو اور اور جیل سے فرار ہو جاؤ ۔"

"نہیں نہیں میں ایسا کرکے آپ کو مصیبت میں گرفتار نہیں کر سکتا۔ آپ کو معلوم ہے اس کا انجام کیا ہوگا آپ گرفتار کر لئے جائیں گے اور مقدمہ چلے گا ۔ سزا ہوگی اور نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مجھے معلوم ہے ۔۔ مگر کیا کروں کرشن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں ۔۔ میں تمہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔"

"مگر کیوں؟ ۔۔ کیا اس جیل میں پھانسی کا یہ پہلا واقعہ ہے؟

"نہیں ۔۔ سیکڑوں قاتل یہاں پھانسی پا چکے ہیں۔

"پھر آپ کیوں پریشان ہیں ۔۔ جیلر صاحب ۔۔ میں فرار ہو کر دوسرا پاپ نہیں کر سکتا ۔۔ میں نے خون کیا ہے مجھے سزا ملنی ہی چاہیئے ۔

"کرشن ۔۔" جیلر کا لہجہ انتہائی جذباتی ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور ایک باپ کا پیار امنڈ آیا کرشن تمہیں نہیں معلوم کہ تم میرے راجندر سے کتنی مشابہت رکھتے ہو۔ راجندر میرا اکلوتا لڑکا بی اے کے پہلے ہی سال میں تھا کہ یونیورسٹی کے ایک اسٹرائک میں گولی کا نشانہ بن گیا ۔۔ آہ کرشن میں تمہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ تم فرار ہو جاؤ ۔۔ جلدی کرو میری بات مان لو ۔۔ آؤ باہر آ جاؤ ۔۔"

جیلر نے آہستہ سے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔

کرشن باہر نکل آیا اور رات کے ٹھیک ساڑھے نو بجے وہ جیل کی کوٹھری سے فرار ہو گیا ۔ برسات کا موسم، موسلا دھا

بارش، اندھیری رات، ایسی خوفناک اور سیاہ رات میں
کرشن جیل کے صدر دروازے سے باہر نکلا ۔ اس کا دل
بری طرح دھڑک رہا تھا ۔ حیران اور پریشان نظروں سے
چاروں طرف دیکھتا ہوا وہ جیل کے حدود سے نکل گیا ۔

اب وہ کھلی سڑک پر چل رہا تھا اور موسلا دھار
بارش ہو رہی تھی ۔ اس نے سڑک پر دور دور تک نگاہیں
دوڑائیں مگر کہیں کوئی نظر نہیں آیا ۔ اب رات کے گیارہ
بج چکے تھے اور کرشن شہر سے بہت دور نکل چکا تھا ۔ دیہاتوں
کے جھونپڑے اور ان میں جلتے ہوئے مٹی کے دیئے نظر آرہے
تھے ۔ وہ ان مکانات کو چھوڑتا ہوا بہت تیزی سے آگے
بڑھتا جا رہا تھا ۔ اس نے میلوں فاصلہ دوڑ کر طے کیا تھا ۔
لہذا اب وہ کافی تھک چکا تھا ۔ اور اس کی چال مدھم
ہو چکی تھی ۔ جب چال دھیمی ہوئی تو سوچنے کی رفتار
تیز ہوئی ۔ اس نے سوچا جب صبح اس کے فرار کی خبر
پھیلے گی تو کیا ہوگا ۔ پولیس کی گاڑیاں اس کی تلاش میں
نکل پڑیں گی ۔۔۔ پھر ۔۔۔ پھر ۔۔۔ جیلر کا کیا ہوگا ۔۔۔؟ اس نے
سوچا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا ۔ اس کی اس حرکت سے
جیلر اور اس کے پورے خاندان پر تباہی آ سکتی ہے ۔ اس کا
دل چاہا کہ وہ واپس چلا جائے اور خود کو پھر اسی کمرہ کوٹھڑی
میں بند کر دے ۔

مگر پھر اس کے خیالات کی سطح پر اس کی منگیتر آشا کا
چہرہ ابھر آیا اور اس نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا ۔ آشا جو اس کی
منگیتر تھی اور اس خونی ڈرامہ کی مرکزی کردار تھی ۔ آشا کا باپ
سیٹھ کرم چند کا مقروض تھا اور یہی قرض سیٹھ کے قتل کی وجہ
تھا ۔ کرشن سیٹھ کے پاس آشا کے باپ کے قرضے کی ادائگی
کے سلسلہ میں گیا تھا ۔ مگر اصل رقم اور سود کی لین دین میں تو تو
میں میں اس حد تک بڑھی کہ کرشن کا مضبوط اور توانا ہاتھ
سیٹھ کرم چند کی بوڑھی اور لاغر گردن پر غیر ارادی طور پر پڑ گیا
اور تھوڑی ہی دیر میں اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں ۔

اس نے چاروں طرف ایک بار پھر بڑے غور سے
دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ اب وہ کافی دور نکل آیا
ہے ۔ یہ خیال آتے ہی اسے بھوک کی شدت محسوس ہوئی ۔
اس نے امرود کے ایک باغ میں خوب پیٹ بھر امرود کھائے
اور قریب ہی ایک بہتے نلے کا برساتی پانی پیا ۔ اور پھر
اپنے نامعلوم سفر پر روانہ ہو گیا ۔

چلتے چلتے جب وہ ایک گاؤں میں داخل ہوا تو
اسے سخت سردی کا احساس ہوا اور اس کا بدن ٹھنڈک سے
کانپنے لگا وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو نچوڑتے ہوئے گاؤں کی
مسجد کے قریب پہونچ گیا اور سوچنے لگا کہ بالکل ایسی ہی ایک
مسجد اس کے عزیز ترین دوست احسان کے گاؤں بہرائچ
میں بھی ہے کہیں وہ احسان کے گاؤں میں تو نہیں آ گیا ۔۔۔ یہ
خیال آتے ہی اس کے قدم احسان کے گھر چل پڑے جہاں وہ
بارہا آچکا تھا ۔

تھوڑی دیر بعد وہ احسان کے دروازے پر دستک
دے رہا تھا ۔ پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد ہلکی چرچراہٹ
کے ساتھ دروازہ کھلا اور احسان اتنی رات گئے کرشن کو
سامنے دیکھ کر اچھل پڑا ۔ اس نے حیرت سے پوچھا ۔ کرشن
تم ۔۔۔ اس وقت یہاں ۔۔۔ کیا بات ہے؟ خیریت
تو ہے ۔۔۔؟

احسان میں جیل سے فرار ہو گیا ہوں ۔ آج رات
تمہاری پناہ چاہتا ہوں ۔"

"کرشن ۔۔۔" احسان فرطِ مسرت سے اس سے
لپٹ گئے ۔۔۔ یہ گھر تمہارا ہے تم جب تک چاہو رہو ۔ تمہاری حفاظت
میں اگر جان قربان کرنے کی بھی نوبت آئی تو تمہارا احسان
پیچھے نہیں ہٹے گا ۔"

دونوں اندر چلے گئے ۔ اس وقت احسان کے کمرے
میں لگی ہوئی گھڑی نے بارہ بجائے ۔ اور کرشن چونک پڑا ۔
"بارہ بج گئے احسان ۔۔۔"

ہاں بارہ بج گئے — مگر تمہیں تو بخار ہے۔ اف پورا جسم
رہا ہے بیٹھو میں ابھی کوئی انتظام کرتا ہوں۔

ان احسان — میرے دوست میں نے پیٹ بھر
رد دکھائے ہیں۔ اور برسات کا گندہ پانی پیا ہے۔

مجھے سخت سردی لگ رہی ہے — اف میرا سر چکرا
رہا ہے —" کرشن تکلیف کی شدت سے چار پائی پر
ستے ہی بے ہوش ہو گیا۔

احسان گاؤں کے حکیم کو بلا لایا۔ حکیم نے دیکھا دوا
ی اور احسان سے تاکید کی کہ اس کی سخت حفاظت کی جائے
ونکہ اس کو ڈبل مونیہ ہونے کا خطرہ ہے۔ اگر صبح تک ہوش نہ
یا تو بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہے گی۔

صبح چار بجے کرشن کو ہوش آگیا اور وہ نیم بیہوشی کے
عالم میں لیٹا ہوا سوچنے میں مشغول تھا۔ اس کا ذہن رات کے
خوفناک واقعات کو یاد کر رہا تھا۔ ڈراؤنی رات، موسلا دھا
بارش، جیل کی سلاخیں، سیٹھ کا قتل، جیلر کا اپنا راور قربانی اور
— اور صبح چھ بجے پھانسی کی سزا۔

اچانک گھڑی کی آواز آئی۔

" ایک — دو — تین اور چار —" صبح کے چار
بج چکے تھے۔

کرشن نے چونک کر گھڑی کی جانب دیکھا اور اس کا
دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ آنکھوں میں خوف کی گہری لکیریں
ابھر آئیں۔

تین — چار — اور پانچ —"

ایسا محسوس ہوا جیسے وہ عمیق غار میں گرتا جا رہا ہے۔
اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل سینے سے باہر نکل پڑے گا۔ اور
حرکت قلب بند ہو جائے گی — گھڑی نے آخری ضرب
لگائی۔

چار — پانچ — اور چھ —" یہ وقت اس کی پھانسی
کا وقت تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کا دماغ گھومنے لگا۔ سر

چکرایا اور وہ تکیہ پر ایک طرف کو لڑھک گیا۔

صبح لاکھ کوشش کے باوجود بھی احسان کی سمجھ میں
نہیں آیا کہ حکیم کے کہنے کے باوجود ہوش میں آنے کے بعد
کرشن کا ہارٹ فیل کیسے ہو گیا۔

بقیہ ریشم

ہو سکتا ہے شام ڈھلے تک آئیں .... کام ہی ایسا
ہے ...... اور ہاں بابو .... اس رات کی قیمت
آپ نے کتنی چکائی .... شاید دو سو ....

"کیا بک رہے ہو ......" رامو نے مجھ کو ایک نظر
دیکھا پھر مسکراتا ہوا بولا " بابو ناٹک تو خوب کر لیتے
ہو؟"

"رامو چلا گیا ......اور تب مجھے احساس ہوا کہ
ریشم .... ریشم نہیں ...... بلکہ وہ ایک پیشہ ور طوائف
تھی ...... جس کا کام ہی بے حیائی اور بے شرمی کے کنوئیں
میں گر کر خود کو ننگا کر دینا اور دونوں ہاتھوں سے روپیہ
بٹورنا تھا ...... آج بھی جب کبھی اس کی یاد آتی ہے
تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ نہ جانے کتنے روپے ہیں اس عورت
ذات کے .... نہ جانے کتنے۔

صبا اکرام

کس کس کے ہاتھ میرے گریباں پہ آگئے

دیواکر اپنے اس اونچے عہدے پر صرف تیرہ گھنٹے ہی
رہ سکا۔ دن کے دس بجے اسے اس امتیازی عہدے سے
نوازا گیا اور رات کے ٹھیک گیارہ بجے اس نے خودکشی
کر لی۔

نریش گم سا اپنے کمرے میں بیٹھا نہ جانے کیا کیا سوچ
رہا تھا۔ یکبارگی اس نے گردن گھما کر اپنے پہلو میں پڑے
خالی چارپائی کو دیکھا۔ جس پر چند روز قبل اس کا لنگوٹیا
دوست دیواکر سوتا تھا ـــــ اور اس کی
آنکھیں بھر آئیں۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے
کوسوں دور تھی۔ عجیب کرب و بے چینی کے عالم میں وہ بستر پر
کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے ذہنی کرب کو دور کرنے کے لئے
دریچے سے باہر نظر دوڑائی۔ فوجی افسروں کے کمرے میں اب بھی
روشنی ہو رہی تھی ـــ "اُف .... یہ لوگ بھی
جاگ رہے ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ
ڈال کر سگریٹ نکالا اور لائٹر کے لئے میز کی طرف بڑھ گیا۔

میز پر خوشبو میں بسا ہوا ایک خط کھلا پڑا تھا ـــ
اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا ــــ اور
وہ ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا ــــ اور

پھر جب ان گہرائیوں سے نکل کر جب سطح آب پر آیا تو اس کی
نگاہوں میں دیواکر ہی کی تصویر تھی۔

دیواکر اس کا عزیز دوست ...... زندہ دلی
کی جیتی جاگتی تصویر۔ اسے کتنا عزیز تھا۔ اسے وہ بات
بری طرح یاد آ رہی تھی۔ جب دیواکر نے ایک مردہ سانپ
اپنے ایک ڈرپوک دوست کے بستر میں ڈال دیا تھا
اور اس دوست کی چیخ پر نہ جانے کتنی دیر تک قہقہہ لگاتا
رہا۔ آج اسے کسی کتاب کا یہ جملہ نہ جانے کیوں یاد آ گیا
کہ دوستی سب سے اونچا اور مقدس انسانی رشتہ ہے۔ دوستوں
سے وفاداری کبھی کبھی فرض اور محبت سے زیادہ
ضروری ہو جاتی ہے۔

نریش نے انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کے
ٹکڑے کو ایش ٹرے میں ڈال دیا اور دوسرا سگریٹ
جلا کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے کمرے کے باہر دالان میں
نکل آیا ــــ وہ سوچ رہا تھا ــــ کیا وہ
سچ مچ قصوروار ہے؟

اس کے سامنے والے کمرے میں اس کے چند فوجی
دوست بیٹھے اس کا نام لے لے کر گفتگو میں مشغول تھے
نریش دبے قدموں سے چلتا ہوا کمرے کی دیوار سے لگ کر

کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ دیواکر نے اپنی ہی پستول سے خودکشی کی تھی۔ کیونکہ چند ہی روز قبل اس نے اسے اسلحہ خانہ سے نکلوایا تھا۔" یہ نریش کے کسی فوجی دوست کی آواز تھی۔

یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دیواکر جیسا آدمی بھی بزدلوں کی طرح خودکشی کرسکتا ہے۔" یہ دوسرے افسر کی آواز تھی۔

"نہیں ...... نہیں اسے بزدل نہ کہو .. دیواکر ایک زندہ دل شخص تھا .... مگر کیا کرتا ...... اس کے سامنے خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔" تیسرے نے کہا۔

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کئی آوازیں ایک ساتھ کمرے کی ساکت فضا میں گونجیں۔

"وہ رات بھی عجیب رات تھی .. ... دیواکر نے اپنے کمرے کے پیچھے جھاڑی میں کسی کی سرگوشی سنی تھی .... وہ میرے پاس آیا اور مجھے اپنے ہمراہ لیکر جھاڑی کے قریب پہنچا .. .. لیکن جیسے ہی اس نے ٹارچ جلائی چیخ اٹھا .... اس کی بہن نیم برہنہ حالت میں نریش کی آغوش میں پڑی تھی ...." تیسرے افسر نے رک رک کر کسی طرح اپنی گلوگیر آواز میں ساری داستان اپنے دوستوں کو سنادی۔

پھر کمرے میں ایک مکمل سناٹا چھا گیا

نریش کا سارا جسم پسینے سے بھیگ چکا تھا وہ اندھیرے سے نکل کر عالم وحشت میں دوڑتا چلا گیا

(مرکزی خیال انگریزی کہانی ہے)

(غیر مطبوعہ)

بقیہ "سرسوتی کی موت"

آکر رک گیا۔ رکشا سے باہر آکر ایک شخص سامنے والے دھوبی کے مکان پر پہنچا اور اس نے دریافت کیا ——

"کیا کہیں لکڑی مل سکتی ہے؟"

"اتنی رات گئے آپ کو لکڑی کی کیا ضرورت ہے بابو؟"

"ایک عورت کی موت ہوگئی ہے۔ پورے شہر میں ایک سو چالیس نافذ ہے مجھے کہیں سے لکڑی مل جاتی تو قریب ہی کسی گھاٹ پر جلا دیتا۔" بابو نے جواب دیا۔

میں نے فوراً اس کے پاس پہنچ کر پوچھا ——

میں لکڑی کا انتظام کر دیتا ہوں۔ مگر یہ تو بتایئے مرنے والی کون تھی؟"

"سرسوتی!!" میں نے پوچھا۔

"ہاں سرسوتی دیوی! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

بھلا میں ایک طالب علم ہو کر سرسوتی کو بھی نہ جانونگا مجھے یقین تھا آج وہ بھی زندہ نہیں رہے گی۔"

بابو نے مجھے زور سے جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا کہہ رہے ہیں جناب؟ آپ پاگل تو نہیں؟"

اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا وہ لپک کر رکشا میں جا بیٹھے اور جدھر سے آئے تھے چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میں اسپتال واپس پہنچا تو ایمرجنسی وارڈ سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ مرنے والوں کا نام اعلان ہو رہا تھا۔

مرنے والوں کی تعداد صرف ۹ بتائی گئی لیکن سرسوتی دیوی کا نام نہ تھا۔

(غیر مطبوعہ)

طارق جمیلی

سرسوتی کی موت

میں پٹنہ میٹرنیٹی وارڈ سے اپنے نوزائیدہ بھانجے کی لاش لے کر نکلا ہی تھا کہ سڑک پر ایک بھگدڑ سی مچی نظر آئی۔ لوگ بے تحاشہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے دوکانیں بند ہو رہی تھیں اور عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ پولیس سے بھری ہوئی ٹرکیں اور پولیس افسران سے لدی جیپیں مرادپور سے آئیں اور یونیورسٹی ایریا کی طرف چلی گئیں۔

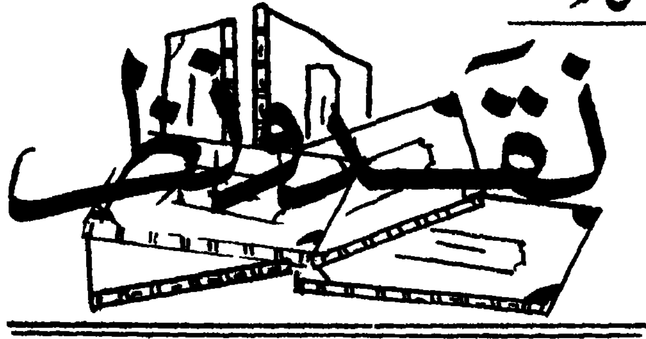
جس کی گود میں ایک بچہ کی لاش ہو اس کے دل پر اس ہنگامے کا کیا اثر ہوتا۔ خاموشی کے ساتھ ہاتھوں میں لاش لئے کُن کُن سنگھ لین سے ہوتا ہوا مصلح پور قبرستان پہنچ گیا۔ قبرستان میں دھوبی کپڑے سکھا رہے تھے۔ چند بچے شور مچا رہے تھے۔ دو ایک گدھے گھاس چر رہے تھے اور میں بچہ کی لاش دفنا رہا تھا۔

تجہیز و تدفین سے فراغت پا کر جب میں سینٹ ہال کے قریب پہنچا تو سڑک پر ایک جلوس نظر آیا۔ جس کی اگلی قطار میں چند طلبا ایک لاش لئے نعرے بلند کر رہے تھے۔ لاش ایک نوجوان طالب علم کی تھی۔ جس کا چہرہ گولیوں سے داغدار تھا اور سارے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ لاش دیکھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے غم کے سارے سیاہ بادل چھٹ گئے ہوں اور میرے دل پر بچے کی موت کا جو گہرا اثر تھا وہ ختم ہو گیا ——"اچھا ہوا کہ یہ بچہ پیدا ہونے سے قبل ہی مر گیا ورنہ دنیا میں آنے کے بعد اسے پہلی خبر یہی ملتی۔" یہ سوچتا ہوا میں جلوس کی طرف بڑھ گیا۔ اب میں تنہا نہیں رو رہا تھا۔ بلکہ میرے ساتھ ایک جلوس تھا، بے شمار لوگوں کا جلوس —— جیسے گنگا پٹنہ کی سڑکوں پر بہہ رہی ہو —— اسی سیلاب میں میں غمزدہ دل بھی یوں شامل ہو گیا جیسے بہتے ہوئے دریا میں پانی کا ایک قطرہ۔

شام کو جب میں ایمرجنسی وارڈ کے قریب پہنچا تو اسپتال کا پورا احاطہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایمبولنس کے ذریعہ زخمی لائے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد ان گنت تھی۔ میں اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکا اور وہاں سے ہٹ کر کسی پرسکون جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ ایسے لمحوں میں جب کہ سارا شہر آنسو بن جائے اور زندگی ایک کراہ تو انسان آبادی سے دور تنہائی اور ویرانی کا دامن تھام لیتا ہے تاکہ سکون میسر ہو سکے اور اس وقت سکون میرے لئے سوائے مصلح پور قبرستان کے کہاں ملتا۔ لہذا میں قبرستان آ کر اپنے بھانجے کی قبر کے نزدیک بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک رکشا قبرستان کے پاس .

پروفیسر کرامت علی کرامت



ذوقِ جمال (عنوان چشتی)

اس نئی شاعری کے دور میں جبکہ تجربہ برائے تجربہ کو مطمحِ نظر تصور کیا جاتا ہے، جبکہ "جدیدیت" کے نام سے غزل کی روایت کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جبکہ شاعری کو شاعر جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ الفاظ کی محض بازیگری سمجھنے لگا ہے، تو ایسے میں اگر کوئی سنجیدہ قسم کی شاعری کا مجموعہ نظر سے گذرتا ہے تو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ عنوان چشتی کا شعری مجموعہ "ذوقِ جمال" سنجیدہ قسم کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ عنوان چشتی کی غزلیں جگر، فانی، حسرت اور اصغر کی یاد پھر تازہ کر دیتی ہیں جنہوں نے نظموں کے ہنگامی دور میں بھی صنفِ غزل کی روایت کو زندہ رکھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عنوان چشتی نے مذکورۂ بالا شعراء کی روایت کو اپنایا ہے بلکہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ غزل کے اس بحرانی دور میں عنوان چشتی جیسے چند سنجیدہ غزل گو شعراء پیدا نہ ہوں، تو صنفِ غزل کا مستقبل یقیناً تاریک ثابت ہوگا۔

عنوان چشتی ہماری شاعری کے میدان میں ایک نیا ذہن لے کر داخل ہوئے ہیں لیکن الفاظ و بندش کے انتخاب میں وہ جس مہارت کا ثبوت دیتے ہیں، وہ کلاسیکل شاعری کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ نئے شعراء کے برعکس عنوان چشتی یہ نہیں سوچتے کہ الفاظ شاعری میں کثرتِ استعمال کے بعد فرسودہ ہو کر اپنا اثر کھو بیٹھے ہیں بلکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ شعر کے لئے جذبات ہی سب سے زیادہ اہم ہیں اور جذبات میں ندرت ہو تو فرسودہ الفاظ میں بھی نئی جان ڈالی جا سکتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

جذبوں کو سمو کے ان میں\
لفظوں کو جِلا دے رہا ہوں

ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:-

کہتے ہیں ازل جس کو اس سے بھی کہیں پہلے\
ایمان محبت پر لاتے تھے ہمیں پہلے

وقت کے تسلسل میں "ازل سے پہلے" کا تصور جدید ذہن کی پیداوار ہے اور اپنی تازہ کاری اور تہہ داری کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اسی طرح وقت کو روکنے کا جذبہ ان کے اس شعر میں پایا جاتا ہے:-

اپنی زلفیں میرے شانے پہ بکھر جانے دو\
وہ گھڑی گردشِ دوراں کو ٹھہر جانے دو

حالانکہ اس خیال کو بادی النظر میں شاعرانہ غلو پر محمول کیا جا سکتا ہے، لیکن سائنسی علوم نے ثابت کر دیا ہے کہ وقت کی رفتار کو واقعی روکا جا سکتا ہے۔

دورِ جدید میں کاروانِ حیات اپنی قدیم روایت سے قطع تعلق کر کے ایک نامعلوم منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس لئے شاعر کو یہ اندازہ نہیں ہو رہا ہے کہ زندگی کا قافلہ کس مقام پر پہنچا ہے۔ چنانچہ شاعر پکار اٹھتا ہے:-

جنوں بھی خاک کا ہے، خرد بھی ناتمام ہے

بھٹک رہی ہے زندگی، یہ کون سا مقام ہے

حیات کا قافلہ اس وقت جس دور سے گذر رہا ہے اس میں شاعر کے لئے ہجوم غم و تنہائی کا سامنا کرنا فطری ہے۔ یہی سبب ہے کہ نئے شعراء میں بے یقینی اور تنہائی کا احساس نظر آتا ہے۔ لیکن عنوان چشتی کا خیال ہے کہ جدید انسان کے ذہن میں غم و تنہائی کا جذبہ ضرور ہے لیکن یہ اتنا مہلک نہیں ہے جتنا کہ خود اس کے کردار کی کمزوری ہے جس کی وجہ سے اسے پرچھائیاں بھی تعاقب کرتی ہوئی نظر آتی ہیں:۔

ہجوم غم سے نہ تنہائیوں سے ڈرتا ہوں

مگر میں اپنی ہی پرچھائیوں سے ڈرتا ہوں

لہٰذا اگر انسان اپنے کردار کی بلندی کی طرف متوجہ ہو، تو اس کا احساس غم و تنہائی بھی رفتہ رفتہ دور ہو سکتا ہے۔

ذیل کے اشعار میں تشبیہات، استعارات اور ذہنی پیکر کی ندرت ملاحظہ فرمایئے:۔

اف یہ اندازِ شکستِ ارماں

شاخِ گل ٹوٹ پڑی ہو جیسے

یوں دل سے لپٹ کر روئی

کوئی برسوں میں ملا ہو جیسے

مرمریں جسم تراشیدہ محل ہو جیسے

اک چھلکتا ہوا مینائے غزل ہو جیسے

یوں تری یاد کی مشعل ہے فروزاں دل میں

ذہنِ شاعر میں شگفتہ سی غزل ہو جیسے

یوں ترے قرب کی پھر آنچ سی محسوس ہوئی

آج پھر شعلۂ احساس جواں ہو جیسے

مجھے عنوان چشتی کے ایسے اشعار ذاتی طور پر سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں جن میں غم و اندوہ کی چاشنی پائی جاتی ہو۔ چند اشعار:

بجھا بجھا سا ہے کیوں آج شعلۂ احساس

ابھی تو دل میں غموں کے چراغ جلتے ہیں

جینے کا تیرے غم نے سلیقہ سکھا دیا

دل پر لگی جو چوٹ تو میں مسکرا دیا

روتا ہوں میں لپٹ کے دلِ غم نصیب سے

انجامِ عشق دیکھ لیا ہے قریب سے

جب یہ سوچا اپنوں کا انعام ہیں یہ

سینے سے زخموں کو لگا کر بیٹھ گئے

اس سے قبل کہ قارئین کرام "ذوقِ جمال" سے صحیح طور پر مستفیض ہو سکیں، انہیں شاعر کے اس نظریۂ جمالیات سے واقف ہونا از حد ضروری ہے:۔

نہ کیفِ رنگ و نور ہے نہ حسنِ صبح و شام ہے

جمالیاتِ عشق کی لطافتوں کا نام ہے

یہ مجموعہ تین روپیوں میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے خریدا جا سکتا ہے۔

سنگ و سمن (خالد شفائی)

خالد شفائی بہار و اڑیسہ کے ایک مقبول شاعر ہیں۔ میں نے "بہار و اڑیسہ" ایک ساتھ اس لئے کہا کہ خالد شفائی کی جائے پیدائش بہار ہے، لیکن وہ اڑیسہ میں رہ کر ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ویسے بہار اور اڑیسہ دونوں ثقافتی اعتبار سے زمانہ قدیم سے ایک دوسرے کے بہت قریب رہے ہیں اور ۱۹۳۶ء سے قبل یہ دونوں ایک ہی صوبہ قرار دیئے جاتے تھے۔ عبدالقادر بیدل نے ایک عرصے تک اڑیسہ میں قیام کیا تھا۔ اڑیسہ کے سب سے پرانے اردو شاعر جودت کا کلام ہمیں بہار سے ہی حاصل ہوا ہے۔ خدا کے فضل سے آج بھی بہار کے چند ایسے قابلِ ذکر شعراء اڑیسہ میں قیام پذیر ہیں جو یہاں شعر و ادب کی بے لوث خدمات میں منہمک ہیں۔ خالد شفائی ان میں سے ایک ہیں۔ خالد شفائی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے ان کا ذکر "آب خضر" میں کرنا چاہیے تھا لیکن خالد شفائی اس وقت میں متعارف نہیں تھا۔ اسے میں اپنی معلومات کی تنگ دامانی پر محمول کرتا ہوں۔

بنگالی کے مشہور جدید شاعر بدھ دیو بسو نے کہا ہے کہ ہر دور کی شاعری میں رومانیت کسی نہ کسی شکل میں خود کو ظاہر کرتی رہتی ہے۔ جہاں

.وستان کی دیگر زبانوں کی قدیم مذہبی شاعری میں کرشن اور رادھا کے
م کی حیثیت سے رومانیت سر ابھارتی رہی، وہیں اردو کی قدیم شاعری
، صنفِ غزل کی گود میں رومانیت پرورش پاتی رہی۔ اقبال کے بعد
دو ادب میں تین طرح کی تحریکیں بہ یک وقت شروع ہوئیں (۱) ترقی
سند تحریک (۲) رومانوی تحریک (۳) نئی شاعری کی تحریک۔ حالانکہ
ں تینوں قسم کی تحریکوں کا ایک دوسرے پر اثر پڑا ہے۔ جس کی وجہ بعض
عرا کو کسی ایک گروپ سے منسوب کرنا مشکل ہو جاتا ہے تاہم ایک ادب کا
ق فیض، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی کی شاعری کو اختر شیرانی کی
اعری اور اختر شیرانی کی شاعری کو میرا جی، ن۔م۔ راشد اور مجید امجد
ی شاعری سے الگ محسوس کر سکتا ہے۔ مجھے رومانوی تحریک سے متعلق
شاعرض کرنا ہے کہ جوش اور حفیظ نے رومانیت کو جس انداز سے برتا،
ختر شیرانی نے رومانیت کو جس منزل تک پہنچایا، مجاز اور ساحر لدھیانوی
نے اس میں ترقی پسند عناصر کے امتزاج سے جس حد تک مقصدیت کی لویں
روشن کیں، ساغر، روش اور اختر انصاری نے اس تحریک کو جس حد تک
آگے بڑھایا، آج کے نوجوان شعرا میں اس روایت سے متعلق قابلِ افسوس
حد تک بے رخی و بے اعتنائی پائی جاتی ہے۔ لیکن خالد شفاقی ایک ایسے
نوجوان شاعر ہیں جو اختر شیرانی اور مجاز دونوں کی روایت پر بڑی
خود اعتمادی کے ساتھ گامزن ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ خالد شفاقی شاعری میں
مقصدیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ اسے پوری شاعرانہ ذمہ داری
کے ساتھ نبھانا بھی جانتے ہیں۔ معصوم دوشیزاؤں کی عصمت فروشی،
بیکاری و بے روزگاری، مفلسی و ناداری وغیرہ ان کے چند اہم موضوعات
ہیں۔ کبھی کبھی ان کی شاعری میں اکتا دینے والی یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن
جہاں وہ اختر شیرانی کی طرح خالص رومانی نظم کہتے ہیں یا جب وہ آزادانہ
اور بہار کے مناظرِ قدرت کی عکاسی کرتے ہیں تو ان کے کلام میں فطری
شاعری کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً نظم "یہ رت ہے برشگال کی" میں
فرماتے ہیں:۔

یہ مینڈکوں کی ٹرٹراہٹیں، یہ جھینگروں کا شور
کہیں نوائے عندلیب اور "پی کہاں" کا زور
کہیں ہے کوک کوئلوں کی، رقص میں کہیں ہے مور

لیکن خالد شفاقی کی شاعری کا بہترین حصہ ان کی غزل کا ہے جسے وہ
خود قابلِ اعتنا تصور نہیں کرتے۔ ان کی غزل نما نظموں سے چند اشعار
انتخاب کر کے قارئین کی باصرہ نوازی کے لئے پیش کر رہا ہوں:۔

مدِ نظر تو ہے وہ بہ حدِ نظر نہیں
کیوں کر کہوں کہ ذوقِ مراد دیدہ ور نہیں
کہنے کو یوں طلوعِ سحر ہو چکی مگر
جس کا ہے انتظار ابھی وہ سحر نہیں

بخشا گیا ازل سے جنونِ سفر مجھے
ذوقِ طلب نے کر دیا شوریدہ سر مجھے
گو آج تیری بزم میں ساقی گذر نہیں
کل دے گا تو ہی بڑھ کے مئے تیز تر مجھے

عام کر دو عالم میں آگہی بہاروں کی
بخش دو اندھیروں کو روشنی ستاروں کی

نظم "اداس نہ ہو" کا ایک مصرع ہے "نشیمنوں کو اگر برق نے جلائے تو کیا"۔
یہاں "جلائے تو کیا" کے بجائے "جلا یا تو کیا" ہونا چاہئے تھا۔ نظم "سپنوں کی
راکھ" کا یہ مصرع "ابھی کچھ بے خبری ہوتی کہ اک دن ہم تم" خارج از بحر ہے۔
نظم "کارٹون" کے اس مصرع "پاگلوں کی طرح وہ تجھ سے چمٹ جاتی نہیں"
میں "طرح" کی "ح" گرا دی گئی ہے۔ بہر کیف مجھے امید ہے کہ خالد
شفاقی فطری شاعری پر عموماً اور صنفِ غزل پر خصوصاً اپنی تمام توجہ
مرکوز کریں، تو ان کا مستقبل حال سے بھی زیادہ تابناک ہوگا۔ "سنگ [illegible]"
تین روپیوں میں مغل اکیڈمی، ہندی محبوب، حیدرآباد دکن یا براہِ راست
خالد شفاقی، پوسٹ آفس بسرا، ضلع سندرگڑھ (اڑیسہ) سے مل سکتی ہے۔

میری اصلاحیں (ابر احسنی گنوری)

ابر احسنی گنوری اردو کے ایک کہنہ مشق اور مسلم الثبوت شاعر
ہیں جن کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ ہندوستان بھر میں موجود ہے۔ زیرِ نظر
کتاب میں انہوں نے تمام معائبِ سخن کو یکجا پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب ہندوپا

کے علاوہ مبتدیوں کے لئے بھی کارآمد چیز ثابت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اکبر صاحب کے تلامذہ کا تذکرہ بھی ہے جو ایک اہم چیز رہی ہے۔ زمانہ قدیم کے اساتذہ نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس لئے بہت سے اچھے شعراء کا نام وقت کے بحر بے کنار میں غرق ہو کر رہ گیا۔

اکبر احسنی نے متروکات کی جو فہرست پیش کی ہے، اسے اگر سو فیصدی قبول کر لیا جائے، تو زبان کا دائرہ بہت تنگ ہو جائے گا۔ میرے خیال میں شاعری میں ان، وان، تنک، مدت، سدا، گر (بمعنی اگر)، رہ (بمعنی راہ)، جا (بمعنی جگہ بغیر ترکیب فارسی) وغیرہ تو بہرحال مستعمل ہونا چاہئیں، کیونکہ ہمارے پاس جواز موجود ہے کہ اساتذہ کے کلام میں ان الفاظ کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔

آئے ہے، جائے ہے، لکھائے ہے کچھ دنوں تک متروک رہا لیکن اب اردو کے شعراء اسے پھر سے استعمال کرنے لگے ہیں۔ مثلاً سید کرامت الاکرام کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

جیسے جیسے درد کا پندار بڑھتا جائے ہے
اپنا پر لذت آزار بڑھتا جائے ہے
مسکرا کر دیکھتا جاتا ہے مجھکو جانے کیوں
ایک دیوانہ کہ سرے دار بڑھتا جائے ہے

کیا آپ ان حسین شعروں کو "بڑھتا جائے" کی ردیف استعمال کرنے کی وجہ سے اردو ادب کے دائرے سے نکال دیا گے؟

اس شعر میں "جب نظر عنبر کی رت آئی۔ میں نے سمجھا کہ خزاں آئی" ابر احسنی کا کہنا ہے کہ سمجھنا فعل لازم ہے اور اس لئے "نے" علامت فاعل کی ضرورت نہیں۔ دراصل سمجھنا فعل متعدی ہے اور اس میں "نے" استعمال جائز ہے۔ مثلاً: سیخ کا یہ شعر لیجئے:۔

جان شیریں جو گئی یاد لب شیریں میں
چھوڑ کر ان نے بھی میری خاک کو شکر سمجھا

البتہ میں سمجھا" بھی جائز ہے۔

جس طرح پہلے زبان بنتی ہے اور اس کے بعد اس کا قاعدہ مرتب کیا جاتا ہے، اسی طرح پہلے ذوق سلیم میں شعر کا آہنگ گونجنے لگتا ہے بعد میں عروض کے قوانین مرتب ہوتے ہیں۔

اکبر احسنی صاحب کا کہنا ہے کہ جلال کا یہ شعر

"خدا سلامت رکھے بتوں کی ٹھوکر کو
کہ یہ جگا تی ہے سوتے ہوئے مقدر کو"

عروض نہ جاننے والوں کو اکثر ناموزوں معلوم ہوتا ہے، لیکن ناموزوں نہیں ہے۔ میں نے جب اکبر صاحب کو لکھا کہ پہلا مصرع کیسے ناموزوں نہیں ہے، تو انہوں نے اس طرح اس کی تقطیع کی:۔

خدا سلامت رکھے/بتوں کی ٹو/کر کو
مفاعلن/مفعولن/مفاعلن/فعلن

دوسرا رکن فعلاتن تھا۔ ایک زحاف کے عمل سے اس کو مفعولن میں بدل دیا گیا۔ اگر با قاعدہ آہنگ کو مشعل راہ تصور کیا جائے، تو اس طرح کی زحافات کا استعمال یقیناً ذوق سلیم پر گراں گذرے گا۔ اس کے برعکس حالانکہ یگانہ چنگیزی کے اس شعر

کلمہ پڑھ کے ایسے ویسے کتنے مسلماں بن بیٹھے
فعلن فعلن فعلن فعلن فاع فعولن فعلن فع
بات بہ کچھ دشوار نہیں دشوار نہیں تو کچھ بھی نہیں
فاع فعولن فاع فعولن فاع فعولن فاع فعل

میں آہنگ کی یکسانیت محسوس ہوتی ہے، لیکن بقول ابر احسنی یگانہ کے نو شعر (جن میں یہ شعر بھی شامل ہے) "نہ صحیح ارکان پر تقطیع ہو سکتے ہیں نہ کسی بحر میں ہیں۔ فعلن بحر متقارب کا رکن ہی نہیں ہے اور فعولن بحر متدارک کی فرع نہیں، اس اجتماع ضدین کی وجہ سے نو شعر مہمل ہو کر رہ گئے۔"

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ چونکہ اردو زبان دیگر ہند آریائی زبانوں کی طرح سنسکرت کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، اس لئے سنسکرت کے عروض کے اصول بھی اس میں ضرور مستعمل ہونا چاہئیں۔ دیوناگری رسم الخط سے بہتر طریقے پر فارسی رسم الخط میں ماتراؤں کا حساب لگایا جا سکتا ہے کیونکہ دیوناگری میں اکار، درگھ ای کار اور درگھ او کار کو ایک ماترا تصور کیا جاتا ہے جبکہ فارسی رسم الخط میں ان سب کے لئے

علاوہ ملفوظ حروف (ا، د، ا، و، ر، ی) موجود ہیں۔ مد، اور کسرِ اضافت (جیسے کبھی کبھی کھینچ کر پڑھا جاتا ہے) کو بھی ایک ایک ماترا تصور کیا جا سکتا۔ یعنی جو حروف تقطیع میں آئیں گے ان کی کل تعداد ماتراؤں کے برابر ہوگی۔

مذکورہ بالا شعر کے دونوں مصرعوں میں ہم آہنگی کا سبب غالباً یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں ماتراؤں کی تعداد برابر ہونے کے ساتھ ساتھ پاؤں میں بھی ماتراؤں کی تعداد برابر ہے۔

کھڑکے / ایسے ویسے / کتنے مسلما / ن جیتے

۸ ماترائیں ۸ ماترائیں ۸ ماترائیں ۶ ماترائیں = ۳۰ ماترائیں

بات کچھ دشوار ہی دشوار ہی تو / کچھ سب ہی

۸ ماترائیں ۸ ماترائیں ۸ ماترائیں ۶ ماترائیں

= ۳۰ ماترائیں

اس قدر ہم آہنگ دو مصرعوں کو آپ خارج از بحر کہہ دیں، تو اسے ناانصافی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

بہر کیف، آبر احسنی گنوری کی تصنیف "میری اصلاحیں" اپنی نوعیت کی واحد تصنیف ہے۔ یہ کتاب تسخیر فہمی صاحب کے زیرِ اہتمام دہلی میں طبع ہوئی۔ اسے چار روپیوں میں براہِ راست آبر احسنی گنوری، گنور ضلع بدایوں (یوپی) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اردو	(نظم)
دہلی کی جامع مسجد	(نظم)
ماتمِ سالک	(نظم)
رفیع صاحب کے مزار پر	(نظم)
شاعر کی آواز	(نظم)
اجنتا	(نظم)

(جگن ناتھ آزاد)

"اردو" جگن ناتھ آزاد کی مشہور نظم ہے جو ترمیم اور اضافے کے ساتھ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ "دہلی کی جامع مسجد" "ماتمِ سالک" اور "رفیع صاحب کے مزار پر" آزاد کی تاثراتی نظمیں ہیں۔ "شاعر کی آواز" تامل کے شاعر سندرم کی نظم کا ترجمہ ہے جس میں چینی جارحیت کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے، یہ ایک بے کار سی نظم ہے۔ معلوم نہیں جگن ناتھ آزاد کو اس کے ترجمے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ چینی جارحیت کے خلاف ملک کی مختلف زبانوں میں بہت سی نظمیں لکھی گئیں، لیکن ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جنہیں واقعی کامیاب کہنا چاہئے۔ صرف ان نظموں کا ترجمہ کرنا چاہئے جن سے اردو ادب میں واقعی قابلِ قدر اضافہ ہو سکے۔

البتہ جگن ناتھ آزاد کی نظم "اجنتا" کو ایک لازوال تخلیق کا لقب عطا کیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر آزاد کچھ نہ لکھ کر صرف نظم "اجنتا" کی تخلیق کرتے، تو بھی ان کا نام اردو ادب میں زندہ رہتا۔ یہ نظم ایک نئے ڈرامائی انداز میں لکھی گئی ہے جس کا ایک کردار خود شاعر ہے اور باقی کردار کئی آوازوں پر مشتمل ہیں۔ اس نظم میں تشبیہات و استعارات کی ندرت کے ساتھ ساتھ جذباتی عمق کا پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

جس وقت شاعر کی زبانی ہم یہ سنتے ہیں:-

یہ تنہا آنے سے پہلے عالمِ اسرار میں
تو دلِ کہسار میں تھا یا دلِ فنکار میں

تو ہمیں فنکار کے ضمیر سے "کن فیکون" کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے اور ہمارے ذہن میں ایک تحیر کی کیفیت منتقل ہوتی ہے۔ نظم کے آخری حصے "ندائے غیب" میں نظم عروج کو پہنچتی ہے۔ جس میں شاعر کو یہ ترغیب ملتی ہے:-

ان سے لے کر ابھار جذبے کا
تو بڑھائے نکھار جذبے کا
نغمۂ تازہ تر سنا اپنا
سوئے فردا قدم بڑھا اپنا

آزاد کی نظم میں، شاعر کی تخلیق بھی اجنتا کی طرح کاروانِ حیات کے لئے سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ نظم "اجنتا" آزاد کا ایک ایسا ادبی کارنامہ ہے جسے شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو پڑھنا چاہئے۔

قیمت - ۷۵ پیسے

ملنے کا پتہ - مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جام جم (مظفر حیدری)

آج کل یوں تو کافی تعداد میں اُردو کے شعری مجموعے شائع ہوتے ہیں، لیکن ان مجموعوں میں بہت کم اچھے شعر نظر سے گذرتے ہیں جنہیں پڑھ کر واقعی روح کو تازگی حاصل ہو۔ جامِ جم مظفر حیدری کا ایک ایسا مجموعۂ کلام ہے جس میں بہت سے اچھے شعر نظر سے گذرے۔ مظفر حیدری نے کہا ہے کہ ؎

جہاں کی ہر شئے کو ہے تغیر، بدلتے رہنا ہے عینِ فطرت
کسی زمانے کے فیصلے کو کچھ اور کہئے اٹل نہ کہئے

لیکن میرے خیال میں ایک اچھا شعر اس سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ زمانے کا مذاق بدلنے کے باوجود اچھا شعر ہمیشہ اچھا کہلاتا رہا ہے۔

... حیدری کے کلام میں رجائیت کا عنصر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ وہ مترنم الفاظ کے استعمال سے ذکاوتی لہجات کی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں وہ اکثر کامیاب نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

ستم ظریفی کی کوئی حد ہے کہ تاج مرمر کی عظمتوں کو
شہنشہی کا عروج کہئے وفا کا نعم البدل نہ کہئے

حرفِ شکایت لب پہ نہ لاؤ، دردِ جگر کا نام نہ لو
دل کی چوٹ چھپائے رکھو ان کی نظر کا نام نہ لو

تیرگی کے ایواں بھی پُرفریب ہیں کتنے
ہر طرف ہیں آویزاں روشنی کی تصویریں

جستجوئے نظر کی کوئی حد بھی ہے اب کہاں آرزوئے سفر جائے گی
چاند تارے بھی گردِ سفر ہو گئے اب جنوں کی سواری کدھر جائے گی

ان کا یہ شعر:۔

ترے سمندر سے اب تو شبنم بھی تشنگی کو نہیں میسّر
اگر یونہی تشنہ لب رہے ہم تو کیا تری آبرو رہے گی

مجذوبی کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے:۔

ہو میں پھر آشنامِ محفل میں ساقی، کہیں پیاس بجھتی ہے شبنم سے ان کی؟
یہ پاسِ ادب ہے کہ خاموش ہوں، ورنہ شکوہ مجھے بھی ہے تشنہ لبی کا؟

صنفِ غزل کے علاوہ صنفِ رباعی میں بھی مظفر حیدری کو کافی دخل ہے۔ اُمید کہ "جامِ جم" ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ قیمت — تین روپے

ملنے کا پتہ:۔ مظفر حیدری۔ نمبر سی/۲۷ رفیع احمد قدوائی روڈ۔ کلکتہ ۱۴

نوائے شکستہ (ظفر حمیدی)

اُردو کے وجودیت (EXISTENTIALIST) شعراء میں ظفر حمیدی کا نام اس لئے اہم ہے کہ وجودیت پسندی ان کے نزدیک محض شاعری کا وسیلہ نہیں بلکہ خود ان کے اعتقاد میں داخل ہے۔ یہ تحریک نظریاتی زیادہ ہے، اسلوبی کم، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظریات متعین ہو جائیں تو انہیں برتتے وقت ان کا اثر شعر کے اسلوب پر بھی بہت گہرا پڑتا ہے۔ وجودیت پسند ادیب ہمیشہ اپنی قوتِ ارادی اور آزادیٔ عمل پر ایقان و ایمان رکھتا ہے۔ مغرب میں وجودیت پسندی کی تحریک کو کرک گارڈ، نطشے اور ہسرل کے فلسفوں سے کافی تقویت ملی۔ فرانس میں مافروا، سارتر، البیر کامیو وغیرہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اُردو میں اقبال بھی وجودیت پسند شاعر ہیں اور جمیل مظہری بھی۔ لیکن اقبال کی وجودیت پسندی شاعر کو قادرِ مطلق تک پہنچا دیتی ہے جبکہ جمیل مظہری کی وجودیت پسندی قادرِ مطلق، روح اور حیات بعد الموت سے متعلق جذبۂ تشکیک کا مظہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ظفر حمیدی، جمیل مظہری کے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج کل مغربی مفکروں میں جو عام ہو چلی ہے، وہ اسی نوعیت کی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سائنسی انکشافات نے انسان کے ذہن کو بہت سی خود فریبیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ "موجودہ وجودیت پسندی" بھی اسی طرح کی ایک خود فریبی کا نتیجہ ہے۔ موجودہ دور میں جہاں آئنسٹائن اور ملنے جیسے صفِ اوّل کے سائنس داں قادرِ مطلق پر ایمان و ایقان رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں اس دور کے بعض دوسرے

مفکر تکنیک کے شکار معلوم ہوتے ہیں۔ بہرکیف یہ بات مسلم ہے کہ موجودہ وجودیت پسندی دور جدید کی ہی پیداوار ہے۔ موجودہ مذہب نے ہمیں صرف غم دے لیسی کا جذبہ عطا نہیں کیا ہے بلکہ تھوڑی سی خود اعتمادی بھی دی ہے۔ (چاہے یہ خود فریبی کی شکل میں کیوں نہ ہو) اس لئے غم دے لیسی کا راگ الاپنے والا ہی جدید شاعر نہیں ہے بلکہ ایک وجودیت پسند شاعر بھی جدید شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس کی شاعری میں کم از کم جدید ذہن کے ایک خاص پہلو کی نمائندگی تو ہوتی ہے۔ چنانچہ ظفر حمیدی کے نظریۂ حیات سے اختلاف ممکن ہے لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت سے انکار ممکن نہیں۔ ہمیں دراصل یہ دیکھنا ہے کہ شاعر جس عقیدے کا حامی ہے اپنی شاعری میں انہوں نے شاعرانہ خلوص و صداقت کے ساتھ کس حد تک اس سے انصاف برتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ظفر حمیدی ایک کامیاب شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں "بازیافت" اور "وسوسہ" مثال کے طور پر لی جا سکتی ہیں جو میرے خیال میں ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ نظم "بازیافت" میں شاعر کو اپنے پیکر کا حسین تخلیقی عمل ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے مادی جسم کا فانوس چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد رنگ آمیزیٔ ماحول کا صد رنگ طلسم خواب پریشاں کی طرح منتشر ہو جاتا ہے۔ پردۂ وقت پر جب شاعر کی ہستی کا جمال ابھرتا ہے تو شاعر پھر سے مانگ کھینے لگتا ہے۔ (ممکن ہے شاعر کی روح سحر کے پیکر میں مانگ کھیل رہی ہو) کھیل ختم ہونے پر پیکراں وسعت آفاق کی پہنائی میں نیرگی پھیل جاتی ہے۔ آخر میں شاعر کہتا ہے:–

اب بھی باقی ہے مگر نور کی ہلکی سی لکیر

ایک احساسِ وجود

ایک احساسِ وجود

مادی جسم کا فانوس چکنا چور ہونے کے باوجود شاعر کو ایک احساسِ وجود ہے۔ اسے واقعی شاعر کا عرفان کہنا چاہئے۔ اس نظم میں احساسات کی جو گہرائی پائی جاتی ہے، وہ ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی کے لئے ذمہ دار ہے۔ نظم "وسوسہ" میں شاعر نے جدید ذہن کی ہو بہو عکاسی کرتے ہوئے کہا ہے کہ متعلق انسان خالقِ کائنات کے تصور سے گریزاں ہے۔ زمین پر نزولِ بشر اور خلافت خدا کا تصور ذہنِ آدم کی طفولیت میں تسکین بخش ثابت ہو رہا تھا لیکن اب یہ تسکین بخشنے سے قاصر ہے۔ کبھی روحِ انسان کی تقویم و ناسیس خدا اور خودی کی امین محافظ بنی تھی۔ لیکن آج روح کو عناصر کا ردِ عمل کہا جاتا ہے۔ اب مذہب اپنی اہمیت کھو چکا ہے اور پتھروں کے تابوت پر سر جھکائے اندھیروں میں کچھ لوگ دم توڑ رہے ہیں۔ صحیفوں کے بوسیدہ اوراق کو طاقِ نسیاں پہ دیمک چاٹ رہی ہے۔ ان ذہنی وسوسوں کے بعد شاعر خود سے پوچھنے لگتا ہے کہ آخر انسان کا ذہن کیا چیز ہے، تخیل اور وجدان کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک طبعی عمل کا مظہر ہے یا کسی کیمیائی اثر کا نتیجہ۔ آخر میں شاعر کہتا ہے:–

یہ ایجادِ فن کیا ہے، تخلیق کیا ہے

یہ موزونیٔ طبعِ شاعر ہے کیا شئے

یہ رنگینیٔ کلکِ فنکار کیا ہے

یہ آواز کی نغمگی کا کرشمہ

یہ آہنگ کیا ہے ! ! !

یہیں نظم عروج پر بھی پہنچتی ہے اور اختتام پر بھی۔ شاعر ذہنی کشمکش میں پڑ کر کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکا ہے۔ اس نظم میں جدید انسان کی ذہنی کشاکش کی ہو بہو عکاسی نظر آتی ہے۔ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں جو سوالات موجزن ہیں ان پر شاعر مزید غور و فکر کرے تو شاید کسی کارآمد نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ لیکن شاعر کو اس نتیجے کی کوئی فکر نہیں۔ شاعر کا یہ غیر متعلقانہ رویہ اس کی فنکارانہ صلاحیت کی ضمانت ہے۔

نئے شاعروں کے تتبع میں ظفر حمیدی نے ایک نظم "بال ہمٹیا" لکھی ہے جو نئی شاعری کی ایک بھونڈی تقلید ہے۔ اس نظم میں کیفیاتی امتزاج سے وہ سالم کلیت پیدا نہیں ہوتی جو مثال کے طور پر ان کی نظم "بازگشت" میں جذبات کی تنظیم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے وجودیت پسند شعراء میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے اور انہیں اس طرح ادھر ادھر بھٹکنا نہیں چاہئے تھا۔

ان کی غزلوں کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے ان کا وجود ...

دبی رجحانات پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

میری ہر سانس کو مرہونِ بلا ہونے دو
مجھ پہ جو قرض ہے ہستی کا ادا ہونے دو
عارضِ زیست کا ہر رنگ بدل جائے گا
منجمد خون مرا گرم ذرا ہونے دو

مجھے فکرِ سود و زیاں نہیں، میں وہی ہوں تیشہ کوہکن

جیسے ہوتے تیری آرزو، جیسے مشکلات سے پیار ہے

ج انساں کی خودی جاگ گئی ہے انتی

دیوتاؤں کا فسوں ٹوٹ چکا ہو جیسے

نہ مجھے کو جو کچھ سمجھے وہ ہے اک سطحی سی بات
میں اپنے کو جو کچھ سمجھوں وہ ہے میرا اصلی وجود

ابھی موت کا مسئلہ حل نہ کیجئے
ابھی زندگی کے مسائل بہت ہیں

مستقبلِ انساں سے نہ مایوس ہوائے دوست
فنکار کے قبضے میں ابھی لوح و قلم ہے

"حرفِ آغاز" (پیش لفظ) میں ظفر حمیدی نے اس شعر

دار و رسن کا مرحلہ آیا گذر گیا
گیسو و قد کی بات قیامت ہے آج بھی

و جنسی ناآسودگی سے منسوب کیا ہے حالانکہ اس شعر میں ایک طرح کا

[illegible]باتی ترفع (SUBLIMATION) پایا جاتا ہے۔

پورے مجموعے کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ظفر حمیدی کو

[illegible]کی بابت زیادہ محتاط ہونا چاہئے تھا۔ ذیل کے اشعار میں شتر گربہ

[illegible]ب پایا جاتا ہے :-

(۱) آؤ دکھاؤ اپنے فن کا کمال
جس میں رقصاں ہیں آج تیرے صنم (نظم کلائمکس)

(۲) تم آج میرے کلبۂ احزاں میں آئی ہو
تیری جبیں پہ پہر درخشاں کا ہے گماں

بکھرا پڑا ہے آج بھی رنگین ایک خواب

جو مٹی تمہارے نقشِ کفِ پا کی کائنات (نظم۔ تجدیدِ التفات)

نظم "قطب مینار" کے دو مصرعے ہیں ؎

" قطب کی زندہ روایت کھارتے ہی رہے"
" قطب کے نقشِ کہن کی یہ آج پامالی "

لفظ " قطب" کو بروزن " خدا" استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ

بروزن " وقت" ہے۔

مثلاً امیر کا شعر :

کب پھرے تو نشہ نشیں لاکھ زمانہ پھر جائے
قطب گردش نہیں کرتا فلکِ پیر کے ساتھ

نظم " وسوسہ" کے اس مصرع " یا اک کیمیائی اثر کا نتیجہ" میں

لفظ " یا" کا الف گرا دیا گیا ہے جو محلِ نظر ہے۔

بہر کیف ان خامیوں سے ظفر حمیدی کی شاعرانہ اہمیت

میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ظفر حمیدی کی تصنیف "نوائے تیشہ"

اردو کے جدید پسند ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل

کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ کتاب تین روپیوں میں ڈاکٹر ظفر حمیدی، مظفر پور

یا مکتبہ " صبح نو"، قطب الدین لین، پٹنہ ۶ سے

حاصل کی جا سکتی ہے۔

۴۸۶



ابر احسنی گنوری

ساتواں شمارہ ملا۔ ماشاءاللہ رسالہ کا حسن معنوی کافی نکھر گیا ہے۔ لیکن آپ اسی کو منزل نہ سمجھ لیں۔ ابھی آپ کو بہت دور جانا ہے۔

شعور (ادارہ میں (جو ترجمہ منظوم ہے) سلیقہ ہے۔ شیرینی ہے، صفائی ہے اور کام کی باتیں ہیں۔ ذیل کے اشعار شعر کہنے کے لائق ہیں:

ایسا بھی کیا کہ اپنی نظر کا فریب کھائیں
جلوے ہیں تیرے چشم تمنا میں تو کہاں

جمیل مظہری

مرنے والے مر چکے طے کر کے راہِ زندگی
جینے والو! اب تمہاری زندگی خطرے میں ہے

نجمی

مسکرانا غموں کے سائے میں
ضبطِ غم کا ہے اک حسیں انداز

تسخیر فہمی

بادہ نوشی کے لئے رندوں کو ساغر چاہیئے
اٹھو! مسجد کا ہر ظرفِ وضو خطرے میں ہے

عطا کاکوی

وحشت بڑھی ہے زلفِ گرہ گیر دیکھ کر
دیوانے محو رقص ہیں زنجیر دیکھ کر

تسنیم فاروقی

ساقی یہ تشنگی سرِ میخانہ تابکے
جام و سبو نہ توڑیں تو میخوار کیا کریں

مخمور

وہ زندگی کے ساتھ قدم کس طرح ملائیں
جو زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں دور سے

مظفر حنفی

افسانے غنیمت ہیں۔ مفتون کا مقالہ کافی کاوش کا نتیجہ ہے۔

باضابطہ شعر لکھنے والے شعراء سے دو لفظوں کی صحت کے بارے میں کچھ عرض کر دوں۔ لفظ دلہن بروزن وطن، چمن صحیح اور فصیح ہے۔ دُل + ہَن بروزن امین۔ مدفن صحیح نہیں لفظ ٹھُ + ہَر بروزن کرم۔ نظر۔ سفر صحیح ہے۔ ٹھیر بروزن خیر۔ دیر صحیح نہیں۔ میر نے لکھا تھا مستند ہے میرا فرمایا" یہ میر کے زمانہ کی بات ہے" جو ترک ہو چکی۔ آج کسی واحد لفظ کے ساتھ فرمانا لکھنا اہل زبان کی بول چال کے خلاف ہے مثلاً آپ نے فرمایا۔ انہوں نے فرمایا۔ صحیح تو نے فرمایا۔ اس نے فرمایا دل آرام فرماتا ہے۔ نظر دیدار فرماتی ہے۔ یہ سب آج غلط ہے۔

سید حرمت الاکرام — مرزاپور

شفقت صاحب نے میری غزل "دل کو توفیق دیا ہو تو غزل ہوتی ہے" کو تکلف محض قرار دیا ہے، جس کی اصولاً مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اگرچہ ان کی رائے سے میں مطلقاً متفق نہیں، لیکن ان کے یہ الفاظ:

"معلوم نہیں، اس زمین میں غزل کہنے کا مشورہ انہیں کس نے دیا؟"

بحد دلچسپ اور توجہ طلب ہیں۔ کیا شفقت صاحب کسی زمین میں غزل کہنے سے قبل "مجلس مشاورت" کی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟ — بھائی! مجھے ایسی کوئی عادت نہیں۔

رہی غزل تو وہ اچھی بری جیسی بھی ہے، اہل نظر اور قارئین "شاخسار" کی نگاہوں سے گزر چکی ہے اور کئی دوسرے احباب نے اس کی پسندیدگی کا بھی اظہار کیا ہے۔ اگر میری حقیر رائے کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے، تو میں خود بھی اسے اپنی ان غزلوں میں شمار کرتا ہوں جنہیں اردو کی اچھی غزلوں میں جگہ مل سکتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ میری شاعری محض واردات قلب کی شاعری نہیں۔ بلکہ جذبہ کو فکر و شعور کی منزل تک لاتی ہے یہ کیفیت میرے یہاں غزل و نظم دونوں میں یکساں طور پر ملے گی اور میرا اسلوب سخن متعین کرنے والے عناصر میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بہرحال میں شفقت صاحب کی رائے کی قدر کرتا ہوں اور موصوف کا شکر گزار ہوں۔

شمس الرحمن فاروقی — الہ آباد

"شاخسار" کا شمارہ مل گیا۔ شکریہ

بزم شاخسار میں محفوظ الحسن صاحب نے جو بات کہی ہے میں اس سے متفق ہوں۔ بلکہ یہ شعر پڑھنے کے بعد مجھے سودا کا بھی مطلع یاد آ گیا، جو میرے شعر کا تقریباً ہم معنی ہے:

ہم نے ترے کوچے میں او صبا بھی ہو : ہماری خاک کے دیکھو تو کچھ ہوا بھی ہے

اپنا شعر کہتے وقت دونوں اشعار میرے ذہن میں بالکل نہ تھے۔ لیکن غالباً لاشعور نے اپنا ساحرانہ عمل دکھایا۔ محفوظ الحسن نے جگر کا شعر نقل کیا ہے:

انساں نے ماہ و انجم کی راہیں تو دیکھ لیں
خود اپنی انجمن میں چراغاں نہ کر سکا

اس سے بہت بہتر شعر اقبال کا ہے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

جگر صاحب کا شعر اقبال کا کمزور چربہ معلوم ہوتا ہے۔

زہرہ جبیں — ناگپور

اپریل کا "شاخسار" نظر نواز ہوا۔ بے انتہا پسند آیا۔ مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں سب نفیس اور دلکش ہیں۔ افسانوں میں زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر بحث ہے اور اخلاقی سبق موجود ہے۔ ترجمہ "ان پڑھ" بھی بے حد پسند آیا۔

احمد شکور — لکھنؤ

"شاخسار" کا ساتواں شمارہ موصول ہوا۔ زیر نظر پرچہ پچھلے پرچوں کی بہ نسبت اچھا اور نکھرا ہوا ہے۔ مایہ ناز شاعر کرشن موہن کی شاعری پر مفتوں کو ٹوی صاحب نے بڑی خوبی سے تبصرہ فرمایا ہے۔ منظومات میں علامہ مظہری، تسنیم فاروقی، کرامت علی کرامت اور عطا کاکوی صاحبان کی نگارشات قابل تعریف اور معیاری ہیں۔ سوائے سہرسٹ ہاشم کی کہانی کے کوئی بھی افسانہ قابلِ اشاعت نہیں معلوم ہوا۔ مثلاً انور سیوانی ایم اے سادات اور رئے جمال صاحبان کی کہانیوں کا پلاٹ آج سے دس پندرہ سال قبل کا ہے۔

تسخیر فہمی — دہلی

کل بالکل ایسا معلوم ہوا، جیسے مدتوں بعد "شاخسار"

کے درشن ہوئے ہیں۔ موجودہ شمارہ دیکھ کر طبیعت خوش
ہوگئی۔

"بزم شاخسار" میں برادرم محمود سعیدی کا خط ان
کی سلامت طبع اور سنجیدگی فکر کا مظہر ہے۔ سلطان صدیقی
کچھ جھنجھلا گئے ہیں۔ غزلوں میں یہ شعر:

اپنے کرتوتوں کے باعث آدمی خطرے میں ہے
اس کا یہ ذوقِ جنونِ آگہی خطرے میں ہے
ہر نفس ہے وقفِ غم، ہر سانس ہے وقفِ الم
سچ تو یہ ہے امنِ عالم آج بھی خطرے میں ہے
مرنیوالے مرچکے طے کرکے اپنی منزلیں
جینے والو اب تمہاری زندگی خطرے میں ہے

امجد نجمی

"شاعری جزویست از پیغمبری" کے مصداق ہیں۔
شعری حصہ پورا معیاری ہے۔ بالخصوص یہ اشعار:

دل کو ترے خطوط سے ہے ربط بے پناہ
راتیں گزار دیں تری تحریر دیکھ کے
مایوسیوں میں ضبط کا یارا نہیں رہا
آنسو نکل پڑے تری تصویر دیکھ کے

تسنیم فاروقی

وہ زندگی کے ساتھ قدم کس طرح ملائیں
جو زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں دور سے
شاید نظر میں آئیں مری سربلندیاں
منسوب کر رہا ہوں تمہارے غرور سے

مظفر حنفی

بارگاہِ حسن میں جب ناپنے لگتے ہیں ہونٹ
مدعائے عشق کی تفسیر بن جاتا ہے دل

سیف ہمتی پوری

تسنیم منکشہ کے نظریے بدل گئے۔ نظریے یعنی؟
صحیح لفظ نَظَرِیّہ ہے، جسے بعض لوگوں نے نَظَرِیے تو استعمال
کیا ہے۔ مگر نظریے لکھنے والے تسنیم صاحب میری نظر میں پہلے
شخص ہیں۔ اس طرح سے

"ٹھہر جا اے گردشِ دوراں ذرا آرام کر"

لفظ ٹھہر ہے۔ ٹھہر نہیں
اندرجیت دت کا "اَن پڑھ" کامیاب ترجمہ ہے۔
"سرخ تاج" اور "سہارا" بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔

نسیم محمد جان ۔ آرہ

اس شمارے کی ہر چیز پسند آئی۔ مضامین میں مقتول
کوثری کا "کرشن موہن اور غزل" بہت خوب ہے۔ "شعور
آوارہ" اور "نشاطِ کرب" قابلِ تحسین ہیں۔ امان صاحب
کا "سرخ تاج" اور اندرجیت صاحب کا "اَن پڑھ"
جو سمرسٹ ماہم کی کہانی "دی ورجر" کا اردو عکس ہے، بھی
پسند آیا۔ علامہ جمیل مظہری اور عطا کاکوی کی شرکت "شاخسار"
کے لئے ایک فخر کی بات ہے۔ غزلیں سبھی معیاری ہیں۔ اس
بار کا "بزم شاخسار" بھی جاندار ہے۔

ساحل مانک پوری ۔ مانک پور (پرتاب گڑھ)

"شاخسار" کا ساتواں شمارہ موصول ہوا۔ صوری و معنوی
حیثیت سے دلپذیر ہے۔ کرشن موہن کے متعلق مضمون
پسندیدہ ہے۔ کرشن موہن اپنی جدت ادا کی بنا پر آج کے
شعر و ادب میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ انداز بیان
میں ایک انفرادیت ہے، یہی وہ چیز ہے جو شاعر کو
اپنا مقام متعین کرانے میں معاون ثابت ہوتی ہے
ان کے تینوں مجموعے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ ان میں
درجہ بیشتر اشعار درد و غم، لذتِ شوق و وارفتگی کی
شعورمندانہ جھلک پیش کرتے ہیں۔

نئے نسل کے نمائندہ شاعروں کے متعلق ... قابل قدر ہیں۔ طب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے ابو علی سینا ایک دلچسپ مضمون ہے۔

مندرجہ ذیل غزلیہ اشعار خصوصیت سے پسند آئے:

ع یہ کاروبار درد و تپش ہے خودی کا کام
اے بیخودی مقام تمنا میں تو کہاں
——— علامہ جمیل مظہری

ع مرنے والے مر چکے طے کر کے اپنی منزلیں
جینے والو! اب تمہاری زندگی خطرے میں ہے
——— امجد نجمی

ع یہ چہچہاتی ہے چمن میں عندلیب خوشنوا
کون اس سے یہ کہے جا کر کہ تو خطرے میں ہے
——— عطا کاکوی

ع جیسے کوئی گناہ ہو اک حرف آرزو
ان کو گریز ہے مجھے دلگیر دیکھ کے
——— تسنیم فاروقی

ع منزل، پہ اپنی آج نظر آ رہے ہیں وہ
یعنی بڑے نڈھال، بہت چور چور سے
——— مظفر حنفی

ع کم ہیں متاعِ غم کے خریدار کیا کریں
جنسِ وفا کا سرد ہے بازار کیا کریں
——— پروفیسر افتخار احمد فخر

جاوید اقبال کاظمی - فتحپور

تخلیقات بحیثیت مجموعی خاصی اطمینان بخش ہیں نظم کے میدان میں تو غلطے کی چیزیں ملیں۔ جن کی فراہمی کے لئے آپ کی مساعی مستحق مبارک باد ہیں۔ پروفیسر کرامت علی کرامت کا حقیقی بہار کی نظم کا ترجمہ بہت خوب ہے۔ غزلیات کے باب میں مندرجہ ذیل شعراء کی غزلیں پسند آئیں۔ جمیل مظہری۔ امجد نجمی۔ عطا کاکوی۔ مظفر حنفی تسخیر فہمی وغیرہم اور یہ شعر بطور خاص پسند آئے۔

ع ساحل پہ بیٹھ، موجوں کی اٹکھیلیوں کو دیکھ
اے مظہری، تلاطمِ دریا میں تو کہاں
——— جمیل مظہری

ع ہر نفس ہے وقفِ غم، ہر سانس ہے وقفِ علم
سچ تو یہ ہے امنِ عالم آج بھی خطرے میں ہے
——— امجد نجمی

ع مسکرانا غموں کے سائے میں
ضبطِ غم کا ہے اک حسیں انداز
——— تسخیر فہمی

ع دامنِ صیاد خاروں میں اُلجھ کر رہ گیا
خوش ہو اے بلبل کہ خود تیرا عدو خطرے میں ہے
——— عطا کاکوی

ع پنہاں نہیں جناب مظفر سے اصلیت
وہ لغزشوں کو لاکھ چھپائیں سرور سے
——— مظفر حنفی

افسانوں کی دنیا میں پروفیسر انور سیوانی کا سہما خاص توجہ کا مستحق ہے۔

شمیم ہاشمی - شاہ آباد (بہار)

شاخسار کا شمارہ ۲-۳ باصرہ نواز ہوا "کرشن موہن اور غزل" کامیاب اور کارآمد مقالہ ہے "ابو علی سینا" جیسے اور بھی مقالات کی اشاعت کارآمد ثابت ہوگی۔ جناب نور الدین احمد سے ایسے اور مقالے لکھوائیے "شعور آزاد" پڑھ کر ذرا بھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ یہ محترم کرامت کی کرامت ہی ہے "نشاطِ کرب" اور "خواب کی موت" اچھی نظمیں ہیں۔ غزلیں سبھی عمدہ اور معیاری ہیں۔ خصوصاً جمیل مظہری اور حضرت عطا کاکوی کی غزلیں "سونے پہ سہاگہ"!!

اور جبیت وت نے اپنی کوشش میں خاطر خواہ کامیابی
حاصل کی۔ "ان پڑھ" بہت پسند آیا۔ افسانوں میں "سہارا"
اچھا افسانہ ہے۔ سرخ تاج اور آخری رات کے پلاٹ گرچہ
فرسودہ ہیں پھر بھی اندازِ بیان دلکش!! "دھوپ چھاؤں"
کسی اعتبار سے تعریف کا مستحق نہیں۔

رونق دکنی سیمابی جمشید پور

مقالات میں "کرشن موہن اور غزل" کافی طویل ہے
جس سے عقیدت زیادہ اور حقیقت کم واضح ہوتی ہے۔
جناب معصوم کسی اور شاعر کے فن پر تبصرہ کرتے تو اچھا
ہوتا۔ اس لئے کہ ایک ہی مضمون انہوں نے کسی اور پرچہ
میں بھی دیا ہے۔ "ابو سینا" گو مختصر ہے۔ مگر ہے جامع
ابکی نظموں کے مقابلہ میں غزلیں زیادہ ہیں۔ نظم "شعور
آوارہ" بہترین نظم ہے۔ جس کے لئے پروفیسر کرامت علی
کرامت، قابل مبارک باد ہیں۔ امجد نجمی، تسخیر فہمی،
تسنیم فاروقی، پروفیسر فخر کی غزلیں پسند آئیں۔

افسانے اب کے بہت زیادہ ہیں۔ مگر ان میں سہارا
اچھا اور آخری رات، غنیمت ہے۔

بزم مناخسار میں جناب تسنیم فاروقی کا خط درخورِ
اعتناء تو نہ تھا مگر سخن گسترانہ بات، چونکہ آ گئی ہے۔ اس لئے
چند سطریں سپردِ قلم کرنی پڑیں۔ انہوں نے مولانا ابر احسنی کو
ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کا بڑا ہی بھونڈا طریقہ اختیار کیا ہے
ابر صاحب کے ممتاز شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ مگر اس کے لئے
علامہ سیماب اکبر آبادی جیسی عظیم شخصیت سے متعلق کہنا کہ ابر
صاحب نے سیماب کی شاعری کو زندگی دی ہے" حقیقت سے
نابلد ہونے کا بین ثبوت ہے۔

حضرت احسن مارہروی (جن کے ابر صاحب تلمیذ رشید
ہیں) اور حضرت سیماب، داغ دہلوی تک بے شمار تلامذہ میں
[illegible]

علامہ [illegible] (جو خود حضرت داغ کے شاگرد ہیں) سے بھی علاقہ
یہ ادبی حقیقت ارباب قلم سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت علامہ
بحیثیت شاعر وہ روشن مینار ہیں کہ کتنے ہی سسکتے دیے
اس سے روشنی حاصل کر کے فضائے ادب میں روشن
ہیں اور کتنوں کی شعری زندگی سنور گئی۔ آپ نے طہارت فکر و نظر
کو اصول شاعری قرار دے کر شعر مہذب کہنے کی پہلے پہل طرح
ڈالی تھی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں: ؎

میں کہ پیغمبر تہذیب سخن تھا سیماب
سلسلہ شعر مہذب کا مرے گھر سے چلا

غرضیکہ اس سلسلہ میں غلط بحث لا حاصل ہے۔ مجھے مولانا
ابر احسنی سے امید ہے کہ وہ تسنیم فاروقی کے اس غلط بیانی
کی تردید کر دیں گے۔



اُردو دنیا کا منفرد علمی و ادبی جریدہ

دو ماہی شاخسار کٹک

تیسری جلد — چوتھا شمارہ

مدیر اعلیٰ
امجد نجمی

★

ترتیب و تدوین
کرامت علی کرامت

★

ادارۂ تحریر
سید حرمت الاکرام
مظہر امام
حیدر نایاب

★

معاونین
محمد انور ——— احمد حسین آزاد

قیمت فی شمارہ ۵۰ پیسے • زرِ سالانہ تین روپے

پتے
(۱) مدیر "شاخسار" بخشی بازار - کٹک ۱
(۲) رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار کٹک ۱

امجد نجمی، مدیر، مالک و ناشر نے لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر "شاخسار" بخشی بازار، کٹک ۱ سے شائع کیا

نقشِ اوّل

ڈوبنا سیکھ لو پہلے تو بتاؤں تم کو
کس طرح وقت کا گرداب نگل جاتا ہے

اُردو ہندوستان کی زبان ہے۔
ان چند الفاظ کی توضیح، حصولِ آزادی سے اب تک اتنی تفصیل کے ساتھ کی جا چکی ہے کہ تاریخی و لسانی حقائق کا کوئی پہلو، کوئی باب تشنۂ اظہار
ہیں رہا۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ فرقہ پرستوں نے تھوڑی دیر کے لئے بھی تنگ نظری کی عمیق خندقوں سے اُبھرنے کی زحمت کی ہوتی، تو اس
ضرورت ہوتی بھی نہیں چاہیئے تھی۔ اگر یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہندی ہندوستان کی زبان ہے، تو کانگرس نے جسے ملک پر حکومت
رتی تھی۔ یہ کیسے گوارا کیا کہ اہلِ اردو کو چیخ چیخ کر یہ بتانا پڑے کہ اُردو کس خطۂ ارض کی زبان ہے اور وہ بھی سعی رائگاں بن کر رہ جائے۔
بہرحال یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کانگریس نے گذشتہ بیس برسوں کے دوران اردو دشمنی اور اُردو کشی کو
جس طرح روا رکھا، ممکن نہ تھا کہ اسے اہلِ اردو کے علاوہ کوئی اور طبقہ گوارا کرتا۔ کیونکہ اردو کو مسلم اقلیت کی زبان (اور اس اقلیت
و غدار) قرار دینے کا کھیل کھیلا جا چکا تھا اور کسی جماعت، طبقہ یا فرقہ کو عملاً بے دست و پا کر دینے کی اس سے بہتر تدبیر کیا ہو سکتی
ہے؟ یہ تمام کارنامے ان عناصر نے انجام دیئے۔ جنہیں کانگریس خود بھی فرقہ پرستی کا مجرم گردانتی تھی۔ لیکن کم از کم اردو کی تقدیر
انہیں کے نظریۂ سیاست اور مذاق کا رستہ وابستہ تھی۔

لیکن ——————

یوپی اور بہار کے موجودہ حکمرانوں نے کانگریس کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ کون نہیں جانتا کہ دونوں ریاستوں کی متحدہ حکومتیں جن جماعتوں کے اشتراک
سے وجود میں آئی ہیں۔ ان کے بیشتر امیدواروں نے انتخاباتِ عامہ (۶۷ء) میں اردو کے مسئلے کو نمایاں تر اہمیت دے کر اور اُردو کو
اس کے حقوق دلانے کے خواب دکھا کر اہلِ اردو کے دلوں کو گرمایا اور گرم لوہے پر ضرب لگا کر مطلب برآری کی صورت نکالی۔ ظاہر
ہے کہ انیس بیس سال کی مظلوم و زخم خوردہ لسانی اقلیت نے جسے فطرتاً ہمدردی کی ضرورت تھی۔ پورے جوشِ عمل اور خلوص کا رسے
تعاون کا ہاتھ بڑھایا، جس کا صلہ یہ ہے کہ وہ آج جن سنگھی ارکان کی اکثریت سے مغلوب ہو کر (یا اسے حیلہ بنا کر) اور اپنے بیانوں اور
وعدوں کی تاویلات پیش کر کے مضحکہ خیز سیاسی مصلحت کوشیوں پر مصر ہیں۔
ساتھ ہی بعض عناصر بلند تر آواز میں یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ موجودہ اردو تحریک کی پشت پر سیاسی بازیگروں کی کارفرمائی ہے۔
لیکن ہمیں صرف اتنا دریافت کرنا ہے کہ یہ تحریک بجائے خود بیجا تو نہیں؟ بے سبب تو نہیں؟ یہ اور بات ہے کہ اہلِ اردو خوابِ مدہوشی
سے بڑی دیر میں چونکے۔ سابقہ اور موجودہ تجربات بتاتے ہیں کہ کم ہی افراد ایسے ہیں، جن کے ذہن اردو کے باب میں صاف ہوں، ورنہ اردو
کے حقوق کو پامال کرنے کا سوال اس انداز سے اٹھایا جاتا ہے۔ گویا اس کے بغیر ملک کی ترقی ممکن نہیں۔
کرۂ ارض کے کسی خطہ میں شاذ ہی کسی زبان کو فنا کرنے کی اس قدر عظیم الشان جدوجہد کی گئی ہو۔ اولاً تو اسے اتنے ہی حقوق دیئے گئے جنہیں
کم از کم، سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اسے بھی صرف تحریر کی زینت بنا کر چھوڑ دیا گیا۔ نیز دوسرے مختلف وسائل سے وہی کام لیا گیا جس کا مقصد
اردو کو فنا کرنا تھا، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ درسگاہوں سے اردو کی تعلیم ختم ہو جاتی۔ اردو والے چیخنے چلانے رہتے اور حکومت کچھ نہ کر سکتی۔ اب
اب یوپی اور بہار کی موجودہ حکومتیں بھی انہیں ہتھکنڈوں کو بروئے کار لا رہی ہیں چنانچہ سوچنا یہ ہے کہ کیا ہم اُردو کو مٹ جانے دیں؟

حرمت الاکرام - ۳۱ اگست،

ابر احسنی گنوری

ہر زمانے کا ادب نیا ہی ہوتا ہے

قدرت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ جس شخص یا جن اشخاص سے جو کام لینا چاہتی ہے اس ذمہ داری کو سپرد کرنے سے پہلے اس کی یا ان کی طینت میں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ایک اصول ہے بیان کیا۔ اس کو زندگی کے کسی شعبہ پر منطبق کر کے دیکھ لیجئے اس کی صداقت ظاہر ہو جائیگی۔ یہ فرق البتہ محسوس ہوگا کہ کوئی شخص اس ذمہ داری کو باحسن الوجوہ انجام دیگا اور داد و تحسین کا مستحق ٹھہریگا اور کوئی اس ذمہ داری کو پورا تو کرے گا مگر اس میں حسن کی کمی ہوگی۔ ممکن ہے کہیں کہیں کوئی خرابی بھی پیدا ہو جائے خواہ اس ذمہ داری کی دونوں قسم کے لوگوں نے یکساں تربیت (ٹریننگ) پائی ہو۔ اور صرف اختلافِ طبائع کے باعث ہوا کرتا ہے ورنہ اپنے اپنے فریضے سب ادا کرتے ہیں اور یکساں عہدوں پر متمکن ہوتے ہیں۔

اگر ہم شعر و ادب کو بھی ایک عہدہ یا ذمہ داری مان لیں اور ادیب و شاعر کو عہدہ دار تو ہمیں اس پر نظر کرنی ہوگی کہ ان دونوں نے کس کس دور میں کیا کارنامے انجام دیئے اور اگر کل کے ادیب و شاعر کی طرز تبلیغ آج کے شاعر و ادیب سے مختلف ہے تو کیوں جبکہ دونوں ہی ایک ہی ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں۔

تلاش بسیار کے بعد ہمارا دماغ یہیں تک رسائی کرے گا کہ (۱) ادب طبعاً حالات کا تابع ہوتا ہے پس جس شاعر و ادیب کے زمانہ میں جو ملکی اور سماجی حالات ہوں گے شاعر و ادیب انہیں حالات پر روشنی ڈالے گا اس دائرے سے باہر نکل ہی نہیں سکتا کچھ واردات ایسی ہیں جو فطرت انسانی میں شامل ہیں، اور انہیں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی جیسے، محبت، عشق، نفرت، دشمنی، بھوک خواہ شکمی ہو یا جنسی، تنگی، فراخی کا احساس وغیرہ۔ (۲) شاعر و ادیب انسان ہوتے ہیں اور ہر انسان جن حالات و جذبات کے تحت عمر گزارتا ہے ان سے شاعر و ادیب بھی ضرور گذریں گے اور وہی کہیں گے جو ان پر گذر رہی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ادیب و شاعر اپنے ماحول اور اپنے زمانہ کے حالات ضرور قلم بند کرے گا۔ وہ چیزیں جو قدرت نے فطرت میں داخل کر دی ہیں اس سے ضرور متاثر ہوگا اور قلم اٹھائے گا۔ جو کچھ اس پر یا اس کے زمانے کے لوگوں پر گذرے گی وہ اسے ضرور ضابطۂ تحریر میں لائے گا اور اگر وہ اپنے ماحول سے ہٹ کر کچھ کہے گا یا اُن جذبات سے گریز کرے گا جو قدرت نے انسانوں کی فطرت میں شامل کر دیئے ہیں تو کوئی اسے رجعت پسند کہہ کر اس کا مذاق اُڑائے یا نہ اڑائے سامعین و ناظرین خود اس کے رشحات کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں گے اور یہ اس کے لئے سخت سزا ہوگی کیونکہ بے وقت کی راگنی کبھی پسند نہیں کی گئی اگر کوئی احمق کسی ماتمی جلسے میں ٹھمریاں گائے یا برات میں مرثیے پڑھنے لگے تو لوگوں کا اس کے ساتھ جو سلوک ہوگا اس کا خود تصور کر لیجئے۔

اب سے پہلے اس اطمینان کے دور میں جب انسان فکر و آرام سے بری تھا ہر طرح فراغت اور عیش کے سامان مہیا تھے۔ روٹی کی وہ افراط تھی کہ کھانے والے میسر نہ تھے ایسے ماحول میں انسان کو عیاشی، تفریح اور عیش پرستی ہی سوجھا کرتی ہے عیاشی کے سلسلہ میں رقابت ایک ضروری چیز ہے حسن و حسینہ کی مختلف زاویوں سے تعریف و توصیف ہی وقت کی آواز ہوتی ہے۔ شباب و شراب کے چرچے ہی اس دور کی پسندیدہ چیز ہوتی ہے۔ انہیں کے اذکار لوگ سننا پسند کرتے ہیں اور انہیں سے لطف اٹھاتے ہیں خود شاعر انہیں واردات کا شکار ہوتا ہے اور انہیں حالات کا۔ اس پیمانہ داری کے ساتھ بتائیے ایک شاعر اسیرِ حلقۂ زلف نہ ہوگا تو کیا ہوگا دل کی تدبیر اور فراق کی مدافعت نہ کریگا تو کیا کریگا اپنی راہ میں آنے والے رقیبوں کو کالے پانی پہنچانے کی راہیں تلاش نہ کریگا تو کیا کرے گا۔ محبوب کا سراپا رقم نہ کریگا تو کیا کرے گا واسوخت نہ لکھے گا تو کیا لکھے گا اپنے وقت کی مساعدت اور حالات کی موافقت کے ترانے نہ گائے گا تو کیا گائے گا۔ یہی اس کی ذاتی کیفیت ہے یہی اس کے ماحول کا رنگ ہے آپ اس دور کے منثور و منظوم مجموعے دیکھ لیجئے۔ یہی عیش پرستی اور عیاشی نظر آئیگی جو داستانیں لکھی گئیں ان میں پریوں کا اور ان کے حسن کا ذکر، دربار کے ٹھاٹ باٹ، خاتونوں کی نمائش، ہجر و فراق کے قصے

یہی رنگ مثنویوں کا یہی غزلوں کا اس میں داغ غریب پر ہی منحصر نہیں اس دور کا ہو یا ایسے ادوار کا مولوی اور متقی شاعر و ادیب بھی اسی رنگ میں نظر آئیگا یہ الگ بات ہے کہ کسی شاعر کے حالات مساعد نہیں ہیں تو اپنے گھر کا حال لکھتے وقت چھت کے ٹپکنے اور بیٹھنے کی جگہ باقی نہ رہنے کا شکوہ کرے ڈ پھر بھی عیش مسرت عشق و عاشقی اس کے کلام پر غالب ہوگی یا کسی شاعر و ادیب پر تصوف کا غلبہ ہے تو وحدت الوجود اور موت و حیات کے فلسفے بیان کرے گا مگر ماحول کے اثر سے اس کا کلام پھر بھی باہر نہ جائے گا۔

آج جبکہ زمانہ بالکل منقلب ہوگیا سکون چھن گیا فراغت پر ڈاکے پڑ گئے۔ فکر معاش روح حیات بن گئی اور شاعر و ادیب یا عام و عوام سبھی ایک شکنجہ میں کس گئے تو کون فاتر العقل اور آنکھوں کا اندھا کل کی شاعری میں اور آج کی شاعری میں یا کل کے افسانوں اور آج کے افسانوں میں فرق محسوس نہیں کریگا۔ شاعر و ادیب تو اپنے حال کے مترجم، اور ماحول کے مفسر ہوتے ہیں وہ جو دیکھتے ہیں یا جوان پر گذرتی ہے وہ خود بخود لکھنے لگتے ہیں۔ اگر آج داغ، ذ، امیر ہوتے، سودا و میر ہوتے تو ان کے اشعار آج ہی کے حالات کے ترجمان ہوتے۔ وہ پرانے انداز سب طاق نسیاں ہو جاتے اس کا دوسرا استقرائی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آج کی نئی شاعری کے دعویدار اگر داغ و میر یا سودا کے زمانے میں ہوتے اور یہ نسخے جو آج وہ لا رہے ہیں اس محفل میں پیش کرتے تو انہیں کیا سمجھا جاتا اور کس کس طرح ان کا مذاق اڑتا اس کا تصور کر لیجئے۔ وہ مجبور ہوتے عیش کی تانیں اڑانے پر۔

اس تمام عرض و گذارش کا مقصد یہ ہے کہ شاعری یا ادب ہمیشہ زمانے حالات و ماحول اور ضروریات انسانی کے ساتھ ساتھ کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہے گا اور موجودہ وقت کے ادب ہی کو سب جدید ادب کہتے رہیں گے یعنی ہر دور میں ادب اس زمانہ کے لحاظ سے نیا ہی رہا ہے اور نیا ہی رہے گا۔ یہ ادب خود بخود بدل جاتا ہے اس میں نہ کسی کی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے نہ تبلیغ کی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج جس ادب کو ترقی پسند ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ کل حالات بدلنے پر یہی ادب دقیانوسی اور رجعت پسندی کے نام سے یاد کیا جائیگا اور اس کی سب چولیں خود بخود ڈھیلی نہ ہو جائیں گی؟

غزل اردو شاعری کی ایک پسندیدہ اور مخصوص و مقبول صنف ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادبا و شعرا نے اس کے مٹانے اور بدنام کرنے میں کیا نہ کیا یہ سبھی لوگ کم و بیش جانتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ غزل کا ڈھانچہ عشق و محبت کے اینٹ گارے سے تیار ہوا ہے اور اس زمانہ میں عشق و محبت یا اس کے جزئیات کا تذکرہ ان لوگوں کے نزدیک " گناہ کبیرہ " ہے اور غزل لکھنے والے شاعر صلیب و دار کے مستحق ہیں مگر اس تمام مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ غزل پہلے سے زیادہ مقبول ہوئی تا آنکہ وہ لوگ جو نظم ہی کو جان سخن سمجھتے تھے وہ غزل کہنے پر مجبور ہوگئے ایسے ہی ایک مشاعرہ میں کئی مخالفین غزل کو غزل پڑھتے دیکھ کر مجھے فی البدیہہ ایک شعر کہنا پڑا تھا ؎

ابر ہم تو خیر ہیں دیرینہ شہید اے غزل
یہ غزل دشمن بتاؤ، کیوں غزلخواں ہو گئے؟

غزل کی مقبولیت میں کیوں کمی نہ ہوئی اور کیوں اضافہ ہوگیا اس کا خاص سبب یہ ہے کہ غزل گو شعراء نے غزل کا ڈھانچہ بڑی خوبصورتی سے بدلا اور غزل میں وہ سب کچھ سمو دیا جو حالات و ماحول کا تقاضا تھا اکثر غزلوں میں ایسے شعر نظر آنے لگے جو پوری نظم کو غزل کے ایک ہی شعر میں سمیٹ لیں۔ پھر بتلایئے غزل کی مقبولیت کیوں نہ بڑھتی اور مخالفین غزل کی مساعی ناکام کیا کام کرتیں پھر کہاں غزل کی نازک و لطیف اور کنایاتی زبان حسن بندش۔ مناسبات لفظی۔ صنائع و بدائع کا ماہرانہ انداز بیان اور کہاں موجودہ نظموں کا سپاٹ اور بازاری اسلوب نتیجہ جو ہونا تھا ہوا مخالفتیں دھری رہ گئیں۔

غزل کی بنیاد محبت ہے اور محبت ہر ذی روح کی (انسان ہی کی نہیں) وہ ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے جس سے اگر ایک ہفتہ کو سبکدوشی حاصل کر لی جائے تو پوری زمین پر کوئی جاندار باقی نہ بچے کہا جاتا ہے کہ عشق و محبت کی اس بھوک کے زمانہ میں ضرورت نہیں یعنی یہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا الله بہ داں دوستوں کو کون سمجھائے کہ نہیں ہے اختیاری شے محبت + یہ دنیا کیوں مجھے سمجھا رہی ہے ؟ ابر احسنی بھلا قدرتی جذبہ کو کون روک سکا ہے اور یہ جذبہ کب طعن و تشنیع کی زد میں آسکتا ہے لہذا غزل کو مطعون کرنے والے غور کریں کہ قدرت کے اس لطیف عطیہ کی مخالفت کر کے انہیں کیا حاصل ہوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے محبت تو جتنی دنیا تک رہے گی خواہ زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلتا رہے کتنے ہی انقلاب آتے رہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ محبت کے اظہار کا ڈھانچہ بدل جائے اور جب تک محبت ہے غزل رہے گی خواہ اس کی کوئی شکل ہو جائے وہ ترقی پسند مضمون بیچے رد و بدل میں ہو۔

کیا مخالفین غزل دست قدرت کی اس سزا پر غور فرمائیں گے کہ غزل کی مخالفت کے ساتھ ساتھ غزل نے خود ان کے دامن میں جگہ بنائی یعنی وہ عشق و محبت سے متعلق خود نظمیں کہنے لگے چاہے وہ غزل کی لطافت کی گرد کو بھی نہ پا سکیں کیا یہ نظمیں غزل نہیں۔ کیا نام بدل دینے سے حقیقت بدل جاتی ہے۔ غزل کے معنی سخن با زنان گفتن ہیں۔ غزل گو محبوب کا ذکر ادب احترام اور سلیقے سے کرنی

تھری پاکیزہ زبان میں کرتے ہیں۔ غزل دشمن بھی ذکر بھونڈے بھدے اور بازاری
زعیاشانہ رنگ میں کرتے ہیں۔ دراصل دونوں کی ایک ہے لطافت وکثافت کا فرق ہے
سمجھا گیا ہے میں ترقی پسند ادب سے متنفر ہوں، یہ جھوٹ ہے۔ یہ مجھ پر الزام
ے میں تو ترقی پسند ادب کو وقت کی آواز سمجھتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ وقت کے
اتھ ادب کا بنا ہوا قدرتی بات ہے جیسا کہ اس مضمون سے ظاہر ہے۔ میں
عض ان ترقی پسند شعراء و ادباء پر ضرور غور کیا کرتا ہوں جو ہر طرح شعر کا حلیہ بگاڑ
ر اس اعضا بریدہ مصرعے کو شعر اور نئے ادب کا نام دیتے ہیں اور جو اس عُریاں
رسیاٹ نیز ایک مخصوص مضمون کی بے ڈول شاعری پر فخر بھی کرتے ہیں اس کے
م نئے جھنڈے بھی گاڑتے ہیں اور باقاعدہ لطیف اور محاسن سے مملو اشعار
ت کرانے کے تیور بگڑ جاتے ہیں اس لئے کہ تعداد میں پابندیوں اور محاسن کے
اتھ شعر کہنا ان کے بس کی بات نہیں کتنی نظمیں اس قسم کی دیکھنے میں آتی
یں جن کا کچھ مطلب نہیں ہوتا ہے۔ بے ڈھنگی نثر کے بھدے ٹکڑے اور
مضمون کے لحاظ سے ایک مخصوص قسم کا پروپگنڈا یا بازاری عیاشی کے اطوار
ں منع نہیں کرتا کہ اپنے اس سرمایہ پر ناز نہ فرمائیے مگر جو اس کو ادب کی توہین
سمجھتے ہیں اور شعر کو اس کی تمام خوبیوں کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں ان کا منہ تو نہ
ڑائیے ان کی یہ کہہ کر توہین نہ کیجئے کہ ان کے کلام پر نئے ادب کی چھاپ ہے
ان کو نئے ادب نے بہت کچھ مرحمت فرمایا ہے جس کے پاس خود کچھ نہ ہو وہ کسی
دکیا دے گا۔

میرے ان دوستوں کو کون بتلائے کہ شعر اور اس کی لطافتوں کو سمجھنا اس کے
عائب و محاسن پر عبور حاصل کرنا مذاق نہیں ہے اس میں بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔
شق کرنی پڑتی ہے۔ ماہرین شعر سے مدتوں تک اکتساب کرنا پڑتا ہے تب کہیں شعر
اور شعر شناسی آتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ آج ہی تُکیں ملائیں آج ہی محفل میں سنایا اور
پہلے ہی قابل لوگوں سے داد پائی۔ آج ہی کسی اچھے رسالے میں ایڈیٹر کے مخصوص
نوٹ کے ساتھ شائع ہو گئی اور آج ہی مستند شاعر بن گئے اور لگے ان اکابرین کی پھر
مخالفت اچھالنے جنہوں نے اسی فن کی تحصیل میں اپنی عمر عزیز صرف کر دی ہے۔

میرے دوستو اگر آپ مزدور کے دوست ہیں غریبوں کے ساتھی ہیں تو غور
کیجئے کہ آپ کی شاہانہ زندگی جو رنگ رلیوں میں اکثر ڈوبی رہتی ہے اور ننگے بھوکے مزدور کی
زندگی میں کیا فرق ہے اور آپ مزدور کے دکھ درد کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا
نہیں ہے تو آئیے۔ آپ نے سیدھے سبق پڑھ کر ان کے افلاس کو تو اور بڑھا دیجئے
غریب ہمدردی کے مستحق ہیں ان کے خاتوں میں ان کا مادہ چھوڑ کر تو ادا نہ
یجئے۔ میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کو لعنت سمجھتا ہوں۔ مگر آپ اس ذہنیت
کو خود کیوں بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مزدور کو اس سے لڑا کر تماشا کیوں
دیکھتے ہیں؟

میں نظموں کا مخالف نہیں۔ میرا پورا دیوان "سیفینے" محض نظموں پر
مشتمل ہے۔ مگر اس میں نظم نما غزل کوئی نہیں یعنی اس میں اخلاقی نظمیں ہیں اتفاقی ہیں
سیاسی ہیں مگر عاشقانہ نہیں۔ کیونکہ عشق کے موضوع پر کہنے کو غزل کا میدان بہت
وسیع ہے۔ ورنہ وقتی نظموں کی عمر تو بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ جن حالات میں نظم لکھی
ان حالات کے بدلنے میں نظم بے کار ہو جاتی ہے۔ ہاں مستقل عنوانات کے تحت
لکھی ہوئی نظمیں ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔

میں لاریب غزل کا شاعر ہوں اور بحمداللہ میری غزلیں عُریانی سے پاک ہیں
میں نے غزل میں سب کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ مگر خلاف تہذیب مضامین یا
الفاظ سے دامن بچایا ہے۔ حالانکہ لفظ کوئی برا نہیں ہوتا۔ اس کا غلط یا بیہودہ
طریقہ پر استعمال ہی اسے برا بنا دیتا ہے۔

میں جدید خیالات کے اظہار کا شعر میں شدت سے حامی ہوں۔ بشرطیکہ وہ
کپکپاتی ہوئی سڑکیں اور بسورتی ہوئی ہوا ایسی قسم کے اہمل بے جوڑ واقعات کے
خلاف خیالات نہ ہوں اور میں ہی نہیں تمام ترقی یافتہ اور باقاعدہ شعراء حامی
کرتے ہیں اور ایسی حالت میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا ادب ترقی یافتہ نیا
ادب ہے کیونکہ ہم زمانے کے ساتھ چل رہے ہیں۔ جیسا کہ ہر دور میں ادیب و
شاعر چلا کرتے ہیں۔ ہاں ہمارے یہاں وسعت ہے ہم انسان پر طاری ہونے
والی تمام کیفیات کو اپنے اشعار میں سمیٹتے ہیں۔ صرف روٹی، عورت، ہجر و وصل ہی
کے دائرے میں ہماری شاعری نہیں گھومتی اور غیر یہ کیا بھی کہ ان ۳ عنوانات
پر ہی آپ اپنی دو ٹیاری رکھیں۔ مگر شعر تو قواعد اور اس کے اسلوب میں کہیں ما منہ
بے جوڑ ٹکڑوں کو ہم شعر ہی کب سمجھتے ہیں۔ شعر تو شعر وہ تو سلیقہ کی نثر بھی نہیں
ہوتی پھر ہم اس سے کیا متنفر یا خفا ہوں گے جو چیز قابل التفات ہی نہیں،
اس سے نفرت و رغبت کا کیا سوال ہے۔ آپ نے تو اپنے گھر میں اس کا نام نیا ادب
رکھ دیا ہے جیسے کوئی فقیر اپنے بیٹے کا نام سلطان رکھ لے کون ایسے شعر کو شعر کہے گا اور
کون اس فقیر کے لونڈے کو سلطان سمجھے گا۔ ہاں جو لوگ شعر کو اس کے محاسن کے
دائرے میں کہتے ہیں اور ہم شاعران کا احترام کرتے ہیں خواہ بہ لحاظ مضمون
وہ کیسے ہی ہوں۔

کرامت علی کرامت

دورِ جدید کے دو مقبول شاعر

(۱) خلیل الرحمن اعظمی

اگر کوئی پوچھے کہ فانی کے بعد کس کی شاعری میں کرب و درد کا پہلو عناصر ترکیبی کی حیثیت رکھتا ہے تو میں بلا تکلف خلیل الرحمن اعظمی کا نام لوں گا۔ ترقی پسند تحریک سے بھی خلیل الرحمن اعظمی کی وابستگی رہی ہے اور نئی شاعری سے بھی۔ اس طرح انہوں نے اجتماعی غم سے انفرادی غم تک کی ذہنی مسافت طے کی ہے۔ اس طویل ذہنی مسافت میں انہیں طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کی شاعری انہی گوناگوں پیچیدگیوں سے عبارت ہے۔

شعر میں شاعر کی شخصیت کا اظہار ایک پیچیدہ مسئلہ ہے لیکن جہاں تک خلیل الرحمن اعظمی کا تعلق ہے۔ ان سے میں ذاتی طور پر متعارف ہوں اور میں سمجھتا ہوں ان کی شاعری ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کی مکمل آئینہ دار ہے۔ وہی سادگی، وہی خلوص، وہی والہانہ پن جو ان کی شخصیت میں ہے ان کی شاعری میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چنانچہ میر کی طرح ان کی شاعری کو بھی "والہانہ شاعری" سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ والہانہ شاعری سے میری مراد ایک ایسی شاعری ہے جس میں سیدھے سادے الفاظ کے استعمال سے بہت ہی دھیمے لہجے میں پرخلوص جذبات کا شدت کے ساتھ اظہار کیا گیا ہو۔ اس طرح کی شاعری میں جذبات کے ابلاغ کے لئے تشبیہات و استعارات سے زیادہ الفاظ کے تلازم سے کام لیا جاتا ہے۔ والہانہ شاعری کے ذیل میں میر کے علاوہ مومن اور غالب کی شاعری کا کچھ حصہ بھی آتا ہے۔ ہندی شعرا میں میرا بائی، کبیر اور تلسی داس اور اڑیا شعراء میں سارلا داس اور گوپال کرشن بھی قابل ذکر ہیں۔ جہاں ہندوستان کی دیگر زبانوں میں والہانہ شاعری" شعراء کے مذہبی جذبات کی ترجمان رہی ہے وہیں اردو کی والہانہ شاعری ہمیشہ مذہبی جذبات سے ہٹ کر شاعر کی واردات قلبی کی آئینہ دار ثابت ہوئی ہے جن میں گویا کل کائنات کا درد و غم سمٹ آیا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

آج آئینہ جو دیکھا تو ہوا یہ محسوس
جانے یہ کون ہے؟ میں ایسا تھا؟ یہ میں تو نہیں

اعظمی کی شاعری کی تمام خصوصیات گویا اس ایک شعر میں سمٹ آئی ہے۔ اس شعر میں اشاریت بھی ہے اور سادگی بھی۔ شخصی جذبات بھی ہیں اور عصری تقاضے بھی۔ اپنی بے چہرگی کا احساس آج کے شاعر کو جس قدر شدید ہے زمانہ قدیم کے شعراء کو اس قدر کبھی نہیں تھی۔ پرویز شاہدی جیسے پرانے گرو کے شعراء بھی اس احساس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جہاں پرویز شاہدی اپنے کھوئے ہوئے چہرے، کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہیں خلیل الرحمن اعظمی اپنی شکل کا عکس دیکھ کر بھی اسے پہچاننے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں۔

"آئینہ" ان کے نزدیک بہت ہی لطیف اور معنی آفریں علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ موپاساں کی طرح دور جدید کا انسان AUTOSCOPIA میں مبتلا ہو کر ہر طرف اپنی بگڑی ہوئی شکل دیکھنے میں مصروف ہے جس کا انجام خودکشی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اعظمی کا مندرجہ بالا شعر صرف جدید انسان کی نفسیاتی بے یقینی کا آئینہ دار نہیں بلکہ اس شعر میں اس کے انجام کی پیشین گوئی بھی پنہاں ہے۔ "آئینہ" کے متعلق دو اور خوبصورت شعر سنئے ؎

میں نے دیکھا نہیں برسوں سے خود اپنی صورت
میرے آئینے سے روٹھا ہے سراپا میرا

لے مجھ کو سنبھال گردش وقت
ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں

وہ زیب النساء مخفی کی طرح:

از قضا آئینۂ چینی شکست
خوب شد اسباب خودبینی شکست

کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ٹوٹے ہوئے آئینے کو از سر نو جوڑنے کی آرزو رکھتے

جدید انسان کے ذہنی عدم توازن کا یہ نتیجہ ہے کہ اس نے اپنا نام بھی فراموش کر دیا ہے۔ اعظمی کے نزدیک نام علامت ہے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کا جو

اپنے آبا و اجداد سے ملتا ہے کیونکہ ہمیں جو نام ملتا ہے وہ بزرگوں کا ہی رکھا ہوا ہوتا ہے۔

یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا! پوچھ کر گردشِ دوراں سے بتا دو ہم کو

کون سی منزل میں ہوں اب کچھ بھی یاد آتا نہیں اپنی تنہائی سے اکثر پوچھتا ہوں اپنا نام

مجھ کو معلوم نہیں نام ہے اب کیا میرا ڈھونڈنے والے! مجھے چھوڑ دے پیچھا میرا

شاعر کے زخم خوردہ احساسات کا یہ عالم ہے کہ خون، اس کے شعر میں بار بار صورت بدل کر نئے نئے ذہنی پیکر کی حیثیت سے آیا ہے۔

روٹھی تو خوب روٹھی رہی ہم سے فصلِ گل آئی تو پھر نچوڑ کے دل کا لہو گئی!

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے مرے لہو کا سمندر! ذرا پکار مجھے!

ہوتی نہیں ہے یوں ہی ادا یہ نمازِ عشق یاں شرط ہے کہ اپنے لہو سے وضو کرو

پھر کوئی سے گیا ہے چراغوں کی روشنی تا صبح کج اپنے جگر کو لہو کرو

چند اور شعر سنئے جن میں شاعر کے لہجے کا انوکھا پن ہمیں اپنی طرف بیک نظر متوجہ کر لیتا ہے۔

تو مجھے چاہے نہ چاہے یہ ترے بس میں تو ہے اور میں تجھ کو نہ چاہوں یہ مرے بس میں نہیں

میں تیرے دھوپ میں کھڑا ہوں سایہ سایہ پکارتا ہوں

ہم جانتے ہیں کیا ہیں یہ مردانِ دُنیا! یوں دیکھنے میں وہ بھی لگتے ہیں آدمی سے

خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظموں میں بھی والہانہ پن کے ساتھ وہی ہلکی ہلکی اشاریت موجود ہے ان کی نظموں میں سے "نظموں میں رفتگاں" "سلسلے سوالوں کے" "دیوار" "شام، ..ن یاس" "نیا عہد نامہ" وغیرہ بہت ہی کامیاب نظمیں ہیں جو اپنی جامعیت کے علاوہ ..یات کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ موجودہ تہذیب کو شاعر جس وقت ایک المناک ...ور کرتا ہے جس کا

"ہر ایک فرد
...م سہم سے چپ چاپ ہے
اور ہر شخص خود اپنی آواز سننے میں مصروف ہے"

تو ہمارے ذہن میں جدید انسان کی تنہائی کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیات ذیل کے بند کے مطالعہ سے بھی ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔

(۱) میں کہ خود اپنی ہی آواز کے شعلوں کا اسیر
میں کہ خود اپنی ہی زنجیر کا زندانی ہوں
کون سمجھے گا جہاں میں ترے زخموں کا حساب

(۲) وہ مرے پھول، وہ شستہ ہوئے سائے پھرنے
مرے غم خانے سے رخصت ہوئے اک اک کر کے
پھر رہی ہیں وہی میری فسردہ راتیں

(۳) دروازے اداس اور سہم سہما
دہلیز کو چپ سی لگ گئی ہے
کیوں دور سے ان کے قہقہوں کی
آتی نہیں آج کوئی آواز
اب کوئی نہ انگلیوں کی جھنکار
نے قدموں کی کوئی راگنی ہے

اعظمی کے کلام میں دیگر جدید شعراء کے برعکس غیر منطقی تنظیم کا اہتمام نظر نہیں آتا بلکہ ایک طرح کا والہانہ پن ہوتا ہے جو ہمارے ذہن میں دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی جڑیں کلاسیکیت کی سرزمین میں بہت ہی گہرائی تک پیوست ہیں لیکن اس کی شاخیں جدیدیت کی کھلی فضا میں سانسیں لے رہی ہیں۔ ان کی شاعری دورِ جدید کی حس کی نمائندہ ضرور ہے لیکن دورِ جدید کی شاعری کی نمائندہ نہیں کیونکہ یہ بذاتِ خود ایک عہد، ایک زمانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غرض کہ خلیل الرحمٰن اعظمی شاعری کی اس وادی میں محوِ خرام ہیں جہاں وہ تنہا نظر آتے ہیں اور دور دور تک بھی کوئی ان کا ہم سفر دکھائی نہیں دیتا

(۲) شہریار

بقول ورڈزورتھ، انسان کا ذہن تند یا تیز ذہنی ردعمل کے بغیر بھی متحرک ہو سکتا ہے۔ شہریار کی شاعری انہیں ذہنی ردعمل سے مرکب ہے جو تند یا تیز نہ ہوتے ہوئے بھی قارئین کے ذہن میں دیرپا تاثرات چھوڑ جاتے ہیں شہریار اپنی نازک واردات قلبی کے اظہار کے لئے مختصر نظم گوئی کی ٹیکنیک کا سہارا لیتے ہیں۔ اس وقت بین الاقوامی ادب میں مختصر نظموں پر تجربے ہو رہے ہیں اور ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں بھی۔ لیکن مختصر نظم گوئی کے فن کو منفرد احساسات و جذبات کی آنچ دے کر شہریار نے جس حد تک نکھارا ہے وہ اردو کے کسی دوسرے جدید شاعر کے یہاں مجھے نظر نہیں آئی۔ ان کی شاعری اس معنی میں جدید نہیں ہے کہ یہ دورِ جدید کے

انسان کے ذہنی انتشار کی نمائندگی کرتی ہے بلکہ اس معنی میں جدید ہے کہ زندگی کے بکھرے ہوئے مابعد الطبیعی تجربات کو اپنے فن کی گرفت میں لا کر شاعر نے منضبط اور منظم طریقے پر اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ہمیں یہ تجربات بالکل نادر اشیا معلوم ہوتے ہیں ایک معنی میں مختصر نظم کا فن اردو شاعری کے لئے نیا نہیں ہے۔ کیونکہ اردو کی غزل کا ہر شعر ایک مختصر نظم کی حیثیت رکھتا ہے لیکن شہریار کی مختصر نظموں کی فضا صنف غزل کی رومانی فضا سے مختلف ہے شہریار کی ایک مختصر نظم "نیا دن نیا عذاب" ملاحظہ فرمائیے۔

سرد شاخوں پہ اوس کے قطرے
ہیں ابھی محوِ خواب اور سورج
رتھ پہ اپنے سوار آتا ہے۔

شہریار اگر چاہتے تو دیگر نئے شاعروں کی طرح تین مصرعوں کی اس نظم کو غزل کے دو مصرعوں میں پیش کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنی غزلوں کو ہمیشہ اس طرح کی باتوں سے منزہ رکھا۔ ان کی غزلوں میں پیکریت (IMAGISM) کا پرتو واضح طور پر نظر نہیں آتا۔ حالانکہ یہی پیکریت ان کی مختصر نظموں کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں کے جدید لب و لہجہ کے باوجود ان کا رشتہ روایت سے بہت استوار رکھا ہے کیونکہ وہ غزل کو غزل کی شکل میں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کی شانِ تغزل کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

ہمیں تو اپنے دل کی دھڑکنوں پہ بھی یقیں نہیں
خوشا وہ لوگ جن کو دوسروں پہ اعتبار ہے

یا تیرے علاوہ بھی کسی شے کی طلب ہے
یا اپنی محبت پہ بھروسا نہیں ہم کو

جو چند لمحے وقت نے دیئے ہیں ان کا کیا کریں
درِ حبیب وا نہیں، درِ حیات بند ہے

ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تمنا نہ کرو سائے پھر سائے ہیں، کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

جانا ہے تجھکو تیرے تغافل کے باوجود اے زندگی! تو یاد کرے گی کبھی ہمیں

دیگر جدید شعراء کے برعکس شہریار کی شاعری دورِ جدید کی مایوسی بے یقینی اور بے بسی کی نمائندگی نہیں کرتی (البتہ ان عناصر کا ہلکا ہلکا پرتو کہیں کہیں ضرور نظر آتا ہے) لیکن ان کی اصل شاعرانہ خوبی ان کے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعی لب و لہجہ کی ہے۔ ان کی ایک خوبصورت نظم "التجا" ملاحظہ فرمائیے ؎

کہاں ہو، کہاں ہو،
نئی صبح کی مہرباں نرم کرنو،
مرا جسم مجھ سے بغاوت پر آمادہ ہے
کانپتی ہے مری روح
آؤ بچاؤ
مجھے شب کے زنداں سے باہر نکالو
میں دن کے سمندر کی گہرائیاں ناپنا چاہتا ہوں

روح سے جسم کی بغاوت مادی تہذیب کی پیداوار ہے۔ کیونکہ دورِ جدید کا انسان اپنی روح کی ہستی سے منکر ہو چکا ہے۔ موجودہ تہذیب کو شاعر نے بجا طور پر "شب کے زنداں" سے تعبیر کیا ہے۔ شاعر کو ایسی نئی صبح کی تلاش ہے جس میں روحانی بیداری ہو اور جس میں روح اور جسم کے مابین تفرقہ نہ ہو۔ شاعر کے ذہن میں ایک ایسی صبح کا تصور ہے جس میں سمندر کی سی گہرائیاں پائی جاتی ہیں۔ "سمندر" علامت ہے انسان کی داخلی کائنات کے زیر و بم، مد و جزر، تلاطم خیزی اور وسعت و گہرائی کی جو مناسب طریقے پر یہاں مستعمل ہوئی ہے۔

جدید انسان آئینے میں اپنی ظاہری شبیہہ دیکھ کر بہت خوش ہے لیکن اس کے اندر کا جو آئینہ ہے وہ صیقل سے محروم ہے اور اس میں ہر حقیقت اُلٹے روپ میں نظر آتی ہے۔ اس اندر کے آئینے سے متعلق شاعر کہتا ہے کہ انسان اگر اسے بھولے سے بھی دیکھ لے تو ظاہری آئینہ دیکھ کے اپنی خوش پوش شکل پر وہ کبھی خوش ہونے نہ پائے (نظم "آئینہ دیکھ کے")

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، شاعر اپنی نازک قسم کی ذہنی واردات سے موضوعِ سخن کی تلاش کرتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری بھی جدید ذہن کی پیداوار ہے اور شہریار کی شاعری بھی۔ لیکن دونوں کے اسلوب میں فرق ہے۔ اعظمی سادگی بندش کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور شہریار پیکریت کو۔ جس وقت ہم شہریار کی نظم "آشوبِ آگہی" میں پڑھتے ہیں:

اک گھنیرے شجر کے سائے میں
دو گھڑی بیٹھ کر یہ بھول گئے
قرض ہائے جنوں چکانے ہیں

ہمارے ذہن میں اعظمی کے اس شعر سے

دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں سایہ سایہ پکارتا ہوں

کی طرح جذباتی شدت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ جذبات کی ایک خاص قسم کی تربیت نظر آتی ہے جس میں غور و فکر کو بھی کافی دخل ہے

بیسویں صدی میں زمان و مکان کے باہمی تعلقات کے انکشافات کے بعد جدید شاعر کو ہمیشہ 'وقت' کے وجود کا احساس رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ وقت کے عنصر کو طرح طرح کے ذہنی پیکر کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے لیکن اسے غالب کی شاعرانہ ذکاوت ہی کہئے کہ انہوں نے اُردو میں پہلی بار "خود" کو "وقت" کے ساتھ مقابلہ کیا ع (میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں) اس لطیف ذہنی پیکر کو شاعر نے اپنی نظم "وقت" میں پھر سے استعمال کیا ہے لیکن ایک نئے پیرائے میں مثلاً۔

"نقش ہیں ہم پیروں کے اس کے
جب ہی پیچھے چھوڑ گیا ہے
اپنی راہ چلا جاتا ہے
ہم اور تم احساس کے پتلے
سوچ رہے ہیں
شاید دیکھے مڑ کے ادھر بھی
ہم سا وہ نادان نہیں ہے
وہ کوئی انسان نہیں ہے"

غالب کہنا چاہتے ہیں کہ 'انسان'، کوئی وقت نہیں ہے کہ پھر آبھی نہ سکے اور شہریار کہتے ہیں کہ 'وقت'، کوئی انسان نہیں ہے کہ مڑ کے دیکھے۔ دونوں کا ماخذ لافانی تجربہ ہے کہ گیا وقت کبھی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ غالب نے "انسان" کا 'وقت' کے ساتھ منفی موازنہ (NEGATIVE COMPARISON) کیا تھا لیکن شہریار نے 'وقت'، کا 'انسان'، کے ساتھ منفی موازنہ انجام دیا ہے۔ دونوں میں تقابل کی تکنیک مشترک تو ہے۔

شہریار کی کامیاب پیکری نظموں میں "نیا کھیل" "پرچھائیاں" "مداوا" "خود فریبی" وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نظم 'نیا کھیل' میں شاعر اہلِ شہر کے سامنے ایک ایسے کھیل کا ذکر کر رہا ہے جس میں

آوازوں کے ہجوم، صداؤں کے ماہتاب
سناٹوں کی صلیب پہ لٹکائے جائیں گے

"آوازوں کے ہجوم" اور صداؤں کے ماہتاب" کی ترکیب سے ہمارے ذہن میں جو لطیف ذہنی پیکر اُبھرتے ہیں وہ "سناٹوں کی صلیب" سے ٹکرا کر کچھ ایسی شکل بدل لیتے ہیں کہ ہمارا ذہن دورِ جدید کی ولدوز تنہائی کی جانب خود بخود مبذول ہوتا جاتا ہے۔ "آوازوں کے ہجوم" اور "صداؤں کے ماہتاب" کی تراکیب میں شاعر نے آواز اور روشنی ان دونوں طرح کی کیفیات کے باہمی امتزاج سے ہمارے ذہن کو نئی قسم کے حسیاتی تجربات سے دوچار کیا ہے۔ اس طرح کے تجربات کو جدید تنقید میں امتزاجیت (SYNESTHESIA) کہا جاتا ہے۔

نظم "پرچھائیاں" میں تنہائیوں کے ساتھ زخمی روحوں اور پیاسے جسموں کے "تنازعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

رات کے بے کنار صحرا میں
اپنی تنہائیوں سے لڑتی ہوئی
زخمی روحوں کی پیاسے جسموں کی
ساری پرچھائیاں شہید ہوئیں
یہ خبر تازہ روز نامے کے
کس ورق پر چھپی تھی یاد نہیں

کوئی دوسرا شاعر پرچھائیوں کے شہید ہونے پر ہی اکتفا کر سکتا تھا لیکن شہریار نے "یہ خبر تازہ روزنامہ کے کس ورق پر چھپی تھی یاد نہیں" کا اضافہ کر کے اپنے منفرد اسلوب کا ثبوت دیا ہے۔ اس بند سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حالانکہ جدید انسان جسمانی اور روحانی حادثوں کا شکار ہے لیکن وہ روزنامہ کی خبر پڑھنے کی طرح ذہنی طور پر ان حادثوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا یا ان سے کوئی گہرا اثر قبول نہیں کرتا۔ یہی اس دور کا سب سے بڑا بحران ہے۔

شہریار نے جن ذہنی پیکروں کی تخلیق کی ہے ان میں تازگی، توانائی اور شدت سب کچھ موجود ہے۔ مثال کے طور پر چند نادر ذہنی پیکر کی مثالیں درج ذیل ہیں جن سے شاعر کی طبیعت کے جدت پسند تخلیقی رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔

"خواب کا تعبیر کے شکستہ دل کو جوڑنا" "وحشت کا پر کھولنا" "بیتے دنوں کے سسکتے سہاروں کا اُدھڑتی راہ کے سرد سینے کو سہلانا" "دشتِ تنہائی میں یادوں کے غبار کا ہونا" "دریچے کی شکستہ انگلیوں کا گونگی بجلیوں کا کو چھونا" "خلا میں خواب کا ساغر اچھالنا" "سورج کی شعاعوں کی پکار کا تیر کی طرح چبھنا" "آرزؤں کے مکان کا نیند کے سیلاب میں بہہ جانا" "تنہائی کی دھوپ میں جسموں کا جھلسانا" "وقت کے صحرا میں ٹھوکریں کھانا" "آوازوں کے ہجوم اور صداؤں کے ماہتاب کا سناٹوں کی صلیب پہ لٹکائے جانا" وغیرہ وغیرہ۔

اُڑیا: پروفیسر درگا چرن کنور
ترجمہ: اطہر عزیز

عصرِ حاضر کا جدید یونانی شاعر جارج سیفرس

دورِ حاضر کے ایک مشہور یونانی شاعر جارج سیفرس کو ۱۹۶۳ء میں نوبل پرائز پانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۳ء تک نوبل پرائز پانے والے مختلف فنکاروں میں سیفرس پہلا یونانی شاعر ہے۔ سویڈش اکیڈیمی کے اس حسنِ انتخاب پر ہر طرف استعجاب کی لہر دوڑ گئی تھی کیونکہ عوام اس سے قبل نہ سیفرس کے نام سے واقف تھے اور نہ اس کی شاعری سے۔ یہی وجہ تھی کہ اس اعزاز کے لائق جن مایۂ ناز ادبی ہستیوں کا ذکر سننے میں آتا تھا ان میں ایزرا پاؤنڈ، رابرٹ گریبس، گراہم گرین، سامویل بیکٹ، لارنس ڈوریل، سابھرے اور پبلو نیرودا جیسے مشاہیر کے نام خاص طور پر نمایاں تھے۔ ان تمام روشن و آبدار موتیوں کے درمیان اکیڈیمی کی نگاہِ انتخاب اگر پڑی تو ایک ذرۂ یونان پر۔ اکیڈیمی نے سیفرس کی شاعری کو سراہنے کے ساتھ ساتھ یونان کی قدیم تہذیب و روایات پر بھی جس حسنِ عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ اکیڈیمی کی جانب سے شائع شدہ رپورٹ میں درج ہے۔

"یونان کی ملکۂ تہذیب کی خدمت میں ایک حسین سا نذرانۂ عقیدت
جس کے لئے نہ جانے کتنی مدتوں تک انتظار کرنا پڑا۔"

سیفرس کی پیدائش ۱۹۰۰ء میں یونان کے علاقہ ادرانیہ میں واقع جزیرۂ سمرن میں ہوئی۔ فراغت تعلیم کے بعد اس نے اپنی عمر کا ایک عزیز حصہ قومی خدمات میں گزارا۔ حالیہ یونان کے مختلف سیاسی اور سماجی مسئلوں کے ساتھ اس کے ذہنی و جسمانی ارتباط اور بیرونی ممالک کے مشہور ادبا اور شعراء کے ساتھ ملاقات و تبادلۂ خیالات کے سبب اس کی فکر و نظر میں کافی وسعت و گہرائی آگئی ہے۔ بلکہ یوں کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ غیر ملکی سیر و سیاحت ہی اس کی ذہنی و فکری نشو و نما کی ضامن ہے۔ ان مختلف دوروں سے حاصل شدہ گوناگوں تجربات نے اسے اہم سے اہم اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں کافی مدد پہنچائی اور اس کے ذہن کو ایک تر و تازگی بخشی جس کا اندازہ اس کی شاعری کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

سیفرس کی نظمیں تعداد میں بہت کم ہیں۔ اکثر نظموں کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ فرانس کے نوبل پرائز یافتہ مشہور شاعر سینٹ جان پآرس کی طرح سیفرس کی نظمیں یوں تو گنتی کی ہیں مگر اپنی انفرادیت و ندرت کی بنا پر حلقۂ علم و ادب میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

سیفرس کی اکثر نظموں میں زمانۂ قدیم کے یونان کی شہرت و عظمت پر اظہار فخر، حالیہ یونان کے سماجی و معاشی تنزل پر اظہار افسوس اور مستقبل کے یونان کی آسودگی و خوشحالی کے دلکش خواب بکثرت نظر آتے ہیں۔ یونان کی تاریخ میں نشیب و فراز کی داستان بہت طویل ہے اور یہی تاریخی داستان، گویا سیفرس کی شاعری کا محور ہے۔

یونان کی پرانی تہذیب کی بے مثال رفعت و عظمت اور پھر تاریخ یورپ میں اس کی شکست کا ایک ہلکا سا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

جہاں مغرب کے شبستان ظلمت میں شمع تہذیب روشن کرنے والا سب سے پہلا شہر یونان ہے۔ مگر افسوس ہومر، ہیڈ، افلاطون، ارسطو، ایسیلس اور سوفوقلس کے وطن کی یہی شمع درخشاں بربادی و گمنامی کے غار میں پھکیا ل بیتی رہ گئی۔ شہر یونان کے سکندر اعظم نے جس عظیم ریاست کی بنیاد ڈالی تھی وہ رفتہ رفتہ مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر حکومت روم کے قبضہ میں چلی گئی۔ ریاست کے مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے یونانیوں کی زبان و ثقافت نے الگ الگ رنگ اور روپ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ سیاسی تنزل کے ساتھ ساتھ چوتھی اور پانچویں صدی کے دوران پاگانزم (PAGANISM) پر قائم شدہ یونان کی قدیم روایات و تہذیب کو ایک اور زبردست تغیر کا سامنا کرنا پڑا۔ عیسائی مذہب کی توسیع کے سبب پاگان مذہب کو ایک جدید اور بالکل انوکھے مذہب کے دھارے پر بہنا پڑا جس کی وجہ سے یونانیوں کو ایک نئی رسم و رواج کی تقلید پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر صدیوں پرانی تہذیب و معاشرت بھلا اتنے جلد کہاں مٹ سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطنیہ جدید یونانی تہذیب کا مرکز اصلی سمجھا جانے لگا۔ یورپ کے تہذیبی

قارمیں قسطنطیہ کی تہذیب و تمدن کا اثر کچھ کم نہیں ہے پھر بھی ستم رسیدہ قوم یونان اس کے احسانات بہت زیادہ ہیں۔

۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ آگے چل کر کریٹ کے ساتھ بھی دیگر یونانی علاقے ان کے قبضے میں آ نے گئے۔ یونانی اقوام کے لئے یہ ایک بائی منحوس زمانہ تھا۔ ماہ ابر آلود کی طرح یونانی زبان و ثقافت تاریکی کی اتھاہ رائیوں میں روپوش ہو کر رہ گئی، افلاس، غربت، جہالت، رنج اور غم کے بیکراں ندر میں ہچکولے کھاتی ہوئی قوم یونان یورپ کے مختلف مہذب خطوں میں ذلت و بارگی کی زندگی بسر کرنے لگی۔

آخر انتشار کے بادل ایک ایک کر کے چھٹنے لگے اور پھر شدید مشکلات کا امنا کرنے کے بعد ۱۹۱۲ء میں یونان کو آزادی حاصل ہوئی۔ مگر ابھی آزادی کی تنہائی نے بھی منہ پائی تھی کہ ۱۹۲۲ء میں ترکوں نے دوبارہ حملہ کر کے یونان کا علاقہ اروانیہ تیار کر لیا جس کے سبب سیفرس کو اپنی جائے پیدائش سمرنا سے ہاتھ دھونا پڑا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمن نے بھی یونان پر قبضہ کر کے بے انتہا ظلم ڈھائے۔

یہ بات پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے کہ سیفرس کی شاعری کا پس منظر ہمیشہ قدیم یونان کا سیاسی انتشار و معاشی تنزل رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی شاعری کا مخصوص پہلو یونان کی داستانِ تاریخ ہے۔ ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس کی گہرائی تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ بقول ایک تبصرہ نگار "سیفرس کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت زمانہ قدیم کے یونان کی روشن تصویر ایک عکس بنتے ہوئے سمندر میں تیرتی ہوئی نظر آتی ہے"۔ سویڈش اکیڈیمی نے بھی اس کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے "یونانی تہذیب سے وابستہ غنائی تخلیق" کا لقب عطا کیا ہے۔ یونان کے اس مایۂ ناز سپوت کی اکثر تحریروں میں اس کے وطن کی اعلیٰ شعری روایات اور لوک کہانیوں سے وابستہ حسین و جمیل تمثیلات کے جلوے ملتے ہیں۔

سیفرس کی اکثر نظمیں پُر آشوب یونان کے ان گنت مسائل سے وابستہ ہیں مظالم کے شکار یونانی بچوں کی داستانِ درد و الم اس کے حساس دل کو جھنجھوڑ دیتی ہے اور وہ ایک بے چارگی و بے بسی کے عالم میں بے ساختہ پکار نے لگتا ہے۔

ان کی آنکھیں سفید اور اداس
بازوئیں بید کی طرح پتلی
اے خدا! میں نے کب یہ چاہا تھا؟
شہد کی مکھیوں کا لے کر رنگ
خوبصورت سی تتلیوں کی طرح
سبز پربت کے دونوں ساحل پر
دور تک دوڑتی قطاروں میں
میں نے دیکھا ہے ہنستے بچوں کو
اور سنا ہے مچلتے نغموں کو
اے خدا! میں نے کب یہ چاہا تھا؟
جانے کیوں آج ان کے سب نغمے
دفن ہوتے ہیں آکے ہونٹوں پر (POST SCRIPT SEPT. 1941)

ترکوں کے مسلسل حملوں کے بعد اپنا وطن چھن جانے کی وجہ سے شاعر مجسمہ حیرت و یاس بن گیا۔ وہ گھنٹوں اپنے جزیرہ کی یاد میں بےقرار رہتا ہے۔ اس کی اندرونی سسکیوں کی آواز ہمیں اس کی اکثر نظموں میں سنائی دیتی ہے۔

ٹوٹی پھوٹی سی کشتیوں میں سوار
ایک منزل سے دوسری منزل
یوں ہی بے چارگی کے عالم میں
جانے یہ اپنی آتمائیں کیا
ڈھونڈتی رہتی ہیں خلاؤں میں؟
مضمحل اور مضطرب رو حیں
سنگریزے ہیں گویا راہوں کے
جن کو پائین کے درختوں کا
دو گھڑی کے لئے خنک سایہ
ملا دشوار ہو گیا ہے اب
یہ سمندر کی بے کراں وسعت
کوئی منزل نہ کوئی سنگ نشاں
کوئی خواہش نہ کوئی جذبۂ شوق
یہ وطن اب نہیں رہا اپنا!
وہ جزیرے کہ جن کو ہر لمحہ
ڈھونڈتی پھرتی تھی اپنی نظر
کس قدر دل نشیں و دلکش تھے
کھو گئے ہیں نہ جانے آج کہاں (MYTHISTOREMA-XII)

سیفرس کی نظموں میں قدیم یونان کے شکستہ مندروں، پتھروں کی ٹوٹی پھوٹی مورتوں، تاریخی حادثات ندی، جنگل، پہاڑ وغیرہ بےجان اشیاء کا بیان کچھ

اس لطیف پیرایہ میں کیا گیا ہے کہ یہ اشیاء ہمیں ذی روح معلوم ہونے لگتی ہیں۔ دورِ حاضر کی بدنظمیوں، جنگ کی شعلہ افشانیوں اور یونان کے مستقبل کی بھیانک تاریکیوں نے اس کی قوتِ احساس و ادراک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کا نہ صرف خود پر سے بلکہ پورے نوعِ انسان پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ پھر بھی یونان کی قدیم یادگاریں، شکستہ مورتوں کی بے باک مسکراہٹیں اس کے قلبِ پریشان کے لئے کچھ حد تک تسکین کا باعث بن گئی ہیں اور اس کے بھٹکے ہوئے خیالات کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے۔ جیسے اسے کھوئی ہوئی تمنائیں اور آرزوئیں واپس مل گئی ہیں۔

اک مقدس سفر میں چلتے ہوئے
کچھ شکستہ سنم جو آئے نظر
شدتِ غم سے روحیں چیخ اُٹھیں
کہہ اُٹھیں بے بسی کے عالم میں
"آہ! یہ موت چپکے چپکے سے
جانے کن راستوں سے آتی ہے!
جس کا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا
جب کھڑے ہوتے ہی کے عالم میں
چھوڑ جاتی ہیں روحیں جسموں کو
اور جب جسم بنتے ہیں پتھر
اُس گھڑی اپنے آباد اجداد
پھاند کر موت کی فصیلوں کو
ہر طرف دیکھتے ہیں حیرت سے
دیکھتے دیکھتے یونہی چپ چاپ
زیرِ لب مسکرانے لگتے ہیں (MYTHISTOREMA XXI)

سیفرس کی اکثر نظموں میں یونان کی موجودہ بدحالی و بدنظمی سے زیادہ اس کی گذشتہ شان و شوکت کی پُر زور داستان نظر آتی ہے۔ سیفرس کے علاوہ کوسٹیس، پالامس، انجیلس اور سیکیلینس وغیرہ دیگر جدید یونانی شعراء کا کلام بھی قومی احساسات و جذبات سے عاری نہیں۔ ان کی شاعری بھی اعلیٰ و ارفع خیالات و تجربات سے معمور ہیں مگر بحیثیت ایک جدت پسند شاعر ہونے کے، سیفرس نے یونان کے ماضی مستقبل اور حال کا نقشہ جس انوکھے اور نادر انداز میں کھینچا ہے وہ ہر باذوق قاری کے دل پر اثر کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہی اس کی شاعری کا کمال ہے۔

اس کے گہرے قومی اور وطنی جذبات سے بھرپور اشعار، قدیم لوک کہانیوں سے ماخوذ حسین و جمیل استعارات اور دورِ جدید کے گوناگوں مسائل سے اس کی جذباتی وابستگی کا اندازہ کرتے ہوئے اسے بجا طور پر آئرلینڈ کے قومی شاعر ایٹس کا ہم مشرب تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس کی شاعری میں بودلیئر اور ٹی۔ ایس ایلیٹ کے اثرات کا گمان ضرور گذرتا ہے لیکن وہ جدید یونان کے قومی اور وطنی شاعر کی حیثیت سے امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے متعلق انگریزی کے مشہور شاعر ریکس وارنر نے کہا ہے کہ "یوں تو سیفرس یورپ کا ایک ممتاز شاعر ہے لیکن اسے بنیادی طور پر ایک یونانی شاعر کہنا چاہئے۔ اسے یونان کی اس عظیم روایات کا عرفان حاصل ہے جس سے سارے یورپ کی روایات کی تشکیل ہوئی"

بقیہ اڑیا ادب میں گنگا دھر کا مقام

میں ہوا۔ جہاں اس کے والد بو چیتن ہر دن رات کپڑے بننے اور سوت کاتنے میں مصروف تھے۔ دو مختلف ماحول میں دو عظیم شخصیتیں پروان چڑھیں ایک رام موہن رائے کے بنائے ہوئے مغربی نظریے اور مشرقی فلسفہ کی حادث پر برہما سماج کو اپنایا اور دوسرے نے زمانۂ قدیم کی ہندوستانی تہذیب کا سہارا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیگور نے سورگ نرکی اُردشی کو بلا کر "اوشا" کا روپ دیا اور گنگا دھر "تپسونی" میں سیتا کی دیدی پر پھانجلی دیکر خوش ہو گیا۔ دونوں کا نصب العین ایک ہی ہے۔ دونوں اپنی خودی کو خدا میں جذب کر دینا کمال فن سمجھتے ہیں۔ دونوں عہدِ ماضی کے ہندوستان کو مہابھارت اور رامائن کے لافانی اشلوکوں اور خوبصورت گیتوں کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ گنگا دھر ایسی جگہ اور ایسے ماحول میں پیدا ہوا جہاں وہ اُبھر نہ سکا۔ اس کے برعکس ٹیگور کی فضا سازگار تھی، ماحول اس کا اپنا بنایا ہوا تھا۔ اس کے ہمنوا لاکھوں کی تعداد میں تھے اور ترقی تہذیب اس کے قدم چومنے کے لئے بیقرار ہو رہے تھے۔ کاش کہ گنگا دھر نے بنگال میں جنم لیا ہوتا۔

شیخ محمود پالیسری

اُڑیا ادب میں گنگا دھر کا مقام

گنگا دھر مہر اُڑیا ادب کا ایک بدنصیب شاعر ہے۔ جو بقیہ حیات بھوک اور افلاس سے جد وجہد کرتا رہا۔ اس کی پیدائش ۱۸۶۲ء کو برپالی، جیسے ایک گمنام گاؤں میں ہوئی جہاں شہر کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ گنگا دھر بچپن سے اپنا آبائی پیشہ سوتا کاتنے اور کپڑے بننے میں مصروف رہا اور بعد میں اسے زمیندار کے ہاں ۸ روپئے ماہوار کی نوکری مل گئی۔ وہ اپنے ہم عصر شعراء راد ھا ناتھ، مدھوسدن اور نند کشور کی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ برپالی جولا ہوں کا گاؤں ہے جہاں دن رات سوت کاتنے اور کپڑے بننے کی کھٹ کھٹ اور گھر گھر کی آواز گونجتی رہتی ہے۔ اسی فضا اور ماحول میں گنگا دھر تپسونی اور پرانو بو بلری، جیسی لافانی نظموں کی تخلیق میں کامیاب ہوا ہے۔

اُڑیا ادب کے جدید شعروں میں جنہوں نے مہابھارتی سماج یعنی قدیم تہذیب و تمدن پر اپنی تخلیق کی ہے ان میں گنگا دھر کا مقام بہت بلند ہے۔ مدھوسدن کی نظم "ہمپلے اور دوے اُتسو" وں میں ویدک سماج کے کچھ حصے ملتے ہیں لیکن گنگا دھر کے مہابھارتی سماج کی تصویروں میں بڑی زندگی پائی جاتی ہے۔ مہابھارت اور رامائن پلاٹ گنگا دھر کی شاعری کی بنیاد ہونے کی وجہ سے ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ گنگا دھر سماج کی تصویریں مہابھارتی ہیں۔

گنگا دھر کی پیدائش ایک ایسے زمانے میں ہوئی جبکہ پُرانی ادبی قدروں کی نئی ادبی قدریں جنم لے رہی تھیں۔ وہ مختلف ادبی قدروں کے درمیان ایک قدم پر پاتھا۔ گنگا دھر گرچہ قدیم ادب سے مواد فراہم کرتا ہے پھر بھی اسے ایک رنگ معاصر تلے اور اسے جدت طرازی کا جامہ پہنا کر عوام کے سامنے لاتے ہیں کردار نگاری کو ایپک کا لازمی جزو مانا گیا ہے۔ پلاٹ کی روانی اسی کردار نگاری پر ہے۔ آیئے گنگا دھر کے مشہور کردار، رام چندر پر ہم نظر ڈالیں۔

رام چندر کا کردار مختلف اشخاص کے زاویۂ نظر سے مختلف انداز میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ والمیکی کا رام چندر بذات خود برہما ہے۔ جو رام چندر کو نہیں پہچانتا برہم کو نہیں پہچانتا۔ تلسی داس کا رام چندر پاک، دانا مجسمۂ روحانیت ہے۔ دسرتھ کا رام چندر مذہبی فرض کی ادائیگی کے لئے عظیم بہادر ہے۔

سیتا کے لئے دیا اور دھرم کا پیکر اور لکشمی کے لئے آدرش بھائی۔ اسی طرح مختلف شعراء نے مختلف انداز سے رام چندر کی شخصیت کو اجاگر کیا ہے۔ مگر گنگا دھر کا کہنا رام چندر ایک فرماں بردار فرزند، ایک ہمدرد بھائی اور فرض شناس حکمراں ہے۔ وہ کوئی دیوتا نہیں ہے۔ وہ اسی دنیا میں بسنے والے کروڑوں انسان کی طرح گوشت پوست کا ایک انسان ہے جو راجہ کے روپ میں اپنی رعایا کی خوشی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جان سے عزیز سیتا کو بن باس کے لئے بھیج دیتا ہے۔ گنگا دھر کا اپنا ایک خاص اسلوب اور لب و لہجہ ہے۔ جو نظم تپسونی میں بدرجہ اتم مترشح ہے۔ مواد رامائن سے لینے کے باوجود پوری نظم میں انفرادیت زائل نہیں ہو پاتی۔

اسی طرح سیتا کے کردار کو مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

I "She knew the highest human happiness and was not blinded by happiness. She knew the deepest & bitterest sorrows liked serene amidst her sorrow such was Sita, queen of Ajodhya crown of loveiled in sorrow & peerless amongst women"

(Sister Nivedita)

2. Ideal of Indian woman hood"

(Vivekananda)

اپنشد میں سیتا کو فطرت کا عظیم شاہکار کہا گیا ہے۔ مگر گنگا دھر کی سیتا سی

پتی ورتا اور آریائی تہذیب و تمدن کی جیتی جاگتی مورتی ہے۔ شاعر نے آیک درش
پتنی کے لحاظ سے سیتا کا مقام بہت ہی بلند دکھایا ہے۔ اڑیا ادب کی تاریخ میں
ڈاکٹر مان سنگھ نے گنگا دھر کی سیتا کو ایک انوکھے روپ میں دیکھنے کی کوشش
کی ہے۔

" Nothing in the whole
of oriya literature can
surpass the beauty,
charms grandeur of
Sita as she comes
to life in Meher's fa-
mous Kavya Tapaswini "

گنگا دھر کی نظم "پرانا بڑی" کا مقام بھی بہت بلند ہے۔ "پرانا بڑی" کا مواد
حالانکہ کوی کالیداس کے "آدگیان شکنتلم" سے لیا گیا ہے پھر بھی گنگا دھر اپنے
خاص اسلوب میں اسے ڈھالنے میں کامیاب ثابت ہوا ہے۔ جنگل میں جنم لے کر
چرندوں پرندوں کے درمیان پل کر جوان ہونے کی وجہ سے اس کا نام شکنتلا رکھ
گیا ہے۔ وہ ایک جوگی کے آشرم میں ادھ کھلے اچھے پھول کی طرح پاک ہے۔
اسے جنگلی پھول، پیڑ اور پودے اور جنگلی جانوروں سے کافی محبت ہے۔ شکنتلا کے
کردار کو شاعر نے محبت کی دیوی اور خلوص کی مورتی بنا کر پیش کیا ہے۔

گنگا دھر نے کشمکش کی زندگی گذاری ہے۔ جینے کے لئے جدوجہد کی ہے۔
اسی لئے نظم "کیچک بودھا" میں "کیچک"، "سیرندری" اور نظم "رند ومتی" میں
"آچار" اور "رندومتی" کے کردار اسی کشمکش سے دوچار، امید و یاس کی آغوش
سے ہمکنار ہو کر عظیم بن گئے ہیں۔ شاعر ان کرداروں کو کٹھ پتلی کی طرح اپنی خواہش
کے مطابق نچواتا نہیں ہے۔ انہیں آزادی حاصل ہے۔ یہ پلاٹ کی روانی کے
ساتھ رواں دواں نظر آتے ہیں۔ ٹھاکر (THAKER) کہتا ہے "میرے سب
کیرکٹر میرے غلام نہیں ہیں بلکہ ان کے اشارے پر میرا قلم چلتا ہے۔" گنگا دھر کے
"کردار" بھی اسی طرح شاعر کے نوکِ قلم کو اشارے کرتے ہیں۔

گنگا دھر کا دل مادرِ وطن اور مادری زبان کے لئے ہمیشہ تڑپتا رہا۔ اڑیا
زبان کی ترویج و ترقی کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہا۔ اس کا ثبوت چند چھوٹی چھوٹی
نظمیں "ماترو بھومی" اور "اُڈو۔ونہ دُکھی" سے ملتے ہیں۔ گنگا دھر کی طرح
ٹیگور بھی کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ وہ کلکتہ کے مشہور زمیندار ٹیگور فیملی کا ایک
فرد تھا۔ مگر گنگا دھر کی پیدائش ایک چھوٹے سے گاؤں میں جولاہے کے خاندان

بقیہ کرشمہ

سے واپس آئی تو اس نے کشور کا کمرہ خالی پایا۔ اس نے سمجھا
وہ کہیں گیا ہوگا۔ لیکن وہ ٹینس میں اپنی شاندار کامیابی
کی خبر وہ جلد سے جلد سنانے کے لئے اس قدر پریشان تھی کہ
اس نے لمبے چوڑے محل جیسے مکان کا کونا کونا چھان مارا
مگر وہ کہیں نہیں ملا۔

وہ تھک ہار کر اس کے کمرے میں صوفے پر لیٹ
گئی۔ صوفے کے سامنے کی چھوٹی سی میز پر ایک کاغذ پیپر ویٹ
سے دبا پڑا تھا۔ رادھا نے قطعی غیر ارادی طور پر وہ کاغذ
اٹھا لیا۔ لیکن اس کے پڑھتے ہی جیسے اس پر غشی طاری
ہو گئی۔ لکھا تھا۔

رادھا! میری بہن!

اتنے دنوں سے اس گھر میں رہتے ہوئے مجھے
اس گھر سے ایک خاص قسم کی ہمدردی پیدا ہو گئی ہے اور
اسی ہمدردی کے جذبے کے تحت میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ
تم اپنے چچا کو کہو کہ وہ اپنے ملازموں اور خاص طور پر بڈھے
منیم پر خاص نظر رکھیں۔ انہیں لوگوں کی مدد سے میں نے
اس گھر کے ڈھکے چھپے راز کا پتہ لگایا اور آج انہیں کی
مدد سے چار لاکھ روپے لے کر جا رہا ہوں۔ اس میں شک
نہیں کہ جب تمہارے چچا جی میری طرف سے مطمئن ہیں تو آئندہ
مستقبل قریب میں میں ایک بڑی جائداد کا وارث بن سکتا
تھا لیکن ——— کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے
تک۔ اور مجھے یہ بھی خوف تھا کہ تمہارا منیم کبھی مجھ سے بلیک
میلنگ کی رقم پانے میں کمی محسوس کر کے راز نہ فاش کر دے۔
لیکن تم برا بریا د آؤگی۔ تمہیں میں نے واقعتاً
اپنی بہن بنا لیا ہے۔ فکرمند نہ ہو رادھا۔ یہ سب کچھ خدا کے
کرشمے ہیں ——— بھگوان کی لیلا ہے۔

تمہارا بھائی ——— کشور

اڑیا: گورو پرشاد مہانتی

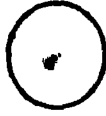
ترجمہ: سید عزت الاکرام

میری نگاہوں کی فاختائیں

میری نگاہوں کی فاختائیں روزانہ آسمان کے
فولادی پیکر کی جانب بڑھتی ہیں اور اس سے
ٹکرا کر اس دھرتی —— تمہاری اس دھرتی کی
جانب پلٹ آتی ہیں۔ جہاں تم یکہ و تنہا حیات
کے اسرار اور اس کی فنا اور اس کے غوامض
کی معنویت تک پہنچنے کی منتظر ہو۔
جب تو جیں اپنی ننھی ہتھیلیوں سے کہن سال ریت
کے جسم کو آہستہ آہستہ تھپکتی ہیں، تو میں گھبرا جاتا
ہوں اور کھڑی دوپہر کی خشکی میں گم ہو جاتا ہوں
اور تمہارے زرد بدن میں اپنے تمام اجداد، نیز ان
کی یادوں کو محسوس کرنے لگتا ہوں۔
تم گھاس اور ریتی، جنگل، پہاڑی، کائی، موتی
اور سمندر اور زرد رات کے مٹھے ہوئے بادلوں
کے زرد چاند، نیز (سمندر کے) اس کنارے
سے اس کنارے تک تیرتے اور فنا ہوتے ہوئے
[illegible] کے پوشیدہ احساسات کو دہراتی ہو۔
دل کا فولادی پیکر ہیرے کی مانند سخت ہے
اور تمہارے ذہن کی فاختائیں روزانہ شکست
خوردہ لوٹ آتی ہیں۔

اور جب میری نگاہوں کی فاختائیں
آسمان کی تمام خامیوں کو عبور کر کے لوٹ آتی
ہیں، تو وقت میرے جسم کے تمام خوابوں کے
ساتھ اور تمہارے بدن کی بھی تمام ماندگی،
تشنگی، گرسنگی، برانگیختگی اور حسرت کی راہ
سے ایک دھارے کی شکل میں بہتا ہے۔
دوپہر تنہا ہے، تتلیاں بھی نہیں گر رہی ہیں
سورج کے انفاس بھی ساکت ہیں۔ چھاؤں کا
جنگل آسمان میں دھوئیں کی طرح گم ہو گیا ہے
مجھے یاد نہیں آتا کہ کب اور کہاں، آیا
کٹک یا اجین کی سرحدوں میں، میری نگاہوں کی
فاختاؤں نے تمہارا تعاقب کیا تھا۔

محمود سعیدی



... سیہ بر سفید

محمود سعیدی کے زیر طبع شعری مجموعے "سیہ بر سفید" کی ایک نظم

دیدنی تھی جو دیکھتا کوئی　　زندگی جنوں کی نیرنگی
رنگ سارے نگل گئی آخر　　رفتہ رفتہ فنا کی بے رنگی

○

اِک سیاہی مگر چمکتی ہے　　وہ جو میرے قلم سے ٹپکی تھی
لوحِ قرطاس کی سفیدی پر　　موجۂ رنگ بن کے لپکی تھی

○

روشنی اب بھی اس سیاہی کی　　دل و جاں میں جو پھیل جاتی ہے
آب و تاب اُن تمام رنگوں کی　　دفعتہً جیسے لوٹ آتی ہے

○

آب و تاب ان تمام رنگوں کی　　جو مری روح میں در آئی تھی
زندگی کا شعور بن بن کر　　ظلمتِ جاں میں جگمگائی تھی

○

رنگ سب مٹ چکے مگر شاید　　یہ سیاہی فنا نہیں ہوگی
یہ امانت ہے روحِ فردا کی　　یہ اجل آشنا نہیں ہوگی

حیدر نایاب

سانحہ!

برقِ بے ساختہ
چشمِ دلدار کی
جب گری ناگہاں
دل کے رنگین ایوانِ بلّور کی
چھنچھنا کر ہوئیں ڈھیر سب منزلیں
شیشۂ جاں میرا ہو گیا چور چور
ٹوٹی کرچوں کی رگ رگ میں پھیلی چبھن
ایک اِک زخم سے پھروں ٹپکا لہو
اور سینے کا میداں ہوا سرخرو!
حسرتوں کا نمو
بن کے آنسو چھلکنے لگا آنکھوں میں،
شمعِ انفاس کی لو تھرکنے لگی
کانچ کے ٹکڑے ٹکڑے میں کتنے شبیہیں
مچلنے لگیں، جھلملانے لگیں!
اس طرح یہ محل
آرزوؤں کا رنگیں بلوریں محل
ٹوٹ کر درشۂ دارِ چراغاں ہوا
ہر طرف عشق کی ضو فشانی ہوئی!

●●●

شہریار

رات کی زد سے بھاگتا ہوا دن

رات کی زد سے بھاگتا ہوا دن
پہلے ٹھہرا گھنے درختوں پر
پھر لگائی زمیں پر اس نے جست
مندروں، مسجدوں سے ٹکرایا
راستوں، کوچوں اور گلیوں کی
گرد اور گندگی سے بچتا ہوا
گھس گیا تنگ خالی کمروں میں
تیز رفتار بس میں ہو کے سوار
پھر گیا اونچی بلڈنگوں کی طرف
بوسے کچھ فائلوں پہ ثبت کئے
کچھ دریچوں کے جسم سہلائے
پھر چلا کافی ہاؤس کی جانب
پھر ملوں کے دھوئیں کے سیل کے ساتھ
اُن فلک بوس چوٹیوں پہ گیا
پھر کسی سخت شئے سے ٹکرایا
اور پھر رات ہر طرف ہی رات

●●●

• ساجد اشرف

ایک نظم

تب میرے خیالوں کے تہہ خانے کا دروازہ
کھلتا ہے،
مرا ماضی
زخموں کا کفن اوڑھے
آتا ہے
اُداسی کے پُر ہول سمندر میں
دل ڈوب سا جاتا ہے
لیکن ـــ میں امیدوں کی
مہکی ہوئی جیوتی کے
گلنار سہارے پر
آسیب زدہ جیون کی چیختی راہوں سے
بے خوف گذرتا ہوں
بس جانبِ مستقبل!
بس جانبِ مستقبل!!

• • •

• فضل المتین

سکوتِ شب

سکوتِ شب میں اکثر
تو میرے رو برو ہے
تری سانسوں کی آہٹ
مخاطب ہیں

مجھ پہ یہ عالم گذرتا ہے
تجھ سے محوِ گفتگو ہوں میں
تیرے دل کی دھڑکنیں مجھ سے

میں کھویا ہوں
نیلی، سرمگیں، آنکھوں کی مستی میں
سنہرے عارضِ تاباں کی گرمی میں
معطر ریشمی زلفوں کے سائے میں

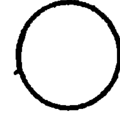
سکوتِ شب
میرا سرمایۂ ہستی، میرے خوابوں کی بستی ہے

• • •

اظہارِ افسوس ......

ادارہ "شاخسار" پدم بھوشن آرزو لکھنوی اور شاہد احمد دھلوی کے انتقال پر ملال پر اظہارِ افسوس کرتا ہے۔ آرزو لکھنوی گویا لکھنؤ اسکول کے آخری نمائندہ شاعر تھے اور انہیں نیاز فتحپوری کے ساتھ پدم بھوشن کے معزز خطاب سے نوازا گیا تھا۔ شاہد احمد دہلوی اردو کے صاحب طرز ادیب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور "ساقی" کراچی کے اڈیٹر تھے۔ اردو ادب میں "نگار" کے بعد "شاعر" کے پہلو بہ پہلو "ساقی" کی ادبی خدمات کا ذکر آتا ہے۔ ان دونوں ممتاز ادیبوں کی رحلت سے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ قارئینِ "شاخسار" سے مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

امجد نجمی



علیم اختر مظفر نگری

غزل

جتنی ہوائے ظلم و جفا پھیلتی گئی
اُتنی ہی اور بوئے وفا پھیلتی گئی

رنگین آنچلوں کو اڑاتی رہی وہ یاد
اِک مست مست شوخ ہوا پھیلتی گئی

کچھ اور بڑھ نہ جائیں کہیں غم کی ظلمتیں
ان کے تبسّموں کی ضیا پھیلتی گئی

مٹھی میں جلوۂ یدِ بیضا لئے ہوئے[1]
شوخیٔ رنگِ دُزدِ حنا پھیلتی گئی

منزل سمٹ کے نقشِ کفِ پا میں آ گئی
چہرے پہ گردِ راہِ وفا پھیلتی گئی

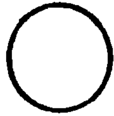
ذکرِ وفا چھڑا تو مرا نام آ گیا
چہرے پہ اُن کے شرمِ جفا پھیلتی گئی

جب تک مری زباں پہ رہا حرفِ مدّعا
ان مست انکھڑیوں میں حیا پھیلتی گئی

وہ انتظارِ شوق کا عالم کہ رات بھر
اک روشنیٔ مہر و وفا پھیلتی گئی

اختر، ہمارے ساتھ چلا کاروانِ شوق
ہر چار سمت بانگِ درا پھیلتی گئی

[1] مصرعہ علامہ سیماب سے ادبی تصرف۔



سعادت نظیر

غزل

جو بیکسوں کو ستا رہا ہے، جو بے بسوں کو رُلا رہا ہے
وہ اپنی بربادیوں کے نقشے، سمجھ لو، خود ہی بنا رہا ہے

اندھیرے غم کے سسک رہے ہیں، ستم کے آنسو ٹپک رہے ہیں
زمیں کے ذرّے چمک رہے ہیں، نقاب کوئی اٹھا رہا ہے

رہِ صداقت کو طے کیا ہے، کچھ اس طرح ہم نے ہر قدم پہ
زمانہ اک ایک نقشِ پا کو، نشانِ منزل بنا رہا ہے

حقیقتِ جہدِ زندگی وہ سمجھ چکا ہے، بقدرِ امکاں
جو قافلہ راہِ نو پہ بچ کر پرانی راہوں سے جا رہا ہے

مصیبتوں پر مصیبتیں ہیں، قیامتوں پر قیامتیں ہیں
مگر یہ دل ہی سا حوصلہ ہے، کہ پھر بھی وہ مسکرا رہا ہے

نظیر، کہتا ہے عزمِ محکم کہ اب ہے کشتی قریبِ ساحل
قرار موجوں کو آ رہا ہے، سکوت دریا پہ چھا رہا ہے۔

● ● ●

عطا کاکوی

غزل

نیا چمن ہے، گلوں کا ہے رنگ و بو بھی نیا
اُمنگ دل کی نئی، رنگِ آرزو بھی نیا

نیا ہے عزم، نئے ولولے، نئی منزل
ہیں راہ رو بھی نئے، ذوقِ جستجو بھی نیا

بدل رہا ہے زمانہ، نظامِ میخانہ
نیا ہے جام، ہے مینا نیا، سبو بھی نیا

ہو کیف تازہ تری چشمِ مست میں ساقی
دکھا زمانے کو اب کوئی غمزہ تو بھی نیا

قبا پرانی ہوئی، آ گئے بہار کے دن
ہو اپنے دامنِ صد چاک میں رفو بھی نیا

مچل رہے ہیں شرارے چمن کے سینے میں
کلی کے دل میں ہے اب جذبۂ نمو بھی نیا

نئے گلوں سے نئی چھیڑ چھاڑ ہے جاری
ہے عندلیب کا اندازِ گفتگو بھی نیا

قبائے کہنہ کے بدلے نیا لباس بنے
نیا قماش ہو اس کا، ہو تار و پو بھی نیا

چمن میں نکلے ہیں گل پیرہن نہا دھو کر
نیا نکھار ہے، اندازِ شست و شو بھی نیا

بساطِ عیش بھی ہے نئی سرِ محفل
نیا ہے سازِ طرب، نغمۂ گلو بھی نیا

نگاہِ عشق میں بچتا نہیں حسیں کوئی
زمانہ پیش کرے لاکے ماہرو بھی نیا

فضائے عقل و خرد کی رہی نہ حد باقی
ہے شش جہت بھی نئی اسکی، چار سو بھی نیا

کتابِ ہند کی تہذیب کا ورق الٹا
نیا ہے جلوۂ دلّی، ہے لکھنؤ بھی نیا

نئی ہے بزم، پرانی غزل سنے گا کون
عطا کلام سنا، آج سب کو تو بھی نیا

سیّد اولاد اصغر رضوی

غزل

فردا کے تصور کو دولھن ہم نے بنایا — صبح آئی تو کرنوں کا کفن ہم نے بنایا

اے گریۂ خونیں، تجھے فن، ہم نے بنایا — آنکھوں کو بدخشاں و یمن ہم نے بنایا

ہاں فکر و معانی کو بہ عہد کاوش و رغبت — الفاظ کے زیور سے دولھن ہم نے بنایا

بخشی ہے حیات ابدی ہم نے ادب کو — یوں زیست کی تفسیر کو فن، ہم نے بنایا

چہرے کو کہا ہم نے ابھرتا ہوا خورشید — پرتو کو ترے چندر کرن، ہم نے بنایا

پہلے تو عطا کی اسے خاصیتِ شبنم — اور عشق کو پھر کوہ شکن، ہم نے بنایا

شعلوں کی سلگتی ہوئی تاریخ سے پوچھو — دہکے ہوئے شعلوں کو چمن، ہم نے بنایا

شکوہ ہے انہیں خلد ہے جن کے لئے دنیا — رہ رہ کے اسے دار محن، ہم نے بنایا

یہ شیوۂ منصور بھی اصغر ہے عجب چیز — ٹھکرا کے سرِ دار و رسن، ہم نے بنایا

• • •

شجاع خاور

غزل

اس کی شوخیاں، یا اس کی تلخیاں، شعلے تقدیر کے، نغمے تدبیر کے

زندگی کے کہن سال زندان میں یہ سب سلاسل رہے میری زنجیر کے

میں گیا دام تک مانتا ہوں مگر اس میں میری نہیں کچھ خطا دوستو!

میں تو ان چند دانوں سے مجبور تھا، جو پڑے تھے وہاں میری تقدیر کے

میں نوائے خرد میں مزاجِ جنوں، میں اک انساں جو پھر بھی مکمل نہیں

عشق کیا، حسن کیا، سوز کیا، ساز کیا، یہ تو کچھ رنگ ہیں میری تصویر کے

کوئی پاسِ وفا اب کہاں تک کرے، کس کو فرصت کہ راتوں کو آہیں بھرے

یہ زمانے نہیں شیریں، فرہاد کے، یہ زمانے نہیں رانجھے اور ہیر کے

عشق سوزِ دروں ہے، دروں ہی رہے، ہو کے رسوا کہاں عشق رہتا ہے پھر

عشق میں ان کے خاور، صداقت نہیں، بھوکے ہوتے ہیں جو اسکی تشہیر کے

علقمہ شبلی

غزل

ترمیم چاہتا ہوں نظامِ بہار میں کلیاں چٹک رہی ہیں دلِ سوگوار میں
ہر شعلے سے موسمِ گل کے ہوں باخبر اپنی تو کائنات لٹی ہے بہار میں
اے دورِ چشمِ یار! ترے فیض کے نثار ہے گردشِ زمانہ مرے اختیار میں
تارے اداس اداس ہیں، پھیکی ہے چاندنی لو رات یہ بھی ختم ہوئی انتظار میں

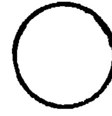
شبلی! یہ فیض ہے دلِ منزل شناس کا
ہے عکس کوئے یار کا ہر رہ گذار میں

محمد رفیق درد

غزل

پھر لبِ بام وہی جلوہ دکھایا جائے جو ہیں بیہوش، انہیں ہوش میں لایا جائے
دوستو فرق جو باقی ہے مٹایا جائے بڑھ کے دشمن کو بھی سینے سے لگایا جائے
دل کی محراب میں سجدوں کو لٹانے کے لئے عقل کا سنگِ گراں در سے ہٹایا جائے
ان کی میخانہ بدوش آنکھوں کا لے کر صدقہ آج زاہد کو بھی اک گھونٹ پلایا جائے

مندمل ہو ہی گیا زخمِ جگر جب، اے دوست
نگہِ ناز سے پھر تیر چلایا جائے



غزل

دیکھ لے اس کو نگاہِ بشری مشکل ہے
ہوش رہ جائے دمِ جلوہ گری مشکل ہے

پُرخطر راہِ محبت ہے مرے ساتھ نہ چل
تجھ سے اے دوست مری ہمسفری مشکل ہے

ہر قدم پر ہے یہاں مرحلۂ دار و رسن
منزلِ آگہی و باخبری مشکل ہے

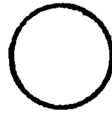
ذرّے ذرّے میں ہے خورشید یہ مانا ہم نے
سب کا حصّہ ہو، وسیع النظری مشکل ہے

عشق کا میں ہوں پرستار، تو بیگانۂ عشق
چارہ گر تجھ سے مری چارہ گری مشکل ہے

بے حجابی ہے کسی کے رخِ روشن کا حجاب
جب یہ عالم ہو تو پھر پردہ دری مشکل ہے

چاند تاروں پہ ہے قبضہ بہت آساں لیکن
غم سے ہو دورِ حیاتِ بشری مشکل ہے

نفسِ تنگ جہنم ہے یہاں اے ناظر
گذرِ موجِ نسیمِ سحری مشکل ہے



غزل

دل نے ماضی کو دی صدا جیسے
کوئی دروازہ کھل گیا جیسے

شرم سے کوئی کٹ گیا جیسے
کچھ نگاہوں نے کہہ دیا جیسے

گل بہ گل ذکرِ موسمِ گل کا
ایک عاشق کا تذکرہ جیسے

جان لی وجہ غمِ زمانے کا
یہ خوشی بھی ہو بے صدا جیسے

کانپ اٹھی شمعِ انتظار کی لَو
آ گئی صبح کی ہوا جیسے

غم کی راتوں میں تیری یاد کی لَو
عکس جمنا میں تاج کا جیسے

پھول کی لاش برہنہ[1] تھی صبا
چاند نے ڈال دی ردا جیسے

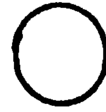
---

[1] دراصل [illegible] بَرَہنہ ہے۔ مثلاً

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست (اقبال)

(ادارہ)

ساحل مانکپوری



غزل

فرطِ نومیدی میں اکثر کچھ سکوں پاتا ہے دل
یاد آتی ہے جب انکی پھر تڑپ جاتا ہے دل

اور سب بیکار ہو جاتے ہیں شیشے ٹوٹ کر
ہاں مگر جب ٹوٹ جاتا ہے تو کام آتا ہے دل

آتشِ سوزِ محبت بھی نرالی آگ ہے
دے رہے ہیں اشک چھینٹے اور جلا جاتا ہے دل

دل کا دامن تھام، عقلِ حیلہ جو سے ہوشیار
عقل بھٹکاتی ہے اکثر، راہ پر لاتا ہے دل

یہ بھی دنیائے محبت کا عجب دستور ہے
جب لڑیں آنکھوں سے آنکھیں دل سے مل جاتا ہے دل

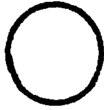
یاد آ جاتی ہے گلشن کی بہارِ فتنہ خیز
جب چٹکتا ہے کوئی غنچہ دھڑک جاتا ہے دل

کیا چمن میں اٹھنے والا ہے کوئی طوفان نو
خود بخود پہلو میں میرے آج گھبراتا ہے دل

کیا کہوں جس دم چمک جاتی ہے برقِ حسنِ یار
ہوش بن جاتے ہیں موسیٰ، طور بن جاتا ہے دل

اب کہاں وہ دوستوں کے جمگھٹے، وہ صحبتیں
گو ہجومِ غم میں اے ساحل بہل جاتا ہے دل

عزیز الرحمٰن بھاگلپوری



غزل

ناکامیوں کی آگ، نہ بد قسمتی کی آگ
مجھ کو جلا رہی ہے مری آگہی کی آگ

ہر سمت آسماں پہ دھواں پھیلنے لگا
چاروں طرف سے پھوٹ پڑی گمرہی کی آگ

جلتے رہے ببول کے پودے سرس کے پیڑ
افلاک سے برستی رہی چاندنی کی آگ

گلہائے گلستاں پہ خدا کا کرم رہے
پھیلی ہوئی ہے چاروں طرف دشمنی کی آگ

میں رات بھر اکیلا پڑا جاگتا رہا
تشنہ لبی بڑھاتی رہی تشنگی کی آگ



نسیم محمد جان

ایک مہینے کے پندرہ منٹ

آج شرما صاحب کا بوڑھا کتا قلب بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا ان کی کوٹھی میں ایک نئی کتیا آگئی تھی، بیچارہ انسانوں کے ساتھ رہتے رہتے اکتا گیا تھا۔ آج اپنی ہی ذات کی کتیا دیکھ کر اتنا خوش تھا جیسے دنیا کی ساری ہڈیاں کھانے کو مل گئی ہوں۔ کتیا اس کے پاس ہی باندھ دی گئی تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں تعارف بھی ہو چکا تھا اور شرما صاحب کے چمکارنے سے بوڑھے کتے کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا نام لوسی ہے۔ شام کے وقت میاں قلب یوں مخاطب ہوئے۔

"اچھا ہی ہوا تم آگئیں میں تو پانچ برسوں سے یہاں تنہا ہوں۔ آج اکٹھے سیر کریں گے"

"اپنی مرضی کی سیر ہم کتوں کے نصیب میں کہاں۔ کیا یہ زنجیر تم نہیں دیکھ رہے ہو"

"مگر سیر کر سکتے ہیں"

"وہ کیسے!"

"میں نے ایک بار ایک سادھو کی جان بچائی تھی اس نے مجھے آشرواد دیا تھا کہ جا بیٹا! ہر مہینے کی بیس تاریخ کو پندرہ منٹ تک سیر کر سکتا ہے۔ صرف آنکھیں بند کر لینا پھر جہاں کا خیال کرو گے وہاں کا منظر تیرے سامنے ہوگا"

"مگر اس طرح تو تم تنہا سیر کر سکو گے"

"نہیں۔ نہیں۔ تم میرے شانے پر صرف ایک پیر رکھ دینا آنکھیں بند کر لینا اور میں آنکھیں کھول لوں گا پھر تم جس جگہ کی سیر چاہو گی کر پاؤ گی۔"

"عجیب بات ہے چلو ہٹو مجھے یقین نہیں آتا"

"اچھا تو میں سیر شروع کرتا ہوں۔ پہلے گھر سے ہی سیر شروع کی جائے۔ لو میں مالکن کے کمرے میں پہنچ گیا"

"ہش"

"تم آنکھیں بند کر کے دیکھ لو"

"آتا ہے نظر؟"

"ہاں"

"کیا؟"

"بیگم صاحبہ اپنے چھوٹے بچے کو پاؤڈر لگا رہی ہیں"

"اچھا"

"ہاں اور کہہ رہی ہیں میرے پپو کی آنکھیں بالکل رمیش کی سی ہیں۔ یہ رمیش کون ہے جی؟"

"تم ابھی نئی ہو۔ یہ صاحب کا بھی صاحب اور بیگم صاحبہ کا تو ...."

"ہو وہ تو بالکل رمیش کی سی ہیں، بالکل رمیش کی سی ہیں کہتے کہتے اسے چومنے لگیں۔ عجیب بات ہے شوہر کے رہتے ہوئے یہ رمیش؟ کیا انسان بھی ہم کتوں کی طرح ....."

"بے کار باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ صرف پندرہ منٹ تک ہم سیر کر سکتے ہیں"

"مگر"

"بعد میں سب کچھ پوچھ لینا۔ اب میں صاحب کے آفس میں آگیا"

"دیکھو نا"

"ہاں نظر تو آرہا ہے۔ یہ لڑکی کون ہے؟"

"صاحب کی اسٹینو"

"سن رہے ہو صاحب کیا کہہ رہا ہے؟"

"نہیں"

"صاحب کہہ رہا ہے آج فرسٹ شو" دو ہم" میں چلنا ہے اسے گریڈ کی رومانی فلم لگی ہے۔ باکس میں نے ریزرو کرا لیا ہے۔ آج شام کو تمہارے سامنے ہی گھر چلے پہنچنا ہے۔ ابھی ابا صاحب کیسا آدمی ہے؟"

"بیکار سوالات کر کے وقت ضائع نہ کرو۔ وقت بہت کم ....."

"اچھا اب کچھ نہ پوچھوں گی"

"یہ رہا ابو سیٹھ کا بنگلہ"

"میں بھی تو ذرا دیکھوں"

"یہ ان کی اہلیہ کا کمرہ ہے۔ ان کا چھوٹا بھائی کمرے میں موجود ہے"

"مگر یہ لوگ تو بہت بد مذاقی کر رہے ہیں۔ برابر والا کمرہ کس کا ہے؟"

"یہاں ابو صاحب کے بہنوئی اور صاحب رہتے ہیں"

"ان کی بیگم تو بہت حسین ہیں"

"مجھے دیکھنے دو"

"دیکھو"

"ارے وہی! ان کی بیگم تو دوسرے کمرے میں سو رہی ہیں یہ تو ان کی بیگم کی بڑی بہن ہیں۔"

"مگر یہ لوگ تو ایک ہی بستر پر .... ہم نے تو یہی سنا تھا کہ انسانوں میں ہم کتوں کی طرح صرف نر و مادہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے یہاں رشتے ہوتے ہیں اور ایک عورت صرف ایک مرد کی بیوی ...."

"تم پھر بے کار سوال کرنے لگیں میں نے کہا تھا کہ آخر میں ...."

"اچھا بابا اب پوچھوں تو کہنا"

"اب ہم دھنی رام بھا سیٹھ کے گھر پر ہیں۔ غریبوں کو کھانا کھلایا جا رہا ہے"

"اب میں دیکھوں گی"

"اچھا تو یہ جو کچھوں والا دھنی رام ہے۔ آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ غریبوں کو کھانا کھلا رہا ہے۔ مذہبی لگتا ہے جبھی تو اس نے سب سارے فوٹو بھگوان کے لگا رکھے ہیں۔ گلے میں مالا بھی ہے۔ منشی جی سے باتیں کرنے لگا"

"کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

"لو تو دہی سن لو"

"بھگوان نے میری سن لی میں نے کہا تھا بھگوان اگر ایک ہزار بورے گیہوں کے بلیک کر لوں اور پکڑا نہ جاؤں تو پچاس غریبوں کو کھانا کھلاؤں گا۔ میرا تو یقین ہے کہ اگر انسان بھگوان کے نام پر کچھ نکال دے تو بگڑا کام بھی بن جاتا ہے۔ سب لوگ انسپکٹر کی شکایت کرتے تھے کہ سالا پانچ سو سے کم کی بات ہی نہیں کرتا مگر میرا کام تو اس نے دو ہی سو میں کر دیا سب بھگوان کی کرپا ہے"

"اب مجھے دیکھنے دو"

"سامنے والے مکان سے یہ عورت کیوں بھاگی جا رہی ہے!"

"او۔ سامنے کمرا نوجوان اس کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اسے ایک آدمی سمجھا رہا ہے۔"

"کیا؟"

"ماں جی اپنی کیوں دکھ دیتے ہو۔ کیوں نہیں تم اپنی اہلیہ کو بھی اسپتال بھیج دیتے ہو۔ بیچاری بوڑھی تمہارے والد کی تیمارداری ٹھیک سے نہ ہو پاتی ہو گی۔"

"یار تم بھی زمانے سے دو صدی پیچھے ہو۔ ارے ان

بوڑھوں کا کیا آج ہی کل چل دیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کی وجہ
میری بیگم سے کشیدگی ہو۔ آخر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ان کی وجہ
سے اپنا ذہنی اور گھریلو سکون برباد کر لوں۔ آئی تھیں کہنے کہ دو
روز سے کھانا دیر سے جاتا ہے۔ بیگم نے بھی صاف صاف سنا دیا میں
کوئی نوکرانی نہیں کہ کھانا پکا پکا کر بھیجتی رہوں۔ آج سے کھانا
نہیں جائے گا'۔"

"اب میں دیکھوں گی۔"

"چوک پر بھیڑ کیوں ہے۔ وہاں تو پولس بھی کھڑی
ہے۔"

"مجھے دیکھنے دو۔ یہ تو رام داس چائے والا ہے۔ سن
رہی ہو کیا کہہ رہا ہے؟"

"کیا؟"

"حضور غلطی ہو گئی۔ اب کبھی چائے کے پیسے نہ مانگوں گا۔
کسی طرح اس مصیبت سے نجات دلائیے۔ پولس والے اسے پیٹ
رہے ہیں۔ اسے شک میں پکڑ رکھا ہے۔ رات شہر میں چوری ہو گئی تھی۔
گواہ بھی تو تیار ہیں گواہی دینے کے لئے۔"

"کیا؟"

"کہ رام داس نے چوری کی ہے اس کے گھر سے چوری کا سامان
برآمد ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مال کہیں اور سے لایا گیا ہے۔"

"تو کیا رام داس کو سزا مل جائے گی؟"

"صاحب ایک دن کہتا تھا کہ قانون کو صرف گواہ چاہیے
اور ثبوت . . . ."

"سامنے رکشا پر کون آرہا ہے؟"

"دیکھوں تو ذرا۔ یہ تو مشہور افسانہ نگار ہیں۔ دائیں
جانب والا پیلا مکان انہیں کا ہے۔ پچھلے ماہ کسی رسالے میں ان کی
ایک کہانی شائع ہوئی تھی، رکشا ڈرائیور کے ستائے جانے پر۔
کس طرح سواری کرنے والے اور پولس والے ان پر مظالم
کرتے ہیں۔ میم صاحبہ صاحب کو پڑھ کر سنا رہی تھیں۔ میری
آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔"

"اب مجھے دیکھنے دو۔ یہ صاحب تو رکشا والے سے الجھ
پڑے۔ وہ آٹھ آنے مانگ رہا ہے اور یہ چھ آنے دے رہے ہیں۔
وہ میونسپلٹی کا ریٹ دکھا رہا ہے اور یہ اسے ماں بہن کی گالیوں
سے نواز رہے ہیں۔ لو وہ تو کمرے کے اندر چلے گئے۔ رکشا والے
کو بھی بلا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب آٹھ آنے دے دیں گے۔
مگر انہوں نے تو دروازہ بند کر لیا۔ اب ڈنڈے بھی لگانا شروع
کر دیئے بیچارہ رکشا والا بری طرح چیخ رہا ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا
ہے ڈنڈا بڑا موٹا ہے۔ تم تو کہتے تھے کہ انہوں نے رکشا ڈرائیور پر
کہانی لکھی . . . ."

"ہاں"

"تم پھر بے کار سوال کرنے لگیں۔"

"اب کچھ نہ پوچھوں گی۔"

"لوسی صاحب آرہے ہیں۔"

"میم صاحبہ بھی آگئیں"

صاحب "ڈارلنگ! تو یہ ساڑی بازار سے گذر رہا تھا
پسند آگئی"

میم صاحب "اولولی" ([illegible])

"میں ایک دوست کو دیکھنے جا رہا ہوں بیمار ہے"

"چائے تو پی لو"

"نہیں۔ ذرا جلدی ہے۔ وہیں پی لوں گا۔ تم اکیلی ہی کلب
چلی جانا"

لوسی "مکار' مرد کی ذات" اچھو فلسفہ پھر شروع کر دیا"

"پندرہ منٹ ختم ہو گئے اب تو ایک ماہ کے بعد پھر ہو
سکے گی۔"

"تم کہتے تھے کہ اخیر میں تمام سوالوں کا جواب دو گے۔"

"ہاں"

"تو دو"

"تم نے جو کچھ بھی سنا تھا وہ آج کے انسان کے متعلق نہ تھا۔ اب انسان ترقی کر رہا ہے اس لئے مذہب، اخلاق اور تہذیب کے مفہوم بھی بدل رہے ہیں۔"

وہ مطمئن ہو گئی جیسے اسے تمام سوالوں کا جواب مل گیا ہو اور اس کے ذہن میں اب کوئی سوال نہ ہو مگر وہ پھر بھی سوچ رہی تھی اگر واقعی انسان ترقی کر رہا ہے تو عجب نہیں کہ ترقی کی منزل پر پہنچ کر ہم کتوں اور انسانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔

بقیہ "بزم شاخسار"

مسکراؤ نہ مری چاک گریبانی پر
یہی اس دور میں جینے کی سزا ہے یارو
(مہدی پرتاپگڑھی)

اہلِ جفا کی ہم کو جفا راس آگئی
آب و ہوائے شہرِ وفا راس آگئی
(محسن زیدی)

اک برس اس شہر میں لوگو، زہر پیو، یا تشنہ رہو
امرت پی کے جو آتا ہے ناگ وہ بن کر ڈستا ہے
(عنوان چشتی)

جیسے کوئی چراغ اندھیرے میں جل اٹھے
دل کے قریب آ کے کوئی یوں ٹھہر گیا
(اقبال منہاس)

محبت راز یہ سمجھا گئی ہے
حقیقت بھی فریبِ آگہی ہے
(ثریا ندرت)

کتنے ٹکڑے خوابوں کے آس پاس بکھرے ہیں
دیکھتے ہیں اک اک کو ہم بچشمِ نم تنہا
(سید شکیل دسنوی)

یہ جشنِ چراغاں ہے کہ ہے سیلِ سیاہی
جتنے ہیں چراغ اتنی ہی تاریک فضا ہے
(محسن الہ آبادی)

شاہد ماہلی کا شعر ہے:

لیکر کدھر کو جائیں امیدوں کا کارواں
ملتی نہیں ہے دور تلک رہ گزر کہیں

کدھر کے بعد "کو" لانا حشو قبیح ہے۔ اہل فن اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ عنوان چشتی صاحب کی غزل کے ساڑھے چار اشعار "ہما" ڈائجسٹ شمارہ جون میں صفحہ ۱۰۰ پر نظر سے گزرے ہیں۔ ان کا مذکورہ بالا شعر اس غزل سے لیا ہے۔ ساڑھے چار اشعار کی وضاحت اس شعر سے ہو جائے گی:

اپنے خوابوں کا آئینہ دیکھ کے شرما جاتا ہوں
جیسے کوئی ہنس کر میرے دل پر جملے کستا ہے

برستا، بستا کا قافیہ ہنستا بنانا اہل فن کے نزدیک غلط ہے حالانکہ کچھ لوگ درست سمجھتے ہیں۔

بقیہ دورِ جدید کے دو مقبول شاعر

یہ غرور ہے کہ ذہنی پیکریت کی بذاتِ خود تب تک کوئی اہمیت نہیں ہوتی جب تک کہ پوری نظم کی مناسبت سے اس کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ پھر بھی مندرجہ بالا مثالوں سے کم از کم شاعر کی ذہانت اور فطانت کا تو پتہ چلتا ہے جو کہ شاعر نے احساسات اور جذبات کی آگ میں تپ کر ان ذہنی پیکروں کی تخلیق کی ہے اس لئے ان ذہنی پیکروں کے استعمال سے بہ آسانی کیفیات کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی معرض وجود میں آتی ہے چنانچہ دورانِ مطالعہ قارئین کے ذہن میں تحت الشعور اور لاشعور کی تہوں سے شعور کی سطح تک ڈوبتی اور ابھرتی ہوئی جذبات و کیفیات کی لہروں کے باہمی امتزاج سے انتشار کی بجائے ایک سالم کیفیت وجود میں آتی ہے جو شہریار کی نظموں کو اعلیٰ پیمانوں کی تخلیقات کا لقب عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔ (بشکریہ 'نگار' پاکستان)

عبید قمر



قتل

شفیع، رفیع اور سمیع اسکول کا ٹاسک پورا کرنے میں
مک تھے۔ تینوں حقیقی بھائی تھے اور ہم عمر بھی۔ شفیع کی عمر
ہ سال اور رفیع کی گیارہ سال۔ اور سمیع کی تو آٹھویں
الگرہ اسی ماہ کی پچیس تاریخ کو منائی جانے والی تھی
دی اور مینڈک کی طرح گال پھلانے اور پچکانے والا
ل مٹول سمیع ڈالڈا کمپنی کا جیتا جاگتا اشتہار معلوم
تا تھا۔ شفیع کا بشاش چہرہ اس کی صحت مندی کا ثبوت
لیکن پتلے دبلے رفیع کی گوری رنگت جیسے ہلدی کا
نگ پکڑنے جا رہی تھی۔ اس کے پھیکے پھیکے سے چہرے
چھائی ہوئی مردنی عجیب بے بسی کی غماز تھی۔ وہ
ان دونوں فیشن زدہ خوش پوش بھائیوں کے
یک گندے کپڑے پہنے ایک اجڈ گنوار اور اچھوت
وم ہوتا تھا۔

سامنے کی کھڑکی سے باہر بندھے ہوئے بیل کی گردن
ایک بڑے زخم سے خون رس رہا تھا۔ مکھیاں بھنک
تھیں اور ایک مظلوم اور بے زبان، بے بس فریادی کی
رح بیل کی آنکھیں نم تھیں۔ شاید ابھی ابھی بے رحم
ن بیل گاڑی سے مال اتر جانے کے بعد اسے یہاں
ہ گیا تھا۔ ایک کوا بیل کی پیٹھ پر پھدکتا ہوا گردن پر
جا کر چونچ سے زخم کو کریدتا اور پھر جیسے ہی بیل زور سے
اپنی دم ہلاتا کوا اڑ کر باہر کے مکان کی منڈیر پر جا بیٹھتا
پڑھنے کی بجائے معصوم سمیع کی نظریں بیل کی گردن پر
بیٹھے کوے پر جمی تھیں جیسے ہی کوا اپنی چونچ زخم پر لگاتا
بیل کی تھرتھراہٹ کے ساتھ ہی سمیع کے بدن میں
کپکپی کی لہر سی دوڑ جاتی۔ درد و غم کی تصویر بنا
— وہ عجیب سی سوالیہ نگاہوں سے اس دردناک
منظر کو دیکھ رہا تھا۔ شریر شفیع نے موقع سے فائدہ
اٹھا کر اس کی گوشمالی شروع کر دی۔ سمیع کا چہرہ سرخ
ہو گیا۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد یکایک جیسے
یہ سوچ کر کہ موقع غنیمت ہے پڑھنے سے نجات حاصل
کرنے کا — سمیع رونے چیخنے لگا۔ اس کی امی
دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور بغیر کچھ پوچھے
سمیع کو اس حالت میں دیکھ کر بیچارے رفیع پر طمانچے
تھپڑ، جھانپڑ کی بارش شروع کر دی۔ رفیع بے چارہ
تو پڑھ رہا تھا۔ سمیع کے رونے پر اس کی شکایتیں ہی سن کر
امی اسے پیٹنے لگیں۔ اور وہ "ہم نہیں۔ ہم نے
کچھ نہیں کیا — ہم نہیں۔ ہم نہیں!" کہتا ہی رہ گیا
لیکن اس کی سنتا ہی کون تھا۔ اس کے ساتھ تو ہمیشہ سے

یہی ہوتا آیا تھا، قصور کوئی کرتا، شرارت کسی کی ہوتی
لیکن موردِ الزام اسی کو ٹھہرایا جاتا۔ مجرم اسی کو گردانا جاتا
قصوروار وہی سمجھا جاتا۔ وہ دونوں گھٹنوں کو ہاتھ سے
پکڑے اور ان پر سر جھکائے رو رہا تھا ــــ روئے جا
رہا تھا ــــ رفیع اسی طرح ہمیشہ روتا تھا کتنی بے بسی
کا رونا تھا یہ! وہ روتا رہتا اور بڑبڑاتا رہتا ــــ دل کی
بھڑاس نہ نکلے تو جینا مشکل ہو جائے۔ وہ اپاہج تھا نہ
فطری طور پر اس کا کوئی عضو معطل تھا۔ اور نہ دماغ ہی
ماؤف و کمزور تھا! وہ سست اور کاہل بھی نہ تھا
ہاں وہ ایک سیدھا سادہ سا لڑکا تھا۔ نیک
فطرت اور کم گو! حکم کا غلام!! گھر کا کوئی آدمی، خاندان
کا کوئی فرد، محلہ کا کوئی شخص کسی کام کے لئے کہتا وہ فوراً
کر دیتا جیسے وہ ایک کٹھ پتلی ہو اور حکم کی ڈور پر چلنا اس کا
کام ہو۔ پھر بھی سارے لوگ جیسے اس سے نفرت کرتے
تھے۔ ہر شخص اس سے اسی طرح پیش آتا جس طرح راستے
میں پڑے روڑے کو لوگ ٹھوکر مار دیتے ہیں۔ لیکن ایسا
کیوں تھا ــــ؟ لوگ اسے کیوں نفرت کی نگاہ سے
دیکھتے تھے۔ کیوں؟؟ کبھی کبھی جب وہ یہ سب کچھ سوچتا
تو اس کے آنسو نکل پڑتے۔ وہ تنہائی میں جا کر بستر پر گر پڑتا
اور گھنٹوں روتا رہتا۔ اگر کبھی تنہائی میں روتا پکڑا جاتا اور
لوگ رونے کا سبب پوچھتے تو جیسے اسے سکتہ سا آجاتا
وہ بے بس نگاہوں سے سب کو تکنے لگتا۔ جیسے خود اسے بھی
اپنے رونے کا سبب معلوم نہ ہو۔ جیسے وہ یونہی روتا ہو۔
اور پھر یکایک جیسے وہ چیخنے لگتا ــــ "کوئی مجھ سے محبت
نہیں کرتا۔ کوئی بھی مجھ سے دو میٹھے بول نہیں بولتا۔ سب
مجھے ہی برا بھلا کہتے ہیں۔ سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میں
اسی لئے روتا ہوں ــــ اسی لئے روتا ہوں ــــ!" یہ
سن کر سب کے سب ہنسنے لگتے اور اس پر طنز و تشنیع کے

تیروں کی بارش شروع ہو جاتی۔ سب اپنے دل کی بھڑاس
نکالنے لگتے۔ ہر لفظ تیر بن کر اس کے وجود کو چھلنی کر
دیتا اور پھر سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔
اسی طرح اس کی زندگی کی گاڑی وقت کے
پہئے اور آنسوؤں کے بھاپ کے ذریعہ نامعلوم منزل
کی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھی جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا
اس کے لاشعور میں جاگزیں احساس کمتری بھی بڑھتا جاتا۔ وہ
زیادہ تر اپنے سے بہت کم عمر لڑکوں میں رہنا پسند کرتا
تھا۔ نہ جانے ان کی صحبت اس کے کون سے جذبے کو تسکین
دیتی۔ وہ گھر میں اگر موجود بھی رہتا، لیکن جیسے اس کا کوئی
وجود ہی نہ ہو۔ اس کے ابا کو آم بہت پسند تھے آموں کا موسم
ان کے لئے بہاروں کا موسم ہوتا۔ وہ ہر ہفتہ ایک ٹوکری آم
لاتے۔ مزدور کے سر سے وہ آم کی ٹوکری اتارتے۔ اور مزدور کچھ
سے پسینہ خشک کرتا ہوا آموں سے بھری ٹوکری کو تکتا رہتا
ــــ تکتا رہتا! عجیب سی نگاہوں سے بس تکے جاتا اور پھر
ایک چونی پاتے ہی جیسے وہ خوشی سے ناچ اٹھتا۔ وہ چو
نی اس کی نگاہوں کا مرکز ہوتی وہ اپنی ہتھیلی پر چونی
کو الٹتے پلٹتے اور دیکھتے ہوئے واپس چلا جاتا ــــ اور
ابا آواز دیتے ــــ بیٹا شفق! ارے ستو بابو دیکھو
تمہارے لئے کیا لائے ہیں!" شفیع اور سمیع پڑھنا چھوڑ کر
بھاگتے ہوئے ابا کے پاس آتے اور بے چارہ رفیع
رہ جاتا۔ اسے کوئی بھی نہ پکارتا، کوئی بھی نہ بلاتا جب اس کا
دل نہ مانتا تو وہ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لئے ہوئے
کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بڑے کمرے میں پہنچ جاتا۔ وہاں
شفق اور ستو آم گن رہے ہوتے۔ ستو اسے آنکھیں نکال
آم دکھاتا اور اشارے سے بتاتا کہ یہ سب سے بڑا آم
میرا ہے۔ شفق آم گن گن کر کچا پکا گن کر الگ کرتا جاتا
اور ابا آم کی قیمت اور گرانی پر تبصرہ کرتے!

رفیع کو دیکھ کر ابا کہتے ۔ "آؤ بھئی میاں رفیع تم بھی آم گننے میں شفن کا ہاتھ بٹاؤ ۔ تم کیسے کاہل آدمی ہو" اور رفیع عجیب بے دلی سے آم گننے لگتا ۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا ہوتا ——— ابا شفیع بھیا کو شفن کہتے ہیں اور امی شفو کہتی ہیں ۔ سمیع کو سب سمو کہتے ہیں کتنے اچھے کتنے بھلے کتنے میٹھے لگتے ہیں یہ پکارنے کے نام لیکن مجھے کوئی رفو نہیں کہتا ، کوئی بھی رفی نہیں کہتا ——— کیا انہیں مجھ سے محبت نہیں ؟ کیا میرے لئے ان کے دل میں کوئی پیار نہیں ؟؟ اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے اور وہ چپ چاپ آموں کو چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل جاتا ۔ اس کی امی کہتیں ——— "بڑے کام چور ہو تم ——— بالکل نکمے !" ابا کی آواز گونجتی ——— "خدا جانے یہ کیسے دنیا میں اور سارے کام کرے گا نہ جانے کیوں کام سے اتنا جی چراتا ہے"

دن ہفتے ، ہفتے مہینے اور مہینے سال بنتے رہے اور رفیع بڑا ہوتا رہا ، اور اس کی زندگی گھٹتی رہی اور والدین کی جھڑکیاں بڑھتی رہیں ۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی غلطیوں پر بھی اسے جھڑکنے اور ملامت کرنے سے باز نہ آتے ۔ اس کی امی اسے جب بھی غلط الزام دیتیں تو وہ عجیب بے بسی سے روتی آواز میں کہتا بس مجھ ہی پر بگڑتی ہیں اور کسی کو کچھ نہیں کہتیں ۔ ہم نے کچھ کیا بھی نہیں ہے ۔ ہاں ۔"
کبھی کبھی جب اس کے ابا جان اسے دیر تک بگڑتے تو وہ نظریں نیچی کئے چوکھٹ پر کھڑا رہتا اور بس اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہتے ۔ پندرہ سال کی عمر اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے بجائے آنکھوں میں یہ آنسو ! ... اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں جا کر گھنٹوں روتا رہتا اور اسے شفن بھیا اور سمو کی باتیں یاد آنے لگتیں

جب کبھی شفیع کی گستاخیاں حد سے بڑھ جاتیں اور ابا اسے بگڑنے لگتے تو جیسے اسے کچھ احساس ہی نہ ہوتا ادھر ابا کی آواز بلند ہونے لگتی اور ادھر وہ اطمینان سے ٹہلتا ہوا گھر سے باہر نکل جاتا اور پھر امی اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتیں ۔ سمیع ایک تو بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور سب سے چھوٹی اولاد سب سے پیاری ہوتی ہے ۔ دوسرے وہ حد درجہ ضدی تھا اپنی خطا پر آپ ہی غصہ ہو جانا اس کی عادت تھی دوسروں کے برہم ہونے سے پہلے وہ خود ہی منہ پھلا لیتا اور گھنٹوں امی منت و سماجت میں لگی رہتیں ۔ تب جا کر کہیں کھڑ ڑتا ۔ اگر کبھی ابا بگڑتا چاہتے بھی تو امی سمو کی بجائے ابا ہی پر برس پڑتیں اور وہ منہ ہی منہ میں منمنا کر رہ جاتے پھر وہ سوچتا ——— لیکن امی میری طرفداری کبھی نہیں کرتی ہیں ۔ کبھی نہیں ! وہ تو اور مجھی کو کوستی ، بگڑتی اور لعنت و ملامت کرتی رہتی ہیں ۔ جب ابا مجھ سے خفا ہوتے ہیں تو وہ اور ان کا ساتھ دیتی ہیں جیسے چنگاری کو شعلہ بنا کر ہی دم لیں گی نہ جانے اس وقت ان کی ممتا کہاں دب جاتی ہے ، نہ جانے کیوں سا جلا نہ ابھر آتا ہے ۔ شاید انہیں مجھ سے محبت ہی نہیں ۔ شاید وہ مجھے چاہتی ہی نہیں ہیں ۔ اور ابا بھی تو مجھ سے بے التفاتی برتتے ہیں جب وہ دوسرے کے سامنے مجھ سے باتیں کرتے ہیں تو کتنا طنزیہ اور تمسخرانہ انداز تخاطب ہوتا ہے جب وہ مجھ پر بگڑتے ہیں تو کس قدر غیض و غضب کی حالت میں ہوتے ہیں ——— جیسے ——— جیسے ——— اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم ہو اور اسے لگتا سب اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ سارے محلہ کی تلخ و ترش باتوں کا وہ نشانہ بنتا ہے اور پھر روتے روتے سارا

تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔

یہی وجہ تھی کہ بچپن ہی سے رفیع بڑے بوڑھوں سے دور رہتا آیا تھا۔ جیسے جیسے وہ جوان ہوتا گیا بغیر شعوری طور پر وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے دور رہنے لگا۔ وہ اپنا گھائل وجود لئے تنہائی میں سسکتا رہتا۔
تنہائی میں جیسے اسے یک گونہ سکون ملتا۔ اور آہستہ آہستہ وہ گوشہ نشین بن گیا۔

رفیع کو شعر و شاعری کا خاصہ ذوق تھا۔ یوں بھی آغازِ شباب میں ہر انسان رومانی غزلوں نظموں کا دلدادہ ہوتا ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ جوانی کی طبیعت کچھ نہ کچھ رنگین ہوتی ہے۔ پر اس کی طبیعت کی یہ کیسی رنگینی تھی۔ اس کی سرشت میں یہ کیسی رومانیت تھی کہ وہ چاندنی راتوں میں بھی درد انگیز اور روح سوز نغمے گایا کرتا۔ اور اس کی پر درد اور پرسوز آواز سن کر لوگ تڑپ اٹھتے۔ بے چین ہو جاتے! نہ جانے کیوں ہمیشہ وہ درد بھرے ہی نغمے گایا کرتا۔ یہ شعر تو جیسے اس کی تنہائی کا ساتھی تھا ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

تنہائی میں وہ ہمیشہ یہی شعر گنگنایا کرتا — یہاں تک کہ اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ گھر میں کوئی مہمان آتا تو سارے لوگ اس کی خاطر تواضع میں لگ جاتے۔ جب تک وہ رہتا گھر کے سب لوگ پہلے سے زیادہ بشاش اور مستعد نظر آتے۔ عزیز اقارب اور محلہ کے لوگ آتے روز ایک نئی محفل جمتی۔ طرح طرح کی باتیں ہوتیں پھر ان پر تنقید و تبصرہ، بحث و مباحثہ میں ہر شخص ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگتا۔ بلند قہقہے چائے کی گرم بھاپ کے ساتھ بلند ہوتے رہتے۔ لیکن رفیع اپنے کمرے میں پڑا تنہائی کی بھاپ میں ابلتا رہتا سسکتا رہتا۔

اس کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ صرف والد کے خوف سے جس دن مہمان آتے وہ جا کر ان سے مل لیا کرتا۔ مہمان کے کچھ پوچھنے پر وہ سوالوں کا جواب بہت نرمی سے دیتا جاتا اور لوگوں کی طرح نہ تو وہ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھتا اور نہ مہمان سے کوئی گفتگو کر پاتا۔ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد یا تو کوئی اسے کسی کام کے لئے کہتا اور وہ فوراً اٹھ کر اندر چلا جاتا۔ یا اس طرح وہاں سے اٹھتا جیسے اسے کوئی اشد ضروری کام یاد آ گیا ہو اور پھر اپنے کمرے میں آ کر سوچ میں ڈوب جاتا — مجھے لوگوں سے ملنے جلنے میں کیوں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے اور لوگوں کی طرح میں بھی سب سے بے جھجک کیوں باتیں نہیں کر پاتا — میں اپنی اس عادت سے چھٹکارا پانے کی بہت کوشش کرتا ہوں لیکن چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ لوگ میرے بارے میں نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے؟ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی اسے اپنا وجود دھرتی کے سینے پر ایک بوجھ معلوم ہوتا ۔۔ اور پھر وہ انتہائی بے چارگی کے عالم میں غیر شعوری طور پر کوئی یاس انگیز شعر گنگنانے لگتا — اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔

وہ ہر وقت اپنے کمرے میں پڑا کورس کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اس کے امتحان کو صرف ایک ماہ باقی رہ گیا تھا۔ اور وہ جان توڑ محنت کر رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے یکایک اس کے ذہن میں یہ جملے گونجنے لگتے — "تم زندگی میں کچھ نہیں کر سکتے تم سے کچھ نہیں ہو پاتا! کسی کام میں بھی تم کامیاب نہیں ہو سکتے" بزرگوں کے کہے ہوئے یہی جملے تو تھے جو اس کی کامیابی کی راہ میں پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ تین سال لگاتار بی کام فا

کے امتحان میں ناکام ہوتا رہا تھا۔ اس بار کی طرح ہر سال یہی ہوتا آیا تھا کہ جب بھی وہ پڑھنے بیٹھتا یہ جملے اس کے ذہن کے گوشوں سے باہر نکل کر اس کا مذاق اڑانے لگتے اور وہ پریشان ہو جاتا۔ امتحان ہال میں پرچے ملتے ہی یہ جملے جیسے اسے چیلنج کرنے لگتے ــــ "تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے! تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے!" اور اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ یاد کئے ہوئے سارے جوابات بھول جاتا اور امتحان ڈراپ کر دیتا۔ اس کی ساری محنت رائیگاں جاتی! لیکن اس بار امتحان کے دنوں میں جب بھی ان جملوں کا بھوت اس کے عزم و اعتماد کو، اس کے بلند حوصلوں کو کچلنا چاہتا وہ فوراً اپنی ڈائری کے اوراق الٹنے لگتا اور اس کی نگاہیں ایک صفحہ پر مرکوز ہو جاتیں جس پر اس نے چند ماہ پہلے لکھا تھا ــــ "ان سارے خیالات کو اپنے ذہن سے نکال دو جو تمہاری کامیابی کی راہ میں سدِ راہ بننے کی کوشش کریں۔ ماضی کی ناکامیوں سے سبق لو۔ مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے کے لئے حال کے ہر لمحہ پر نظر رکھو۔ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرو۔ اپنی قوت ارادی کو مستحکم بناؤ اور دنیا کی نکتہ چینی سے بے پرواہ ہو کر اپنی منزل پانے کے لئے سچی لگن سے آگے بڑھو۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا اور ضرور آئے گا جب تم اپنی منزل پا لوگے!"

یہ تحریر پڑھ کر اسے طاقت و تقویت حاصل ہوتی۔ وہ ساری باتوں کو بھول کر ایک نئے عزم اور ایک نئے جوش و ولولے کے ساتھ پڑھنے میں منہمک ہو جاتا۔ امتحان دینے وقت بھی اس بار اس کے کانوں میں یہی جملے گونجتے رہتے ــ "اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرو۔ اپنی قوت ارادی کو کامیاب بناؤ۔ تم ضرور کامیاب ہوگے! اور جب اس کا نتیجہ برآمد ہوا تو سارے لوگ ششدر رہ گئے۔ وہ صرف کامیاب ہی نہیں ہوا تھا، وہ فرسٹ ڈویژن لایا تھا۔ اور یہ اس کی انتھک محنت کا صدقہ تھا! خود اعتمادی کا کرشمہ!!

تحریری مقابلہ میں وہ سکنڈ ہوا۔ سب کو کامل یقین تھا کہ اس بار انٹرویو کے بعد دس منتخب امیدواروں کی فہرست میں ضرور اس کا نام شامل ہوگا۔ وہ اپنی ساری قوتوں کو یکجا کر کے خود اعتمادی کے انٹرویو روم میں داخل ہوا لیکن پندرہ منٹ بعد جب وہ کمرے سے باہر آیا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ پسینہ سے شرابور تھا اور اس کے چہرے پر عجیب بے بسی اور مردنی چھائی ہوئی تھی۔ انٹرویو کے بعد کمرے سے باہر جاتے ہوئے۔ بڑے صاحب نے کہا تھا ــــ "ہم نے تو آپ سے بہت ساری امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں ــــ لیکن ہمیں افسوس ہے ....؟" اور پھر چھوٹے صاحب کا وہ جملہ ــــ "بیچارہ کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہے!" اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دماغ کا آتش فشاں پھوٹ پڑے گا ــــ اس کا وجود بھسم ہو جائے گا۔

آج چوتھی بار انٹرویو میں ناکام ہوا تھا۔ ہمیشہ اس کے ساتھ ایک ہی بات پیش آتی تھی۔ وہ انٹرویو روم میں اطمینان سے داخل ہوتا۔ صاحب کو سلام کرنے کے بعد ان کے حکم کی تعمیل میں کرسی پر بیٹھ جاتا۔ پھر جیسے ہی اس سے کوئی سوال کیا جاتا ــــ اس پر لرزہ کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ وہ جواب دینے کی کوشش میں ہکلانے لگتا۔ پھر گھبراہٹ اور پریشانی کا ایک ساتھ حملہ ہونے پر وہ نروس ہو جاتا۔ اس کے سارے بدن سے پسینہ چھوٹنے لگتا اور وہ نظریں نیچی کئے الٹے سیدھے جواب دیتا جاتا پھر آہستہ آہستہ جیسے اس کی طاقت گویائی سلب ہو جاتی اور وہ عجیب بے بسی میں گردن جھکائے بیٹھا رہتا۔ ہاں وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ کا جواب نہ دے پاتا ــــ کچھ جواب نہ دے پاتا۔!!

گھر پہنچ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اندر سے دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں اب یہ جملے اور زور زور سے

گونج رہے تھے ـــ "بیچارہ کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہے
ـــ بے چارہ کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہے! لیکن ہمیں افسوس
ہے ـــ لیکن ہمیں افسوس ہے ـــ لیکن ہمیں ...... اور
اسے محسوس ہوا جیسے اس کا مستقبل اس کے سامنے ایک
بھیانک اژدہا بن کر منہ پھاڑے کھڑا ہے جیسے اسے نگل ہی
جائے گا!!

وہ بڑبڑانے لگا ـــ "ہاں مجھے مر ہی جانا چاہیئے
میں زندہ رہ کر کیا کروں گا ـــ ٹھیک ہی کہتے ہیں ابا"
میں زندگی میں کچھ نہیں کر سکتا ـــ کچھ نہ کر سکوں گا۔
شفو بھیا ڈاکٹر ہیں۔ بیتو نے اس سال اورسیر پاس کی
ہے۔ دونوں ہونہار کہلاتے ہیں۔ دونوں ملازمت کرتے
ہیں۔ اور ـــ اور میں؟ میں کب تک والدین کیلئے
بوجھ بنا رہوں گا۔ اور کب تک لوگوں کی انگلیاں مجھ پر اٹھتی
رہیں گی۔ لوگ مجھے کاہل، ناکارہ اور نااہل کہتے ہیں۔
لیکن یہ غلط ہے۔ بالکل غلط!! میں نے کبھی محنت سے
جی نہیں چرایا۔ میں ہمیشہ سچی لگن کے ساتھ کوشش کرتا رہا۔
لیکن تقدیر کا نوشتہ بھی کوئی بدل سکا ہے۔ شاید قدرت
کو منظور ہی نہیں کہ میں ترقی کروں۔ اسی لئے تو ایک عجیب سا
مرض مجھے لگا دیا۔ عجیب سا نفسیاتی مرض جس کا
کوئی علاج ہی نہیں ہے ـــ کوئی علاج نہیں ـــ نہیں
نہیں میں قدرت پر الزام نہیں لگا سکتا۔ یہ روگ تو مجھے
میرے اپنوں کا دیا ہوا ہے بچپن سے اب تک انہوں نے
میری ہر بات پر نکتہ چینی کی ہمیشہ دوسروں کے الزامات
ہمارے سر ڈالے گئے اور میں سنتا رہا، سزا پاتا
رہا ـــ تم کسی کام کے نہیں ہو! تم کچھ بھی نہیں کر سکتے
تمہاری زندگی بیکار محض ہے۔ تم کچھ نہیں بن سکتے
تم دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے!! یہ جملے میں بچپن ہی سے
سنتا آ رہا ہوں۔ ہمیشہ میرے ذہن کے گوشوں
میں یہ چکر لگاتے رہے ہیں شاید انہیں باتوں کا
ردعمل ہے یہ مرض ـــ یہ نفسیاتی مرض!! جس کے
زہر نے میری زندگی کو مسموم بنا دیا۔ میں زندگی میں
کچھ نہیں کر پا رہا ہوں ـــ کچھ نہ کر سکوں گا! ایسی زندگی
سے فائدہ ہی کیا؟ جب میں کچھ نہیں بن سکتا! مجھے جینے
کا کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی حق نہیں!!"
اور ـــ اور وہ اپنی طلائی انگوٹھی کا ہیرا دانتوں
سے کھرچنے لگا اور پھر وہ پسینہ میں نہایا ہوا غم، غصہ
اور نفرت کا پیکر نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس پر
تشنج کی سی کیفیت طاری ہونے لگی ـــ وہ بستر پر
گر پڑا اور اس نے بہت سارا خون اگل دیا۔
یہ خون کہہ رہا تھا ـــ اس نے خودکشی نہیں
کی ہے ـــ اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ ایک پراسرار
قتل ہے!! لیکن قاتل کون تھا ـــ؟ کون!!!

ھدیۂ تبریک ....

اس سال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریہ
ھند نے حضرت عطا کاکوی صاحب کو فارسی کے
لئے اور حضرت سعید اکبرآبادی صاحب کو عربی کے لئے
سرٹیفکیٹ آف آنرز دے کر اعزاز بخشا ہے۔ حضرت عطا
کاکوی "شاخسار" کے خصوصی قلمکاروں میں سے ہیں اور ان
کی ایک غزل زیر نظر شمارے میں شامل اشاعت ہے۔ حضرت
سعید اکبرآبادی اپنی علمی اور ادبی قابلیت کے لحاظ سے خصوصی
اہمیت کے حامل ہیں۔ ادارہ "شاخسار" ان دونوں صاحبان
کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے

"اراکین ادارہ"

حسن نظامی کیراپی

کرشمہ

وہ مارننگ شو دیکھ کر ہال سے باہر نکلی تو بارہ بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ سردی کے دن تھے بارش ہو جانے کی بنا پر سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بدن پر گرم کپڑے ہونے کے باوجود وہ کافی ٹھنڈک محسوس کر رہی تھی۔ ایسے میں چائے یا کافی پینے کی خواہش کا جاگ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وہ کافی ہاؤس کی طرف جیسے ہی مڑی کچھ عجیب سے حلیے کا ایک نوجوان اس سے ٹکرا گیا۔ اور ایک لمحت اس نے جیسے غیر ارادی طور پر اسے لوفر کمینہ، اندھا وغیرہ کہہ ڈالا۔ لیکن وہ کچھ اس طرح حد سے زیادہ ندامت بھری خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اسے وہ بڑا ہی قابل رحم سا نظر آیا —— وہ کافی ہاؤس میں داخل ہو گئی۔ چند منٹ کے بعد وہ بھی آگیا اور اس کے قریب ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ اب تک بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"شاید تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟" وہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

"مجھے معاف کر دیں بہن جی۔ مجھ سے بھول ہو گئی ہے۔ اس کے لئے میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"تم بدتمیز ہو۔" وہ اب بھی غصہ میں تھی لیکن اس کا غصہ کسی قدر سرد ہو گیا تھا۔

"میں ایک بدنصیب آدمی ہوں ... میں ... میں کسی کی تلاش میں خود کو اتنا کھو چکا ہوں کہ مجھ سے بھول ہو ہی جاتی ہے۔ میں آپ کو دیکھ کر غلط فہمی میں پڑ گیا تھا۔ میں نے آپ کو اپنی بہن رادھا سمجھ لیا تھا۔"

"رادھا —— ؟"

"ہاں رادھا .... میری اپنی بہن ..... رادھا جس کی تلاش میں میں پاگل ہو رہا ہوں۔ جس کی تلاش میں میں در در کی خاک چھان رہا ہوں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے" —— اس کا نام بھی رادھا تھا۔ چنانچہ اُسے اس کی بہن رادھا کی کہانی سننے کا اشتیاق ہوا۔ اور اس نے التجا کی کہ وہ اپنی کہانی سنائے۔ غالباً وہ اپنی کہانی کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن ایک لڑکی کی خواہش کو وہ ٹھکرا نہ سکا۔ اور پھر وہ اس کی کرسی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"آج سے بہت پہلے کی بات ہے۔ انگریزوں کا زمانہ تھا لیکن آزادی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ایک رات ظالم انگریزی فوج کے کچھ سپاہیوں نے ہمارے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ گاؤں کے جوانوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر ان کے سپاہیوں کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹک سکے۔ گاؤں جلا دیا گیا۔ جوان لڑکیوں اور عورتوں کی عزت لوٹی گئی۔ میرے ماں باپ بھی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیئے گئے تھے۔ مگر میں رادھا کو لے کر کسی طرح

بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میری عمر اس وقت لگ بھگ دس
سال کی تھی اور رادھا تقریباً چار سال کی تھی۔ میں اسے لے کر
ایک طرف نکل بھاگا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں کہ کیا ہوا۔ میری جب
آنکھیں کھلیں تو اپنے آپ کو ایک خوبصورت سے کمرے میں
نرم گدے دار پلنگ پر دراز پایا۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ
رہا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں پر کئی جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک
بوڑھا آدمی جس کے چہرے پر سفید داڑھی تھی مجھ پر جھکا ہوا
تھا۔ ایک ضعیف العمر عورت اور کئی بچے میرے ارد گرد کھڑے
ہوئے تھے۔ ہوش میں آتے ہی میں نے رادھا کو پکارا۔

"گھبراؤ نہیں بیٹے۔ اب تم حفاظت میں ہو۔ ابھی تمہیں
آرام کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کی تاکید
کی ہے۔" پھر وہ خاموش ہوگیا۔ جیسے کہ اسے اپنے بارے
میں بتانے میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ چہرے پر غم کے
بادل منڈلانے لگے تھے۔ اور آنکھوں میں آنسو لیکن وہ
پھر کہنے لگا۔

"اس طرح بہت دن بیت گئے۔ سارا بھارت
ڈھونڈ چکا ہوں۔ مگر وہ نہ مل سکی۔ پتہ بھی کیسے چلے کوئی نشان
بھی تو نہیں ہے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ہاں ایک نشان
ہے۔ شاید وہ اب بھی اس کے پاس ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ
جب وہ دو سال کی تھی تو بہت بیمار پڑ گئی تھی۔ ہمارے
گھر کے بغل میں رہنے والے جمن بابا نے کاغذ پر لکھ کر کچھ دیا
تھا جسے ماتا جی نے چاندی کے ڈبے میں بند کر کے رادھا کے گلے
میں ڈال دیا تھا اور اس پر اس کا نام لکھوا دیا تھا"۔۔۔

۔۔۔ میں اس کے خیال میں کبھی اتنا بے خود ہو جاتا
ہوں اور کھو جاتا ہوں کہ مجھ سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔" اور
وہ رونے لگا تھا۔

ایک تو رادھا کو اس بات کی ندامت تھی کہ اس نے
اس کے ساتھ بہت ہی برا برتاؤ کیا تھا۔ اور پھر اس کی المناک
کہانی نے اسے بے حد متاثر کر دیا اور وہ اسے اپنی گاڑی پر
بٹھا کر گھر لے آئی۔ رادھا کا باپ بھی اس کی کہانی سن کر بہت متاثر
ہوا۔ لیکن جب وہ کہانی سن رہا تھا تو اس کے باپ کے چہرہ کا
رنگ کچھ بدل سا گیا تھا اور کہانی کے آخری حصے کو سن کر
وہ چونک پڑا۔ اس نے غور سے اس نوجوان کی طرف دیکھا
سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا پھر وہ کسی گہرے سوچ میں
ڈوب گیا۔ اور کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد اس نے
اس نوجوان کو اپنے یہاں رہنے کی صلاح دی اور معمولی انکار
کے بعد وہ نوجوان وہاں رہنے پر آمادہ ہوگیا۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی رادھا کی بیسویں
سالگرہ آئی۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی سالگرہ کی پارٹی
میں بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ مگر رادھا کا باپ، خلاف
معمول بہت خاموش اور اداس نظر آ رہا تھا۔ لیکن ہمیشہ
کی طرح پارٹی کے اختتام پر حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے
ایک مختصر سی تقریر کی جس تقریر سے نہ صرف وہ نوجوان اور
رادھا حد سے زیادہ چونک کر ایک دوسرے کی طرف
دیکھنے لگے، بلکہ تمام حاضرین رادھا اور اس نوجوان کی
طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ رادھا کے باپ نے
بتایا کہ یہ جوان دراصل رادھا کا سگا بھائی تھا جس کا
واپس مل جانا سب بھگوان کی لیلا ہی تھا۔ لیکن رادھا
کے تجربہ کار باپ نے بھگوان کی لیلا پر کچھ زیادہ بھروسہ نہیں
کیا اور خفیہ طور پر اس کا تجزیہ کرنے لگا۔ کیا سچ مچ وہ رادھا
کا بھائی کشور ہی تھا۔ اور اب وہ مطمئن تھا کہ کشور اور رادھا
سگے بھائی بہن تھے۔ اور اس دن رادھا کے باپ نے لگے ہاتھوں
یہ بات بھی ظاہر کر دی کہ رادھا اس کی بیٹی نہیں بلکہ بھتیجی تھی۔
اور اب وہ بہت خوش تھا کہ اس کی اتھاہ دولت وجائداد
کا وارث اس کا بھتیجا بھی زندہ تھا

کشور یک لخت ایک بہت بڑی جائداد کا مالک بن گیا
اور اس کی دنیا بدل گئی۔ اور رادھا اپنے کھوئے ہوئے
بھائی کو پا کر حد سے زیادہ خوش تھی۔ لیکن ایک دن جب وہ کالج

ظفر اقبال



پژمردہ گلاب

رات پوری طرح جوان تھی چاند جاگ رہا تھا۔ تاریکی دم توڑ چکی تھی۔ اور سکوت کا ایک لامتناہی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ ماضی کی رنگین یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ آج وہ جاگنا چاہتا تھا۔ کیونکہ آج کی رات اس کی زندگی کی سب سے حسین اور خوبصورت رات تھی۔ آج وہ ساری باتیں یاد کرنا چاہتا تھا اور پھر وہ ماضی کے حسین دھندلکوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

جہاں عائشہ تھی۔ اس کے قہقہے تھے پیار اور محبت بھری باتیں تھیں جب وہ کبھی غمگین یا اداس ہوتا تو عائشہ کی محبت بھری باتیں اسے تسکین دیتیں۔

اس کو وہ شام ابھی تک یاد تھی جب عائشہ نے اس سے بڑے بھولے پن سے پوچھا تھا محمود بھائی محبت کیسے ہوتی ہے۔

تو وہ اس کی اس معصومیت پر مسکرائے بغیر نہ رہا تھا۔

عائشہ اس کی ماموں زاد بہن تھی۔ وہ پڑھنے کی غرض سے اپنے ماموں کے یہاں رہتا تھا۔ عائشہ سے اس کو بچپن ہی سے دلی لگاؤ ہو گیا تھا۔

محمود کا بی۔ اے فائنل تھا اور عائشہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ محمود یونیورسٹی سے سیدھا مکان آتا۔ یہی وہ مکان تھا جہاں کبھی اس کی طبیعت لگتی نہ تھی لیکن اب عائشہ کے مترنم قہقہوں اور سحر انگیز نگاہوں نے کچھ اس طرح اسے الجھا لیا تھا کہ شہر کی دوسری مصروفیات سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اور وہ دیوانہ وار مکان پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔

عائشہ کا خالہ زاد بھائی سعید محمود کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا تھا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی کافی جائداد پر وہ اپنی زندگی عیش و عشرت سے کاٹ رہا تھا۔ انٹرنس میں تین سال فیل ہو چکا تھا۔ اب چوتھی بار پھر کوشش کر رہا تھا سعید عائشہ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ اس کو منہ نہ لگاتی جس کی وجہ سے وہ اور بھی محمود سے جلنے لگا تھا۔

عائشہ کے باپ عنایت حسین کئی کارخانوں کے مالک تھے۔ شہر میں اثر و رسوخ تھا۔ ایک شاندار کوٹھی میں رہتے تھے۔

اس کے باپ دو سو روپیہ پانے والے ایک کلرک جس پر چھ آدمیوں کا بار اور ایک جوان بہن کی شادی کا سوال ——؟

یہ تمام خیالات اکثر اسے پریشان کر دیتے۔ کہ عائشہ کو وہ اپنا سکے گا یا نہیں۔ محبت کا انجام کیا ہوگا امیری اور غریبی نے ہم دونوں کے درمیان تفریق کی جو دیوار بنا دی ہے۔ کیا اسے میں ڈھا سکوں گا۔

رات کو عائشہ جب اس سے پڑھنے آتی تو پڑھنے

کے بعد وہ اس سے مختلف مسائل پر بات چیت کرتا رہتا اور وہ ہوں، ہاں کرتی رہتی کبھی کبھی خاموش فضا میں اس کے قہقہے بھی گونج جاتے اور محمود کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔

وقت گزرتا گیا اور عائشہ کی محبت اس کے دل میں پروان چڑھتی گئی اس نے ابھی تک اپنی محبت کا اظہار عائشہ سے نہیں کیا تھا۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا مگر عائشہ کے سامنے پہنچ کر اس کی زبان گنگ ہو جاتی۔

ایک دن جب وہ کالج سے آیا تو اسے عائشہ نظر نہ آئی اس نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ وہ وہاں بھی نہ تھی تب وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور اندر کسی کی آہٹ پا کر وہ دروازے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ جھانک کر دیکھا تو عائشہ اس کی تصویر ہاتھوں میں اٹھائے غور سے دیکھ رہی تھی۔ محمود! تم کتنے بے مروت ہو۔ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ مگر تم ....

اور پھر وہ اپنا جملہ نہ پورا کر سکی۔ کیونکہ محمود کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر شرم سے دوہری ہو گئی جلدی سے تصویر رکھ کر اس نے بھاگنا چاہا۔ مگر محمود نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کون بے مروت ہے عائشہ؟ محمود نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔"

وہ نظریں جھکائے کھڑی رہی اس وقت عائشہ اسے بہت خوبصورت لگ رہی تھی اس کی شرم آلود پیشانی پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ اسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا وہ بے اختیارانہ لہجے میں بولا۔ عائشہ! میں تم سے والہانہ محبت کرتا ہوں اور تم مجھے بے مروت کہتی ہو۔ یہ کہہ کر اس نے عائشہ کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ وہ شرم و حیا کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی اس نے بڑھ کر اس کی پیشانی کی چوم لی۔"

اس کی پیشانی پر سلوٹیں چڑھ گئیں۔ شرم و حیا میں ڈوبی ہوئی عائشہ اس وقت غم و غصہ میں ڈوبی ہوئی تیز معلوم ہونے لگی۔ اس نے محمود پر ایک غصیلی نظر ڈالی، اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ وہ مبہوت بنا کھڑا رہا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد نڈھال ہو کر مسہری پر گر پڑا۔

اس واقعہ کے بعد کئی دن عائشہ اس سے پڑھنے نہ آئی۔ محمود کو اس واقعہ کا بہت افسوس تھا۔ وہ سوچتا "معافی مانگ لوں" مگر پھر اس کی ہمت نہ پڑتی اسی طرح دن بیتتے گئے اور امتحان کو صرف ایک ہفتہ رہ گیا دونوں امتحان کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔

امتحان ختم ہوتے ہی محمود اپنے گھر جانے کی تیاری کرنے لگا جانے سے پہلے اس کی یہ خواہش تھی کہ عائشہ سے معافی مانگ لے

تاریکیاں سے گلے ملتی ہوئی ایک شام کو عائشہ گلاب کے پودوں کے پاس اداس کھڑی گلاب کے خوبصورت پھولوں کو دیکھ رہی تھی کہ کسی کے ہاتھ کا دباؤ اسے اپنے کاندھے پر محسوس ہوا۔ وہ چونک کر مڑی۔

"محمود بھیا ." آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

"عائشہ مجھے معاف کر دو" محمود کی تھرتھراتی آواز اسے سنائی دی۔

اور عائشہ نے کچھ کہے بغیر اپنا سر اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔

"مت رو عائشہ" اس نے اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔

"محمود اکل تم چلے جاؤ گے مجھے بھولو گے تو نہیں"۔

"نہیں عائشہ! میں بھلا تم کو بھول سکتا ہوں۔ تم تو میری زندگی ہو۔ مجھے ہر دم تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ وہ درد بھرے لہجے میں بولا۔

محمود کو دور سے سعید آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے

جلدی سے عائشہ کا سر اپنے کاندھے سے الگ کر دیا۔ عائشہ نے محمود کے کالر میں گلاب کا پھول لگاتے ہوئے کہا

میری محبت کا حقیر نذرانہ ..... "

عائشہ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اس کی مہک مجھے ہر دم تمہاری یاد دلاتی رہے گی۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی محبت کا گلاب کبھی پژمردہ نہ ہونے دوں گا۔"

دوسرے دن عائشہ نے اسے آنسوؤں کے سائے میں رخصت کیا

دن گذرتے رہے محمود کو نوکری نہ ملی مسلسل بیکاری سے تنگ آکر وہ اپنے دوست عارف کے پاس چلا گیا تھا۔ عائشہ سے بچھڑے تقریباً دو سال کا عرصہ ہو رہا تھا اور وہ بی۔اے کا فرسٹ ڈویژن سارٹیفیکٹ لئے نوکری کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ عارف نے اسے نوکری دلانے کی امید دلائی تھی۔ تب سے وہ عارف ہی کے یہاں مقیم تھا۔

جب سے اس کے ماموں نے اس کے باپ سے یہ کہا تھا کہ اگر محمود کو اچھی ملازمت مل گئی تو میں محمود کو اپنا داماد بنانے میں خوشی محسوس کروں گا۔ ورنہ نہیں۔

تب سے اس کو اپنی ملازمت کی بہت فکر تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی عائشہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ عائشہ کے بغیر اس کی زندگی کے سارے خواب ادھورے تھے۔ اس کی جدوجہد کا سلسلہ اور بڑھ گیا۔ وہ رات دن اسی کوشش میں سرگرداں رہتا کہ کوئی اچھی سی نوکری اسے مل جائے تاکہ وہ عائشہ کو ہمیشہ کے لئے اپنا سکے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکے۔

مسلسل دوڑ دھوپ اور عارف کی کوششوں سے ایک اچھی سی ملازمت آج مل گئی تھی وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا اور جلد از جلد اپنی نوکری کی خوشخبری عائشہ کو سنا دینا چاہتا تھا۔

بڑی رات تک عارف کے یہاں اس کے دوستوں کا جمگھٹا لگا رہا۔ ہنسی قہقہے ابلتے رہے اور جب سب لوگ سو گئے تب بھی وہ جاگتا رہا۔ اس کے ذہن کے دریچے سے یادوں کا سیلاب نکل نکل کر بہہ رہا تھا۔ وہ ماضی کی حسین و رنگین یاد میں کھویا ہوا تھا۔ پھر نہ جانے کب وہ نیند کے ہنڈولوں میں سو گیا۔

صبح اٹھ کر اس نے سب سے پہلے اپنے گھر اور ماموں کو تار کے ذریعہ اپنی نوکری کی اطلاع دی اور جب وہ بازار سے خوش خوش گھر آیا تو اس نے دیکھا عارف اداس اور پژمردہ بیٹھا ہوا ہے۔ اسے عارف کی اداسی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ "کیا بات ہے عارف " تم اداس کیوں ہو؟" محمود نے محبت سے پوچھا۔ اور عارف نے کچھ کہے بغیر ایک خوبصورت سا چھپا ہوا کارڈ تھما دیا۔

وہ کارڈ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ سعید اور عائشہ کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں چند لمحے کھڑا رہا پھر سوٹ کیس کھول کر اس نے ایک خوبصورت سی ڈبیا نکالی جس میں مرجھایا ہوا گلاب کا ایک پھول رکھا تھا جس کی پنکھڑیاں سوکھ گئی تھیں۔ وہ مرجھائے ہوئے پھول کو اپنی آنسو بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا کھڑکی سے اندر داخل ہوا۔ اور گلاب کی مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں ایک ایک کر کے کمرے کے فرش پر بکھر گئیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے بہہ بہہ کر زمین پر بکھری ہوئی گلاب کی پنکھڑیوں میں جذب ہو رہے تھے۔

اس کی دنیا تاریک ہو چکی تھی اور آشاؤں کے پھول بکھر گئے تھے۔

یوسف جمال

شیشہ کی تلوار

کینوس پر ایک ادھوری اور نامکمل تصویر تھی۔ وہ ہفتوں سے یہ تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ تصویر بنانے سے پہلے اس نے گھنٹوں اپنے حسین تخیلات کی لطیف رعنائیوں کے جھرکوں میں رنگوں کا امتزاج لیا، اور جب ست رنگی دھنک پہ اس نے خوابوں کے انمول شاہکار کو ترتیب دی تو کینوس پر اسکیچ کھینچنے لگا۔ بڑی کاوش اور انتھک لگن کے بعد تصویر آج مکمل ہوئی۔ دیر تک اس کی نظر تصویر پر جمی رہی۔ جھیل کے کنارے ایک سایہ دار درخت کے نیچے حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی ایک لڑکی بیٹھی پُرامید نگاہوں سے سورج کو دیکھ رہی تھی جو دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہا تھا۔ جو ایک حسین مستقبل کا پیغام لا رہا تھا۔ ایک حسین مستقبل — جہاں کچی کلیوں کے خواب مسکراتے ہیں اور آرزوؤں کے پھولوں پر بہار ناز کرتی ہے یہی سب کچھ اس نے اپنی تصویر میں پیش کیا تھا۔ وہ اپنے اس شاہکار پر مسکرا اٹھا

"اجنبی!" فضا میں ایک نغمگی ابھری، فضا چہک اٹھی، اس نے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک پری پیکر حسن کی جیتی جاگتی ساحرہ کھڑی تھی۔ اس کی تصویر سے بھی زیادہ حسین۔ اس نے خیالوں سے بھی بالاتر جس میں رنگوں کی مصنوعی نمائش نہ تھی ایک حقیقی رنگ ایک نایاب حسن جو قدرت نے بیش بہا سانچے میں ڈھلی معلوم ہو رہی تھی۔ رنگ و نشاط میں ڈوبے ہوئے کئی لمحے بیت گئے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"ثمینہ!" اس کے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی ابھر آئی۔ پھر بھی وہ اجنبی کی طرف دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اجنبی کی آنکھوں میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔ اور اجنبی بھی اسے تک رہا تھا۔

اجنبی خود حیران تھا کہ اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی۔ وہ تو لڑکیوں سے ہمیشہ کتراتا تھا ان سے نظریں ملانا تو درکنار ان کے سائے سے بھی دور بھاگتا تھا۔ اسکی زندگی میں اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ تھا۔ شام کی تنہائی میں ایک خوبرو اور نوجوان لڑکی کا ساتھ۔ اس میں اتنی جرأت، اتنا حوصلہ کہاں سے آیا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش نے جنم لیا۔ راستہ اتنا طویل ہو جائے کہ وہ عمر بھر — اس کے ساتھ چلتا رہے — اور — وہ اپنی اس خواہش پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

ثمینہ قبیلے کے سردار عقرب کی لڑکی تھی۔ عقرب اپنے قبیلے کا سب سے معتبر شخص مانا جاتا تھا۔ اونچا تڑا چوڑی

پیشانی دو بڑی بڑی خون میں ڈوبی ہوئی سرخ آنکھیں اسکی آواز کافی پاٹ دار تھی جیسے کوئی سیکڑوں فٹ کی گہرائی سے بول رہا ہو۔ وہ قبیلے میں بڑا ہی سنگدل اور تندمزاج مشہور تھا۔ اگر ذرا سی بھی کسی سے لغزش ہو جاتی تو عقرب اسے اذیت کوس اور سوہان روح سزا دیتا کیونکہ یہی ان کے دیوتا کا حکم ہوتا۔ دیوتا کا فرمان عقرب کو پجاری کے ذریعہ ملتا تھا۔ پجاری ـــــ پجاری جس کی ایک آواز پہ پورا قبیلہ سرنگوں ہو جاتا۔ عقرب تو محض نام کا سردار تھا۔ قبیلے کی باگ ڈور تو پجاری کے ہاتھ میں تھی ـــــ اس کے حکم سے سرتابی کرنے والے کو دیوتا کے سامنے جلتے ہوئے الاؤ میں بڑی بے رحمی سے ڈال دیا جاتا۔ اور یہ فرض عقرب کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔

"تم میری تصویر کیوں بنا رہے ہو ــــ ؟"

اس لئے کہ کبھی تمہاری جدائی کا احساس نہ ہو تم ہر وقت ہر لمحہ میرے پاس رہو تاکہ تمہاری مدھ بھری آنکھوں کی گہری جھیل میں ڈوبا رہوں۔"

کیا تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے کہ میری جدائی بھی برداشت نہ کر سکو۔"

"ثمینہ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے ؟؟"

"میں اس آنے والے لمحے سے کانپتی ہوں۔ میں اپنے باپ سے ڈرتی ہوں۔ سارا قبیلہ اس سے ڈرتا ہے۔ رحم نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں۔ اور جب اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں تم سے روز ملتی ہوں تو ....." اس خیال سے ہی اس کے پورے جسم میں خوف و ہراس کی ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ اس کے جسم سے ٹھنڈا پسینہ آنے لگا پھر دھڑکنے لگی ــ پجاری چاہتا ہے کہ اس کے لڑکے نیل گری سے میری شادی کر دی جائے اور میرا باپ پجاری کی بات کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ حالانکہ قبیلے کے سبھی لوگ جانتے ہیں نیل گری ایک اوباش قسم کا آدمی ہے دن رات شراب میں غرق رہتا ہے آئے دن اس کے پہلو میں نئی نئی لڑکیاں ہوتی ہیں اور یہ سب کام نیل گری کا معتمد خاص ابرق کرتا ہے۔"

نوجوان اس کی باتوں کو غور سے سنتا رہا چند لمحوں کے بعد بولا۔"

ثمینہ، تم کیسی باتیں کر رہی ہو تم جانتی ہو کہ محبت کرنے والے پر اس دنیا نے اس کے سماج نے کبھی عقیدت کے پھول نچھاور نہیں کیے۔ محبت کے نام پر نفرت و حقارت کے شعلے برسائے۔ ان پر سنگ باری کی پھول کی جگہ کانٹے بچھا دیئے گئے۔ ان پر ناقابل تسخیر ظلم کئے گئے ـــ اور ـــ اور محبت کی پہلی منزل کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ جو محبت کا اہل ہوتا نہیں جس کی محبت کی بنیاد میں کمزوری ہوتی ہے وہ سماج اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے سامنے ایک شکست خوردہ جواری کی طرح ہار مان لیتا ہے۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی سے مقابلہ کر سکے۔ اور جو محبت کرتا ہے اور جو حقیقت کو سمجھتا ہے کوئی بھی طاقت اسے اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ محبت قربانی مانگتی ہے ثمینہ ــ قربانی ـــ اور جانتی ہو اس قربانی کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کی جدائی یا موت! جو بچ جاتا ہے وہ ساری زندگی اپنی محبت کی یاد میں گزار دیتا ہے۔ کیا ہوا، اگر تمہارا باپ ظالم ہے تمہاری شادی نیل گری سے کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے پیار اور سچی محبت کرتے ہیں تو یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم دوسرے جنم میں ملیں گے کسی دوسرے روپ میں یہ ہمیں کتنی بار ملنے سے روکیں گے۔ کتنی بار ہمیں ماریں گے۔

ایک نہ ایک دن ان کے بازو شل ہو جائیں گے۔ یہ تھک کر چور ہو جائیں گے۔ ثمینہ محبت کبھی شکست نہیں کھاتی۔ اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اتنا اونچا ہے جہاں رفعتوں کی بلندی بھی شرماتی ہے اور ......" ثمینہ کی چیخ غیر ارادی طور پر نکل گئی۔ نوجوان چونک اٹھا۔ اس کے سامنے عقرب کھڑا تھا۔ عقرب کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اتنی تیز کہ ہر چیز کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی۔ نوجوان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر پہلے وہ دنیا کی ہر طاقت سے لڑنے کو تیار تھا۔ اس کے دل میں ایک بلند حوصلہ اور عزم تھا تمام دشوار مراحل کو طے کرنے کا عزم ——— اور وہ سکتے میں رہ گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ عقرب کی خونی آنکھیں اس کے جسم کی پوری قوت کو سلب کر رہی ہیں۔ عقرب کے بدلے ہوئے بھیانک تیور دیکھ کر اس میں لب کشائی کی ہمت نہ ہوئی ——— اور عقرب ——— اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

ثمینہ!" اس کی آواز میں شیر کی گرج تھی۔ کیا تم اپنی حیثیت بھول گئی کہ تم کس کی بیٹی ہو۔ میں کون ہوں؟ ایک غیر قبیلے کے شخص سے پیار کرنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ قبیلے میں میری رسوائی ہو۔ میری عزت خاک میں مل جائے۔ اور ایک مجرم کی طرح مجھے نادم اور شرمندہ ہونا پڑے؟ جواب کیوں نہیں دیتی۔ تمہاری یہی خواہش ہے کہ پجاری کے سامنے لوگ میرا مذاق اڑائیں میری سرداری چھین لی جائے ———؟؟ اور اس کے بعد وہ نوجوان سے شعلہ ریز آنکھوں سے مخاطب ہوا۔

نوجوان تم ثمینہ کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے ثمینہ کی شادی مقدس دیوتا کے پجاری کے لڑکے نیل گری سے ہوگی اور آنے والے ہفتہ میں قبیلے کے رسم و رواج اور دیوتا کے حکم کے مطابق اس جشن میں ثمینہ اور نیل گری کی شادی کی رسم ادا ہوگی۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ دیوتا کا حکم ہے۔ حالانکہ نیل گری مجھے خود بھی پسند نہیں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ اسے سزا دے نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ دیوتا کے پجاری کا لڑکا ہے۔ پجاری ہم سے ناراض ہو جائے گا تو ہم سے دیوتا آنکھیں پھیرے گا۔ اور پھر تباہی و بربادی شروع ہو جائے گی ——" اور یہ کہہ کر وہ ثمینہ کو گھسیٹ کر لے گیا۔

رات ابتدائی منزل طے کر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی نے ماحول پر ایک عجیب نشہ طاری کر رکھا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپ سے فضا کانپ اٹھی۔ سناٹا ٹوٹ گیا۔ عقرب چونک اٹھا۔

"اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے ———؟ اور کچھ سوچ کر برق رفتاری سے ثمینہ کے کمرے کا رخ کیا ثمینہ بستر پر نہیں تھی۔ اس کا پتہ نہیں تھا۔ آنے والے لمحے کے تصور ہی سے وہ لرز گیا اور نیل گری کے کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔ نیل گری بھی موجود نہ تھا ——— اور کچھ دیر بعد ——— اپنے سب سے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر ایک طرف چل پڑا۔

نیل گری سامنے کھڑا تھا۔ اور اس کا وفادار ساتھی ایرق نوجوان اور ثمینہ کو ایک درخت سے باندھ رہا تھا نیل گری سخت لہجے میں کہہ رہا تھا "نوجوان شاید تم نیل گری کو نہیں جانتے۔ وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے خواہ جس طریقے سے ہو اسے حاصل کر کے چھوڑتا ہے۔ تم ثمینہ کو لے کر بھاگ رہے تھے۔ جانتے ہو ثمینہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ گر میں کسی لڑکی کو زندگی بھر گلے کا ہار

بنانا نہیں چاہتا۔ روزانہ میرے پہلو میں نئی نئی لڑکیاں آتی ہیں۔ شادی سے پہلے میں ثمینہ کے ساتھ ایک رات گزارنا چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی اور میں اس بڈھے سردار سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔ جو مجھ سے نفرت کرتا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیل گئی "اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" نیل گری نے میان سے تلوار نکالی کہ ایک عجیب اور دل ہلا دینے والا منظر سامنے آیا نیل گری کی گردن خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھی۔ دھڑ ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ نیل گری کا ساتھی کچھ دیر کے لیے ہوش باختہ ہو گیا اور پھر بجلی جیسی سرعت کے ساتھ ایک جست لگا کر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ عقرب کی تلوار خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے۔ وہ نوجوان اور ثمینہ کی طرف بڑھا۔ دونوں نے خوف سے اپنی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح تیز تیز چل رہی تھی۔ بس کچھ ہی دیر کے بعد نیل گری کی طرح ان کا بھی یہی انجام ہو گا۔ عقرب ان کے سامنے آیا۔ دونوں کو بہت غور سے دیکھا۔ دونوں کتنے معصوم لگ رہے تھے کتنی پیاری جوڑی تھی دونوں کی اور وہ مسکرا دیا۔ تلوار فضا میں لہرائی۔ درخت میں بندھے ہوئے رسی کے بند ایک جھٹکے کے ساتھ کٹ گئے۔ دونوں چونک کر عقرب کو دیکھنے لگے۔ عقرب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ دونوں کو سینے سے لگائے کہہ رہا تھا۔

تم لوگ یہاں سے جتنی جلد ہو سکے چلے جاؤ۔ کیونکہ صبح ہوتے ہی پجاری کے آدمی چپے چپے میں پھیل جائیں گے اور وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہو سکتا ہے۔ صبح تک زندہ نہ رہوں۔ جاؤ میرے بچو! دیوتا تمہاری حفاظت کرے گا جتنی جلد ہو سکے چلے جاؤ۔ وقت برباد نہ کرو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

اور پھر۔ دو گھوڑے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ اک گمنام منزل کی طرف۔

۔۔۔ عقرب چند لمحوں تک ان کو دیکھتا رہا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر کا انسان جاگ پڑا ہے۔

اور پھر بڑی تیزی سے گھر کی طرف اس کے قدم اٹھ گئے۔!!!

بزمِ شاخسار

علی عباس حسینی - لکھنؤ :

شاخسار کے دو نمبر ملے - اپنی علالت کی وجہ سے پہلا شمارہ نہ دیکھ سکا - نمبر ۲-۳ لیٹے لیٹے پڑھ ڈالا - بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے کلک جیسے مقام سے ایسا معیاری رسالہ نکالا - میں اس کی ترقی اشاعت کے لئے دست بدعا ہوں -

زیر نظر نمبر کے مضامین نثر میں سے کئی ہمارے علم و آگہی میں اضافہ کرتے ہیں - مثلاً شیخ محمود بابیسری صاحب کا جدید اڑیا ادب، یا حفیظ اللہ نیولپوری کا "اڑیسہ کا منڈا قبیلہ" اردو داں طبقہ کے لئے اس طرح کی معلومات فراہم کرنا، خواہ وہ ادبی ہوں یا معاشرتی یا اقتصادی، اخلاقی ہوں یا حکیمانہ، ایک اہم علمی خدمت ہے - میری طرف سے ان حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کر دیجئے -

البتہ ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب کی "غلط کار قلم کاری" اس نمبر میں کچھ عجیب چیز نظر آئی - اس مقالے یا انشائیہ کی سرخی تک ہم بڈھوں کو کھلتی ہے - نفسِ مقالہ کی ابتدا ہی میں انھوں نے اردو نثری ادب کی کم مائگی کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ قابل اعتراض ہی نہیں، دلخراش بھی ہیں - ملاحظہ ہوں جگہ جگہ سے چند جملے :-

(۱) "ہمارا اگلا نثری سرمایہ محض داستانوں اور مضامین جیسی بے ڈھنگ و بے ضابطہ نگارشات پر مشتمل تھا"

(۲) "علم کی گوناگوں ترقی سے ہمارے ذہن کے بند دریچے کھلے اور کھلے دریچوں سے تھوڑے تھوڑے وقفوں پر براق روشنیاں بھی آتی گئیں - احساس بیداری اور عالم شعور کے بعد ہم میں غیر جانبدارانہ غور و فکر کی عادت آئی"

(۳) "پیروی مغرب سے ہم نے فن کاری کے گُر جاننے اور قلم کا آرٹ پہچانا - ہم نے سمجھا کہ ہر تحریر نہ ادب ہو سکتی ہے اور نہ ہر قسم کی قلم بندی کو قلم کاری کا مرتبہ و مقام حاصل ہو سکتا ہے"

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو صرف اتنا کہنا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے پہلے اردو نثر نگاری کی طرف باقاعدہ توجہ نہیں کی گئی تھی جب مغربی تعلیم کا رواج عام ہوا، تو اس صنف ادب کی طرف خاص طور سے توجہ کی گئی اور فارسی و عربی نثر کی جگہ انگریزی نثر کی تقلید میں نثر کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی گئی - اتنی سی بات کو جس قدر ستر ھویں، اٹھارویں صدی کے ادیبوں کو جن کے پیش نظر صرف عربی و فارسی نثر کے نمونے تھے اور جو اردو میں نثر نگاری کو اپنی توہین سمجھتے تھے، برا بھلا کہکر جاہل اور غیر مہذب قرار دیا گیا ہے - وہ تمہید کے ابتدائی منقولہ حصوں سے ظاہر ہے اب چونکہ یہ کہنا تھا کہ آشفتہ بیانی مری (رشید احمد صدیقی) روشنائی (سجاد ظہیر) اور لکھنؤ کی پانچ راتیں (سردار جعفری) کی تصنیفات ڈاکٹر موصوف کے مقرر کردہ اصناف نثر کے کسی خانے، ڈربے یا مک میں بند نہیں کی جا سکتی ہیں - اس لئے وہ ادب پارے نہیں کہی جا سکتی ہیں - اس کے لئے جو طویل تمہید لکھی گئی ہے اس کے

چند جملے مختلف مقامات سے ملاحظہ ہوں:

(۱) "ادب، انسان، مہذب و متمدن انسان کی حسی و ذہنی کاوشوں کا تحریری عکس ہے۔ یہ عکس مگر کسی بات یا خیال کی محض قلم بندی نہیں ہے۔ نوشت و خواند ہر انسان کی مہذب و باادب سماجی زندگی کی علامت ہے۔ ادب کو نگارشات کا جنگل قرار دینا بے ادبی ہے، کھلی بدتہذیبی۔"

(۲) "نہ صرف ظاہری یا ہیئتی بلکہ باطنی و بطنی طور پر بھی بلحاظ زمان و ادب یہ تحریروں کا اپنا مقام و مرتبہ ہوتا ہے۔ یہ اپنا خاص جسم و خاص مزاج رکھتی ہیں۔ مجہول النسب افراد کی طرح تحریریں بھی مجہول الصدف ہو سکتی ہیں، اور ہوتی ہیں۔ ادبی پذیرائی کے باوجود اکثر تحریریں جو تحقیقات کی شکل میں عالم وجود بھی حاصل کر لیتی ہیں، اصل النسل نہیں ہوتیں۔ یہ حوالہ یا یہ کم نسبی ان تحریروں کی صورت و سیرت کی ناہمواری ہے اور ان کی صنفی بے ضابطگی، یہ کم نسلی تحریروں میں خیال و بیان کی غیر مناسب جدت اور اسفل و اکستگی ہے۔"

تمہید میں اس قدر گہر افشانی فرمانے کے بعد "شگفتہ بیانی، روشن نمائی اور منٹو کی پانچ راتیں" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

(۳) "رشید احمد صدیقی، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی مذکورہ بالا مطبوعات کو عجیب الخلقت تصنیفات کہنا، آپ خود غور کریں، نامناسب نہ ہوگا۔ یہ غلط کار قلم کاری کا نمونہ ہیں۔ یہ ایسی بے وضع، بد ترتیب اور بد سلیقہ ادبی تحریریں ہیں، جو ادب اور ذوق ادب دونوں پر داغ ہیں" اور آخری جملہ ان تصنیفات کے متعلق یہ ہے:

"غلط کار قلم کاری سے تحریروں کا جنگل تیار کیا جا سکتا ہے۔ تہذیب و ادب میں نگارستان کی تعمیر ہو سکتی؟"

میں نے اہل نظر کے لئے قابل غور فقروں پر خط کھینچ دیا ہے۔ نہ میری صحت اس کی اجازت دیتی ہے کہ میں ان کے لسانی و نظریاتی و منطقی اغلاط سے بحث کروں اور نہ مجھے نوجوان ڈاکٹر صاحب سے کسی طرح کی ادبی آویزش کی خواہش ہی ہے۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اتنے بڑے ادیبوں کی تصنیفات کے سلسلے میں "بے وضع، بد ترتیب، بد سلیقہ" جیسے الفاظ کا استعمال ناجائز ہے اور اس سلسلے میں کسی بدتہذیبی، کم نسبی اور اسفل و اکستگی کی جیسی دشنام طرازی ہر طرح غیر مستحسن۔ اکثر بڑے ادیبوں کی تحریریں ہمارے بنائے ہوئے خانوں میں نہیں بند کی جا سکتی ہیں۔ سب سے بڑی الہامی کتاب قرآن حکیم ہی کو لے لیجئے۔ اسے نثر کے کس خانے میں ڈاکٹر صاحب رکھیں گے؟ اصول، قواعد و ضوابط، تخلیقات و تصنیفات کے وجود میں آنے کے بعد بنائے جاتے ہیں۔ اگر بفرض محال یہ تینوں تصنیفات مروجہ سانچوں میں ٹھیک نہیں بیٹھتیں، تو ڈاکٹر صاحب نئے الفاظ کی طرح نئے سانچے بنا لینا، خود ان کے مشفقوں سے دریافت فرمالیں کہ ان کی یہ تحریریں کس کا مک میں بند کی جائیں۔ غلط طرح کی چرب زبانی معلمین ادب کو زیب نہیں دیتی۔

افسانوی حصہ بہت ہی گراں پایہ ہے۔ جوگندر پال کا "سراپا" بہت ہی عمدہ نفسیاتی مطالعہ ہے۔ فنی لحاظ سے ان کی ہر کہانی کی طرح بہت ہی مکمل۔ خدا کرے، انگریزی کے اس معلم کا اردو ادیب بننے کا یہ شوق قائم رہے اور گرانقدر معاوضہ کی تحریص اسے منڈی کی طرف نہ کھینچ لے جائے۔!
اے۔ بی۔ انجم کی کہانی "اب اسے ڈھونڈھو چراغ رخ زیبا لے کر" اچھی چیز ہے۔ وقتی غم سے متاثر ہو کر ایک محبت بھرے دل کو ٹھکرا دینا اور پھر اس کے لاپتہ ہو جانے پر پچھتاوا بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ طارق جمیلی کی "سرسوتی کی موت" اگر آخری حصے میں پروپیگنڈے کے داغ سے بچالی گئی ہوتی، تو بے مثل ہو جاتی۔ بہرحال اس نوجوان میں ایک بڑے فن کار ہونے کی پوری صلاحیت ہے۔ ضرورت ہے کہ انہیں برابر لکھنے پر اکساتے رہیئے۔ احمد جمال پاشا نے اپنے خاص مزاحیہ رنگ میں "عزیز ماموں" کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ نسیم محمد جان کی "ریت کی دیوار" کی مامتا بڑے پیارے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ یہ سب حضرات قابل ستائش ہیں اور آپ مستحق مبارکباد کہ

آپ نے ایک ہی نمبر میں اتنی اچھی چیزیں پیش کر دیں۔

نظموں میں "میں نے دیکھا ہے تجھے" "موت کی نہر"۔ اور ونو ملک پوری کی "مراجعت" خاص طور سے پسند آئی۔ علیم اللہ حالی کی "خلا" اچھی چیز ہے۔ مگر مجھے محض اس لئے نہیں پسند آئی کہ میں ان نوجوان جدید شاعروں کی 'قنوطیت' سے گھبرا گیا ہوں۔ آخر یہ جوان بھی تو ہیں، ان کی رگوں میں گرم خون بھی تو ہے۔ ان میں زندگی سے لڑنے، اس پر فتح پانے۔ اس کے دکھ درد کو خوشی اور مسرت سے بدلنے کا جذبہ کیونکر بالکل نیست و نابود ہو گیا ہے؟ انہیں آخر مغرب کے نوجوانوں کی طرح ہر وقت کا رونا بسورنا کیوں پسند آ گیا ہے؟ جدیدیت کے اگر یہی معنی ہیں، تو خدا بچائے اس نامردوں والی جدیدیت سے۔ اس سے تو موجودہ شعراء اچھے کہ انہیں اپنی خودی پر اعتماد ہے۔ ان کے تجربے سنہرے ہوں یا تلخ وہ ساری آزمائشوں سے گذر کر زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں! مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر جدید شاعر اعصابی کمزوری کا شکار ہے ـــــ!

اس سلسلے میں پروفیسر کرامت علی کرامت صاحب کے قلم سے آپ کے رسالے کے حصہ نقد و نظر کی داد نہ دینا ادبی گناہ کے مترادف ہوگا۔ ان کی تنقید میں ایک طرح کی سلامت روی، توازن، باریک بینی اور غیر جانبداری ہے، جو آج کل کمیاب ہے۔ ان کی خدمت میں میرا سلام نیاز پہنچا دیجئے گا۔

معاف کیجئے گا خط خاصا طویل ہو گیا۔ خود بھی تھک گیا اور آپ کو بھی تھکا دیا۔ آخر میں آپ کے رسالے کی کامیابی کے لئے پھر دعا۔

مہدی پرتاپگڑھی ـــ پرتاپگڑھ

تازہ شمارہ ملا۔ کرم فرمائی کے لئے مشکور ہوں۔ مجھے آپ کا اداریہ بہت پسند آیا۔ آپ نے جدید شاعری کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے، وہ حقیقت سے بہت قریب ہے۔ کاش ہمارے شاعر اسی سے سبق سیکھیں اور منزل کے تعین میں اسے مشعل راہ بناتے۔

جی۔ ایم۔ راہی ـــ فتحپور

مشترکہ شمارے کی ضخامت میں خاصہ اضافہ کر کے آپ نے مارچ ۱۹۶۷ء کے شاخسار کی عدم اشاعت کی کمی بڑی حد تک پوری کر دی۔

"نقش اول" میں جدید شاعری کے روشن و تاریک پہلوؤں پر اثر انداز روشنی ڈالی گئی ہے۔ جدید شاعری کے بحران کا حل بعید از فہم نہیں ہے۔ مگر حامیان جدید شاعری اس ضمن میں سنجیدگی سے غور تو کریں۔

مقالے اور مضامین کا حصہ پہلے سے بہتر ہے۔ ٹھوس معلوماتی اور فکر انگیز مقالے متاثر کن بھی ہوتے ہیں اور سود مند بھی۔ پروفیسر کرامت علی کرامت اور علیم اللہ حالی کی نظمیں اور مخمور سعیدی، عنوان چشتی اور نازش پرتاپگڑھی کی غزلیں پسندیدہ ہیں۔ جوگندر پال، ڈاکٹر جاوید اقبال اور صبا اکرام کے افسانے بطور خاص پسند آئے۔ ویسے بحیثیت مجموعی سبھی افسانے اچھے ہیں۔

"بزم شاخسار" میں احمد شکور رقمطراز ہیں "مثلاً انور سیوانی ایم۔ اے سادات۔ جمال صاحبان کی کہانیاں کا پلاٹ دس پندرہ سال قبل کا ہے"؟ ارباب قلم بکھنے، محض لکھنے کی خاطر نہ لکھا کریں تو بہتر ہے۔ ٹھوس اور مدلل بات کا ہی قاری کے ذہن پر اثر ہو سکتا ہے۔ صرف یہ لکھ دینا کہ فلاں کہانی کا پلاٹ دس پندرہ برس پہلے کا ہے، قطعی ناکافی و غیر صحت مند تحریر ہے۔ اگر نقد و نظر کا یہی معیار رہا، تو ہر ادیب و شاعر کو جرم بیگناہی کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ فن کار تو بے چارہ مرکھپ کر معیاری تخلیق کو جنم دے گا اور یہ جدید ترین ناقدان فن، بیک جنبش قلم اس کی تخلیق کو پچاس ساٹھ برس قبل کی قرار دیکر سپرد خاک کر دیں گے۔ یہ جدید ترین آلۂ نقد و تبصرہ نرا مہلک ہے۔ مجھ پر اندیشۂ مستقبل لاحق ہو گیا ہے۔

مظفر حنفی بی، اے علیگ ۔ سیہور

اس بار "شاخسار" ڈاکٹر شاہین سے لے کر دیکھا۔ خوب
ے۔ لیکن جدید شاعری کی پوری نمائندگی نہیں کی گئی۔ سوائے پروفیسر
رامت صاحب کی ترجمہ کردہ نظم کے صحیح معنوں میں ایک بھی جدید نظم
س شمارے میں نہیں ملتی۔ ویسے منظومات کا پورا حصہ معیاری ہے۔
فریب، موت کی نہر، نوخیز نازک کلی، تضاد وغیرہ بھی جدید
نظمیں ہیں جن میں جدید انسان کی ذہنی پیچیدگیوں کا عکس نمایاں
ہے۔ (ادارہ)

سید محسن نقوی ۔ ڈیرہ غازی خاں

شمارہ نمبر ۲ و ۳ باصرہ نواز ہوا "شاخسار" کو پہلی بار
ں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ "اداریہ" سے لے کر "بزم شاخسار"
ک ہر موضوع کی نگارشات نہایت جمیل ہیں۔ مقالات میں "اقبال
ور اس کی شاعرانہ صلاحیت" لکھتے وقت تجمل فہمی علیگ نے نہایت
منت کی ہے "چند اہم خطوط" بھی ادبی لحاظ سے نہایت اہم حیثیت
کھتے ہیں۔

نظموں میں "فریب" "موت کی نہر" "یادیں" "نازک کلی"
ور "تضاد" اچھی نظمیں ہیں اور حصۂ غزل کے متعلق اتنا کہنا
چاہتا ہوں کہ بہت ہی حسین انتخاب ہے آپ کا۔

جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے "سونی مانگ بھری کلائی"
"ریت کی دیوار" "چراغ رخ زیبا لے کر" اور "کس کس کے ہاتھ
یرے گریباں الخ" نہایت ہی پیارے افسانے ہیں:

علقمہ شبلی ۔ کلکتہ

بہت دنوں کے بعد "شاخسار" کا مشترکہ شمارہ ملا۔ پہلے
سرورق ہی پر نظر ٹھٹکی۔ پھر فہرست دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔
آپ لوگوں نے مختلف مکتبۂ خیال کے لوگوں کو یکجا کر کے قابل قدر
مواد پیش کیا ہے۔ صوری و معنوی دونوں حیثیت سے ترقی ہوئی ہے۔

پیش نظر شمارے میں بیشتر نظمیں اور غزلیں اس قابل ہیں
کہ غور سے پڑھی جائیں۔ آپ کا ترجمہ اصل کی روح تک پہنچنے
میں بہت حد تک کامیاب ہے۔

"جدید انڈیا ادب" ایک معلوماتی مقالہ ہے۔ مختلف زبانوں
سے متعلق اس طرح کے مضامین بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہیں
جناب تجمل علی فہمی کا مضمون اقبال کے کسی نئے گوشے کو
سامنے نہیں لاتا "غلط کار قلم کاری" اور "آبجیات۔ ایک مطالعہ"
دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔

وصی اکبر ۔ رانچی

"شاخسار" کا مشترکہ شمارہ نگاہ سے گزرا۔ آپ نے زیر نظر
شمارہ میں کیسے کیسے بلند پایہ فن کاروں کو یکجا کر دیا ہے، کہ
بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسنین، پروفیسر انور سیوانی اور شیخ محمود کے
مقالات بڑی جاں فشانی اور عرق ریزی کے بعد ضبط تحریر میں
لائے گئے ہیں۔

پروفیسر کرامت علی کرامت کو منظوم تراجم کا جو سلیقہ ہے
وہ نکتہ سنجی اور بالغ نظری کا بیّن ثبوت ہے۔ پروفیسر کرامت علی
شاعری اور تنقید دونوں میدانوں کے شہسوار ہیں اور اپنی فن کاری
چابکدستی سے پوری طرح کام لیتے ہیں۔

جدید شاعری میں تلمیحات موجودہ دور کا اہم ترین موضوع
ہے۔ ندا فاضلی کی نظم "پیٹ" اس کی اچھی مثال ہے۔ اگر
یہ رجحان آگے بڑھتا رہا، تو اردو شاعری کا خدا ہی حافظ
ہے۔ جی۔ ایم راہی کی نظم کا عنوان "کاشانۂ نیاز فتح پوری"
بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ راہی صاحب نے صرف چار شعر تو
کاشانۂ نیاز سے متعلق کہے ہیں اور باقی تمام اشعار نیاز
صاحب کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔ اس لئے ان کی نظم کا عنوان
"نیاز فتح پوری" ہی ہونا چاہیئے تھا۔

غزلیات پسند آئیں۔ محمود سعیدی، نازش پرتاپ گڑھی

عنوان چشتی، حباب ہاشمی اور آوج اعظمی کی غزلیں حاصل شمارہ کہلانے کی مستحق ہیں۔ درج ذیل اشعار نے مجھے شدید طور پر متاثر کیا ہے؛

دن تو سو طرح کی باتوں میں گذر جاتا ہے
شام ہوتی ہے، تو دل اور بھی گھبراتا ہے

(مخمور سعیدی)

ہو نہ ہو ہے کہیں نزدیک ہی وہ جان حیات
دل دھڑکنے کی ادا بھول رہا ہے یارو

(نازش پرتاپگڈھی)

میری آنکھوں کی جھیلوں کی ویرانی پہ دھیان نہ دو
غم کا بادل وہ بادل ہے، کھل کر بھی برستا ہے

(عنوان چشتی)

نکال دی اسی نے جوئے شیر سنگلاخ میں
گذر گیا جو تیشۂ گراں سے کھیلتا ہوا

(حباب ہاشمی)

ہیں ہمیں راز غم دل کے امیں
اپنا غم ہم کو عطا کیجئے گا

(آوج اعظمی)

پرنسپل جوگندر پال، شوکت عظیمی اور محترمہ اے بی انجم کے افسانے اس شمارے کی جان ہیں۔

ک قوزان ۔ پورنیہ

"شاخسار" کا مشترکہ شمارہ موصول ہوا۔ سادگی اور پرکاری کا آئینہ دار ہے: مندرجات میں "نئی اور پرانی شاعری" پہ آپ کا اداریتی نوٹ، ڈاکٹر حسین صاحب کا "غلط کار قلمکار" اور "الزبیہ کا مقبرا قبیلہ" خاص طور پر پسند آیا۔ "موت کی نہر" کامیاب ہی نہیں بلکہ ایک بہترین اور قابل ستائش نظم ہے۔ خلا، مراجعت، اور ایک خواب، بھی اچھی تخلیقات ہیں نازش پرتاب گڑھی اور عنوان چشتی کی غزلیں بیحد پسند آئیں۔ ان کے علاوہ مہدی پرتاب گڑھی، محسن نقوی، اور ثریا محمود ندرت کی غزلیں بھی پسند آئیں "سراپا" "ریت کی دیوار" "اب اسے ڈھونڈ ..." "کس کس کے ہاتھ" اچھے افسانے ہیں۔ ان سب فن کاروں کو میری جانب سے دلی مبارکباد "شاخسار" ظاہری و باطنی دونوں لحاظ سے ایک کامیاب مجلہ ہے

شاہد ماہلی ۔ مرزاپور

"شاخسار" کا خاص نمبر ملا۔ میری غزل کا ایک شعر غلط شائع ہو گیا۔ شعر یوں تھا ؎

جذبات ہو سکیں گے نہ یارو کبھی اسیر
روکے سے رک سکیگی نہ فکر و نظر کہیں

اور ایک اچھا شعر نہ جانے کیوں شائع ہونے سے رہ گیا ؎

پھرتے رہے ہیں لیکے تہی دامنی کا درد
لیکن ملا نہ ہم کو کوئی چارہ گر کہیں

افسانوں میں جوگندر پال اور احمد جمال پاشا کافی پسند آئے۔

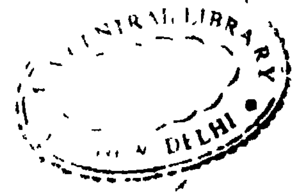
حق ایروی چھترپوری ۔ (مدھیہ پردیش)

"شاخسار" کافی پسند آیا۔ بہت سے نئے نام باصرہ نواز ہوئے افسانوں سے حصۂ نظم اور حصۂ نظم سے تنقید و تبصرہ کا پلہ بھاری ہے۔ افسانوں میں جوگندر پال کا "سراپا" پسند آیا۔ نظموں میں ندا فاضلی کی "موت کی نہر" کافی پسند آئی۔ اس کے یہ معنی قطعی نہیں کہ دیگر نظمیں اچھی نہیں ہیں۔ "خلا" "یادیں" "مراجعت" "وہ گھڑی کبھی نہ آئے" بھی اچھی نظمیں ہیں۔ جی ایم راہی کی نظم "کاشانۂ نیاز فتحپوری" پڑھ کر نیاز صاحب کی یاد شدید ہو گئی۔ غزلوں میں بھی کچھ اچھی غزلیں ہیں۔ پسندیدہ اشعار یہ ہیں؛

؎ کوئی جگنو کا کسی خوشبو کا جو آ جاتا ہے
مدتوں دشت خیالات کو مہکاتا ہے (مخمور سعیدی)

؎ تم میں واقف ہو جو کوئی تو کرے ذکر خلوص
میں نے یہ لفظ کتابوں میں پڑھا ہے یارو (نازش)





خالص تمباکو سے تیار کردہ

اکبری گڑاکو

آپ کے صحت مند دانتوں کا ضامن ہے

دانت کی ہر قسم کی بیماری اور مسوڑھوں کے درد کے لئے اکبری گڑاکو اکسیر
کا کام کرتا آرہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارا یہ مقبول ترین منجن آج ملک گیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔

اس کے استعمال سے فوراً جسمانی تھکن دور ہو جاتی ہے اور طبیعت میں فرحت و
سرور کی لہریں دوڑ جاتی ہیں

یہی وجہ ہے کہ لاکھوں لوگ روزانہ صبح اس کا استعمال کرتے ہیں۔

آپ بھی ایک بار آزمائیے

پتہ

شمس الدین اکبر خاں اینڈ کمپنی

بالو بازار، کٹک ۲۔ اڑیسہ





اُردو زبان کا منفرد علمی و ادبی مجلّہ

دو ماہی

شاخسار

کٹک

۱۹۶۷ء

تیسری جلد — پانچواں شمارہ

مدیرِ اعلیٰ

آمجد نجمی

●

ترتیب و تدوین

کرامت علی کرامت

●

ادارۂ تحریر

سید حرمت الاکرام

مظہر امام

حیدر نایاب

●

معاونین

محمد انور ـــــ احمد حسین آزاد

●

قیمت فی شمارہ ۵۰ پیسے ـــــ زرِ سالانہ تین روپے

پتے:۔ (۱) دفتر شاخسار، بخشی بازار، کٹک ۱

(۲) رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک ۱

امجد نجمی، مدیر، مالک و ناشر نے [illegible] پریس، [illegible] سے چھپوا کر دفتر شاخسار بخشی بازار کٹک ۱ سے شائع کیا

نقشِ اوّل

دیارِ حرماں کے میہمانو! یہاں بھلا ڈھونڈتے ہو کیا تم
مرے تصوّر کی سرحدوں تک نہیں ہے احساس خستگی کا

لفظ "جدید" کسی کرم خوردہ لغت کا فرسودہ لفظ نہیں۔ بلکہ اس کی نبض میں زندگی، تازگی اور توانائی کے آثار موجزن ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج کے خودساختہ جدید شعراء و ادباء میں سے کتنے ہیں، جو "جدیدیت" کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں۔ یا اس لفظ کا صحیح استعمال جانتے ہیں؟ مختلف رسائل میں اس سلسلے کے جتنے مضامین نظر سے گزرتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اکثر نئے ادیبوں کے ذہن میں "جدیدیت" کا تصوّر بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہے اور بین الاقوامی سطح پر "جدیدیت" کے تحت جو تجربے ہو رہے ہیں۔ ان سے یہ لوگ ناواقف ہیں۔ اس کا رواں ادب میں نئی شاعری کے کچھ فلسفہ طراز بھی شامل ہیں، جن کی دکھلائی ہوئی راہوں پر بغیر سوچے سمجھے یہ نئے شعراء گامزن ہیں۔ لیکن شاعری تو محض فلسفہ طرازی کا نام نہیں! یہی سبب ہے کہ یہ فلسفہ طراز دورِ جدید کے جس المیہ کی بنا پر اپنے نئے فلسفے کی عمارت قائم کرتے ہیں۔ اکثر نئے شعراء کے نزدیک اس المیہ کے احساس کی سچائی نظر نہیں آتی۔

ترقی پسندوں نے تو ایک غلطی یہ کی تھی کہ ان لوگوں نے غمِ روزگار کو زندگی کا سب سے بڑا المیہ قرار دے کر اس کے لئے اشتراکی واقعیت کو نجات کا واحد ذریعہ تصور کرتے ہوئے دوسری ہر قسم کی صحت مند اور صالح شاعری کو نظرانداز کر دیا تھا۔ اب نئے شعراء (جنھیں ترقی پسند کا (Reactionery Group) کہنا زیادہ مناسب ہوگا) دوسری غلطی یہ کر رہے ہیں کہ یہ لوگ محض داخلیت پسند المیہ شاعری کو ہی جدید شاعری تصور کر رہے ہیں۔ حالانکہ جدید شاعری کو اصولاً موجودہ طرزِ حیات کے ہر پہلو کی نمائندگی کرنا چاہیے۔ یہ سمجھی جانے ہیں کہ سائنس اور دیگر علومِ جدیدہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس وقت حیات و کائنات کا تصور کافی وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ خلائی سفر نے ذہنِ انسان کو نئے رومان سے دوچار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جدید انسان کے ان نادر اور وسیع تجربات کو محض داخلیت کی بند کوٹھری میں مقید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "ہندوستان کی طرزِ حیات میں وہ انتشار نہیں ہے، جو مغرب میں ہے اور اس لئے اردو شاعری میں اس انتشار کی عکاسی غیر فطری ہے" وہ لوگ غالباً بھول رہے ہیں کہ شاعر اپنی قوتِ متخیلہ کے ذریعہ اس المیہ کا احساس ضرور کر سکتا ہے، جو دوسروں پر گزر رہا ہے۔ کشمیر اور ویت نام کے لوگوں کے ذہن میں جو مایوسی، بے یقینی اور بے اطمینانی کا جذبہ پایا جاتا ہے، اس کا کسی نہ کسی حد تک احساس تو اردو شاعر کو ہو سکتا ہے۔ لیکن حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہ کر کے شتر مرغ کی طرح داخلیت کی ریت میں اپنا سر چھپا کر یہ محسوس کرنا "اب ہم محفوظ ہیں" کہاں کی عقلمندی ہے؟ کہنے کی غرض یہ ہے کہ محض داخلی شاعری ہی نہیں، بلکہ خارجی شاعری بھی وقت کی آواز ہے جسے ٹھیک ٹھیک کہنا ہر باشعور جدید شاعر کا فرض ہے۔ شرط یہ ہے کہ شاعری جدید انسان کی نفسیات کے کسی نہ کسی پہلو کی عکاسی کرتی ہو جو شعری تنقید کی میزان پر پوری اُترتی ہو۔ اس لحاظ سے اچھی ترقی پسند شاعری کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔

اس وقت بین الاقوامی ادب میں وجودیت پسندی ایک اہم ادبی تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ موجودہ تہذیب نے ذہنِ انسان

...رت بے چارگی، مایوسی، اور بے یقینی کا جذبہ نہیں دیا ہے۔ بلکہ تھوڑی سی خود اعتمادی بھی دی ہے (چاہے یہ خود اعتمادی، خود فریبی کی شکل میں کیوں نہ ہو) دورِ جدید کی وجودیت پسندی جدید انسان کی اسی خود اعتمادی کی عکاسی کرتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُردو کے نئے شاعروں میں اس خود اعتمادی کا جذبہ بالکل معدوم ہے۔ اس لحاظ سے بھی، اردو کے نئے شاعروں کی کم مائگی اور تہی دامنی ہمارے سامنے آتی ہے اور ان کی جدید ذہنیت کو زیادہ سے زیادہ آج سے نصف صدی پہلے کی انگریزی شاعری کے رجحان کے پہلو بہ پہلو رکھا جاسکتا ہے۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ نئے شعراء اپنی شاعری کو منوانے کے لئے جگہ جگہ سمینار منعقد کر رہے ہیں اور تحریک چلا رہے ہیں کہ ان کا کلام یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہو، تاکہ طلبا کا ذہن نئی شاعری کو قبول کرنے کے قابل بن جائے۔ جہاں تک شاعری کے مسئلہ ابلاغ کا تعلق ہے، وہ سمینار منعقد کرنے یا نئی شاعری کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کرنے سے حل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس ابلاغ کا بنیادی تعلق قارئین کی موجودہ زندگی سے ہے اور جب تک نئی شاعری ان کی زندگی سے قریب نہیں ہوگی۔ تب تک ابلاغ کا مسئلہ حل نہیں ہوسکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئی شاعری اس وقت تک یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہونے کے قابل نہ ہوگی۔ جب تک اس پر خاطر خواہ تنقیدی سرمایہ فراہم نہ ہوجائے۔ جس کا میرے خیال میں دس حصے کا ایک حصہ بھی نہیں ہوسکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کچھ وقت چاہیئے۔ علاوہ ازیں جدید تنقید کی اساس بھی علوم جدیدہ پر مبنی ہونی چاہیئے۔ جس کے بغیر جدید شاعری کی قدر و قیمت صحیح طور پر متعین نہیں ہوسکے گی۔ لہٰذا اس وقت نئی شاعری کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کرنے کا مطالبہ قبل از وقت نہیں تو اور کیا ہے۔

(کرامت علی کرامت)

نذرانۂ عقیدت ....

شری دیو نرائن پانڈے نے کان پور میں ۲۷ اگست ۱۹۶۷ء کو اُردو کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ۲، گھنٹوں کی بھوک ہڑتال کے بعد انتقال فرمایا۔ ادارہ "شاخسار" شری دیو نرائن پانڈے (مرحوم) کی خدمت میں ان کی اس عظیم قربانی کی وجہ سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔

عبدالمغنی

ادب میں روایت اور بغاوت

روایت اور بغاوت کے الفاظ علمی و ادبی بحثوں میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اور بالعموم لوگ ان کو سکہ بند الفاظ سمجھ کر بہت سرسری طور پر ان سے گزر جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے استعمال اور فہم دونوں میں غور و فکر سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ اپنے مفہوم اور مضمرات کے اعتبار سے صرف ادب ہی نہیں، پوری انسانی معاشرت میں زبردست اہمیت رکھتے ہیں۔ بلکہ ارتقائے انسانیت میں ان کی حیثیت کلیدی ہے۔ روایت ماضی و حال کے ٹھہرے ہوئے دھارے کا نام ہے۔ جب کہ بغاوت کا محرک حرکت اور پیشقدمی کا وہ جذبہ ہے، جو مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس معنی میں روایت ایک یاد ہے اور بغاوت ایک امید۔ جب انسانیت کا قافلہ بہت سے مراحل طے کر کے ایک منزل پر آ ٹھہرتا ہے اور مزید منزلیں مارنے کی بجائے حاصل کی ہوئی منزل ہی پر ڈیرہ ڈال دینا چاہتا ہے بلکہ ڈیرہ ڈال کر کچھ دن آسودگی کے ساتھ آرام کر لیتا ہے۔ تو اس وقت کچھ من چلے اٹھ کر کوچ کا گھنٹہ بجا دیتے ہیں اور ہر طرف ایک کھلبلی مچ جاتی ہے۔ پہلی صورت روایت کی علامت ہے اور دوسری بغاوت۔ بات یہ ہے کہ انسانی ارتقا صرف فتوحات یا صرف نظم و نسق کا نام ہی نہیں بلکہ یہ دونوں کا ایک متوازن مرکب ہے۔ آپ تصور کیجئے ایک لشکر کشی کا۔ خوب ظفر موج شہر پہ شہر فتح کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن یہ بجائے خود کوئی کامیابی نہیں۔ اگر شہروں کی فتح کے ساتھ ہی ساتھ ان پر قبضہ کر کے ان کے باضابطہ نظم و نسق کا انتظام بھی نہیں کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ فتح کے اقدامات ایک باغیانہ سرکشی و تندی اور حرکت و رفتاری سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن ان اقدامات پر قابو حاصل کرنے اور ان کو بروئے تعمیر لانے کے لئے روایت پسندی کا تحمل، ضبط اور نظم درکار ہے۔

لیکن عام طور پر روایت اور بغاوت کو ایک دوسری کی مطلق ضد اور ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ جنگ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ عام ذہنوں میں ان دونوں کا تقابل اس طرح ہوتا ہے کہ روایت قدامت پرستی، رجعت پسندی، بوسیدگی و فرسودگی اور پس ماندگی ہے اور بغاوت جرأت پسندی، ترقی پسندی، تازگی و عمدگی اور پیش قدمی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی ذہن اور سماج کی یہ دونوں کیفیتیں اور صورتیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں ان کے درمیان ایک کشمکش پیہم برپا ہے۔ وہ ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتیں، ایک کا کفن دوسرے کا پیرہن ہے۔ روایت و بغاوت کے اس مفروضہ تضاد کو قدیم و جدید کی کش مکش سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ روایت بہت عام ہے کہ قدیم ایک گزری ہوئی اور اس لئے "از کار رفتہ" چیز ہے اور جدید موجود ہونے کے

سبب ہی ایک قیمتی شئے ہے۔ بہرحال روایت و بغاوت اور قدیم و جدید کے درمیان اس تضاد و کشمکش کو ایک فلسفیانہ بنیاد ہیگل کے نظریئے نے مہیا کی ہے، وہ ارتقاء کی بنیاد اضداد کی آویزش کو قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں کائنات کے اندر ترکیب و تحلیل کا ایک مسلسل عمل جاری ہے (اس طرح کہ عناصر کا ہر مرکب (سِن تھیسس) اپنے ایک ضد (اینٹی تھے سِس) کو جنم دیتا ہے۔ پھر ان دونوں کے درمیان ایک زبردست کشاکش برپا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کشاکش کا انجام ایک نئے مرکب کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر اس مرکب کا ایک مخالف پیدا ہوتا ہے۔ پھر دونوں کے درمیان کشاکش ہوتی ہے اور پھر ایک نئی چیز وجود پذیر ہوتی ہے۔ ہم چنیں مسلسل۔ اس کے بعد ڈاروِن کا بقائے اصلح (سروائیول آو دی فِٹیسٹ) کا نظریہ بھی نئے پرانے کی اس کش مکش کو پیش کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہیگل کے وہاں بس خیالات پُر اسرار طور پر ٹکراتے چلے جاتے ہیں۔ جب کہ ڈاروِن کے نزدیک گوشت پوست کے اجسام ایک دوسرے کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہیں۔ اسی لئے یہاں کمزور و مضبوط کی آویزش ہے۔ پھر اضداد کی یہی لڑائی فرائیڈ کی تجویز کی ہوئی مذکر و مؤنث کی خالص جنسی و حیوانی کشمکش میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہی چیز مارکس کی معاشی و طبقاتی جدلیت میں بھی جلوہ آرا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ روایت اور بغاوت کا مسئلہ بہت پُر پیچ ہے اور ان الفاظ کے عام مطالب سے بہت دور جا کر اس کے مضمرات جدید فلسفے اور علوم تک پھیل گئے ہیں۔ ایسا اس لئے ہے کہ روایت کے مقابلے میں بغاوت کے لفظ کا استعمال اور دونوں کے باہمی تقابل کا رواج جدید علوم ہی کا بروئے کار لایا ہوا ہے۔ چنانچہ اب یہ دونوں الفاظ علم و ادب میں بالعموم اصطلاحی معنوں میں اور اصطلاحی مضمرات ہی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں روایت و بغاوت کے تقریباً متبادل الفاظ کلیسزم اور رومینٹی سیزم بھی ہیں۔ یعنی جس طرح روایت اور بغاوت ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آویز سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح کلاسکیت اور رومانیت کو بھی ایک دوسرے کا مخالف اور آپس میں متحارب تصور کیا جاتا ہے لیکن روایت و بغاوت کو اگر بنیادی طور پر کلاسکیت و رومانیت کے ہم معنی تصور کر لیا جائے، تو واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کا صحیح رشتہ اور حقیقی طور و طریق بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ کلاسکیت اور رومانیت کی تعریف ادبی تاریخوں اور تنقیدوں میں یہ کی گئی ہے کہ ایک دور میں کچھ اقدار اپنے استعمال کی کثرت اور شدّت کے باعث لوگوں کے درمیان مروّج اور مقبول ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ انھیں ایسا وقار اور استقلال و استحکام حاصل ہو جاتا ہے کہ ان کو ادبِ عالی (کلاسکس) سے تعبیر کیا جانے لگتا ہے۔ لیکن دوسرے دور میں، جب لوگوں کا ذوق اور رجحان بدلنے لگتا ہے تو ادب عالی اپنی جگہ متبرک اور محترم رہ جانے کے باوجود نئی نسل کے لئے زیادہ لطف و مسرت کی چیز نہیں رہ جاتا، نتیجے کے طور پر نئے دور میں نئے لوگ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کچھ نئے تجربے کرتے ہیں۔ یہ تجربے اپنے زمانے کے اعتبار سے ذرا مبہم اور پیچیدہ بلکہ پُر اسرار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کا یہی وصف نئے ذہنوں میں ان کے متعلق کچھ تجسّس پیدا کر دیتا ہے اور شروع شروع یہ تجسّس اور اسرار ہی نئے تجربوں کو لوگوں کے لئے دلچسپ اور پُر لطف بنا دیتا ہے۔ چونکہ ابتدا میں یہ تجربے اپنا مرکز حقیقت سے زیادہ خوابوں میں رکھتے ہیں اور ان کی اپیل واقعے سے زیادہ تخیل پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے ان جدّت پسندوں کو رومان پرست کہا جاتا ہے۔ بہرحال اس صورت حال میں واضح طور پر دو مختلف عوامل ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں، ایک تو جی جائی، نکھری اور ستھری روایت' دوسرے نو پیدا اور کچھ اُلجھی اُلجھی بغاوت، ایک طرف برسوں کے

تجربے اور مشق سے صیقل کیا ہوا اسلوب فکر و خیال اور دوسری طرف بالکل خام اور عبوری قسم کا اندازِ احساس و ادراک، ایک طرف لطیف و نازک پیرائیہ بیان اور دوسری طرف پیچیدہ و ژولیدہ طرز نگارش۔ روایتی اور کلاسیکی انداز فکر و اظہار میں نزاکت اور جلا کے باوجود ایک اضمحلال اور بوسیدگی ہوتی ہے جب کہ باغیانہ اور رومانی طرز خیال و بیان میں ابہام اور پیچیدگی کے ساتھ ہی ساتھ ایک زبردست قوت اور صلابت ہوتی ہے چنانچہ جب ان دو مخالف لہروں کا سامنا ہوتا ہے، تو ابتدائی آویزش کے فوراً ہی بعد ان کے درمیان آمیزش کا ایک ناگزیر عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر آخر کشمکش کشش میں بدل جاتی ہے۔ دونوں ہی شکست و ریخت کے بعد ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور اب جو صورت حال سامنے آتی ہے، تو اس میں قدیم اور جدید دونوں ہی اپنی ابتدائی شکلوں کو چھوڑ کر کچھ بدلے بدلے نظر آتے ہیں۔ نہ قدیم پہلے کی طرح قدیم رہ جاتا ہے اور نہ جدید شروع کی طرح جدید رہ جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان بڑی وسیع اور عمیق مفاہمت ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ اخذ کر لیتے ہیں —— یہاں تک کہ بالآخر جدید مقبول و مسلّم ہو کر اپنی باری میں خود بھی قدیم ہو جاتا ہے اور پھر اسے دوسرے دور میں ایک نئے جدید کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ پھر قدیم و جدید کا ایک معرکہ بپا ہوتا ہے۔ پھر ان کے درمیان تعاون اور اشتراک ہوتا ہے۔ پھر قدیم و جدید کی صورتیں اور کیفیتیں بدلتی ہیں اور پھر اسی طرح ایک دوسرا سلسلہ چلتا ہے۔

قدیم و جدید کے مقابلے کی اس حقیقی صورت حال کے پیش نظر پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں روایت کے خلاف بغاوت کا تصور مصنوعی اور دور از کار ہے۔ در اصل روایت کے مقابلے میں جو ارتقائی عنصر ابھرتا ہے وہ صحیح معنی میں انفرادیت ہے۔ اس طرح کہنا یوں چاہیئے کہ "ادب میں روایت اور انفرادیت" اس لئے کہ بغاوت اپنے مفہوم اور اثرات کے اعتبار سے ایک سراسر منفی اور تخریبی قوت ہے۔ اس کی ابتداء اس لئے ہوتی ہے کہ یہ اپنے علاوہ کسی دوسری چیز کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اُسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے اور پرانی بنیادوں کو کھود اور ڈھا کر بالکل نئی اور مختلف طرح ڈالنی چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے منفیانہ اور تخریبانہ جذبے اور عمل کے ساتھ ارتقا کا کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس لئے بغاوت کی حقیقت زیادہ سے زیادہ ایک چیلنج، ایک للکار اور ایک ضرب کی ہے لیکن بجائے خود فقط یہ چیز ادب یا زندگی کے کسی بھی گوشے کے لئے کسی کام کی نہیں اس کے برخلاف انفرادیت روشِ عام کے مقابلے میں ایک خاص چیز ہے جب ادب کے اندر کوئی ایک ڈھرّا بن جاتا ہے اور تمام لوگ اسی کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ ایک رنگ اور ایک ہی کیف کے بہت عرصے تک چھائے رہنے کے نتیجے میں بےرنگی اور بےکیفی پیدا ہو جاتی ہے۔ تو ایک بالکل نیا اور نرالا عنصر ابھرتا ہے جس کی بنیادی خصوصیت روشِ عام سے امتیاز ہوتا ہے یہی انفرادیت ہے، یہی کلاسیکیت کے مقابلے میں رومانیت ہے اور یہی وہ عنصر ہے جو ابتداً روایت سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ لیکن آخر آخر اس کے ساتھ مصالحت کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی کو روایت بھی آخر آخر قبول کرنے اور اپنے اندر جذب کر لینے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انفرادیت کا انداز مثبت اور تعمیری ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بغاوت اتنی سنجیدہ، روادار اور متوازن نہیں ہوتی۔ لہٰذا قدامت اور کلاسیکیت کی روایت کے مقابلے میں جو جدیدیت اور رومانیت ہے اس کو صحیح طور پر انفرادیت ہی سے تعبیر کیا جانا چاہیئے چنانچہ اب تک روایت کے مقابلے میں بغاوت کو فرض کر کے ہم نے جو گفتگو کی ہے، وہ درحقیقت انفرادیت کے متعلق ہے۔ اس لئے کہ ہم نے بغاوت کے اسی تصور کو اپنی گفتگو کی بنیاد بنایا ہے، جو انفرادیت کا ہم معنی ہے اور اب ہم روایت کے مقابل عنصر کے طور پر انفرادیت کے لفظ کو ترجیح دیا

اڑیا۔ سیتا کانت مہاپاتر (آئی۔ اے۔ ایس)

ترجمہ۔ اطہر عزیز

کچھ شاعری کی زبان کے بارے میں

شکسپیئر کے کسی ڈرامہ میں ایک کردار نے کہا ہے

I UNDERSTAND THE FURY IN YOUR WORDS BUT NOT THE WORDS

الفاظ چاہے کتنے ہی ثقیل کیوں نہ ہوں ان کے پس پشت چھپے ہوئے خیالات و جذبات کبھی ذہن انسانی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ زبان اور الفاظ کا جذباتی اور علامتی پس منظر ہی ہمارے لئے ان کے معانی اخذ کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ماہرین علم الانسانیات اس بات پر کلی طور پر متفق ہیں کہ زبان کے وجود میں آنے سے قبل چند مخصوص اشارات و کنایات ہی اظہار خیال کے ذرائع سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ زبان کی مختلف ہیئتیں ہیں مثلاً اس کی تحریری ہیئت اور تقریری ہیئت۔ تحریری ہیئت سے قبل تقریری ہیئت ہی معرض وجود میں آئی تھی۔ زمانۂ قدیم میں ممکن ہے چند ایسے مبہم اور ناقص الفاظ کا استعمال ہا ہو جو صرف گھریلو حد تک محدود ہوں اور اس لحاظ سے ظاہر ہے وہ الفاظ معنوی نقطۂ نظر سے کسی خاص قدر و قیمت کے حامل نہ ہوں گے پھر بھی روزمرہ کی بول چال کے ذریعہ ان بے ربط و غیر متوازن الفاظ کی کچھ نہ کچھ افہامی حد متعین کر لی جاتی ہوگی۔

یہاں یہ کہہ دینا نامناسب نہ ہوگا کہ زبان اور الفاظ کا تعلق تہذیب و ثقافت سے کافی گہرا رہا ہے لفظ کوئی بے جان یا مشینی شئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ذی روح و ترقی پذیر شئے ہے۔ ہر لفظ کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے اس کی ثقافتی اقدار ہوتی ہیں چاہے وہ لفظ کتنا ہی حقیر اور معمولی کیوں نہ ہو مثال کے طور پر ایک لفظ "پالنا" لیجئے۔ یہ لفظ ایک مخصوص سماج کے اندر شعور اور لاشعور کے ان گنت نازک اور مہین دھاگوں میں بندھا ہوا ہے۔

CRADLE یا ہسپتال کے LABUUR ROOM وغیرہ کہنے سے اس لفظ کی مکمل توضیح نہیں ہوتی۔ اس لئے کسی لفظ کے اصل معنی تک پہنچنے کے لئے کچھ خارجی محرکات کی بھی چاہے وہ ثقافتی ہوں یا سماجی امداد لینی پڑتی ہے کیوں کہ وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ مختلف غیر ضروری اور غیر اہم اجزاء سائے کی طرح اس ایک لفظ میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب اس ایک لفظ کے تصور کے ساتھ ذہن میں ان تمام غیر ضروری محرکات کا بیک وقت اجتماع لازمی ہو جاتا ہے۔ مثلاً نرس، ناف کاٹنے کا گھونگھا (SNAIL)، دیہاتی رات کی طویل بھیانک خاموشی اور غیر متوقع حادثات کے تصورات "تولد کے وقت کی تکلیف" کا ایک خاص نقشہ آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ذہن کے پردۂ سیمیں پر بڑی بوڑھیوں کا بچوں کو اس کمرہ میں نہ چھوڑنے کی حتی الامکان کوشش (بچوں کی بے انتہا خواہش کے باوجود) جادو، ٹونا، جڑی بوٹی سے تیار شدہ دوائیں، خوف، دہشت وغیرہ وغیرہ کی مبہم تصویریں اجاگر ہوتی ہیں۔ یہ تمام نامکمل تصورات اجتماعی لاشعور میں محفوظ رہتے ہیں جو بعد میں توانا ذہنی پیکر اور علامات کی شکل میں خود کو ظاہر کرتے ہیں۔

لفظ سماج کے مختلف لوگوں کے مختلف تلازمات کی وجہ سے مختلف رنگ اختیار کرتا رہتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ کوئی خاص واقعہ یا حادثہ اس سماج کے کسی ایک فرد کے لئے اس لفظ کو کچھ اور بھی زیادہ معنی خیز بنا دیتا ہے۔ پھر وقت، عمل اور موقع کے مطابق وہ لفظ اس شخص کے لئے کچھ اور کیفیت رکھتا ہے۔ ممکن ہے اس لفظ کے ساتھ اس شخص کی کچھ واردات قلبی یا اس سے

خاندان اور ماحول کے کچھ خصوصی واقعات وابستہ ہوں۔ اس کے احساسات کی مختلف رنگ و بو اور شکل و شباہت آپس میں مل کر جو آرکسٹرا (ORCHESTRA) پیش کرتی ہیں، وہ اس خاص لفظ کے معنی سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں لفظ کی ادائگی کے وقت مخاطب کی ذہنی قابلیت و فکری صلاحیت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ چوں کہ لفظ ترسیل کے لئے ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں مخاطب اور متکلم دونوں کی ذہنی استعداد اور علمی لیاقت خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس لفظ کی خارجی اور داخلی ہئیت بھی اس لفظ کی وضاحت کرنے میں کافی حد تک ضروری ثابت ہوتی ہے۔

شاعری کی زبان میں ان تمام تلازمات (ASSOCIATIONS) کا احساس بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ شاعری دراصل نام ہے سحر بیانی اور فکری مرقع سازی کا۔ دورِ قدیم میں شاعری کو "جز ویست از پیغمبری" کے مصداق تصور کیا جاتا تھا مگر آج اس پیغمبری کا تصور ہی ناممکن ہے کیونکہ چند تاریخی، سماجی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر عام انسان اس پیغمبری کے فریب سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرنے لگا ہے۔ پھر بھی افسانہ، ناول، یا مقالہ وغیرہ دیگر اصنافِ ادب کے مقابلہ میں زبانِ شاعری جو ایک حد تک زیادہ سحر آفریں اور زبانِ پیغمبری سے زیادہ نزدیک ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

شاعر کی حیثیت ایک مبصر کی سی ہے وہ مبصر لیکن ارسطو کے بوطیقا کا مبصر نہیں ہے۔ ارسطو کا مبصر جس چیز کو خلوص کے ساتھ دیکھتا تھا اس کی بعینہ عکاسی کرتا تھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران فرانس کے واقعیت پسند زولا کے طرزِ فکر میں اور دورِ حاضر کی اشتراکی واقعیت کے مارکسی نظریے میں ارسطو کے مبصر کی مثال مل جاتی ہے۔ فوٹوگراف کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ایک حسین و جمیل نقل تیار کی جاسکتی ہے مگر جذبات و احساسات کا انعکاس اس میں کہاں ممکن ہے؟ بہر حال واقعیت پسند ادب کی خامیوں سے متعلق بحث کا یہ مقام نہیں البتہ اسی واقعیت پسند ادب سے متعلق ہیگل کا قول بہت دل چسپ ہے جو درج ذیل ہے۔

ART IS AND WILL REMAIN A THING OF THE PAST SINCE THE MODE OF PROSE HAS ABSORBED. ALL THE CONCEPTS OF THE MIND AND IMPRESSED THEM WITH ITS PROSAIC STAMP, POETRY WILL HAVE TO TAKE ON THE BUSINESS OF SO THOROUGH A RECASTING & REMODELLING OF REALITY THAT FACED WITH THE UNYIELDING MASS OF THE PROSAIC, IT WILL FIND ITSELF INVOLVED EVERY WHERE IN THE MANIFOLD DIFFICULTIES.

اب یہاں دیکھنا ہے کہ ہیگل جیسے فلسفی نے شاعری یا زبانِ شاعری سے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ پھر بھی مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس نے شاعری کی زبان کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس میں کچھ نہ کچھ مقصدیت ضرور مضمر تھی۔ انسان کے علومِ جدیدہ نثر کے ذریعہ ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں اس لئے فطرت، سماج یا انسان ان سب کے متعلق ان جدید ترین تصورات کے اظہار کے لئے شاعری کی زبان کو حسبِ موافق ذی روح، موثر اور توانا بنانا پڑے گا۔ ورنہ شاعری اور جدید ثقافت پر مبنی علوم کے درمیان کوئی کڑی باقی نہ رہ سکے گی۔ ان جدید علوم کو شاعری کے دائرے میں داخل کرنا ہو تو شاعری کی زبان میں ایک انقلاب لانا پڑے گا۔ واقعیت پسند اقدار کے ذریعہ یہ انقلاب لانا ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شاعری تو محض نقالی یا بیان نہیں ہے۔ ایک طرف یہ جہاں معدوم بعید از قیاس اشیاء و معانی کا انکشاف کرتی ہے تو دوسری طرف احساسات و جذبات کے ناہموار خطوں کو زرخیز اور سرسبز و شاداب بناتی ہے۔ احساسات صرف خارجی ادراک کا نام نہیں ہے ورنہ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو جب تک ہمارے حواسِ خمسہ کے دروازے کھلے ہوئے رہیں گے تب تک تجربات و احساسات کی بیتاب لہریں شعور کے پرسکون ساحل پر مچلتی ہی رہیں گی۔ اس لئے ان خارجی SENSATIONS کی معنویت کا نام ہی احساس ہے اور اس معنویت کے طریقِ اظہار میں شاعری کی زبان کی افادیت کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ احساسات سے معنویت اخذ کر کے اعلیٰ پیمانے کی شاعری کی تخلیق ہوتی ہے۔

شاعر کے فطری تجربات کے علاوہ کچھ POTENTIAL EXPERIENCES بھی ہوا کرتے ہیں۔ انہیں تجربات کو ممکنات کے تاریک دائرے سے سماجی شعور اور لاشعور کے حدود میں لا کر انہیں نام اور شکل دینا بھی شاعری کے فرائض میں داخل

ہے. ہاں شاعری میں احساسات کی معنویت و حدود کا انکشاف سائنس یا سی اور فن کے طریق انکشاف سے بہت مختلف ہے۔ کیونکہ شعور اور لاشعور میں بعض ڈھانچے اور نظام متعین رہتے کے باوجود معنویت ہر شاعر کی اپنی ذاتی ایجاد ہوا کرتی ہے۔ چونکہ شاعر دوسروں کے ذریعہ استعمال شدہ معانی کی کورانہ تقلید نہیں کرتا اس لئے انفرادی تجربات نگاری کو دکھنی اس کے لئے لازمی ہے۔ الفاظ کے روج معانی کو استعمال کرنے میں شاعر کو قدم قدم پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ں لئے شعر گوئی کی راہ اس کی اپنی ذاتی راہ ہوتی ہے جس کا وہ یکا و تنہا مسافر ہوتا ہے۔

اس ضمن میں جدید شاعری کی زبان کے سلسلے میں احتیاط کے ساتھ ہے نکری شعور کے استعمال کا ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے شاعری کی زبان کا استعمال بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جدید شاعری میں دو اور اہم اسباب کی بنا پر یہ امر مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے پہلا سبب یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں شعرا کے طرزِ فکر میں ایک رخی تھی۔ یوں تو مختلف زقات میں الفاظ صوری و معنوی اعتبار سے مختلف رنگ اور روپ اختیار کرتے رہتے تھے پھر بھی شاعر کسی ایک مخصوص وقت میں ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار کرتا تھا مگر اب حال یہ ہے کہ آپ PINOLA کے ذائقہ پر قلم اٹھائیں، شنکر اچار یہ کے تصرف پر غور کریں، خوش ذائقہ اور لذیذ پکوان کے بارے میں سوچیں یا ہاتھ کٹے تین کے اشتہار پر اظہار خیال کریں آپ کو بیک وقت لفاظ کی معنوی وسعت، ذو معنویت (P LURI-SIGNIFICANCE) کثافت (DENSITY) اور ٹھوس پن (SOLIDITY) کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب کہ چاندنی رات میں زندگی کے سرمئے ہیت کی عکاسی شاعری کی روایت بن چکی تھی۔ آج چاند اور چاندنی رات کی خوبصورتی کے تصور کے ساتھ موت کی بھیانک خاموشی، الجھنوں اور پریشانیوں کی لامتناہی تاریکیاں، ماضی کی دلخراش چیخیں اور مستقبل کی طویل سسکیاں بیک وقت ذہن پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اب جذبات اور طرزِ فکر یک رخی (UNILINEAR) نہ ہو کر ایک ہی لمحہ میں ایک ہی وقت میں متعدد رخی (MULTI-DIMENSIONAL) ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شاعری کے غنائی تصور کے اندر غیر مربوط اور غیر مسلسل خیالات و تصورات راہ پانے لگے ہیں۔ فرائڈ اور ینگ کی تھیوری کے بعد ادب میں یہ مسئلہ درپیش آیا تھا جو بعد میں زندگی کے درجات کے مختلف نشیب و فراز میں سے گزرتا ہوا ایک توانا شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کا یہ مطلب

نہیں کہ زمانۂ قدیم کی شاعری میں بیک وقت مختلف قسم کے جذبات کی آمیزش نہیں ہوتی تھی مگر بحیثیت مجموعی ان جذبات و کیفیات کی PURITY یعنی آزادی و سالمیت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ اس روایتی طرزِ فکر کو نظرانداز کر کے الفاظ کی وساطت سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کے لئے بے انتہا ریاضت، مشق، ہمت، استقلال اور مہارت و مزاولت کی ضرورت ہے۔ ان تمام صبر آزما مراحل کو جس نے واقعی طے کیا ہے صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے۔

...."WORLD STRAIN,
CRACK AND SOMETIMES BREAK
UNDER THE BURDEN UNDER
THE TENSION SLIP, SLIDE, PERISH
DECAY WITH IMPRESSION."

ایسا شخص عموماً کسی لافانی صداقت مثلاً انسانیت یا جمالیات وغیرہ کا والہانہ طور پر شیدا ہوا کرتا ہے۔ لیکن البیئر کامیو نے (THE REBEL) L'HOMME REVOLTE میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ممکن ہے یہ رجحان فلسفیانہ نقطۂ نظر سے صحیح ثابت ہو لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ مثلاً فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سب لوگ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لیکن سماج کی رسم و روایات کے مطابق ذات پات اور نسل کے فرق کی وجہ سے عموماً ہر جگہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی والہانہ پن کی کمی کی وجہ سے انسان روز بروز مایوسی، بے چارگی اور بے یقینی کا شکار ہوتا جا رہا ہے اس کا اظہار ایک ایسی عمومی فضا کے ذریعہ ہوتا ہے جس کی خاموش دردآمیز تکمیلیت ہمارے ذہن میں گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ مثلاً

.......ALAS, WHO IS THERE
WE CAN MAKE USE OF ? NOT ANGELS.-
NOT MEN AND ALREADY THE
KNOWING BRUTES ARE AWARE
THAT WE DON'T FEEL VERY
SECURELY AT HOME WITHIN
OUR INTERPRETED WORLD....."

(DUINO ELEGY: RILKE)

یا

"YET I FELT NO CERTAINTY ABOUT ANYTHING, DEMANDING FROM EVERY SINGLE MOMENT A NEW CONFIRMATION OF MY EXISTENCE...
....IN TRUTH, A DISINHERITED SON. (FRANZ KAFKA)"

فکر کی خط استوائی جیسی (EQUATORIAL) غیر استقلالی اور زبان و بیان کی مختلف تبدیلیوں کی بنا پر جدید شاعری میں ابہام کا عنصر پیدا ہو چکا ہے۔ زبان کو روزمرہ کے قریب کرنے کی کوشش کے باوجود اس میں اب تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فکر میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے وہ خود کو ظاہر کرنے کے لئے زبان نہیں پا سکا ہے۔ اس سلسلے میں تلاش جاری ہے۔ دورِ جدید کی شاعری، مصوری، رقص، موسیقی سب میں اسی طرح کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ذہنی انتشار و تذبذب کے اظہار کے لئے ہیئت (FORM) اور زبان کی تلاش بڑے شد و مد کے ساتھ جاری ہے مگر کامیابی کی منزل ابھی حدِ نظر سے کوسوں دور ہے۔

دوسرا رخ جو سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ جس وقت زندگی کی پریشانیاں اور الجھنیں آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں تو شاعر ایک انسان ہونے کی حیثیت سے کس عظیم صفت یا قدر پر ایمان رکھتا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر وہ شاعر صاف گوئی اور صداقت و دیانتداری پر اس کا مکمل ایمان ہے تو یہ الگ بات ہے ورنہ مارکسزم، مذہب، فلسفہ یا اسی قسم کے کئی نکات کو بھی وقتی طور پر اس کا نظریۂ حیات تصور کر لیا جا سکتا ہے لیکن بعد میں اس سے فریبِ نظر (DISILLUSIONMENT) پیدا ہو سکتا ہے یا آگے چل کر وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "اس خدا نے تو دھوکہ دیا" ویسے مختلف حصوں میں بٹے ہوئے موجودہ نظامِ حیات کے پیشِ نظر صداقت پسند شاعر یا فنکار کے لئے کسی ایک قدر کے ساتھ والہانہ وابستگی ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ شخص جو واقعی فنکار ہے کبھی مصالحت (COMPROMISE) کا قائل نہیں ہوتا بلکہ اس کا اپنا منفرد نظریہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایسا بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھی شاعر اپنے وطن کا ذکر کرتے وقت سرسبز و شاداب کھیتی کا خواب دیکھتا ہو یا مرے ہوئے گینڈے کی دھنسی ہوئی آنکھوں سے آسماں کی نیلگوں وسعت

کا نظارہ کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ وہ زبان ایک دوسری دنیا کی زبان ہے ایسی زبان جو گہرے آنسوؤں کی آگ سے احساسات کی تپش سے گزر کر زندگی و توانائی حاصل کرتی ہے۔ ہر شاعر کا نصب العین تو وہی زبان ہوا کرتی ہے۔

بلاک مور نے زبان کی اسی نازک خصوصیت کو ادا یا GESTURE کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جسے انھیں کے الفاظ میں یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ

'THAT WHAT MOVES THE WORDS AND MOVES US" - الفاظ کی گویائی جس وقت تشنگی کی حد کو عبور نہیں کر پاتی اس وقت ہم لوگ اشاروں اور کنایوں کی زبان ہی استعمال میں لاتے ہیں اور اسی کی قوت اور توانائی کا سہارا لیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں زبان محض علامتی ماحول کے سوا کچھ نہیں اور خیالات کا اظہار ایک علامتی ردعمل ہے

پروفیسر کرامت علی کرامت

اُردو اور اُڑیا کے باہمی تعلقات اور ان کے مسائل

قومی یکجہتی کے لئے ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں باہمی رابطے کی ضرورت مسلم ہے۔ رابطے سے مراد صرف چند الفاظ کا لین دین نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہونا ہے اور ایک دوسرے کے ادبی رجحانات کو اپنانا ہے۔ دورِ جدید میں مغرب کے فنی و ادبی تجربات کا ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں نے کس حد تک خیر مقدم کیا ہے اور ان تجربات کی روشنی میں کس حد تک اپنی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کا علم نہ ہو تو ہم اردو ادب کو ترقی کی نئی منزلوں تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

اڑیا اور اردو دونوں نو ہند آریائی زبانوں (NEO-INDO ARYAN LANGUAGES) کے خاندان سے ہیں۔ البتہ اردو کا تعلق سورسینی پراکرت سے ہے اور اڑیا کا تعلق ماگدھی سے ہے۔ لیکن دونوں اس انڈک زبان سے نکلی ہیں جسے قدیم آریہ بولتے تھے۔ اس لئے اڑیا اور اردو میں صوتیاتی اختلافات کے باوجود مزاج کی یکسانیت کا پایا جانا فطری ہے۔ یہی سبب ہے کہ بنیادی گرامر کے علاوہ بہت سے ضرب الامثال جو اردو میں مستعمل ہیں، ان کو ہو بہو اڑیا کے ضرب الامثال میں پایا جاتا ہے۔

اردو اور اڑیا کے باہمی تعلقات کے مسائل پر غور کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اردو کب اڑیسہ پہنچی اور اڑیا زبان پر کس طرح اثر انداز ہوئی ڈاکٹر ستیہ نارائن راج گرو نے (STUDY OF EARLY ORIGA INSCRIPTIONS) میں ثابت کیا ہے کہ اڑیسہ میں مسلمانوں کے دورِ حکومت سے بہت پہلے تیرہویں صدی عیسوی میں فارسی اور عربی کے الفاظ اڑیا زبان میں آ گئے تھے۔ پرشوتم دیو کے ۱۴۸۵ء کے ایک اڑیا کتبے میں الفاظ "مقابلہ" اور "تیار" مستعمل ہوئے ہیں۔ اڑیا کا شاعر سارلہ داس جو راجا کپلیندر دیو (۱۴۳۵ء — ۱۴۶۷ء) کا ہم عصر تھا، اس نے لفظ "اسباب" کا استعمال کیا ہے۔ اسی طرح شاعر ارجن داس جو راجا پرشوتم دیو (۱۴۶۷ء — ۹۷) یا راجا پرتاپ رودر دیو (۱۴۹۷ء — ۱۵۳۱ء) کا ہم عصر تھا، الفاظ "رقم" اور "اسباب" کا استعمال کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت سے بہت پہلے کسب معاش کے سلسلے میں شمالی ہند کا فارسی داں طبقہ کافی تعداد میں اڑیسہ پہنچ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ اپنے ساتھ وہی زبان لایا تھا جسے اردو کی قدیم شکل کہنا چاہئے۔

اڑیسہ کا راجا مکند دیو شہنشاہ اکبر کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے شہنشاہ اکبر کے دربار کو مہاپاترا نامی ایک شاعر بھیجا تھا جو ریختہ یا ہندی (یا قدیم اردو) کا شاعر تھا۔ ایک جنگ میں مکند دیو کے شہید ہونے کے بعد اڑیسہ بنگال کے افغان حاکموں کے زیر حکومت رہا۔ مان سنگھ نے افغانوں کو شکست دے کر ۱۵۹۲ء میں اڑیسہ پر قبضہ کر لیا۔ آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ راجا ٹوڈرمل نے اڑیسہ میں زمین کے بندوبست کا کام انجام دیا تھا۔ اسی زمانے میں عدالت اور کچہری کے بہت سے اردو اور فارسی کے الفاظ اڑیا زبان میں آ گئے۔ اڑیسہ میں مغلیہ دورِ حکومت ۱۷۵۱ء تک قائم رہا۔ اس اثنا میں بنگال کے صوبہ دار یا اڑیسہ کے نائب ناظم کٹک میں ہی مقیم رہتے تھے۔ اسی زمانے میں شمالی ہند سے مسلمان فوجی لشکر کے ساتھ کسبِ معاش کے سلسلے میں آ کر اڑیسہ میں بسنے لگے۔ ان میں سے جو تعلیم یافتہ لوگ تھے وہ اپنے ساتھ اپنی خاص تہذیب، ثقافت اور زبان لائے تھے۔ شمالی ہند کے شعراء و ادباء سے

اسی زمانے میں ضلع ڈھینکانال کے اڑیا شاعر برج ناتھ بڑجینا کی اڑیا شاعری میں اردو اور فارسی کا اثر بہت گہرا نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی اڑیا رزمیہ شاعری کی کتاب "سمر ترنگ" (سنہ ۱۷۹۰ء) کے چوتھے باب کا ایک حصہ اردو زبان میں اور اڑیا رسم الخط میں ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں فارسی کے ساتھ ساتھ اڑیا بولنے والے عوام میں اردو بھی مقبول ہونے لگی تھی۔ مرہٹوں کے بعد سنہ ۱۸۰۳ء میں جب انگریز اڑیسہ پر قابض ہو گئے، تو انہوں نے بھی فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں سرکاری دستاویزات فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں اردو اور فارسی اڑیسہ کے ہندو اور مسلمان دونوں کے تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول تھی، وہاں علاقائی زبان اڑیا پر ان زبانوں کا اثر پڑنا فطری بھی تھا اور لازمی بھی۔ مسلم کلچر اور اردو زبان کا اڑیسہ کے ہندو کلچر پر جو گہرا اثر پڑا، اس کی جیتی جاگتی مثال اڑیا زبان کے "پالا" یا جاترا" میں نظر آتی ہے۔

عام طور سے پالا دو پارٹیوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ستیہ پیر کی پوجا کے بعد اصل پالا شروع ہوتا ہے جو ایک طرح کا ادبی مقابلہ و مناظرہ ہوتا ہے جس میں اشعار گا کر تمثیلی انداز میں پیش کئے جاتے ہیں، ساتھ ساتھ نثر میں بعض حصوں کی تشریح بھی کی جاتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اب بھی مسلمان بادشاہوں کا لباس پہنا جاتا ہے۔ اس لئے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پالا مسلمانوں کے دور حکومت ہی میں وجود میں آیا۔ کرپا سندھو مصرا نے "اتکل اتہاس" میں لکھا ہے کہ شجاع الدین محمد خاں (جنہوں نے سنہ ۱۷۱۲ء میں کٹک میں قدم رسول بنایا تھا) کے عہد میں ستیہ نارائن پالا اڑیسہ میں شروع ہوا۔ پالاؤں کے مخصوص شعراء کے علاوہ بعض نامعلوم شعراء کا کلام بھی اس میں پیش کیا جاتا ہے۔ اڑیسہ کے بعض علاقوں خصوصاً بھدرک وغیرہ میں ایسے پالے نظر سے گذرتے ہیں جن کا ایک ایک حصہ خالص اردو میں ہوتا ہے۔ بنگال میں "کوی رگان" پالا سے ایک حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ سنسکرت لفظ "ستیہ" اور فارسی لفظ "پیر" کے امتزاج سے لفظ "ستیہ پیر" بنا ہے۔ سکمار سین نے اپنی تصنیف "بانگلہ ساہتیہ۔ اتہاس" میں لکھا ہے کہ "ستیہ نارائن اور پیر شند لکھے دونوں مل کر مجھندی پیر یا ستیہ پیر میں تبدیل ہوئے ہیں۔ رفتہ رفتہ ستیہ نارائن اور ستیہ پیر کو ایک سمجھا قرار دیا جانے لگا۔ ستیہ نارائن کی پوجا صرف اڑیسہ یا بنگال میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں مقبول ہے۔ مثلاً مہاراشٹر میں ستیہ نارائن پوجا پر ایک سنسکرت کتاب ہے جس کا مہاراشٹری ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ کٹک زبان میں ستیہ نارائن پوجا کتھا بہت مشہور ہے۔ ستیہ نارائن اور پوجا" کے نام سے ایک سنسکرت کتاب گجراتی پرنٹنگ پریس بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔ جالندھر میں بھی ایک ستیہ پیر کا میلہ لگتا ہے جس میں ہندو، سکھ، مسلمان سب حصہ لیتے ہیں۔ شری شرت چندر مترا نے "SATLYA PIR LEGEND IN SANTALI GUISE" میں لکھا ہے کہ ستیہ نارائن پوجا ہندوؤں سے آدی باسیوں میں بھی منتقل ہو گئی ہے۔ لیکن اڑیسہ کی ستیہ پیر پوجا کی خصوصیت یہ ہے کہ ستیہ پیر کی روایت کو گیتا کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ بہرکیف اڑیا کے ستیہ پیر پالا میں کبھی کبھی مخلوط قسم کی زبان کا استعمال ہوتا ہے جس میں بنگالی، اڑیا اور اردو تینوں کا اثر ہوتا ہے۔ کشامرکرن جو اڑیسہ میں پالا کے لئے بہت مشہور رہے وہ برہمن تھا اور اس کے والد کا نام گوپی ناتھ تھا۔ اس کے دو بادھر پالہ کا قلمی نسخہ بھی ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔ اس نے بنگالی میں جو پالے لکھے ہیں ان میں اگرچہ اڑیا اشعار ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ البتہ یہ پالے اڑیسہ میں کافی مقبول تھے۔ مدن سندر پالا میں درج ہے۔

اڑیا، بانگلہ، فارسی پڑھا ہے

(یا)

دو بادھر پالا میں درج ہے۔

اڑیا، بانگلہ، فارسی پڑھی رسے پا ٹھ

سکل دو دیارے پاچھا ہیل گر سٹھ

اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہاں اڑیا اور بنگالی کے ساتھ ساتھ فارسی کی تعلیم کو بھی بہت ضروری سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ اڑیا بولنے والا تعلیم یافتہ طبقہ فارسی رسم الخط سے واقف تھا، اس لئے وہ اردو سے بھی یقیناً واقفیت رکھتا ہوگا۔

انیسویں صدی کے آخر میں فقیر موہن سیناپتی نے اڑیا زبان کو عوام کی زبان سے قریب لانے کی کوشش کی۔ لہٰذا ان کے اڑیا ناولوں کے کرداروں کی زبانوں میں اردو اور فارسی کے اثرات بہت گہرے نظر آتے ہیں۔

اسی زمانے میں اسد اللہ سہراج پوری اور عبدالمجید بھوریاں وغیرہ اردو میں "تماشے" لکھنا شروع کئے جس میں اردو کے ساتھ اڑیا کے امتزاج کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً۔

حسن کا نور صنم ہے جو ترے تن میں بھرا

چاہیں دیبری ہوتے چدرکھی مرگ ترا

ہی اڑیسہ کا تعلق و ربط قائم تھا۔ مثلاً عبدالقادر بیدل کا اڑیسہ آنا ثابت ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی "ان کی سیاحت کا مشرقی نقطہ اڑیسہ کا شہر کٹک ہے۔ اس زمانہ میں مولانا یعقوب چرخی کے پوتے خان دوران سید محمود صوبہ دار تھے۔" ۱ خان دوران ستمبر ۱۶۶۰ء سے مئی ۱۶۶۷ء تک صوبہ دار رہے۔ ظاہر ہے کہ اسی زمانے میں عبدالقادر بیدل کا قیام کٹک میں تھا۔ قاضی عبدالودود، غالباً اسی زمانے میں فارسی گو درویش والہ ہروی جو ہروی سے تلمذ رکھتا تھا، اڑیسہ میں تھا۔ ناطق لکھنوی نے "نظم اردو" کے نسخے میں لکھا ہے "کٹک میں ایک نامعلوم مدت سے نہایت عمدہ اردو بنگال (مرشد آباد) کے ذریعہ پہنچی۔ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر کی اردو سے بنگال، بہار اور اودھ کو شرف حاصل ہوا۔ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بنگال میں ...ار ہے .... یعنی پنجاب سے دہلی، دہلی سے دولت آباد، اودھ، بہار، بنگال اور دولت آباد سے گجرات، گجرات سے بیجاپور (دکن) اور بنگال سے ... اسی طرح تمام صوبوں میں اردو پہنچ گئی۔" ۲

بنگال سے کچھ لوگ اردو کے کر ضرور اڑیسہ پہنچے ہوں گے لیکن میرے خیال میں اردو براہ راست دہلی، یو پی اور پنجاب سے اڑیسہ پہنچی۔ ابھی بھی بعض ... جات میں خاندانی شجرات موجود ہیں جو میرے اس دعوے کی تصدیق کر... ہیں۔ مثلاً قصبۂ سونگڑہ کے سادات کے جد امجد سید ہاشم (متوفی ۱۰۵۵ ہجری) ... دہلی سے آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ قصبۂ معصوم پور کے سادات کے جد امجد ... مولوی محمد حسن (متوفی ۲۷ ذی الحجہ الاول ۱۲۵۱ھ) علی کا سیالکوٹ کے نزدیک سادات بارہ کے رہنے والے سید بایزید کی اولاد میں سے تھے اور خود حضرت ... اللہ ہیراگیؔ کے شاگرد تھے جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مشہور ... شاگرد تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے نام سید قطب الدین محمد خان سنگڑوی ... متوفی ۲ شوال ۱۲۷۵ھ (جو شاہ عالم کے زمانے میں بنگال کے ۲۴ پرگنہ کے قاضی القضاۃ تھے) کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ نور ... صاحب ولایت سہارن پور کے پوتے حسام الدین شاہ صاحب قصبۂ ... ڈنگڑہ میں آ بسے تھے۔ ان حضرات کے خاندان آج بھی اڑیسہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چونکہ ان خاندانوں کے افراد اب بھی اچھی اردو بولتے ہیں ... کہنا غلط نہ ہوگا کہ ... فارسی کے علاوہ اردو بھی ساتھ لائے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ شمالی ہندی کی طرح یہاں کے ادباء ... بھی مادری زبان کو قابل اعتنا تصور نہیں کرتے تھے بلکہ فارسی پر ہی اپنی توجہ مرکوز کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اڑیسہ میں زمانۂ قدیم کے جتنے بھی کتبے ملتے ہیں، وہ اکثر فارسی زبان میں ہیں۔ دلچسپی کے لئے ناظم بنگال شجاع الدولہ کے داماد مرشد قلی خان مخمور جو اڑیسہ کے ناظم تھے، ان کا ایک فارسی کا شعر ملاحظہ ہو۔

ہر چند از تو بر دل بیداد رفتہ باشد
حاشا کہ بر زبانم فریاد رفتہ باشد ۳

مغلیہ دور حکومت میں تو فارسی سرکاری زبان تھی ہی۔ ۱۷۵۱ء کے بعد مرہٹوں کے دور حکومت میں بھی فارسی، اڑیسہ کی سرکاری زبان رہی۔ اسی زمانہ میں سجان محمد متوطن قصبۂ بھدرک سنگور سرکار کٹک مضافات صوبہ اوڑیسا ضمیمۂ ملک ہندوستان نے "فرہنگ جانی" کی شکل میں فارسی کی ایک اہم ڈکشنری لکھی جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور جس کا تقریباً ۷۶۸ صفحات پر مشتمل ایک قلمی نسخہ میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ کتاب ۱۱۸۳ھ فصلی یعنی تقریباً ۱۷۵۰ء میں لکھی گئی تھی۔ کتاب کے آخر میں لکھا ہے "مالک این کتاب جگموہن داس ولد دیارام دیوان است دعویٰ دیگران گذبست"۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اڑیسہ کے تعلیم یافتہ ہندو بھی فارسی پڑھتے تھے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ اڑیسہ کا فارسی داں طبقہ فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی قابل توجہ سمجھنے لگا۔ ہمیں جہاں تک معلوم ہے، اڑیسہ کا سب سے پرانا اردو کا شاعر جودت ہے جس کے متعلق گلزار ابراہیم صفحہ ۶۰ میں درج ہے۔

"جودت تخلص مرشد آبادی نامش رائے ہری رام رحلش از کٹک وسلسلہ او از سلطان نواب علاء الدولہ سرفراز خان مرحوم است با راقم آشنا بود۔ در بلدۂ مذکورہ بعہد شاہ عالم بادشاہ انتقال نمود۔ سوائے این رباعی بیتے از وے نہ رسیدہ

واعظ تری بات دل سے کہنے کا نہیں
پتھر کی چوٹ شیشہ سہنے کا نہیں
جا زاہد خشک تو ہے جب تک میرے پاس
تو ہو میری چشم تر سے بہنے کا نہیں

شاہ عالم کے زمانے (یعنی بارھویں صدی ہجری) اڑیسہ میں جس طرح صاف ستھری اردو بولی جاتی تھی اس کی ایک جھلک ہمیں مندرجۂ بالا رباعی میں ملتی ہے۔

---

۱ اقتباس ماخوذ از ... مرتبہ خطا کاکوی۔ ۲ اقتباس از بنگال میں اردو، مولانا وفا راشدی۔

۳ سفینۂ ہندی تالیف بھگوان داس ہندی صفحہ ۱۹۱

۴ اب تک اس کی تحقیق نہ ہو سکی کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ کرامت

اس طرح کی چیزیں اڑیسہ کے عوام میں بہت مقبول ہوئیں۔

ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے بعد جب انگریزی یہاں کی سرکاری زبان ہوگئی، اڑیا داں طبقہ فارسی اور اردو سے دور ہوتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت بہت ہی کم اڑیا بولنے والے ایسے ملیں گے جو اردو اور فارسی لکھ پڑھ سکتے ہوں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ مہادیا دیوی (مہہ جبین بالیسری) جو اڑیا زبان کی مشہور شاعرہ ہیں، اردو سے واقف ہیں۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر اور غالب کی چند غزلوں کے اڑیا میں ترجمے کئے ہیں جو اڑیا کے ادبی حلقوں میں خاصے مقبول ہوئے ہیں۔ مولوی رحمت علی رحمت (مرحوم) نے اقبال پر اڑیا میں ایک مضمون لکھا ہے جو سکنڈری اسکول کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ پریم چند، کرشن چندر کے چند افسانوں اور فیض اور فراق کی چند نظموں کا بھی اڑیا میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ غالباً ہندی کی وساطت سے ہوا ہے۔ نیاز فتح پوری کی افسانہ نگاری سے متعلق راقم الحروف کا ایک مضمون اڑیا کے علمی رسالہ "جھنکار" میں شائع ہوا ہے۔ اس وقت چونکہ اڑیا کے اکثر ادیب اردو سے نابلد ہیں، اس لئے اردو کی تخلیقات کے اڑیا ترجموں کی رفتار بہت سست ہے۔ میرے خیال میں اگر اڑیسہ کا اردو داں طبقہ خود اڑیا میں بھی اچھی استعداد پیدا کرے تو یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات سے یہ بات واضح ہوئی کہ زمانہ قدیم سے اب تک اڑیا زبان پر اردو کا اثر کافی گہرا رہا ہے۔ اس کے برعکس راقم الحروف کی تالیف "آب خضر (شعرائے اڑیسہ کا تذکرہ)" کے مطالعہ سے پتہ چل سکتا ہے کہ اڑیسہ کے اردو ادیبوں پر اڑیا کا اثر اتنا گہرا نہیں پڑا ہے، اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اڑیسہ کے قدیم اردو ادیبوں میں فارسی کا ذوق و شوق بہت گہرا تھا۔ اب بھی اڑیسہ کے قصبات میں گلستاں، بوستاں، دیوان حافظ، کریما، کلام فریدالدین عطار وغیرہ کے قدیم قلمی نسخے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس وقت شمالی ہند کے اردو ادیبوں کی بعض تخلیقات بھی اڑیسہ پہنچی تھیں۔ چنانچہ مجھے عطا علی معصوم پوری کا لکھا ہوا سنہ ۱۲۷۴ھ (یعنی سنہ ۱۸۵۷ء) کا ایک نسخہ ملا ہے جس میں نظیر اکبرآبادی کی نظمیں بہ عنوان قدرت نامہ، تندرستی نامہ، بھوجپال نامہ، رکھو سکھو نامہ، دولت نامہ، کوڑی نامہ، رنگین نامہ اور احمد کی مثنوی "قصۂ منصور" وغیرہ شامل ہیں۔

اسی زمانے کا ایک اور نسخہ میں "ہری داس نامہ" کے عنوان سے کسی سنت شاعر کی مذہبی مثنوی موجود ہے۔ نظیر اکبرآبادی والے نسخے میں "بھوجپال نامہ" اور "کوڑی نامہ" میں ایسے بند موجود ہیں جو نول کشور کے ایڈیشن میں نہیں ہے بلکہ صرف مخمور اکبرآبادی کے ایڈیشن میں موجود ہیں۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، احمد کی مثنوی مطبوعہ ہے لیکن احمد کے سوانح حیات سے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں۔ "ہری داس نامہ" زبان کے لحاظ سے بہت قدیم مثنوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مطبوعہ ہے کہ نہیں اس کے بارے میں اب تک تحقیق نہ ہو سکی۔ بہرکیف ان تمام نسخوں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ زمانہ قدیم میں آمد و رفت کی دشواریوں کے باوجود، اڑیسہ کے اردو داں طبقے کا باقی اردو دنیا کے ساتھ ایک طرح کا رابطہ قائم تھا۔ یہ رابطہ بہت گہرا نہ سہی لیکن تھا ضرور۔ اڑیسہ کی اردو شاعری مذہب اور تصوف کی راہ سے جدید نظم تک پہنچی۔ اس کے برعکس اڑیا کی قدیم شاعری نے رادھانا تھ رائے کی کوششوں سے اپنا روایتی مذہبی لبادہ اتار کر رومانوی اور فطری شاعری کا رنگ اختیار کر لیا۔ رادھانا تھ رائے کی ایک مشہور نظم "چلکا" پر اڑیسہ کے مشہور اردو شاعر امجد نجمی نے اس سے متاثر ہو کر اردو میں ایک نظم کہی ہے۔

فی الحال اردو میں جس طرح جدید شاعری کے تجربے ہو رہے ہیں اڑیا میں بھی اسی طرح کے تجربے جاری ہیں۔ خصوصاً اڑیا کی جدید شاعری رادھا کانت رائے، گورو پرشاد مہانتی، راما کانت رتھ، بھانو جی راؤ، سیتا کانت مہاپاتر وغیرہ کی کوششوں سے ترقی کر رہی ہے۔ (پدم شری اسچی راوت رائے کی تصنیف "سنہ ۱۹۶۲ء کوتیا" جسے ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے انعام ملا ہے جدید اڑیا شاعری کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔) اگر اڑیا کے جدید شاعروں کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ ہو تو اردو ادیب اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ اس دور کے افسانہ نویس اور ناول نگار سریندر مہانتی، گوپی ناتھ مہانتی اور کانہو چرن کی تخلیقات کا تو اردو میں ضرور ترجمہ ہونا چاہئے۔ اب صرف کالندی چرن پانی گراہی کے ناول "مٹی کا پتلا" کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے وہ بھی براہ راست نہیں، بلکہ ہندی کی وساطت سے۔ دو سال ہوئے امجد نجمی کے زیر ادارت کٹک سے اردو کا ایک دو ماہی ادبی رسالہ "شاخسار" نکل رہا ہے جو ترجموں کے سلسلے میں کچھ خدمات انجام دے رہا ہے۔ اب تک اس میں سیتا کانت مہاپاتر، پدم شری سچی راوت رائے، سوریندر مہانتی، چنتا منی بہرا وغیرہ کی جدید نظموں اور سریندر مہانتی، راوت رائے وغیرہ کے افسانوں کے ترجمے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ ان ترجموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو اڑیسہ کے اردو ادیبوں نے براہ راست اڑیا سے ترجمہ کیا ہے۔ اس وقت سب سے اہم مسئلہ

...امت کا ہے۔ اگر یہ حل ہو جائے اور اچھے پبلشر مل جائیں تو ازبا کی قابل ...رانی کتابوں کے ترجموں سے اردو کے سرمایہ میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ...ہے کہ اردو کے ہمدرد سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور فرمائیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض اشیاء کے وہ اڑیا نام جنہیں ...ر کے اردو بولنے والے اپنا چکے ہیں اور جن کے مترادف الفاظ اردو ...نہیں ہیں، انھیں اردو دنیا کو اپنانا چاہئیے اور انھیں اردو کی ڈکشنری ...جگہ ملنی چاہئیے۔ میری مراد اڑیسہ کے ایسے پودوں، جانوروں، غذاؤں، ...وں اور زیوروں سے ہے جو خاص سرزمین اڑیسہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ...د لغات میں جن کا ذکر نہیں۔ ان الفاظ کو اردو میں جگہ دینے سے اردو ...ملاقائی زبان سے اور بھی قریب ہو جائے گی۔

(جموں کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کی اردو کانفرنس میں پڑھا گیا)

تارے اداس، اداس ہیں پھیکی ہے چاندنی
لو رات یہ بھی ختم ہوئی انتظار میں

(علقمہ شبلی)

شعلوں کی سلگتی ہوئی تاریخ سے پوچھو
دہکے ہوئے شعلوں کو چمن ہم نے بنایا

(اولاد اصغر رضوی)

افسانوی دنیا میں نسیم محمد جان اور یوسف جمال کی کوششیں ...ب ہیں۔

شفق بہرمانڈوی - کلکتہ

ابرا حسنی گنوری اور شیخ محمود بالیسری کے مقالات بڑی جانفشانی ...ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔ سید حرمت الاکرام کا ترجمہ "میری ...ں کی فاختائیں" خوب ہے۔ ترجمہ نگاری ان ہی کا حصہ ہے ...بیا حیدر نایاب کی "سانحہ" اور ساجدہ اثر کی "ایک نظم" کافی پسند ...میں ایسے نام منتخب کرتا ہوں۔ جن کی غزلیں کافی پسند آئیں ...عطا کاکوی، سعادت نظیر، عزیز الرحمن۔ "ایک مہینے کے ...منٹ" اور "پژمردہ گلاب" اچھے افسانے ہیں۔

●●●

بقیہ "بزم شاخسار"

سادہ ہیں۔

"دور جدید کے دو مقبول شاعر" پر خامہ فرسائی اچھی کوشش ہے۔ امید ہے کہ کرامت صاحب یہ سلسلہ جاری رکھیں گے

استاذی حضرت ابر احسنی گنوری کا مقالہ پاکیزہ ہے۔ اچھا ہو کہ پژمردہ نثر کو "شاعری" سمجھنے والے غور و فکر سے کام لیں۔

ایس - اے - فیروز - پٹنہ ۴

"شاخسار" کا تازہ شمارہ دیکھا۔ طبیعت پھڑک اٹھی۔ واقعی "شاخسار" نے معیاری حیثیت سے کافی ترقی کر لی ہے اور اس کا ثبوت پرچے میں چھپنے والی نامور فن کاروں کی تخلیقات ہیں۔ لیکن غزلیں جدید قسم کی شائع کیا کریں تو بہتر ہے [جدید قسم کی غزل میں کوئی بات ہو، تب تو " ادارہ] ویسے زیر نظر شمارہ میں نظمیں بڑی معیاری چھپتی ہیں۔ غزلوں میں صبا اکرام کی غزل بہت پسند آئی افسانوں میں نسیم محمد جان صاحب کا افسانہ خاصہ توجہ کا حامل ہے

جاوید اقبال کاظمی ——— فتحپور

ماہنامہ "شاخسار" اپنی تمام تر جلوہ رعنائیوں کے ساتھ مجھ تک پہنچا۔ شروع سے آخر تک حرف بہ حرف پڑھا۔ منظومات کا حصہ کافی زوردار ہے۔ محمود سعیدی، شہریار اور فضل الحق کی نظمیں کامیاب ہیں۔ علیم اختر مظفر نگری، سعادت نظیر، عطا کاکوی، علقمہ شبلی، سید اولاد اصغر رضوی اور ساحل مانک پوری کی غزلیں حاصل شمارہ ہیں اور یہ شعر تو بہت متاثر کن ہیں

ذکر وفا چھڑا تو مرا نام آ گیا
چہرے پہ انکے شرم حیا پھیلتی گئی

(علیم اللہ مظفر نگری)

مصیبتوں پر مصیبتیں ہیں قیامتوں پر قیامتیں ہیں
مگر یہ دل ہی کا حوصلہ ہے، کہ پھر بھی یہ مسکرا رہا ہے

(سعادت نظیر)

نئے گلوں سے نئی چھیڑ چھاڑ ہے جاری
ہے عندلیب کا انداز گفتگو بھی نیا

(عطا کاکوی)

اندرجیت دت

انصاف

انشائیہ

انصاف : کتنا پُرکشش ہے یہ لفظ !!

زمانۂ قدیم میں بادشاہ یا حاکم وقت اپنی رعایا کی داد فریاد سننے اور انصاف کرنے کے لئے اپنے محلوں یا متبرک عبادتگاہوں کے دروازوں پر جاتے تھے۔ بیشتر محلات اور خانقاہوں کے دروازوں پر بنائی گئی شیروں کی تصویریں انصاف کی طاقت اور عظمت کی مظہر سمجھی جاتی تھیں اور شاید ان ہی وجوہ کے زیر اثر "چلو دروازے پر" - "چلو شیروں کے سامنے" کے محاورات لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوں گے۔ اور ہم آج بھی عدالتوں کو "انصاف کا دروازہ" سمجھتے ہیں۔

لیکن انصاف کا خیال، معبدوں کی تعمیر اور سلطنتوں کی تکمیل سے پہلے بھی وحشی انسانوں کے دلوں میں شیر کے خوف کی مانند قیام پذیر رہا ہے۔ چاہے اس زمانے کا انسان وحشی، ناسمجھ اور خونخوار تھا اور اسے ضروریات زندگی کے حصول کے لئے قدرتی طاقتوں کے خلاف چالاکی اور بے رحمی سے برسرپیکار ہونا پڑتا تھا۔ پھر بھی اس کا ضمیر ایک ایسی غیبی طاقت سے متاثر تھا، جو اس کے صحیح کاموں پر خاموش اور غلط کاموں پر شیر کی مانند دھاڑتی ہوئی اسے سنائی دیتی تھی۔

اس دور کا انسان انصاف سے بری طرح خائف تھا وہ توہم پرست تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ ٹھیک راستے پر چلے گا، تو پھولے پھلیگا۔ اس کے برعکس غلط کام کرنے پر وہ تبا[ہ] دبرباد ہو جائے گا۔ یعنی وہ راہ راست پر چلنے کے لئے اس [کے] لئے مجبور تھا کہ غلط اعمال کی کڑی سزا سے ڈرتا تھا۔ جب مسلسل تجربات کے بعد انسان نے اس خوف پر قدرے قابو پا[یا] تو وہ سمجھنے لگا کہ دوسروں کی نظر بچا کر کوئی غلط کام کر بھی لیا [جائے] تو سزا کا امکان نہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی اس کے دل م[یں] غلط اور صحیح کام میں زمین و آسمان کا فاصلہ حائل ہونے کا [احساس] موجود رہا۔ وہ تب بھی یہی سمجھتا تھا کہ انسان کے بنائے ہو[ئے] قانون قابل احترام اور ناقابل رد و بدل ہیں۔

یونانی مفکر افلاطون نے یہ ہمہ گیر نظریہ دنیا کو دیا [کہ] چاہے انصاف کے ہاتھوں انسان کو کچھ تکلیف یا نقصان [اٹھانا] پڑتا ہے۔ مگر اس انسان کو بعد میں اس سے بھی زیادہ تکلیف اور نقصان اٹھانے پڑتے ہیں، جو ناانصافی کی بدولت بھ[گتنا] پڑتا ہے۔ اور یہی عقیدہ ہماری سماجی زندگی کے دائرہ کا [مرکزی] نقطہ بن چکا ہے۔ یہ ہماری تہذیب کی روح ہے۔ ا[یک] بہت بڑے جج کے الفاظ میں "انصاف" انسان کی ا[س دنیا] میں سب سے بڑی دلچسپی ہے"!

آخر لفظ انصاف سے ہماری مراد کیا ہے؟ اس کا [مطلب] ہرگز "قانون" نہیں۔ قانون ایک ایسی شئے ہے، جو

ئی ہے ۔ یہ ایک مداری کی طرح کئی لبادے اوڑھے ہوئے ہے
ور روز بدلنے والے فیشن کی طرح کئی صورتیں اور تاثر رکھتا ہے
ِرماجیت کے عہد میں معمولی سے معمولی چوری کی سزا موت تھی ۔
مغلوں اور ان کے ہمعصر حکمرانوں کے دربار میں سر نہ جھکانے یا
باقاعدہ سجدہ نہ کرنے والے کو ملک بدر کیا جا سکتا تھا چنگیز
خان جیسے جابر حکمران کا قانون یہ تھا کہ " پہلے پھانسی پر لٹکا
دو، پھر مقدمہ چلاؤ "۔ آج سے سو دو سو سال پیشتر چھوٹے
چھوٹے معصوم بچے اپنے آقاؤں کی ہر جائز و ناجائز خدمت
پر مامور دم توڑ جاتے تھے، تو کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی
یہ سب قانون کی اجازت سے ہوتا تھا ۔ کیوں کہ اس وقت کوئی
ایسا قانون نہ بنا تھا ۔ جس کی رو سے ایسے مالکوں کو سزا دے سکتا ۔
آج ایسی ظالمانہ حرکات نہیں کی جا سکتیں ۔ کیونکہ قانون بدل گیا
ہے ۔ مگر یہ تبدیلی کیوں کر ہوئی ۔ اس کا جواب ہمارے ماضی کے تمام
اندھیروں کو روز روشن میں کھڑا کرتا ہوا سامنے آ جاتا ہے کہ
وہ آسان ترین الفاظ میں یہ ہے کہ " انصاف " کا تقاضہ تھا
قانون کو بدلا جائے ۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کسی انصاف کے دیوتا نے لب کشائی
کی ہو گی کہ قانون کو بدلا جائے ۔ یا کسی عدالت کی دیواروں پر
اس نوعیت کے الفاظ ابھرتے ہوئے دکھائی نہ دیئے ہوں گے
اور نہ ہی انسان کو اپنے شیطانی قانون میں ردوبدل کے لئے آسمان
سے وحی نازل ہوئی ہو گی ۔ تو پھر انصاف نے اپنے تقاضوں کا اظہار
کس طرح کیا ہو گا ؟ انصاف کا خیال فطرتی نہ ہو کر انسانی دماغ کی
اپج ہے ۔ ایک بھیڑیئے اور بھیڑ ـــــ لومڑی اور مرغی ـــــ باز
اور چڑیا کے مابین کوئی جذبۂ انصاف حائل نہیں ۔ کچھ ایک مفکروں
کا قول ہے کہ طاقت ور اور کمزور حکومتوں کے درمیان بھی انصاف
قائم رہنا ناممکنات میں شامل ہے ۔ طاقت ور ہر دور میں ظلم ڈھاتا آیا
ہے، جو وہ ڈھا سکتا تھا ۔ اور مظلوم ہر اس ناانصافی کو سہتا آیا
ہے، جسے سہنے کی طاقت اس کے جسم میں تھی ۔ باوجود اس تفریق
انصاف کا یہ خیال ہر دور میں زندہ رہا اور اب بھی اس دنیا میں
موجود ہے ۔ کوئی بھی آگ اسے انسانی دماغ سے نکال کر جلا نہ
سکی اور کوئی بھی تلوار اسے کاٹ کر الگ کرنے
میں کامیاب نہ ہوئی ۔ اس نے ہر ظالم پر فتح پائی اور اسے برباد شدہ
سے بھی عمر نصیب ہوئی ۔ یہ آج بھی اس دنیا پر انسان کی سب
سے بڑی دلچسپی بنا ہوا ہے ۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہوا ؟

یہ تبھی ممکن ہوا جبکہ یہ ہمیشہ انسان کے دل و دماغ میں
قیام پذیر رہ کر، اس کا ضمیر بن کر متقاضی بنا رہا ۔ ہم اکثر
یہ الفاظ سنتے ہیں کہ یہ بات قانونی طور درست ہو سکتی ہے مگر منصفانہ
نہیں ـــ انسان برے قوانین کو رد کر سکنے کا قانون بناتا آیا
ہے ۔ مگر انصاف نے اس کے قانون میں کبھی " بہت خوب "۔ " بہت
اچھے " کی سرگوشی نہیں کی ۔ بلکہ اس کا تقاضہ ہمیشہ " اس سے بھی
عمدہ " ۔ " اس سے بھی بہتر " رہا ہے ۔ یہ ہمارے کسی بھی ضابطۂ
قانون سے مطمئن نہیں ہو پاتا ۔ یہ ہر انسان کا دماغ بن کر اسے ہر
نئے موڑ کو دیکھنے اور ہر نئی چڑھائی عبور کرنے کی ہمت بخشتا
آیا ہے ۔ یہ اس عزم کا نشان ہے کہ ہم ایک نیک منزل کے مسافر
اور عظیم آخرت کے وارث ہیں ۔ " انصاف " کے خیال ہی کی وجہ
سے انسان خود اپنے وحشی پن اور پراگندہ روح سے جنگ
کرتا ہوا اس مقدس شئے کو پانے کی کوشش کرتا رہا ہے، جو
قدرت کے کسی خزانے میں سرے سے موجود ہی نہیں ۔

انصاف کی ترجمانی کسی جج کا بارعب جسم یا اس کی پرشکوہ
پوشاک بھی نہیں کر سکتی ۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں قانون کی
نمائندگی کرتا ہے ۔ وہ عدالت کی کرسی میں بیٹھ کر صرف یہ دیکھتا
ہے کہ وکیلوں کی چالاکی، جیوری کے دماغ پر اثر انداز نہ ہو
اور مجرم چاہے وہ قصوروار ہو یا بے قصور ۔ قانون کے
مطابق سماعت کا حق ادا ہو سکے ۔ لیکن انسان کو ہمیشہ اس
بات کا احساس رہا ہے کہ قانونی انصاف سے بڑھ کر ایک
اور سچا انصاف بھی ہے، جو کہ صحیح معنوں میں " انصاف " کہلانے
کا مستحق ہے ۔ شکسپیر کی دور بین نظریں انصاف اور جور کو کس
حالت میں دیکھتی ہیں ـــــ اپنے کانوں سے بہرہ اور آنکھوں سے

دیکھو کہ ایک سادہ لوح چور کے اوپر انصاف کس طرح سوار ہے؟ تم ذرا غور سے سوچو اور ان کی جگہ تبدیل کر دو۔ سارا معاملہ ہی الٹ پلٹ ہو چکا ہوگا۔ تمہیں کچھ سجھائی نہ دیگا کہ کون چور ہے اور انصاف کون ہے؟"

انسانی انصاف اپنی تمام تر کمزوریوں سے قطع نظر انسانی تاریخ میں اس نیک جذبے کی تکمیل کا حامی بنا رہا کہ انسانی انصاف کبھی بھی بے داغ نہیں ہو پایا۔ ہر ایسے انصاف کے سر پر خالق کے بے عیب انصاف کا سایہ منڈلاتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ہم پورے وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے دل میں انصاف کی خواہش نے اسے بلند اخلاق بننے میں ہمیشہ مدد دی۔ وہ عروج اور طاقت کی انتہائی بلندیوں، پستیوں اور غلامی کی تاریکیوں میں بھی انصاف کا خواہش مند رہا ہے۔ انصاف کے لئے طلبگار ہر اس مقید انسان کی آواز سب سے زیادہ پُر اثر اور بلند رہی جس نے انصاف کو اپنا حق قرار دیا۔ ان ہاتھوں سے اوپر کوئی ہاتھ نہ اٹھ سکا، جنھوں نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بھی انصاف کے لئے دعا مانگی۔

بادشاہ اور دینی رہنما ہر اس انسان کا سر قلم کرتے رہے جس نے انصاف کو خدا کے حکم کے نام سے پکارا اور ان لوگوں نے ہر ایسے حاکم کو مٹی میں ملا دیا جنہوں نے ان انصاف کے خواہش مند انسانوں کی آواز کو سنا۔ ہر بادشاہ کے بعد دوسرا حکمران نعرہ بلند کرتا رہا "میں انصاف ہوں — میں قانون ہوں اور میں ہی اس زمین پر خدا کا نمائندہ ہوں" لیکن ہر بار ان لوگوں نے جواب دیا "نہیں! یہ جھوٹ ہے! کیونکہ تم بھی ہماری طرح ایک خاکی ہو۔ اے حاکم وقت تم سے بھی بڑھ کر ایک قوتِ انصاف ہے۔ جس کے آگے ہم سرِ تسلیم خم کریں گے۔ اس کا ہم بھی حکم مانیں گے اور ہمارے ضمیر بھی — کیا انسان اس دنیا میں ہزاروں سال سے یہ نہیں گاتا آیا کہ: — "ہم زمین پر بھی وہی کام کریں گے، جو آسمان پر ہوتا آیا ہے" ان سب کششوں میں وہ جذبہ جس سے لوگ متاثر تھے عظیم اور نیک تھا۔ مگر ان کے انصاف کا خیال مبہم تھا۔

وہ اپنی مرضی کے مطابق ٹیکس لگاتے، اپنی معاشرت کا نظام خود چلاتے۔ اپنے چین کے لئے خود قانون بناتے اور اپنے جسمانی اور دماغی آزادی کے حقوق کے دعویدار تھے۔ آج جب ہمیں یہ سب حقوق تقریباً تقریباً حاصل ہیں۔ جب ہم اس غلامی دوسروں کے حکم کے مطابق کام کرنے، ان کی مرضی کے مطابق سوچنے، یا اپنی ملکیت اور پردہ داری ان کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی لعنتوں کا تصور بھی نہیں کر پاتے، تو کیا انصاف اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس لمبے اور طویل سفر کے بعد اس کا حقیقی سفر اب شروع ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

آج جب ہم قانون کی رو سے اپنی محنتوں کا مزہ اٹھانے کے خود حقدار ہیں اور کوئی ہماری محنتوں کے ثمر کو زبردستی چھین لینا چاہتا ہے، تو اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ تو اس حالت میں ہمارے ضمیر کی حالت کیا ہوگی جب ایک بھوکا آدمی ہماری الماریوں میں سجی ہوئی اشیا، کو حسرت بھری نظر سے دیکھتا ہوا وہاں ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔ کیا ہمارے لئے مناسب ہوگا کہ ہم اس وقت یہ تصور کر لیں کہ ہمارے اندر کوئی بھوکا انسان کھڑا ہی نہیں ہے؟ کیا ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے اندر مجرم ہونے کا احساس کئے بغیر اس طرح کھاتے پیتے رہیں؟ باہر آندھی اور بارش میں کھڑے ہوئے بھوکے آدمی کی شکایت، — بھلے ہی ہمارے کانوں تک نہ پہنچ رہی ہو۔ لیکن ہمارا ضمیر ہمیں پکار پکار کر یہ کہتا ہوا سنائی دے گا "انصاف! انصاف!!"

اس طرح مثالی اچھائی انسان کے دوش بدوش آگے بڑھتی ہے اور انسان اپنے حقوق اور نظریوں کی تکمیل میں قائم رہتا ہے۔ ہم صرف اپنے نظریوں کی تکمیل کے چند مراحل ہی طے کر پائے ہیں کہ منزل مستقبل کے خلا میں گم ہو جاتی ہے جلد جلد ہماری زندگیوں کو اتنی شاندار اور ملا انقدم بنا دیتی ہے۔ برائی پر فتح اور سچائی پر قبضے کی خواہش

تان کی تلاش اور اسے پہنچنے کی آرزو نہ ہو کر ایک لمبی سڑک پر سفر کے دوران زیارت کا جھنڈا ہی ہو سکتی ہے۔

کوئی بھی حق ایک آرام دہ کرسی یا پلنگ نہیں۔ بلکہ ایک سخت فریضہ ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر انسان کو آزادی حاصل ہو۔ مگر یہ ٹھیک نہیں کہ وہ اس حق کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے یا اپنی خودغرض خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال میں لائے۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ طاقت ذمہ داری ہے۔ ہم دوسروں کو طاقتور بنانے کے لئے طاقت ور، دوسروں کو آزاد رکھنے کے لئے آزاد اور دوسروں کو عقلمند بنانے کے لئے عقلمند بنے ہیں۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہم عالم و فاضل اور دولت مند ہوں۔ لیکن ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس میں دوسروں کو شریک کریں۔ ہر ایک اچھائی کی خدمت کرنے کے لئے نیا دروازہ ہے اور ہر انسانی تکمیل اس کتاب کا پہلا ورق ہے۔ جس کا کوئی خاتمہ نہیں۔

سچے انصاف کو اس دنیا میں لانا ابھی باقی ہے۔ ہم اس سنہرے راستے پر ابھی تھوڑا آگے ہی بڑھ پائے ہیں۔ ان لوگوں پر مہربان ہونا جو ہمارے دوست ہیں، یا جن سے ہمارا کوئی رشتہ ہے، ہی تکمیل انصاف نہیں۔ بلکہ ہر انسان کو اس کا حق دینا یا دلوانا ہی اہم انسانی فریضہ ہے۔ ہم اس نظریہ پر چل کر ہی سچے انصاف کو اس دنیا میں لا سکتے ہیں۔ ہمارے نیک کاموں سے یہ دنیا بھلے ہی جنت ثانی بن جائے۔ لیکن پھر بھی ہم یہ سوچنے پر مجبور رہیں گے کہ سچا انصاف اب بھی ہم سے کچھ آگے ۔۔۔ خالق کے دل میں قیام پذیر ہے۔ ●●●

بقیہ پھولوں کی سیج

زیادہ پیار کیا ہے روی۔ تم کویتا سے ہی شادی کرو گے میں خود تمہیں دلہن بناؤں گی۔

"بڑی آئی دلہن بنانے والی" کویتا سامنے آ کر بولی۔ میں ہی تجھے بناؤں گی" پھر بہت پیار سے بولی:

"اس دن تو دیوی سے وہی مانگ لیا جو میں نے مانگا تھا۔ اب دیوی نے دے ہی دیا ہے، تو پیتا کیوں ڈرتی ہے۔ اب تو یقین آیا، دیوی دیوتاؤں کی بات جھوٹ نہیں ہوتی۔"

میں سمجھی نہیں" الوپما پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔

"الوپ نے ہمیشہ ہر چیز بانٹ کر کھائی ہے آج دیوی کا پرساد بھی بانٹ کر لیں گے۔"

"کویتا"! الوپما سے لپٹ گئی: "آج بھی تم مجھ کو پیچھے چھوڑ گئیں"

لیکن آج سے ساتھ نے کر چلوں گی" کویتا بھی خوشی سے مسکرائے جا رہی تھی۔

روی حیران تھا۔ لندن میں کویتا نے اسے یہ واقعہ بتایا تھا۔ لیکن وہ خوش نصیب روی خود ہو گا، یہ اس نے سوچا تک نہ تھا۔ لیکن اب وہ کتنا خوش تھا۔ زندگی کی کانٹوں بھری راہ میں اس کے لئے پھولوں کی سیج بن چکی تھی۔ ●●●

نسیم مظفر پوری

وقت کتنا ظالم ہے

اے اجل رسیدہ دل
تو مجھے کہاں لایا
کیا یہی جگہ ہے وہ
کل جہاں حسیں چہرے
شوخ، دل رُبا نغمے
ساز پُر امنگوں کے
جھوم جھوم جاتے تھے
دور اس پہاڑی کے
خوشنما سے ٹیلے پر
باغ ایک پھیلا تھا
جھیل کا ترنم تھا
حسن تھا جوانی تھی
کیف تھا فضاؤں میں
شوخیاں ہواؤں میں
کل یہاں کی ہر اک شے
تھی جواں اور خوش کُن
تھا بہار کا عالم

آج ان کی یادوں کی
راکھ صرف اڑتی ہے
مٹ گئے حسیں چہرے
اس زمیں کے ذرّوں میں
کھو گئی فضاؤں میں
پھول کی مدھر خوشبو
وقت کی یہ کروٹ بھی
کس قدر انوکھی ہے
وقت کتنا جابر ہے
وقت کتنا ظالم ہے!

●●●

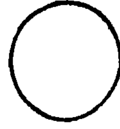
ندا فاضلی

شام

شور کرتا ہوا چھت پر گرا مانجھے کا سِرا
ننھے پیروں سے لپٹنے لگی خاموش گلی
میز پر اُگنے لگی دھوپ کی چھوٹی سی کلی
جھُنجھنا سنتے ہیں
پتیلی میں کئی سو تارے
پھیلتا جاتا ہے چھلکے پہ بڑا گول سا چاند
گر گیا ٹوٹ کے
چرپائی پہ چوکور گگن
جلتی سگرٹ سے اُلجھنے لگی دن بھر کی گھٹن

●●

مظفر حنفی



فائلوں کا جادوگر

اس کے ہاتھوں میں جادو ہے۔
لاکھوں ایکڑ جنگل اس نے صاف کیا،
سڑکیں بنوائیں،
سُندر بنگلے۔
ان گنتی تالاب،
کنوئیں تعمیر کیے،
باندھ بنا کر کھیتوں کو شاداب کیا
نہروں کی اسکیم کھڑی کی
لیکن ....
اس کے اور اس کی کرسی کے بیچ
کاغذ کی دیوار کھڑی ہے۔

●●●

پاگل، چاند اور چور

وہ کنارے پر کھڑا تھا
سامنے
بے شکن، شفاف چادر، سطحِ دریا کی بچھی تھی
چاند لیٹا سو رہا تھا۔
جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے
ایک پتھر کھینچ مارا
اور بھاگا،
سیکڑوں ہاتھوں نے موقع پا کے
پہلے چاند کے ٹکڑے سمیٹے
بعد ازاں،
چوری چھپانے کے لئے کہرام برپا کر دیا
دیکھنا! جانے نہ پائے!

●●●



خالد شفائی

"کسی کے نام"

اس طرح دیکھ کے نظریں تو چرا لیتی ہے
جیسے تجھ سے نہ کبھی میری شناسائی تھی
جیسے تو نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہو مجھ کو
جیسے دنیا میں مری تو نہ کبھی آئی تھی

وہ کھنڈر آج بھی پھرتا ہے نگاہوں میں مری
جس کے سائے میں لٹاتی تھی تو بھرپور شباب
جس کی آغوش میں کھل اٹھتے تھے بوسوں کے گلاب
جس کی آغوش میں ڈھلتی تھی مسرت کی شراب

o

تیرے اس بلبے سے گھونگھٹ سے گماں ہوتا ہے
پارسا تجھ سی نہ جیسے کوئی اس گاؤں میں ہے
تیری پلکیں کچھ اس انداز سے جھک جاتی ہیں
باحیا تجھ سی نہ جیسے کوئی اس گاؤں میں ہے

اور اس گاؤں میں اب جبکہ کئی سال کے بعد
ایک لذت بھری خواہش مجھے لے آئی ہے
یوں مجھے دیکھ کے نظریں تو چرا لیتی ہے
جیسے تجھ سے نہ کبھی کی بھی شناسائی ہے

o

گر نہ ہو یاد تو میں یاد دلاؤں کہ کبھی،
میری صورت کو ترستی تھیں تری یہ آنکھیں
تیرے گھونگھٹ کو ضرورت تھی مرے ہاتھوں کی
لذتِ لمس کی خواہاں تھیں تری یہ باہیں

میں نے مانا کہ تو "سادتری" ہے اور "مریم" ہے
پھر بھی یہ ذوقِ تغافل یہ ستم ٹھیک نہیں
اک سسکتی ہوئی تہذیب کی "عظمت" کے لئے
یہ تصنع، یہ بناوٹ، یہ بھرم ٹھیک نہیں

آسکر وائلڈ
ترجمہ: سہیل اختر

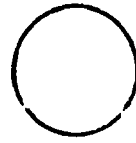
یادوں کے رنگ

ساز کے دودھیا پردوں پہ بصد نازو ادا
کیف و مستی کی مئے تند سے بے خود ہو کر
اس طرح کھیلتے تھے اس کے حسیں مرمریں ہاتھ
جس طرح زرد چناروں کے گھنے پتّوں پہ
نقرئی چاند کی لرزاں و درخشاں کرنیں
رقص کرتی ہوئی، چمکتی ہوئی بصد غمزہ و ناز
یا سمندر کی چمکتی ہوئی لہریں جیسے
خود کفِ بحر کے مسکاتے ہوئے پھولوں کو
بھینچ لیتی ہوں عجب شوق بھری باہوں میں

اس کے شانوں پہ حسیں زلفیں یوں بکھری ہوئی
پھول پر گیندے کے جیسے ہو سنہری جالی
جس طرح رات کی تاریکیٔ جاں سوز کے بعد
گلِ خورشید کے شانوں پہ سحر دم کرنیں
یوں بکھر جائیں کہ جس طرح رخِ سوسن پر
نور کا ایک حسیں ہالہ نظر آتا ہو

سوزِ دل سے مرے ان دہکے ہوئے ہونٹوں پر
اس کے گلنار و جواں لب تھے یوں آتش بکنار
جس طرح آتشِ یاقوت سے لے کر شعلہ
ایک قندیل سے جلے دور کسی معبد میں
یا کہ رِستا سا نظر آئے کوئی زخمِ انار
یا کوئی تازہ لہو رنگ کنول ہو جیسے
برسرِ بزمِ طرب جس کے دلِ نازک میں
ساغرِ سرخ سے چھلکی ہوئی صہبائے حسیں
مستی و کیف کا اک حشر اٹھا دیتی ہو

●●●



سید محسن نقوی

میں جلوۂ صد رنگ ہوں یا موجِ صبا ہوں
احساس کی چوکھٹ پہ کھڑا سوچ رہا ہوں

اے دوست! زمانے کی عنایات پہ مت جا
تو خاک بسر ہے تو میں زنجیر بپا ہوں

اِک جام تو پی لینے دے اے گردشِ دوراں
پھر تجھ کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں کیا ہوں؟

ہر اشک یہاں روکشِ تنویرِ سحر تھا
ہر زخم یہ کہتا ہے ترا رنگ قبا ہوں

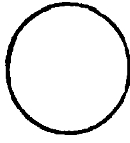
مانوسِ شبِ غم جو نہیں تھا مرا احساس
ہلکی سی اِک آہٹ پہ بھی اب چونک پڑا ہوں

سو بار زمانے نے مجھے زہر دیا ہے!
سو بار میں سچ بول کے سقراط بنا ہوں

روشن ہیں زمانے کے در و بام مجھی سے
میں وقت کے چڑھتے ہوئے سورج کی ضیا ہوں

محسوس یہ ہوتا ہے مجھے تجھ سے بچھڑ کر
جیسے میں ترے بعد زمانے سے خفا ہوں

اکثر اُسے پا لینے کی خواہش میں اے محسن
میں اپنے لئے راہ کی دیوار بنا ہوں



شفقت کاظمی

رودادِ غم زبان پہ لانے سے فائدہ
وہ ملتفت نہیں تو سنانے سے فائدہ

جس بارگاہِ ناز میں ممکن نہیں کلام
اس بارگاہِ ناز میں جانے سے فائدہ

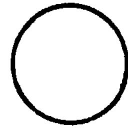
جن دوستوں کو پاسِ محبت نہیں رہا
اُن دوستوں کی آس لگانے سے فائدہ

کشتی کرے گی آپ ہی طوفاں کو سازگار
احسان ناخدا کے اٹھانے سے فائدہ

جن کے حضور ہوش میں رہنا محال ہے
ان کے حضور ہوش میں آنے سے فائدہ

شفقت ہزار بار ہنسی جس کی اُڑ چکی
وہ بات پھر کسی کو سنانے سے فائدہ





مہدی پرتاپ گڑھی

ب تک میں ان فسردہ رواجوں کا ساتھ دوں
ایدمیں زیست سے نہ ہم آہنگ ہوسکوں
د اپنے ہی فریب وفا کا شکار ہوں!
، دوستوں کے حسنِ عنایت کو کیا کہوں

یسا جو تیرگی کی پرستار ہے تو ہو،
، کیوں نہ روشنی کے تقاضوں کا ساتھ دوں

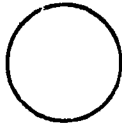
ب آرزو کا شہر مرے ساتھ ہو لیا
ب فکر کیا ہے میں کسی دنیا میں جا بسوں

ے چشم یار تیری روایت پہ کیا بنے!
، بھی جو تیرے حسنِ عنایت پہ ہنس پڑوں

ری تباہیوں کا سبب پوچھتے ہیں لوگ
ب آپ ہی بتائیں کہ میں کیا جواب دوں

ب وفا پہ خود بھی بھروسہ نہیں مجھے
نی زباں سے کیسے اسے بیوفا کہوں!

ہدی مجھی سے گردشِ لیل و نہار ہے
، گردشِ حیات کا پابند کیوں رہوں



اخلاق فتحپوری

دل کو اندیشۂ دوراں سے گریزاں کرلیں
تم سے اِک اور ملاقات کا ساماں کرلیں

آخری قطرۂ خوں صرفِ گلستاں ہی سہی
اور کچھ دیر ابھی جشنِ بہاراں کرلیں

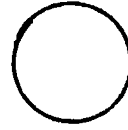
بڑھ گیا یاس کی تاریک شبی کا عالم
آؤ اشکوں کے چراغوں کو فروزاں کرلیں

آج کی رات غمِ ہجر پہ بھاری ہے بہت
آج کی رات تری یاد کو مہماں کرلیں

ہائے کیا چیز ہے ہم تیرہ نصیبوں کی خوشی
خون دل اپنا جلائیں تو چراغاں کرلیں

ہر زباں پر ہو محبت کا ترانہ اخلاق
اتنا اس جنس گراں مایہ کو ارزاں کرلیں





آزاد گلاٹی

خلائے ذہن کے گنبد میں گونجتا ہوں میں
خود اپنے عہدِ گزشتہ کی اِک صدا ہوں میں

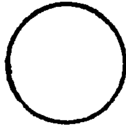
سمیٹ لاتا ہوں موتی تمہاری یادوں کے
جو خلوتوں کے سمندر میں ڈوبتا ہوں میں

تمہیں بھی مجھ میں نہ شاید وہ پہلی بات ملے
خود اپنے واسطے اب کوئی دوسرا ہوں میں

جو دے سکو تو محبت کے ٹھنڈے سائے دو
خیال و خواب کی دنیا میں جل رہا ہوں میں

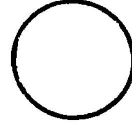
وہ خود بھی میں کہیں کھو گیا نہ ہو آزاد
جسے خلائے زمانہ میں ڈھونڈتا ہوں میں





حفظ الباری حافظ

آئیں یا نہ آئیں وہ، یہ ہے اختیار اُن کا
اے دل آج جی بھر کے کر لے انتظار اُن کا
کس کو ہمنوا مانیں، کس کو رازداں مانیں
اِک دل تھا پہلو میں، وہ بھی رازدار اُن کا
میں تو اس فسانے کو اپنی داستاں سمجھا
ذکر جس فسانے میں آیا ایک بار ان کا
درد نے سنوارا ہے۔ عشق کے خمستاں کو
چھین کر سکوں میرا، لوٹ کر قرار اُن کا
آس اب بھی باقی ہے، عرض مدعا کیجئے
ہوش ان کے قابو میں دل پہ اختیار ان کا
ایک بار دیکھا تھا شوق کی نگاہوں سے
دن کو یاد ہے ان کی، شب کو انتظار ان کا
حسرتوں کے مدفن میں جل رہی ہیں قندیلیں
زیست کا سہارا ہے، جب سے اعتبار ان کا
رشتۂ نیاز و ناز، استوار ہوتا ہے
مٹ گئی جبیں اپنی، بن گیا دیار ان کا
اب جناب حافظ کا بس خدا ہی حافظ ہے
خوب ہو چکے رسوا، کر کے اعتبار ان کا



سید شکیل دسنوی

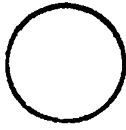
وہ اہل نظر فن کو جو اپنائے ہوئے ہیں
ناقدری کے مصلوب ہیں ٹھکرائے ہوئے ہیں

ہم دیکھ چکے حد ہے کہاں جور و ستم کی
ہم اپنی وفاؤں کا صلہ پائے ہوئے ہیں

ہم اور نہ سلجھا سکیں پیچ و خم ہستی
گیسوئے شب ہجر کو سلجھائے ہوئے ہیں

غیروں کا ستم کوئی نئی چیز نہیں ہے
اپنوں کی محبت کا صلہ پائے ہوئے ہیں

نظروں میں شکیل اب نہیں جچتا غم دوراں
ہم تو غم جاناں کا مزہ پائے ہوئے ہیں



ناز قادری

ذکر رخسار و دہن ہو تو غزل ہوتی ہے
منظر حسن چمن ہو تو غزل ہوتی ہے

فکر تزئین چمن ہو تو غزل ہوتی ہے
جوش پہ حب وطن ہو تو غزل ہوتی ہے

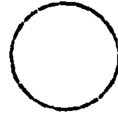
صرف پازیب کی جھنکار پر موقوف نہیں
فتنۂ دار و رسن ہو تو غزل ہوتی ہے

ذہن شاعر میں ابھر آتے ہیں ماضی کے نقوش
پہلوئے دل میں چبھن ہو تو غزل ہوتی ہے

یوں تو دعوی سبھی کرتے ہیں غزل گوئی کا
غالب و میر کا فن ہو تو غزل ہوتی ہے

تلخئ زیست سے گھبراتے نہیں ہم اے ناز
کاہش رنج و محن ہو تو غزل ہوتی ہے

●●　　●●



جی۔ ایم۔ راہی

نگاہِ باغباں کو جب نہ پایا معتبر ہم نے
کلوں کو بخش دی کیفیتِ برق و شرر ہم نے

یقیناً ملتفت تھا غائبانہ طور پر کوئی
نہیں محسوس کی دشواریٔ راہِ سفر ہم نے

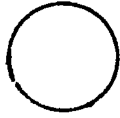
بالآخر، جب ہمارے ضبط کا پیمانہ بھر آیا
شبِ تاریک سے پیدا کیا نورِ سحر ہم نے

حریمِ ناز کے جلوے سمٹ کر خود چلے آئے
نگاہِ شوق میں پیدا کیا ایسا اثر ہم نے

کسی کا آسرا کھو کر، کسی کا آسرا پا کر
بنا لی ہے شبِ غم بھی طویل و مختصر ہم نے

ہمکو نہ جب راہِ وفا کا راہرو کوئی
بنا کر خود مٹا ڈالے نشانِ رہگذر ہم نے

نہ روکیں گی ہمیں وہم و گماں کی منزلیں راہیؔ
بنایا ہے خود اپنی جستجو کو راہبر ہم نے



شاہد ماہلی

وفا کے ساز اٹھاؤ کہ درد تھم جائے
قریب اور کچھ آؤ کہ درد تھم جائے

اُداس اُداس فضائیں اُداس اُداس یہ رات
سحر کی آس بندھاؤ کہ درد تھم جائے

میرے قریب جو لرزاں ہیں یاد کے سائے
ہٹاؤ ان کو ہٹاؤ کہ درد تھم جائے

سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی فسوں انگیز
کوئی غزل ہی سناؤ کہ درد تھم جائے

امیدیں ٹوٹ گئیں انتظار ختم ہوا
ستارو! ڈوب بھی جاؤ کہ درد تھم جائے

بہت گراں ہے شبِ زندگی کی تاریکی
کہیں سے روشنی لاؤ کہ درد تھم جائے

اندھیرے پھیلیں جو شاہدؔ، چراغِ فکر جلے
سخن کی جوت جگاؤ، کہ درد تھم جائے

کامل صدیقی لکھنوی

میں چچا بنا

یقین جانئے یہ خودستائی نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ لفظ "چچا" سن کر ہمیں کچھ
رح کی وحشت سی ہونے لگتی ہے گویا وہ کاٹنے دوڑتا ہو۔ اس کے خاص وجوہ
ی عقل ناقص میں آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اول تو یہ کہ اس قسم کی چیز ہمارے
اں میں ذرا کم ہی نظر آتی ہے مطلب یہ کہ نہ تو ہمارے ہی کوئی چچا ہیں اور نہ
ی ہمیں چچا کہنے والا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ کسی راہ چلتے کو تو ہم چچا کہنے سے
رہے اور اسی لئے یہ لفظ کچھ جانا پہچانا نہیں معلوم ہوتا اور دوسرے یہ کہ اس نام
شکل کو ہم نے دیکھا بھی ہے تو بس یوں سمجھئے کہ ذہن میں ہی الجھن سی
لگتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک حضرت جو قریب چچا
کے واقع ہوئے ہیں تمام شہر میں چچا کے نام سے مشہور ہیں آپ کیا عرض کریں

حضرت کو شاید ہی ہم نے کسی وقت اپنے "آثار قدیمہ" قسم کے سقہ سے بچے
رماتے دیکھا ہو ورنہ تو بس یہی دیکھا کہ کبھی تو اخذ میں بھڑکتے ہوئے بے تحاشا
بکتے ہوئے بچوں کے پیچھے دوڑے جا رہے ہیں تو کبھی پچے ہوئے کپڑے
آفت کے مارے ہوئے "چچا" کہنے کا بدلہ لینے میں مصروف ہیں۔ ایک روز
ہیں کوئی صاحب کہیں باہر سے اپنے چچا کے گھر تشریف لائے ہوئے تھے
اتفاق سمجھئے کہ وہ پہلی ہی بار آئے تھے اور اپنے چچا کا پتہ انہوں نے پوچھا
رے رہین الاقوامی "چچا" سے بس یقین جانئے کہ بیچارے کئی بار پٹتے پٹتے
کو خیر ہوئی محلے کے لوگ بر وقت ملاقات کو پہنچ گئے ورنہ ان بیچاروں کا پتہ
شتر کرنے ہمارے پیارے محبت کے چچا۔ دیکھا صاحب؟ اسی کو بات سے بات
ئیں تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ انہی سب باتوں کی وجہ سے ہم لفظ "چچا"
چونکتا ہی رہتے ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ اس کا کیا علاج ہے کہ اس
سنتے ہی ہمارے ذہن میں "چپت" "چمچہ" "چھچھوندر" قسم کے الفاظ چلنے
۔ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ کسی خاندان میں جھگڑا ہو پڑے دار نا ہو
معاملے میں فقط ایک کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہوں۔ عام طور پر آپ کو
ے میں چچا کا نام ضرور چڑھا ملے گا۔ ایسے بھی آپ کو کتنے جائیں گے جنہیں
بنانے اور سیدھا کرنے یا محض بیوقوف بنانے کے سلسلے میں بخشا گیا ہو۔ مگر ہم اب
سے کیا بتائیں کہ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور "چچا" سے سخت قسم
کے پرہیز کے باوجود بھی ہم خود اس لفظ کی زد میں ایسا آئے ہیں کہ اس کی تلخی ابھی
تک دور نہیں ہو سکی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہم کہیں سے لکھنؤ جا رہے تھے اور جیسا کہ
آپ جانتے ہیں کہ آجکل مناسب نوکری اور ریل میں مناسب سی جگہ ملنا قسمت ہی
پر منحصر ہے۔ ہم ڈبہ میں داخل ہوتے ہی ادھر صاحب قسمت کے ایکدم کے لئے ثابت
ہوئے۔ یعنی کہ ہماری سیٹ جسے ہم محفوظ کرا چکے تھے اس کے سامنے والی سیٹ پر
ایک پست قد گول مٹول سی ہماری جیسی محترمہ بیٹھی ہوئی تھیں اور خاکسار کی برتھ پر
انہوں نے اس قدر سامان دھر رکھا تھا کہ اگر وہ سب سامان ترتیب سے رکھا
جاتا تو شاید آدھا ڈبہ بھی کم پڑتا۔ اب ایسے موقعوں پر انسان کی جو حالت ہوتی ہے
وہ شرح ہی لوگ اچھی طرح جانتے ہوں جنہیں کبھی اس قسم کے حادثات سے دوچار
ہونا پڑا۔ پہلے تو ہمیں بڑا غصہ آیا مگر تے نہ تو کرتے کیا والی مثل یعنی کہ نہایت شرافت
کے ساتھ ایک جگہ پر جسے خالی کیا جا سکتا تھا ہم بیٹھ تو گئے۔ مگر بجز ہمارے شان و
گمان میں بھی نہ تھی کہ ہم مارے شرافت کے پھلوں کی ٹوکری پر اکتفا کر سکتے ہیں۔
نتیجہ ظاہر ہے۔ محترمہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں کھا جانے والے انداز سے
گھور کے دیکھا اور اس زور سے خدا جانے ٹوکری کو کھینچ کر ہمیں جھٹکا دیا کہ ہم گویا
ہوا میں تیر گئے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ نہایت ہی کرخت آواز میں فرمانے لگیں

"دیکھتا نہیں پھلوں کا ٹوکری رکھا ہے" ہم گر کر سنبھلے تھے۔ لہذا نیت
اسی میں نظر آئی کہ محترمہ سے بتا دیں کہ سامنے والی سیٹ سامان رکھنے کی الماری نہیں
بلکہ اس بدنصیب کے آرام کی جگہ ہے۔ ہم نے تمام ہمت سمیٹ کر ڈرتے ڈرتے عرض
کیا۔ "معاف کیجئے گا یہ ہماری جگہ ہے" اور محترمہ آپ واقعی اس جگہ کے قابل سمجھ
کر کبھی اپنے تمام سامان کو اور کبھی ہم کو کچھ اس انداز سے گھورنے لگیں گویا سب
سامان تو سیٹ پر آگیا ہو مگر ایک عدد بچہ ہی چھوٹ گیا ہو۔ مگر صاحب اپنی تو
سیٹ کے بارے میں ہمارے احتجاج سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ان اللہ کی بندی
کا غصہ کچھ کم ہو گیا اور ساتھ ہی انہوں نے اس جگہ میں سے جسے عام طور پر ڈبہ میں
پہلے داخل ہونے والے مسافر بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت سمجھتے ہیں، تھوڑی

جگہ بیٹھنے کے لئے دے دی۔ ابھی ہم اپنی جگہ سے سامان ہٹا کر آرام کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ محترمہ نے "چچا" والا تیر بہدف نسخہ آزمایا یعنی وہ نہایت اپنائیت کے ساتھ اپنے بچوں سے کہنے لگیں کہ "دیکھو تم لوگوں کی وجہ سے تمہارے "انکل" یعنی "چچا" کو کس قدر تکلیف پہنچ رہی ہے۔ بس جناب یہیں پر میں زندگی میں پہلی بار "چچا" بنا۔ یقین جانئے! یہیں سے ہماری وہ درگت بننا شروع ہوئی ہے کہ تمام سفر گویا مٹی پلید ہو کر رہ گئی۔ ہم آپ سے کیا عرض کریں کہ بچے ہمارے اور آپ کے گویا کہ سبھی گھروں میں ہوتے ہیں مگر خدا نہ کرے کہ کسی کے ایسے نالائق بچے ہوں جیسے کہ ان محترمہ کے تھے۔ پہلے تو ان بچوں کی والدہ ماجدہ نے اسی منحوس پھلوں والی ٹوکری میں سے جس پر بیٹھ کر میں بھرت چکا تھا کچھ پھل وغیرہ نکال کر ہم چچا بھتیجوں کی تواضع کی اور پھر اس قدر بے تکلفی کا ثبوت دیا کہ ہم گویا "چنوں چنوں کا مربہ" بن کر رہ گئے۔ ظاہر تھا وہ نانا نانی کے بچے بد تمیزی کی حد تک کھل مل گئے تھے۔ ایک بھتیجے صاحب تناول کرنے کے بعد اپنے گندے ہاتھ نہایت صفائی سے میرے نئے کوٹ سے صاف کئے اور دوسرے حضرت جو ماشاء اللہ اپنے علاقہ کی مناسبت سے کافی تندرست واقع ہوئے تھے۔ کچھ اس انداز سے اچک کر ہماری گردن پر آگئے کہ اگر ہم بروقت دونوں ہاتھوں سے انہیں سنبھال نہ لیتے تو یقین جانئے ہو رہے تھے کسی ڈاکٹر کے محتاج۔ مگر جناب ذرا ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیے کہ وہ فٹ بال نما محترمہ اپنے بچوں کی ان حرکات پر دانت نکال نکال کر ہنس رہی تھیں اور پھولی نہ سماتی تھیں اور اس پر حادثہ یہ کہ ہم بھی ان محترمہ کے ساتھ زبردستی کی ہنس کر اپنے اخلاقی فرض کا ثبوت دیئے جا رہے تھے۔ گاڑی اپنی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی اور ہم چچا اور چچی بنتے جا رہے تھے۔ آپ یقین جانئے کہ اپنے بھتیجے صاحبان کی بے ہودہ حرکتوں سے اس قدر داب چکے تھے کہ بس انہیں بری طرح پیٹنے کو طبیعت چاہ رہی تھی۔ مگر پیٹ بھی کیسے سکتے تھے چچا جو ٹھہرے۔ مختلف "اسٹاپوں" پر بچوں کی فرمائشیں ہم نہایت دریا دلی کے ساتھ پوری کر رہے تھے۔ باقاعدہ انہیں گود میں لاد کر باہر لے جاتا، حسب فرمائش چیزیں دلاتا اور اسی عالم میں انہیں صحیح سلامت اپنی جگہ پر پہنچاتا گویا ہمارا پورا "پورٹ فولیو" بن چکا تھا۔ مگر صاحب کمال کی چیز تھیں وہ فوٹ بال نما محترمہ بھی۔ اب کیا مجال جو ذرا بھی فرق آیا ہو ان کے جھومنے میں۔ بس یوں لگتا تھا گویا بری طرح سے افیم کے نشہ میں مخمور پڑی ہوں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ چچا بے چارہ کن صبر آزما لمحات سے گذر رہا تھا۔ ایک دم سے ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی جو رکی تھی تو وہ کچھ بیدار ہو گئیں اور ہمارے پاس اپنے بچوں کو بیٹھا دیکھ کر کچھ اس طرح دیکھا جیسے ہم بچوں کو پکڑنے والے کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں تو پھر کچھ سوچ کر فرمانے لگیں:-

"ابھی آپ سوئے نہیں"۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم ان عقل کی دشمن کو کیسے سمجھاتے کہ محترمہ نہ تو ہم اور نہ ہمارے کوئی قریبی رشتہ دار ہی افیون سے شوق فرماتے ہیں اور نہ ہی ہمیں بیٹھے بیٹھے سونے کی عادت ہے مگر غیر ارادی طور پر منہ سے نکل گیا۔

"جی ہم رات کو نہیں سوتے" اور یقین جانئے کہ اس پر وہ "کچھ" ہو ہو ہو کر کے اس بری طرح سے ہنس پڑیں کہ لگتا تھا جیسے رو رہی ہوں اور واقعی انہیں اس عالم میں دیکھ کر کچھ ڈر سے گئے۔ ہم کو اس بات کا پہلی بار اندازہ ہوا کہ پہاڑوں پر زلزلے کیسے آتے ہیں۔ اس وقت تک ہمارے دو بھتیجے صاحبان ہم کو اپنا بستر شب خوابی بنا چکے تھے۔ اور اس بری طرح سے سو رہے تھے ہمارے کپڑوں کا ستیاناس ہو کر رہ گیا تھا۔ اب ظاہر تھا کہ یہ وہ وقت تھا ہر شریف آدمی کو نیند محسوس ہوتی ہے۔ لہذا محترمہ تھوڑی دیر تو فٹ بال کی طرح کروٹ بدل کر دراز ہو گئیں مگر فوراً ہی پھر اٹھیں، کچھ سوچتی رہیں پھر ایک ٹوکری کر کچھ ٹافیاں نکالیں اور ہمارے ہاتھ میں کچھ یوں دینے لگیں گویا کسی کو چمکار کر بہلا رہی ہوں۔ ہم واقعی عجیب چکر میں پھنسے تھے۔ بہرحال ہم ٹافیاں لئے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ محترمہ سر الہیند کا سانس لے کر لیٹ گئیں۔ ڈبہ کے تمام مسافر خراٹے بھر رہے تھے اور ہم ٹافیاں چوس رہے تھے اور سوچ رہے تھے کاش لفظ "چچا" نہ ہوتا تو ہم ان محترمہ کو بتا دیتے کہ اس طرح سے کسی شریف کے ساتھ زیادتی کرنا ٹھیک نہیں۔

حیات کی منزلوں کو طے کرنے کے لئے راستے سے زیادہ انسان کو پیروں کا خیال رکھنا پڑتا

سرتاج بانو شبنم



دسمبر کا مہینہ آیا اور لڑکیاں جھوم جھوم اٹھیں۔ اب انتظار تھا تو صرف سپرنٹنڈنٹ مسز کھنہ کے حکم کا۔ کتنی بے چینی سے انتظار کرتی تھیں لڑکیاں کہ کب دسمبر آئے اور وہ پکنک پر نکلیں۔

اس دن لڑکیاں پوری طرح جاگ بھی نہ پائی تھیں، کہ انوپما کی آواز کانوں میں پڑی، جو متواتر چیختے جا رہی تھی۔ "اری کویتا، نلنی، کملا، سریکھا، شیلا۔ جلدی آؤ" اور شیلا ہاتھ میں ٹوتھ برش لئے، سریکھا بال کھولے ہوئے۔ نلنی منجن سے منہ کالا کئے اور کملا کویتا بستر سے اٹھ کر کچھ اس طرح بھاگیں کہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ پھر سنبھل کر بھاگیں اور جب انوپما سے سُنا کہ کل انہیں دیوی پور جانا ہے، تو سب خوشی سے ناچ اٹھیں۔

دیوی پور شہر سے ۶۰ میل دور ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جہاں دیوی کے مندر نے گاؤں کی رونق کو دوبالا کر دیا تھا اور نوراتری کا میلہ تو چاروں طرف دھوم مچا دیتا۔ دور دور سے لوگ تمناؤں اور آرزوؤں کو سینے میں لئے آتے اور جھولی بھرے جاتے اور کیوں نہ آتے۔ پونم کی رات مانگی گئی مراد دیوی پوری کرتی تھی۔

گنگا مائی ہوسٹل کی لڑکیاں، جب دیوی پور کے لئے روانہ ہوئیں، تو اپنا خوش تھیں، جیسے چاند کے سفر پر روانہ ہوں۔ سال بھر منتیں کرنے کے بعد وہاں جانے کی اجازت ملی تھی۔

انوپما اور کویتا ہوسٹل میں دو تن اور ایک جان مشہور تھیں۔ انوپما خوب صورتی اور خوب سیرتی کا جیتا جاگتا پیکر تھی۔ شوخی پر اترتی، تو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتی شرارت پر کمر کستی، تو رُلا رُلا کر ہنستی۔ گانے پہ آتی، تو سب کو بیخود کر دیتی۔ پڑھائی میں سب سے آگے تو تھی ہی محبت کرنے پہ آئی تو کویتا سے اتنا پیار کرنے لگی کہ اس کے بنا ایک پل بھی نہ رہ سکتی اور کویتا معمولی شکل و صورت کی سنجیدہ اور ذہین لڑکی تھی۔ جب کبھی کویتا کہتی:

"انوپما! بھگوان نے بڑی فرصت سے تجھے بنایا ہے سب کچھ تجھے ہی دے دیا"

تو وہ بات کاٹ کر کہتی "نہیں کویتا! سب سے حسین چیز تو تیرے حصے میں آئی!"

"وہ کیا؟" کویتا حیرت سے پوچھتی۔

"ایک خوبصورت دل!" اور کویتا اسے سینے سے لگا لیتی۔

دیوی کے سامنے بیٹھی ہوئی کویتا بھی دیوی ہی جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے پر ایک نور جس میں دیوی کے لئے ایک یقین تھا۔ ایک اعتماد تھا۔ ہنستی مسکراتی انوپما اُسے دیکھ اس کی بغل میں جا کر بیٹھ گئی اور کویتا کا دھیان ہٹانے کے لئے

زور سے بولی:

" دیوی! کویتا نے جو مانگا ہے، وہی مجھے بھی دینا۔"

کویتا حیرت سے بولی " اری انوپ! جانتی ہے میں نے کیا مانگا ہے"؟

" اونہہ! مانگا ہوگا کوئی راج کمار!"

" ہاں راج کمار ہی تو .....!" کویتا خیالوں میں کھوئی ہوئی بولی۔

" اری چھوڑ! انوپما اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔ کیا دیوی کی بات سچ ہو جائے گی۔ کیا میں تیرا راج کمار لے لوں گی" اتنا بھی وشواس نہیں مجھ پر۔"

لوٹ کر انوپما ایک دن شرارت سے بولی " کویتا! اگر دیوی کی بات سچ ہوگئی تو؟"

" ہوگا کیا؟ ہنسنا تیرے حصے میں آئے گا، رونا مجھے پڑے گا" کہکر کویتا مسکرادی

" کیوں تو کیوں روئے گی؟" کویتا تو سمجھتی ہے میں تجھ سے جھگڑا کروں گی؟" انوپ شوخی سے کہتی

" نا نا۔ تو کیا لڑے گی مجھ سے! لیکن صاحب بہادر ہی تجھ جیسی حور پری کو پاکر بھلا مجھ کالی کلوٹی کی طرف کیوں دیکھنے لگے؟"

" اے کویتا" انوپما بولی " اب کبھی پری وری کہا تو" لنگور بنادوں گی" کویتا کہکر ہنس پڑی۔

" دیکھ انوپ!" کویتا یوں بولی جیسے ان کی شادی ہونے ہی جارہی ہو۔ ہم دونوں کام بانٹ لیتے ہیں۔ میں چوکا سنبھالتی ہوں۔ تم صاحب بہادر کے ساتھ باہر کا کام کیا کرنا"

اور انوپما مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے اٹھ گئی۔

آج ان باتوں کو عرصہ گذر گیا ہے۔ کویتا اب مقامی کالج میں لکچرار ہے، وہ بہت خوش ہے۔ ردی سے اگلے ماہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ انگلینڈ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لے کر آیا ہے۔ اس کی ماں کالنری دیوی تو کویتا کو بہت پسند کرتی ہے

آج کویتا کو انوپما کی یاد آرہی ہے، جو اس ہفتے لندن سے لوٹنے والی ہے۔ اس کی یاد آتے ہی کویتا کو ہنسی آگئی۔ شوخ شرارتی انوپما وہاں کسی نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی۔ لکھا تھا "وہاں آکر تم سے ملاؤں گی"

"بیٹی! ردی کی ماں چل بسیں!" اپنے پتاجی کی آواز سنتے ہی وہ چونک پڑی اور پھر پھپک پھپک کر رو پڑی۔ ماں کی ممتا سے محروم کویتا نے کالنری دیوی کے آنچل سے ماں کا پیار پالیا تھا۔ یہ آج اسے پھر کھو بیٹھی تھی۔ کتنے ہی دنوں تک وہ اُداس رہی۔ آج دیپک کا خیال آتے ہی وہ اس کے گھر کی طرف چل دی۔ لیکن انوپما کو وہاں داخل ہوتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کسی انجانے جذبے نے اُسے ان کی باتیں سننے پر مجبور کر دیا۔

" ردی! یہ انوپما کی لرزتی ہوئی آواز تھی" تمہارا خط مجھے مل گیا۔ میں تم سے پیار ضرور کرتی ہوں۔ تمہارے بنا رہنے کی سوچ بھی نہیں سکتی۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں

" انوپ! ردی بھرائی ہوئی آواز میں بولا " میں نے کو وچن دیا ہے۔ ماں نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ بچپن سے مجھے چا ہے۔ قسم کھائے بیٹھی ہے کہ میرے سوا کسی سے شادی نہ کر ماں کے آخری دنوں میں اسی نے ماں کی خدمت کرکے ماں کو طاقت دی کہ میرے لوٹ آنے تک جی سکیں۔ پھر اگر ماں اس احسان کے بدلے اسے اس کی پیاری چیز دینے کا وعدہ کیا، تو کیا بُرا کیا؟ میں تم سے اب بھی پیار کرتا ہوں انو لیکن کویتا نہ ہوتی تو میری ماں تڑپ تڑپ کر مرجاتی۔

" کویتا! انوپما چونک کر بولی۔ کیا گردھاری لا کی لڑکی"؟

" ہاں! کیا تم اسے جانتی ہو" ردی حیرت سے بو

" او ردی!" وہ خوشی سے بے حال ہوتی ہوئی

" تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ خوش نصیب ہے۔ کویتا تو دیوی ہے ردی۔ اس نے مجھ پر بڑا احسا ہیں۔ میں اب اس کی خوشیاں نہ لوں گی۔ میں تو کویتا کو

عبدالحنان

تصادم

آؤ ریحؔو میں تمہیں ایک خط دکھلاتا ہوں جو میں تمہیں
وسٹ نہیں کر سکا۔

تمہارے بغیر شہر اجنبی سا لگ رہا تھا۔ یہ وہی تو شہر تھا
ہری تمناؤں کا مسکن۔ جہاں دل و دماغ نے پہلی بار مجھ سے
فادت کی تھی۔ مگر آج نہ جانے اپنے اس پرانے شہر میں مجھے غربت
ا بُری طرح احساس کیوں ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے
یں کسی نئی جگہ پر آ گیا ہوں۔ اس احساس کو کم کرنے کے لئے
یں پیلازہ کی طرف چلا گیا۔ جہاں "آئی کونفس" چل رہی تھی
ب میں ٹکٹ لے کر لوٹ رہا تھا تو تمہیں کار سے اترتے دیکھ کر
یرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

وہی مست کر دینے والی شوخ و بیباک نگاہیں۔ وہی
نان بے نیازی۔ وہی بکھری بکھری آوارہ زلفیں جو اس وقت
ی لہرا رہی تھیں اور پہلے کی طرح اس وقت بھی میں سوچ
رہا تھا

پھر کاکلِ شب گیر میں چمکا رخِ روشن
پھر کفر کی آغوش میں ایمان نظر آیا

ور تم ایک جان لیوا مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگیں
تھیں۔ ہاں وہی نیند میں ڈوبی ہوئی سی شربتی آنکھیں
تم سراپا وہی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا، پہلے تم میرا کا کوئی
بھجن تھیں اور آج وڈسورتھ کی کوئی نظم۔ جو دوپٹہ کل تک

سر کو ڈھانپے رہتا تھا آج گردن میں پھندہ بن کر رہ گیا
تھا۔ کچھ بھی ہو نیڈی لباس میں تم پہلے سے زیادہ دلکش
نظر آ رہی تھیں۔ اور کتنی ہی نگاہیں تم پر ٹکی ہوئی تھیں۔
لیکن ان نگاہوں کی ییٹ سے ہٹ کر تم کار کا سہارا
لئے کھڑی تھیں۔

تم کیا سوچنے لگیں آگے پڑھو۔

بار بار تمہاری زلفیں جو کبھی چکلی پیشانی پر لہرا جاتیں
اور تم چہرہ پر خفگی کے آثار لئے انہیں اپنی مخروطی انگلیوں
سے ہٹا دیتیں۔

میں اس وقت تم میں دو تبدیلیاں مارک کئے
بغیر نہ رہ سکا۔

ایک اداسی۔ دوسری بے حیائی۔

نہ جانے تم اس قدر کیوں اداس اداس الجھی الجھی
سی نظر آ رہی تھیں۔

میں دل سے سوال کرتا ۔۔۔؟ تمہارے قریب جاؤں
یا نہ جاؤں ۔۔۔ اتنے دنوں نہ ملنے کی وجہ اگر تم پوچھو گی
تو میں کیا بتاؤں گا۔ تم اگر دوسروں گھورتی نظروں کی پرواہ
کئے بغیر میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگو گی
تو میں کیا کروں گا۔؟ میں کھڑا یہی سوچتا رہا۔ دل سے
سوال کرتا رہا۔ لیکن دل سوائے دھڑکنے کے اور کیا جانے

بے ہنگم طریقے سے دھڑکتا جارہا تھا۔ کاش دھڑکن کوئی سن سکتا ——! اگر کوئی سننے والا نہیں تو اسے بند کردے !!

میرا دل پہلے بھی دھڑکتا تھا۔ لیکن اس دھڑکن میں ایک لذت تھی، ایک عجیب انداز تھا اس دھڑکن کا۔ اُس وقت دل کا دھڑکنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ اور اِس وقت کی دھڑکن سے الجھن ہو رہی تھی۔ دھڑ دھڑ..... دھڑ.... عجیب بے ہنگم سی آواز۔

اور میں ایک کونے میں کھڑا تمہیں تکتا رہا حسرت و یاس کے ایک پیکر کو۔ غم واندوہ کی ایک تصویر کو۔ یہ کیا تم ——؟ تم کہاں کھو گئیں ——؟ آگے بڑھو......

تم گم سم سی بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتی رہیں۔ اور تب ہی ایک دوسری کار تمہارے قریب آکر رکی میں نے دیکھا ایک نوجوان اس میں سے اترا اور اس نے تمہارے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور تم چونک سی گئیں اور پھر ایک تلخ سی مسکراہٹ نے تمہارے چہرے کے گلاب جیسے رنگ کو اور بھی تپا دیا۔ وہ مسکراہٹ زیادہ دیرپا نہیں تھی۔ یکایک پھر تم اداس ہو گئیں۔ بجھی سی گئیں، کمھلا سی گئیں۔ تم نے ابتک مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اور جب وہ نوجوان ٹکٹ لینے کھڑکی کی طرف بڑھا تو تم میرے مدمقابل تھیں تم نے مجھے دیکھ لیا اور شام خنک ہونے کے باوجود بھی تمہاری پیشانی پسینے سے بھیگ گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تم کچھ ہی دیر میں رو پڑو گی۔ مگر تم روئیں نہیں۔ خالی خالی نظروں سے مجھے تکتی رہیں۔ اس درمیان وہ نوجوان ٹکٹ لے کر آگیا تھا۔ تم دونوں ہال میں جانے کے لئے آگے بڑھے۔ تم نے جاتے جاتے ایک بار مڑ کر مجھے دیکھا اس طرح جیسے وہ نوجوان کچھ بھانپ گیا تھا۔ اس نے جانے تم سے کیا پوچھا۔ تم نے پتہ نہیں کیا جواب دیا۔ میں یونہی کھڑا سگریٹ کا کش لگاتا رہا۔ اور دل سے پوچھتا رہا آخر یہ نوجوان کون ہے؟

کون ہوگا کی ضرب کاری تھی میں برداشت نہ کر بھاگا بھاگا ہال میں داخل ہوگیا۔ ہال بالکل گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ لیکن میرا دل فلم میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ ذہن میں ایک ہی سوال گھوم رہا تھا ——

آخر وہ نوجوان کون ہے ——؟

میں نے بے خیالی میں سگریٹ نکال کر لائٹر سلگایا حالانکہ بعد میں مجھ کو یہ احساس ہوا کہ ہال کے اندر پینا ممنوع ہے۔ لائٹر کی مدھم روشنی میں تم نظر آگئیں ساتھ ہی ساتھ وہ نوجوان بھی۔ تم نے مجھے دیکھ لیا اور ایک دم سے تڑپ گئیں سگریٹ سلگ چکا تھا۔ دل سلگ چکا تھا۔ جذبات سلگ چکے تھے۔ ارمان سلگ چکے تھے۔

تب ہی میں ہال سے نکل بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا۔

مگر تم بغل میں تھیں۔ تم نے نہ جانے کیسے میرا بھانپ لیا اور اپنا ہاتھ دھیرے سے میرے ہاتھوں سے مس کر دیا۔ میں لرز گیا۔ چونک کر تمہاری طرف تمہاری آنکھوں کے جلتے بجھتے ننھے دیئے نے مجھے طرف دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ اچانک اس نوجوان آواز پر گھبرا کر تم نے فلم کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ارے یہ کیا ——؟ تم پھر نہ جانے کہاں کھو گئیں آگے سنو۔ سنو بھی ——

"ڈارلنگ" میں نے زیرلب بڑبڑایا۔ اور یہ سمجھ میں آگیا کہ وہ نوجوان تمہارا ڈارلنگ تھا۔ ایک چوٹ سی لگی۔ مگر یہ سوچ کر کہ اب میرا تم پر کیا حق تو تم کسی کی ہو چکی تھیں۔ کیوں۔ تمہاری خوشیوں آگ بھر دی۔ آہ بھر کر رہ گیا۔

چند لمحوں بعد ہال پھر روشنی سے جگمگانے

نزول ہو چکا تھا ۔ وہ نوجوان اٹھ کر اپنی سیٹ سے باہر
چلا گیا ۔ جو آنسو ضبط وغم کے بھاری چٹان تلے دبے ہوئے
تھے ۔ چٹان کے ہٹتے ہی بہہ نکلے ۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے
ڈر تھا ۔ تم نے سسکیوں کے درمیان پوچھا کہاں چلے گئے
تھے ۔ ؟ بتاؤ مجھے بے سہارا چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے ۔ ؟"
میں کیا جواب دیتا کیسے بتاتا کہ کہاں چلا گیا تھا اور کیوں
چلا گیا تھا ۔ اس لئے اس وقت بھی تمہیں ہال میں تنہا چھوڑ کر
نکل آیا ۔

دیکھو یہ خط جو میں تمہیں بھیج نہ سکی ـــ

میرے ساتھی ـــ کل تم سنیما سے اٹھ کر چلے گئے
میرے لاکھ روکنے پر بھی نہ رُکے ۔ اتنے عرصہ بعد تمہیں دیکھ کر
میں اپنی موجودہ زندگی کو بالکل بھول گئی تھی ۔ میں تمہارے
پاس آنے کے لئے بالکل تیار تھی مگر یہ سوچ کر میرے قدم
تھم گئے کہ میں کیسے آ دوں ـــ ؟ کیا لے کر آ دوں ـــ ؟
میرے پاس اب کچھ بھی تو نہیں ـــ سب کچھ ممی نے
چھین لیا ۔

ممی ـــ ! ہائے کتنا پوتر رشتہ ہے یہ ۔
مگر اس رشتے نے مجھے دیا ہی کیا ـــ ؟ سوائے
ناکامی، مایوسی اور تڑپ کے ۔

وہ ممیاں اور ہوں گی جو اپنی بیٹیوں کی سکھ کے لئے
اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی ہیں ۔ مگر میری ممی نے تو میرے
سکھ میں آگ بھر دی ۔

میرے جنم دن سے لے کر آج تک ممی نے مجھے وہ پیار
نہیں دیا جس کی میں مستحق تھی ۔ میری آیا کا کہنا ہے کہ جب
نرس نے انہیں بتایا کہ انہیں بھی بیٹی ہوئی ہے تو پتہ نہیں کیوں
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں ۔ پھر میری پرورش کا
سارا بوجھ ڈیڈی پر سونپ کر میری طرف سے عرصہ تک
بے نیاز رہیں ۔ میں کس کے ساتھ کھیلوں کس کے ساتھ
نہ کھیلوں اس کی انہیں کوئی فکر نہیں رہتی ۔ میرے گھر
میری عمر کے بچے آتے وہ مجھے کھیلنے کے لئے مجبور کرتے ۔
مگر میں کسی کے ساتھ نہیں کھیلتی ۔ اور ایک دن ایک لڑکے
نے مجھے دیکھ کر حبیب قلم کا یہ شعر پڑھا تھا ۔

چہرہ ہے جیسے جھیل میں ہنستا ہوا کنول ..... تو میں
اس لڑکے کی شکایت ممی سے کرنے گئی ۔ اس دن ممی مجھے
کافی دیر تک گھورتی رہیں ۔ اور پھر مجھے سینے سے گھنٹوں
لگائے رکھا تھا ۔

پھر میری ویران راہوں پر تمہارے قدموں کے
نشان پڑنے لگے ۔ تم ہی وہ پہلے شخص تھے جس کے ساتھ
میں نے دل کھول کر باتیں کی تھیں ۔ تمہاری باتوں پر قہقہے
بھی لگائے تھے اور آنسو بھی بہائے ۔ میں چاہتی تھی کہ
تمہیں اپنا جیون ساتھی بناؤں ۔ ڈیڈی بھی میری رائے سے
متفق تھے وہ چاہتے تھے کہ میں اپنی پسند کے لڑکے سے ضرور
شادی کروں ۔ شادی بیاہ کوئی ایک دن کا کھیل نہیں
یہ تو عمر بھر کا سودا ہے ۔ اگر ذرا بھی بھول چوک ہوئی زندگی بھر
پچھتانا پڑتا ہے ۔

ممی کا خیال ڈیڈی کے ٹھیک برعکس تھا ۔ ان کا
خیال تھا کہ پیار ایک دھوکا ہے ۔ فریب ہے ۔ پیار خوشیاں
نہیں دے سکتا ۔ سوسائٹی میں پوزیشن نہیں دے سکتا ۔
پیار رسوائی کا دوسرا نام ہے ۔

پیار کرنا ہی ہے تو انسان چمکتی ہوئی نئی ماڈل کی
کار سے کرے ۔ عالی شان بلڈنگوں سے پیار کرنا چاہئے ۔ زرق
برق لباس سے پیار کرنا چاہئے ۔ انہوں نے بھی اپنی جوانی
میں اسی طرح کی بھول کی تھی ۔ لیکن ان کے ماں باپ بہت
دور اندیش تھے ۔ تب ہی تو انہیں جوانی کی اس حماقت سے
باز آنے پر مجبور کر دیا ۔ ورنہ آج اس دیوانے شاعر کی طرح
فاقہ سہہ سہہ کر دق کی مریض ہو جاتیں ۔ پھر ان کا نادار اور
مفلس شاعر اپنی دق میں مبتلا بیوی کے علاج کیلئے اپنے خون جگر
سے لکھا دیوان پبلشروں کے پاس لئے پھرتا اور پبلشر اسے

شائع کرنے سے بر بار انکار کر دیتے اور اس کی بیوی گھٹ
گھٹ کر مر جاتی۔

مگر میں جانتی ہوں کہ ممی اپنے آپ کو بہت بڑے فریب
میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ اگر ان کی بھی شادی اس بے چارے شاعر
سے ہو جاتی تو آج انہیں سکون ملتا۔ کہنے کو تو وہ سیٹھ ہیرا چند
کی بیوی ہیں۔ جن کے پاس کئی ملیں ہیں۔ کئی گاڑیاں ہیں۔ نوکر
چاکر ہیں۔ سب ہی کچھ ہے۔ لیکن سکون نام کی کوئی چیز نہیں
اگر ممی کو اپنے اس خزانے میں رہ کر ذرا بھی اطمینان ہوتا تو ممی
ڈیڈی سے بات بات پر کبھی نہ الجھتیں۔ اور پھر شام ہی سے
میک اپ میں نہیں لگ جاتیں۔ زندگی کی تیس سے زیادہ
بہاریں دیکھنے کے بعد بھی آج غازہ و پاؤڈر کی موٹی موٹی
تہیں اپنے چہرہ پر نہ جماتیں۔ آنکھوں میں کاجل کی پتلی لکیر
نہیں کھینچتیں۔ بغیر آستین کا عریاں بلاؤز نہیں پہنتیں
وہ یونڈر کی خوشبو سے اپنے جسم کے ہر حصے کو نہیں بساتیں
اور پھر ولائتی شراب کی دوکان کا شوکیس بن کر کلبوں اور
ریسٹورانٹ میں غیر مرد کی باہوں میں باہیں ڈال کر
کمر سے کمر ملا کر الٹے سیدھے رقص ہرگز نہیں کرتیں۔
جتنا وقت وہ اپنے بناؤ سنگار میں لگاتی ہیں اس سے
کم ہی وقت میں اگر وہ گھر کی دیکھ بھال میں لگاتیں تو آج
ہم لوگوں کو ہوٹلوں سے منگا کر کھانے کی ضرورت نہیں
پڑتی۔ اسی لئے وہ مجھے ـــــ اپنی اکلوتی بیٹی کو جو ان کی
ساری زندگی کا دیکھا ہوا حسین خواب ہے۔ ایڑیاں
رگڑ رگڑ کر مرنے نہیں دیں گی۔ وہ مجھے زندہ دفن نہیں
کرنا چاہتی ہیں۔

اس لئے انہوں نے تمہارے بارے میں جاننے کے بعد
سخت لفظوں میں تنبیہہ کر دی تھی کہ آئندہ سے اگر میں پیار
کے سنہرے خواب دیکھوں گی تو وہ میرے خوابوں پر پہرے بیٹھا
دیں گی۔ ممکن تھا میں ممی کے ظلم کا مقابلہ کر لیتی۔ مگر اچانک
تم نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ مجھے سہارا دینے کو کیا ایک سہارا
چھوڑ کر نہ جانے کہاں کھو گئے۔

ممی جیت گئیں۔

میں ہار گئی۔

پھر ممی کے کئی دوستوں کے لڑکے مجھ سے ملنے
آنے لگے۔

ان سے ملنے کے قبل ممی مجھے جاپانی گڑیوں کی
کی طرح سجاتیں۔ طرح طرح سے ہدایتیں دیتیں۔ میں کس طرح
ڈرائنگ روم میں پہلا قدم رکھوں گی۔ ان لڑکوں پر
میں ظاہر کروں گی کہ وہ صرف میرے لئے ہیں اور میں ان
کے لئے ہی پیدا کی گئی ہوں۔ جب میں ان سے ملنے کے لئے
چلتی تو راستہ بھر ممی کی ہدایتوں کی ریہرسل کرتی رہتی لیکن
ان کے سامنے جاتے ہی نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگتا جیسے
میں ننگی کر دی گئی ہوں۔ کوئی مجھے بھدی گالیاں دے رہا
جب وہ مجھے گھومنے کا آفر کرتے تو میں بے دلی سے
ٹھکرا دیتی۔ ممی جو میری ساری حرکتوں کا جائزہ چھپ کر دو
دوسرے کمرے سے رہی ہوتیں۔ ان کے جاتے ہی مجھ پر برس پڑتیں
"تو بڑی سرد لڑکی ہے۔ اس طرح مردوں سے پیش
آنے پر تو عمر بھر کنواری رہ جائے گی۔" نہ جانے ممی مجھ
کیا چاہ رہی تھیں۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے کس طرح کے برتاؤ
کی توقع رکھتی تھیں۔ بہت دنوں تک تو مجھے ممی کی باتیں
سمجھ میں ہی نہیں آئیں۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے ممی کی باتیں
سمجھ میں آنے لگیں۔ ایک بار تو میں نے ممی کے سکھائے
ہوئے آرٹ سے بڑھ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے پر خود
کو آمادہ کر لیا تھا۔ اپنے ترکش کے سارے تیروں کو بچا
میں کیپٹن ناستی کی باہوں میں دبک جانا چاہتی تھی۔ پر
اس گھڑی تمہارا پیار کیوں نشتر چبھانے لگا اور میں ان
بازوؤں سے تڑپ کر آزاد ہو گئی۔ وہ مجھے پاگلوں کی طرح
تکتا رہا۔ میں وہاں رکی نہیں سیدھے اپنے کمرے میں آ
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ممی کا وہی زہر میں بجھا

ے دل کے پھپھولے پھوٹنے لگا۔

"تو بڑی سرد ہے لڑکی۔ یہ ریمارک سب ہی
ؤں نے تیرے بارے میں کیا ہے۔ میں سوسائٹی میں تجھے
نچا دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن تیری سرد مہری سے میرے
مانوں پر اوس پڑتی جا رہی ہے"

آج بھی ڈیڈی کے کہنے پر میں انل کا سینما میں انتظار
رہی تھی۔ انل کے بارے میں ممی کو صرف اتنا ہی معلوم تھا
وہ ایک مشہور بیرسٹر کا بیٹا ہے۔ اور خود بھی ولایت
سے بیرسٹری کر چکا ہے۔ وہ ڈیڈی کے انتخاب سے مطمئن تھیں
ڈیڈی ہی نے انل کو میرے لئے سلیکٹ کیا تھا۔ وہ چاہتے
ے کہ شادی سے قبل ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ
ں۔ ڈیڈی ہی نے ضد کی تھی کہ میں اس کے ساتھ
گھوموں پھروں۔

تم نے دیکھا ــــ انل بیشک ایک خوبصورت
نوجوان ہے۔ اس کے مردانہ حسن پر کئی لڑکیوں نے
ں راتوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ میں نے بھی اسے
ہلی بار دیکھا تھا تو میرا دل بھی زور سے دھڑک
ا تھا۔ میں اپنی اسی کیف زندگی سے تنگ آ چکی
ں۔ میں بھی کسی کی بانہوں کا سہارا چاہتی تھی۔ اور
انل سے روٹھنے لگی تھی۔ تاکہ جب ممی کو یہ معلوم
۔ میں بھی دل رکھتی ہوں، دھڑکتا ہوا۔ جذبات
تی ہوں، جو تیز اڑنے والے باز رکھتے ہیں اور
ے کم انل تو گواہی دے دے کہ میں ایک سرد لڑکی
یں۔ میری سانسوں کی گرمی بھی کسی مرد کے جذبات میں
اچل مچا سکتی ہے۔ اسی بار میں نے ممی سے پوشیدہ
اپنا ایک نیا تجربہ شروع کر دیا تھا۔

انل کی ضد تو تھی جس سے مجبور ہو کر میں "دو آئی
ننس" چلی گئی تھی۔ مگر میں کیا جانتی تھی کہ جو چنگاری
سلگی ہے۔ ایک سخت شعلہ بن جائے گی جس دنیا

اپنا رخ بدل لیا ہے آج اتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھ کر
پھر پرکشش ہو جائے گا۔

اور جب میں سنیما سے نڈھال واپس ہوئی تو کار
کو پورٹیکو میں کھڑی کر کے جب انل نے مجھے الوداعی بوسہ
دیا تو میں پھر وہی پہلی سی سرد لڑکی تھی۔ پورٹیکو
میں اس وقت اندھیرا تھا۔ یکا یک پورٹیکو کی
روشنی جل اٹھی۔ سامنے ممی کھڑی تھیں۔ انل کو دیکھتے
ہی ممی کے چہرے کا رنگ نہ جانے کیوں بدل گیا؟ نہ جانے
کیوں ان کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ انل بھی سکتے میں کھڑا ممی
کو تک رہا تھا۔ اور پھر وہ جلدی سے کار موڑ کر کیوں
چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ یہ سب کچھ
کیا تھا ــــ؟

رات ممی اور ڈیڈی میں کافی بحث ہوئی۔
ممی نے سخت لفظوں میں ڈیڈی کو بتا دیا تھا کہ آئندہ
میں انل سے ملنے کی کوشش نہ کروں۔

آج اتنے دنوں بعد ممی نے میرے دل کے
مطابق فیصلہ کیا تھا اور وہ یہ کہ میں انل کے علاوہ
جس لڑکے سے بھی چاہوں مل سکتی ہوں۔ اسے جیون
ساتھی بنا سکتی ہوں ــــ حتیٰ کہ تمہیں بھی۔

آپ آ بھی جاؤ ــــ

میرے ساتھی آ جاؤ ــــ اور اس امید
کے ساتھ آؤ کہ پھر مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے ــــ!!

علاالدین حیدر وارثی

شہر آفتورا

آنند نے یکایک گھڑی دیکھی رات کے ایک بج چکے تھے اسے اب نیند آ رہی تھی۔ سارے جسم سے کسلمندی کے آثار نمایاں تھے اس نے انگڑائی لی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اور کتاب میز پر ڈال کر سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا ہی میں کواڑ پیٹنے کی آواز آئی۔ آواز تیز ہوتی چلی گئی۔ رادھا گھبرائی ہوئی آواز میں چلا رہی تھی۔

"آنند! آنند!! دروازہ کھولو۔

آنند جلدی سے کواڑ کھولنے کے لئے بڑھا اور اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ رادھا اس کے پیروں پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنند نے اسے دونوں ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔" رادھا! تم کیوں رو رہی ہو؟ کسی نے تم کو آج پھر کچھ کہا کیا؟ بولو میں آج اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

رادھا تھوڑی دیر کے بعد ہچکیوں کے درمیان بولی۔ "آنند........ مجھے یہاں سے لے چلو۔ مجھے ان بھیڑیوں سے بچاؤ۔"

"وہ کون تھا رادھا؟ جلدی سے اس کا نام بتا تا میں ابھی اسے شوٹ کر دوں گا۔" آنند غصہ سے لال بھبھوکا ہو گیا۔

پڑوس کے لوگ شور سن کر جمع ہو گئے تھے۔ سبھی آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ مگر کوئی اس سے ہمدردی نہ جتا رہا تھا۔

رادھا اس شہر میں بالکل نئی نئی آئی تھی۔ آنند اسے برسوں سے جانتا ہے۔ وہ اس وقت سے اسے جانتا ہے جب رادھا ابھی جوانی کی حد میں اچھی طرح داخل بھی نہ ہوئی تھی۔ رادھا دیہات کی کچی فضا میں پلی تھی وہ بے حد معصوم تھی اور ساتھ ساتھ حسین بھی۔ اور یہی حسن اس کے لئے عذاب جان بن گیا تھا۔ رادھا بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ مگر اس کا باپ اس کی جانب سے بے پرواہ تھا۔ کالج میں اگر کوئی اس کا سچا ہمدرد تھا تو وہ آنند تھا۔ آنند بہت ہی نرم انسان تھا۔ محرومیوں، ناکامیوں اور مایوسیوں سے اس کا دل اتنا رقیق ہو گیا تھا کہ اگر کسی کو ذرا بھی تکلیف میں دیکھتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ خود کوئی اس کے دل کو کچوکے لگا رہا ہو۔ آنند کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا کہ جب فائنل ایر کے لڑکے کالج سے رخصت ہو رہے تھے اور کالج کی زندگی کا خاتمہ ہو رہا تھا لڑکوں کی جانب سے ایک شاندار پارٹی کالج کے تمام اساتذہ کرام نیز اہل کاران دفتر کو دی گئی تھی۔ سب لوگوں نے ایک یادگار گروپ فوٹو بھی کھنچوایا تھا۔ اس دن سبھی محسوس کر

یہ کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے ۔

طلباء کی عمر میں کالج ہی کا زمانہ سب سے زیادہ طربناک ہے ۔ ہر طرف رنگ و بو کے نظارے بکھرے پڑے رہتے ہیں اس پر مخلوط تعلیم تو اور بھی سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی ہے ، اور لڑکیاں دل کھول کر رومانس لڑاتے ہیں ۔ شاید یہ ۔ سوچتے ہیں کہ زندگی میں یہ وقت پھر لوٹ کر آنے کو نہیں لئے دل کے سارے ارمان نکال لئے جائیں ۔ اور قابل تعریف ن تو یہ ہے کہ اس رنگ و بو میں اساتذہ بھی شامل ہو جاتے کالج میں بھی اس طرح لڑکے رادھا کو اکثر چھیڑتے تھے اور دعوت ں و نشاط دیتے تھے ۔ مگر رادھا ایک انوکھی لڑکی تھی ۔ وہ سب لغویتوں سے الگ تھلگ رہتی تھی ۔ اور بظاہر سب سے ملتی بھی تھی ۔ رادھا اصول کی پابند تھی ۔ وہ تفریح کی مخالفت ، کرتی تھی ۔ چنانچہ وہ برابر پکنک منانے جاتی تھی ۔ جہاں ے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ جاتے ۔ اسپورٹس میں شامل ہوتی تھی ۔ مگر یہ کبھی نہیں کسی نے سنا کہ آج رادھا یش کے ساتھ سنیما دیکھنے گئی ہے ۔ یا موہن کے ساتھ بال کیبن میں دیکھی گئی ہے ۔ یا مہیش کے ساتھ فلاں ک میں بیٹھی تھی ۔ اسی لئے سب رادھا کی دل سے کرتے تھے ۔

رادھا کا شوہر لڑائی میں کام آگیا ۔ اور رادھا بیوا ہوگئی ۔ اور اس کو اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر میں ملازمت نی پڑی ۔ اور حسن اتفاق سے رادھا آنند ہی کے مکان کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگی اور اس کے بعد رادھا کے لوگوں کی نظروں میں کھب گئی اور محلہ کے آوارہ اور عاشق لڑکوں نے رادھا کو زک پہنچانا شروع کیا آج کے اس واقعہ سے تو رادھا اور بھی عاجز آگئی ۔ رادھا کی زندگی کا یہ دور بہت ہی المناک تھا جب کہ پتا چل بسے اور کچھ دنوں کے بعد اس کے پتی بھی سورگ باش ہوگئے اور رادھا کو اپنی ماتا اور چھوٹے بھائی بہن کی وجہ سے شہر آنا پڑا ۔ ملازمت کرنی پڑی ۔ وہ آج بہت ہی نڈھال ہوگئی تھی اور اس نے زمانے سے ہار مان لیا تھا ۔ مگر جب آنند نے اس کو سمجھایا تو وہ کسی حد تک مطمئن ہوئی ۔

آنند کو دنیا جہان کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اگر کوئی سہارا ملا تو رادھا کی بیوہ جوانی کا ۔ اس نے رادھا کے حق میں جو کیا تھا وہ ایک شوہر ۔ ایک باپ ایک بھائی بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ مگر پھر بھی زمانے کی انگلیاں اسی پر اٹھتی تھیں ۔ لوگ یہی کہتے تھے کہ رادھا کی بھری جوانی کو تباہ کرنے والا آنند ہی ہے ۔ مگر آنند اب اس بے ہنگم اور بے ڈھنگے سماج کی پرواہ نہیں کرتا تھا ۔ وہ اب تک سماج کا ساتھ دیتا رہا ۔ مگر اب وہ یہ چاہتا تھا کہ سماج اس کا ساتھ دے ۔ وہ سماج کے ناسور سے بہتی ہوئی غلاظت کو دیکھ رہا تھا ۔ وہ سماج کی اصلاح اور فلاح کی خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار تھا ۔ اس کو اس سماج کے تقریباً ہر فرد سے نفرت تھی ۔ اسی سماج کے ایک فرد کی حریصانہ نگاہ نے اس کی محبوبہ کو اس سے چھین لیا جس کو اس نے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہا تھا ۔ اس ظالم، بھوکے، ننگے اور سرمایہ داری کے پرستار سماج نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا ۔ وہ کب تک اس سماج کی خاطر اپنے ضمیر اور اپنی روح کی آواز کو دباتا ۔ اب وہ اس سماج کا باغی بن گیا تھا ۔ وہ کبھی کبھی سوچتا کہ کاش اس کے پاس کوئی ایسا ایٹم بم ہوتا جس کے ذریعہ سماج کی ساری گندگی پل بھر میں ختم کر سکتا ۔ اور تب اس کے دل کو قرار ملتا ۔ مگر اس کے لئے ایک منظم اور پرعزم جماعت کی ضرورت تھی اور وہ خود کو تنہا محسوس کرتا ۔ کاش کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے جو اس کے کاندھا سے کاندھا ملا کر چلتے اور ہر طور اس کا ساتھ دیتے ۔ ان باتوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے آنند رات رات بھر جاگتا تھا وہ کتابوں میں کھو کر سکون قلب حاصل کرنا چاہتا تھا ۔

مگر پھر بھی اس کو قرار نہیں ملتا تھا۔ اب اس کا ساتھی اگر کوئی تھا
تو وہ رادھا تھی جس سے وہ پاک اور بے لوث محبت کرتا
تھا اور شفقت کی حد تک اس کو چاہتا تھا۔ مگر یہ سماج
اس کا آخری سہارا بھی چھین لینا چاہتا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا
کہ وہ کیوں نہ یہاں سے دور چلا جائے اور ایسی جگہ چلا جائے
جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا مگر "نہیں" وہ بڑبڑایا "یہ زندگی
کی شکست ہوگی اور میں یہ شکست کبھی نہیں مانوں گا چاہے
زمانہ لاکھ ستائے"۔ اور یہ سوچ کر پھر اس کو تقویت ملی۔
اور اس نے رادھا کو گلے سے لگا لیا اور شفقت سے اسکی
پیٹھ سہلانے لگا۔ اور پھر رادھا کچھ دیر کے بعد اس سے
الگ ہوئی اور اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ آنند نے اس کو اطمینان
سے سلا دیا اور خود بھی اپنے کمرے میں جا کر سونے کی ناکام
کوشش کرنے لگا

صبح کوئی دس بجے آنند کا کمرہ پیٹ رہا تھا۔
رادھا باورچی خانہ میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ آنند کی آنکھ
کھل گئی وہ جلدی سے آنکھ ملتا ہوا اٹھا۔ کواڑ کھلتے ہی رمیش
آنند سے لپٹ گیا۔

"تم کب آئے رمیش"
"ابھی ابھی تو ٹرین سے اترا ہوں"
"کہو تم کیسے ہو آنند"
"ہاں اچھے جا رہا ہوں"
"رمیش تم ان دنوں کہاں ہو؟"
"میں نیوی میں لفٹیننٹ ہو گیا ہوں یار"
"ارے تو اتنا بڑا آدمی ہو گیا ہے؟"

" باتوں کا سلسلہ رک گیا۔ رادھا ناشتہ لے آئی۔
رمیش رادھا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ رادھا ابھی ابھی نہا دھو کر
آئی تھی۔ اس کا گورا بدن نکھر گیا تھا اس کے لمبے لمبے سیاہ بال
کھلے ہوئے تھے سفید لباس میں وہ کوئی دیوی معلوم پڑتی تھی۔

رادھا جلدی سے باورچی خانہ میں گھس گئی۔

"بھابی تو خوب اچھی ڈھونڈ کر لائے آنند"
"تم کو پسند ہے؟"
"کیوں نہیں اتنی پیاری بھابی کو کون نہیں چاہے گا
"کیا تمہاری شادی ہو گئی رمیش؟" آنند بے بس
ہو گیا۔
"نہیں یار کبھی کروں گا ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے
رمیش نے لاپرواہی سے کہا۔
"کیا تم شادی کرو گے؟"
"کیا کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں؟"
"ہاں" آنند نے آہستہ سے کہا
"کیا یہ لڑکی تم کو بے حد پسند ہے؟"
"کون لڑکی؟"
"یہ جو ابھی آئی تھی"
"یہ تو تمہاری پتنی یعنی میری بھابی ہے"
"تم غلط سمجھ رہے ہو رمیش یہ میری پتنی نہیں ہے"
"تو پھر کون ہے؟"
"یہ رادھا ہے میرے مکان میں کرایہ دار ہے۔
یہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ مگر بے چاری زمانہ کی بہت
ستائی ہوئی ہے۔ اس کا پتی لڑائی میں مارا گیا۔ اگر تم اس کا
ہاتھ تھام لو تو اس کا سارا دکھ دور ہو جائے گا" آنند نے
ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔ یہ سُن کر رمیش سوچ میں پڑ گیا
میں تم پر جبر نہیں ڈالتا ہوں۔ رمیش خوب اچھی طرح
سوچ لو"

اس نے پھر کہا۔ "مگر خوشی سے تم میری بات مان لو
تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری ایک بہت بڑی بات رکھ لی
اگر نہیں مانو گے تو پھر کوئی شکایت بھی نہیں"
پھر اس نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا "تم سوچتے ہو۔

ہی کیوں نہیں رادھا سے شادی کر لیتا ہوں۔ مگر یہ سچ ہے کہ
تی میں اس لائق نہیں ہوں۔ تم کو معلوم ہی ہے کہ میں نے
سے محبت کی تھی اور وہ بے وفا نکلی۔ مگر میں مجبور ہوں ایک بار
دل کے مندر میں جسے بٹھا چکا ہوں اسے نکال نہیں سکتا
سے زیادہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

رمیش پھر بھی خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا
کہ وہ آنند کو کیا جواب دیدے۔

آنند پھر بولا "رمیش کیا تم سماج سے ڈرتے ہو؟ شاید
یہ سوچ رہے ہو کہ رادھا ودھوا ہے اور سماج کے قانون
رو سے اس کی شادی دوبارہ نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔"

اگر تم یہ سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ مجھے افسوس
کہ تم روشن دماغ ہو کر بھی ایسا سوچ رہے ہو۔ کیا تم نہیں
نتے کہ اس سماج نے ایسے ایسے کتنے قانون بنائے۔ جو زمانہ
رفتار کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے۔ آج اس کی ضرورت
پڑی ہے کہ سماج کے اس قانون کو بھی توڑ دیا جائے تاکہ
ودھوا کی شادی ہوگی؟ ضرور ہوگی۔ اگر تم جیسے نوجوان نے
عملی قدم نہیں اٹھایا تو سماج کا یہ فرسودہ نظام کبھی بھی
ہم برہم نہیں ہو سکے گا اور رادھا جیسی ہزاروں لاکھوں
ائیں اس سماج میں گھٹ گھٹ کر اپنا دم توڑتی رہیں گی
راس سماج کے حریص اور بوالہوس افراد اسی طرح کتنی رادھاؤں
دامن کو داغ دار کرتے رہیں گے۔

آخر کب تک کوئی آنند کسی رادھا جیسی پاک عورت
زت کی رکھوالی کرتا رہے گا" یہ کہہ کر آنند خاموش ہو گیا۔

آنند کی اس پرجوش تقریر نے اپنا پورا اثر دکھایا رمیش
خوشی سے رادھا سے شادی کے لئے رضامندی کا اظہار کر دیا۔
اس نے ہنستے ہوئے کہا "میں ضرور رادھا سے شادی کروں گا۔
نہ! مجھے بھلا کب ایسی بیوی مل سکتی ہے۔ میں اپنی قسمت پہ
ناز کروں گا۔ اگر رادھا مجھے مل جائے گی۔

رات جب آنند نے رادھا سے رمیش کے بارے
میں پوچھا تو رادھا کا دھیان اپنے شوہر کی طرف چلا گیا۔ وہ
سوچنے لگی "وہ بھی تو فوج ہی میں تھے۔" مگر جب اس نے آنند
کی طرف دیکھا تو اس کا سارا وہم دور ہو گیا اور اس نے شرم
سے نگاہ نیچی کئے جھکنے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

آنند جب اپنے کمرے میں آیا تو سوچنے لگا کہ رمیش اور
رادھا کی شادی سے سماج کو ایک نیا سبق ملے گا۔ سماج کی برسوں
پرانی روایت کی زنجیر ٹوٹ جائے گی اور سب کی زبان پر
حیرت کے ساتھ یہی کلمہ ہوگا۔ کیا ایک نوجوان سے ایک
ودھوا کی شادی ہو سکتی ہے؟ اور یہ سوچتے سوچتے
آنند کی آنکھ لگ گئی۔ وہ آج سکون کی نیند سویا۔ صبح سویرے
اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جلدی سے اٹھ گیا۔ رادھا مندر
جا رہی تھی۔

اس نے رادھا کو مخاطب کیا اور کہا "چلو رادھا
آج میں بھی مندر جاؤں گا۔" اور یہ کہہ کر رادھا کے
ساتھ ہو لیا۔

آنند نے سوچا رادھا تو آج مجھ سے الگ ہو جائے گی
میں تو اب اکیلا رہ جاؤں گا۔ رادھا کو ایک مستقل
سہارے کی ضرورت تھی سو وہ مل گیا۔ مگر اب میں کہاں
جاؤں؟ وہ سوچنے لگا میری منزل کہاں ہے؟

کون دے سکتا تھا آنند کے اس سوال کا جواب
شاید بھگوان بھی نہیں۔

رادھا جب مندر سے باہر آئی تو آنند کو چاروں طرف
ڈھونڈنے لگی۔ مگر آنند کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ باہر سورج کی روشنی ہر
طرف پھیل گئی تھی۔ اندھیرے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

رادھا کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ اداسی چہرے پہ لئے ڈیرے
کی طرف بڑھنے لگی۔ دور کوئی پنچھی اپنے آشیانے سے نکل کر آسمان کی

م ح ع ۔ رحمٰن جمیدی

کشتیٔ دل کیلئے کوئی کنارا ابھی نہیں

صاب! مادام آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔

بیرے کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ میں اپنی انتہائی مصروفیت سے جان بچا کر جبریا لیک ہاؤس آیا ہوں تا کہ قدرت کی رعنائیوں میں کھو کر زندگی کے چند مسرت بکنار دن گزار دوں۔

'لیکن یہ عورت ہے کون ——!؟' میرے ذہن میں سوال ابھرا۔

"بھیج دو"

دوسرے لمحہ کمرے میں ایک اجنبی سن رسیدہ عورت داخل ہوئی۔ اس کے بھرے بھرے گورے بدن پر سفید ساڑی اور بلاؤز ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے خالق کائنات نے ابھی ابھی شگفتہ سفید گلاب پر شبنم پاشی کی ہے اس کے بال گندھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر تھی۔ جبین ہاتھ سے کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھئے!"

"جی شکریہ!"

وہ بیٹھ گئی۔

فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ہوٹل کے منیجر سے خبر ملی کہ آپ رانچی مینٹل ہاسپٹل کے ڈاکٹر وحید ہیں۔ اسی لئے میں آپ کو تکلیف دینے آگئی ہوں۔" اس نے آغاز کلام کیا۔

"نہیں نہیں تکلیف کی کیا بات ہے کہئے میں آپ کے کام آگیا تو یہ میرے لئے خوش نصیبی کا باعث ہوگا۔" میں نے ڈھارس دی۔

"میرے مرحوم شوہر کی اکلوتی نشانی فیروزہ ہے اس کو اکثر ذہنی اختلاج کا دورہ پڑتا ہے، کھانا پینا سب کچھ چھوڑ کر بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ ہفتہ عشرہ میں ایک بار دورہ پڑتا ہے" اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں

"کب سے یہ مرض لاحق ہوا ہے۔" میں نے سوال کیا

"آج سے چھ سال پہلے۔ اس وقت وہ بی۔ اے فائنل کی طالبہ تھی۔ کئی ڈاکٹروں سے تشخیص کرایا لیکن کوئی فائدہ نہ۔ سوچا شادی کر دوں اچھی ہو جائے گی۔ لیکن ہر جگہ کی نسبت صرف اسی وجہ سے چھوٹ جاتی ہے۔ اگر آپ میری بچی کے لئے تھوڑی تکلیف فرمائیں تو میں ساری زندگی آپ کی ممنون رہوں گی" اس نے گلوگیر آواز میں التجا کی۔

"چلئے اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض ہے" میں سلیپنگ ڈریس میں باہر نکل آیا۔ اور ہوٹل

نڈے سے ہوتا ہوا فیروزہ کے کمرے میں آیا ۔
وہ ہلکی سبز دھانی چادر میں لپٹی محوِ خواب تھی ۔
فیروزہ بیٹی ــــ!! مادام نے پکارا ۔
گہرے خواب سے کسی کو بیدار نہ کرنا چاہیئے! میں نے
رة کہا ۔
آواز کی آہٹ پاکر فیروزہ نے نیم بیداری میں کروٹ
، اور مجھ پر نظر پڑتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور دوپٹے کو
یے سے سر پر رکھ کر مسہری کے کونے پر بیٹھ گئی ۔ میں گردو
سے بے خبر فیروزہ کے حسین خد وخال میں ڈوب گیا ۔
گہری سیاہ مخمور آنکھیں !
شفاف پیشانی پر الجھے ہوئے بال !
کھرے جسم پر گلابی مخملی سوٹ !
میں ایک لمحہ کے لئے بھول گیا کہ یہاں کس لئے آیا ہوں ۔
بیٹی! یہ ذہنی مریض کے تجربہ کار ڈاکٹر وحید ہیں "
نے تعارف کرایا ۔
" وحید ــــ!!؟ "
اس کے منہ سے زور سے میرا نام نکلا ۔ اور اس کی
یں مجھ پر مرکوز ہو گئیں
" آپ کہاں تھے ؟ آخر آج آپ کو میرا خیال آ ہی گیا! "
بکنے لگی ۔
" میں تمہیں پہلے بھی کبھی نہیں بھولا " میں نے مریض کی
ادراک کی شعوری گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی ۔
" سچ ــــ!!؟ "
وہ اٹھ کر میرے سینے سے لگ گئی ۔
" مجھے بھی یقین تھا کہ آپ کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے ! "
" ملنے والے کسی نہ کسی منزل پر ضرور ملتے ہیں ۔ میں نے
کی آواز میں آواز ملائی
" دیکھو نا ! ممی ہوٹل اور سارا کاروبار چھوڑ کر دوسری جگہ

جانا چاہتی ہیں ۔ لیکن میں اب کہیں نہ جاؤں گی ۔ ارے آپ
ابھی تک کھڑے ہیں ؟ بیٹھئے نا !! "
میں کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا ۔
آپ نے ابھی تک غزل سنانے کی فرمائش نہیں کی '
کیوں ؟ میں نے آپ کے جاتے ہی گانا چھوڑ دیا ۔ آج آپ
آئے ہیں تو سب کچھ یاد آ رہا ہے ۔ فی الحال چند اشعار سنا
رہی ہوں ۔

کشتیٔ دل کے لئے کوئی کنارا بھی نہیں
دل کے بہلانے کو آنکھوں کا اشارا بھی نہیں
ظلمتِ شب میں نہیں ایک بھی تارے کی چمک
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو سہارا بھی نہیں

سحر انگیز آواز کے ڈوبتے ہی اس نے کہا ۔
میں آپ کے لئے چائے لے آؤں ۔ پھر آپ سے
مزید بات چیت کروں گی "
وہ تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھی ۔
معاً مادام نے پکارا ۔
" بیٹی ! یہ ڈاکٹر وحید ہیں ! "
" ڈاکٹر ــــ!! "
وہ چند ثانیے تک خاموش کھڑی رہی اسے ایسا
محسوس ہوا جیسے ہر طرف دھواں پھیل رہا ہے ۔ اور وہ
دھوئیں کے طوفان میں محبوس ہو گئی ہے ۔ اچانک وہ فرش پر
شاخِ بریدہ کی طرح گر پڑی ۔ اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی "
" کیا فیروزہ سے وحید اور مجھ میں کوئی مشابہت
ہے ؟ " میں نے فیروزہ کو اپنی باہوں میں لے کر پوچھا ۔
" ہاں تھوڑی بہت مطابقت ہے " مادام نے جواب دیا ۔
میں نے مسہری پر اسے لٹا کر چہرے پر چادر ڈالتے ہوئے آخری بار
دیکھا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اسکی بے نور آنکھیں اور ساکت ہونٹ کہہ رہے ہیں ع
کشتیٔ دل کے لئے کوئی کنارا بھی نہیں

افسانہ

نسیم شرقی



کچھ دنوں کے لئے امی نے غزالہ کو اپنے ہاں بلا لیا۔ اسے یہاں آئے بہت دن ہو گئے تھے۔ ماموں جان اسے لے کر آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر شرما گئی۔ میں بھی اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور سر جھکائے اوپر بارجے پر چلا گیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور امی کی باتیں سننے لگا۔

"فاروق! یہ غزالہ اتنی بڑی ہو گئی!" امی نے اس کے برابر کھڑی ہو کر حیرت سے کہا

ماموں جان ہنسنے لگے۔ غزالہ شرم و حیا سے دہری ہوتی گئی۔ امی پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ اندر لے گئیں۔ ماموں جان ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

"بیٹھو بیٹی! شرماؤ نہیں۔ اب یہی تمہارا گھر ہے!"

امی کی آواز آئی۔ پھر وہ غزالہ کو بٹھا کر شربت بنانے چلی گئیں

امی چلی گئیں راشدہ آپا اس کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ پھر ہنسی اور مسکراہٹوں کی دنیا آباد ہو گئی جانے کہاں کہاں کی باتیں بہت دیر تک ہوتی رہیں۔

دوسرے دن ماموں جان چلے گئے اور ایک مہینے بعد آ کر غزالہ کو لے جانے کے لئے کہہ گئے۔ غزالہ کے آنے سے گھر کا ماحول ہی بدل گیا۔ میرے اور غزالہ کے درمیان ہر وقت حیا کی ایک دیوار کھڑی رہتی۔ حالانکہ غزالہ میری ماموں زاد بہن تھی۔ ہماری عمر بھی تقریباً ایک ہی تھی۔ لیکن جانے کیوں میرے سامنے آنے سے شرماتی۔

ایک دن امی نے کہا

بیٹی! اتنا نہ شرما۔ ابھی تو تم اس کی بہن ہی ہو اس کی بہو ہو جانا تو شرمانا۔" یہ سنتے ہی غزالہ نے دونوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

امی کے کہنے سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ میرے سامنے لگانے لگی۔ اب وہ میرے سامنے بھی ہوتی۔

اس دن میں کالج سے آیا۔ راشدہ اور امی صحن پر تھیں۔ ان کی آواز اندر سے آ رہی تھی۔ میں سیدھے اندر چلا گیا

آپا بھائی جان کالج سے آ گئے؟" غزالہ نے راشدہ آپا کو آواز دی۔

ذرا تم ہی انہیں پانی دے دو۔ راشدہ آپا نے

میں نے اپنے کپڑے اتارے اور پھر نیچے چلا آیا۔ میں ہاتھ منہ دھویا۔ پھر امی نے اندر ہی سے کہا

"بیٹی غزالہ! ذرا کھانا بھی دیدو - میں کام میں ہوں
غزالہ میرے لئے کھانا نکالنے لگی -

میرا کالج صبح کا تھا - صبح سات بجے گھر سے نکل جاتا - اور
پہر کو بارہ بجے واپس آتا - غزالہ میرا انتظار کرتی رہتی - مجھے بھی
الہ سے محبت ہو گئی تھی - وہ جس دن مجھے نظر نہ آتی میں امی سے
چھتا ——— "وہ کہاں ہے؟"
"کون ——— ؟"
"غزالہ!"
امی میری بات سن کر مسکرانے لگتیں - راشدہ آپا
امی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتیں -

اس دن میں کالج سے آیا تو گھر میں ایک اداسی چھائی ہوئی
- امی اور آپا کی دھیمی دھیمی آوازیں کمرے میں سے آرہی تھیں - ایسا
لوم ہوا جیسے غزالہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہو -
دھیرے دھیرے کمرے کی طرف گیا - امی اور آپا غزالہ کی
ربائی پر جھکی اسے دیکھ رہی تھیں - امی کا ہاتھ اس کے
بانی پر تھا - راشدہ آپا اس کے پائنتی بیٹھی اس کا پیر
بلا رہی تھیں - بخار کی شدت سے غزالہ کی آنکھیں بند
ں - لیکن میرے آنے کی آہٹ پا کر اس کی آنکھیں یکایک
ل گئیں - اس کی ویران ویران آنکھیں میری طرف دیکھنے
ں - میں نے جھک کر اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ
ا - بخار بہت تیز تھا - بخار کی شدت سے چہرے پر
ب کیفیت طاری تھی - میں اسی وقت دوا لا نے
گیا -

وہ دوسرے دن پہلے سے بہت اچھی تھی - تیسرے
وہ بالکل اچھی ہو گئی
"بھائی جان آپ نے مجھے بچا لیا - سچ جانئے - اگر
آپ کے دل سے نکلی ہوئی دعا کا اثر نہ ہوتا، تو میں . . . . .
کبھی نہ ...... بچتی!" غزالہ نے کہا -
اپنا دل اتنا چھوٹا نہ کرو غزالہ! تم بچتی کیوں نہیں ؟"
میں نے کہا -
یہ آپ کی محبت تھی بھائی جان ورنہ ......"
یہ کہتے ہوئے غزالہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے -

ماموں غزالہ کو لینے آئے - امی نے غزالہ کو کچھ دن
اور رہنے کیلئے کہا - لیکن ماموں جان نے نہ سنی جاتے
ہوئے امی نے ان سے کہا -
اگلے سال ہم شادی کر لیں گے - ابھی سے تیاری
شروع کر دیجئے -
ماموں جان مسکرائے اور غزالہ شرما گئی -
کچھ ہی دیر بعد غزالہ مجھ سے کوسوں دور چلی گئی -!
آنکھوں میں نہ جانے کتنا درد و غم سمیٹے -

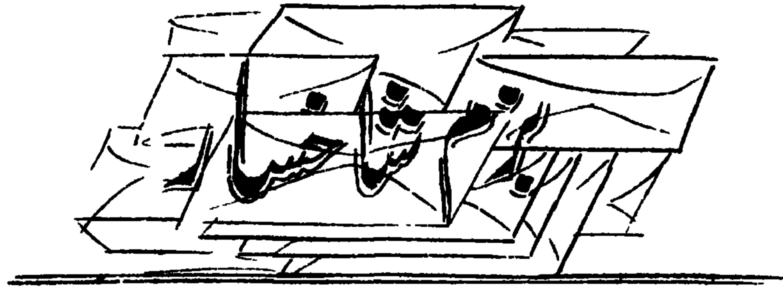
غزالہ کے جانے کے تین ماہ بعد ماموں جان کا خط
آیا - لکھا تھا غزالہ کچھ دنوں سے بیمار رہنے لگی ہے - ڈاکٹروں
نے ٹی - بی - بتایا ہے - یہ خبر پاتے ہی گھر میں اداسی اور
مایوسی چھا گئی - غزالہ کتنی اچھی لڑکی تھی - اسے یہ نامراد مرض
ہو گیا - ہر ایک کا دل دکھ درد میں ڈوب گیا - بیچاری
کی اگلے سال شادی ہونے والی تھی -
غزالہ ماموں جان کی پہلی اولاد تھی - کافی روپے
خرچ کر کے وہ اس کا علاج کرنے لگے - شہر کے بڑے بڑے
ڈاکٹروں کا علاج کیا ——— پانی کی طرح روپے بہائے -
غزالہ کی حالت سنبھلنے لگی - کچھ دنوں کے بعد وہ بالکل
اچھی ہو گئی - امی اور ابا اسے دیکھنے گئے - لیکن بیماری کے
بعد غزالہ وہ غزالہ نہیں تھی جو پہلے تھی - اس کی صحت اور

صورت میں وہ پہلی سی بات نہ تھی -
گھر لوٹنے پر ابو نے ایک بڑے ڈاکٹر سے پوچھا ——
اس لڑکی سے شادی کرتے ہیں اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے -
یہ مرض پھر کبھی ابھر سکتا ہے - ڈاکٹر نے کہا -
ڈاکٹر کی اس رائے کے بعد میرے گھر والوں کی رائے
ایک دم بدل گئی - غزالہ لاکھ اچھی لڑکی سہی، صحت نہیں تو کچھ نہیں -
آپ کہتیں —— "نور کی شادی غزالہ سے کرنا اچھا نہ ہوگا
دنیا میں بہت سی لڑکیاں ہیں -" لیکن وہ تو آس لگائے
بیٹھی ہوگی ——...... ابو کہتے
لیکن امی اس شادی کے بالکل خلاف تھیں -
ایک دن ماموں جان کا خط آیا ——!
غزالہ کی طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے - آپ
شادی کی تیاری شروع کر دیجئے - ہمیں اس فرض ——سے
سبکدوش ہو جانا چاہئے -
میرے گھر میں کچھ ابو کی رائے تھی اور کسی کی نہیں -
اپنی آخری رائے بتاؤ - یہ شادی ہوگی یا نہیں "
ایک دن ابو نے امی سے ان کی آخری رائے معلوم کی -
بھئی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیا ہم جان بوجھ کر
اپنے بیٹے کے دامن سے ایسی لڑکی باندھ دیں - ایک خط
لکھ دو ہم شادی نہیں کریں گے امی نے کہا -
میں نے کہا —— نہیں نہیں ایسا نہ کرو - یہ انسانیت
نہیں ہے -
پھر تمہیں جانو - جان بوجھ کر آگ سے کھیلو" امی
چیخ پڑیں -
آخر ماموں جان کو خط لکھ دیا گیا - ہم لوگ شادی
نہیں کر سکتے - لڑکی ٹی - بی کی مریض ہے -
ایک مہینے کے بعد مجھے غزالہ کا ایک خط ملا میرے پیارے بھائی جان!
مجھے آپ لوگوں کی پریشانیاں معلوم ہو گئی ہیں - میں

ٹی - بی کی مریضہ رہی اس لئے میں خود نہ چاہوں گی کہ آپ
مجھ سے شادی کر کے اپنی زندگی تلخ بنا لیں - مجھے اس شا
سے زیادہ آپ پیارے ہیں - آپ کی زندگی پیاری ہے - مگر
کبھی نہ چاہوں گی کہ میرے جانے سے آپ کا گھر تلخیوں
گہوارہ بن جائے —— اس لئے میرے بھائی جان :
اچھا ہوگا کہ میں اور آپ بہن اور بھائی ہی رہیں -
یہ رشتہ کتنا مقدس ہے —— کتنا پیارا ہے -
آپ کی بدنصیب بہن
غزالہ
غزالہ کا خط پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو چھلک
میں سمجھتا ہوں —— میرا خواب حقیقت نہ بن س
لیکن اس کی تعبیر کتنی مقدس ہے !!

بقیہ ادب میں روایت اور بغاوت

بغاوت کے لفظ کو جوڑ کر لیتے ہیں - وہ اُس کے اس مفہوم کی ب
جو اس وقت متبادل ہے اور لغوی و اصطلاحی طور پر بغاوت
مفہوم ہے بھی وہی - ہاں اگر روایت کے مقابلے میں یہ لفظ است
جائے گا، تو اضافی طور پر اور معاملے کی حقیقت کے پیش نظر
کا وہی مفہوم لینے پر مجبور ہوں گے، جو انفرادیت کا ہم معنی ہے لیکن
پر اور یہ کی بحث کے بعد میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ روایت کے م
بہتر اور معنی خیز لفظ انفرادیت ہی ہے، نہ کہ بغاوت -
اس سلسلے میں اس واقعے سے واقف ہوں کہ کچھ ناقدین ا
میں بھی روایت کے مقابلے میں اسی بغاوت کا ارتقاء کا ضامن سمجھتے
منفی اور تخریبی ہیں - اسکی ایک وجہ ہے - یہ ناقدین زندگی کے دو
کی طرح ادب میں بھی ارتقاء کے لئے اصلاح کی بجائے انقلاب
گمان کرتے ہیں - لیکن میں مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں ک
میں اصلاح تو ممکن نہیں ہے لیکن انقلاب محال ہے - اس لئے کہ ا
ارتقاء کے لئے جس تسلسل کا متقاضی ہے - وہ اصلاح ہی سے بر
سکتا ہے - ورنہ انقلاب تو اس کو توڑ کر ہی رکھ دیگا - (شکریہ آ



...ش صہبائی ۔ جموں

"شاخسار" کا تازہ شمارہ ملا ۔ شکریہ

جناب ابرآحسن صاحب نے اپنے مضمون میں بعض باتیں نہایت
...ری کہی ہیں ۔ لیکن وہ ایک بنیادی بات کو نظر انداز کر گئے ہیں ، وہ
...جدیدیت منزل اتنے قصوروار نہیں جتنے ایسے جرائد کے مدیر ہیں ، جو ایسی
...ہودہ اور بے معنی تخلیقات (میں انہیں بکواسیات کہوں گا) شائع
...تے ہیں ۔

سیہ بر سفید میں نیرنگی کے ساتھ بے رنگی قافیہ دیکھ کر حیرت ہوئی
جناب علی عباس حسینی صاحب نے اپنے خط میں پتے کی باتیں کہی ہیں ۔
...ے نزدیک ایک عمدہ بات کو نہایت بے ڈھب طریقہ سے کہنا
...ید شاعری ہے ۔ اس شاعری میں کسی ریاضت یا محنت کی ضرورت
... ۔ اس لئے نئی پود اس کی طرف زیادہ رجوع کر رہی ہے ۔

...طرفہ قریشی ۔ ناگپور

"شاخسار" کا تازہ شمارہ ملا ۔ یاد فرمائی کا شکریہ

"نقش اول" میں حضرت حرمت الاکرام نے جو دو ٹوک
...یں کہی ہیں ۔ ان کا اثر باقتدار لوگوں پر ہو کہ نہ ہو ۔ لیکن یہ حقیقت
...کہ ملک کے مسموم عناصر اقلیت کا مقدر بن چکے ہیں ۔ مولانا ابراحسنی
...وری نے غزل کی حمایت میں جو بحث کی ہے ۔ اس سے کوئی بے شعور ہی
...ار کر سکتا ہے ۔ غزل آج بھی انسانی زندگی ہی نہیں بلکہ پوری
...نات کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس میں ابتذال اور رکاکت کے

جو عناصر کبھی کبھی نظر آتے ہیں ، وہ محض سطحی دل و دماغ رکھنے والے شعراء
کی پیداوار ہیں ۔ پروفیسر کرامت علی صاحب نے محترمی خلیل الرحمن اعظمی
اور شہریار صاحب کے فن پر اچھا ریسرچ کیا ہے ۔ "شیشہ کی تلوار" یوسف
جمال صاحب کی کہانی دلچسپ بھی ہے اور پُر اثر بھی ۔ حصہ نظم متوسط
ہے ۔ پھر بھی عطا کاکوی ۔ شجاع خاور ، اصغر رضوی ، شبنم اختر اور
سعادت نظیر کی تخلیقات اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں ۔

پروفیسر افتخار احمد فخر جلگاؤں

'شاخسار' کا تازہ شمارہ (۴) ۳۰ ستمبر کو باصرہ نواز ہوا چکا
ہے ۔ مقالات میں مولانا ابر احسنی نے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ پر قلم
اٹھایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے ۔ مولانا موصوف نے
"ہر زمانے کا ادب نیا ہی ہوتا ہے" ثابت کرکے گم کردہ راہ نئے
اذہان کو بر وقت متنبہ فرمایا ہے ۔ راقم الحروف کی جانب سے
ان کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کر دیجئے ۔ آپ کا مقالہ بھی
بجا فکر انگیز ہے ، پسند آیا ۔ نئی شاعری ابھی تجرباتی دور سے گزر رہی
ہے ۔ ادب و شعر میں نئے تجربے ضروری بھی ہیں ۔ تاہم مجھے کہنے
دیجئے کہ بعض نئی نظمیں اس قدر ابہام کا شکار ہوتی ہیں کہ توبہ ہی
بھلی ۔ ان میں "دامن دل" کھینچ لینے کی ادا کہاں ہے ۔ غزلوں
میں علیم اختر مظفر نگری ، سعادت نظیر ، شجاع خاور ، ناظر صدیقی
اور ساحل مانک پوری کی غزلیں پُر تاثیر ہیں اور کیف انگیز بھی
مخمور سعیدی کی نظم بھی پسند آئی ۔

اندرجیت دت — امرتسر

"شاخسار" کا شمارہ ۴ باصرہ نواز ہوا۔ مقالات، تراجم، افسانے اور حصہ نظم، سب دلپذیر ہیں۔ جو کہ آپ اور شاخسار کے معاونین کی شب و روز کی کاوشوں کا مظہر ہیں۔ جناب کرامت علی کرامت صاحب نے خلیل الرحمن اعظمی و شہریار کی شخصیتوں اور ان کے کلام پر سیر حاصل تبصرات لکھ کر سعی مشکور کی ہے۔ افسانوں میں تبسم جان محمد کا "ایک مہینے، پندرہ منٹ" اور یوسف جمال کا "شیشہ کی دیوار" از حد پسند آئے۔ دونوں قلمکاروں نے دو مختلف پہلوؤں پر شاندار افسانے لکھے ہیں۔ دیگر افسانے بھی اچھے ہیں۔ لیکن اول الذکر کا جواب نہیں۔ حصہ نظم میں محمود سعیدی کی "سیہ بر سفید"، شہریار کی "رات کی زد سے بھاگتا ہوا دن" اور صبا اکرام کا کلام قابل صد داد ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسری منظومات بھرتی کی ہیں۔ بلکہ ان میں سے یہ تینوں بہتر ہیں۔

سخن فہمی — دہلی

"شاخسار" ہمدست ہوا۔ مندرجات کا انتخاب مناسب اور معیاری ہے۔

"ہر زمانے کا ادب نیا ہوتا ہے" تسلیم ہے۔ لیکن تامل اس میں ہے کہ ہر زمانے کا ادب (ادب متعارف) اپنے ماحول اور معاشرہ کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

جہاں تک میرا مشاہدہ اور مطالعہ ہے، ہندوستان کے ادیبوں کی اکثریت نیا ادب تو پیش کر رہی ہے لیکن وہ ادب، زندگی اور سماج سے بہت دور ہے۔

"ایک مہینے کے پندرہ منٹ" میں ترقی کے نام پر سماج کے گندے ناسور کو نہایت چابک دستی کے ساتھ کریدا گیا ہے "قتل" بھی پسند آیا۔ ساجد اکبر کی نظم خاصی پر اثر ہے

محمود سعیدی کے پہلے قطعے کے قوافی محتاج توجہ ہیں۔ اسی طرح عطا کاکوی کی غزل میں "تار و پو" اور "شست و شو" کے قوافی قابل غور ہیں۔۔ مذکورہ دونوں قافیوں کے علاوہ تمام قوافی واؤ معروف کے ساتھ ہیں۔ جبکہ "تار و پو" میں واو کے ماقبل فتحہ ہے اور "شست و شو" میں واؤ مجہول ہے۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں عطا صاحب کی معلومات زیادہ ہوں۔

صبا اکرام — آرہ

"شاخسار" کے تازہ شمارہ میں اپنی غزل دیکھی۔ غزل کے مطلع کے پہلے مصرع

پھول کی لاش برہنہ تھی صبا

میں "برہنہ" کے استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے آپ نے نوٹ میں لکھا کہ دراصل یہ لفظ "برہنہ" ہے اور مثال کے طور پر آپ نے اقبال غزل کا ایک مصرع

ع برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست

بھی پیش کیا ہے۔ آپ کا اعتراض اپنی جگہ درست ہے۔ مگر ضرورۃً سے حرکات زبر، زیر، پیش، وقف و سکون میں تبدیلی جائز ہے خود کو سعدی نے بد کا قافیہ بنایا ہے؟ جو بد کی رعایت سے خود ہو جاتا ہے۔ خورشید کو خور کر دیتے ہیں۔ عربی الفاظ طرح کو طرح بھی باندھتے ہیں۔ نظر کو نظر بھی لکھتے ہیں (نظر کو نظر لکھنا فاش غلطی ہے۔ ادارہ) اسی طرح لفظ برہنہ کو برہنہ بھی باندھتے ہیں۔

اس سلسلے میں میں نے غیاث بھی دیکھا۔ برہنہ کی تحقیق لغوی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

برہنہ:۔ بفتح اول و ثانی و سکون ہا، ترجمہ عریاں ذبفتح اول و سکون ثانی و فتح ہا نیز آمدہ!

بہر حال یہ تو اصولی اور لغوی تحقیق ہوئی، اب میں آپ کو اساتذہ کے سناتا ہوں، پہلا شعر کسی استاد کی مشہور غزل کا۔ کہ نام یاد نہیں۔ دوسرا شعر داغ کا ہے:۔

(۱) برہنہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا نہ کچھ بھی راستہ محمل یار، دیکھ کر

---

(۲) کیا برہنہ پا دشت میں لاکھوں ہی نہ ہوں گے
کانٹوں کو مگر چھیڑ ہے، چھالوں سے ہمارے

حق ابروی چھترپوری — چھترپور

شمارہ ۴ پیش نظر ہے۔ شامل اشاعت غزلیں بہت باغ باغ ہو گئی۔ محمود سعیدی کی "سیہ بر سفید" کا جواب نہیں۔ "رات کی زد سے بھاگتا ہوا دن" میں سلیقہ سے بات کہی ہے



اُردو زبان کا منفرد علمی اور ادبی جریدہ

دوماہی شاخسار کٹک

...ری جلد —————— چھٹا شمارہ

مدیرِ اعلیٰ

امجد نجمی

★

ترتیب و تدوین

کرامت علی کرامت

★

صلاح کار

حرمت الاکرام

مظہر امام

حیدر نایاب

★

معاونین

...انور — احمد حسین آزاد

...سالانہ — فی شمارہ

...روپے — ۵۰ پیسے

...ی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ادیب و پرامٹر نے "لیبل لیتھو پریس رمنا روڈ، پٹنہ ۴" میں چھپوا کر بخشی بازار کٹک ۱ (اڑیسہ) سے شائع کیا



ایک رسم چل نکلی ہے کہ ہر رسالے کے ہر شمارے میں ایک اداریہ ضرور ہونا چاہیئے، کوئی مناسب موقع ہو یا نہ ہو، لیکن کھینچ تان کر کوئی موضوع نکال لیا جاتا ہے، تاکہ ایک دو صفحات کی خانہ پُری کی جا سکے۔ کچھ اور نہیں، تو شمارے کے مشتملات پر ہی ایک نثری قصیدہ لکھ دیا جاتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ "شاخسار" اب اس منزل سے آگے نکل آیا ہے، جہاں اس رسم کی پیروی ضروری ہو۔ البتہ جی چاہتا ہے کہ اس رسالے کی ان کارگزاریوں کی طرف ہلکا سا اشارہ کر دیا جائے، جو اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں انجام دی ہیں۔ یہ ۱۹۶۷ء کا چھٹا اور آخری شمارہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی "شاخسار" نے اپنی زندگی کے تین سال پورے کر لئے۔ اڑیسہ کی سرزمین سے شائع ہونے والا یہ پہلا رسالہ ہے جس نے اتنی باقاعدگی کے ساتھ اور اتنے عرصے تک اپنی اشاعت جاری رکھی ہے۔ اس جریدے کو برصغیر ہند و پاک میں جو پذیرائی حاصل ہوئی اور اس نے بتدریج معیار اور مقبولیت دونوں اعتبار سے جو ترقی کی ہے، اس پر خواہ ہم مغرور نہ ہوں، لیکن اپنے احساسِ مسرت کو چھپا بھی نہیں سکتے۔ "شاخسار" نے چھوٹے چھوٹے ادبی حلقوں کو چونکانے یا ایک ہی رات میں مشہور ہو جانے کا نسخہ استعمال نہیں کیا۔ کسی مخصوص مسلک، عقیدے اور رجحانات کی ہمنوائی یا فلسفہ طرازی کے لئے بھی اس نے زمین ہموار نہیں کی۔ "شاخسار" نے ہمیشہ فن کو فن کی حیثیت سے پرکھا۔ وہ نہ بڑے بڑے ناموں کے پیچھے دوڑا اور نہ اس نے ہر نوزائیدہ لکھنے والوں کو معیاری قرار دینے کی کوشش کی۔ "شاخسار" نے جہاں بہت سے جوہرِ قابل کو ڈھونڈ نکالا، وہاں برگزیدہ ادیبوں سے نئی تخلیقات حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوا۔

آج جب اردو ادب میں کف در دہاں تنقید کا دور دورہ ہے اور لال بجھکڑ قسم کے قلم پکڑنے والے اعصابی تشنج میں مبتلا ہیں۔ "شاخسار" پر کچھ زیادہ ہی ذمہ داری آتی ہے۔ ہمیں ایسی تحریروں کی ضرورت ہے، جن سے سوچنے اور غور و خوض کرنے کی نئی راہیں کھلیں، نئے مسائل کو سمجھنے کا شعور اور وقت کے شانہ بہ شانہ چلنے کا حوصلہ پیدا ہو۔

یہ بات بارہا دہرائی جا چکی ہے کہ اچھے ادب کے قاریوں کا حلقہ روز بروز محدود ہوتا جا رہا ہے، اردو تو خیر یوں بھی مظلوم زبان ہے اور اس زبان میں کوئی رسالہ نکالنا، اور بے لوث ہو کر نکالتے جانا بذات خود ایک وقیع کارنامہ ہے "شاخسار" کے سامنے بھی صاف اور سیدھا راستہ نہیں ہے۔ اِسے بھی قدم قدم پہ قربانیوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ "شاخسار" ویسا نہیں ہو پایا، جیسا ہم اسے بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم نے سخت حالات میں بھی علم و یقین کی شمع فروزاں رکھنے کا سلیقہ سیکھا ہے

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
(جمیل مظہری)

(ادارہ)

یا - پدمراج ستیہ نارائن نند
جمہ - محمد سعید

علامت کا ماضی و حال

"THE USE OF SYMBOLS IS SIMPLY ONE ASPECT OF LANGUAGE, THE MISTAKE LIES IN TRYING TO INVEST THEM WITH SOME SORT OF TRANSCENDENTAL SIG-NIFICANCE INSTEAD OF REGARDING THEM AS A TECHNICAL DEVICE OF THE SAME ORDER AS SIMILE OR METAPHOR. A SYMBOL IS NOTHING MORE THAN A VEHICLE FOR IMAGIN-ATIVE EXPERIENCE..... IT SHOULD CORRESPOND TO THE EMOTION EVOKED."

MARTIN TURNE
SCRUTINY (P: 295-96)

Symbol یا علامت ایک یونانی لفظ ہے۔ و شاعری میں اسی طرح مروج ہے جیسے استعارہ یا تشبیہ۔

علامت کی افادیت پر اکثر ایسے لوگ بھی متفق نظر آتے ہیں جو بظاہر متفرق مکتبِ خیال کے حامل ہیں۔ روزمرّہ کی زبان سے علامت بالکل مختلف چیز ہے کیونکہ روزمرّہ کی زبان میں جذبہ یا تخیل کا ہوبہو اظہار شدّت سے نہیں ہوتا۔ اگرچہ ذریعۂ اظہار کے اعتبار سے علامت روزمرّہ کی زبان سے بالکل مختلف چیز ہے پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی تشکیل اسی روزمرّہ کی زبان سے ہوئی ہے۔ ادب[1] میں علامت کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ جس طرح زبان اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے اسی طرح علامت کا کام کسی دانشورانہ کیفیت کو موثر انداز میں پیش کرنا ہے۔ بعض[2] نقاد زبان کے استعمال کو عقلی اور جذباتی ــــ ان دو مدارج میں تقسیم کرنا ضروری سمجھتے ہیں مگر علامت سے متعلق ایسی کسی بھی کوشش کو مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ البتہ علامت میں ان دونوں عناصر کی ہمیشہ متوازن آمیزش ہوتی ہے۔

---

۱ آر۔سی۔کالنگ اوڈ : پرنسپلز آف آرٹ صفحہ ۲۶۹

۲ آئی۔اے۔رچرڈز : ادبی تنقید کے اصول ــــ (PRINCIPLES OF LITERARY CRITCISM) صفحہ ۲۶۱-۲۷۱ "The Two Uses of Language"

ذہنی پیکر (Image) سے علامت کا بہت قریبی[۳] رشتہ ہے۔ اگر ذہنی پیکر شاعری میں اختصار کے ساتھ موثر انداز میں اظہار خیال کا ایک ذریعہ ہے تو علامت بھی ان خصوصیات کی حامل ہونے کے علاوہ دانشورانہ انداز میں مختلف تاثرات و کیفیات کو معنی آفریں بنا کر پیش کرتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی ایک نظم میں یا شاعر کی مختلف نظموں میں کسی ایک علامت کا بار بار استعمال ہوتا ہے۔ ایٹس اس کی زندہ مثال ہے۔

ایسٹر ۱۹۱۶ء (Easter 1916) ایٹس کی شاعرانہ زندگی کے وسطی دور کی تخلیق ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ایسٹر کی تقریب کے روز انقلاب آئرلینڈ میں حصہ لے کر جن میں بے شمار لوگوں نے اپنی زندگی کی قربانی دی تھی انہیں شہید کا درجہ دے کر حیاتِ دوام عطا کرنا اس نظم کا نصب العین ہے۔ اگر پوری نظم پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اس کا مقصد بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں اس کی گہرائی میں اتر کر آپ اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس میں مستعمل ذہنی پیکر اور علامت کو سمجھنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ مثلاً ؎

We know their dream; enough
To know they dreamed and are
dead."

ان مخصوص سطروں میں موت کو پیش نظر رکھ کر جو بات کہی گئی ہے وہ نظم کی گہرائیوں سے ہی عیاں ہو سکتی ہے — یہاں فنا و بربادی کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ وقت کی بیکراں پہنائیوں میں عالمی قیام کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ایٹس نے جو لافانی تخلیق پیش کی ہے اس میں حوصلہ کو جس قدر عظیم بتایا گیا ہے زیرِ زمیں مسخ شدہ لاش کو اسی قدر عبرت انگیز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ابدی رشتوں سے وابستہ فن اور فہم و فراست کی ارضی شان و شکوہ کی خوبصورت مثال اس کی نظموں میں جگہ جگہ ملتی ہے۔

مذکورہ بالا نظم کی سطروں سے اگر ذیل کے اشعار کا تعلق تلاش کیا جائے تو ذہنی پیکر اور علامت کے نازک رشتے مترشح ہوں گے۔ ؎

"Hearts with one purpose
alone Through summer and
winter seem Enchanted to a
stone
To trouble the living stream."

تیسری سطر میں پہلا لفظ "مسحور" (Enchanted) پہلی One purpose alone "صرف ایک ہی مقصد" کے ساتھ موت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ گویا کہ تمام زندہ افراد حیاتِ دوام کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ صرف ایک ذہنی پیکر "سنگریزہ" (Stone) میں تمام کے تمام افراد مع ہیں۔ پھر بھی "سنگریزہ" "زندگی کی لہروں" Living Stream) کا سدِ راہ تو بن سکتا ہے۔ ان لہروں کی رفتار پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ درحقیقت پوری نظم لہروں کی روانی کی شان میں ایک قصیدہ ہے۔

ایٹس کے آخری دور کی ایک اور تخلیق[۵] nder Ben Bulben ایڈگر ایلن پو کی ایک نظم[۶] Marginalia. کے ایک مصرع کی بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ دونوں نظموں کے موازنہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے ایٹس نے علامت کے استعمال میں اپنے دیگر ہم عصر شعراء کی ما پو سے بہت کم اثر قبول کیا تھا۔ البتہ اس کی شاعری پر فرانس

---

۳ "ذہنی پیکر کی وضاحت" (رسالہ "رنگت" (انڈیا) مئی ۱۹۶۷ء)
۴ "منتخب نظمیں" مصنفہ ڈبلو۔ بی۔ ایٹس (Collected Poems)
۵ "منتخب نظمیں" (Collected Poems) صفحہ ۳۴۳ ملاحظہ ہو۔
۶ The Poetic Principle, Works XVI 55

ن کی تحریکِ علامت کا اثر بہت گہرا معلوم ہوتا ہے۔ ایک دفعہ پو کی
ہ نظم پر رائے دیتے ہوئے ایٹس نے کہا تھا۔ "پوری چیز مجھے
فلمانہ اور لایعنی نظر آتی ہے (The Whole thing
Seems to me insincere and vulga
پھر بھی یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ پو کے اثر سے فرانسیسی شاعر بودلیئر
شاعرانہ زندگی میں نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ پو کے خیال میں زمین ملکوتی
ن (Beauty above) کا ایک اجمالی عکس ہے۔ صرف
لیات ہی شاعر کی زندگی کا نصب العین ہونا چاہئے۔ بودلیئر نے
۱۸۴۶ء میں پو کے اس قول کا تجزیہ کرکے اپنے مقصد کو اس سے
یب تر محسوس کیا تھا، رفتہ رفتہ انفرادی واقفیت پر اس کا اعتماد گہرا
گیا۔ پو کی طرح اس نے بھی شعری کاوش کے لئے فطرت کے اشتراک
کر تصور کیا۔ ۱۸۵۷ء میں اس کا ایک مجموعۂ کلام شائع ہوا جس کا نام
LES FLURS DUM تھا، اسی میں Correspond-
ences نامی ایک سانیٹ بودلیئر کے شعری مقاصد کا آئینہ دار
ہے۔ اس میں ساری فطرت کو ایک مندر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔
نظم میں بودلیئر نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ رنگ، خوشبو
نغمہ میں جو الگ الگ شعری کیفیات ہیں ان میں ایک دلفریب ہم آہنگی
موجود ہے۔ اگرچہ وہ فرانسیسی تحریکِ علامت کا رہنما تھا مگر اس کی
قات میں ملارمے کی طرح اسلوبِ بیان کا کوئی ضابطہ نظر نہیں آتا۔
ملارمے کے خیال میں اسرار (Mystery) کو صحیح طور پر
کرنا ہی علامت کی حقیقی ترجمانی ہے۔ دلوں کو متاثر کرنے
لئے واقعات کی بروقت تخلیق ہی دراصل علامت کو ہمہ گیر
نے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوتی ہے۔ ملارمے کی نظموں میں حسنِ ترتیب اور
لوبِ بیان کی دلکشی قابلِ تعریف ہے۔ اسکی نظموں کا ایک ایک لفظ معنی آفرینی اور
ریت پسندی کا حامل ہے۔ دراصل معنی آفرینی اس کی شاعری کا جزو لاینفک

ہے۔ ملارمے ان الفاظ میں شاعری کی تعریف کرتا ہے — "شعر کا مقصد[9]
انسان کی زبان کے ذریعہ شعری تاثرات پیدا کرنا ہے — یہ شعور کو
وجود کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔ ہماری عارضی زندگی
کو خود اعتمادی اور روح کو تازگی بخشتا ہے"

علامت کی تحریک کے دیگر کامیاب پہلو پال والرنک کی
تخلیقات میں نمایاں ہیں۔ اس کی شعری خصوصیات کو تسلیم کرتے ہوئے
ایک نقاد یوں رقمطراز ہے — "والرنک کی شاعری میں الفاظ تحلیل
ہو کر جذبات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں" مگر اس کے ایک ہم عصر شاعر
رمبو (Rimbaud) کے اشعار میں الفاظ کو خصوصی آزادی
حاصل ہے۔ لیکن رمبو نے علامت کی موزونیت پر جس قدر کاوش کی
ہے اس سے کہیں زیادہ خواب اور لاشعور کے احساسات کو اجاگر کرنے
پر زور صرف کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے فوق الواقعیت
(Surrealism) کی بنا ڈالنے میں اس نے ایک نمایاں
کردار ادا کیا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ تحریکِ
علامت ہر سطح پر واقعیت کے خلاف ایک ردعمل کی حیثیت رکھتی آئی
ہے۔ تاہم علامت کی کوئی مخصوص تعریف متعین کر لینا بہت دشوار ہوگا۔
پو سے لے کر رمبو تک یا بودلیئر سے لے کر ایٹس تک اس تحریک کے
مختلف ادوار میں مختلف فنکاروں نے اپنے اپنے طور پر علامت کی
مختلف تعریفیں پیش کی ہیں۔ علامت کے حامیوں نے کسی بھی تاریخی یا تمدنی
انقلاب کا کوئی مخصوص فارمولا پیش نظر نہیں رکھا۔ بلکہ مختلف شاعروں نے
اسے مختلف انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلئے کہیں کہیں
اختلاف کا سوال بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوصف
یہ کہا جا سکتا ہے کہ نفسیاتی یا روائتی تردید کی بہ نسبت فلسفیانہ نظریات
پر علامت پسندوں کا زیادہ اعتماد ہے۔ انہی فلسفیانہ نظریات سے

"ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس کے مراسلات" مرتبہ ایلن ویڈ صفحہ ۳۲۵
Response a' une Enquete (1891)
Message Poetique du symbolisme, II-P. 321
Mallarme: P. 264

متاثر ہو کر فرانسیسی تحریک علامت کو جن لوگوں نے انگریزی ادب سے روشناس کرایا اور اسے ایک ترقی یافتہ شکل عطا کی ان میں ٹی۔ای۔ہیوم، ایذرا پاؤنڈ اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جب تک ایٹس کی شخصیت کا جائزہ خود اسی کی شاعری کی روشنی میں نہ لے لیا جائے، تب تک اس کی شاعری کو سمجھنا دشوار ہوگا۔ علوم جدیدہ کا سہارا لے کر اس نے فلسفہ اور تاریخ کے تجزیہ (Analysis) سے اپنے مافی الضمیر کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ کی طرح ساحری بھی اس کی شاعری کا ایک ناگزیر جزو ہے۔ اپنی ان گنت نظموں میں ایٹس پیکریت اور علامت پسندی کی تعریف میں وقتاً فوقتاً ترمیم کرتا رہا ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والے گوناگوں انقلابات کی طرح اس کی تخلیقات میں علامتیں حسبِ ضرورت نیا روپ اختیار کرتی رہتی ہیں۔ اس لئے اس کے خلاف ایلیٹ نے Esotericism. کا الزام لگایا تھا۔

مگر ایٹس اور ایلیٹ نے اپنے اپنے رنگ میں علامت کا جس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اس کے لئے انہیں ساری دنیا خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔ ان کی یہ ہمہ گیر مقبولیت دیگر فنکاروں کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور ساتھ ہی اس میدان میں طبع آزمائی کیلئے دعوتِ عمل بھی دیتی ہے۔

المختصر فرانسیسی یا انگریزی ادب کے لئے علامت ایک پرانی چیز سہی مگر ہمارا ادب اس سے متعارف ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ ذہنی پیکر اور علامت کے ذریعہ مفہوم کی ادائگی کس حد تک ممکن ہو سکتی ہے نئے فنکار اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ کبھی کبھی علامت کے ساتھ کوئی مخصوص معنی وابستہ کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے نظریئے کو اشعار کے توسط سے اسی وقت موثر انداز میں پیش کر سکتا ہے جب تک اپنے نظریئے سے وہ خود اچھی طرح واقف ہو۔ اس صورت میں وہ جو چیز بھی پیش کرے گا وہ واضح اور دلکش ہوگی۔ خواہ علامت کے مخصوص معنی ہماری سمجھ میں نہ آسکیں، پھر بھی یہ لفظ اپنے مفہوم کی ادائیگی میں جس حد تک موثر ہے اس کے پیشِ نظر تمام اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

یریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

جگر بریلوی کی غزل

اردو شاعری ابتدا سے کچھ ایسی روش پر چلی اور اس میں کچھ ایسے لوازم اپنائے چلے گئے کہ وہ قریب قریب کلیتہً ایک رسمی و رواجی جنس بن کر رہ گئی شاعر کے یہاں اس رواجی جنس کی اس قدر کثرت اور بہتات ہوئی کہ اس انفرادی حیثیت اس میں گم ہو کر رہ گئی۔ ڈھونڈھتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ رسمیات کے پس پردہ حقیقت کیا ہے شاعر نے ہم کو کیا درس دیا ہے اس اپنی جنس کس نوعیت کی ہے اگر ہم اس کو شاعر کہیں تو محض ادب میں کسی خصوصیت کے ساتھ اسے پیش کریں اور یا ہم کسی خصوصیت کے ساتھ پیش بھی کر سکتے ہیں یا نہیں زور ہے کہ بعض شخصیتوں نے رسمیات پر اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھا دیا ہے لیکن مستثنیات سے ہیں اور ایسی مثال تو نایاب نظر آتی ہے جس نے ان لوازم یا ہتھیار کہ سہارا قطعی نہ لیا ہو گل و بلبل، بہار و خزاں صراحی و ساقی شراب و عارض و گیسو ہجر و وصال و رقابت شمع و پروانہ دشت و بیابان جیب و آستیں و داماں لیلیٰ مجنوں طور و منصور دار و رسن گور و کفن میت و مزار ایسی چیزیں ہیں جن سے باہر شاذ ہی کوئی اصلیت نظر آتی ہے اسی ذخیرہ ایسا سرمایہ بھی ہے جو جذبات عامیانہ و سوقیانہ ہے لیکن جس میں تصوف و رسے اعلیٰ خیالات بھی مضمر و مستور بتلائے جا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے یہاں کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت نہیں ملتی تو اس کے یہاں کچھ حقائق زمین دوز مل جاتے ہیں۔ اب یہ حقائق و معارف اس کے رنگ طبیعت یا درویش کے اثرات ہیں یا محض رواجی شاعری کی کرامت اس کا علم عام طور پر نہیں مغربی علم و ادب کی برکتوں میں ایک برکت اردو میں نیچرل شاعری کی ایجاد ہے جس کے بہت سے علمبرداروں نے ان رسمیات کا بت توڑ دیا ہے لیکن غزل بڑی حد تک اسی کی پرستش چلی جاتی ہے۔ ایک شاعر ضرور ایسا نظر آتا ہے جس نے میدان میں بھی قدامت کے ساتھ بغاوت کی اور علم اجتہاد بلند کیا اور بالاعلان بلند کیا وہ کہتا ہے :-

میرے یہاں ذکر شمع و پروانہ نہیں ۔ محفل میں میری شراب و پیمانہ نہیں

روداد جگر ہے کیا حدیث منصور ۔ سب کہہ سکیں جس کو یہ وہ افسانہ نہیں

اب دیکھنا ہے کہ جگر نے جو اردو لوازم شاعری سے اجتناب کیا تو اس کی خصوصیت محض اجتناب کی حد تک رہی یا اس نے کوئی اثر ایسی بھی پیش کی جو شاعری کے اعتبار سے مستحسن ہو اور جس کو ایک ممتاز اور منفرد حیثیت دی جا سکتی ہو۔ ہم نے تو یہ کہہ دیا کہ جگر کے یہاں رسمی و رواجی سرمایہ نہیں ہے لیکن یہ بھی دیکھیں کہ اس کے یہاں ہے کیا اس کے یہاں ہم کو غم و اندوہ کے مضامین بہت ملتے ہیں لیکن یہ غم و اندوہ نزع و جانکنی موت و میت گور و کفن سے قطعی تعلق نہیں رکھتا بلکہ تجزیہ و تحلیل کے بعد ایک مستقل فلسفہ کی صورت میں ہم کو نظر آتا ہے اور اپنی تمام باریکیوں اور گہرائیوں کے ساتھ یہ غم وہ غم ہے جو طلب صادق اور بیتابی روح کا نتیجہ ہوتا ہے جو زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے جن کی تعریف جگر ہی خود کر سکتا ہے ؎

سوز عشق اصل زندگانی ہے ۔ داغ دل ہر کامرانی ہے

بے خبر حیات تھا غم نے مجھے جگا دیا ۔ زیست کا راز کھول کر موت کا آسرا لیا

غالب کے ذیل کے شعر کے ساتھ جگر کا شعر پڑھیے اور دونوں شاعروں کی پرواز فکر و حقیقت نگاری کا لطف اٹھایئے غالب کہتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

یہی وہ غم ہے جس میں فنا ہو کر انسان بقائے دوام حاصل کرتا ہے اور جس سے بیتاب ہو کر بار بار جگر کہتا ہے ؎

جان اپنے لئے کھو لینے دے ۔ مجھ کو جی کھول کے رو لینے دے

راہ میں اپنی خاک ہونے دے ÷ اور کچھ میری التماس نہیں
غرضِ جان و جگر ہے آرزو مند فریغ ÷ بے محابا اک نگاہ برق سامان کیجئے
عشق ارمان آرزو و تمنا سب کا دشمن ہے ؎
کیسی دعا کہاں کا اثر کس کا مدعا ÷ کچھ آگ کے سوا میرے دل میں کہیں نہیں
اور یہ واقعہ ہے حقیقت ہے کہ اس آگ کے سوا جگر کے یہاں کچھ نہیں حد ہے کہ خواہش وصال کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا کس کس انداز سے کیا کیا اسرار بیان کرتا ہے۔

قصۂ ہجر و وصال کیا جانیں ÷ سلسلۂ آرزو سے ہم ہیں دور
برباد ہو رہا ہوں محبت کی راہ میں ÷ عالم تمام ہیچ ہے میری نگاہ میں
مائل لطف و کرم حسن ہو کچھ دور نہیں ÷ عشق منظور کرے عشق کا دستور نہیں
آپ بھی دور ہیں آپ کے غم کے صدقے ÷ کسی عنوان تسلی مجھے منظور نہیں

اور یہ دوری کی خواہش اس لئے ہے کہ ؎
وہ سمایا ہوا ہے رگ رگ میں ÷ فیض ہے یہ غم نہانی کا

سمایا جاتا ہے جیسے کوئی رگ رگ میں دل بن کر
یونہی غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہے

جگر اس حقیقت کا تجربہ رکھتا ہے کہ غم ایک قوت ہے جس کے ضبط کرنے سے وہ کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں جو عالم الوہیت کی جانب رہنمائی کرتی ہے جس قدر کوئی شخص ضبط سے کام لے کر اس میں قاودگی و خستگی کی شان پیدا کرتا ہے اتنا ہی دیار محبوب کے قریب ہوتا جاتا ہے وہ ان تمام باریکیوں کو طرح طرح سے بیان کرتا ہے ؎

یہی ہے رمز محبت یہی ہے رازِ فنا ÷ برنگ برق تپاں رہ برنگ داغ خموش
شدت غم پہ اگر ضبط کا امکان ہو جائے ÷ دل میں جو داغ ہو تحال رخ ایمان ہو جائے
تھا پردۂ خودی جو ولولۂ دل تھا ÷ جذبہ جسے کہتے ہیں اک جذبۂ باطل تھا
ابھی جبیں پہ ہوئی ہی کہاں ضبط جوش جنون ÷ پھر ٹھہرا ابھی خلوت خیال یار نہیں

یہی نہیں ہے کہ جگر غم کی عظمت کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور ضبط کی اہمیت بھی جانتا ہے وہ اظہار غم کو ایک ایسا گناہ سمجھتا ہے جس سے زندگی تاریک ہو جاتی ہے ؎

حیثیت سر جدا ہے جاں کش عشق ÷ آستیں لالہ گوں نہ ہو جائے

ادعائے عشق ننگ و شکوۂ بیداد ننگ
زہے اپنی وفا ان کی جفا میرے لئے

اس راز غم یا سوز عشق کے چھپانے میں کس قیامت کی اخفائے جگر کو لیتا ہے ؎

دل سے کہتے بھی دم نکلتا ہے
ہائے کیا راز ہے محبت کا

اور اس شعر میں تو حد کر دی ہے جس کی بلاغت و معنویت غور طلب ہے

دوست پر بھی گمان غیر ہوا
اک قیامت ہے عشق و طبع غیور

جب یہ غم رگ و پے میں سرایت کرکے روح میں سما جاتا ہے تو عالم لاہوت کی کیفیتوں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔

سرور و کیف کا عالم ہے حد ہستی تک
لئے ہوئے اب آغوش میں کوئی مجھ کو
کیفیت و سرور ہے اور جلوۂ جمال
اب میں نہیں زمیں نہیں آسماں نہیں
بالیدگی روح ہے اور جلوہ نگار
پھرتا ہے کوئی ساتھ گلستاں لئے ہوئے
دنیائے محبت ہے ہیں ہر کیفیت و مستی ہر دل ہے
کچھ فکر نہیں ہے ساحل کی اس دریا کا ساحل ہی نہیں

بحر غم کی گہرائی میں ڈوب کر دل کس طرح روحانی کیفیت و سرور میں تبدیل ہو جاتا ہے جگر نے بہترین طریقہ میں ایک رباعی میں نظم کیا ہے ؎

جب رنج سے دل نڈھال ہو جاتا ہے
جب حد سے سوا ملال ہو جاتا ہے
محویت غم سے دل کی گہرائی میں
محسوس تیرا وصال ہو جاتا ہے

جب ہم ان اشعار کی معنویت پر اچھی طرح وقوف حاصل کر لیتے ہیں تو ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ حالات اور کیفیتیں یہ رموز و اسرار محض دماغی اور تخیلی قوت کا نتیجہ نہیں بلکہ ان زندگی کے تجربات و احساسات ہیں جو اس غم میں ڈوب کر ملے ہیں اور ایسی ہی زندگی کا یہ دعوے ہو سکتا ہے ؎

اصل حق پرستی کی کیا ہے خود پرستی ہے
خاک راہ دل ہونا مدعائے ہستی ہے

اپنے ہی سجدہ کا ہے شوق میرے سر نیاز میں
کعبۂ دل ہے سامنے محو ہوں میں نماز میں

اور ایسے ہی شخص کو جو اس رفعت پر پہونچ چکا ہو زندگی ایک عبادت محسوس ہو سکتی ہے اور زندگی کو عبادت سے تعبیر کرنا ہمارے لئے ضرور ایک نئی اور قابل توجہ بات بھی ہے

کوئی جینے کو سمجھے مایۂ عشرت برا کیا ہے
مجھے تو اک عبادت زندگی محسوس ہوتی ہے

غم عشق مجازی کا تعین ہو یا عشق حقیقی کا دین کے لئے ہو یا دنیا کے بری بلا ہے اور کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جو اس سے گھبرا کر نہ کہہ اٹھا ہو

"اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"

لیکن التجائے مرگ نہیں کی تو جگر نے شروع سے آخر تک آپ ایک ایک شعر دیکھ جایئے کہیں خواہش مرگ کا خیال تک نظر نہیں آتا بلکہ وہ آرزوئے مرگ کو اس راستہ میں ایک گناہ سمجھتا ہے۔ زندگی کی عظمت پر شدت غم غالب نہیں آنے پاتی اس سے ثابت ہے کہ جگر ایک رسمی اور خیالی شاعر نہیں بلکہ اس کا کلام زندگی کے ایک خاص معیار پر عملی درس ہے۔ ایک خاص مسلک کی تفسیر اور خاص کیفیت کا سرچشمہ آدمی ہونے کی حیثیت سے کبھی کبھی غم اسے لرزا دیتا ہے مگر پھر اس کی علو ہمتی آڑے آجاتی ہے

عظمت زیست بھولتا ہے جگر
موت کا خواستگار ہوتا ہے

کیا شعر کہا ہے دیکھئے

آتی رہیں بلائیں لرزتی رہی حیات
جس دل میں تو رہا وہ ہراساں نہ ہو سکا

وہ اپنے غم کے آگے دنیا وما فیہا کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا پھر وہ اس کی شدت کو مبارک سمجھیگا نہ کہ اس سے گھبرا کر طالب مرگ ہوگا وہ جینے کی تلقین ہی نہیں کرتا بلکہ اسی زندگی کو زندگی سمجھتا ہے جو غم واندوہ سے معمور ہو اس غم واندوہ میں لیا کیا اسرار اس نے دیکھے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

نبرد تنہائی سے مر جانا تو کچھ مشکل نہ تھا
کیا کہیں غم سے مگر کچھ عہد و پیماں ہو گئے

اب میں سمجھا سینۂ سوزاں کے شق ہونے کا راز
آپ پنہاں کیا ہوئے گویا نمایاں ہو گئے

فراوانی غم میں کچھ پیام دوست پنہاں ہیں
جگر آساں نہیں ہے جان سے بیزار ہو جانا

وہ اس طرح جینے کی تلقین کرتا ہے۔

نوید امتحاں ہے زیست کا دشوار ہو جانا
مبارک ہو تجھے دل راہ کا پر خار ہو جانا

دیکھئے کس بلا کا شعر ہے۔

دل ہے سینے میں غم سے عہد و پیماں کیجئے
موت کے ارماں سے جینے کا ساماں کیجئے

دل نہ جب تک ہوا ایک شعلۂ عشق !
زندگی زندگی نہیں ہوتی !

ہجوم نامرادی سے یہ عقدہ کھل گیا آخر
جو ہوتی ہے تو غم میں زندگی محسوس ہوتی ہے

وہ اپنی ہستی اور ہستی کے تمام پندار کو سپرد غم کر چکا ہے پھر اس کو دنیا اور اسباب دنیا سے کیا واسطہ

دفنا کے دل زار کو ہم اس کی گلی میں
بیٹھے ہیں کچھ ایسے کہ کوئی کام نہیں ہے

اب کوئی زہر دے کہ بادۂ ناب
ایک پیمانہ ہم کو بھرنا ہے

اس طرح کچھ دل کا خون ان کے اشاروں پر ہوا
بڑھ گئی افسوس جینے کی تمنا اور بھی

یوں تو ہر شعر نہایت پر مغز اور جامع ہے لیکن آخری شعر تو عجیب وغریب کیفیت کا مرقع ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی کہتا ہے کہ دل خون تو ہوا لیکن محبوب کے اشاروں کے مطابق کچھ اس انداز سے خون ہوا کہ بجائے زندگی سے تنگ آجانے کے افسوس کہ جینے کی تمنا اور بھی بڑھ گئی۔ یہ ہی انداز

نیاز عشق و اسرار تسلیم و رضا جن کو سمجھنا اور سمجھانا دونوں مشکل ہے پھر افسوس کہ بلاغت وہ بلاغت ہے جس پر ذوقِ سلیم وجد کرتا ہے۔

میں نے نہایت مختصر طور پر جگر کے فلسفۂ غم پر بحث کی ہے اور جو اشعار پیش کئے ہیں ان میں سے بیشتر ایسے وسیع و دقیق معانی و مطالب کے حامل ہیں جن کی شرح میں صفحے کے صفحے لکھے جا سکتے ہیں یہ اشعار مشتے نمونہ از خروارے ہیں لیکن شاعر کی عظمت و رفعت کا اندازہ کرا دینے کے لئے ضرورت سے زیادہ کافی ہیں ایک ایک شعر اپنی اصلیت و حقیقت کے انکشاف کے لئے تامل و غور کا محتاج ہے اور پختگی جامعیت و اثر میں بے پناہ ہے جس شخص نے کہنے کے لئے یا شاعر مشہور ہونے کے لئے نہیں بلکہ حقیقت میں دلِ زار کو کوئے دوست میں دفنا دیا ہو اس کی ہستی ہی باقی نہیں رہتی اس سے جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ کسی اور ہی ہستی کا عنصر ہوتا ہے وہ عنصر عبد و معبودیت کی قید سے باہر ہے۔

نیاز میں بھی اک اندازِ بے نیازی ہے
میری جبیں کو کوئی آستاں نہیں ملتا
زمیں پہ ٹیک تو دوں میں جگر جبینِ نیاز
نشانِ سجدۂ غم دل کو ناگوار نہیں

جگر کے یہاں خود پرستی جس چیز سے مراد ہے وہ اسی عنصر یا کیفیت روحانی کی پرستش ہے اور اس پرستش کو وہ اصل عبادت سمجھتا ہے۔

دل پرستی خدا پرستی ہے
خود پرستی خودی نہیں ہوتی

محویتِ غم نمازِ دل ہے
دیوانہ ہوں اپنی بندگی کا

خودی اور بے خودی پر شعرا کے بہت شعر ملیں گے جگر نے صرف ایک شعر کہا ہے مگر جو فلسفہ اس میں نظم کر دیا ہے اس کی تشریح کے لئے دفتر چاہیئے۔

خودی میں دل میں ہو تو بے خودی میں دل تجھ میں
جو یہ نہیں تو جہنم ہے زندگی مجھ کو

یہ جگر کے کلام کا اصل رنگ بلکہ اس کے ضمیر کا جوہر ہے جو انسانیت کے لئے ایک پیام اور مسلک کا کام دیتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا سمجھنا اور سمجھانا بغیر عمل کے مشکل ہے۔

بقیہ ایک خط، ایک کہانی

سوچتی ہوں کہ ایک بار صرف ایک بار خدا سے یہ التجا کروں، تمنا کروں کہ مرنے سے قبل تمہیں دیکھ لوں۔ لیکن نہیں، اب تو کوئی تمنا کرتے بھی جی ڈرتا ہے کیونکہ میں وہ ناکام تمنا ہوں کہ میری کسی بھی خواہش کو آج تک سرفرو ہونے کی ساعت نصیب نہیں ہوئی، اور یہ خواہش زندگی کی آخری خواہش ہوگی اس لئے ڈرتی ہوں کہ یہ بھی پوری نہ ہوئی

ہائے مجبوریٔ آدابِ محبت اے دوست
پاس آ بھی نہ سکوں، تجھ کو بلا بھی نہ سکوں (غالب)

غالب نے یہ شعر شاید میرے ہی لئے کہا تھا۔ اف! اس کے ایک ایک لفظ میں کتنے نشتر چھپے ہوئے ہیں اور اس ہائے میں کتنی مجبوریاں، کتنی مایوسیاں اور کتنی تڑپ پنہاں ہے۔ کاش! میں تم تک پہنچ جاتی یا تمہیں بلا لیتی لیکن ان دونوں صورتوں پر میرا بس نہیں۔ تم آ دگے نہیں اور مجھ میں اتنی سکت نہیں کیونکہ چراغِ زندگی کی لو جھلملا رہی ہے۔

ہائے مجبوریٔ آدابِ محبت اے دوست!
اچھا اب اجازت دو، تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت!

تمہاری اپنی
نغمانہ

ی۔ ایم۔ راہی فتحپوری

باب الانتقاد

واحد پریمی کا مجموعۂ غزلیات

"گلِ نو"

صنف غزل کے بدلتے ہوئے نظام و شعور کی کسوٹی پر کسنے سے
ں کوتاہ نظری و تنگ دامنی جیسے عیوب کیلئے مورد الزام ٹھہرانا حق بجانب
یں ہے۔ غزل، انسانی فطرت کے داخلی و خارجی دونوں پہلوؤں پر
یغ و مکمل اشارے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر فنکار کا شعور پختہ و
الغ ہے تو وہ غزل کے نازک و جاذب نظر خد و خال کو مجروح کئے بغیر
ی حد تک زندگی کے مختلف شعبوں کی موثر آئینہ داری کر سکتا ہے۔ آج ہم
یکھتے ہیں کہ صنف غزل کے سخت گیر ناقد بھی غزل کی بے پناہ وسعت و
نش و بالغ نظری سے خاطر خواہ استفادہ کرنے پر پوری طرح آمادہ ہیں۔

یوں تو ایسی کون سی صنف سخن ہے جو ناعاقبت اندیش فنکاروں
بھینٹ نہ چڑھی ہو۔ لیکن وہ لوگ قابل قدر ہیں جنہوں نے صحت مند
ت و خوش آئند تجربات و مشاہدات سے شعر و ادب کو کشادہ دامن
یا کر رہے ہیں۔ دور حاضر کے دور اندیش غزل گو شاعروں میں واحد
ی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ واحد پریمی جملہ فنی پابندیوں کو ملحوظ خاطر
کھتے ہوئے روایات کے تسلسل کو بحسن و خوبی آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان
کلام میں نہ تو لکیر روایات کا رچاؤ ہے اور نہ قطعی انحراف ــــ

ادب اور زندگی کا ربط و تعلق ظاہر و باطن کا سا ہے۔ یہ بات اور ہے
کہ کبھی کبھی مصلحتاً یا غیر فطری طور پر لوگوں نے ادب اور زندگی کے رشتوں
کو نظر انداز کر دیا ہو۔ زندگی میں فنکار کی اپنی زندگی اور اپنے تجربات و
مشاہدات کو اولیت حاصل ہے جس کا عکس ادب کے آئینے میں زیادہ
گہرا ہوتا ہے۔ ایام شباب عموماً جمالیاتی کیف و کم، سرمستی و سرشاری کیلئے
وقف ہوتے ہیں۔ لیکن واحد پریمی نے ان چند غیر اہم تقاضوں سے ماوریٰ
ہو کر وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے اپنی فکر و نظر کو سنجیدگی، متانت و
مقصدیت سے ہمکنار کیا۔ ان کی عشقیہ شاعری محض آئینہ دارِ وصال یا
وقف ہائے نالۂ غم ہی نہیں ہے بلکہ امید و عمل کا صحیح جذبہ لئے ہوئے
ہے۔ ان کے تخیل میں روایت کا پرتو بھی ہے اور جدید رجحانات کا
عکس بھی۔ جس کا انہیں خود بھی احساس ہے۔ ؎

لاکھ پابندِ روایات ہے واحد لیکن
اس کا اندازِ بیاں کچھ تو نیا ہے یارو

واحد پریمی کا اولین مجموعہ "گلِ نو" (۸۰ غزلوں پر مشتمل)
اپنی جملہ خوش آئند خوبیوں کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ پیر صدیقی سے

سے کر حرفِ آخر تک یہ مجموعہ حسنِ ترتیب و حسنِ معنی کے اعتبار سے گلدستۂ نظر نواز معلوم ہوتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذبِ نظر اور غزلیں فکر انگیز و اثر آفریں ہیں۔

واحد پریمی کی تخلیقی صلاحیتوں کے پیچھے ایک متحرک شعوری جذبہ کارفرما ہے۔ ان کی فکر و نظر کی داخلی نیز خارجی فضا میں ربط و ہم آہنگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام معنوی پیچیدگیوں سے یکسر پاک ہے۔ ان کا لب و لہجہ متین و مہذب ہے۔ فطرت میں بلا کی غنائیت ہے جو نغمہ و ترنم کے اثر انداز لہجے میں جا بجا ملتی ہے۔ ان کے بیشتر اشعار ان کے محسوساتِ قلبی کے موثر ترجمان ہیں۔ جن میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حسین امتزاج ہے۔ واحد پریمی نے دامنِ غزل میں مقصدیت کے گلہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں۔ ان کی شاعری زندگی اور زندگی کے گرد و پیش کا بھرپور جائزہ لیتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ ان کی نگاہ "آئینۂ سحال" کی تاریکی میں تابندہ و درخشندہ نقوش کی تلاش میں سرگرداں ہے ؎

اس طرح ظلمتِ حالات پہ آنسو نہ بہاؤ
سوز دل میں ہو تو خود شمعِ فروزاں بن جاؤ

سازِ دل سے کوئی اب درد کی جھنکار نہ ہو
صبحِ نغمات کے پیغامبرو یاد رکھو

بکھرے کسی طرح تو شبِ تار دوستو
بکھسوئے مشعلِ لب و رخسار دوستو

پھر ہر ایک انسان میں حسن ہی نظر آئے
اپنی کم نگاہی پر ہم اگر نظر کر لیں

واحد پریمی سعی و عمل اور کشمکش ہی کو زندگی کا نصب العین گردانتے ہیں۔ ان کے دل میں عزم و استقلال کا طوفان ہے تو لب پہ انسانی عظمت کے ترانے۔ ان کا عشق پاکیزہ اور صحت مند ہے جو داخلی و خارجی پہلوؤں کا بہ حسن و خوبی احاطہ کئے ہوئے ہے

جہاں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ تذکرۂ رنج و الم بھی ہے تفسیرِ کیف و کم بھی۔ جو احساسات و مشاہدات کی روشن اور تاریک کیفیات سے متاثر ہوتا ہے جو بہ یک وقت کامیابیوں پہ ہنستا بھی ہے مگر ہنستے ہنستے نمدیدہ بھی ہو جاتا ہے ؎

کوئی ہنگامۂ حیات نہیں
رات خاموش ہے سحر خاموش

بارہا زبانوں پر لگ گئی ہے پابندی
بارہا نگاہوں سے کی ہے گفتگو ہم نے

دلوں میں زخم، ہونٹوں پر تبسم
اسی کا نام تو زندہ دلی ہے

واحد پریمی کے بیشتر اشعار حالاتِ حاضرہ کے سخت گیر ناقد ہیں مگر وہ صرف حالات کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھو کر سکون نہیں پاتے بلکہ کاروانِ سعی و عمل کے ساتھ ہر موڑ اور ہر منزل پر خوابِ خوش آیند کی تعبیر تلاش کرتے ہیں ؎

وقت کی دھڑکنوں سے غافل ہیں
ہاتھ میں نبضِ کائنات بھی ہے

عرش پر دیکھنے والو! دیکھو
فرش پر ہیں مہ و اختر کتنے

فاصلے سمٹ جائیں منزلیں قدم چومیں
اپنے جذبۂ دل کو ہم جو راہبر کر لیں

کون طوفان کا راز سمجھے گا
ہم اگر ہو رہے کناروں کے

واحد پریمی نے وارداتِ حسن و عشق سے بھی پہلو تہی نہیں کی۔ ان کی شدتِ احساس میں غمِ جاناں کا عنصر واضح ہے لیکن وارداتِ

قلبی کے اظہار میں جذباتیت کو زیادہ دخل نہیں ہے۔ واحد ایک زاویۂ خاص سے اپنے محبوب کے حسن کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں بھی ان کے مشاہدات میں ایک ہمہ گیری شان تیز ماحول کی اثر آفرینی ہے۔ ان کی آپ بیتی میں جگ بیتی کا سا انداز ہے۔ معیارِ خیال سے قطع نظر انہوں نے نفسیاتی پہلو پر روشنی نہیں ڈالی۔ ابہام، بے راہ روی اور اوچھے پن کو نہیں اپنایا۔ ان کا محبوب پست کردار یا بازاری محبوب نہیں ہے۔ نہ وہ قنوطیت پسند ہیں اور نہ انتہا پسند ؎

کبھی نہ حسن و محبت میں نبھ سکی واحد
وہ اپنے ناز میں ہم اپنے بانکپن میں رہے

کیسی بیمارِ غم کی حالت ہے
کیوں کھڑے ہیں یہ چارہ گر خاموش

ٹھنڈی چاندنی سے بھی میرا قلب جلتا ہے
کوئی یاد آتا ہے چاند جب نکلتا ہے

شبِ فراق کئی بار گوشۂ دل سے
اُٹھی تو آہ مگر آہ بے اثر اُٹھی

واحد پریمی کے فکر و شعور بالیدہ و پختہ ہیں جن سے خاطر خواہ استفادہ کرتے ہوئے اپنے مستقبل سازی میں منہمک ہیں۔ انکے آئینۂ کلام میں ادب و زندگی کے اہم نقوش نظر آتے ہیں۔ وہ بے حد حساس طبع ہیں۔ باریک بینی ان کی فطرت کا جزوِ خاص ہے۔ آگے چلکر یہ لوازمات ان کی شاعری میں ایک خاص انفرادی چمک دمک پیدا کرنے میں معاون ہونگے۔ نہایت شیریں و شگفتہ الفاظ میں انتہائی تلخ و اثر انداز مضمون سمو دینا گویا واحد پریمی کا طرۂ امتیاز ہے۔ حسنِ ترکیب، زبان کا چٹخارہ پن، شاعرانہ لطافت، منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، غرضکہ جملہ اوصافِ غزل کسی نہ کسی مقدار میں واحد پریمی کے کلام میں موجود ہیں۔ خیالات و جذبات میں جوش و صداقت بھی بدرجہ احسن ملتا ہے۔ عامیانہ جذبات اور فرسودہ خیالات کی سطح سے ان کی نگاہ لطیف حقائق تک پہونچ جاتی ہے۔ اضطراب و کشمکش کی آمیزش ان کے اشعار کو نازک اور پرلطف بنا دیتی ہے۔ جذبات کی صداقت، تخیل کی بلندی اور کلام میں جوش و خروش واحد پریمی کے مخلص ترین دوست ہیں جو یقیناً مستقبل میں بھی ان کی صحیح رہنمائی کریں گے ؎

ہم وہ رہرو ہیں کہ چلنا ہی ہے مسلک جن کا
ہم تو ٹھکرا دیں اگر راہ میں منزل آئے

تاریکیٔ حیات کو جو دور کر سکے
ہم ایسی صبح کے ہیں طلبگار دوستو

اُونچی اڑانیں اڑنے سے حاصل نہیں ہے کچھ
ذرّوں ہی میں ستاروں کی ہم جستجو کریں

اے جذبِ جنوں یہ کوئی دھوکا تو نہیں ہے
مائل بہ کرم، چشمِ غضب دیکھ رہے ہیں

جدید شاعری کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی خارجی و داخلی دنیا میں تضاد، بے ربطی و ناہمواری ہے۔ وہ اس ہنگامہ بردوش دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں بھی شک، بے یقینی، خوف اور مایوسی جیسے تباہ کن اور ہمت شکن تاثرات اُبھرتے ہیں۔ واحد پریمی کو زندگی کی کس مپرسی کا احساس تو ہے مگر اس احساس نے انہیں قنوطی بنا کر نہیں رکھ دیا۔ وہ اپنے اشعار میں محض پست ہمتی اور زندگی کی افسردگی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ پورے عزم و خلوص کے ساتھ کارزارِ حیات میں سعی و عمل اور بصیرت و احساس کی روشنی لئے انسان اور کائنات کے رشتوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہ تجربات و عمل سے قطع نظر صرف احساس کی ترجمانی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی بیشتر غزلیں اگرچہ رومانی اور عشقیہ فضا میں پروان چڑھی ہیں مگر ان کا بنیادی موضوع محض روایت کا پابند ہو کر نہیں رہ گیا ؎

رشتۂ قول و قسم ٹوٹا ہے ٭ یعنی اک تازہ ستم ٹوٹا ہے

آج ان کو بھی سکوں کی ہے تلاش
روشنی کو ڈھونڈتی ہے روشنی

میکدہ آنکھوں میں اور گیسو بدوش
دیکھ کر ان کو رہے پھر کس کو ہوش

نظر کے سامنے ہر دلکشی ہے
نظر لیکن انہیں کو ڈھونڈتی ہے

غرضکہ مجموعہ "گل نو" ہر اعتبار سے اپنے خالق کی نفاستِ مزاج، پاکیزگیٔ خیال اور روشن تر مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے مجھے امید ہے کہ اس مجموعہ کے متعلق گراں قدر آرا نہ صرف یہ کہ واحد پرمی کی صحیح رہنمائی و حوصلہ افزائی کریں گی بلکہ منزلِ سخن کے تعین میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوں گی۔ "گل نو" جیسا حسین مجموعہ شائع کرنے پر مکتبۂ صبحِ ادب نزد مسجد ٹولوالی بھوپال یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے۔

بقیہ غروب

ہو جاؤں۔"

ستیہ ہرمزجی اپنے پروفیسر کی جانب تشکر سے دیکھنے لگی۔

"مس ہرمزجی ——"

"جی؟"

"جی، کی بڑی شیریں ملائمت محسوس کر کے ڈاکٹر پانڈے بے چین ہو گیا۔ "آج میرا ذہن خلا، کی بجائے محبت کے موضوع سے بھرا ہوا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے مس ہرمزجی کہ ہم خلا کی بات کسی اور دن پر اٹھا رکھیں؟"

"پروفیسر، آپ —— آپ شاید نہیں جانتے۔ میں بیوہ ہوں۔"

"تو کیا مضائقہ ہے؟" ڈاکٹر پانڈے اپنی کرسی سے اٹھ کر بڑے گرم جوش اشتیاق سے ستیہ ہرمزجی کے قریب آ کھڑا ہوا جیسے وہ اپنے چیرا کی نتھوں کی طرح سوختہ لبوں کے رو برو اپنی محبوبہ کو اڑا لے جائے گا۔

"تم جو بھی ہو ستیہ، میں —— تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں ——"

"آپ میری ہتک کر رہے ہیں ڈاکٹر پانڈے! ——"

زمین نے چشم زدن میں سورج کے ڈھائی کروڑ چکر کاٹ لئے اور ——



بقیہ بزم شاخسار

دنیا جو تیرگی کی پرستار ہے تو ہو
میں کیوں نہ روشنی کے تقاضوں کا ساتھ دوں

مہدی پرتاپ گڑھی

روشنی میں زمانے کے در و بام مجھی سے
میں وقت کے چڑھتے ہوئے سورج کی ضیا ہوں

سید محسن نقوی

جناب ہاشمی —— فتحپوری (یوپی)

زیر نظر شمارے میں پروفیسر عبدالمغنی اور پروفیسر کرامت علی کرامت کے مقالات افادیت کے اعتبار سے نہایت پر مغز ہیں۔ نسیم منظر پوری اور خالد شفائی کی نظمیں اچھی ہیں۔ سید محسن نقوی، شفقت کاظمی، اخلاق فتحپوری اور حفظ الباری کی غزلیں پسند آئیں۔ مسرتاج بانو شبنم اور عبد المنان کی کہانیاں خوب ہیں۔ بحیثیت مجموعی سعیٔ جمیل بہت کامیاب ہے۔



تناسخ

کرامت علی کرامت

میں نے اِک برج پہ جاکر دیکھا
کرۂ ارض کے اِک خطے میں
کچھ قبیلے ہیں کہ مصروف ہیں پُوجا میں فقط لکڑی کی
دیکھتا کیا ہوں کہ بڑھ کر میں نے
چھین لی ان سے ہر اک طرزِ پرستش آخر
اور اُسی لکڑی کو
میں نے دی شکل حسیں پیکر کی
شیو اور وشنو کی روحوں کو مسخر کر کے
میں نے داخل کیا اس پیکر میں
کیونکہ وہ پیکر تھا
صلح کوشی و مساوات پسندی کی علامت گویا۔

• • •

اور اِک برج پہ جاکر دیکھا
غمِ ایّام سے ہوکر بیزار
غار کی گود میں لی میں نے پناہ
مجھ پہ ظاہر ہوا جب رمزِ حیات
میں نے پیغامِ اخوت سے منور کیا یہ سارا جہاں

• • •

اور اِک برج پہ جاکر دیکھا
باغِ عالم میں تھا خونیں منظر
گُل کے اوراق پہ تھی خون کی شبنم لرزاں
خار کی نوک سے رِستا تھا لہو
کاسۂ چشم میں غلطاں تھے پیازی آنسو

میں نے ہی رنگِ گلستاں کو نمک بخشا تھا
اور بویا تھا یہاں امن و مساوات کا بیج
مری قربانی پہ عیسیٰ بھی سرِ دار و صلیب
کامیابی کے لئے گویا دعا کرتے تھے

• • •

اور اِک برج پہ جاکر دیکھا
اسی خطے میں مجھے جبکہ ہوا امن نصیب
فن کو تب میں نے بنایا مذہب
آذری پر مری شیدا تھی براھیمی بھی
نغمہ و رقص کی حرکات کو پھر دے کے سکوں
سنگ کے جسم کو بجلی کی تڑپ دی میں نے
اپنے احباب کا فن جبکہ پڑا خطرے میں
خودکشی کر کے کیا زندۂ جاوید اسے

• • •

اور اِک برج پہ جاکر دیکھا
چاندنی رات کی مہکی ہوئی رعنائی میں
دور اُفق پار میں نکلا تھا صبا کی صورت
ہر طرف ایک سمندر تھا مہیب
اور ہر سمت تھا طوفاں بپا
پھر بھی کھیتا ہی رہا عزم و عمل کی کشتی
کیونکہ نکلا تھا لئے عشق و محبت کا پیام

• • •

مہ و انجم کا سفر طے کر کے
اب میں لوٹ آیا ہوں اس دھرتی پہ
سوچتا ہوں کہ ان آنکھوں نے جو دیکھا، سچ تھا؟
خواب تھا یا کہ حقیقت کوئی؟

کتنا معروف تھا میں دیکھنے میں اپنی ادا!
ہاں مجھے یاد آیا
میں وہی ہوں، جو تناسخ کی وساطت سے ہر اک بزم میں موجود رہا۔

•••

چاندنی رات جواں آج بھی ہے
سوچتا ہوں کہ ہر اک سمت تباہی کے نشاں کیوں ہیں عیاں؟
آج امروز کو فردا کے تصور سے ہے لرزش سی کیوں؟
آج پھر امن کا لے کر پیغام
مجھ کو کھینا ہے بہت دور یہاں کشتیٔ شوق
کیونکہ ہے امن و مساوات کا خوں میری رگوں میں ساری
یہ ہے اجداد کا خوں
اَن گنت صدیوں سے جو عشق کی گرمی سے یہاں زندہ ہے۔

•••

شاہد ماہلی

نیند

نیند آئی تھی
سجائے ہوئے خوابوں کی سنہری تھالی
آرزوؤں کی جلائے شمعیں
نکہت و نور کے ملبوس میں لپٹی ہوئی
امیدوں کی چادر اوڑھے
چارسو تلخیٔ امروز کی تاریکی تھی
درد کی راہ گزر
زخم کے کنکر پتھر
سہمے سہمے سے تھکن کے اشجار
یادوں کے سائے بھٹکتے سے تھے
غم و رنج کے سناٹوں میں
راہزن خوف کے در آئے تھے
خوابوں کی کمیں گاہوں میں
پھر بھی خاموشی کے دروازے سے
نیند افکار کی خلوت میں چلی آئی تھی
دیکھ کر مجھ کو خیالات میں گم
روٹھ کر رات کی تاریکی میں پھر لوٹ گئی
میں بھٹکتا ہی رہا
صبح تک
عالمِ بیداری میں

حیدر نایاب

بازگشت

وقت کے کنارے تک
ہم نہ جا سکیں تو کیا
وقت کے اشاروں کو
ہم نہ پا سکیں تو کیا
وقت ایک دن آخر
زیست کے کنارے پہ
ہم کو ڈھونڈ ہی لے گا!
عمرِ رفتہ کی یادیں
کسمساتی آئیں گی
چشمِ تر کے دو موتی
ہم کو سونپ جائیں گی
ہم اتھاہ قلزم میں
صبحِ غم کی شبنم میں
ڈوب ڈوب جائیں گے!
لاکھ چاہنے پر بھی

حسرتوں کے حلقے سے
ہم نکل نہ پائیں گے
شمع ٹمٹمائے گی
سانس ٹوٹ جائے گی!
اک سیاہ کمرے میں
جسم تا ابد تنہا
سڑتا، سوکھتا ہوگا
رُوح، رنگ و بُو بن کر
جانِ آرزو بن کر
ارض سے ستاروں تک
وقت کے کناروں تک
گشت کرتی جائے گی
پھر بھی کچھ نہ پائے گی

پھر بھی کچھ نہ پائے گی!!

●●●

ڈبلیو - بی - ییٹس

صبا اکرام

ادا ۱؎

اِک جل پری نے اِک دن
دریا میں تیرتے جب
اِک نوجواں کو دیکھا
سینے میں عشق جاگا
اور اُس نے نوجواں کو
اپنے قریں بُلایا
سینے سے اس کو بھینچا
اور قہقہہ لگایا
پھر ڈوبی ساتھ لے کر
دریا میں نوجواں کو
اپنی خوشی کی خاطر
اتنا نہ اُس نے سوچا
پانی میں ڈوب کر وہ
مرجائے گا بیچارہ

۱؎ The mermaid کا ترجمہ

حق ابروی چھترپوری

ایک سانیٹ

تم آجاتے تو ہر اک آرزو سرشار ہو جاتی

غموں کے تیرہ بادل آسمانِ دل پہ چھائے ہیں
کنارہ کر گئے اپنے، مقام ایسے بھی آئے ہیں
محبت کشمکش کے خواب سے بیدار ہو جاتی
تم آجاتے تو ہر اک شے تبسم بار ہو جاتی
تمہارے ساتھ میرے تشنہ ارمانوں کے سائے ہیں
تمہاری یاد میں اشعار میں نے گنگنائے ہیں
مری رگ رگ میں مدغم ساز کی جھنکار ہو جاتی

مری ہستی الم کے خواب کی تعبیر رہتی ہے
مرے احباب مجھ کو تابکے بہلائیں گے آخر
جہاں والے علاجِ دردِ پیہم کر نہیں سکتے
سنا کر داستانیں اپنی چپ ہو جائیں گے آخر
یہ نغماتِ حسیں تو پرسشِ غم کر نہیں سکتے
مری ہستی غم و آلام کی تصویر رہتی ہے

وسیم شعلہ عظیم آبادی

آتشِ دروں

اپنے ماحول کی
چلچلاتی ہوئی دھوپ میں
پھر رہا ہوں کروڑوں برس سے
مگر!
سوجھتا ہی نہیں منزلِ گم شدہ کا نشاں
اپنی ہی پیدا کردہ فضاؤں میں محصور ہوں
روح بیتاب ہے
جسم بے چین ہے۔
کیا خبر؟
کب زمیں کھینچ لے
آسماں کھینچ لے
کب زمیں، آسماں
ایک ہو کر مجھے پیس دیں
اور جھلس دیں مرے جسم کو، روح کو
ذہن کی وادیوں میں کروڑوں جہنم کی یلغار ہے

•••

عزیز الرحمٰن بھاگلپوری

آسماں

آسماں
چُپ کھڑا
سوچتا ہے
کہ جلتا ہوا تیر کوئی
دہکتا ہوا آگ کا کوئی گولہ
شرر بار راکٹ
کہ اِسپوتنک
اِن خلاؤں کی آغوش میں ڈال کر
اہلِ دنیا
جو مرّیخ کی سرزمیں پر اُترنے کی کوشش میں ہیں
کیا خلاؤں کی تسخیر کر پائیں گے؟
اور بالفرض
مرّیخ کی سرزمیں پر اُتر بھی گئے
تو بھی کیا
چین سے رہ سکیں گے وہاں؟
جی سکیں گے وہاں!؟

•••

فیضی سنبھل پوری

پیشین گوئی

لوگ کیوں چین سے جینے بھی نہیں دیتے ہیں
اور ستم اس پہ کہ مرنے بھی نہیں دیتے ہیں
غنچۂ دل نہیں کھلتا، مجھے پروا بھی نہیں
لطف اندوز خزاں سے بھی نہیں ہو سکتا
اِس نازخموں کا مرے بھی نہ گوارا ہے انہیں
جبکہ زخموں پہ کوئی پھاہا نہیں رکھ سکتا
غم و آلامِ زمانہ سے تو اب گھبرا کر
چارسو، ڈھونڈتی ہے راہِ مفر میری نظر

•

کہیں سپنوں کی حسیں وادی جو آتی ہے نظر
تو بھٹکتے ہوئے میں دور نکل جاتا ہوں
چلتے چلتے کبھی تھک جاتا ہوں، رک جاتا ہوں
بیٹھ جاتا ہوں لبِ جو، کہ کچھ آرام ملے
پردۂ گوش سے ٹکراتی ہے اِک موسیقی
جو لگا تار نکلتی ہے کسی جھرنے سے
گنگنا اٹھتا ہوں پُرسوز ترانہ کوئی
ہر طرف نغمۂ ملکوتی بکھر جاتا ہے
بادۂ کیف سے سرشار فضا ہوتی ہے
ڈوب جاتا ہے زمانہ مئے سرمستی میں
رقص میں محو نظر آتے ہیں، پھر کوہ و دمن
نغمہ زن ہے کہیں بلبل کہیں رقصاں طاؤس
سبز وادی پہ ہے اِک مخملیں قالین کا گماں
جس پہ خورشید کی پڑتی ہیں طلائی کرنیں
اوڑھ رکھی ہے فلک نے بھی حنائی چادر
پیش کرتی ہے شفق دلکش و رنگیں منظر

•

اس پرستاں میں کوئی اجنبی احساس مرا
جلوہ گر ہوتا ہے اِک پیکرِ نورانی میں
سامنے میرے کوئی حور کھڑی ہے گویا
جس کی آنکھوں کی چمک شعلہ زنِ قلب و نظر
دلِ پژمردہ ہے پھر زندہ دلی کا مظہر
ایک مستقبلِ تابندہ ہے، پھر پیشِ نظر
مردہ جذبات میں پھر جان سی پڑ جاتی ہے
باندھنے لگتا ہوں منصوبے حیاتِ نو کے
کھینچتا خونِ جگر سے ہوں میں تصویرِ حیات
اور بناتا ہوں میں اک نقشۂ تعمیرِ حیات

•

میں پہنچ جاتا ہوں اس عالمِ نا دیدہ میں
کہ جہاں نام و نشاں رنج و مصائب کا نہیں
جس جگہ جور و جفا نام کی اِک شئے بھی نہیں
نہ تو مظلوم کوئی ہے، نہ تو ظالم کوئی
"دیش بھگتی" کے نہیں "فتنہ گروں" کو دعوے
"جاں نثارانِ وطن" کا نہیں غدّار لقب
سر اٹھا پاتے نہیں دیر و حرم کے فتنے
جس جگہ کشمکشِ محنت و سرمایہ نہیں
دَور دَورہ ہے جہاں امن و اماں کا ہر دم

حکمراں ہے نہ کوئی اور نہ تو محکوم کوئی
دھرم ہے امن و مساوات و اخوت سب کا
جہاں "دستورِ زباں بندی" نہیں ہے جاری
نہ ہی کٹتی ہے زباں "بلبلِ خوش الحاں" کی
"گل و ریحاں" جہاں ہر رنگ کے کھل سکتے ہیں
مسلا کرتا نہیں اس جا "دلِ بلبل گلچیں"
"طائرانِ چمن" آزاد پھرا کرتے ہیں
پھینکا کرتا نہیں "صیاد" کبھی "دام فریب"
"برق" کی چشم کرم "شاخ نشیمن" پہ نہیں
"بے وطن" ہو نہیں پاتے کبھی "مرغانِ چمن"
وہاں بہتے ہیں محبت کے سدا گنگ و جمن

•

اس خزاں دیدہ گلستاں میں بہار آئے شتاب
کاش! شرمندۂ تعبیر بھی ہو جائے یہ خواب
دیر سے کھویا ہوا تھا میں اسی سپنے میں
تیرگی چھانے لگی، ہو گیا خورشید غروب
یک بیک جادو خیالوں کا مرے ٹوٹ گیا
لڑکھڑاتا ہوا بستی کی طرف لوٹ پڑا
دل میں جذبات کا طوفان مگر اٹھتا رہا
لاشعوری میں کوئی نغمہ مگر گاتا رہا

•

پھر وہی تیرہ شبی ہے، وہی پُر ہول سماں
"عفتِ مریم و عذرا" نہیں محفوظ جہاں
بیوہ ہو جاتی ہیں یک چشم زدن میں مائیں
عزت و آبرو، لٹتی ہے غریبوں کی یہاں
اَن گنت بچے ہوا کرتے ہیں پل بھر میں یتیم
"دلِ مجبور" سے اٹھتا ہے سدا دود و فغاں
سیکڑوں بستیاں ہو جاتی ہیں نذرِ آتش
"سایۂ مرگ" میں پلتے ہیں کروڑوں انساں

مردم آزار جہاں قوم کے ہوں رکھوالے
امن اور شانتی اس دیش میں پیدا ہو کہاں
حکمرانی ہو تعصب کی، تو پھر عدل ہو کیا؟
کیسا انصاف کہاں داد رسی کا امکاں؟

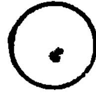
•

جور، جب حد سے گزرتا ہے، فنا ہوتا ہے
جب گھڑا "پاپ" کا بھرتا ہے چھلک پڑتا ہے
"دلِ خوں گشتۂ مظلوم" سے اٹھتا ہے دھواں
بن کے سیلاب پھر آتا ہے "عذابِ یزداں"
خشک سالی کی تباہی سے زمیں کانپتی ہے
قحط و سیلاب سے ہو جاتے ہیں برباد عوام
اقتصادات پہ آ جاتا ہے پھر ایسا زوال
کہ سنبھالے نہ سنبھلتا ہے حکومت کا نظام
جب گھٹا ظلم کی آفاق پہ چھا جاتی ہے
خلق آمادہ بغاوت پہ نظر آتی ہے
بھوک، بیکاری و افلاس و تشدد کے خلاف
احتجاجات کے نعرے ہوا کرتے ہیں بلند
زلزلہ آتا ہے، طوفانِ بلا اٹھتا ہے
نعرے پھر شورِ قیامت سے بدل جاتے ہیں
ڈگمگا جاتا ہے اربابِ ستم کا آسن
اہلِ ثروت کے در و بام دہل جاتے ہیں
دھجیاں جنتا قوانین کی اڑا دیتی ہے
اینٹ سے اینٹ پھر ایواں کی بجا دیتی ہے

•

پرچم امن و مساوات جو لہرائے گا
سارا ماحول زمانے کا بدل جائے گا
صورتِ حرفِ غلط ظلم بھی مٹ جائے گا
انقلاب آئے گا، اک روز ضرور آئے گا
اور مرا خواب حقیقت سے بدل جائے گا......

انقلاب آئے گا، آئے گا، ضرور آئے گا •••



ابرؔ احسنی گنوری

جہاں وہ گئے یہ نشاں چھوڑ آئے — لبِ اہلِ دل پر فغاں چھوڑ آئے

امانت کا بارِ گراں چھوڑ آئے — چمن ہم تجھے آشیاں چھوڑ آئے

گماں ہے کہ سارا جہاں چھوڑ آئے — کہاں ہم دلِ ناتواں چھوڑ آئے

یہ خونِ اسیراں یہ دیوارِ زنداں — پئے داستاں سرخیاں چھوڑ آئے

بھڑکنے نہ دیں گے جہنم زمیں پر — ہم اس کے لئے تو جناں چھوڑ آئے

کہاں آزمائش، کہاں اہلِ مطلب — ہزاروں عنفِ امتحاں چھوڑ آئے

جہاں تیرے غم سے ہوا تھا تصادم — وہیں ہم غمِ دو جہاں چھوڑ آئے

نکل آئے ہم ان کی محفل سے لیکن — زبانوں پر اک داستاں چھوڑ آئے

خدا عمر میں ان کی بخشے ترقی — جو بیمار کو نیم جاں چھوڑ آئے

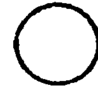
وہ کیا رہنمائی کریں گے کسی کی — جو لٹتا ہوا کارواں چھوڑ آئے

لگاتے ہیں دیر و کلیسا کے چکر — وہی جو ترا آستاں چھوڑ آئے

مسلسل غلط راہ پر جا رہا تھا — ہم اچھا ہوا کارواں چھوڑ آئے

نشیمن سے نکلے تو یوں ابرؔ نکلے
تڑپتی ہوئی بجلیاں چھوڑ آئے

●●●



مظہر امام

بخش دو مرا ماضی، میرے خواب لوٹا دو
ورنہ میرے فردا کی نبض ڈوب جائے گی

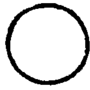
جسم و دل کے طوفاں میں ڈوبنا تو آساں ہے
روح کے جزیرے تک کس کی ناؤ آئے گی؟

اور ہم سے کیا ہو گا اپنے دل کو سمجھا لیں
صبح ہو نہ ہو لیکن رات بیت جائے گی

آج کے ترانے میں میری لے مچلتی ہے
دیکھنا ہے کل دنیا کس کی لے میں گائے گی!

یوں مجھے نہ ڈھلنے دو، دیکھنا، تھکن میری
تیز رَو زمانے کے ساتھ ساتھ جائے گی

●●●



نجم آفندی

زخمِ دل زخمِ زباں سب سہہ گئے
وقت کے مارے ہوئے چپ رہ گئے

آپ کی دریا دلی بھی دیکھ لی
کتنے دریا آنسوؤں میں بہہ گئے

دے رہے تھے، بے عمل، درسِ عمل
ہم بھی سب سُن کر، سمجھ کر رہ گئے

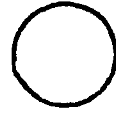
بے زبانی بھی زباں بن کر رہی
کچھ نہ کہنا تھا، مگر کچھ کہہ گئے

حرفِ حق برداشت کے قابل نہ تھا
کتنی چوٹیں تھیں، جو ناحق سہہ گئے

غفلتِ امروز کے سیلاب میں
کل کے سارے کارنامے بہہ گئے

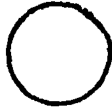
نجمؔ ہم نکلے جو ارضِ تاج سے
خسروِ بے تاج ہو کر رہ گئے

●●●



حرمت الاکرام

ظلمت و نور کا ہر خواب پگھل جاتا ہے
کبھی خاور، کبھی مہتاب پگھل جاتا ہے
سرِ محراب لرزتی ہے کوئی شوخ کرن
کوئی سجدہ تہہِ محراب پگھل جاتا ہے
کون جانے، کبھی شبنم نے یہ سوچا کہ نہیں
کیوں یہ ہر گوہرِ خوش آب پگھل جاتا ہے؟
بجھتے شعلوں میں کہاں اتنی حرارت باقی!
خود ہی اکثر دلِ بیتاب بدل جاتا ہے
چشمِ بے خواب کو دو کوئی جہانِ بے صبح
رات ڈھل جاتی ہے، مہتاب پگھل جاتا ہے
ڈوبنا سیکھ لو پہلے تو بتاؤں تم کو
کس طرح وقت کا گرداب پگھل جاتا ہے
تپشِ فکر سے لرزاں ہوں کہ اکثر حرمت
فقط اک آنچ سے ہر خواب پگھل جاتا ہے



عرش صہبائی

مرحلے اور بھی ہیں، رنج و محن اور بھی ہیں
ہم سلامت ہیں اگر دار و رسن اور بھی ہیں
مختلف اُن سے کئی غنچہ دہن اور بھی ہیں
لہلہاتے ہوئے شادابِ چمن اور بھی ہیں
آج کے دور میں اوہام پرستی کے سوا
وجہِ آزار رسوماتِ کہن اور بھی ہیں
ستم و جور بھی ہر چند ضروری ہیں، مگر
او جفا کیش! محبت کے چلن اور بھی ہیں
کشتۂ گردشِ حالات فقط ہم ہی نہیں
خستہ جاں اور بھی ہیں، سوختہ تن اور بھی ہیں
عرش حاصل نہیں کوئی بھی رسائی جن کو
ہم سے دنیا میں کئی اہلِ سخن اور بھی ہیں



زیب غوری

نہیں ہے شئے کوئی زنداں میں روشنی کی طرح
یہاں تو صبح بھی ہوتی ہے شام ہی کی طرح

کوئی مثال نہیں اعتبار کے قابل
مری وفا کی طرح، تری دشمنی کی طرح

دھڑک اٹھا ہے مرا دل، تڑپ گئی ہے نگاہ
کوئی قریب سے گذرا ہے زندگی کی طرح

دل و نظر میں ابھرتا ہے، ڈوب جاتا ہے
ترا خیال ستارے کی روشنی کی طرح

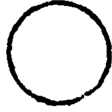
بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے ہستی کو
ادا ادا ہے تری طرز بے رخی کی طرح

مری طرف سے تو اے دوست اپنے دل کو نہ توڑ
ترا ستم بھی گوارا ہے زندگی کی طرح

ستارۂ سحری جان کر مرے دل کو
ڈرا رہا ہے اُجالا بھی تیرگی کی طرح

خبر نہیں دلِ برباد کی انہیں شاید
وہ پھر ہیں مائلِ لطف و کرم کبھی کی طرح

بہت فسردہ سہی زیب یہ تبسم گل
تم ایک بار تو ہنس لو، چلو اسی کی طرح



تسنیم فہمی

یہ بات بھی نہیں کہ پریشاں نہیں رہے
لیکن ہم ان کے غم سے گریزاں نہیں رہے

دنیا کو ہم نے درسِ وفا کب نہیں دیا
کب ظلمتوں میں نور بداماں نہیں رہے

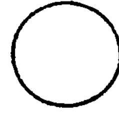
یارو پھر اس میں کیف نہ ہوگا کوئی۔ اگر
ہم سرخیٔ فسانۂ دوراں نہیں رہے

وہ عظمتیں حیات کی حاصل نہ کر سکے
طوفاں میں حادثوں کے جو خنداں نہیں رہے

ہوتی تھی اس سے عشق کی توہین اس لئے
ہم شکوہ سنجِ گردشِ دوراں نہیں رہے

ماحول کتنا تلخ ہوا۔ کچھ نہ پوچھئے
جب زندگی پہ عشق کے احساں نہیں رہے

فہمیؔ سنا ہے اب نہیں باقی وہ رونقیں
ہم انجمن میں جب سے غزل خواں نہیں رہے



رمز سیتاپوری

انہیں عجیب سی اُلجھن میں چھوڑ آیا ہوں
کچھ اشک ان کے بھی دامن میں چھوڑ آیا ہوں

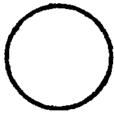
جلوسِ موسمِ گل کے وہی تو ہوں گے نقیب
وہ چند خار، جو گلشن میں چھوڑ آیا ہوں

کرے خلوص کا انجام دیکھ لو ...... جل کر
یں بجلیوں کو نشیمن میں چھوڑ آیا ہوں

ہ دھوپ چھاؤں مرا پیار. جس میں کھیلا تھا
سی حسین کے آنگن میں چھوڑ آیا ہوں"

غم کرو مرے لٹنے کا قافلے والو
بس اِک خلش دلِ رہزن میں چھوڑ آیا ہوں

بکیدہ ہے یہاں پیار ہے، خلوص ہے رمز
نفاق شیخ و برہمن میں چھوڑ آیا ہوں



اطہر عزیز

دُور تک رینگتے قدموں کے نشاں پائے ہیں
جب کبھی اپنے تعاقب میں نکل آئے ہیں

زندگی اپنی کشاکش ہی میں گھر کر اُبھری
ہوں گے وہ اور جو حالات سے گھبرائے ہیں

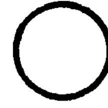
کیا بھلا یاد رہے، پورشِ افکار میں اب
کتنے پتھر غمِ ایام نے برسائے ہیں

ہم نے ہر ذرّہ کو بخشی ہے، تبسّم کی ضیا
ہم ہی پھر ننگِ وفا دہر میں کہلائے ہیں

زندگی! آ کبھی مُڑ کر ذرا دیکھیں تو سہی
کتنے زخموں کے قدم راہ میں چھوڑ آئے ہیں

عکس ہی عکس ہیں، چہروں کے نشاں تک بھی نہیں
ہائے کس شہر میں ہم لوگ نکل آئے ہیں

کتنا پُر ہول ہے یہ دشتِ وفا بھی اطہر
بارہا اپنی ہی آواز سے تھرائے ہیں



معین کوثر

شعلہ جب نگہِ یار نظر آتی ہے
رقص کرتی ہوئی تلوار نظر آتی ہے

بوئے گل میں ہے ترے نرم بدن کی خوشبو
ہر کلی شاہدِ رخسار نظر آتی ہے

ہم دانش کے اجالوں نے سکوں لوٹ لیا
آگہی علم سے بیزار نظر آتی ہے

محتسب فیصلۂ جرم و گنہ مشکل ہے
بحث آئینۂ تکرار نظر آتی ہے

فکر رندوں کو ہے میخانہ میں سورج ہو طلوع
رات واعظ کی طرفدار نظر آتی ہے

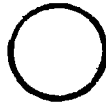
آزماتی ہی نہیں یہ کبھی کم ظرفوں کو
چشمِ ساقی بڑی ہشیار نظر آتی ہے

جب بھی ہوتا ہے کوئی اہلِ جنوں زیبِ صلیب
زندگی اور طرحدار نظر آتی ہے

دور سے کرتا ہوں خوابوں کے جزیروں کو سلام
رات جب دولتِ بیدار نظر آتی ہے

تھے تو کچھ اہلِ ہوس بھی قدِ موزوں کے حریص
اِک محبت ہی سرِ دار نظر آتی ہے

وصل کی رات مقدس تو بہت ہے کوثر
پھر بھی زاہد کو گنہگار نظر آتی ہے



بیکس الٰہ آبادی

ساقی نے جو دستورِ میخانہ بدل ڈالا
رندوں نے بھی تنگ آ کر پیمانہ بدل ڈالا

طوفانِ تغیر نے کیا کیا نہ بدل ڈالا
عنوان بدل ڈالا، افسانہ بدل ڈالا

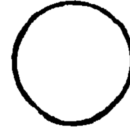
وہ قصۂ غم میرا سن کر بھی نہ کچھ سمجھے
بے ربطیوں نے رنگِ افسانہ بدل ڈالا

اس بزم میں بھی زر نے الفت کی جگہ لے کر
اندازِ محبت کا پیمانہ بدل ڈالا

وہ کہتے رہے غم کا عنوان نہ بدلے گا
ہم نے غمِ ہستی کا افسانہ بدل ڈالا

اِک ہم نہیں بے گھر، اس دور نے اے بیکس
شاہوں کا بھی اندازِ شاہانہ بدل ڈالا

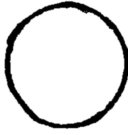
●●●



سیف سہستی پوری

پ کو اندازہ کیا ہو، آپ نے دیکھا نہیں
شانۂ ہستی پہ غم کا بوجھ کچھ ہلکا نہیں
دوسروں کے درد کا احساس کچھ ہوتا نہیں
آدمی جبتک کہ غم کی آگ میں جلتا نہیں
یوں ہوئی ہے؟ سب کے دل میں آرزوئے صبحِ نو
آج تک اس "مسئلے" پر آپ نے سوچا نہیں!
بلنے کس دنیا میں گم ہیں "نکتہ دانِ" زندگی
صفحۂ حالات پر ان کا قلم چلتا نہیں
وقت کی ہر قید سے آزاد تو ہم ہیں مگر!
زندگی کا آج بھی طے مرحلہ ہوتا نہیں
بھی ہے پہلو بہ پہلو اور خوشی بھی ساتھ ساتھ
ہراہِ زندگی میں کوئی بھی تنہا نہیں
پ کے غم سے ملا راہِ مسرت کا سراغ!
بھول جائیں آپ کو، ہم سے یہ ہو سکتا نہیں

یا بھی رہنا ہے قیامت اور ہنسنا بھی ہے جرم
م غریبوں کے لئے اے سیفؔ یہ دنیا نہیں



لطیف جعفری مالیگانوی

بہ پیشِ قلب و نظر یاس کا دھواں ہے ابھی
لبِ سحر پہ اندھیرے کی داستاں ہے ابھی
افق پہ ایک کرن بھی نظر نہیں آتی
سیاہیوں کا وہی سیلِ بیکراں ہے ابھی
چمن چمن ہے وہی ماتمِ بہار ہنوز
عروسِ لالہ و گل کشتۂ خزاں ہے ابھی
مغنیہ غمِ الفت کی راگنی کب تک؟
حیات اپنی تباہی پہ نوحہ خواں ہے ابھی
نہ آگہی کا نشاں ہے، نہ زندگی کا پتہ
ہوائے جہل دماغوں پہ حکمراں ہے ابھی
قدم قدم پہ ہے درپیش کارزارِ حیات
نفس نفس پہ محبت کا امتحاں ہے ابھی

لطیفؔ نغمۂ دلکش نشاط گوش نہیں
دیارِ شوق میں ہنگامۂ فغاں ہے ابھی

جوگندر پال

غروب

"تمہیں شاید یقین نہیں آ رہا ؟"

"میرا سر پھرا ہوا ہے کہ چالیس برس کے کنفرمڈ بیچلر کی بے تکی باتوں کو خدا کا کلام سمجھ لوں۔"

"شٹ اپ!" پروفیسر ڈاکٹر پانڈے نے خشک سی مسکراہٹ سے اپنے دوست پروفیسر قادر کو جواب دیا، اور وہ دونوں لیبارٹری سے نکل کر ڈاکٹر پانڈے کے دفتر میں داخل ہوئے۔

"بیٹھو۔" ڈاکٹر پانڈے نے خود بیٹھ کر پروفیسر قادر کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آل ورلڈ سائنٹسٹس کانفرنس نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے اور تشویش ظاہر کی ہے کہ سورج کی آگ ٹھنڈی پڑ رہی ہے اور عنقریب آگ کا یہ گولا بالکل سرد ہو کر رہ جائے گا ——"

"عنقریب —— ؟"

"ہاں کوئی ڈھائی کروڑ سال تک۔"

"اوہ —— ہ!" پروفیسر قادر نے اپنے اطمینان کے اظہار کے لئے سانس بھرا۔

"اوہ وہ نہیں۔" ڈاکٹر پانڈے جھلا سا گیا۔ "ذرا غور کرو ہماری دنیا کی حالت کیا ہوگی۔"

"کیا ہوگی؟" ڈھائی کروڑ سال بعد کے خطرے کا احساس پروفیسر قادر کو بڑا مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔ "اور ہو بھی گی تو تمہیں کیا؟ تمہیں کسی سے عشق نہیں، تمہارے بیوی بچے نہیں، ڈھائی کروڑ سال بعد کیا، سالی دنیا کو آج ہی تباہ ہونے دو، تمہیں کیا؟ ——" وہ ہنسنے لگا۔

"تمہاری ہنسی بڑی المناک ہے۔"

پروفیسر قادر مزید ہنسنے لگا۔ "ہم سب جانتے ہیں کہ صرف اسی برس کی عمر میں ہی موت آئے گی پھر بھی وہ جب تک ہمارے سر پر نہیں آ کھڑی ہوتی ہم بڑے مزے سے آنکھیں بند کئے کسی جاوداں زندگی کے تصور میں مست رہتے ہیں۔ اب تم ——"

"تم ادیب لوگ بڑے جاہل ہوتے ہو پراف۔" اپنی سائنسی برتری سے لبریز ہو کر ڈاکٹر پانڈے کو معلوم ہونے لگا کہ پروفیسر قادر بے چارہ نرا خالی خولا ہے۔ "چھوٹے یا بڑے ہندسوں کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ وقت کی پہچان میں ایک سہولت مہیا کرے اور بس، مگر تم لوگ ہو کہ ہندسوں کی جسامت کو وقت کی طوالت کا مترادف سمجھ لیتے ہو۔"

"وہ تو ہے ہی۔" پروفیسر قادر نے اسے ٹوکا۔ "ڈھائی کروڑ سال کا عرصہ ایک سال سے ڈھائی کروڑ گنا طویل ہے۔"

"نہیں میرے بھائی، نہیں!" ڈاکٹر پانڈے کو اپنے ساتھی پر ترس آنے لگا کہ خواہ مخواہ اس نے اپنی ساری زندگی ادب ودب میں ڈبو دی ہے۔ "وقت کو سال و ماہ کا نام ہم نے دے رکھا ہے، بذات خود وقت صرف وقت ہے، وہ ایک کروڑ سال ہو یا ایک روز یا ایک لمحہ۔" ڈاکٹر پانڈے پھر پریشان نظر آنے لگا۔ "ذرا تصور کرو، جب سورج ٹھنڈا پڑ جائے گا تو کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا؟" پروفیسر قادر نے اپنی کلاس میں کسی نظم کی تفسیر پیش کرنے کے انداز میں کہا۔ "ہم دن کے وقت سو لیا کریں گے اور چاند تاروں کی روشنی میں راتیں آباد کر لیں گے —— سگار پیو گے؟" وہ اپنا سگار سلگانے لگا۔

"نو، تھینک یو! میں نے تمباکو نوشی، شراب نوشی —— سب الٹی عادات ترک کر دی ہیں۔"

"یعنی سیدھی عادات نے تمہیں الٹا لٹکا دیا ہے۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر، تمہارے نزدیک تو ساری عمر الٹا لٹکے رہنا ایسا ہی ہے جیسے یہی گھڑی دو گھڑی کے لئے

سپیس آمن کرنا تمہیں ڈھائی کروڑ سال تک زندہ رہنا ہے تاکہ سورج۔"

"مذاق مت کرو میرے دوست۔ میں واقعی بڑا پریشان ہوں ——
—— لاؤ تمہارے سگار ہی پی لوں۔" ڈاکٹر پانڈے سگار لے کر پروفیسر قادر سے ماچس طلب کرنے لگا۔ "تم غور نہیں کر رہے۔ جب سورج ٹھنڈا ہو جائے گا تو —— تو وہ یخ بستہ اندھیرہ ——"

"لیکن موت کے بعد بھی تو یہی ہوتا ہے، ایک یخ بستہ اندھیرہ اور بس۔"

"لیکن اس موت میں اور اس موت میں بڑا فرق ہے پراف۔ اس موت میں ایک گونہ زندگی آباد ہوتی ہے —— تمہارا سگار واقعی بڑا مزیدار ہے۔ ڈاکٹر پانڈے نے بڑے فخر سے ایک کش لیا۔ "ہاں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ اس موت میں زندگی کا تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ ہم جو زندہ رہ جاتے ہیں موت سے متعلق سوچ سوچ کر اس میں جان بھر دیتے ہیں۔ لیکن وہ موت ٹوٹل زندگی کی ٹوٹل موت ہے، گھور سیاہ بے بصری، یا نہ جانے کیا، کیونکہ بے بصری کا تصور بھی زندگی کا محتاج ہے —— تم ہنس رہے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں برنارڈ شا کا کوئی ڈرامہ اسٹیج کر رہا ہوں؟ ارے ہا ہا؟ یہ ڈرامہ نہیں، میری سائنس کی باتیں ہیں، حقیقت ہیں۔"

"اطمینان رکھو ڈاکٹر، اگر تم جھوٹ بھی بول رہے ہو تو مجھے قطعاً اعتراض نہیں، کیونکہ ہم اہل ادب کے نزدیک جھوٹ بھی سچائی ہی کا ایک اہم حصہ ہے۔" پروفیسر قادر سگار کا کش لیتے ہوئے کچھ سوچنے کے لئے ذرا ٹھہر گیا۔ "تمہاری مشکل یہی ہے ڈاک، کہ تم جھوٹ کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے، واللہ اگر تم اپنے معلوماتی علم کے گورکھ دھندے سے باہر نکل آؤ، شاعرانہ یا بقول تمہارے احمقانہ اضطراب سے عشق کرو اور ہر خوبصورت جھوٹ پر ایمان لاؤ تو تمہیں ان سب دباؤں سے نجات مل جائے جو ڈھائی کروڑ سال بعد وقوع پذیر ہوں گی —— اچھا بتاؤ، اب چائے پلاؤ گے؟ نہیں پلا سکتے تو میرے ڈیپارٹمنٹ میں چلے آؤ۔ ہمارا رسول اسپیشل فرسٹ کلاس چائے تیار کرے گا کہ تمہیں سر سے سورج کی حرارت کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ آؤ!"

"نہیں بھائی، تم جاؤ اب مجھے کام کرنا ہے۔"

لیکن ڈاکٹر پانڈے کا جی اپنے کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ جب پروفیسر قادر چلا گیا تو وہ بدستور سوچ رہا کہ سورج کی گرمی کیوں کر انحطاط پذیر ہو رہی ہے۔ یہی سوچتے سوچتے اس نے اپنے سامنے بالائی دیوار کی جانب دیکھا، وہاں دھوپ کا ٹکڑا کچھ ایسا دکھائی دے رہا تھا گویا برف کی سفیدی جمی ہوئی ہو۔ اور اس برفانی سفیدی کی طرف گھور گھور کر دیکھتے ہوئے سائنس داں کے ننھے منے ذہن پر کل کائنات کا کینوس بننے لگا۔ جیسے ایک نقطے سے کروڑوں، اربوں میل کی وسعتیں پھوٹ رہی ہوں اور ان وسعتوں میں سیاروں کا سفر، زندگی کی ریل پیل سورج سے قائم ہو جو سدا جل جل کر اس لئے راکھ نہیں ہوتا کہ وہ آگ سے جلتی ہوئی کوئی اور شے نہیں بلکہ خود آپ آگ ہے۔ لگاتار جل جل کر آگ میں صرف آگ ہی باقی رہ جاتی ہے، روحِ آتش، جو کبھی نہیں بجھتی، کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔

"لیکن یہ آگ اب کیوں کم ہو نا شروع ہو گئی ہے؟" سائنس داں نے بے چین ہو کر اپنے سائنسی اعتقاد کو جھنجھوڑا۔ "چالیس ہزار پچاس کروڑ سال پہلے ہمارا کرہ ارض جل جل کر آگ کی اسی جسیم روح سے باہر آ گرا تھا۔ اس تپیدہ ٹکڑے کی سطح آج سرد ہو چکی ہے لیکن چونکہ ابھی اس کے باطن میں کچھ حرارت اور بے چینی کہیں چھپی پڑی ہے اس لئے اب بھی یہ ٹکڑا سورج کا طواف کرتا رہتا ہے مگر جب اس کا محور ہی بجھ گیا، بے جان ہو گیا تو یہ بھی خلا کی تہوں میں غرق ہو جائے گا۔

"لیکن نیچر، پروگرام ہے کیا؟ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کیو
ڈاکٹر پانڈے آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ فٹ کر کے اپنے آفس کی کھڑکی کے قر
آ کھڑا ہوا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"آخر نیچر اپنے اس اقدام سے چاہتی کیا ہے؟ کیا — کیا خودکشی؟
آئی ہے؟" سورج کی جانب گھور گھور کر دیکھنے کے باوجود اس کے دل و
حرارت کے احساس سے عاری رہے۔

"ارے بھئی ڈاکٹر" باہر فلسفہ کا پروفیسر اسے دیکھ کر چلتا چلتا
ٹھہر گیا تھا۔ "ادھر دیکھو، سورج یہاں دھرتی پر اترا ہوا ہے" اس نے
کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "مگر تم اسے دیکھنے کے لئے آسمان کی طرف نظر
اٹھائے ہوئے ہو۔"

ڈاکٹر پانڈے نے حسب عادت خشک سے انداز میں مسکرا کر ا
سلام کیا اور کھڑکی سے ہٹ کر پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور بدستور نظامِ شم
سے متعلق سوچ سوچ کر اس نے اپنے سامنے رکھا ہوا تازہ اخبار اٹھا یا
سرخیوں پر نگاہ دوڑانے لگا۔ چھوٹے بڑے حروف۔ جو بے حس الناقون

مانند اپنے بھیانک معنی کو بڑی سرد مہری سے ادا کر رہے تھے۔ ڈاکٹر پانڈے نے لا پرواہی سے اخبار کو ایک طرف ڈال دیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ اگر ہم سب واقعی ڈھائی کروڑ سال بعد ایک بے کراں منجمد تاریکی میں غرق ہو رہے ہیں تو ہم باقاعدہ اپنے اپنے کام میں کیوں جتے رہیں؟ کیوں نہ ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بے کار بیٹھ جائیں اور ڈھائی کروڑ سال تک چپ چاپ قیامت کا انتظار کریں؟

اسی اثنا میں ڈاکٹر پانڈے کا بوڑھا چپراسی اس کے لئے چند کاغذات لئے آفس میں داخل ہوا۔

"نتھو" چپراسی کاغذات میز پر رکھ کر مڑنے لگا تو ڈاکٹر نے کہا۔ "ادھر آؤ" علمیت کی فطرت ہے کہ اپنی بے چارگی محسوس کرکے جہالت سے ایک چھپا ڈھکا سمجھوتہ سا کر لیتی ہے۔

"تم جانتے ہو سورج سرد ہوتا جا رہا ہے؟"

بوڑھا چپراسی کتابی علم سے بے بہرہ تھا لیکن جب سے غریب کی بوڑھی جلد حیات کے گرم و سرد سے جلد تر متاثر ہونے لگی تھی وہ غور و فکر کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ "سورج بھگوان تو ابھی جتا کتا ہے سرکار، پر آدمی ہی بڈھا ہوتا جا رہا ہے۔"

"یعنی؟"

"مانی یہ سرکار" سائنس داں کے چپراسی نے اپنے آقا کی زمین پر ذرا ٹانگیں پسار کر بیٹھنے کا حق جتایا۔ "کہ آدمی کا اپنا ٹمپریچر گر جائے تو باہر کی تپن بھی برف لگتی ہے۔ آج کل کے چھوکروں کو دیکھتا ہوں سرکار تو بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ جتنے بوڑھے ہیں اور تو اور، کھل کر کھکھلانے سے بھی ڈرتے ہیں کہ پسلی ٹوٹ جائے گی۔" وہ ہنسنے لگا۔ "بات یہ ہے سرکار کہ نئے ڈگ سوچ سوچ کر، پڑھ پڑھ کر ناکارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ برا نہ مانئے میں اپنے دل کی ایک بات کہہ رہا ہوں۔" نتھو ڈاکٹر پانڈے کا منہ لگا آدمی تھا۔ "آدمی علم سے بڑا نہیں ہوتا۔ دل بڑا ہو تو آدمی بھی بڑا ہوتا ہے۔ میں نے لگائی کو سو حریفوں کی "جلے" سے اٹھا کر گھر لا یا تھا سرکار بس اندر کی ایک تپن سی، ایک چاہ سی تھی، سو ——"

ڈاکٹر پانڈے کو معلوم تھا کہ ذرا اور ڈھیل چھوڑ دی تو یہ ترنی بڈھا بولتا چلا جائے گا۔

"اچھا جاؤ اب نتھو، کام کرنے دو۔"

"ہاں سرکار، آپ کام کریں۔" وہ جاتے جاتے کوئی خیال آنے پر ٹھہر کر ہنسنے لگا۔ "پر ایک بات کہوں، ان بچہ لوگوں کو سائنس پڑھانے سے پہلے آپ محبت کرنا سکھائیے۔ انہیں محبت کرتے دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے لڑکیوں کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے ایک ٹک کر کوئی امتحانی پرچہ پڑھ رہے ہوں۔ آپ سورج کی بات کرتے ہیں سرکار، میں تو ——"

"اچھا اچھا۔" ڈاکٹر پانڈے نے متین نظر آنے کی کوشش کی "جاؤ۔"

نتھو چلا گیا تو ڈاکٹر پانڈے کھلکھلا کر ہنس پڑا گویا نتھو نے اس کی متانت کو گدگدا دیا ہو۔

"ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ ہم نے لوگ اس لئے جی بھر کے محبت نہیں کرتے کہ محبت کو بھی علوم میں شمار کرنے لگے ہیں۔"

ڈاکٹر پانڈے کا منہ ہنس رہا تھا اور ذہن میں طلوع ہو رہا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ پروفیسر قادری کی تمباکو آمیز خنداں آواز اس سے مخاطب ہے: "محبت علم نہیں ڈاکٹر، محبت احساس ہے، کیوں کہ علم سب کی ساجھی ملکیت ہے اور محبت سب کی اپنی اپنی۔" گویا ڈاکٹر پانڈے کی سماعت میں اچانک اس کا دل چلا آیا ہو۔ "ڈاکٹر، محبت ہر انسان سے براہ راست رابطہ پیدا کرتی ہے۔ تم نے اپنی یونگ اور فرائڈ کو بھی سائنٹیفک سب ٹائٹل دے رکھے ہیں۔ مگر محبت علم ہے نہ سائنس، محبت ایک تجربہ ہے، ایک ذاتی خوشی ہے، ذاتی غم ہے ——"

"ذاتی غم، ذاتی خوشی ——" ڈاکٹر پانڈے نے اپنے دل میں کبھی ذاتی غم کبھی ذاتی خوشی کو ڈھونڈنا چاہا لیکن یہاں اسے لاشخصی سائنسی حقائق کے سوا کچھ نہ ملا۔ جیسے وہ ان حقائق کو الٹ پلٹ کر سچائی ڈھونڈھ رہا ہو۔

"تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم جھوٹ کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے۔" پروفیسر قادری کی آواز میں سگار کی خوشبو کتنی پر لطف تھی۔

ڈاکٹر پانڈے نے جلدی سے گھنٹی دبائی جسے سن کر نتھو فوراً حاضر ہو گیا۔

"نتھو، کینٹین سے ایک پینٹ سگار لے آؤ اور ایک ماچس۔ جلدی۔"

انھوں نے منہ بنا کر کہا۔ تو ڈاکٹر پانڈے اچانک کوئی خیال آنے پر اپنی گھڑی دیکھنے لگا۔

"مس ہرمزجی ابھی تک کیوں نہیں آئی؟"

مس ستیہ ہرمزجی اس کی نگرانی میں اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اسپیس پر ایک مقالہ لکھ رہی تھی، اپوائنٹمنٹ کے مطابق وہ ہر بدھ کو ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اس کے دفتر میں پہنچ جاتی تھی۔ لیکن آج ساڑھے گیارہ سے دو چار منٹ اوپر ہو گئے تھے۔

"دیکھو ڈاکٹر" ایک دن قادر نے ڈاکٹر سے کہا تھا۔ "عورت کو خلا سے ازلی بیر ہے؟ وہ تو ہمیشہ ہر خلا کو بھرا بھرا دیکھنا چاہتی ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی اُسے تم سے دلچسپی ہے۔"

"شٹ اَپ!"

"نہ مانو۔ تمہیں اپنی آنکھیں کھولنے یا بند رکھنے کا حق حاصل ہے، کیونکہ یہ تمہاری ہیں۔ مگر یاد رکھو، چالیس برس کی عمر میں ایسا موقع مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ اب بھی تم کتابوں کے پیچھے رہے تو ساری عمر کنوارے رہو گے۔"

دفعتاً اپنے آفس کے باہر نسوانی چاپ سن کر ڈاکٹر پانڈے کو معلوم ہوا کہ دل کی لیبارٹری میں کیمیکلز کی ٹیوبیں اچانک اپنے اپنے خانے سے گر کر ٹوٹ گئی ہیں، اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آیئے مس ستیہ ہرمزجی!" ڈاکٹر نے "سنو" کہنے کے لئے پارسی لڑکی کو اس کے پورے نام سے پکارا کیونکہ وہ سوچ رہا تھا کہ یہی وہ خوبصورت سچائی ہے جو ابھی ابھی سائنسی حقائق کے انبار میں ڈھونڈھ رہا تھا۔

"معاف کیجئے مجھے دیر ہو گئی ہے۔"

ڈاکٹر پانڈے نے اپنے دل ہی دل میں کہا کہ صرف چند منٹ نہیں دوڑا دوڑا چلا آیا ستیہ جیسا ایک وقت لے کر پہنچی ہے۔ اس نے مس ہرمزجی کی طرف بڑی بڑی نظروں سے دیکھا۔ وہ تو گلابی رنگ کی سلکن ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے سرخ لب بے چین ہو ہو کر مل رہے تھے۔ اس کا منہ ذرا ذرا کھلا ہوا، وہ بولے بغیر بات کرنا چاہ رہی ہو اور اس کے بالوں کی شوخ سیاہی اس کی ذہین سفیدی پیشانی پر سایہ کر رہی تھی۔

مس ہرمزجی اپنے پروفیسر کو اپنی جانب اس قدر غور سے دیکھتے ہوئے پاکر شرما گئی اور اس کی ساڑھی کا رنگ اچھل کر اس کے چہرے میں چلا آیا۔

"بیٹھئے۔"

وہ بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر پانڈے کے سامنے دیوار کی دھوپ گویا اپنی حدت سے پگھل پگھل کر ڈاکٹر کے پاؤں کی جانب پھسلنے لگی۔

"مس ہرمزجی" ڈاکٹر بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آپ کی آمد سے پہلے آپ ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔"

مس ہرمزجی کے کھلے ہوئے لب ذرا اور کھل گئے مانو اس کی دل آویز خاموشی کی صدا ڈاکٹر کے الفاظ سن کر ذرا بلند ہو گئی ہو۔

"اور میں سوچ رہا تھا کہ ہر وقت خلا کی طرف تک تک کر ہماری اپنی ہماری نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے۔"

مس ہرمزجی کی دزدیدہ سی مسکراہٹ اوٹ سے باہر آ گئی۔

(یو آر گریٹ پر دفیسر قادر! محبت واقعی ایک تجربہ ہے، ایک ذاتی تجربہ ہے، ذاتی غم ہے۔)

"میرا ایک دوست کہا کرتا ہے مس ہرمزجی کہ عورت کو خلا سے کوئی دلچسپی نہیں۔" "کیوں؟"

"اس لئے کہ عورت فطرتاً ہر خلا کو بھرا بھرا دیکھنا چاہتی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

ستیہ ہرمزجی کے ساکن، سفید چہرے میں تپیدہ، قرمزی سرخی کو محسوس کر کے ڈاکٹر گویا پہلے سورج پر آنکھیں جمائے ہوئے ہو، اور کرۂ ارض کے مانند اس نے ... آفرین سیارے کا طواف کر کر کے وقت کی ویران گزرگاہ کو زندگی کے ... سال سے آباد کر رہا ہو۔

"مس ہرمزجی، ہم ـــــــ میں ـــــــ"

ڈاکٹر پانڈے کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہو گئے۔ "اُف وہ کتنی گرمی ہے!"

(سورج ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے؟)

"مس ہرمزجی، آپ پارسی لوگ سورج کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟"

"کیوں کہ سورج کی حرارت لازوال ہے۔"

"تمہاری قوم بڑی ذہین ہے مس ہرمزجی۔ پرانی جاہلیت میں بھی یاد میں

اُڑیا :- ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب
ترجمہ :- عزّت النّساء

گھیراؤ

پوجا کے دن جس قدر قریب آ رہے تھے۔ بچّوں کی فرمائشیں اسی قدر زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ کل جہاں نئے کپڑوں ہی کی ضد تھی آج وہیں ریلن پر اصرار ہے۔ گھر میں کل تین بچے ہیں۔ دو خوبصورت لڑکے اور ایک معصوم سی پیاری لڑکی۔ تینوں اسکول میں پڑھتے ہیں اور وہ بھی کانونٹ میں۔ محض اس لئے کہ وہاں انگریزی تعلیم ذرا اعلیٰ سطح پر دی جاتی ہے اور وہاں بچّوں کے عادات و اطوار بگڑنے کا بھی زیادہ خوف نہیں رہتا۔ ظاہر ہے بچّے یہاں ایسے اسکول میں پڑھتے ہوں وہاں ہر بچے کے پیچھے ماہانہ کم از کم سو روپے خرچ کرنے ہی ہوں گے۔ اس طرح صرف تین بچّوں کی پڑھائی پر خرچ ہوئے تین سو روپے۔ اب رہا گھر کے اخراجات کا سوال جس کے لئے گرانی کے اس سنہرے دور میں کم از کم پانچ سو روپے کی ضرورت ہے۔ اس طرح ہوئے آٹھ سو روپے۔ اب بیچارے رام چندر بابو کریں بھی تو کیا کریں۔ جن کی تنخواہ الاؤنس وغیرہ مل ملا کر بھی پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ادھر بچے ہیں کہ مسلسل فرمائش کئے جا رہے ہیں۔ ماں کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ اپنی ضد نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ رام بابو بھی دبی زبان سے بچّوں کو سمجھا رہے ہیں۔ زور دینے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں کیونکہ جب دوسروں کے بچّے محلہ میں نئے لباس میں جا رہے ہوں وہاں اپنے بچّوں کو معمولی لباس میں گھمانا بھلا کون سی عقلمندی ہوگی؟ خواہ مخواہ لوگ مذاق اڑائیں گے۔ ان کی بنی بنائی ساکھ مٹی میں مل جائے گی۔ نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ انہیں کہیں سے بچّوں کے لئے انتظام کرنا ہی ہوگا۔ اور پھر پوجا کے وقت تو کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ یہی سوچتے سوچتے رام بابو باہر نکل گئے۔

کارخانوں میں مزدوروں کو بونس دینے کا جیسا سلسلہ ہے اسی طریقے کا کوئی انتظام سرکاری دفتروں میں بھی ہو۔ اس کے لئے رام بابو کے سروس ایسوسی ایشن میں بھی کئی بار بحث چھڑی مگر وہ زیادہ دنوں تک نہیں چل پائی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے اس بحث میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیا۔ پوجا اپنے ساتھ آرزوؤں اور تمنّاؤں کی اتنی حسین شامیں نہیں لاتی ہیں جتنی کہ پریشانیوں اور الجھنوں کی کہر آلود صبحیں اور درمیانی طبقوں کے لوگوں کے لئے تو یہ صبحیں بھی طویل اور بھیانک راتوں سے بڑھ کر خوفناک ہوتی ہیں۔ پوجا جتنی قریب آتی جاتی ہے ان کی پریشانیاں اور الجھنیں اتنی ہی بڑھتی جاتی ہیں۔ زندگی کے کسی دور میں اگر وہ سب سے زیادہ متفکر اور پریشان نظر آتے ہیں تو اس پوجا کے تین چار دنوں کے دوران۔ یہی حالت رام بابو کی تھی۔

کچھ دنوں میں محسنوں نے نعرہ لگایا "آرام ہے حرام"۔ بس کیا تھا پلاننگ کمیشن پوری حرکت میں آگئی۔ یوجناؤں پر یوجنائیں تیار ہونے لگیں کہ کس طرح لوگوں کے آرام میں کچھ تخفیف لائی جائے۔ کام بڑھ جانے سے آرام خود بخود کم ہو جائیں گے۔ اتنی معمولی سی بات نیتاؤں کی سمجھ سے باہر تھی۔ کام چاہے کچھ ہو یا نہ ہو، آرام پہلے ختم کیا جائے۔ بس اسی پر تجویزیں پاس ہوئیں۔ بڑے غور و خوض کے بعد مفکرین سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ پوجا کی چھٹی کم کر کے اسے صرف تین دن کے لئے کر دیا جائے۔ سنٹرل گورنمنٹ سے منظوری آگئی۔ اسٹیٹ گورنمنٹ نے نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔ پھر کیا تھا سکریٹریٹ میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف سے آواز اٹھنے لگی کہ سرکار نے پوجا کی تعطیل میں تخفیف کر کے افسروں، کلرکوں اور چپراسیوں پر سراسر ظلم کیا ہے۔ اسی دوران کسی افسر نے

جنہیں اپنی خود ساختہ مقبولیت پر کچھ حد سے زیادہ بھروسہ تھا شوشہ چھوڑ دیا کہ چھٹی میں کمی چیف سکریٹری کی رضامندی اور ان کی خوشی سے ہی عمل میں لائی گئی ہے۔ خلاصفت افسر کا حربہ کارگر ثابت ہوا۔ تحریک میں توانائی آگئی۔ اسسٹنٹ، ہیڈ اسسٹنٹ کے درمیان باہمی مشورے میں طے پایا کہ چیف سکریٹری کا گھیراؤ کیا جائے۔ منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان لوگوں نے لیڈر کی حیثیت سے پہلے اپنا نام پیش کیا جو سال دو سال قبل طالب علم تھے۔

مجوزہ پروگرام کے مطابق چیف سکریٹری کے آفس کے سامنے دھاوا بولا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چیف سکریٹری صاحب آفس کی جانب آتے ہوئے نظر آئے۔ جوں ہی سکریٹری صاحب کمرے میں داخل ہوئے مظاہرہ کرنے والی جماعت "گرانٹ آس فل ہولی ڈے" کا پُرزور نعرہ لگاتے ہوئے شانِ بے نیازی سے کمرہ میں داخل ہوئی۔ چیف سکریٹری صاحب کے لئے یہ مظاہرہ بالکل غیر متوقع تھا۔ آنکھیں حیرت سے جھپکنے لگیں تو ہونٹ خوف سے کانپنے لگے۔ خیر بڑی ہمت کر کے جماعت سے مظاہرہ کرنے کا سبب دریافت کیا۔ پوری جماعت کی جانب سے کسی ایک شخص کے جواب دینے کی رسم تو کب کی پرانی ہو چکی۔ اسلئے سبھوں نے بیک وقت اپنی پوری طاقت سے چلا کر کہا "پوجا کی چھٹی ہر سال جس طرح دی جاتی ہے اس سال بھی اسی طرح دی جائے۔" جماعت کے ایک اور کونے سے آواز اُبھری "نہ صرف ہر سال کی طرح بلکہ اس سال کچھ بڑھا کر دی جائے۔" چیف سکریٹری کو تعطیل کی کمی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اس اچانک یاد دہانی سے سخت پریشان ہوئے اور ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا۔ جماعت پر نہیں، خود پر کہ خواہ مخواہ کس درخواست پر بغیر سوچے سمجھے دستخط کر دیا۔ وہ تو ہر سال کی طرح اس سال بھی باہر جانے کا پروگرام مرتب کر چکے تھے۔ اب جو کایا پلٹا تو سٹی گم ہو گئی۔ بہت گھبرائے۔ خیر کسی طرح معاملہ کو سلجھانے کا وعدہ کر کے جماعت کو سمجھا کر رخصت کیا۔ جلوس خوشی خوشی واپس لوٹ گیا۔

اس تحریک کے روحِ رواں تھے بابو رام چندر۔ گھیراؤ کی کامیابی سے ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ رام بابو پہلے ایک اسسٹنٹ تھے۔ ان کی قابلیت مانی ہوئی تھی۔ سرکار کی جانب سے اعلان ہوا "خرچ کم کرنا ہوگا۔" متعلقہ افسروں نے رپورٹ تیار کر کے روانہ کر دی کہ کلرکوں کی تعداد پر ہی خرچ کی کمی، زیادتی کا انحصار ہے۔ بات معقول تھی۔ منظور کر لی گئی۔ مگر کلرکوں کی تعداد کم کس طرح کی جائے۔ یہ ایک ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ کمی کا سوال اٹھانا ہی ایک ہنگامہ کو دعوت دینا تھا۔ لہٰذا اسی محکمہ ہی سے ایک شخص اسپیشل افسر چنا گیا جس کے ذمّہ یہ کام دیا گیا کہ کن کن محکموں سے کن لوگوں کا اخراج ضروری ہے اس کی ایک فہرست تیار کرے۔ اب اس کام کے لئے رام بابو سے بڑھ کر بھلا اور کون موزوں ہو سکتا تھا؟ قسمت نے چھلانگ لگائی۔ اسپیشل افسر ہو گئے۔ اسپیشل افسر بن جانے پر نہ صرف ان کی تنخواہ بڑھی بلکہ ایک علٰحدہ کمرہ بھی انہیں کام کرنے کے لئے الاٹ کیا گیا۔ اور ساتھ ساتھ ایک لوئر ڈویژن کلرک اور ایک چپراسی بھی ملا۔ اب انہیں ہر وقت ہاتھ میں قلم پکڑے رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اور نہ فائل لانے کے لئے ہی اٹھنا پڑتا۔ کلرک جیسے گھٹیا نام سے چھٹکارا مل جانے پر وہ یک گونہ اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ بہرحال چھ ماہ گذر گئے مگر کسی محکمہ کا تفصیلی معائنہ تو برطرف ادھر جھانکنے تک کی بھی انہوں نے زحمت نہیں گوارا کی۔ یہ نہیں کہ کام کے سست تھے بلکہ انہیں ایک خوف تھا کہ کلرکوں کی تعداد کم کرنا اپنے سر کے بچے بچائے بالوں سے داغِ مفارقت قبول کرنا ہے۔ اس لئے وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی ایسا راستہ نکل آئے کہ کلرکوں کی دشمنی نہ مول لیں اور وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں۔ سوچتے سوچتے آخر ایک نتیجہ پر پہونچ ہی گئے۔ کیوں نہ چپراسیوں کی تعداد ہی کم کر دی جائے۔ اس خیال کے آتے ہی چہک اُٹھے۔ مگر ابھی یہ منصوبہ ان کے گوشۂ شعور سے آغوشِ وجود میں آیا بھی نہیں تھا کہ انہیں محسوس ہوا ان کا گھیراؤ کیا گیا ہے۔ پہلے تو بہت سٹپٹائے کہ کمبختوں کو علم کس طرح ہو گیا، مگر اب سوچنا بیکار تھا۔ چپراسیوں کا مشتعل ہجوم ان کی تاجپوشی کے لئے بیقرار ہو رہا تھا۔ چیف سکریٹری کے گھیراؤ کے وقت گالی گلوج کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ وہاں گالی کے لئے مناسب انگریزی الفاظ نہیں مل رہے تھے، مگر یہاں رام بابو بیچارے چپراسیوں کے خیال میں "اپنے ہی" آدمی تھے، ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جب نوبت باتوں سے لاتوں تک پہنچی تو مجبوراً انہیں ایک پرچی پر دستخط کرنا پڑا کہ وہ چپراسیوں کی تعداد میں کمی کرنے کی نہ صرف سخت مخالفت کرتے ہیں بلکہ ان کی تعداد بڑھانے کے لئے پُرزور تائید بھی کرتے ہیں۔ دستخط شدہ کاغذ کا ٹکڑا ملنا تھا کہ جلوس "گھیراؤ زندہ باد" کا نعرہ لگا کر منتشر ہو گیا۔

آدھ گھنٹے کا حادثہ رام بابو کے ہوش گم کرنے کے لئے کافی تھا۔ کچھ لمحہ تک تو تھر تھر کانپتے رہے۔ عجیب سی رقت ان پر طاری تھی۔ خیر آہستہ آہستہ جب حالت اعتدال پر آئی تو قلم اٹھایا [illegible]

ایک دن کی چھٹی کے لئے لکھ کر آفس روانہ کیا۔ اس ایک دن کے بعد پوجا کی تعطیل شروع ہو رہی تھی اس لئے یک گونہ اطمینان ہوا کہ پوجا کے بعد جو ہوگا دیکھا جائیگا۔ یہ سوچ کر گھر واپس آ گئے۔

گھر آ کر کیا دیکھتے ہیں کہ بیس، پچیس نوجوانوں کا ایک اور ہجوم ان کی ملاقات سے ناامید ہو کر ان کی بیوی ہی سے بحث و مباحثہ میں مصروف ہو گیا ہے۔ انہوں نے جو ذرا نرمی سے نوجوانوں سے اس اچانک آمد کا سبب پوچھا تو اُن میں سے ایک نے نہایت مؤدبانہ انداز میں اکڑ کر کہا "اس سال ہم لوگ اس لوٹ میں دیوی پوجا کا انتظام کر رہے ہیں جس کے لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس یونٹ میں رہنے والے ہر شخص سے اس کی تنخواہ کا پانچ فیصد وصول کیا جائے گا" یہ سننا تھا کہ رام بابو کے اوسان خطا ہو گئے۔ کرسی پر دراز ہوتے ہوئے انہوں نے کہا "چندہ تو خیر دوں گا۔ مگر یہ کہاں کی تہذیب ہے کہ تم میری غیر موجودگی میں میرے گھر میں داخل ہو کر میری بیوی کو تنگ کرو؟" یہ سن کر ان میں سے ایک نوجوان آگے بڑھ آیا اور کہنے لگا "شرما جی! ہم یہاں آپ سے اُپدیش لینے نہیں آئے ہیں۔ براہ کرم جلدی سے پچیس روپے ہمارے حوالے کر دیں ورنہ نتیجہ کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔" اتنے میں پیچھے سے نعرہ بلند ہوا "بھائیو! اس طرح کام نہیں بنے گا۔ ان کا گھیراؤ کر لو" گھیراؤ کا نام سننا ہی تھا کہ رام بابو کے پسینے چھوٹ گئے۔ کیونکہ اس کا لطف اُٹھا کر ابھی ابھی آفس سے لوٹے تھے۔ کوئی راستہ نہ دیکھ کر بیوی کے پاس روپے لینے لپکے۔ مگر بیوی کہاں اتنی آسانی سے مان جانے والی تھی۔ ایک پیسہ بھی دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ بڑی مشکل سے کچھ پیسے بچوں کے کپڑے کے لئے اس نے اکٹھا کئے تھے۔ اب تو بیچارے بڑا گھبرائے مجبوراً بیوی کا حربہ یہی استعمال کرنا مناسب سمجھا۔ آنکھوں میں آنسو لے آئے اور یہ کہتے ہوئے باہر جانے لگے "اگر تمہاری یہی مرضی ہے کہ میں ان لڑکوں کے سامنے ذلیل ہو جاؤں تو ٹھیک ہے۔" تیر نشانہ پر بیٹھا۔ بیوی نے پچیس روپے کو جو کچھ پیسے کم ہو رہے تھے اپنی طرف سے ملا کر کُل پچیس روپے ان کے سامنے ڈال دیئے۔ رام بابو کو بیوی کی دکھی حالت کا اندازہ تھا۔ مگر کیا کریں نہ لیں تو چارہ نہیں۔ دل پر قابو رکھتے ہوئے روپے اُٹھائے اور انہیں لڑکوں کے حوالے کر دیا۔

گھر کے تینوں بچے بڑے غور سے اس تماشا پر ریسرچ کر رہے تھے۔ نوجوانوں کا روپے لے کر دروازہ سے مڑنا ہی تھا کہ تینوں نے باپ کا گھیراؤ کر لیا اور لگے ٹیرلین کے ایک کالے پینٹ اور سفید شرٹ کا مطالبہ کرنے۔ رام بابو تو دن بھر سے جھنجھلائے ہوئے تھے۔ چپراسیوں اور نوجوانوں پر تو بس نہیں چل سکا۔ تمام بھڑاس بچوں ہی پر نکال دی۔ اور لگے بے تحاشہ سنانے ——

"ارے کمبختو! ایسا ہی ٹیرلین کا شوق ہے تو جاؤ چوری کرو، ڈاکہ ڈالو، کسی کروڑپتی کے گھر کا گھیراؤ کرو۔ میرے پاس کیا رکھا ہے؟ ان کمینے نوجوانوں کو بھی اور کچھ نہیں سوجھتا۔ چلے آتے ہیں چندہ لینے۔ پوجا کریں گے، یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ سب معلوم ہے کیا کریں گے۔ پوجا تو خاک کرینگے۔ ہاں ایک ایک کیلو بھوجا مول کر کھائیں گے یا کسی سنیما ہاٹ کے سامنے لگی ہوئی لائن میں جا کھڑے ہونگے۔ جی چاہتا ہے ان بدمعاشوں کو ......"

"بس رہنے دیجئے بہت دیکھا ہے آپ جیسے گولی مارنے والوں کو۔" بیوی جو ابتک خاموش تھی آخر بھڑک اُٹھی۔ "ان نوجوانوں نے ذرا سی دھمکی دی اور آپ نے پورے روپے ان کے حوالے کر دیئے اور میرے بچے ذرا کپڑوں کے لئے ضد کر رہے ہیں تو اس طرح شور مچا رہے ہو جیسے واقعی گھر میں کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔" رام بابو اس حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ غصہ سے پھٹ پڑے اور چیخ کر کہا "اگر بچوں سے ایسی محبت ہے تو تم خود کیوں نہیں بنا دیتی کپڑا؟ روپے نہ ہوں تو چوڑی گروی رکھ دو۔ ہار گروی رکھ دو اور شوق سے لاڈلوں کی کامنائیں پوری کرو۔ کون تمہیں روکتا ہے؟" یہ کہہ کر رام بابو غصہ میں پاؤں پٹکتے ہوئے باہر نکل گئے۔

کہنے کو تو کہہ آئے مگر اب پچھتا رہے تھے۔ خواہ مخواہ بچوں کے ساتھ بیوی کا بھی دل دکھا دیا۔ آخر بیچاری کہاں سے انتظام کرے — مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ یہ سوچ کر سیدھے ایک رشتہ دار کے گھر کا رخ کیا۔ رشتہ دار بیچارے کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ تنہائی پسند آدمی تھے۔ کسی سے میل جول نہیں رکھتے تھے۔ ویسے تھے بہت خوش اخلاق۔ باہر بہت ہی کم نکلتے۔ گھر سے کالج جانا اور کالج سے سیدھے گھر آنا ان کی زندگی کا معمول ہو کر رہ گیا تھا۔ رام بابو جب اپنے رشتہ دار پروفیسر کے گھر کے قریب پہنچے تو وہاں بھی ایک ہجوم نظر آیا جو تقریباً دو ڈھائی سو طلبا پر مشتمل تھا۔ سمجھ گئے یہاں بھی کچھ گھیراؤ ہی کا معاملہ ہے۔ واپس لوٹ جانے ہی میں خیریت تھی۔ مگر پروفیسر صاحب سے ان کا ملنا نہایت ضروری تھا۔

کسی طرح بھیڑ کو چیرتے ہوئے اندر پہنچے۔ نعرہ پر نعرہ لگایا جا رہا تھا — "سر آپ کو نمبر دینے ہی ہوں گے۔" رام بابو جب اندر پہنچے تو پروفیسر کو کچھ لکھنے میں غرق پایا۔ سخت متحیر ہوئے کہ باہر ایسا ہنگامہ برپا ہے اور یہ حضرت اندر بیٹھے اطمینان سے کچھ لکھنے میں محو ہیں۔ رام بابو کے تخاطب پہ پروفیسر نے سر اٹھایا۔ تپاک سے ملے اور مذاقاً کہنے لگے "کہیں آپ ان لڑکوں کے نمائندوں میں سے تو نہیں ہیں؟" رام بابو کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ پوچھا "کیا لکھ رہے تھے؟" پروفیسر نے کہا "ان لڑکوں کے گھیراؤ پہ ایک افسانہ "گھیراؤ" لکھ رہا تھا۔ کہیں سے لڑکوں نے سن لیا ہے میں امتحان کے پرچوں میں بیس فیصد گریس مارک دیتا ہوں اس لئے میرا گھیراؤ کر کے چلّا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر پروفیسر صاحب خاموش ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر توقف کے بعد نہایت افسوس کے ساتھ کہنے لگے۔ "رام بابو! ملک کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔ نہ جانے یہ بدحالی و بدنظمی کب تک رہے گی جس طرح طوفان اپنے غبار آلود دامن میں تمام صاف و شفاف اور چمکیلی چیزوں کو سمیٹ لیتا ہے۔ یہی حالت ان روز بروز کے ہنگاموں کی ہے جن کے سایہ تلے تھوڑی بہت اچھائیاں سسک سسک کر دم توڑنے لگی ہیں۔ اب یہی دیکھئے، یہ جو لڑکے چلا رہے ہیں ان میں کچھ ضرور پاس ہوں گے، اس میں کوئی شک نہیں۔ بلکہ کچھ پوزیشن بھی لا سکتے ہیں مگر اکثریت فیل ہونے والوں کی ہے اور یہی ایک لفظ 'فیل' ان لڑکوں کی دیوانگی کا باعث بنا ہوا ہے۔ وہ سب کچھ سن سکتے ہیں مگر "فیل" کا منحوس لفظ سننے کے لئے قطعی تیار نہیں۔ بس اسی لئے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے کیونکہ انہیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ اگر اس مظاہرہ میں وہ کامیاب ہو گئے تو کل ضرور ملک کے اہم نیتاؤں میں شمار ہونے لگیں گے۔ اور کیوں نہ ہو؟ آجکل تو اسی کو ملک کا لیڈر چنا جاتا ہے جسے اسٹرائک کے سبجکٹ میں سو فیصد مارکس ملے ہوں، چاہے وہ دوسرے پرچوں میں صفر ہی کیوں نہ رکھے۔ آج سکریٹریٹ میں نوکری کے لئے اسی شخص کو خصوصی رعایت دی جاتی ہے جو سست اور نکمے ہونے کا رجسٹرڈ سرٹیفکیٹ پیش کر سکے۔ ملک کی حکمرانی آج اسی شخص کو سونپی جا سکتی ہے جس کے اندر کم از کم پانچ آدمیوں کی بھی ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت نہ ہو۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو اور سنائیے۔ کیسے آنا ہوا۔ گھر میں سب خیریت ہے نا؟" رام بابو جو کچھ دیر کے لئے پروفیسر کی مترشح دملال تقریر میں محو ہو کر رہ گئے تھے چونک پڑے۔ پہلے تو سوچا اب چلنا ہی بہتر ہے۔ مگر پھر خیال آیا وہ تو یہاں ایک خاص غرض سے آئے ہیں۔ آخر بڑی مشکل سے شرم و لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے دل کی بات پروفیسر صاحب کو سنا ڈالی۔

پروفیسر طبعاً فراخدلی کے لئے مشہور تھے۔ ہمیشہ سے اپنے خویش و اقارب کی امداد کرتے آ رہے تھے، چاہے وہ بحیثیت فرض ہو یا بطور قرض، مدد ضرور کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فضول خرچی کے سخت مخالف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رام بابو کے دو سو روپے کے مطالبے پر انہوں نے سمجھایا کہ پوچھا ہیں اتنی ڈھیر سی رقم خرچ کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ رام بابو نے بچوں کی فرمائشوں کا ذکر کیا۔ پروفیسر صاحب نے دلیل پیش کی۔ "مانا ہوں ٹیرین کا لباس بچوں کے لئے بہت دنوں تک کام دے گا مگر دوسرے سال یہی لباس بچوں پر تنگ ہو جائے گا۔ اس وقت آپ کیا کریں گے؟ میری مانئے۔ آپ گھر جا کر بچوں کو سمجھا دیجئے۔" رام بابو نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ بچے کانونٹ کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ اس لئے ذرا شوقین واقع ہوئے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ پروفیسر صاحب کچھ دیر تو فرطِ حیرت سے ان کا منہ تکتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے "پتہ نہیں آپ اپنی آمدنی میں ایسے لمبے چوڑے خوبصورت اخراجات پورا کس طرح کرتے ہیں۔ اگر آپ کی طرح ہر شخص یہی رویہ اختیار کرنے لگے تو پھر ہو چکی ملک کی ترقی۔ اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو۔ یہ لیجئے دو سو روپے۔ اپنا کام تھا آپ کو سمجھانا۔ اب آگے آپ کی مرضی۔" رام بابو دو سو روپے قرض پا کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ آخر کیوں نہ ہو؟ پروفیسر نے ان کی عزت بچا لی تھی۔ اب جی کھول کر وہ بیوی بچوں پر رعب جمائیں گے۔ رام بابو روپے لے کر گئے تو پروفیسر صاحب دروازے پر نمودار ہوئے اور لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ "نوجوانو! میں ایک افسانہ لکھ رہا تھا جس کا عنوان ہے "گھیراؤ" افسانہ مکمل ہو گیا اسلئے تم سے ملنے چلا آیا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارے پرچے میرے پاس اس بار نہیں آئے ہیں۔ اگر آتے تو حتی الامکان تم میں سے لنز ور لڑکوں کو پاس کروا دینے کی کوشش کرتا۔"

"دھت تیری کی، خواہ مخواہ ہم لوگ ایک گھنٹہ سے گھیراؤ کئے ہوئے ہیں۔" لڑکے بڑبڑاتے ہوئے جانے لگے، ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ جاتے جاتے کم از کم

ثریا محمود ندرت

ایک خط، ایک کہانی

از لکھنؤ

میرے ندیم سلامِ شوق

نہ جانے کیوں آج بیتے دنوں کی یاد بری طرح دل و دماغ کو جھنجھوڑ رہی ہے جب کہ تم رشتۂ الفت توڑ بیٹھے ہو۔ اپنا دامن چھڑا چکے میرے نحیف ہاتھوں سے تم اتنی دور ہو کہ تمہیں میرے حالات کی خبر بھی نہیں کہ تم سے بچھڑ کر زندگی میں کتنی تبدیلیاں ہوئیں۔ کتنے انقلابات آئے اور کشتیِ حیات کس طرح تھپیڑوں پر تھپیڑے کھاتی رہی۔

تم سوچو گے کہ آج میں ماضی کی راکھ کیوں کرید رہی ہوں، کیوں اس چنگاری کو تلاش کر رہی ہوں جو مدت سے دبی پڑی ہے۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میں زندگی کے کسی بھی لمحہ میں تمہارے خیال سے، یوں سمجھ لو کہ تم سے دور نہیں رہی ہوں۔ ہاں تم ضرور مجھ سے دور ہو گئے ہو اور آج اس دبی ہوئی چنگاری کو کریدنے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ باتیں جنہیں میں مدت سے دل کے نہاں خانہ میں چھپائے بیٹھی ہوں، تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں۔

میرے ندیم، تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے آنے سے قبل میری زندگی کتنی اداس، کتنی ویران اور کتنی خاموش تھی۔ نہ کوئی ہمدم تھا، نہ مونس، نہ غمخوار، سچ پوچھو تو ان دنوں نہ کسی ندیم کی ضرورت تھی نہ ہمدم کی، کیونکہ میرے سب درد میرے اپنے تھے لیکن اس کے باوجود زندگی ویرانیوں، اداسیوں اور تنہائیوں کی شکوہ طراز تھی۔ تمہیں بتاؤ، جب زندگی میں کوئی رنگینی نہ ہو، کوئی ہلچل نہ ہو تو انسان سکوتِ مسلسل سے گھبرا کر کسی لطیف سے طوفان کی تمنا نہ کرے تو کیا کرے۔ میں نے بھی ایک ایسے ہی طوفان کی تمنا کی میرے دل نے بھی ایک ایسے ہی انقلاب کی خواہش کی اور آخر وہ دن آ ہی گیا۔ رنگ و بو کا طوفان امنڈ آیا، کلیاں چٹک اٹھیں، پھول مسکرا اٹھے اور فضا گنگنانے لگی۔ دل دھڑک اٹھا اور نگاہوں میں چاہت آ گئی۔ ہائے! کتنا خوبصورت تھا وہ دن، کتنی حسین تھی وہ ساعت اور کتنا مسرت خیز تھا وہ لمحہ! میں اس ثانیہ کی تشریح کیسے کروں جس نے دونوں جہاں کی مسرتیں سمیٹ کر میرے دل کے دامن میں ڈال دی تھی تم پلکوں کی چلمن ہٹا کر آنکھوں کی راہ سے میرے دل کے کاشانہ میں آ بسے! زندگی کی راہ میں ہر سمت مسرت ہی مسرت بکھر گئی تھی۔ میرے دل کو کوئی غم نہیں تھا۔ پروانے کو شمع، چکور کو چاند اور بلبل کو پھول مل گیا تھا۔ اس ایک آرزو میں نہ جانے میرے کتنے شب و روز گذرے تھے۔ وہ خواہشیں وہ تمنا اور وہ آرزو پوری ہو گئی تھی اور جیسے مجھے ساری کائنات مل گئی تھی ہاں۔ میرا یہ کہنا بالکل درست ہے کیونکہ تمہیں تو میری کائنات ہو! اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ خوشی کس کو کہتے ہیں اور مسرت کس شئے کا نام ہے۔ میرے ذہن و دل کی عجیب کیفیت تھی میں نے زندگی کی باگ ڈور دل کے ہاتھوں سونپ دی تھی۔ میں گرد و پیش سے بےخبر، انجام سے بےپروا رنگ و بو کے بحرِ بیکراں میں بہی جا رہی تھی۔ کون سی خوشی اور کون سی مسرت تھی جو میرے دل کو حاصل نہیں تھی کیونکہ تم میرے تھے کل کائنات میری تھی۔ میرے دیوتا! میری اس شادمانی سے متاثر ہو کر کسی نے کہا تھا جی چاہتا ہے تمہاری پیشانی سے اپنا ماتھا رگڑ ڈالوں، تاکہ میرا نصیب بھی تم جیسا ہی ہو جائے۔ سنا تم نے؟ بتاؤ، میں اپنی خوش قسمتی پر مسرت سے دیوانی نہ ہو جاؤں تو کیا کروں۔

لیکن نہیں۔! دل دھڑک اٹھا، ظالم بدھن، نظر نہ لگ جائے میری مسرت کے چاند کو، جو اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ زندگی کے صحن میں جلوہ فگن تھا۔

لیکن سچ کہا ہے کسی نے کہ خوشی و مسرت کا زمانہ عارضی ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں آنسوؤں کی تعداد قہقہوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ انسان قہقہوں کو تو شمار لیتا ہے لیکن آنسوؤں کو نہیں گن سکتا کیونکہ وہ بے شمار، لاتعداد اور ان گنت ہوتے ہیں۔

میری زندگی ایک بار اور صرف ایک بار مسرتوں سے ہم کنار ہوئی تھی اور وہ زمانہ بڑا ہی مختصر تھا۔ پلک جھپکتے ہی وہ خوشگوار دورِ حیات ختم ہو گیا اور میرے وہ سوگوار دن پھر لوٹ آئے جن سے اکتا کر اور گھبرا کر میں نے تمہارے دامن میں پناہ لینا چاہا تھا!

وہ خزاں کی ایک بے کیف شام تھی جب تم مجھ سے دور چلے گئے تھے۔ وعدے، عہد و پیماں۔ ایفا کرنے کے لئے نہیں توڑنے کے لئے ہوتے ہیں۔ تم نے بھی یہی کیا۔ باوجود تسلیاں دلاسے اور وعدوں کے دن بیتتے گئے اور تم نہ آئے۔ دل ٹوٹ گیا۔ شاید دل بھی ٹوٹنے ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ زندگی یکسر رنج و آلام بن کر رہ گئی۔ پھر وہی اداسی، ویرانی اور تنہائی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرے شب و روز اب میرے نہیں رہ گئے تھے بلکہ اب ان پر تمہارے خیالات اور تمہارے تصورات کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس طرح دل، دل کی تمنائیں خواب و خیالات اور میرے لیل و نہار، سب ہی کچھ تمہارے ہو چکے تھے۔

تم چلے گئے، گویا بہاریں روٹھ گئیں۔ حسرتیں دم توڑ گئیں، دل میں سوائے درد و غم کے کچھ بھی نہ رہ گیا تھا۔ آہوں کے شعلے سینہ میں بھڑک رہے تھے۔ نغموں کی قندیلیں بجھ چکی تھیں۔ مسرتوں کا چاند گہنا گیا تھا! تم اپنے ساتھ میری ساری خوشیاں، ساری مسرتیں اور ساری مسکراہٹیں، یوں سمجھ لو کہ میری کل کائنات لے گئے تھے۔ پھر بھلا میرے لب کیسے ہنستے، میری نگاہیں کیونکر مسکراتیں اور میرا دل کس طرح مسرور ہوتا۔

ہائے! میرے وہ بیتے ہوئے انمول دن، نہ جانے کون سے خلا میں، کس وادی میں اور کس دیس میں جا بسے تھے۔ آج جن کی صرف دھندلی سی یاد کے سوا دل کے ویران میں کچھ نہیں۔ نہ کوئی آہٹ ہے، نہ آواز! تنہائی اور بھیانک اندھیرا! اس اندھیرے میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ میری سانسیں رکی جا رہی ہیں اور میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ کاش! تم نہ جاتے۔ کاش! میری مسرتیں ابدی اور میری خوشیاں لافانی ہوتیں۔ لیکن نہیں! مسرت و انبساط کی ساعت ناپائیدار ہوتی ہے جبھی تو وہ دن اتنی سرعت کے ساتھ بیت گئے۔ اور اب میرے پاس چند خوشگوار یادوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں رہ گیا، میں بالکل اکیلی ہوں، بالکل تنہا۔

بہار کے بعد خزاں، اور خزاں کے بعد بہار، یہ فطرت کا اصول ہے اس لئے آج میرے غم خانہ حیات سے دورِ خزاں رخصت ہو چکا ہے۔ اور بہار اٹھلاتی مسکراتی اور گنگناتی ہوئی چمن زیست کے گوشہ گوشہ میں براجمان ہو چکی ہے۔ آج میرے چہرہ سے مسرت کی کرنیں پھوٹی پڑ رہی ہیں آنکھوں سے شرابِ مسرت چھلک رہی ہے، دل مسرت کے طوفان سے ہم کنار ہے۔ تم سوچو گے جب کہ زیست تمہارے بغیر اک بارِ گراں ہے تو پھر آج یہ مسرت، میرے ویرانہ دل میں کیوں لہرا رہی ہے۔ تم سے دور رہ کر آج میں خوشیوں سے کیوں لطف اندوز ہو رہی ہوں؟ ہاں، آج میں تمہاری دوری کے باوجود خوش ہوں بہت ہی خوش۔ آج مجھے میرا کھویا ہوا سکون اور میری گم شدہ مسرت مل گئی ہے۔ بتاؤ. کیا تم میری خوشی سے خوش نہیں ہو؟ تمہیں میری خوشی سے خوش ہونا چاہیئے نا پیا؟

سنو، تم سے بچھڑ کر زندگی یکسر درد و غم کے بوجھ تلے دب چکی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد گھر والوں نے میری گہری اداسی اور پژمردگی سے تنگ آ کر ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ہائے! میں ایک بار مسرت سے دیوانی ہو اٹھی پیا جانتے ہو ڈاکٹر نے کیا بتایا ... ؟ ڈاکٹر نے بتایا کہ ٹی بی کا پہلا درجہ ہے سن لیا نا، کتنا خوبصورت ہے میرے اس چھوٹے سے افسانہ کا عنوان کتنا حسین ہے اس کا پلاٹ اور کس قدر مسرت بخش ہے اس کا انجام آج کے سائنسی دور میں جب کہ ٹی بی کا علاج آپریشن کے ذریعہ ہو سکتا ہے میری ناامیدی اپنی انتہا کو کیوں پہنچ گئی ہے؟ لیکن جس کی زندگی میں ناکامیاں ہی ناکامیاں ہوں وہ کامیابی کی کیا امید کر سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی علاج کارگر نہ ہوگا۔ کشتی حیات کو ڈوبنا ہے وہ ڈوب کر ہی رہے گی۔

(بقیہ صفحہ ...)

سید نثار مصطفیٰ

تجریدی آرٹ

ہمارے ایک رفیق جو عہد جدید کے غایت نامور شہرت یافتہ تجریدی آرٹسٹ ہیں۔ نیز جن کی دھوم اس برصغیر کے طول و عرض ہی میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی پھیلنے لگی ہے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ شاکی رہتے کہ میں ان کی عظمت کا ذرا اجلال نہیں۔ درآں حالانکہ ان کی فرد قلم کاری کے دو ایک نقوش تک بھی ہنوز نہ دیکھ سکا۔ انہوں نے شاید بہت سوچنے سمجھنے اور نہایت غور و خوض کے بعد تعلقات دیرینہ منقطع کر لینے کی ٹھان لی۔ لہٰذا جب کبھی سر راہے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ منہ پھیر لیتے، یوں تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ فرماتے کہ جیسے خدانخواستہ رسم و راہ تھی ہی نہیں کبھی چنانچہ میں اس مقولے پر کہ "دل کو نہ توڑئیے کہ خدا کا مقام ہے"، آمادہ بہ جہاد ذرا توقف کے بعد ہوا۔ میں سوچ رہا تھا وہ مجھے نظر انداز کر دیں گے۔ لیکن ایسا کوئی سانحہ درپیش نہیں ہوا بلکہ ایک ذرا عارفانہ تشکیک کے بعد انہوں نے میرے پچھلے گناہوں کی بخشش کر دی اور انتہائی خضوع و خلوص کے ساتھ مجھے لے اپنے نگار خانہ میں داخل ہوئے۔ کسی تاخیر و تکلف کے بغیر فرمانے لگے۔

"آؤ! میں تمہیں خدا کی تصویر دکھاؤں"

میں نے سوچا دیدانت یا یونانی نظریۂ معبود کے مطابق وہ کسی حسین کی تصویر دکھائیں گے لیکن جو وہ تصویر دکھا رہے تھے وہ محض فریم کیا ہوا اسپید مگر نہایت نفیس و دبیز کاغذ کا ایک تختہ تھا۔ میں نے کہا۔

"جناب! یہاں تو آپ کے موقلم نے کہیں جنبش بھی نہیں کی ہے"

"ہاں!" وہ بولے "خدا کی تصویر ٹھہری، بھلا کیا کسی کی مجال جو جنبش کرے یہاں!"

"پھر بھی کوئی عکس لطیف تو ہونا ہی چاہیئے تھا"

"ارے بھئی!" انہوں نے اپنی عقل سلیم پر ناز فرماتے ہوئے تبسم ریزی کی۔ "خدا FORMLESS یعنی کہ غیر عضویاتی، یعنی کہ ماورائے ہیئت ہے۔ لہٰذا جیسے سو خدا ہے" "آنکھ والے رتبہ سمجھیں اس غبار راہ کا" وہ گنگنانے لگے۔

ذرا توقف کے بعد وہ دوسری تصویر کی طرف مڑے۔ فرمایا "یہ تمہاری عقل کو کچھ لگے گی" میں نے دیکھا۔ کچھ سیاہ و سفید لکیریں گڈمڈ ہوتی ہوئی پھیل کر سمٹ گئی ہیں۔ مدعائے فن کار سمجھنے کی کوشش کی تو خرد گھاس چرنے لگی۔ میں نے منہ اٹھا کر عرض کیا۔

"حضرت! یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے"۔

وہ بہت خوش ہوئے اور ایک زوردار قہقہہ ٹھونک مارا۔ ہنسی کی پھوار کے ساتھ صورت حال کی جانب رجوع ہوئے۔

"یہاں ایک عورت ہے جو پتے چن رہی ہے"

"لیکن عورت کہاں ہے؟"

"ارے بھائی! چنتے چنتے ذرا دور چلی گئی ہے یعنی کہ فی الحال نظروں سے اوجھل ہے"

"تو پتے کہاں ہیں؟"

"خشک سالی میں پتے کہاں ہوتے ہیں؟ اسی لئے وہ تلاش میں کہیں دور نکل گئی ہے"

"تو ____؟"

"یہ اس کا نقش اول ہے"

چنانچہ وہ ایک تیسری تصویر یعنی نقش دوم کی طرف قدم رنجہ ہوئے۔ جہاں کہیں کچھ تو نہ تھا پر ایک شکستہ سی ٹوکری پڑی تھی۔

"اب یہ ٹوکری ہے، عورت اور پتے کہاں ہیں؟" میں نے حسب دستور مزید استفسار کیا۔

"اُف تم بھی کچھ سمجھتے ہی نہیں" فن کارانہ وقار کے ساتھ فرمایا:

روایتی ذہن سے باہر آؤ اور ذرا عقلِ عامہ یعنی کہ COMMON SENSE سے
کام لو ـــــــ لے بھیڑیا اُٹھ لے گیا۔ ٹوکری رہ گئی اور پتے اُڑ گئے۔"
میں نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھ ڈالے عرض کیا حضور والا!
معاف رکھیے گا آپ کا یہ شاہکار تو ــــ ہے" وہ بھیڑیے کی طرح مجھے گھورنے
لگے۔ میں نے ایک اور جرأت کی۔ کہا۔

"ایک صاحب کو ایک کلاکار جی اپنی ایک انعام یافتہ تصویر دکھا رہے تھے۔
لیکن وہاں بھی آپ کی اس تصویر کی طرح کہیں کچھ نہ تھا۔ تاہم وہ کہہ رہے تھے۔

"یہاں ایک گائے گھاس چر رہی ہے۔"

ان صاحب نے پوچھا ـــ "گھاس کہاں ہے شریمان جی؟"

"گائے چر گئی۔"

"تو گائے کہاں ہے مہاشے جی؟"

"چر کر چلی گئی ـــ" وہ نہایت سنجیدگی اور غایت اطمینان سے بولے۔

ہمارے رفیق اس بے محل اعتراض سے ذرا متغمص اور اداس سے ہو گئے
لیکن صورت حال پر جلد ہی قابو پاتے ہوئے گویا ہوئے۔

"تو یعنی کہ از خود غیر ارادی طور پر میں نے اپنی فنی روایت سے بغاوت نہیں
کی۔ خیر تو آؤ! میں تمہیں چند ایک مزید اچھی تصویریں دکھاؤں۔"

میں نے دیکھا ـــ

ایک تصویر میں ایک ٹیبل پر ڈھیر سی کتابیں بکھری پڑی تھیں مگر وہ بضد تھے اور
کہتے تھے کہ یہ بات محض نہیں ہے بلکہ یہاں بابائے اردو عبدالحق محو مطالعہ ہیں۔

میں نے کہا "بابائے اردو کہاں ہیں؟"

"کتابوں کی اوٹ میں ہیں اور کہاں؟"

ایک اور تصویر میں چند برانڈی کی بوتلیں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ مگر وہ کہہ
رہے تھے "مرحوم سعادت حسن منٹو ابھی ابھی نوش فرما رہے تھے۔" میں نے کہا مرحوم
گئے کہاں؟"

کہنے لگے "یاران میکدہ اس بلا نوش کا جنازہ ابھی ابھی اٹھا لے گئے۔"
پھر اسی طرح کی بعینہ ایک اور تصویر آویزاں تھی۔ میں نے کہا۔

"حضرت! اس میں اور اس میں کیا فرق ہے؟"

کہنے لگے "بہت فرق ہے۔ آسمان اور زمین کا فرق ہے ـــ ایک میں
سعادت مرحوم پی کر اٹھ گئے

دوسری میں شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی غرقِ بادہ ہیں۔ میں نے کہا۔

"تو حضرت! وہ ہیں کہاں؟"

"ذرا چڑھ گئی ہے۔ بیچے ہیں۔"

ایک تصویر تھی "اندر آنا منع ہے" میں نے کہا یہاں تو محض ایک پردہ لٹکا
ہے۔"

وہ کہنے لگے ـــ ملک کی چند منفرد ہستیاں داد عیش حاصل کر رہی ہیں۔

"تو وہ کہاں ہیں؟"

"دیکھتے نہیں پردہ پڑا ہے۔ وہ ہیں بے حجاب ہوئے۔

نادم ہوتا ہوا مزید میں نے دیکھا۔ ایک نیم سفید بورڈ پر سیاہی پھیلی ہوئی
ہے اور کہیں کچھ نہیں ہے۔ ــ میری عقل حرِ سلیم جواب دے گئی تو وہ اپنے موقلم
کو جنبش دے کر متارِ الیہ ہوئے۔

"یہ ایک مشرقی عورت کی تصویر ہے۔

"لیکن وہ عورت کہاں ہے؟"

"پردے میں ہے ـــ یعنی کہ پردہ نشیں ہے تو کوئی کیسے دیکھے اور کسی
کو کیا حق ہے کہ دکھائے" معقول بات تھی ـــ

ـــ میں خاموش ہو رہا۔ پھر جھینپ مٹانے کو لاشعوری طور پر ایک تصویر
کو میں دیکھنے لگا جو سوئے اتفاق اور زاد ننگی تھی۔ آپ کہنے لگے۔ یہ ہمارا
تازہ شاہکار ہے۔

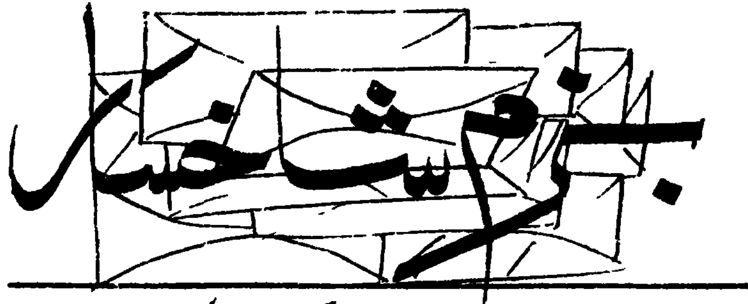
"انجمن تصاویرِ عالم" میں بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

میں نے کہا ـــ یہ عورت کی تصویر نہیں ہو سکتی کیونکہ......... خیر!
نیز یہ کسی مرد کی بھی تصویر نہیں ہو سکتی کیونکہ.. ..... خیر! ـــ تو میں
نے از راہ مذاق کہا ـــ

"ـــ کسی زنخے یعنی کہ خواجہ سرا کی ہے۔

وہ رونے لگے۔ دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ میں بہت گھبرایا۔ وہ کہنے
لگے، "میرے زوال کا وقت آگیا۔ اب تم جیسے ادنیٰ یعنی کہ عام لوگ بھی مجھے
میرے آرٹ کو سمجھنے لگ گئے ـــ اور پھر وہ جاری ہو گئے۔

ـــ سسکیوں کی بے ہنگم اور لامتناہی شورش سے میں باہر آگیا۔
ـــ یعنی کہ تعلق منقطع!!



عطا کاکوی ۔ پٹنہ

شاخسار کا پانچواں شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ کا ادبی لگن قابلِ رشک ہے اور دوسرے رسالوں کے لئے قابلِ تقلید۔ وقت پر ایسا دیدہ زیب اور مفید رسالہ نکالنا ہمت کا کام ہے۔ مسرت ہوئی کہ اہلِ نظر اس کے مضامین دلچسپی اور گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ جناب تسخیر فہمی کی نگاہ میری غزل اور غزل کے ایک شعر پر پڑی اور ایک لفظ انہوں نے قابلِ غور سمجھا، وہ مستحق مبارک باد ہیں کہ کم سے کم ان میں ذوقِ تجسس تو ہے۔ واہ واہ کرنے والے تو بہت ملیں گے مگر ناقدانہ طور پر تنقیدی نگاہ ڈالنے والے بہت کم ہیں۔ میری غزل میں "تار و پو" شست و شو" وغیرہ کے قافیے کے ساتھ بندھا ہے۔ ان کے خیال میں "پو" کے لفظ میں یا تو واؤ مجہول ہے یا "پ" کو فتحہ ہے۔ اس کی صراحت انہوں نے نہیں کی۔ دراصل "پو" کا لفظ واؤ معروف ہے جیسے صحیح ہے جیسے "بو" وغیرہ۔ حوالہ غیاث اللغات ۔ (۱) "تار و پود" بسکون واؤ عاطفہ و ضم بائے فارسی و واؤ معروف بہ ہندی تانا بانا گویند ۔

(۲) "پود" بالضم و بواؤ معروف بہ ہندی بانا گویند۔

(۳) "تار و پو" مخفف ہے "تار و پود" کا ۔

اقبال نے بھی اپنی نظم بعنوان "جبریل و ابلیس" میں "تار و پو" کا لفظ واؤ معروف ہی کے الفاظ کے ساتھ ہم قافیہ کیا ہے ؎

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو

یہاں تک تو تار و پو کی بات ہوئی۔ اب اس تانے بانے کو چھوڑیئے

صبا اکرام صاحب کے کسی شعر میں "برہنہ" کا لفظ تھا جو رائے ساکن کے ساتھ بندھا ہے آپ نے شاید اس پر نوٹ دیا تھا کہ "ر" پر فتحہ ہونا چاہیئے۔ صبا اکرام صاحب نے اپنی سلامت روی کی بنا پر آپ کے اعتراض کو اپنی جگہ درست قرار دیا اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ضرورتِ شعری کی بنا پر انھوں نے ایسا کیا اور اس بحث میں بڑھ کر انھوں نے "نظر" کو "نظر" لکھنا صحیح سمجھا ہے، اس بحث میں بڑھ کر انھوں نے اپنی برأت کے لئے دو شعر نقل کئے ہیں۔ دوسرا شعر تو داغ کا ہے مگر پہلے شعر کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ کسی مشہور استاد کا ہے اور یہ شعر دیا ہے ؎

برہنہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا نہ کچھ بھی راستا محمل یار دیکھ کر

اول تو پہلے مصرعہ میں سند کے لئے جو لفظ "برہنہ" لائے ہیں وہ سرے سے اس شعر میں ہے ہی نہیں۔ برہنہ کی جگہ "پر آبلہ پا" ہے اور یہ شعر یاس عظیم آبادی عرف چنگیزیٔ غالب شکن کا ہے، خیر یہ تو جملہ معترضہ ہوا۔ صبا اکرام صاحب کی حمایت میں چکبست کا یہ شعر کافی ہے ؎

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا پھرتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا پھرتی ہے

طرفہ قریشی ۔۔ ناگپور

"شاخسار" کا پانچواں شمارہ سنہ ۱۹۶۷ء نظر نواز ہوا۔ ہر لحاظ سے قابلِ قدر پایا۔

"بزمِ شاخسار" کے تحت صبا اکرام صاحب کا مکتوب گرامی زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ اکرام صاحب نے لفظ "برہنہ" اور "برہنہ" کی بحث میں جو جوازی باتیں کہی ہیں وہ

بڑی عجیب و غریب ہیں۔

برہنہ یا برہنہ کے جواز میں لغت کا حوالہ اور اشعار کی سند ہی بہت کافی تھی۔ چہ جائیکہ دوسری بے ضرورت اور غلط سلط باتیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ "ضرورت شعری سے حرکات زبر، زیر، پیش، وقف و سکون میں تبدیلی جائز ہے "

میں کہتا ہوں کہ اگر اتنے اختیارات اس دور کے اردو شاعر و ادیب کو مل جائیں تو عالم لسانیات میں غدر مچ جائے۔

کیسی ہی مجبوری کیوں نہ ہو، حرکات و اعراب، وقف و سکون میں تبدیلی جائز نہیں۔ ایسی غلطیاں شاعر یا ادیب اپنی علمی بے مائیگی، خالی الذہنی اور عجز فکر کی وجہ سے کرتا ہے۔ نَظر اور نَظَر یا طَرَح اور طرح کی مثالیں بھی عجیب مضحکہ خیز ہیں پہلی مثال تو گوارا بن گئی ہے۔ دوسری مثال لفظوں کی صحت اور ان کے دو مختلف معنی کی گرفت میں آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکرام صاحب نے طرح اور طرح کی معنوی تحقیق نہیں کی ورنہ کبھی ان لفظوں کو مثال نہ بناتے۔ طُرح اور طَرَحْ دو علاحدہ مستقل لفظ ہیں جن کے معنی میں بڑا فرق ہے۔

اکرام صاحب نے اعراب کی تبدیلی کے جواز میں حضرت سعدی سے متعلق بھی ایک بات کہی ہے فرماتے ہیں کہ ؎

"سعدی نے لفظ خود کو "بدُ" کا قافیہ بنایا جو "بدُ" کی رعایت سے خُدُ پڑھا جاتا ہے۔"

یا

"خورشید کو صرف خور کر دیتے ہیں"

کاش اکرام صاحب سعدی کا وہ شعر پیش فرما دیتے جس میں خود کا قافیہ "بدُ" کھا گیا ہے؟

خور اور خورشید میں اعراب کی کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ خور، خورشید کا مخفف ہے جو لغت کا اپنا تصرف ہے اور لغت کے تصرفات میں کسی کو بھی کلام کی گنجائش نہیں ہے جس طرح خاموشی سے خامشی اور خموشی۔ وغیرہ۔

بَرَہنہ اور بَرَہنہ دونوں طرح صحیح ہے جیسے بَرَہمن اور بَرَہمن یا

دُلہن اور دُلہن۔

مخمور سعیدی ـــــ دہلی

تازہ "شاخسار" مجھے مل گیا ہے۔ اس کے کئی مندرجات پسند آئے۔ خطوط کالموں میں جن احباب نے میری نظم پر اظہار پسندیدگی کیا ہے ان کا میں شکر گزار ہوں۔ تسخیر فہمی صاحب اور جناب عرش صہبائی کو نظم کے پہلے قطعے میں "نیرنگی" اور "بے رنگی" کے قوافی قابل اعتراض معلوم ہوئے ہیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ میں نے "نیرنگی" اور "رنگی" کو قافیہ کیا ہے "نیرنگی" اور "بے رنگی" کو نہیں۔ "نیرنگی" اور "رنگی" میں اصل الفاظ "نیرنگ" اور "رنگ" ہیں۔ "ی" دونوں میں نسبتی طور پر استعمال ہوئی ہے "نیرنگ" اور "رنگ" میں آخری تین حروف اگرچہ مشترک ہیں لیکن دونوں لفظوں کے معنی جزئی جدا جدا ہیں اس لئے علم قافیہ کی رو سے یہ ایک دوسرے کے بالکل جائز قوافی ہیں امید ہے کہ اس وضاحت کے بعد ان دونوں احباب کی الجھن دور ہو جائے گی۔

اس بار اداریے میں نئی شاعری اور نئے شعرا کی بابت جو کچھ کہا گیا ہے وہ میری دانست میں یک طرفہ اور غیر منصفانہ ہے میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ نئی شاعری کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ سب کا سب اس قابل ہرگز نہیں کہ اسے سند اعتبار دے دی جائے اور آپ کا یہ خیال بھی درست ہے کہ جدید شعرا میں بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں نہ جدیدیت سے کوئی سروکار ہے نہ شاعری سے لیکن اس کی بنا پر جدید شاعری کے امکانات سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اور آپ جیسا زیرک ناقد اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ ہر دور میں شعر و ادب کے غالب رجحانات کی نمائندگی کا حق معدودے چند فن کاروں ہی نے ادا کیا ہے جب کہ ان کی آواز میں آواز ملانے والوں کی تعداد بے شمار رہی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، ابھی کچھ مدت پہلے تک جب ترقی پسند تحریک کا زور تھا تو بے شمار ایسے لکھنے والے تھے جو اس تحریک کے حقیقی مفہوم کو سمجھے بغیر اس کی ہمنوائی کا دم بھرتے رہے اور ان میں سے بہتوں کو ترقی پسندوں کی صفوں میں ایک نمایاں حیثیت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن اس تحریک کا زور ٹوٹنے کے بعد ان میں سے کتنے ہیں جن کا کام تو کجا نام ہی لوگوں کو یاد رہ گیا ہو؟ ترقی پسند تحریک کے پیچھے تو ایک مؤثر تنظیم بھی موجود تھی اور اس کے ذمہ داروں کے لئے یہ ممکن تھا کہ جسے چاہیں آگے لانے کا موقع دیں اور جسے چاہیں آگے بڑھنے سے روک لیں اور وہ اپنی ہنگامی مصلحتوں کے زیر اثر اس قسم کی کارروائیاں کرتے بھی رہے لیکن جدیدیت تو اس قسم کی کوئی منظم تحریک بھی نہیں ہے یہ تو محض ایک رجحان کا اظہار ہے جسے بعض عصری تقاضوں نے جنم دیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں

نے جو اس رجحان کی نمائندگی کے بڑے شد و مد سے دعویدار ہیں، اس کی کوئی ہلکی سی آہٹ بھی اپنے دل و دماغ میں محسوس نہ کی ہو اور دوسروں کی دیکھا دیکھی محض ایک فیشن کے طور پر اسے اختیار کر لیا ہو۔ ایسے لوگ چونکہ خود اعتمادی سے محروم ہیں اس لئے سب سے زیادہ شور بھی مچاتے ہیں۔ آپ ایسے لوگوں پر "خود ساختہ" ہونے کی پھبتی کس سکتے ہیں لیکن نئی شاعری کے حقیقی نمائندے یہ نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت مرغ باد نما سے زیادہ نہیں۔ ان میں بعض لوگ وہ ہیں جو ترقی پسند تحریک کے آخری دور میں اس کے سرگرم ترین حامیوں کی حیثیت سے سامنے آئے لیکن جب اس تحریک کا زور ٹوٹا اور جدیدیت کے چرچے عام ہوئے تو یہ فوراً ہی اپنا چولا بدل کر جدید شاعروں کی صفوں میں آ دھمکے جس طرح ان کی ترقی پسندی کی کوئی ذہنی اساس موجود نہیں تھی اسی طرح ان کی جدیدیت بھی بناوٹی اور کھوکھلی ہے۔ ایسے لوگوں کا صرف ایک ہی اصول پر ایمان ہے — چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ ان کے طرزِ عمل اور ان کی بے سرو پا نگارشات کا ذمہ دار جدیدیت کے رجحان کو ٹھہرانا کسی طرح قرینِ انصاف نہیں۔

ایک بات اور بھی ہے، اور اسے مجھ سے کہیں بہتر طور پر خود آپ سمجھتے ہوں گے کہ کسی بھی نئی چیز کو سمجھنے یا اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمدردانہ نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان تمام عوامل کو ملحوظ رکھا جائے جو اس کے پیچھے کار فرما ہیں۔ آپ میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ "شاخسار" کے پچھلے شمارے میں آپ نے دو جدید شاعروں، خلیل الرحمن اعظمی اور شہریار کے فکر و فن کا بالغ نظرانہ جائزہ لیا ہے جس سے جدیدیت کے عمومی رجحان پر بھی اچھی روشنی پڑتی ہے لیکن اس بار آپ اچانک تمام جدید شعراء سے خفا ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کی یہ خفگی کسی وقتی ردِ عمل کا نتیجہ تھی تو اس ادارئیے کی اشاعت کے بعد اسے رفع ہو جانا چاہئے۔ ضبط و توازن آپ کی تنقیدی تحریروں کا نمایاں وصف ہے اور اسے برقرار رہنا چاہئے۔ نئے شاعروں کو ایسے ناقدین کا انتظار ہے جو ان کے ساتھ انصاف سے پیش آئیں۔ ان کی خامیوں پر ہمدردانہ انداز میں انھیں متنبہ کریں اور ان کی خوبیوں کے اعتراف میں بخل سے کام نہ لیں۔

[میری نظر میں صالح جدیدیت سے انکار کفرانِ نعمت کے برابر ہے۔ بھائی سب سے اول آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے کہیں بھی بنیادی طور پر اختلاف نہیں۔ آپ کو خود بھی اس کا احساس ہے کہ جدیدیت کی گرد میں جو کارواں پوشیدہ ہے اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس نے اپنے دل و دماغ میں عصری رجحانات کی ایک ہلکی سی آہٹ تک محسوس نہیں کی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ترقی پسندی کے دور میں بعض ایسے شعراء کو نمایاں حیثیت حاصل تھی جنہیں ترقی پسندی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، اسی طرح بعض نئے شعراء جو صحت مند جدیدیت کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہیں، انھیں نئی شاعری کے فلسفہ طرازوں کی نوازشوں نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ میں نے آپ، شہریار اور خلیل الرحمن اعظمی پر جس انداز سے "نگار" اور "شاخسار" میں مضامین لکھے تھے یا "نگارِ پاکستان" کے جدید شاعری نمبر میں نئے شاعروں کا جس انداز سے ذکر کیا تھا، کیا وہ غیر منصفانہ اور غیر ہمدردانہ تھا؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ نے یہ کیسے باور کر لیا کہ اچانک کسی وقتی ردِ عمل کے طور پر میرے رویہ میں تبدیلی آ گئی؟ میں قابلِ ذکر نئے شعراء پر سلسلہ وار مضامین لکھ کر انھیں کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ نئی شاعری کو خراجِ عقیدت دینے کے لئے نہیں بلکہ اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے جس ضبط و توازن کا ذکر آپ نے کیا ہے، آئندہ بھی مجھ سے اسی کی توقع رکھئے۔ البتہ میرے ساتھ سب سے بڑی دشواری یہ رہی ہے کہ

میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

جہاں تک ترقی پسندی کا تعلق ہے، مجھے کہنے دیجئے کہ آج سے تیس پینتیس سال قبل یہ ایک اہم ادبی رجحان تھا۔ آڈن، اسپنڈر، سی۔ ڈے۔ لوئیس وغیرہ جنھیں انگریزی کی جدید شاعری میں نمایاں مقام حاصل ہے، یہ سب اشتراکی واقعیت سے متاثر تھے یہ ضرور ہے کہ اردو اور ہندی میں ترقی پسند تحریک کے پیچھے ایک موثر تنظیم موجود تھی لیکن تیلگو، اڑیا، اور بنگالی میں تو ایسی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ اس کے باوجود ان زبانوں میں اس وقت کا ادبی رجحان ترقی پسندانہ تھا۔ تیلگو کے جدید شاعر شری شری، اڑیا میں جدیدیت کے بانی سچی راؤت رائے اور بنگالی کے مشہور جدید شاعر بشنو دے، سمر سین، سبھاش مکھوپادھیائے وغیرہ... اڑیا میں جدیدیت کے بانی سچی راؤت رائے اور بنگالی کے مشہور جدید شاعر بری من در مترا اور بدھ دیو بسو اشتراکی واقعیت سے متاثر تھے۔ تیلگو، اڑیا اور بنگالی کے نئے شعراء ان لوگوں کو جدیدیت کے دائرے سے خارج نہیں کر دیتے بلکہ انھیں اپنا پیش رو تصور کرتے ہیں۔ غرض کہ اردو کا کوئی ترقی پسند شاعر اگر جدیدیت کی طرف مائل ہو تو میرے خیال میں نئے شاعروں کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ خود خلیل الرحمان اعظمی کی شاعری اس بات کی مثال ہے کہ وہ جتنے اچھے ترقی پسند شاعر تھے، اس سے بہتر وہ جدید شاعر ہیں۔ اس دفعہ کشمیر میں شہاب جعفری صاحب سے اس سلسلے میں میری گفتگو ہوئی تھی اور وہ بھی مجھ سے متفق ہیں کہ ترقی پسندی بھی جدیدیت کی ایک شکل ہے۔

آپ نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا کہ میں جدید شاعری کے امکانات سے مایوس ہوں؟ میں تو صرف ان نئے فلسفہ طرازوں کا مخالف ہوں جو جدید شاعری کو محض داخلیت پسندانہ شاعری تک محدود کر کے اس کے وسیع امکانات کے دائرے کو تنگ کر رہے ہیں یہی

اور متعصبانہ نہیں۔ مجموعی طور پر "شاخسار" بہتر ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری ـــــ سرینگر

"شاخسار" کا تازہ شمارہ ملا۔ مجھے مسرت ہے کہ آپ کی ادارت میں ایک صاف ستھرا پرچہ نکل رہا ہے۔ تازہ شمارہ میں آپ کا اداریہ دعوت فکر دیتا ہے۔ بڑی بے باکی سے آپ نے بعض حقائق کا اظہار کیا ہے۔

پرکاش فکری ـــــ رانچی

"شاخسار" ملا۔ اس عنایت کا شکریہ۔ میں رسالے کے نام سے متعارف تھا مگر اس سے پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اسے میری بدنصیبی سمجھئے اور اتنا اچھا اردو رسالہ دیکھ کر خواہ مخواہ امید بندھنے لگی ہے کہ اردو اتنی آسانی سے نہیں مرے گی۔ آپ لوگوں کے جذبۂ خدمت اور ایثار کو دیکھتے ہوئے نام نہاد اردو علاقوں کی بے عملی پر رونا آتا ہے اور آپ لوگوں پر رشک۔

جعفر رضا نقوی ـــــ نصیرآباد (یو۔پی)

شاخسار کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ نے لفظ "جدید" پر مختصر مگر بہت جامع و بالغ تبصرہ کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو میں جدید ادب کا انتہائی دلدادہ ہوں خدا گواہ ادب کا شائق۔ شاعری کی نئی قدروں کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کرتا ہوں مگر اس حد تک جہاں تک کہ تخلیق میں ندرت، احساسات میں تڑپ اور طرز بیان میں کشش ہو آپ نے دو چار قدم آگے بڑھ کر جدیدیت کے خوش فہم نمائندوں کو [illegible] کے ساتھ درس دینے کی سعیٔ لاحاصل کی ہے واقعی جدید ادب کے نام نہاد [illegible] اور جدید شاعر خود اپنی جگہ پر یہ نہیں طے کر سکتے کہ ان کا نظریۂ فکر کیا ہے۔

کرامت صاحب! جدید شاعر آپ کی ہر بات مان لے گا آپ کہئے کہ موجودہ شاعری کو طرز حیات کے ہر پہلو کی نمائندگی کرنا چاہئے، بجا ہے، نمبر ۲ محض ہی ہے خارجی شاعری بھی وقت کی آواز ہے، بالکل درست نمبر ۳ شاعری جدید سائنسی تقاضوں کے کسی نہ کسی پہلو کی عکاسی کرتی ہو یہ سب صحیح ہے مگر اب اس کے لئے آپ نے خواہش کی تو یہ آپ کی سراسر زیادتی ہوگی۔ دیکھئے جدید شاعر بھی

وہ نکتہ ہے جس پر گزشتہ اداریہ میں زور دیا گیا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے خط میں اس سلسلے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ اصولاً ایسی شاعری جدید شاعری کے لقب کی مستحق ہے جو موجودہ زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی عکاسی کرتی ہو۔ سائنس نے ذہن انسان کو صرف موت و حیات کی کشمکش کا جذبہ نہیں دیا ہے بلکہ اسے وہ قوت ارادی بھی عطا کی ہے جس سے جدید انسان موت کو بھی مسخر کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔ جدید انسان کو خلائی سفر کے بعد جو نئے نفسیاتی تجربات حاصل ہوئے ہیں، انھیں اردو کا کون نیا شاعر ہے جو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کر رہا ہے؟ ایک ایسا پیدائشی اندھا جس کے لئے روشنی کا تصور ہی ناممکن تھا، اگر آج اسے بینائی مل جاتی ہے تو اس کے ذہن میں جو انوکھا استعجاب اور انبساط کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، کیا اس کی پر خلوص عکاسی جدید شاعری کے ذیل میں نہیں آسکتی؟ موجودہ دور کا سب سے اہم مسئلہ امن عالم قائم کرنے کا ہے اس سلسلے میں کیا جدید شاعر کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ ان موضوعات کو کس طرح شاعرانہ خلوص و صداقت کے ساتھ جدید شاعری میں پیش کیا جائے گا۔ اس کا فیصلہ خود جدید شاعر بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ ممکن ہے مروجہ شعری تکنک ان نئے تجربات کے اظہار کا بار برداشت نہ کر سکے۔ اس کے لئے شاعر کو اپنے طور پر نیا تکنک ایجاد کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس راستے میں جدید شاعر اکیلا اور تنہا مسافر ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک اہم سوال یہ اٹھ سکتا ہے کہ ایسے تجربات جو شاعر کے شخصی تجربات نہیں ہیں، انھیں وہ کس طرح شعری پیکر میں سمو سکتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ شاعر کی قوت متخیلہ میں ایسی توانائی یقیناً ہوتی ہے جس سے وہ دوسروں کے تجربات کو محسوس کر سکتا ہے اور انھیں اپنی شاعری کے دامن میں جذب کر سکتا ہے۔

غرض کہ شاعری چاہے داخلی ہو یا خارجی، اگر شاعر احساسات و جذبات کی آئینے کر موجودہ حیات کی بوقلمونی کی عکاسی کرے، تو اس کی شاعری یقیناً صحیح معنوں میں جدید شاعری کہلانے کی مستحق ہوگی۔ آج اردو کی نئی شاعری کو جس گہرائی، گیرائی اور آفاقیت کی اشد ضرورت ہے، اس کا حصول عصری میلانات کے پہلو بہ پہلو ہماری تہذیب ثقافت اور روایت کا صحیح عرفان حاصل کئے بغیر ممکن نہیں۔

کرامت علی کرامت]

شمس الرحمٰن فاروقی ـــــ الٰہ آباد

آپ کا اداریہ پر وقار ہے۔ اگرچہ مجھے اس سے اختلاف ہے، لیکن آپ کی سطح تو عملی ہے۔ شب رنگ نمبر ۲ کے اداریہ کی طرح جانبدارانہ

مشق ہی سہی مگر آپ کی تمیں گرانقدر رائیں تسلیم کریں۔ اب آپ یہ کیوں فرماتے ہیں کہ "
[illegible] کے میزان پر پوری اترتی ہو تنقید کے گرداب میں پھنسا کر آپ اس کی
کشتیٔ مشق سخن کو ڈبو دینا چاہتے ہیں کیا ؟ اب وہ آپ سے ہرگز اتفاق نہ کرے گا۔
[illegible] آپ کی یہ رائے بھی مان لی تو جدّت ہی کیا رہ گئی وہ مقلد ہو گیا قائد نہ رہا۔
[illegible] ہو گیا علمبردار نہ رہ گیا۔

زیرِ نظر شمارے کی جدید نظموں میں نسیم منظر لودی کی نظم "وقت کتنا ظالم ہے"
[illegible] سادہ سی مگر اثر انگیز ہے۔ سہیل اختر کا ترجمہ "آسکر وائلڈ" بھی اچھی کوشش
ہے۔ [illegible] کا کلام مبہم ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر سطر ایک علاحدہ خیال لئے
ہے جس کا پہلی سطر سے کوئی تعلق نہیں۔ ملاحظہ ہو ان کی نظم "شام"۔
: بچے کا سر، شور کرتا ہوا گرا، ننھے پیر، کیسے ؟ ماں بچے کے پیر یا
کسی طفل شیر خوار کے ؟ مگر یہ طفل کے پیر نہیں ہو سکتے" اس لئے کہ شاعر نے اس کا
[illegible] ذکر نہیں کیا۔ یقیناً یہ ماں بچے کے پیر ہیں جما [illegible] تک نہ دیکھے گئے راستے گرے، نہ ہی
[illegible] کے وجود کا تصور کوئی شاعر ابھی تک کر سکا ہے۔

"دھوپ کی کلی" پیڑ پر اور وہ بھی شام کو اگنے لگی۔ تعجب ہے، شام کو دھوپ
[illegible] ہوتی ہے۔ ندرتِ تخیل کی داد نہیں دی جا سکتی۔ شاعر کا تصور بہت تیز
[illegible] اسی لئے اس کے افقِ تخیل پر اب دھوپ کی کلی کھلنے کے بعد رات کا منظر
[illegible] وہ کہتا ہے "جھنجھناتے ہیں ہتھیلی میں کئی سو تارے" خدا ہی جانے
ہتھیلی کی شان نزول کیا ہے۔ اب تک تو آسمان کی تشبیہ [illegible]
[illegible] شامیانہ وغیرہ سے دی جاتی تھی اب وہ آسمان سکڑ کر ہتھیلی کی شکل
[illegible] ہو گا تیرہ یہ انکشافات اس سائنسی دور میں ممکن ہیں مگر ادب کی زبان
[illegible] تاروں کی چمک کو۔ چمکنا، جھلملانا وغیرہ کہا جا سکتا ہے۔ جھنجھنانے کا مطلب اس
[illegible] پیدا ہوتا ہے جب سوزش یا جلن کا مفہوم ادا کرنا ہو کسی عضو کے اکڑ جانے
[illegible] جب حال سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اسے بھی جھنجھنانا کہا جا سکتا ہے۔ [illegible]
[illegible] ابھی تک کسی شاعر نے اس معنی کے ساتھ نہیں استعمال کیا۔ اگر
[illegible] صحیح کے ساتھ استعمال کیا ہے تو بھی تارے نہیں جھنجھنا سکتے بلکہ
[illegible] ہتھیلی میں تاروں کے باہمی تصادم سے خود ہتھیلی جھنجھناتی ہو لیکن شاعر
[illegible] کا اسم فاعل رکھا ہے ہتھیلی کو نہیں اس لئے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔
[illegible] چرپائی (چارپائی) پر گرنے کے سبب چاروں طرف سے جڑ گیا
[illegible] چارپائی پر بیٹھا رہا وہ چور ہو کر رہ گیا، مگر یہ قہرِ خدا نازل کیوں ہوا ؟

صرف شاعر کی تخیل بتا سکتی ہے۔
اگتی ہوئی دھوپ ہٹکلے پر گول سے چاند کے پھیلنے کے بعد پھر دن بھر کی
گھٹن یک وقت کیوں جلتی سگریٹ سے الجھنے لگی کیا دن بھر رمضان المبارک کے
احترام نے سگریٹ پینے سے باز رکھا تھا ؟
منظر حنفی کی نظم "فائلوں کا جادوگر" پڑھی تو تعبیرات کی اچھی خاصی فہرست
دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکل گیا کہ اس نظم کا عنوان اگر "تعبیر نشاد سوز" ہوتا تو ایک
کامیاب نظم کہی جا سکتی تھی۔ "پاگل، چاند اور چور" میں بھی خوب خوب جدّت طرازیاں
ہیں۔ نظم کا پہلا ٹکڑا بہت متوازن ہے اور اس میں معنویت بھی ہے یعنی "وہ کنارے
پر .... اور بہا" کم از کم اس میں ایک منظرِ فطرت کی عکاسی
ہے اور ایک پاگل کے مزاج کی ترجمانی ہے۔ اس ٹکڑے کے بعد اچانک سیکڑوں ہاتھ
نہ جانے کہاں سے آ گئے کہ انھوں نے "موقع پا کر چاند کے ٹکڑے چنے بدازاں چوری
چھپانے کے لئے کہرام برپا کر دیا" اگر چوری چھپانا ہی مقصود تھا تو چپکے سے ٹکڑے
اٹھا کر چلا دیتے کہرام مچانے کی ضرورت کیا تھی کیونکہ کہرام سے چوری چھپتی نہیں بھید کھل
جاتا ہے۔ اور یوں بھی جہاں سیکڑوں ہاتھ ہوں وہاں رازداری کا سوال ہی کیا !
شیریں شاعری ہے، نئے جذبات اور نیا طرز ادا مگر میں بصد ادب گذارش یہ کرنا
چاہتا ہوں کہ اس طرح کے بعید از فہم کلام پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔
سید محسن نقوی، مہدی بیتاب گڈھی اور رحمٰن الباری حافظ کے کلام خوب
ہیں۔ بہتر تاج بالو صاحبہ شبنم کے افسانہ "پھولوں کی سیج" نے ذہن پر خوشگوار اثر چھوڑا
ہے۔ اطہر عزیز کا ترجمہ قابلِ قدر ہے۔ زبان کی پختگی اور روانی کے سبب یہ مضمون
ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ کامل صدیقی نے جو ادبی سفر شروع کیا ہے وہ بھی قابلِ تحسین ہے
اگر برابر لکھتے رہے تو اس سفر میں بھی کچھ القاب حاصل کر سکتے ہیں۔

کامل صدیقی لکھنوی ــــــ کٹک

تازہ شمارہ زیرِ نظر ہے۔ ہماری "اردو ادب میں روایت اور بغاوت" کافی
پسند آیا۔ "ادب اور تاریخ" ادب کے باہمی تعلقات اور ان کے مسائل میں نے کئی بار
پڑھا کافی ٹھوس اور معلوماتی مقالہ ہے۔ اس قسم کے مضامین کی اردو ادب کو سخت
ضرورت ہے اس سے باہمی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کا جذبہ پیدا ہونے کے ساتھ
ساتھ ادب کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہے۔ اگر گراں نہ گزرے تو منظر حنفی صاحب کی نظم
پاگل، چاند اور چور کے بارے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یا تو وہ میرے فہم سے بالا

ہے یا پھر مجہول فہم اور مبہم سی ہے۔ سطح دریا کی شفاف چادر کا بے شکن ہونا ایک غیر فطری بات ہے۔ دریا میں موجیں تو بہر حال ہوتی ہی ہیں۔ بالفرض ہوا نہ بھی چل رہی ہو تو پھر بھی دریا میں رہنے والے آبی جانوروں کی حرکت پانی کو ساکت نہیں رہنے دیتی۔ یہ ایک بڑی عام سی بات ہے کہ چاند، سورج اور دیگر سیارے ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں چاند کا گھومتے ہوئے سونا کچھ ریسرچ طلب مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ پتھر ہار کر رہا گنا تو خیر پھر بھی فطری ہے کیونکہ اس میں دوسری جانب سے رد عمل کا خطرہ جو لاحق رہتا ہے۔ نظم "شام" بھی کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ دیکھئے مفہوم کب سمجھ میں آتا ہے۔ آپ اس قسم کی "جدید" نظموں کے معنی بھی اگر شائع کر سکیں تو ہر خاص و عام کو ان تخلیقات سے فیض یاب ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔ اطہر عزیز اور سہیل اختر کے ترجمے خوب ہیں۔ اخلاق فتحپوری، آزاد گلاٹی اور جی ایم راہی کی غزلیں کافی پسند آئیں۔

تسخیر فہمی —— دہلی

آپ کا اداریہ بڑا فکر انگیز ہے۔ کاش یہ روایات سے انحراف کی سزا میں جلد کا تاج رکھ کر "سر بازار ننگا ہونے" اور "اپنے آپ کو جنس بازار" بنا دینے پر اتر آنے والے سر پھرے لوگ سمجھتے کہ "اردو شاعری کا ایک مخصوص مزاج ہے جس کی تعمیر و تشکیل میں روایات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ روایات مدت میں بنتی ہیں۔ بالفاظ دیگر روایات کے پس منظر میں تہذیب و معاشرت کا ایک تاریخی سلسلہ ہوتا ہے" یہ کچھ فہم اتنی بات بھی نہیں سمجھ پاتے کہ روایات کا صحیح احساس ہی تو جدت کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

مقالات کا باب قابل مطالعہ ہے۔ حصہ نظم بحیثیت مجموعی کمزور محسوس ہوا۔ صرف سید محسن نقوی کی غزل کچھ متاثر کر سکی۔ یا یہ چند اشعار۔

ہائے کیا چیز ہے۔ ہم تیرہ نصیبوں کی خوشی
خون دل اپنا جلائیں تو چراغاں کر لیں (اخلاق فتحپوری)

ہم دیکھ چکے حد ہے کہاں جور و ستم کی
ہم اپنی وفاؤں کا صلہ پائے ہوئے ہیں (سید شکیل دسنوی)

سمیٹ لاتا ہوں موتی تمہاری یادوں کے
جو خلوتوں کے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں

(آزاد گلاٹی)

ہر زباں پر ہو محبت کا ترانہ اخلاق
اتنا اس جنس گرانمایہ کو ارزاں کر لیں

اگر ردیف کی مجبوری کا عذر لنگ نہ پیش کیا جائے تو "کرلیں" کی بجائے "کر دیں" کا محل تھا۔

افسانوں میں "پھولوں کی سیج"، "شام اور سویرا" پسند آئے۔ کوثر صاحب کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ میری طرف سے عید سلام کے تعزیت پیش۔

ناظر صدیقی —— ہمیرپور (یوپی)

شاخسار مجھے مل رہا ہے۔ تازہ شمارہ زیر نظر ہے۔ مجھے مسرت ہے "شاخسار" میری توقعات سے بھی زیادہ پرکشش ثابت ہوا۔ اس میں جگہ پانے والی تخلیقات اور ان کی ترتیب و طباعت دیکھ کر آپ حضرات کی ادبی صلاحیت و سلیقہ مندی پر ایمان لانا پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ "شاخسار" اپنے اعلیٰ ترین معیار سے بہت مقبول ہوگا اور جس کی بھی نظر سے ایک بار گزر یگا داد تحسین لے رہے گا۔

"شاخسار" کا "نقش اول" ہی پڑھنے والوں کے لئے پرتاثیر ہے اور دور رس تقاضوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ میری نظر میں سب سے زیادہ اہم اور یکتا اول ہی ہے۔ میں آپ حضرات کی ذہنی کاوشوں کے لئے دل کی گہرائیوں سے داد دیتا ہوں جو سوئے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر ایک لمحۂ فکر یہ عطا کرتے ہیں۔

زیر نظر شمارہ میں دیگر تخلیقات کے ساتھ ساتھ اخلاق فتحپوری، راہی۔ سید محسن نقوی۔ مہدی پرتاپ گڈھی کی غزلیں بطور خاص پسند آئیں۔ ان کے یہ شعر تو بہت خوب ہیں۔

آخری قطرۂ خوں صرف گلستاں ہی سہی
اور کچھ دیر ابھی جشن بہاراں کر لیں

ہائے کیا چیز ہے ہم تیرہ نصیبوں کی خوشی
خون دل اپنا جلائیں تو چراغاں کر لیں

اخلاق فتحپوری

ملا ہم کو نہ جب راہ وفا کا راہبر کوئی
بنا کر خود مٹا ڈالے نشان رہگذر ہم نے

جی ایم راہی





پرویز شاہدی



راج نرائن راز، مخمور سعیدی، کمار پاشی



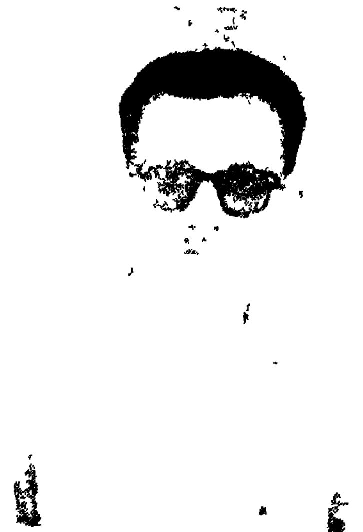
کرامت علی کرامت　　　اسعد نجمی　　　حیدر نایاب



طاہر ا.ا.



سید حرمت الاکرام



احمد حسین آزاد



محمد انور

اُردو زبان کا منفرد علمی اور ادبی جریدہ



نمبر ۱-۲	مشترکہ شمارہ	چوتھی جلد

مُدیر اعلیٰ

امجد نجمی

•

ترتیب و تزئین

کرامت علی کرامت • حیدر نایاب

صلاح کار

حرمت الاکرام

مظہر امام

محمد انور

احمد حسین آزاد

سالانہ بھر کی قیمت
تین روپے

اس جلد کی قیمت
ایک روپیہ ۵۰ پیسے

پتے

(۱) مدیر "شاخسار" بخشی بازار، کٹک ۱

(۲) رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک ۱

مجد نجمی، مدیر، مالک و ناشر نے "لیبل لیتھو پریس" رمنا روڈ، پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر "شاخسار" بخشی بازار کٹک ۱ سے شائع کیا

سنہ ۱۹۶۸ء کا پہلا اور دوسرا مشترکہ شمارہ

ترتیب

نقشِ اوّل

دو چار سال سے اردو میں نئی شاعری کے نام پر جس طرح کی شاعری ہو رہی ہے وہ "فرد کی ذات"، "ذات کا کرب" اور "کرب کا احساس" اک مثلث میں محبوس ہو کے رہ گئی ہے۔ نہ جانے کیوں نئے شعراء اس مثلث سے باہر نکل کر کبھی یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ اس مثلث زندگی کے کس قدر متنوع اور لامتناہی پہلو پھیلے ہوئے ہیں۔ حالانکہ بعض عصری تقاضوں کی وجہ سے جدید شاعری میں فرد کی ذات کو اہمیت حاصل پھر بھی اس وسیع کائنات کے درمیان فرد کی ذات کا مقام متعین کرنا بھی تو جدید شاعر کا فرض ہے۔ موجودہ حیات اس قدر متعدد (MULTI-DIMENSIONAL) ہو گئی ہے کہ اسے صرف ایک جذبہ سے (چاہے وہ کرب کا ہو یا نشاط کا) وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی نفسیات ہی اس قدر پیچیدہ شئے ہے کہ اس کا کوئی بھی جذبہ خالص نہیں ہو سکتا۔ ہر جذبۂ نشاط میں جذبۂ کرب اور ہر جذبۂ کرب میں جذبۂ نشاط پوشیدہ رہتا ہے۔ دورِ جدید کے انسان کو چونکہ ایسی نفسیاتی پیچیدگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے وہ اب تک آشنا نہیں اس لئے مذکورہ بالا خصوصیت کو جدید شاعری میں اور بھی واضح طور پر ابھرنا چاہئے جو کم از کم اردو کی نئی شاعری میں ہو نہیں پا رہا ہے۔ کہنے کی غ یہ ہے کہ اگر نئی شاعری سے صرف ذات کا کرب مترشح ہے تو یہ نہایت مصنوعی چیز ہے۔ کیونکہ خالص "ذات کا کرب" جیسی کوئی چیز موجو حیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ علاوہ ازیں کیا یہ ممکن نہیں کہ شاعر کے دل میں کرب کا ایک حد تک احساس تو ہو لیکن یہ کرب آتے آتے خوشی کے نغموں میں تبدیل ہو جائے؟

کوئی ضروری نہیں ہے غم کو میں پیکرِ شعری میں ڈھالوں
چبھو کے سینے میں اپنے نشتر ترانا گاتا ہوں میں خوشی کا

میرے خیال میں زمانۂ قدیم سے شاعری میں ایسا ہوتا ہوا آیا ہے اور کوئی سبب نہیں کہ جدید شاعری میں یہ بات ممکن نہ ہو۔ المختصر "ذات کا کرب" اور "کرب کا احساس" جدید شاعری کے فلسفے کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

سائنسی انکشافات اور خلائی سفر نے ذہنِ انسان کو ایک نیا استعجاب کا جذبہ عطا کیا ہے اور اس نادر جذبے کو شاعرانہ صداقت کے ساتھ اگر جدید شاعر شعری پیکر میں سمونے کی کوشش کرے، تو یقیناً اعلیٰ پیمانے کی شاعری کی تخلیق ہو سکے گی۔ سنسکرت کے ماہرِ علمِ بدیع وشوناتھ کویراج نے کہا تھا

रसे सारश्चमत्कार सर्व प्राप्यनु भूयते
तच्चमत्कार सारत्वे सर्व त्राप्यद्भुतो रस:

یعنی "ہر طرح کے جذبات کا جوہر جمالیاتی سرخوشی ہے جو ہر شئے پر مسلط ہے اور یہ جمالیاتی سرخوشی کا نچوڑ جذبۂ استعجاب جس سے ہر شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے۔"

جذبۂ استعجاب جو اس دور کا ایک اہم عطیہ ہے اس کو نظر انداز کر دینا وقت کے ایک اہم تقاضے سے چشم پوشی کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟

کرامت علی کرامت

۲۲ مارچ ۱۹۶۸ء

پرویز شاہدی زندہ باد!

۵ مئی ۱۹۶۸ء کو شام کے سات بجے پرویز شاہدی ان محفلوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے، جہاں ان کی زندگی بداماں اشعار، ترنم ریز نغمے، قہقہے اور لطیفے سالہا سال تک گونجتے رہتے تھے

پرویز شاہدی ایک جاگیردارانہ کٹر مذہبی ماحول میں ۱۹۱۰ء میں پٹنہ سیٹی کے محلہ لودی کٹرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ دس سال کی عمر میں کسی بزرگ سے بیعت کرلی اور باقاعدہ تہجد گزار بن گئے۔ لیکن یہ اردو ادب کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں ذوق شعری نے اپنی جانب متوجہ کرلیا اور وہ "مولوی اکرام حسین" بنتے بنتے "پرویز شاہدی" بن گئے

جب زمانہ جوان تھا تو پرویز شاہدی ایک جذباتی حادثے سے دوچار ہوئے اور پٹنہ کو خیرباد کہہ کر کلکتہ چلے گئے، ایسے گئے کہ پھر ادھر ہی کے ہو کر رہ گئے۔ کلکتہ ان کا وطن ثانی بن گیا۔

نومبر ۱۹۵۵ء میں شادی کی۔ اگست ۱۹۵۶ء میں بچی کی پیدائش ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہوئے اور انتقال کے وقت تک اسی عہدے پر مامور رہے۔

آٹھ سال کی عمر میں آپ نے پہلا شعر کہا تھا۔ سولہ سال کی عمر تک ناسخ، آتش، میر، سودا، غالب اور داغ کے دواوین کا باستیعاب مطالعہ کر چکے تھے۔ ابتدا میں ناسخ اور پھر غالب کا اثر قبول کیا، لیکن جلد ہی اپنی علیحدہ راہ منتخب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

پرویز شاہدی ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ لیکن غیر ترقی پسند سنجیدہ ادبی اور علمی حلقوں میں بھی انہیں یکساں مقبولیت اور عزت حاصل ہوئی۔ وہ ادبی محفلوں کی رونق تھے اور مشاعروں کی روح رواں۔ ان کی شاعری کا خمیر شادابِ خیالی، نشاط افروز ربودگی اور فنی رسائی سے تیار ہوا تھا۔ زبان و بیان پر انہیں غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی اور فن شعر کے رموز و نکات پر ان کی نگاہ گہری تھی۔

پرویز شاہدی کا پہلا مجموعہ کلام "رقص حیات" جس میں ۳۵ نظمیں، ۳۰ غزلیں اور ۱۴ رباعیاں شامل ہیں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا دوسرا مجموعہ کلام "تثلیثِ حیات" ان کے انتقال کے وقت تک اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔

ادارہ "شاخسار" مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

پرویز شاہدی کی اچانک اور بے وقت موت ایک ایسا عظیم سانحہ ہے کہ اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کی زبان فرطِ غم سے گنگ ہو گئی ہے:

ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے۔ میں بھی چپ ہوں تم بھی چپ

پرویز شاہدی ہم میں نہیں رہے۔ لیکن ان کا کلام ہمیشہ ان کی یاد تازہ رکھے گا۔ وہ ہمارے ادب کا غیر فانی ورثہ ہے۔

پرویز شاہدی مر گئے! زندہ باد پرویز شاہدی!!

—— مظہر امام

اثر لکھنوی

مکتوبات اثر لکھنوی بنام شفقت کاظمی

کشمیری محلہ لکھنؤ
۱۵ مئی ۵۷ء

(۱)

مکرمی! تسلیم
خط کا شکریہ۔ کسی کتاب کا مقدمہ لکھنے کے لئے پوری کتاب نظر کے سامنے ہونا چاہیئے۔ چند اشعار کی بنا پر کچھ لکھنا میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا۔ میری تجویز ہے کہ اشاعت کے بعد اگر جب تک میں زندہ رہا، تو ریویو لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں گے، تو کسی رسالے میں چھپنے کے لئے بھیج دیں گے۔

اثر

لہ نوٹ: میں نے اپنے پہلے دیوان "حسرت کدہ" پر مقدمہ لکھنے کے لئے، جناب اثر مرحوم کی خدمت میں درخواست کی تھی، جس کے جواب میں انھوں نے یہ کرم نامہ تحریر فرمایا تھا۔ 'شفقت کاظمی'

(۲)

کشمیری محلہ لکھنؤ
۲ نومبر ۵۷ء

مکرمی! تسلیم
یاد آوری کا شکریہ۔ علاج کرتے کرتے تھک گیا مرض سے نجات نہیں ہوتی۔ بظاہر موت کا پیش خیمہ ہے۔ آپ کی غزل پڑھ کر مسرور ہوا۔ ماشاء اللہ خوب کہتے ہیں اور بہت سمجھ کر کہتے ہیں کلام میں گہرائی ہوتی ہے اور نقائص سے پاک ہوتا ہے۔ والسلام

اثر

(۳)

کشمیری محلہ لکھنؤ
۲ مارچ ۵۸ء

مکرمی! تسلیم
آپ کا ۲۵ فروری کا مرقومہ پوسٹ کارڈ آج ملا۔ پچھتّر برس کے قریب ہوں۔ امراض کا شکار۔ کسی کتاب کا مقدمہ لکھنا میری طاقت سے باہر ہے۔ گو آپ کا کلام اس قابل ہے کہ اس کے محاسن کی شرح کی جائے۔ مگر مجبور اور معافی کا خواستگار ہوں۔

ناچیز اثر

(۴)

کشمیری محلہ
۲۹ مئی ۵۸ء

میں نے بار بار آپ سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا کہ میری صحت جواب دے چکی ہے اور ذاتی حالت نہیں کہ آپ کے کلام بلاغت نظام کا مقدمہ لکھوں۔ مگر آپ کو یقین نہیں تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔ انشاء اللہ عنقریب سفر واپسی ہوگا۔ آپ کو تو ۴۴ برس کی عمر میں زندگی کے ساز کے [illegible] ہو جانے کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ اور ۷۵ برس کے بوڑھے کے [illegible] سے متعلق میں کیا کہا جائے۔

خاکسار اثر

لہ نوٹ: میں نے اپنے پہلے دیوان "حسرت کدہ" پر [illegible]

...یاز فتحپوری مرحوم اور مولانا عبدالمجید سالک مرحوم سے مقدمے لکھوائے تھے۔ پھر اپنے دوسرے دیوان 'نغمۂ حسرت' پر مقدمے ...نے استدعا کی تھی۔ مگر جناب اثر مرحوم نے بربنائے علالت مقدمہ لکھنے سے معذوری کا اظہار فرما کر میری امیدوں کا خون کر دیا۔

(۵)

کشمیری محلہ
۲۴ جولائی ۱۹۵۸ء

جناب والا!

مجھے افسوس اور ندامت ہے کہ آپ کا مرسلہ مسودہ کلام ...یں رکھ کر بھول گیا۔ بہت تلاش کیا، نہیں ملا۔ نہ معلوم کہاں ...ئب ہو گیا۔ والسّلام

اثر

(۶)

کشمیری محلہ
...گست ۱۹۵۸ء

کرمی! تسلیم

حسرت کدہ، مل گیا شکریہ۔ آپ کے خطوط مجھے ملتے ...یرا خط آپ کو نہیں ملتا۔ میرے پاس اس کا کوئی چارہ نہیں ...خط میں لکھ چکا ہوں کہ 'نغمۂ حسرت' کا مسودہ کہیں گم ہو گیا ہے ...ڈھونڈا، نہیں ملا۔ افسوس ہے اور نادم ہوں۔ اس کی نقل تو ...کے پاس ہوگی، ٹائپ کیا ہوا تھا۔ والسلام

اثر

(۷)

کشمیری محلہ
...مارچ ۱۹۵۵ء

جناب من! تسلیم

آپ کا پوسٹ کارڈ بھی ابھی ملا۔ فوراً جواب عرض کر ...ہوں۔ فارسی میں لفظ بس کے معنی ہیں۔ کافی۔ بکثرت۔ فرط زیادہ۔ "بس کن ایں قدر مرا بس است" بہت عام جملے

ہیں۔ بسکہ بمعنی چونکہ ہے۔ مثالیں:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا (غالب)

بسکہ پہلے پہل کا تھا یہ سفر
آفتیں ساری آ پڑیں مجھ پر
منیر شکوہ آبادی (شاگرد ناسخ)

ازبسکہ۔ یا زبسکہ بمعنی چونکہ۔ اس حد تک۔ اس وجہ سے۔ کثرت سے مثالیں:

زبسکہ وصفِ دہانِ شیریں، رہا ہے وردِ زبان شیریں
بدن میں جب تک ہے جانِ شیریں، مزہ دہن میں ہے انگبیں کا

اس کثرت سے:

بے اعتبار ہو گئے ہم ترکِ عشق سے
ازبسکہ پاسِ وعدہ و پیماں نہیں رہا (مومن)

چونکہ اس وجہ سے کہ

بیانیہ جملے بنانے کو فارسی والوں نے بسکہ۔ ازبسکہ۔ زبسکہ لفظ بس پر اضافہ کر کے بنا لئے۔ حاصل یہ ہوا کہ بسکہ کی صحت بمعنی بہت، یا کثرت سے محل نظر ہے۔ مگر آپ کے شعر میں بسکہ بمعنی چونکہ کیوں نہ لیجئے، مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اعتراض اٹھ جاتا ہے۔ بسکہ بمعنی بہت کا مطلب پُر امید میں شامل ہے۔ دل پُر امید ہے، امید سے لبریز ہے۔ یعنی بہت امید ہے شعر کی نثر یوں ہوگی۔ دل چونکہ عرض کے بعد امید سے لبریز ہے
(بسکہ) (پر امید)
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری التجا کے بعد کچھ کہیں گے۔
(جیسے)

بسکہ بمعنی چونکہ کی سند میں غالب اور منیر کے اشعار موجود ہیں۔ بسکہ کو چونکہ پر ترجیح اس لئے دی کہ چونکہ سے منطقی استدلال کی مشق تعلق ہے اور ایسا استدلال شعر کی تاثیر کے حق میں سم قاتل ہوتا ہے۔ اس لئے غالب نے چونکہ دشواری کی جگہ بسکہ دشوار ہے کہا۔

پروفیسر کرامت علی کرامت

شعری تنقید کے چند بنیادی مسائل

"تحریک" میں میرے مضمون "نظم، نثر اور شعر" کی اشاعت کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی اور سید جابر علی کے مراسلات نظر سے گذرے۔ اس سلسلے میں شعری تنقید کے چند بنیادی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ جن پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سوالات یہ ہیں۔

(۱) جذبات کسے کہتے ہیں اور ادب میں ان کا کیا مقام ہے ؟

(۲) ادب میں شخصی جذبات کے اظہار سے کیا مراد ہے ؟

(۳) معانی اور جذبات میں کون زیادہ اہم ہے ؟

(۴) کیفیات سے کیا مراد ہے ؟ معنی اور کیفیات میں کیا فرق ہے ؟

(۵) ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی سے کیا مراد ہے ؟

(۶) شعر کی قدروں کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے ؟

(۷) شعر میں آہنگ کا کیا مقام ہے ؟

(۸) کیا یہ ضروری ہے کہ شعر کی زبان نثر کی زبان سے بہت قریب ہو ؟

(۹) کیا تشبیہات، استعارات اور ذہنی پیکر کے بغیر شعر شعر نہیں ہو سکتا ؟

اب آیئے، ان کے جوابات پر غور کریں۔

(۱) سب سے پہلے جدید علم النفس کے نقطۂ نظر سے فہم اور جذبات کا مطالعہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ دماغ میں ہر طرح کی حس کے لئے ایک مخصوص جگہ متعین ہوتی ہے اس جگہ کے نزدیک متعلقہ مقامات (ASSOCIATED AREAS) ہوتے ہیں جن کا کام ظاہری حس کو اس حس سے ادراک (PERCEPTION) میں بدل دینا ہوتا ہے۔ مختلف حسیات سے وابستہ ادراک کے اجتماع سے فہم (UNDERSTANDING) معرض وجود میں آتی ہے جو پورے دماغ کا عمل ہے، اس کے کسی ایک حصے کا نہیں۔ لیکن دماغ کا وہ حصہ جسے (THALAMUS) اور (HYPOTHALAMUS) کہا جاتا ہے اس سے کچھ اعصاب نکلتے ہیں جو ریڑھ کی ہڈی کے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں جنہیں (AUTONOMIC NERVOUS SYSTEM) کہا جاتا ہے یہ اعصاب دل اور پھیپھڑے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ CANNON'S THEORY OF EMOTION کے مطابق جس وقت THALAMUS متاثر ہوتا ہے تو جذبات کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس وقت عموماً THALAMUS اور HYPOTHALAMUS کے اثر سے مذکورہ بالا اعصاب کے ذریعہ PHYSIOLOGICAL تبدیلیاں (مثلاً اخراج غدود یا سانس، دھڑکن اور خون کی رفتار میں تیزی وغیرہ) رونما ہوتی ہیں۔ چنانچہ علم النفس میں جذبات شدید قسم کے احساسات اور PHYSIOLOGICAL تبدیلیوں کا مجموعی نام ہے۔

لیکن زمانۂ قدیم سے ادب میں جذبات عموماً صرف شدید قسم کے احساسات کے لئے مستعمل ہوتا ہوا آیا ہے۔ البتہ بعض موقعوں پر PHYSIOLOGICAL تبدیلیاں بھی صاف نمایاں ہوتی ہیں (مثلاً انیس کا مرثیہ پڑھتے وقت لوگوں کو زار زار روتے ہوئے میں نے دیکھا ہے) زمانۂ قدیم سے اب تک مشرق و مغرب کا ادب گویا "جذبات" کی گود میں ہی پروان چڑھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ "جذبات نام کی چیز کا ادب سے بنیادی تعلق نہیں ہے" وہ لوگ زمانۂ قدیم سے اب تک کی تاریخ تنقید سے آنکھیں بند کرکے غالباً صرف ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس قول میں اپنا جواز ڈھونڈتے ہیں کہ شاعری

جذبات سے فرار کا نام ہے" حالانکہ ایلیٹ کی لازوال نظم "ویسٹ لینڈ" بھی جذبات سے خالی نہیں ہے "جذبات" کے منکر شمس الرحمٰن فاروقی شعر کے لئے معنی کی اہمیت سمجھاتے ہوئے جس وقت کہتے ہیں کہ "شعر میں اگر کوئی واردات قلبی و ذہنی ہے، کوئی تاثر ہے تو وہی اس کے معنی ہیں" ، تو گویا وہ غیر شعوری طور پر جذبات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ جذبات واردات قلبی و ذہنی نہیں تو اور کیا ہیں؟ ہندوستان کے ادب میں "جذبات" کی اہمیت کا احساس اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ ہندوستان کا نام بھارت۔ بھرت منی نے جس وقت اپنے ناٹیہ شاستر میں نو قسم کے اہم جذبات مثلاً (۱) شرنگار اس (جذبۂ محبت) (۲) ہاسیہ رس (جذبۂ مسرت و خوشی) (۳) ویراس (جذبۂ شجاعت و بہادری) (۴) بھے رس (جذبۂ خوف و بیم) (۵) شانت رس (جذبۂ سکون و اطمینان) (۶) کرونا رس (جذبۂ درد و غم) (۷) رودر رس (جذبۂ غیظ و غضب) (۸) بی بھیتس رس (جذبۂ نفرت و کراہت) (۹) ادبھت رس (جذبۂ استعجاب) کا ذکر کیا تھا، تو یہ تقسیم صرف ڈراما کے لئے مخصوص نہیں تھی بلکہ ادب کے ہر شعبے (خصوصاً شاعری) کے لئے مقصود تھی۔ ان جذبات کے باہمی امتزاج سے اور بھی متعدد قسم کے جذبات معرض وجود میں آسکتے ہیں۔ سنسکرت کے ماہر علم بدیع وشوناتھ کو براج نے اس "رس" کے اصول کو اپنی کتاب "ساہتیہ درپن" میں اتنی دور تک آگے بڑھایا کہ عالمی ادب میں اس کی مثال بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ انسان کے جذبات کئی طرح کے ہوتے ہیں اور ادب میں الفاظ کے اجتماع و تلازم سے وابستہ جذبات کا نام رس ہے۔ مولانا شبلی نے جذبات کی اس طرح کی تقسیم سے متعلق کہا ہے کہ "عربی اور فارسی میں اس قسم کی سائنٹفک تقسیم نہیں ہے" (حالات شبلی)۔

شبلی نے شعر العجم میں کہا ہے کہ "شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے .... آپ منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے" ۔ دراصل شعر جذبات کی پیداوار بھی ہے اور قاری کے ذہن میں اثر کرتے وقت جذبات کو برانگیختہ بھی کرتا ہے لیکن میرے خیال میں ادب کے دوسرے شعبوں میں بھی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ شعر میں جذبات کی شدت زیادہ ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ شعر میں جذبات کی افراط فراوانی ہوتی ہے۔

اقبال نے جس وقت کہا تھا

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

تو ان کے ذہن میں لفظ "دل" سے مراد گوشت کا لوتھڑا نہیں تھا، بلکہ ذہن کا وہ حصہ تھا جس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔

اب آیئے، مغربی نقادوں کے اقوال کا جائزہ لیں۔ جس وقت ارسطو تزکیۂ نفس یا (KATHARSIS) سے متعلق کہتا ہے

TEN TON TOIJUTON PATHEMATON KATHARSIN

تو وہ ٹریجڈی کے ذریعہ ہمارے ذہن کو تکلیف دہ اور غیر صحت مند جذبات سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ کہ جذبۂ خوف و ہمدردی کے ذریعہ غیظ و غضب اور طمع جیسے غیر صحت مند جذبات کو دور کیا جا سکتا ہے۔ جس وقت ٹریجڈی عوام کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو انسانی ذہن MIMESIS کے ذریعہ تکلیف دہ سین سے بھی قوت تقلید کی وجہ سے محظوظ ہوتا ہے۔ اس حظ میں بھی سامع یا قاری کا جذبہ پوشیدہ رہتا ہے۔ کولرج نے "بایوگرافیا لٹریریا" میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ

A POET HAS "A MORE THAN USUAL STATE OF EMOTION WITH MORE THAN USUAL ORDER..."

کیبل نے اپنے رسالہ REPOSITORY ۱۸۳۳ء میں کہا ہے کہ شاعر ایسے کہتے ہیں جس کے "جذبات تلازمہ کی ایسی کڑیاں پیش کرتے ہیں جن میں جسمانی اور روحانی دونوں طرح کے خیالات پیوند کر دئے گئے ہوں"۔ بقول سنتایانا "حسین اشیاء ہمارے اپنے ہی جذبات کا OBJECTIFICATION ہوتی ہیں" (THE SENSE OF BEAUTY سنہ ۱۸۹۶ء) لہٰذا ادب کا کوئی شعبہ جس میں حسن و جمالیات کا عنصر ہو جذبات سے عاری نہیں ہو سکتا۔ تھیوڈر لپس نے خود کو جمالیاتی اشیاء کے ساتھ ملاتے ہوئے محسوس کرنے کو EINFUHLUNG یا EMPATHY کے نام سے منسوب کیا ہے۔ EMPATHY ہمیشہ احساسات و جذبات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ آئی۔ اے۔ رچارڈس نے زبان کے دو طرح کے استعمال کا ذکر کیا ہے۔ (۱) زبان کا سائنٹفک استعمال (۲) زبان کا جذباتی استعمال۔ ایک ہی لفظ کا استعمال کبھی سائنٹفک ہو سکتا ہے اور کبھی جذباتی مثلاً لفظ "گل" کو لیجئے علم نباتات میں اس لفظ کا استعمال ہمارے

ذہن کو اس پھول کے خاندان کے علاوہ اس کی پنکھڑی اور رنگ وغیرہ کی طرف لے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے استعمال کو جذبات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن جس وقت ہم میر کا یہ شعر پڑھتے ہیں :-

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
یہ سن کر کلی نے تبسم کیا

تو ہم لفظ "گل" سے وابستہ زندگی سے بے اعتنائی کا جذبہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ صرف شعر میں نہیں بلکہ ادب کے ہر شعبے میں کسی نہ کسی حد تک زبان کا جذباتی استعمال ہوتا ہے۔

فرانس کے مشہور فلسفی جے مارٹین کا کہنا ہے کہ شاعر کی "روح" میں سب سے پہلے ذہنی پیکر ایک طرح کے موسیقانہ اضطرار کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس موسیقانہ اضطرار کی کوئی آواز نہیں ہوتی جو کانوں کو سنائی دے بلکہ اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ پہلا درجہ ہے جہاں "روح" کے اندر شاعرانہ تجربہ کا احساس ہوتا ہے۔ ماقبل شعور (PRE-CONSCIOUS) اور منور ادراک (ILLUMINATING INTELLECT) دونوں کی کارفرمائیوں سے اس طرح کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں جو ہر طرح کے مرئی تصور یا خیال سے منزہ رہتی ہیں۔ بلکہ یہ کیفیتیں ذہنی پیکر اور جذباتی رفتار سے معمور ہوتی ہیں۔ اس طرح کی نفسیاتی گرہ (COMPLEX) جو محض حرکت کے عالم میں رہتی ہے۔ اسے مارٹین نے ذکاوتی ہیجانات (INTUITVE PULSIONS) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان مختلف ہیجانات میں سے ہر ایک شاعرانہ ذکاوت کو پورے طور پر ظاہر نہیں کرتا بلکہ یہ سب مل کے ایک ناقابل تقسیم کلیت کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ان ہیجانات میں ہمیشہ رفتار و تسلسل قائم رہتا ہے۔ ان ہیجانات میں جو ذہنی پیکر ہوتے ہیں، وہ غیر محسوس شکل میں ہوتے ہیں اور جو جذبات ہوتے ہیں، وہی شاعرانہ ذکاوت کے موجب ہوتے ہیں۔ ذکاوتی ہیجانات آہستہ آہستہ وسیع ہوتے جاتے ہیں جس کے نتیجہ پر صاف ذہنی پیکر معرض وجود میں آتے ہیں اور ابتدائی جذبات میں سے واضح جذبات کی زیادہ صاف بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر کی "روح" میں ایک اور بھی وسیع موسیقانہ اضطرار پیدا ہوتا ہے جو ذکاوتی ہیجانات کی خاموش ہم آہنگی اور ترنم کے ساتھ شعور تک پہنچتا ہے۔ اسے مارٹین نے ذکاوتی ہیجانات موسیقی (MUSIC OF INTUITIVE PULSION) کے نام سے موسوم کیا ہے جو بذات خود خاموشی کی آواز ہے۔ اس کے ہیجانات فطری شکل اور سماجی شکل کے مدارج ہوتے ہوئے شاعری کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شعر کی تخلیق کے دوران شاعر میں جذبات کی بڑی اہمیت ہے۔ شعر پڑھتے وقت ذہن قاری پر کیفیات گزرتی ہیں انھیں آئی۔ اے رچارڈس نے سائنٹفک طریقے پر ذیل کیا ہے (۱) تحریر سے وابستہ بصری حس (۲) اس حس سے وابستہ ذہنی پیکر (۳) اشارات (REFERENCES) ہیجانات (IMPULSES) (۴) جذبات (EMOTION) اور رویہ (ATTITUDE) الغرض جذبات و رویہ مجموعی تاثر سے قبل کے ہیں جن سے نہ گذر کر شعر قاری کے ذہن کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ان تمام مباحث کے بعد کیا شمس الرحمٰن فاروقی اب بھی اپنے اس قول پر قائم ہیں کہ جذبات کی چیز کا ادب سے بنیادی تعلق نہیں ہے ؟"

(۲)

سید جابر علی نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ تخلیقی ادب میں ہمیشہ جذبہ ایک معنی میں ذاتی ہوتا ہی ہے۔ اس لئے میں نے جو ادب کے لئے "شخصی جذبات" کو غیر ... سمجھا، اس سے کیا مراد ہے ؟ تو جواباً عرض ہے کہ میں نے شخصی جذبات کا رشتہ ادیب کی ذاتیت پہ مرکوز خودی (SELF CENTRED EGO) سے نہ جوڑ کر اس کی تعمیری خودی (CREATIVE SELF) سے ضرور جوڑا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی میرا اشارہ ادیب کے ان قسم کے جذبوں کی طرف ہے جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر الفاظ کے جذباتی استعمال (EMOTIVE USE) کے حامل بن جاتے ہیں کیونکہ شخصی جذبات کے بحر بے کنار میں ادیب نہ ڈوب جائے تو اس کی تخلیق قاری کے جذبات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی۔ ریاضیات کے ریسرچ میں بھی تخلیقی جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ لیکن ریاضیات کو اس لئے ادب کے ذیل میں شامل نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اسی چیز کا فقدان ہے جسے میں "شخصی جذبات" کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔ ادیب کے شخصی جذبات شخصی ہونے کے باوجود

وسعت و پہنائی کے لحاظ سے اجتماعی بھی ہیں جس کی وجہ سے ادبی تخلیق زمان و مکان کے تمام حدود سے بلند تر ہو جاتی ہے۔ سید جابر علی کا کہنا ہے کہ اگر ہم سیاسیات، معاشیات وغیرہ کو ادب میں شامل نہ کریں، تو ادب کا دائرہ محدود ہو کے رہ جائے گا۔ میرے خیال میں ادب کو سائنس، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، انسانیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان علوم و فنون کا اثر براہ راست ہماری زندگی پر اور بالواسطہ ادب پر پڑنا فطری امر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان علوم و فنون کو ادب کے زمرے میں شامل کر لیا جائے گبن اور کارلائل کی کتابیں تواریخی اور سوانحی کارنامے ہونے کے باوجود مصنف کے "شخصی جذبات" کی حامل ہیں اور اسی لئے ان کو بجا طور پر ادب کے دائرے میں سمجھا جاتا ہے۔ لین پول اور اسمتھ کی تاریخیں "شخصی جذبات" سے عاری ہیں اور ان کو ادب پارہ کوئی نہیں سمجھتا۔ اقبال نے حالانکہ فلسفہ سے استفادہ کیا ہے، لیکن ان کی شاعری محض فلسفہ نہیں ہے بلکہ ان کے شخصی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ اگر وہ محض فلسفہ ہوتی تو شاید زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکتی۔ میں نے اپنے مضمون "نظم، نثر اور شعر" میں اپنے اس نظریے کی وضاحت کی ہے۔

(۳)

اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ادب میں "معنی" کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو "جذبات" کو ہوا ہے۔ ابن خلدون تو معنی کو بہت ہی غیر اہم تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں "انشا پردازی کا ہنر نظم میں ہو یا نثر میں محض الفاظ میں ہے معانی میں ہرگز نہیں۔ معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں اور اصل الفاظ ہیں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں۔ پس ان کے لئے کسی ہنر کے اکتساب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ان معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا جائے" حالی ابن خلدون سے ایک حد تک متفق بھی ہیں اور ایک حد تک متفق نہیں بھی۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں فرماتے ہیں:-

"ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے، اس قدر معنی پر نہیں۔ معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں، اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کئے جائیں گے ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابل تحسین ہو سکتا ہے۔ لیکن معانی سے یہ سمجھ کر کہ وہ ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں، قطع نظر کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا" لیکن اس سلسلے میں وشوناتھ کویراج کی رائے بہت ہی معتدل ہے جسے امتداد زمانہ کے باوجود آج بھی قابل قبول تصور کیا جا سکتا ہے۔ "ساہتیہ درپن" میں فرماتے ہیں۔

"काव्यसय शब्दा र्थौ शरीरम रसादिश्चात्मा
गुणाः शौर्यादिवत दोषाः काणत्वादिवत
रीतयोऽवयव संस्थान विशेषवत
अलंकाराः
कटक कुण्डलादिवत"

(صفحہ ۱۳، لاہور ایڈیشن)

یعنی "(شاعری کو اگر ایک نازنین تصور کیا جائے) تو الفاظ اور معنی دونوں اس کا جسم ہیں اور جذبات اس کی روح۔ شعری خوبیاں اس کی سیرت کی طرح ہیں تو فنی خامیاں ایسی ہیں جیسے اس کی ایک آنکھ نہ ہو۔ طرز نگارش کی حیثیت ایسی ہے جیسے سڈول اعضا اپنی اپنی جگہ پر صحیح و سالم موجود ہوں اور تشبیہات و استعارات وغیرہ کی حیثیت ایسی ہے جیسے کان کا بالا اور ہاتھ کا کنگن"

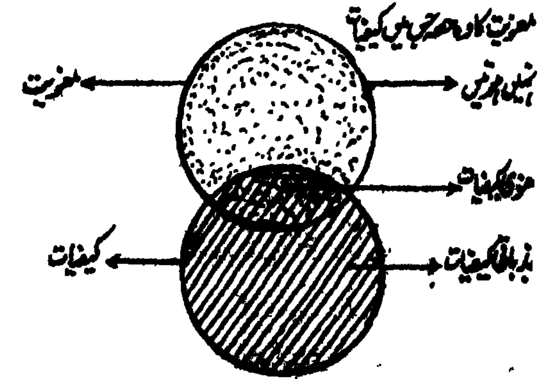
(۴)

یہ ضرور ہے کہ دور جدید کے نقادوں نے "معانی" کے معانی کو کافی وسعت دی ہے، لیکن پھر بھی وشوناتھ کویراج کے قول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کولرج نے جس وقت فرمایا تھا کہ الفاظ پودوں کی طرح اگتے اور بڑھتے ہیں، تو ان کا مقصد یہ تھا کہ ماحول کے موثرات سے وقت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معانی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ امرسن نے "NATURE" میں فرمایا ہے کہ (۱) الفاظ فطری واقعات کے نشانات ہیں (۲) خاص فطری واقعات خاص روحانی واقعات کی علامتیں ہیں (۳) فطرت روحانیت کی علامت ہے۔ یہاں امرسن کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح انسان کے چاروں طرف ایک خارجی کائنات موجود ہے، اسی طرح اس کے اندر ایک داخلی کائنات موجود ہے جو گویا خارجی کائنات کا عکس ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی خارجی واقعہ یا کسی خارجی علت سے وابستہ کوئی

لفظ و لمز کے متعلقہ مقامات (ASSOC IATEDARERS) کے ردعمل کے ذریعہ مختلف حسیات سے وابستہ ادراک کے اجتماع سے فہم (UNDERSTANDING) میں تبدیل ہو جاتا ہے تو یہی اس لفظ کا معنی ہوتا ہے جسے داخلی (یا روحانی) واقعہ یا علت کہا جا سکتا ہے مختلف معانی کو گرفت میں لانے کی وجہ سے ذہن میں ایک طرح کی قوت پیدا ہوتی ہے جسے قوت متخیلہ (POWER OF IMAGINATION) کہا جاتا ہے۔ چونکہ بقول امرسن تخیل کی صفت جمود نہیں بلکہ روانی ہے، اس لئے معانی کو بھی متحرک شے قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی خاص لفظ پڑھتے وقت قاری کا ذہن سوچنے لگتا ہے کہ اس سے قبل اسے اس لفظ سے کن کن موقعوں پر واسطہ پڑا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحت الشعور اور لاشعور کے بہت سے تجربات اس کے ذہن میں ڈوبنے اور ابھرنے لگتے ہیں جو اس لفظ کے معنی کو متحرک کرتے ہیں۔

میرے نزدیک، کیفیات اس خاص قسم کے تجربات سے وابستہ ذہنی ردعمل کا نام ہے جو آگے چل کر جمالیاتی نشاط پیدا کرنے کے لئے ذمہ دار ہے۔

ظاہر ہے کہ کیفیات کا تعلق جذبات سے بہت گہرا ہے۔ کیونکہ اگر ان سے جذبات وابستہ نہ ہوں تو آگے چل کر یہ جمالیاتی نشاط پیدا نہیں کر سکتیں۔ کیفیات کو میں دو حصوں میں منقسم کرتا ہوں (۱) معنوی کیفیات (۲) جذباتی کیفیات۔ معنوی کیفیات، معنویت کے وہ حصے ہیں جن سے قاری کے جذبات ملے ہوتے ہیں جبکہ جذباتی کیفیات خالص جذباتی تجربات (EMITIONAL EXPERIENCES) سے مرکب ہیں اور ان میں معنویت کا عنصر نہیں ہوتا۔ معنویت کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جس میں کیفیات نہیں ہوتیں۔ ذیل کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔



معنوی کیفیات کی طرح جذباتی کیفیات بھی متحرک شے ہیں یہ دونوں طرح کی کیفیات کبھی کبھی ایک دوسرے سے گھلی ملی رہتی ہیں لیکن ہمیشہ نہیں رہتیں لیلاوتی کی منظوم ریاضی کو لیجئے۔ اسے پڑھتے وقت ذہن میں کچھ نہ کچھ کیفیت پیدا ہوتی ہی ہے لیکن اس میں مجموعی طور پر جذباتی کیفیات کی کمی ہونے کی وجہ سے اسے شعر کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جذباتی کیفیات کے متحرک اشیاء ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ یہ ایک حد تک قاری کے MOOD پر بھی منحصر ہوتی ہیں اور MOOD کے بدلنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً میں نے جب کسی آزردہ دل کے پاس اپنا یہ شعر پڑھا۔

اک سہارا ملا ہے غم کا ہمیں
ورنہ دنیا میں کون کس کا ہے

تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن کسی دوسرے وقت وہی شعر پڑھا تو وہ شخص محظوظ تو ہوا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے MOOD کے ساتھ ساتھ جذباتی کیفیات بھی متحرک اشیاء کی شکل اختیار کرتی رہتی ہیں۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ شعر سے محظوظ ہونے اور شعر کو سمجھنے کے عمل کو دو مختلف چیزیں نہیں، بلکہ ایک ہی شے تصور کرتے ہیں چنانچہ FRONTIERS OF CRITICISM (۱۹۵۷ء) میں فرماتے ہیں کہ "یہ ضرور ہے کہ ہم جب تک شعر کو نہ سمجھ لیں تو اس سے اچھی طرح محظوظ نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ جب تک شعر سے محظوظ نہ ہوں، تب تک ہم شعر کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔" ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کم از کم اچھی شاعری کے لئے اس سے محظوظ ہونے اور اس کو سمجھنے کا عمل ایک دوسرے کا معاون ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں عمل ایک شے ہوں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا یہ کہنا کہ "میں محظوظ ہونے اور سمجھنے کو دو علیحدہ عمل (یعنی ایک کو جذباتی اور دوسرے کو عقلی) تصور نہیں کرتا" جدید علم النفس کے نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں واقعی انسانی ذہن کے دو مختلف رد عمل ہیں۔ یاد رہے بات ہے کہ اچھے شعر میں ان دونوں کا رشتہ بہت گہرا ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں رچارڈس کی CONTEXT THEORY OF MEANING کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو درج ذیل ہے۔

(۱) الفاظ ایک دوسرے کو زندگی بخشتے ہیں (۲) شاعری، ڈرامہ یا کہانی کا معانی اس کے اجمال (SUMMARY) سے ظاہر نہیں ہوتا (۳) شاعر اپنا معنی انکشاف کرتا ہے۔ (۴) قاری بھی شاعر کی طرح انکشاف کے طریقے پر قیاس آرائی کے ذریعہ اپنے طور پر اس کے معنی نکالتا ہے (۵) استعارہ کی معنویت ایسی معنویت نہیں ہوتی جو پہلے سے بیان کی گئی ہو بلکہ ایک ایسی نئی چیز ہوتی ہے جس سے تخیل خود کو آگے دھکیل کر ایک نئے پیدا ان میں قدم رکھتا ہے۔

یہاں آئی۔ اے۔ اچارڈس نے معنی کا رشتہ جذبات سے نہ جوڑ کر بجا طور پر تخیل (IMAGINATION) کے ساتھ جوڑا ہے۔

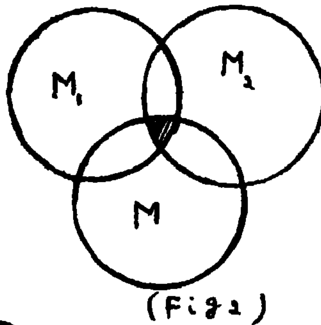
امپسن اچارڈس کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ "شعر کے الفاظ سے وابستہ جذبات معنی و مطلب (SENSE) کے تابع نہیں ہوتے"۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ صرف "معنوی کیفیات" میں جذبات معنی و مطلب کے تابع ہوتے ہیں، ورنہ آگے چل کر ذہن قاری میں بعض ایسے مجرد جذبات ضرور پیدا ہوتے ہیں جو ہر طرح کی معنویت سے آزاد ہو کر صرف جذباتی کیفیات میں اضافہ کرتے ہیں۔

ٹی۔ آر۔ ہن نے ریاضی کے طریقۂ اظہار کو اپنا کر اپنی تصنیف (THE APPLE AND THE SPECTROSCOPE) میں معنی کا جو معنی درج کیا ہے وہ یہ ہے۔

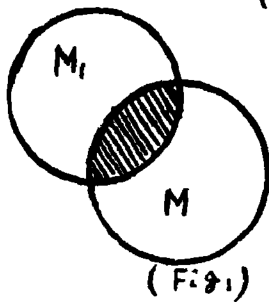
ایک شعر (یا نظم) فرض کیجئے N الفاظ پر مشتمل ہے اور $W_1, W_2, \ldots\ldots\ldots W_N$ اس شعر کے الفاظ ہیں۔ ہم جس قدر آگے شعر پڑھتے جائیں گے، کوئی خاص لفظ کا معنی اسی قدر واضح ہوتا جائے گا انیسویں الفاظ کے مطالعہ کے بعد چوتھے لفظ کا جو معنی نکلا ہے (۱۹) M_4 کے ذریعہ ظاہر کیا جائے۔ اسی طرح S الفاظ پڑھنے کے بعد RTH لفظ کا معنی $M_r(S)$ ہو۔ لہٰذا $M_r(S)$ ، $W_1, W_2, \ldots\ldots\ldots W_S$ ان تمام الفاظ پر منحصر ہے۔ اس لئے

$$M_r(S) = M_r(W_1, W_2, W_3, \ldots\ldots\ldots W_S)$$

S جیسے بڑھتے بڑھتے N تک پہنچتا ہے $M_r(S)$، M_r تک پہنچتا ہے جو اس لفظ کا اصل معنی ہے۔ اسی طرح تمام الفاظ کے معنوں سے ذہن قاری میں جو ایک مجموعی معنی M یعنی $(M_1, M_2 \ldots M_N)$ $M = M$ ہوتا ہے، وہی اس شعر کا معنی ہوتا ہے۔



(Fig 2)



(Fig 1)

M شاعر کا اپنا معنی ہے۔ کسی ایک قاری نے جو مطلب نکالا ہے، اسے M_1 کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ M کا کچھ حصہ M_1 کی گرفت سے باہر ہے۔ اسی طرح M_1 کا کچھ حصہ ایسا ہے جو شاعر کے ذہن میں کبھی نہیں تھا۔ لہٰذا دونوں کا وہ مشترکہ حصہ جیسے (Fig 1 میں) لکیروں کے ذریعہ دکھایا گیا ہے اس کی اس خاص قاری کے ذہن میں ترسیل ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعر کے علاوہ دو قارئین ہوں تو ان تینوں کے مشترکہ حصے کو Fig 2 میں SHADED لکیروں کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ ان دونوں قارئین کے ذہن میں اسی حصے کی ترسیل ہوتی ہے۔ اسی طرح بہت سے قارئین ہوں تو ان سب کے ذہن نے جو معانی اخذ کئے ہیں، ان کا مشترکہ حصہ وہ حصہ ہے جس کی ترسیل ہوتی ہے۔

میری رائے میں معانی کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے کہ ہم انہیں چند دائرے کھینچ کے دکھا دیں۔ کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ ذہن قاری میں شعر کا معنی بھی بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً کسی لمحہ اس کے ذہن میں کوئی ایک معنی پیدا ہوتا ہے تو دوسرے لمحہ کچھ اور معنی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ذہن قاری میں معانی NONENUMERABLE INFINITESETS کی شکل اختیار

کرتے ہیں۔ اس لئے ریاضی کی SET THEORY کی مدد کے بغیر ترسیل کا کمل تصور ناممکن ہے۔ بہت سے نقطوں (یہ نقطے کسی بھی شے کی نمائندگی کر سکتے ہیں) کے اجتماع کو SET کہا جاتا ہے۔ بہت سے SETS کے مشترکہ (COMMON) نقطوں سے جو SET بنتا ہے اسے ان تمام SETS کا INTERSECTION کہا جاتا ہے۔ ایسے نقطے جو کسی بھی SET سے یا کئی SETS کے مشترکہ حصوں سے متعلق ہوں، آپس میں مل کر جو SET بناتے ہیں، اسے ان تمام SETS کا UNION کہا جاتا ہے۔ کسی قاری کے ذہن میں جو لا محدود تعداد کے معانی پیدا ہوتے ہیں، ان کا UNION ہی، اس قاری کے لئے اس نظم کا مجموعی معنی ہوتا ہے۔ اسی طرح ان تمام معانی کا INTERSECTION ہی اس قاری کے لئے اس نظم کا مفہوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ جامد حصہ ہے جس کے ارد گرد ذہن قاری کے تمام معانی متحرک رہتے ہیں۔ مگر یہ INTERSECTION خالی (NULLSET) ہو، تو اس خاص قاری کے لئے اس نظم کا کوئی مفہوم نہیں ہوگا اور ایسی شاعری اس کے لئے بے معنی یا مہمل شاعری ہوگی۔ ذہن قاری میں مفہوم کے پیدا ہونے یا نہ ہونے پر ایک ہی نظم بعض قارئین کو بامعنی بھی ہو سکتی ہے تو بعض دیگر قارئین کی نظر میں مہمل بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ مفہوم اور معنی میں جزو اور کل کا رشتہ ہے۔ لیکن مفہوم ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر معنی بے معنی ہو جاتا ہے۔

ذہن شاعر کے معانی اور مختلف قارئین کے ذہن کے معانی کا UNION ہی اس نظم کا کمل معنی کہلا سکتا ہے۔ مگر ان سب کا INTERSECTION خالی SET نہ ہو، تو یہی حصہ نظم کا وہ مفہوم ہے جس کی سب کے ذہن میں ترسیل ہوتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جس وقت FRONTIER OF CRITICISM میں کہتے ہیں کہ "پوری نظم کے معانی کسی بھی تشریح سے ختم نہیں ہوتا، کیونکہ معنی اسے کہتے ہیں جو مختلف باحس قارئین کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے" تو وہ "پوری نظم کے معنی" سے "نظم کا کمل معنی" مراد لیتے ہیں جو دراصل مختلف قارئین کے ذہن میں پیدا شدہ مختلف معانی کا UNION ہے۔

(۵)

کیفیات کے ابلاغ میں "جذبات کی اضافی فراوانی" سے میری مراد کیا ہے اسے نہ شمس الرحمٰن فاروقی سمجھ سکے ہیں نہ سید جابر علی۔ اس لئے اس کی وضاحت یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کیفیات دو قسم کی ہیں (۱) جذباتی کیفیات (۲) معنوی کیفیات۔ جذباتی کیفیات تو خالص جذباتی تجربات سے معرض رہتی ہیں۔ معنوی کیفیات میں عقلی عناصر کے علاوہ جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ ان دونوں طرح کی کیفیات میں مجموعی طور پر اگر جذبات کا عنصر عقلی عناصر کے مقابلہ میں زیادہ ہو، تو اسے جذبات کی اضافی فراوانی (RELATIVE EXCESS OF EMOTION) کہا جائے گا۔ لہٰذا اگر شاعر کے ماقبل شعور (PRECONSCIOUS) سے لے کر قاری کے رویہ (ATTITUDE) تک تمام مدارج میں جذبات کی اضافی فراوانی ہو گی، تو اسے کیفیات کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی کی ترکیب سے ظاہر کیا جا سکے گا۔ میرے نزدیک یہی شے شعر کو شعر کا لقب عطا کرنے کے لئے از حد ضروری ہے۔ چونکہ مختلف اچھے اشعار میں دیکھا گیا ہے کہ جذبات کی مقدار سب میں برابر نہیں ہوتی، اس لئے شعر کے لئے جذبات کی کسی ABSOLUTE مقدار کو ضروری تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جذبات کی اضافی فراوانی کو مد نظر رکھا جائے تو اس اصول کو عملی تنقید میں بھی بآسانی مستعمل کیا جا سکتا ہے۔ عملی تنقید میں اس کی حیثیت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ داخلی اس لئے کہ یہ چیز شاعر کے ساتھ کسی ایک قاری کے رشتے پر منحصر ہے جس کا تعلق اس خاص قاری کی ذہنی ساخت سے بھی ہے۔ خارجی اس لئے کہ مختلف قارئین کی مختلف ذہنی ساخت کے باوجود تقریباً ہر باحس قاری کے ذہن میں یکساں (برابر نہیں) کیفیات کا پیدا ہونا فطری ہے۔ چونکہ ایک باحس قاری یا ناقد اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے اکثر قارئین کی ذہنی کیفیات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس لئے اس کی ناقدانہ نظر میں اگر کیفیات کے ابلاغ کے ہر مقام پر دیگر عقلی عناصر کے مقابلہ میں جذبات کی زیادتی کا احساس ہو، تو اس ادب پارے کو "شعر" کا لقب دیا جائے گا لیکن شعروں کی قدروں کا تعین ایک علیحدہ مسئلہ ہے جو اور بھی بہت سی باتوں پر منحصر ہے۔ تفصیلی بحث درج ذیل ہے۔

(۶)

اچھی پیمانے کا شعر وہ ہے جو اپنے اندر پائیدار اور زندہ رہنے کی قوت پنہاں (POTENTIALITY) رکھتا ہو۔ اس کے لئے [illegible] اس میں [illegible] جس سے ہر جگہ اور ہر زمانے کا

ری تازگی محسوس کرے۔ شعر میں نئی بات ضرور کہی گئی ہو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نئی بات شعر کو اعلیٰ نہیں بناتی۔ یہ ضرور ہے کہ تشبیہات و استعارات کی ندرت ہمیں جمالیاتی نشاط عطا کرتی ہے، لیکن کبھی کبھی سیدھا سادہ شعر بھی بہت موثر ہوتا ہے اور اسے پائداری حاصل ہوتی ہے۔ میر کے بہت سے اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شعر قاری کے ذہن میں کس طرح جمالیاتی نشاط عطا کرتا ہے، اس پر غور کیا جائے تو اس مسئلے کا بہترین حل نکل سکتا ہے۔ تخلیق شعر کے دوران ذہن شاعر میں ہم آہنگ اور غیر ہم آہنگ دونوں طرح کے جذباتی ہیجانات پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر کا شعری شعور اس میں سے آہنگ کا انتخاب کر کے غیر آہنگ ہیجانات کو کسی اور وقت کے لئے تحت الشعور اور لاشعور میں محفوظ رکھ لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ ممکن ہے جذباتی ہیجانات کی موسیقی میں ابتدا ہم آہنگ نہ ہو، لیکن بعد میں چل کر باقاعدہ آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعر پڑھتے وقت اس میں آہنگ کہاں سے محسوس ہوتا؟ یہاں ...رسن کا یہ مفروضہ یاد آ رہا ہے کہ فطری واقعات روحانی واقعات کی علامتیں ہیں۔ جے مارلین کا کہنا ہے کہ شعری تخلیق کے دوران شاعر کے ذہن میں جو مرحلے گزرتے ہیں قارئین کے ذہن میں اس کے الٹے طور پر مراحل گزرتے ہیں۔ اس قاری جس وقت ذکاوت کی مدد سے شاعر کی ماورائی اصلیت تک پہنچتا ہے اس کے ذہن میں بھی مذکورۂ بالا آہنگ منتقل ہوتا ہے جو کیفیات کے آہنگ میں تبدیل ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ معنوی کیفیات کم ہوتے ہوتے جذباتی کیفیات میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ایک ایسا مقام آتا ہے جب صرف جذباتی کیفیات کی موجیں رہ جاتی ہیں جو لاشعور اور تحت الشعور کی گہرائیوں سے شعور کی سطح تک ...تی اور ابھرتی رہتی ہیں۔ میری رائے میں جذباتی کیفیات کی جو موجیں ...ا ہیں، ان میں گہرائی وسعت اور سالمیت تینوں صفتیں موجود ہوتی ہیں ...لئے شاعری کی قدروں کے تعین کے لئے ذیل کے تین اصولوں کو مدنظر رکھا جا سکتا ہے۔

(۱) جذباتی کیفیات کی موجیں کتنی گہری ہیں یعنی یہ موجیں تحت الشعور اور لاشعور کی کتنی گہرائی سے قاری کے تجربات کو ابھار لانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

(۲) یہ موجیں کتنی وسیع ہیں۔ مطلب یہ کہ زندگی کے کتنے وسیع تجربات ان کے احاطے میں آ گئے ہیں۔

(۳) جذباتی کیفیات کی مختلف لہروں کے باہمی امتزاج سے انتشار کے بجائے سالم کلیت پیدا ہونا چاہیئے۔

میرے خیال میں، یہ تینوں اصول ہر طرح کے فن لطیف مثلاً آرٹ موسیقی، رقص وغیرہ کی قدروں کے تعین کے لئے بھی مستعمل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان فنون لطیفہ سے لطف اندوز ہوتے وقت ایک ایسا مرحلہ ضرور آتا ہے جس میں صرف جذباتی کیفیات کی موجیں رہ جاتی ہیں اور ان موجوں کی گہرائی وسعت اور سالمیت تینوں صفتیں جمالیاتی نشاط عطا کرنے کے لئے ذمہ دار ہیں۔

اب آیئے، مندرجۂ بالا اصول کے نقطۂ نظر سے شعر میں آہنگ کی ضرورت پر غور و خوض کریں۔ انسان کا اجتماعی لاشعور ہمیشہ "آہنگ" سے متاثر ہوتا ہے، کیونکہ اجتماعی لاشعور کا تعلق نسلی یادداشت سے ہوتا ہے جو نامعلوم مدت سے GENES کے ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل تک چلی آ رہی ہے۔ چونکہ آہنگ قارئین کے اجتماعی لاشعور کی گہرائیوں سے تجربات کو متحرک کرتا ہے، اس لئے شرط (۱) کی بہترین تشفی کے لئے میرے خیال میں شعر میں آہنگ کا وجود بہت ضروری ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے موضوع سخن کی مناسبت سے کس طرح کے آہنگ کی کس طرح کی کارفرمائی ہوتی ہے، اس کا مطالعہ کئے بغیر کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔ آہنگ کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ یہ ہمارے ذہن کو تنومیت (HYPNOTISM) کی طرف لے جاتا ہے۔ تنومیت کا مقصد وقتی طور پر شعوری کارفرمائیوں کو سلا کر تحت الشعور اور لاشعور کی گہرائیوں سے تجربات کو ابھارنا ہے، حالانکہ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے تجربات کی وسعت کے لئے چوکنے پن (AWARENESS) کی بھی ضرورت ہے جو ایک شعوری ردعمل ہے، لیکن تحت شعوری کے ردعمل کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ موجوں کی وسعت و گہرائی کی طرح اچھی شاعری کے لئے یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

ایک ایسا شعر جس میں کچھ نیا پن ہو۔ اس لئے عموماً متاثر کرتا ہے کہ یہ ہمارے بہت سے لاشعور کے تجربات (جنہیں ہم لوگوں نے بھلا دیا ہو) کو متحرک کر کے شعور کی سطح تک ابھارنے کی اہلیت رکھتا۔ اگر قارئین کا جذباتی کیفیات زندگی کے وسیع تجربات سے وابستہ ہوں، تو اس میں ہم آہنگی

کو زندگی سے قربت محسوس ہوگی۔ جن تشبیہات، استعارات اور ذہنی پیکر میں مختلف جذباتی کیفیات آپس میں مل کر سالم کلیت پیدا کرتی ہیں، وہ بہترین قسم کے تشبیہات، استعارات اور ذہنی پیکر ہوتے ہیں۔ جہاں ان سب کے امتزاج سے سالم کلیت پیدا نہیں ہوتی، وہاں ان تشبیہات، استعارات اور ذہنی پیکر کو کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے برعکس شعر بہت ہی سادہ بھی ہو تو جذباتی کیفیات کی لہریں اپنی گہرائی و وسعت کے علاوہ سالم کلیت بھی اختیار کرسکتی ہیں۔ اس وقت اسے اعلیٰ پیمانے کا شعر کہا جاسکتا ہے۔

سنتایانا نے THE LIBERATION OF THE SELF میں کہا ہے۔

"حسن کا کام ہے خودی کے مختلف ہیجانات کو آمیز (SYNTHESIZE) کر کے ایک مرکز پہ لانا تاکہ اس پر ہیجان مملکت میں سکون آجائے۔ اس وقتی ہم آہنگی سے حسن کا لطف اندوز اور اس کی تصرفانہ معنویت وابستہ ہے۔ اس ہم آہنگی کو حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو تمام ہم آہنگ عناصر کو ایک ساتھ ملانا ہے اور دوسرا ایسے عناصر کو برطرف کرنا ہے جو آپس میں نہ ملتے ہوں .... اندراج (INCLUSION) کا طریقہ ہمیں حسن عطا کرتا ہے جب کہ اخراج (EXCLUSION) کا طریقہ ہمیں ارتفاع (SUBLIMENR) عطا کرتا ہے۔"

آئی۔ اے۔ رچارڈس ہیجانات کی ہم آہنگی اور ہم وزنی (EQUILIBRIUM) کو SYNAESTHESIS کا نام دے کر اسے حسن کے لئے بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ SYNAESTHESIS کی ہم آہنگی (HARMONIZATION) کی وجہ سے ذہن کی دو حالتیں ظاہر نہیں کرتی بلکہ ایک ہی حالت ظاہر کرتی ہے۔ آئی۔ اے۔ رچارڈس بھی کہتے ہیں کہ (EXCLUSION) اور ELIMINATION اور SYNTHESIS یا کے ذریعہ ہیجانات منظم (ORGANISED) ہوسکتے ہیں۔

سنتایانا اور رچارڈس نے جس طرح ہیجانات کی ہم آہنگی کے لئے INCLUSION اور EXCLUSION کا نظریہ پیش کیا ہے، اسی طرح میں نے نثری شاعری میں آہنگ کے انتخاب میں بھی ELIMINATION کا نظریہ پیش کیا ہے۔ آئی۔ اے۔ رچارڈس نے SYNTHESIS کے

صرف ہیجانات کی تنظیم پر زور دیا ہے جب کہ میں پوری جذباتی کیفیات کی تنظیم ضروری سمجھتا ہوں۔

میرا نظریۂ اضافیات صرف جذباتی شدت (EMOTIONAL INTENSITY) پر قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ "گراں قدر جذباتی تجربات" کا علم بردار ہے۔ رچارڈز نے الیٹ اور سنتایانا دونوں پر اسی لئے تنقید کی تھی کہ ان لوگوں نے جذبات کی ان دونوں نوعیتوں کے درمیان امتیاز قائم نہیں کیا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی "ترکیبات" پر اگر ایسی نظم لکھیں جس میں صرف جذباتی شدت ہو تو اسے اچھی نظم نہیں کہا جائے گا۔ اگر اس نظم میں گراں قدر جذباتی تجربات ہوں، تو یقیناً یہ ایک لازوال تخلیق کا درجہ حاصل کرسکتی ہے۔

(۷)

شاعری کے لئے آہنگ کی ضرورت کے سلسلے میں پہلے ذکر کرچکا ہوں۔ جے مارسٹین کا کہنا ہے کہ شاعری کے لئے موسیقی (یعنی آہنگ) کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ کلاسیکل شاعری میں الفاظ کی خارجی موسیقی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اور جدید شاعری میں داخلی موسیقی (افکار اور ہیجانات کی موسیقی) پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ میرے خیال میں خارجی موسیقی اور داخلی موسیقی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی معاون ہیں۔ خارجی موسیقی کا تعلق صوت سے ہے اور CATHODE RAY OSCILLOGRAPH کے ذریعہ سائنسی طریقہ پر اس کے آہنگ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے جو عموماً بہت دلچسپ ثابت ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انگریزی STRESSED اور UNSTRESSED زبان ہے، جب کہ فارسی، سنسکرت، ہندی اور اردو طوالت اور تخفیف والی دونوں کی زبانیں ہیں۔ عام بول چال میں ہم طوالت پر زیادہ زور دیتے ہیں اور تخفیف پہ اتنا زور نہیں دیتے۔ انگریزی کی طرح STRESSED اور UNSTRESSED حروف کی ترتیب کی طرح اردو میں طوالت اور تخفیف کی ترتیب شعر کا خارجی آہنگ متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئی لاول نے انگریزی زبان پر تجربہ کر کے جو یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ نثر کا آہنگ طویل و پر پیچ ہوتا ہے جبکہ نظم کا آہنگ مختصر ہوتا ہے اور جلد ہی اپنی اصلی حالت کو لوٹ آتا ہے۔ تو وہ اردو زبان پر بھی لاگو ہوسکتا ہے۔ جہاں تک شعر کے داخلی اور خارجی آہنگ کے باہمی ربط و تعلق کا سوال ہے، یہ ذہن و شعور کے احساس کی بات ہے جس کا تعلق شاعر کے مخصوص حالات کے تجربات (EXPERIENCES) سے

...ہا ہے۔ چونکہ سائنسی طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ نثر میں بھی خاص قسم کا آہنگ
...تا ہے اس لئے (PROSE POEM) کو بھی "شاعری" کا لقب عطا کیا
...سکتا ہے بشرطیکہ اس میں داخلی آہنگ، بہ حیثیت مجموعی، موجود ہو اور دونوں طرح
...ہنگ کے اثر سے کیفیات کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی معرض وجود میں
...ہو۔ منثور شاعری سے متعلق ٹیگور نے بجا طور پر کہا تھا کہ "منثور شاعری کو ہر قدم پر
...محض نثر ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ اس کی تخلیق عموماً جتنی آسان سمجھی جاتی ہے
...اتنی آسان نہیں ہے۔ منثور شاعری کی تخلیق کے لئے بالغ مزاج اور چابک
...دست فن کار کی ضرورت ہے۔"

(۸)

شمس الرحمن فاروقی کا خیال ہے کہ شعر کی نحو بھی نثر کی طرح مثلاً اور
...ہونی چاہئے۔ اور شعر کو نثر کی طرح سادہ اور رواں ہونا چاہئے۔ یہاں وہ
...کی زبان کو نثر کی زبان سے قریب کرنا چاہتے ہیں۔ اس اثنا میں ان کا ایک
...بعنوان "نثر سے گذر" جس میں انہوں نے اپنے نظریات کی یوں وضاحت کی
...نظم میں ہر لفظ اسی جگہ رکھا گیا ہو جہاں قواعد کی رو سے اسے ہونا چاہئے۔"
...شبلی نے بھی "مقالات شبلی" میں کہا تھا کہ "ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی ہر منشا
...یہ ہے کہ کلام کے اجزاء کی جو اصل ترتیب ہے، وہ بحال خود قائم رہے مثلاً
...مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات، فعل حسب ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال
...تے ہیں، یہی ترتیب شعر میں باقی رہے۔" لیکن شبلی کو اس امر کا بھی احساس تھا کہ "...
...زیادہ شعر یا بہت سے بہت شعر و شعر میں تعقید یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔" میری رائے
...یہ کہ شاعر کے احساسات و تجربات اپنے اظہار کے لئے خود ہی زبان و بیان کا اسلوب
...ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اس کے لئے شاعر پر کسی طرح کی پابندی نافذ کرنا نامناسب
...کیونکہ پہلے سے اگر زبان و بیان کی یہ پابندی رکھ دی جائے، تو شاعر کے
...کی احساسات و جذبات مکمل طور پر ظاہر نہیں ہو سکیں گے۔ مثلاً غالب کے جن
تجربات نے ان سے یہ شعر کہلوایا:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

وہ زیادہ سلیس و سادہ "نثری" زبان کے استعمال سے ظاہر نہیں ہو
...تے۔ کیا غالب کو اس طرح کا نفیس مگر پیچیدہ شعر کہنے کا حق نہیں تھا؟

(۹)

آخر میں، تشبیہات، استعارات اور ذہنی پیکر سے متعلق اتنا
عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیزیں ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی کے لئے
ممد و معاون ضرور ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو اس امر کا واحد ذریعہ نہیں کہا جا
سکتا۔ الفاظ کے باہمی تلازمے سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسے اشعار
جو محض واردات قلبی کی عکاسی کرتے ہیں، اگر دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوں تو دل
پر ضرور اثر کرتے ہیں، مثلاً حسرت کا یہ شعر لیجئے۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

یہاں سیدھے سادے الفاظ میں نفسیات کے ایک انوکھے پہلو کی عکاسی
ہوئی ہے جس کی ندرت ہمارے لاشعور اور تحت الشعور کی گہرائیوں سے بہت سے
خوابیدہ تجربات کو ابھارتی ہے۔ ہم اس شعر کو اپنے دل کی آواز سمجھنے لگتے ہیں،
اور یہی اس شعر کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شعر میں نہ کوئی
تشبیہ ہے نہ کوئی استعارہ۔ جدید تنقید میں استعارہ کے لئے
VEHICLE اور TENOR ان دونوں چیزوں کو ضروری سمجھا جاتا
ہے VEHICLE استعارہ کا وہ حصہ ہے جو تقابل کا وزن سنبھالے ہوئے
ہو اور جس موضوع کی طرف یہ اشارہ کرتا ہے اسے TENOR کہا جاتا ہے —
VEHICLE کبھی کبھی علامتی معنویت بھی لئے ہوئے ہوتا ہے، لیکن حسرت کے
مندرجہ بالا شعر میں یہ دونوں عناصر نہیں ہیں، لہذا اس شعر میں کوئی استعارہ
نہیں ہے۔ ڈبلیو بی اسٹان فورڈ نے استعارہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ
"یہ ایک ایسی ترکیب (X) ہے جس میں کوئی شے (A) ایک ایسی عبارت میں
منتقل ہوتی ہے جو ایک دوسری شے (B) کی طرف اس طرح اشارہ کرتی ہے کہ
A اور B ان دونوں تصورات کے اجتماع سے X کے ذریعہ علامتی طور پر ایک
پیچیدہ خیال پیدا ہوتا ہے اور A اور B دونوں علامتی طور پر X میں مدغم ہونے
کے باوجود A اور B ان دونوں کی تصوراتی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔"
اسٹان فورڈ کی اس تعریف کے مطابق بھی مندرجہ بالا شعر میں کوئی استعارہ
نہیں ہے۔

جدید تنقید میں لفظ "ذہنی پیکر" کے معنی کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ اسے
ہر ذہنی انعکاس کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن شاعری میں اس لفظ کو اگر
اس قدر وسیع معنی میں استعمال کیا جائے، تو شاعرانہ اور غیر شاعرانہ ذہنی پیکر میں
کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ اس لئے آج کل شعراء (بقیہ صفحہ [illegible])

علیم اختر مظفر نگری

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم — چند یادیں

میں مزاجاً بہت ہی عزلت گزیں اور گوشہ نشیں واقع ہوا ہوں شعر و شاعری کے سلسلہ میں بھی کنوسنگ کا فن مجھے نہیں آتا۔ مشاعروں میں شرکت بھی اتفاقی امر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے ادیبوں اور شعرا میں بہت کم لوگ مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ بعض ادیبوں کے متعلق میں ملاقات سے پہلے ہی ایک نظریہ قائم کر لیتا ہوں کہ یہ شخص کچھ مغرور سا ہوگا اس لئے اس سے ملاقات لاحاصل۔ کچھ ایسا ہی نظریہ میں نے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کے متعلق قائم کر لیا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم اکثر دہلی تشریف لاتے تھے لیکن میں نے کبھی مرحوم سے ملنے کی کوشش نہیں کی اور جب ملاقات ہوئی تو میرے سارے مفروضات ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے اور یہ محسوس ہوا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی سیرت کا بڑا غلط اندازہ لگایا تھا۔ مجھے اپنی شکست پر انتہا سے زیادہ مسرت ہوئی اور دل نے کہا۔

"تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد"

ڈاکٹر صاحب اور میری ملاقات کی شاہراہ پر کارواں دو سال زیادہ نہیں گزرا۔ ایک سال سے بھی کم عرصہ تک مرحوم سے خط و کتابت کا شرف حاصل رہا۔ افسوس کہ یہ آفتاب علم غروب ہو کر تشنہ کامان ادب کو سوگوار چھوڑ گیا۔

مجھے ۱۶ ستمبر ۱۹۶۱ء کو بہ سلسلۂ "جشن بہاراں" مشاعرہ میں شرکت کے لئے ہوائی جہاز کے ذریعہ سری نگر جانے کا اتفاق ہوا۔ شب میں ایک غیر سرکاری مشاعرہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ مرحوم کی صدارت میں ہوا۔ اسٹیج پر ہی ڈاکٹر صاحب سے تعارف ہوا بڑے اخلاق اور محبت سے ملے۔ میری غزل سے بہت خوش ہو گئے۔ مشاعرہ ختم ہوا رات گئی

بات گئی۔ اگلے دن صبح نو بجے میں ایک صاحب سے ملنے چلا گیا قریب دو گھنٹے کے بعد واپس ہوا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنا منتظر پایا۔ میں اور علامہ انور صابری ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انور صابری صاحب نے بتایا کہ قریب ایک گھنٹہ سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ میں نے معذرت چاہی تو مسکرا کر فرمایا کوئی بات نہیں آپ کی عدم موجودگی میں آپ کے پاندان سے دل بہلاتا رہا ہوں۔ کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دوپہر کے کھانے پر اپنی ہمراہ تلسی باغ لے گئے اور بڑی پر تکلف دعوت کھلائی تین چار دن کے مختصر قیام میں زیادہ تر میرے ساتھ رہے اور بزرگانہ شفقتوں اور عنایتوں سے نوازتے رہے۔ سری نگر سے واپسی پر میں نے خیریت پرسی کا خط لکھا اور ایک جلد "نکہت گل" خدمت میں بھیجی یہیں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا اور مرحوم نے مرتے دم تک ہر پندرہ دن کے بعد اپنی خیریت لکھی اور میری خیر و عافیت پوچھی۔ ایک مرتبہ دہلی تشریف لائے اور غریب خانہ کو بھی عزت بخشی ما حضر تناول فرمایا۔ بچوں سے بڑی محبت اور شفقت سے ملے بالخصوص برخوردار عظیم اختر سلمہ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ یہ اس سال بی اے پاس کر لیں تو میرے پاس بھیج دیجئے کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے اور پھر وہیں سے ڈاکٹریٹ دلا دی جائے گی۔ لیکن "تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ" کے مصداق تھوڑے ہی عرصے کے بعد مرحوم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ میاں عظیم نے بی اے پاس کر لیا اور ملازم ہو گئے۔

[illegible] "شاعر" کی ضیافت طبع کے لئے چار خط مرحوم

ر ایک خط اپنا حاضر ہے۔

خط نمبر ۱

آلسی باغ سرینگر ۲۸-۹-۱۹۶۱ء

محب محترم زاد لطفکم

السلام علیکم۔ کارڈ پہلے مل گیا تھا اور کل شام "نکہت گل"
ہوئی۔ دونوں کے لئے شکر گزار ہوں۔ جناب شریف احمد صاحب
ہلے جانا چاہتے تھے میں نے کہا کہ میں اس سے پہلے لطف اندوز ہوں گا پھر آپ
ں گا

زو چار روز میں پھر عریضہ بحاضر خدمت فیض و راحت ہوگا یہ حرف
ہے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

۲

آلسی باغ سری نگر

-۱۹۶۱ء

محب محترم زاد لطفہ

کرم نامے نے سراپا سپاس کیا۔ نکہت گل اور خط کے پہنچنے کی اطلاع
ں والے پتہ پر دے چکا ہوں وہ کارڈ مل گیا ہوگا۔
شب شالامار، بڑی پاکیزہ نظم ہے۔ بخشی صاحب کی خدمت میں بھی
روانہ فرمادی ہے یا نہیں۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ آپ کے نئے
نب رنگ" پر چند لفظ لکھوں یہ آپ کی عنایت ہے اور میں اس کو اپنی قدر
ھتا ہوں۔ آج کل مصروفیت زیادہ ہے اور نیشنل کانفرنس کے سلسلے
آباد سے کئی اصحاب آرہے ہیں اور میرے یہاں قیام کریں گے اگر
ت نہ ہو اور ختم اکتوبر تک انتظار فرما سکتے ہوں تو مسودہ کی نقل
ذریعے میں حسب استعداد کوشش کروں گا۔
دلی سے اگر کوئی ادھر آرہے ہوں تو ان کے ذریعہ سے پان مرحمت
یہاں کے پان تو آپ دیکھ ہی گئے ہیں۔ مراسلت گھر کے پتہ پر
زادیر درج ہے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

خط نمبر ۳

آلسی باغ سری نگر

۷؍ اکتوبر ۱۹۶۱ء

محب محترم زید لطفکم

کرم نامے نے شاد کیا اگر وہ فریم بخشی صاحب کے لئے اب تک نہ نکلا
ہو تو میرے ایک عزیز محمد اکبر الدین صدیقی لیکچرار اردو جامعہ عثمانیہ یہاں
اورینٹل کانفرنس کے سلسلے میں آرہے ہیں میرے ہی یہاں ٹھہریں گے ان کے
ذریعے بھجوا دیجئے وہ آج کل میں دلی پہنچیں گے اور جگن ناتھ آزاد سے
ملیں گے میں نے آزاد صاحب کو لکھا ہے کہ آپ سے ملنے کے لئے بھی کہے۔ آپ ان
کے ذریعہ وہ فریم اور پان بھجوائیے۔ آپ جیسے پان کھاتے ہیں وہ آزاد صاحب
کو نہ مل سکیں گے اس لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔
گزشتہ کرم نامے میں آپ کی نظم تھی سراپا ایک مکمل شاہکار ہے اور ہر لفظ نگینے
کی طرح بیٹھا ہے۔ اگر اکبر الدین صاحب کے ذریعے سے بھجوائیں تو میں خود
لے جاکر آپ کی طرف سے بخشی صاحب کو دوں گا اور آپ کا ذکر خیر بھی کروں گا۔
آپ کی ذات میں مجھے جو خوبی (باوجود ریش بزرگ کے) نظر آئی اس
کا اظہار کبھی بالمشافہ ہی کروں گا۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

خط نمبر ۴

محب محترم السلام علیکم

کرم نامے نے شادکام کیا۔ بخشی صاحب تو جموں میں ہیں اور میں سری نگر
میں۔ وہ اوائل مئی میں یہاں آئیں گے اور ۲۸؍ اپریل تک ملاقات کا موقع
نہیں ہے۔
اگر فتح پوری مسلم ہائی اسکول کی جانب سے جناب غلام رسول رینز ڈویژنل
کمشنر ۵ پرتھوی راج روڈ سے ملاقات کی جائے اور ایک تحریر دی جائے
تو وہ اپنی سفارش کے ساتھ جموں روانہ کریں گے۔ مجھے فی الحال یہی ایک
عملی صورت نظر آتی ہے وہ فون پر جموں سے رابطہ پیدا کر سکتے ہیں۔
آپ کے صاحبزادگان سے مل کر خوشی ہوئی خدا انہیں با اقبال
بنائے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

افسوس کہ تلاش کے باوجود ۳، ۴ خط جو خالص علمی اور میری شاعری سے متعلق مرحوم نے وقتاً فوقتاً لکھے مل نہیں رہے۔ اخیر میں اپنا ایک خط پیش خدمت ہے۔

۲۴۶۳ رنگ محل فورڈ
گیٹ حسین خان دہلی

۳ اکتوبر ۱۹۶۱ء

محترم المقام زید مجدکم۔ ہدیہ سلام مسنون

گرامی نامہ نے عزت بخشی۔ گھر کے پتہ پر کارڈ مل گیا تھا جس کی رسید بھیج چکا ہوں۔ پیش لفظ کے لئے عجلت نہیں ہے۔ اکتوبر کے آخیر تک تو میں ہی مسودہ نقل کر پاؤں گا اس کے بعد انشاء اللہ نومبر کے اوائل میں آپ کی خدمت میں بھیج سکوں گا۔

"شالامار" اور "جشن بہاراں" دو حکومتوں کے انعام کی بات تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر تعلق اور جذبۂ شوق کارفرما نہ ہوتا تو کوئی بات نہ بنتی۔ غالباً جذبۂ شوق ہی تھا جس نے مجھے "شب شالامار" نظم کہنے پر اکسایا اور پھر تعلق خاطر نے مجبور کیا کہ اپنے اس حسین خواب کو تعبیر کی صورت میں کسی خوش رقم سے لکھا دوں اور بہت ہی خوبصورت سنہری فریم سے مزین کر کے اس کو "نگارِ چنستانِ وطن" کی خدمت میں پیش کروں جو آپ اپنا جواب ہے۔

محترمی! میں بہت ہی کم آمیز ہوں لیکن محبت اور شفقت کا بھوکا۔ سرینگر میں مجھے متاثر کرنے والی سب سے پہلی شخصیت جناب زوؔدر کی ہے کہ مجھ جیسے بے علم اور کم مایہ آدمی سے ملنے کے لئے بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ اگرچہ آپ کی ہمراہ عزت مآب بخشی غلام محمد صاحب سے بالکل آخری دن ملاقات ہوئی لیکن اس ملاقات میں موصوف کا حسن سلوک، قیام کے لئے بار بار اصرار حتیٰ کہ آخیر میں یہ جملہ کہ ہم ہوائی جہازوں کو گراتے تو نہیں لیکن واپس ضرور بلا لیتے ہیں ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جن کی یاد بھلائی جا سکے۔ مختصراً یہ کہ اس سفر میں دل پر دو نقش لے کر آیا ہوں ایک نقش ہے کسی علم دوست بزرگ شخصیت کی محبت اور شفقت کا۔ دوسرا نقش ہے حاکم وقت کے حسن سلوک کا۔ اسی حسن سلوک سے تحریک پیدا ہوئی کہ بخشی صاحب سے دوبارہ ملاقات کی جائے کیونکہ موصوف نئی دہلی میں تشریف فرما تھے اس لئے انزو صاحب سے ملاقات کے لئے عرض کیا۔

چنانچہ ۲۴ ستمبر کی صبح کو بخشی کی ایک حلیہ اور "شب شالامار" فریم شدہ لے کر حاضر ہوا۔ ملاقات اگرچہ بڑی عجلت اور رواداری میں ہوئی لیکن ان لمحات پر صدیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ مصافحہ ملایا۔ نظم کو دیکھ کر "اخاہ" کہا اور فرمایا کہ عجلت میں ہوا میٹنگ میں جا رہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے احساس ہے اس کے بعد پھر ہاتھ ملایا اور موٹر میں سوار ہو کر میٹنگ میں تشریف لے گئے۔

رنزو صاحب کو فون کیا تھا کہ شاید وہاں سے کوئی صاحب سرینگر جا رہے ہوں تو "تحفۂ درویش" ہر نمبر بھیج دوں مگر ان سے ملاقات نہ ہو سکی انشاء اللہ ایک دو دن میں ان کے دفتر سے ہی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی اور میں "سرخرو" ہو جاؤں گا۔ جواب سے گھر کے پتہ پر سرفراز فرمائیں۔

فقط والسلام

نیازمند..... علیم اختر مظفر نگری

بقیہ شعری تنقید کے چند بنیادی مسائل

عموماً فطری اشیاء کے چلتے پھرتے مناظر کو ذہن میں غیر منطقی اور غیر استدلالی طور پر کر کے اس میں نئی اور انوکھی کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں یا اپنے ماورائی تجربات کے اظہار کے لئے مادی اشیاء سے مماثلت کا رشتہ ڈھونڈ نکالتے ہیں مختلف اشیاء کی باہمی مطابقت و مماثلت (ANALOGY) کے ذریعہ ذہن میں تعلقات کی کڑیاں پیش کر کے وہ کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ اس کا اصول جدید شعراء نے فرانس کے فلسفی برگساں سے اخذ کیا ہے حسرت کے مذکورہ بالا شعر میں اس معنی میں ذہنی پیکر نہیں ہے کہ اس میں کسی مادی شے کے ساتھ مطابقت و مماثلت کے ذریعہ تعلقات کی کڑیاں پیش نہیں کی گئی ہیں۔

میں شاعری میں تشبیہات، استعارات اور ذہنی پیکر کی افادیت کا قائل ضرور ہوں، لیکن بعض احباب کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ ان چیزوں کے بغیر شعر شعر نہیں ہوتا۔ میں دشرتھ ناتھ کو برلیکھ کے اس قول سے سو فی صدی متفق ہوں کہ "شاعری کو اگر ایک خوبصورت نازنین تصور کیا جائے تو الفاظ و معنی و رنگ اس کا جسم ہیں اور جذبات اس کی روح ...... تشبیہات، استعارات وغیرہ کی حیثیت ایسی ہے جیسے کان کا بالا اور ہاتھ کا کنگن" ●●

مناظر عاشق ہرگانوی

ژاں پال سارتر سے ایک انٹرویو

انسان کے نفسیاتی اشتعال میں فرانسیسی مصنف ہمیشہ ممتاز رہے ہیں لیکن والیتر کے بعد یہ رول ساڑھے پانچ برس کے چھوٹے سے قد (5' 4") کے سابق پروفیسر ژاں پال سارتر (Zean Paul Sartre) نے ادا کیا ہے۔ انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے درمیان فرانسیسی جمہوریت کے ادبا کے تجزیے سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ البیر کاموں اور فرانسوآ مار یاک (Francois Mauriac) کے ساتھ انہوں نے اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کی اور جیل گئے۔ مگر ادیب ہیرو کا مقام پایا۔

بعد میں کمیونسٹ سارتر نے کیتھولک ماریاک اور خدا پرست کاموں کے خیالات سے غیر متفق ہو کر اپنا راستہ الگ اختیار کیا اور جرمن اقتدار ختم ہونے پر سیاسی لیڈر اور نئی پارٹیوں کے بانی کی حیثیت سے مصنف کا نیا رول اپنایا۔

جب امریکی رسم و رواج فرانس اور یورپ میں پھیل رہے تھے تب لوگ سارتر کی نصیحت اور ان کے نظریے سے ادبنے لگے۔ سارتر لکھ رہے تھے "تمہاری زندگی معدوم ہے — خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دنیا کے محنت کشوں سے کندھے ملا کر ہی انسان کی زندگی میں کچھ مقصدیت بھر دی جا سکتی ہے۔ وغیرہ" اس کے علاوہ نوآبادیات کے سلسلے میں فرانسیسی طرز عمل کی مخالفت میں انہوں نے اتنا سخت رویہ اپنایا تھا کہ شاید ان کی بین الاقوامی شہرت ہی انہیں الجیریا کے سوال پر جیل جانے سے بچا سکی۔

لوگ سارتر کو ملک دشمن کہنے لگے اور ان کے گھر پر بم پھینکے گئے۔ ویسے ڈراما نگار سارتر ابھی بھی ہر دلعزیز تھے اور انہوں نے اپنا لکھنا جاری رکھا اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مصنف تب تک مردہ نہیں مانا جا سکتا جب تک کہ اسے قبر میں نہ اتار دیا جائے۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات کا پہلا حصہ (The Brids) شائع کیا جس کی اشاعت کے بعد ایک تہلکہ مچ گیا اور سارتر کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ فرانسیسی ادب میں سوانح عمری کا ہمیشہ ایک مقام رہا ہے۔ سینٹ آگسٹین اور مونٹین (Montaigne) سے (Gide) اور (Genet)

تک ۔ لیکن " دی پرڈس" کے سارتر نے اس صنف کو ایک نئی طاقت اور ایک نئی سمت عطا کی ———]

سوال :- آپ کے متعلق عجیب قصے پھیلے ہوئے ہیں ۔ لوگ آپ کو کئی انہونی وارداتوں کے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ۔

جواب :- جی ہاں ! (*Samedi Soir*) نام کا ایک رسالہ میرے بارے میں لمبی کہانیوں سے بھرا ہوا تھا ۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک لڑکی کے بیان کے مطابق میں نے پیشہ ور عاشق کے طریقے سے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور الماری میں سے مرے پنیر کا ایک ٹکڑا نکال کر اس کی ناک کے نیچے رکھ کر اسے سونگھایا اس کے بعد دروازہ کی طرف اشارہ کرکے میں نے کہا اب تم نکل جاؤ ——" لیکن آپ جانتے ہیں کہ حقیقت میں میں کیوں قابل اعتراض مانا جاتا ہوں —— ؟ ۱۹۴۵ء کے بعد سے اخباروں نے مجھے مرا ہوا اور ختم ہوا مشتہر کیا ہے ۔ ہر اخبار نے یہی بات کہی ہے اس لئے افواہ پورے طور پر پھیل گئی ہے ۔ جب سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے، یہ لوگ میرے خاتمہ کا اعلان کرتے آرہے ہیں ۔ لوگوں کو سب سے زیادہ ناراضگی اس بات سے ہے کہ میں دو طرح سے (*Traitor*) ہوں ۔ میں پہلے بورژوا جماعت کا ہوں اور اس کے بارے میں سختی سے لکھتا ہوں ۔ اور دوسرا یہ کہ میں زیادہ عمر کا ہوں لیکن میرا زیادہ تر تعلق نوجوانوں سے ہے ۔ میں ان سے اچھی طرح مل جل پاتا ہوں اور وہی زیادہ تر میرے قارئین ہیں ۔ چالیس سے زیادہ عمر والے میری برائی کرتے ہیں ۔ چاہے اپنی نوجوانی میں انہوں نے مجھے پسند کیا ہو ۔ اس طرح میں دو طرح سے (*Traitor*) ہوں نسل اور جماعت کے تصادم کا (*Traitor*) ۱۹۴۵ء کی نسل سوچتی ہے کہ میں نے ان کو دھوکا دیا ہے کیونکہ انہوں نے مجھے ڈراما "نو ایگزٹ" اور ناول "نوسیا" کے ذریعہ جانا تھا جو اس وقت لکھے گئے تھے ۔ جب میں نے اپنے خیالات کا مارکسی تجزیہ کی نظر سے مطالعہ نہیں کیا تھا ۔ اس وقت تک مارکسیزم میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ میں جوان اور اچھے گھرانے کا تھا ۔ اور مجھے خیال تھا کہ محنت اور ضرورت کی صورت حال جانے بغیر ہی میں دنیا میں اپنی جگہ بنا سکوں گا ۔

سوال :- کیا تب آپ کو اپنی زندگی کا [illegible]

معلوم تھا ۔

جواب :- مجھے معلوم ہونا شروع ہو رہا تھا ۔ [illegible]

سال کی عمر میں میں ناول نگار بننا چاہتا تھا لیکن کالج [illegible]

داخلہ لینے کے لئے مجھے فلاسفی پڑھنا ضروری تھا ۔ تب [illegible]

خواہش تھی کہ میں ادب کا پروفیسر بنوں اس وقت میں [illegible]

ہنری برگسن کی ایک کتاب پڑھی جس میں وہ بہت [illegible]

ڈھنگ سے سمجھاتا ہے کہ انسان کے دماغ میں وقت [illegible]

احساس کس طرح ہوتا ہے ۔ اس بات کی سچائی میں نے اپنے [illegible]

محسوس کی ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میں نے سیکھا کہ کس طرح [illegible]

کسی موضوع کے بارے میں صحیح طور پر بات کہہ سکتا ہے ۔ اور [illegible]

آگے کس طرح انسان فلاسفی کی کتابوں کی صحیح علمی زبان [illegible]

سچائی کے مطابق بھی باتیں کہہ سکتا ہے ۔ میں چاہتا تھا کہ ادب [illegible]

اور فلاسفی کی راہوں کو متحد کرکے بالکل صحیح راستہ ڈھونڈ [illegible]

جائے جس میں فلاسفی کے طریقوں اور ضابطوں اور ادب [illegible]

لفظوں کا استعمال ہو میں وجود مخفی اور ان [illegible]

بعد میں انسان اور انسان کے بیچ کی عجیب رمز بھری [illegible]

کو سمجھنے کا مشتاق تھا ۔

سوال :- کیا آپ سمجھائیں گے کہ آپ کے [illegible]

"نو ایگزٹ" میں کہے گئے جملے " دوزخ صرف دوسرے لوگ [illegible]

ہیں" کیا مطلب ہے ؟

جواب :- دوسرے لوگ جہنم اس معنی [illegible]

ہیں کہ پیدائش کے بعد سے ہی انسان ایسی حالتوں میں [illegible]

جاتا ہے جن سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے ۔ آپ کبھی [illegible]

یا کسی انجینئر، کسی ڈاکٹر، یا کسی امریکن کے لڑکے کی شکل میں [illegible]

ہوتے ہیں تو آپ کے لئے بنا بنایا مستقبل تیار ہوتا ہے [illegible]

دوسروں نے بنایا ہے ۔ وہ اسے سیدھی طرح [illegible]

بناتے ۔ بلکہ ان کی تیار کردہ ایک سماجی آئین ۔ آپ کو [illegible]

مانی ہے جو کہ آپ اب ہیں۔ اگر آپ ایک کسان کے لڑکے ہیں تو سماجی
آئین آپ کو مجبور کرتی ہے کہ آپ شہر میں جائیں جہاں مشین آپ کا انتظار
کر رہی ہے۔ اس طرح ایک خاص قسم کا مزدور بن جانا ہی آپ کی
تقدیر ہے مگر صحیح طور پر آپ کی ذات اور آپ کا وجود صرف وہی
نوکری ہے جو آپ کر رہے ہیں —— نوکری جو پوری طرح سے آپ کو
دبا لیتی ہے اور آپ پر حاوی ہے اور آپ کی طلب اور رہن سہن کے معیار کے مطابق
آپ کا کلاسی فیکیشن کر دیتی ہے۔ یہ سب دوسرے لوگوں نے آپ پر
ٹھونس ہے اس طرح کی زندگی کی صحیح تفصیل دوزخ نہیں تو اور کیا ہے۔

سوال :۔ کیا اس سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے ؟

جواب :۔ ضرور ہے۔ لوگوں نے جو آپ کو بنایا ہے ان کے
خلاف آپ بغاوت کیجئے اور خود کو بدلئے۔ الجیریائی بچہ اپنے قدیم
تشخیص شدہ تقدیر کے مطابق سزا یا موت کے لئے پیدا ہوا تھا
مگر آج وہ اپنی بغاوت کا پھل پا رہا ہے وہی آزادی کا مجسمہ ہے۔

سوال :۔ متعدد لوگوں نے آپ پر تنقید کی ہے کہ
آپ نے Anguish اور Despair Aliena-
tion موضوع پر بہت لکھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ
یہ بھی کہا ہے کہ انسان اپنی آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن
اس کے لئے آپ کوئی طے شدہ یا متعین راہ نہیں
دکھا پاتے ؟

جواب :۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک پیاری صبح کو جب
آدمی اپنے موڈ سے بہہ رہا ہو تو وہ طے کر سکتا ہے کہ —" اچھا
اب میں اخلاقی ضابطوں کا انکشاف و ایجاد کر دوں گا۔" لیکن
اخلاقی ضابطوں کا انکشاف و ایجاد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ
صرف وہی ہو سکتے ہیں جو پہلے سے ہی کسی نہ کسی سمت میں چلتے
آ رہے ہوں۔ ایسے اخلاقی اصولوں کو جو پہلے سے چلے آ رہے ہیں ضابطوں
کے طور سے نافرمانی یا ناقدری کر کے اپنے ہی نئے رول کو
بناتا ہے۔ حقیقت میں اخلاقی ضابطہ نہیں مانا جا سکتا۔
میرے اس سمجھ گروہ یا جماعت کے طریقۂ فکر کی تشہیر کرتے
ہیں جس کا کہ نام صحیح رکن ہوتا ہے۔

میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں Gide کہتے ہیں ——
"خدا کی تلاش سب جگہ کے علاوہ کہیں اور نہ کرو" اور وہ حوصلہ امنگ
پیاس، اور نشاط پر خود سپردگی کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس طرح کی
بات کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ میں Gide اعلیٰ اور درمیانی
طبقہ کا ہوں اور مجھے اپنے طبقہ میں پیدا ہو سکنے کا علم ہے اور اسی
وجہ سے میں اپنے آپ کو ادبی کام میں لگا سکتا ہوں میری ادبی کارگذاری
سے ظاہر ہوتا ہے کہ میری مشغولیت ہر طرح کے احساس و تجربہ میں
رسائی حاصل کر سکتی ہے —— یہ اعلیٰ درمیانی طبقہ کے مصنف
کا اخلاقی ضابطہ ہے جو اسی طبقہ کے دوسرے مصنفوں کے ذریعہ
قبول کیا جا سکتا ہے میں اسے سمجھ سکتا ہوں۔ حالانکہ میں اس طبقہ
میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ شاید Gide کے
موافق چلنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی صلاح
آٹھ گھنٹے کی فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور کے لئے بے معنی
ہیں۔ وہ ایک دم تھکا ہوا ہے۔ آپ کس منہ سے اس سے کہہ سکتے
ہیں کہ وہ باہر جائے اور دنیا میں نئے علم کی تلاش کرے۔ جبکہ دن بھر کی
کمر توڑ مزدوری نے اس کے دماغ کو مفلوج کر دیا ہے۔

سوال :۔ چونکہ وجود پرستی Existentialism
کی تحریک کا امام آپ کو مانا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں آپ پر الزام ہے
کہ آپ دور از فہم اور بعید از ادراک باتیں لکھتے ہیں۔ کیا آپ
اس کی تردید میں کچھ کہنا مناسب سمجھیں گے۔

جواب :۔ انسان ایک قادر مطلق ہے۔ انسان
لائق تعظیم ہے کیونکہ وہ آزاد ہے اور اس کی آزادی کو چھین لینے
کی کوئی بھی کوشش ظلم کی کوئی بھی شکل ایک سنگین جرم ہے۔ یہ
ٹھیک ہے کہ میں وجودیت پسندی Existantialism
کا امام ہوں اور جہاں تک اس نظریہ کی بنیاد پر کی گئی تخلیقات پر
الزام کا سوال ہے۔ زیادہ تر معترض حضرات میری
کتاب L'Etreetlen e'ant سے مندرجہ ذیل
اقتباس پیش کر کے مجھ پر خرافات کا الزام لگاتے ہیں۔ اب
میں معترض حضرات کی علمیت کو کیا کہوں کہ شاید آٹھ سو صفحات کی

اس کتاب میں انہیں صرف خرافات ہی نظر آتے ہیں۔ یا پھر یہ اقتباس دور از فہم یا بعید از ادراک ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

Let us examine the possibility of the metaphysical question more closely. What appears first of all is that being for others represents the third "ek-stasy" of being for one self. The first "ek-stasy" is in effect, the three demensional projection of being for one self towards a being that has to be after the mode of not-being. It represent the first fissure, the negation by which being for one self becomes, it self, the tearing away of being for one self from all that it is, in so far as this tearing away is constitutive of its being.

The second "ek-stasy"......
is an uprooting from this same tearing away.

This reflexive "scissiparity" corresponds to a vain effort to take a point of view on the negation which the being for oneself has to be............"

میلا پنے ناولوں میں "ژاں پال سارتر" کی راہوں، ماؤنٹ پارناسے کے کلبوں "توت دی اژ" کی رقص گاہوں، گمراہ آوارہ حال انسانوں کی عادتوں اور عشق و محبت کے حادثوں کی تصویریں بھی پیش کرتا ہوں ان تصویروں کو میں کسی بھی تفصیل کے رنگ سے محروم نہیں رکھتا پھر میری تحریر میں یا میرے ناولوں میں خاندان اور شادی کے خلاف شدید نفرت اور بیزاری کا احساس بھی ہوگا کیونکہ ان میں ایسے آزاد طریق حیات کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے جس میں سماجی جنسی، معاشرتی کسی قسم کی بھی پابندی اور روک ٹوک نہ ہو — یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے فلسفیانہ ناولوں کو پڑھنے کے لئے قاری کو اپنے ذہن پر زور دینا پڑتا ہے۔ فرانس کی آزادی کے فوراً بعد وجودیت مدافعتی تحریک (Resistance Movement) کا ایک حصہ بن کر سامنے آئی۔ دراصل بہت سارے وجودیت پرست مدافعتی حلقوں میں رہ چکے تھے۔ خود میں اور میرے ساتھیوں نے "قومی محاذ" کی حمایت کی تھی۔ ہمارے ترجمان (Les temps Modernes) نے محبان وطن جلا وطنوں کی سرگزشت اور ان کی یادوں کو اہمیت دی — آپ کو میرے ناول میں اسپینی جمہور پسندوں کے کارناموں کا بھی عکس ملے گا۔ میں نے اپنے ناول *Le sursis* میں میونخ کی سازشوں کی مذمت اور ان کے خلاف لعنت و ملامت کا بھی اظہار کیا ہے۔

سوال: — آپ نے اپنی کتاب "دی برڈس" میں لکھا ہے کہ "میرے بہت سے خیال ڈگمگا گئے ہیں۔ اور اب مجھے نہیں معلوم کہ اپنی زندگی کو کیا بناؤں"— ؟

جواب: میرا مطلب تھا کہ میں نے اپنی نوجوانی کی غلط فہمیوں کو دور کر لیا تھا۔

سوال: — کس طرح کی غلط فہمیاں ؟

جواب: — میں سمجھتا تھا کہ ایک بورژوا مصنف صرف یاس پسند ہی ہو سکتا ہے "دی برڈس" میں بتلایا ہے کہ کس طرح میری سمجھ میں آیا کہ میں سماج کا ممبر ہوں۔ جو ہمیشہ رواں ہے۔ اور چونکہ اب میں نے نوجوانی کی غلط فہمی

سے جھٹکا دیا گیا اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میں رجائی بن گیا ہوں۔

سوال :۔ عورتوں سے متعلق آپ نے بہت کم لکھا ہے ایسا کیوں؟

جواب :۔ صرف اس لئے کہ میرے پاس لکھنے کیلئے اور بہت سی چیزیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنے حصے کی جذباتی الجھنوں کا احساس نہیں کیا ہے یا نہیں کرسکتا ہوں۔ اصل میں عورتیں میری زندگی کا کافی بڑا اور میری کتابوں کا کافی چھوٹا حصہ بانٹتی ہیں یہ Rapluuras میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن ان کے بارے میں لکھنے میں بے رغبتی محسوس کرتا ہوں کیونکہ ان کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ آج دنیا میں پورے طور سے انسان ہونا ممکن ہے۔ جبکہ اصلیت میں یہ ناممکن ہے۔ کاموں کہہ سکتے ہیں ہمیں انسان کے خوش رہ سکنے کے اختیار کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی خوشی کی حالتیں آج ہی بنائی جا سکتی ہیں۔ حقیقت میں یہ بہت اچھا ہوا اگر مصنف اپنے Sexual-raptures کے بارے میں لکھ کر سب لوگوں کو ان میں حصہ دار بنا سکے۔ لیکن میں ایک مصنف کے طور پر سمجھتا ہوں کہ مجھے ان موضوعات میں ہی دخل دینا چاہیئے جن کے لئے میں سب سے زیادہ موزوں ہوں۔ جیسے اور لوگ مجھ سے اچھی طرح نہیں کہہ سکتے۔

سوال :۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہمیشہ خوبصورت عورتوں میں گھرے رہتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے۔

جواب :۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو عورتوں سے گھیرے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جو کم سے کم دیکھنے میں تو اچھی لگتی ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی اقرار ہے اور میں اس کے لئے شرمندہ ہوں کہ بدصورت عورت مجھے ذرا بھی نہیں بھاتی۔ اس کی وجہ بھی بہت سیدھی ہے۔ عورت اور مرد کی قربت میں ہمیشہ ایک خاص فرق ہوتا ہے۔ ایک بدصورت عورت ہر عورت کی طرح ہمیں وہ خاص خوشی اور تسکین دیتی ہے جو عورتوں کی موجودگی سے حاصل ہوتی ہے لیکن بدصورت عورت تسکین کا وہ خاص لمحہ بھی خراب کر دیتی ہے چھوٹ موٹ کے (Provoked) اور (Denied) سے بڑی نامناسب سچویشن پیدا ہو جاتی ہے — لیکن خود کو عورتوں سے گھیرنے کی میری خاص وجہ صرف یہ ہے کہ میں مردوں کے برعکس عورتوں کی صحبت پسند کرتا ہوں۔ اور سچ پوچھئے تو مردوں کو Bore پاتا ہوں۔

سوال :۔ ادب میں آپ کی پسند کیسی ہے؟ کچھ عرصہ قبل آپ نے کہا تھا کہ John dos Passos ہمارے عہد کا بہت بڑا مصنف ہے آپ نے یہ کیوں کہا کیا آپکا ابھی بھی یہی خیال ہے۔

جواب :۔ مجھے اس کی اور فاکنر کی کتابیں بہت پسند آئیں اس نے کچھ نئی باتیں بتائی تھیں، نئے موڑ، نئی راہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کی کتابوں میں مجھے The 42nd Parallal اور Manhathan Transfer خاص طور پر پسند آئی تھیں لیکن وہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

سوال :۔ کیا آپ نے پچھلے برسوں میں کوئی اور امریکن کتابیں پڑھی ہیں جو آپ کو پسند آئی ہوں؟

جواب :۔ بہت کم۔

سوال :۔ مثال کے طور پر؟

جواب :۔ مجھے whyte کی Organisationman اسپکٹرسکی کی The Exer.vaniter اور اپنے مرحوم دوست C. wright Mills کی سب کتابیں بہت پسند آئیں۔

سوال :۔ آپ اپنی کتابوں کے بارے میں بتایئے آپ کے متعدد ڈراموں پر فلم بن چکی ہیں۔ کیا آپ کو ان میں کوئی پسند آئیں۔

جواب :۔ Respectable Prostitute کے علاوہ میرے سب ڈراموں پر مبنی فلم بہت خراب بنی ہے۔

سوال :- اس کے باوجود ان فلموں سے آپ کو بہت اچھی رائلٹی ملی ہوگی ۔ پھر آپ کی کتابوں کی فروخت تو ہمیشہ سے بہت اچھی رہی ہے ——؟

جواب :- یہ سچ ہے کہ میرے پاس خرچ کرنے کے لئے بہت روپیہ ہے لیکن میری ذمہ داریاں بھی بہت ہیں ۔ دراصل مجھے جمع کرنے سے نفرت ہے ۔ مجھے لگتا ہے کہ جن اشیاء کے ہم مالک ہوتے ہیں سچ پوچھئے تو وہ چیزیں ہماری مالک بن جاتی ہیں چاہے یہ روپیہ ہوں یا وہ چیزیں جنھیں روپیہ خرید سکتا ہے جب مجھے کوئی چیز پسند آتی ہے تو میں ہمیشہ اسے کسی اور کو دے دینا چاہتا ہوں تاکہ میرے بجائے کوئی اور ان اشیاء کا غلام بن جائے ۔ اور مجھے اس سے خوشی ہوتی ہے کہ میری دی ہوئی چیز کسی کو پسند آئے گی ۔

سوال :- بس اب آخری سوال : آپ نے نوبل پرائز کیوں نامنظور کر دیا ؟

جواب :- میں اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا ۔

سوال :- ایسا کیوں ؟

جواب :- کیونکہ میں نہیں مانتا کہ کسی اکیڈمی یا انعام سے مجھے کچھ لینا دینا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا سب سے بڑا اعزاز یہی ہو سکتا ہے کہ لوگ میری کتابیں پڑھیں ——!

سرخ نشان

اس دائرے میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شمارے کے ساتھ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے ۔ لہٰذا فوراً زرِ سالانہ تین روپے منی آرڈر سے ارسال فرمائیے بصورت دیگر آئندہ شمارہ وی۔پی سے بھیجا جائیگا جس کا وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا اگر کسی وجہ سے تجدید خریداری آپ کو منظور نہ ہو تو صرف ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع فرمائیں ۔

اطلاع بابت ملکیت دوماہی شاخسار کٹک

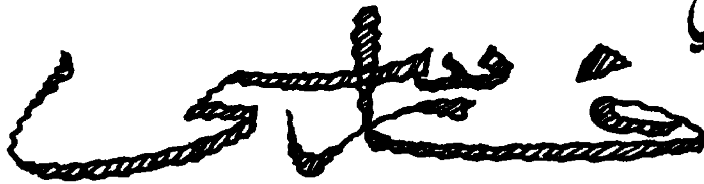
(اخبار کے فارم نمبر ۴)

1. مقام اشاعت :- بخشی بازار، کٹک ۱
2. وقفہ اشاعت :- —— دوماہی
3. طابع :- —— امجد نجمی
   شہریت :- —— ہندوستانی
   پتہ :- بخشی بازار، کٹک ۱
4. ناشر :- امجد نجمی
   شہریت :- ہندوستانی
   پتہ :- بخشی بازار، کٹک ۱
5. ایڈیٹر :- امجد نجمی
   شہریت :- ہندوستانی
   پتہ :- بخشی بازار کٹک ۱
6. مالک :- امجد نجمی
   شہریت :- ہندوستانی
   پتہ :- بخشی بازار کٹک ۱

میں امجد نجمی تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاع میرے علم کے مطابق صحیح ہیں ۔

دستخط امجد نجمی ۴ر اپریل ۱۹۶۸

محمد غفار صدیقی



کی
صوفیانہ شاعری

فارسی شاعری اس وقت تک قالب بے جان تھی جب تک
ں میں تصوف کا عنصر شامل نہ ہوا تھا۔ شاعری جیسا کہ شبلی کہتے ہیں۔
یک وجدانی اور جذباتی چیز ہے۔" فارسی شاعری میں تصوف سے
پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ قصیدہ تملق و چاپلوسی
انام تھا۔ مثنوی واقعہ نگاری اور غزل لفاظی تھی۔ تصوف کا
س خمیر مایہ عشق ہے جو سرتاپا جوش اور جذبہ ہے۔ امتداد زمانہ
ے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کی بدولت عشق مجازی بھی قابل اعتنا
و گیا۔ اور ارباب دل تو ارباب دل اہل حرص و آز کی باتوں
یں بھی تاثیر آگئی۔ سب سے پہلے سلطان ابوسعید ابوالخیر نے
وفیانہ خیالات ادا کئے ان کے دو شعر کیا خوب ہیں ؎

غازی برہ شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہید عشق فاضل تر از دوست

در روز قیامت این بدان کے ماند
کیں کشتۂ دشمن ست وآں کشتۂ دوست

لطان کے بعد سنائی کی توجہ اس عروسہ کی شانہ آرائی کی طرف
ل ہوئی۔ اس عہد میں غزالی کی بدولت فلسفہ و منطق اور علم کلام
نں نصاب ہو چکے تھے اور شاعری کا دامن وسیع تر ہوتا
جا رہا تھا۔ چنانچہ سنائی صوفیانہ مسائل اور علم کلام کے
ائل اپنے قصائد میں ایک ماہر فن کی طرح درج کرتے ہیں۔

آپ نے صبر، توکل رضا و قناعت وغیرہ کے عنوانات قائم
کرکے ان کی حقیقت بیان کی ہے اور جس گروہ کی کیفیت
بیان کی ہے اس کی کنہ پر سیر حاصل بحث کردی ہے۔ علماء
سے متعلق فرماتے ہیں ؎

اصل خود را فدائے خود کردہ
خویشتن را غذائے خود کردہ

با دو معشوق ناز می کردند
با دو قبلہ نماز می کردند

سنائی کے بعد اوحدالدین کرمانی نے "مصباح الارواح"
لکھی جو تصوف میں ہے۔ اسی زمانہ میں اوحدی اصفہانی
بڑے صوفی شاعر گزرے۔ وہ اوحدی کرمانی کے مرید تھے
تصوف میں ان کی مشہور مثنوی "جام جم" ہے۔ ان کی غزلیں
سلاست اور صفائی میں پیش روؤں سے ممتاز ہیں۔ خود سنائی
کی مثنوی اور قصائد تصوف سے پر ہیں۔ ہاں غزل میں
صوفیانہ پن مطلق نہیں اور اگر ہے تو پھیکا پھیکا۔ اوحدی
کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

حکیم سنائی کے بعد خواجہ فریدالدین عطار نے اس شاعری کا

دائرہ نہایت وسیع کر دیا۔ اور انہیں کا فیض ہے کہ قصیدہ رباعی، غزل غرض تمام اصناف سخن میں تصوف کا عطر بس گیا۔ کئی مثنویاں آپ کی یادگار ہیں جن میں "مثنوی منطق الطیر" مشہور ہے۔ آپ وحدت وجود کے علمبردار تھے اور آپ کے تمام ادراکات و احساسات میں وہی جاری و ساری ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ تصوف علم کسبی نہیں بلکہ علم لدنی ہے۔ خواجہ صاحب کے بعد فتنہ تاتار برپا ہوا۔ مشرق و مغرب اس طوفان میں گھر گیا اور بے ثباتی عالم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ تصوف کے مقامات رضا، فنا اور توکل نے دلوں کو مسخر کر لیا۔ اس کے نتیجہ میں کثرت سے صوفی شعراء پیدا ہوئے۔ رومی۔ سعدی۔ رودکی۔ و عراقی اسی دور کی پیداوار ہیں

مولانا روم اور شیخ محی الدین اکبر فلسفہ کے ماہر تھے اور اپنے مکاتیب فکری کے بانی۔ اس لئے بلا قصد فلسفہ کے امتزاج سے صوفیانہ شاعری نے گہرائی اور گیرائی اختیار کر لی۔ عراقی نے بھی تصوف میں بہت کچھ لکھا۔ عراقی کے بعد امیر خسرو و حسن دہلوی، اور محمود شبستری صوفیانہ شاعری میں مشہور ہوئے۔ شبستری کی مثنوی "گلشن راز" تصوف کی مشہور کتاب ہے۔ اقبال نے اس کا جواب "گلشن راز جدید" کے نام سے لکھا ہے جو زبور عجم میں موجود ہے۔ اس دور کے بعد نعمت اللہ ولی۔ مغربی اور جامی جیسے مشہور تصوف نگار پیدا ہوئے۔ نعمت اللہ کے کلام میں شاعری کم اور تصوف کی بھرمار ہے۔ مغربی کا کلام سرتاپا مسئلہ وحدت کا بیان ہے۔ جامی نے تصوف میں ایک بڑا ذخیرہ تیار کر دیا ہے۔ جامی کے بعد صفویہ حکومت کا آغاز ہوا۔ تمام ایران میں ایک متحدہ قومی حکومت قائم ہو گئی۔ صفویہ شیعہ تھے اور اہل تشیع کو تصوف سے بیر ہے۔ لہذا دفعتاً صوفیانہ شاعری کو زوال آ گیا تاہم بعض لوگ تقلیداً اس رنگ میں کہتے رہے لیکن چونکہ نہ وہ صوفی تھے اور نہ صوفیانہ خیالات رکھتے تھے اس لئے ان کا کلام سراسر نقالی اور تصنع معلوم ہوتا تھا جنہوں نے تصوف میں

ایک مثنوی لکھی لیکن تصوف کا جسم روح نہیں کیونکہ لکھنے و[الا]
خود صوفی نہیں تھا۔

صوفی شعراء چونکہ جاہ پسندی اور دنیا طلبی سے آز[اد]
تھے اس لئے۔ قصیدہ کوئی جو سرتا سر خوشامد ہے موقو[ف]
ہو گئی۔ رومی۔ عراقی۔ جامی۔ و مغربی کے دواوین میں ق[صیدہ]
بالکل نہیں۔ مثنوی کے لئے یہ لازمی ہے کہ حمد و نعت کے [بعد]
شاہ وقت کا نام آئے اور اس کی ثنا خوانی و مدح سرا[ئی ہو]
جسے اصطلاح میں "گریز" کہتے ہیں۔ صوفیا نے یہ داغ م[ٹا دیا]
مثنوی "مولانا روم" اور مثنوی "منطق الطیر" سلاطین کے ذ[کر]
سے یکسر خالی ہے۔ دور اول کے خاتمہ پر سوسائٹی کی خرا[بی]
سے زبان نہایت فحش ہو گئی تھی۔ سوزنی و انوری کی فحاشی
زبان کو نجس کر دیا تھا لیکن تصوف نے اس کا اثر زائل کر دیا
ابتدا میں تو کچھ کچھ آثار اس کے رہے۔ چنانچہ مثنوی مولانا رو[م]
اور "گلستان" سعدی کی بعض بعض حکایتیں فحش ہ[یں]
لیکن رفتہ رفتہ یہ داغ محو ہو گیا۔ خواجہ حافظ، عراقی اور
سعدی کی زبان انتہائی مہذب اور شائستہ ہے۔ آ[گے]
چل کر تصوف رخصت ہوا۔ مگر زبان کی شائستگی قائم [رہی]
عرفی، نظیری اور طالب اہل ہوس ہیں مگر کلام شائستہ
شاعری میں جب عاشقانہ خیال آتے ہیں تو بہت جلد ہوا و ہ[وس]
کی طرف منعطف ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام شاع[ری]
فحاشی سے بھر جاتی ہے۔ عاشقانہ شاعری چھٹی صدی ہجری
شروع ہوئی اور چونکہ ایران کو رندی و سرمستی سے خا[ص]
نسبت ہے اس لئے خیال تھا کہ بہت جلد اس کے خمیر میں [فحاشی]
آ جائے گی لیکن تصوف نے کئی سو برس تک اس کی لطافت
و پاکیزگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ اور یہ تصوف ہی کا
اعجاز تھا کہ جو الفاظ عیاشی و رندی کے لئے مخصوص تھ[ے]
حقائق و اسرار کے ترجمان بن گئے۔ ساقی سے مراد عا[رف]
کامل لیتے رہے اور لوازمات شراب مثلاً جام و سبو، خم[ار]
صبوحی و مینائی سب عرفان کے بڑے بڑے واردات

مدارج کے نام ہیں۔ مولانا روم کہتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

تصوف نے زبان میں بہت سے نئے نئے الفاظ
اور اصطلاحات و تلمیحات داخل کر دیئے جن کا ہر لفظ قطرہ
میں دجلہ اور جز میں کل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز گوناگوں
خیالات کے لئے راستہ پیدا کرتا ہے مثلاً "قلندر" وہ
عارف جو مرتبہ تکلف سے گزر جائے۔ "خرابات" مقام
فنا کو کہتے ہیں۔ اور "سالک" عارف باخبر کا نام ہے۔ ایک
مدت سے شخصی تسلط نے عزتِ نفس کا خیال مٹا دیا تھا اور
خودی کے نقوش محو کر دیئے تھے۔ تصوف نے چونکہ انسان کو
اشرف المخلوقات مانا ہے۔ لہٰذا صوفیانہ شاعری سے عزتِ
نفس کا شعور بیدار ہوا، خود داری کا درس ملا اور
قدر انسانیت معلوم ہوئی۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ
کہتے ہیں ؎

سعدیا چندانکہ می دانی بگوے
حق نشاید گفتن اِلّا آشکار
ہر کرا خوف و طمع در باز نیست
از خطا باکش نباشد و از تتار

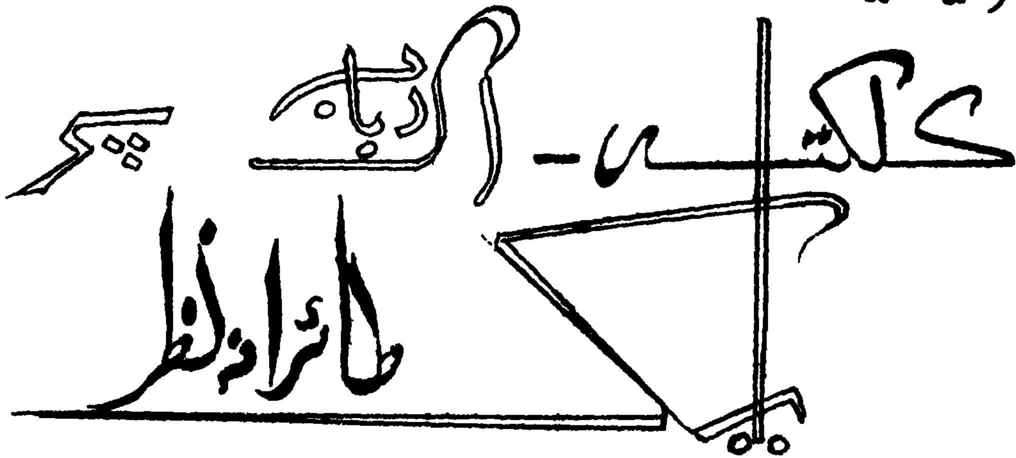
تصوف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جہاں تصوف اور
فلسفہ کے ڈانڈے مل جاتے ہیں لیکن یہ بظاہر ہے۔ فلسفہ و
تصوف میں علم و عمل کا فرق ہے فلسفی جانتا ہے اور صوفی عمل کرتا
ہے۔ فلسفی دلیل سے بتاتا ہے کہ شکر میں مٹھاس ہے اور صوفی
چکھ کر بتاتا ہے کہ وہ شیریں ہے۔ زہد و تصوف بھی ہم رنگ
معلوم ہوتے ہیں لیکن ان دونوں میں بھی کوسوں بعد ہے زاہد
خوشنودیٔ خالق کے لئے ترک دنیا کرتا ہے اور صوفی کی بے تعلقی
اس لئے ہے کہ وہ اس کو تقاضائے عشق سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک
ترک دنیا ہی معیارِ عشق ہے۔ غرض زاہد و صوفی میں ذکر و عاشق
فرق ہے اور صوفیانہ شاعری اسی فرق کو بتاتی ہے۔ صوفیانہ
شاعری میں ظلم و جبر میں بھی ہاتھ پیر نکالے اور آرام طلب و عیش پرست
بادشاہوں کو بھی نصیحت کی۔ سعدی ایسی ہی شاعری کے علمبردار
تھے۔ آزادگوئی اور نکتہ چینی سے کبھی باز نہ آئے۔ ایک حکایت
میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا گزر کسی تنگ گلی سے ہوا
ان کا پیر کسی فقیر کے پیر پر پڑ گیا۔ اس نے جھلا کر کہا کہ "کیا
تم اندھے ہو؟"

حضرت عمرؓ بولے: ؎

نہ کورم ولیکن خطا رفت کار
ندانستم از من خطا درگزار

الٰہیات، طبعیات، و فلکیات مستقل فلسفہ ہے۔ مولانا روم
و سنائی وغیرہ صوفی ہونے سے پہلے فلسفہ کی تعلیم پاتے
رہے۔ مولانا روم کی مثنوی میں سیکڑوں فلسفہ کے مسائل بکھرے
پڑے ہیں۔ ناصر خسرو پہلا شخص ہے جس نے فلسفیانہ خیالات کو
شاعری میں داخل کیا۔ وہ فرقۂ اسمٰعیلیہ باطنہ کا ایک اہم سرگرم
رکن تھا۔ اس کا دستور تھا کہ جب کسی کو اپنے فرقہ میں لانا چاہتا
تو قرآن و حدیث کی منصوصات اور کہنیات کے متعلق اس کے
دل میں شکوک پیدا کرتا ہے۔ اور پھر امام وقت سے اس کو
بیعت کراتا۔ ناصر کے بعد نظامی نے فلسفیانہ شاعری کو ترقی
دی۔ فتنہ تاتار کے بعد تصوف بھی اس میں آ ملا۔ اور پھر
رومی۔ سعدی۔ رودکی۔ عراقی۔ جامی۔ مغربی اور
نعمت اللہ ولی نے ان دونوں کے امتزاج سے خوب خوب
گلکاریاں کیں۔ نئے نئے گل بوٹے کھلائے۔ قصیدہ۔ غزل
رباعی تمام اصنافِ سخن میں تصوف کی آمیزش ہو گئی اور
پھر اسی کا رنگ اتنا گہرا ہوا کہ فلسفہ صرف دلائل کے طور پر
بیان ہونے لگا۔ غرض تصوف و فلسفہ ایک دوسرے سے
اس قدر ممزوج ہو گئے کہ ان کی علیحدہ علیحدہ حد بندی کرنا دشوار ہو گیا
بالکل اسی طرح جس طرح کہ آج سیاسیات کے ساتھ سماجیات
و علم تمدن اور فلسفہ کے ساتھ سائنس اور حیاتیات۔

محمد اکبرالدین صدیقی



شہروں کو دیکھنے کے انداز مختلف ہوتے ہیں، یہ زائر کے ذوق پر منحصر ہے۔ غالب نے اپنے سینے پر ایک تیر سے لیا اور پھر زندگی بھر اس کی خلش انہیں تڑپاتی رہی۔ جوش نے دکن میں جو کچھ دیکھا اس میں جنسیت کو دخل ہے۔ روش صدیقی نے الگ اثر لیا۔ اور جگن ناتھ آزاد نے علاوہ۔ مجاز نے کچھ دیکھا اور صفی لکھنوی نے کچھ۔ ہر شخص کا اپنا ذوق نظر ہے

کلکتہ: اک رباب — حرمت الاکرام کے پچاس بند کے ایک مسدس میں سب کچھ ملے گا جو کلکتہ میں نظر آتا ہے، یہ برلاؤں کا بھی ہے اور محنت کشوں کا بھی۔ یہ لیلاؤں کا بھی ہے اور دل آراؤں کا بھی۔ چورنگی کو آسمان کا دھنک کہنا یہ شاعری کا کام ہے اور یہ تشبیہ کتنی انوکھی ہے۔

> کھل کر برس نہ پائے جو ساون کی وہ گھٹا
> چورنگی وہ کلی ہے جسے کھلنا نہ آ سکا

یہاں دو گھڑی کی زیب و زینت اور آرائش جمال زائر کے ذہن پر جو نقوش مرتسم کرتی ہے وہ اتنے پائدار ہوتے ہیں کہ زندگی بھر برقی قمقموں کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ انہیں شاعر نے جس انداز سے پیش کیا ہے وہ انتہائی والہانہ، حقیقت اور صداقت سے لبریز ہے۔ یہ صداقت ہی کسی شئے کو دوام عطا کرتی ہے۔

صرف چورنگی ہی نہیں شاعر نے کلکتہ کی معاشرت کے اکثر پہلو بھی اجاگر کئے ہیں۔ یہاں کی پسندیدہ اور مرغوب خاطر چیزوں یعنی چاول، چائے، پان، اور رس گلوں کے ساتھ مچھلی کو بھی پیش کر دیا ہے۔ کلکتہ میں مچھلی کا مقام دیکھئے ؎

> مچھلی نظر کا، روح کا، دل کا سرور ہے
> بجلی ہے گھر کا نور یہ ہانڈی کا نور ہے

جب تاریکی بڑھتی ہے تو کتنے بے شمار تاریک اعمال بھی رینگنے لگتے ہیں۔ انہیں شاعر کتنے حسین انداز میں پیش کرتا ہے اس سے اس کی دروں بینی اور قوت اظہار و ابلاغ کا اندازہ ہوتا ہے کہتا ہے:

> شام آتی ہے تو زندگی بیدار ہوتی ہے
> رات اپنے گیسوؤں میں اجالے پروتی ہے
> غیرت برہنہ پا ہے اجالوں کے دشت میں
> رخسار و زلف و لب کی دکانیں ہیں گشت میں

اور انتہا دیکھئے:

> آتا ہے رات کو سوا نیزے پہ آفتاب

اور اس کے بعد

چھا جائے تیرگی تو قیامت طلوع ہو

کلکتہ کی رات کا عالم آپ نے دیکھا۔ یہ شدت احساس اور وقت مشاہدہ اردو کی کسی ایسی نظم میں نہیں ملتی جو شہر پر لکھی گئی ہو۔ ریس مشہور ہے اور یہاں لکھ پتی کنگال اور کنگال لکھ پتی ہوتے رہتے ہیں۔ شاعر کی نظر دیکھیے:

برپا یہ حشر ریس کی بزم نبرد میں
عقل آدمی کی اڑتی ہے ٹاپوں کی گرد میں

یہ عکاسی کتنی حقیقت پسندانہ ہے۔

حرمت صاحب عرصہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی رسالہ ان کے رشحات قلم سے محروم رہا ہو ان کے کلام میں زندگی کی لہریں ہیں اور یہ لہریں کبھی طوفانی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ جذبات کی شدت طوفان کی سی ہوتی ہے اور اس کا ابلاغ جس انداز میں ہوتا ہے وہ نغمگی میں سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے۔ طوفان کو نغموں میں ڈھالنا صرف شاعر ہی کا کام ہے اور حرمت صاحب اس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

شاعر اپنی دروں بینی کے نتائج کو کبھی اشاروں کنایوں میں، کبھی سرگوشی کے انداز میں اور کبھی بہانگ دہل کہتا ہے لیکن اک رباب میں سُر بھی ہیں اور تال بھی، زیر بھی اور بم بھی۔ نغمہ اسی زیر و بم سے عبارت ہے۔ سازندہ جتنا فن کار ہوگا موسیقی اتنا ہی کانوں میں رس گھول سکے گی۔

حرمت ماہر فن کار ہیں۔ نہ ان کے فن میں کوئی نقص ہے اور نہ خیالات کے اظہار میں کوئی ژولیدگی و پیچیدگی سیدھے سادے انداز میں دل پر گذرنے والے تاثرات پیش کرتے ہیں لیکن پیش کش نہایت اثر آفریں اور مسحور کن ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک شہر کی اتنی جامع اضداد خصوصیات بہت کم شعراء نے قلمبند کیا ہے۔ اس کا ایک سبب بھی ہے کہ وہ شہر کا صرف ایک پہلو دیکھتے ہیں عموماً روشن پہلو۔ تاریک کی طرف نظر کم پڑتی ہے۔ حرمت صاحب نے تاریک پہلو میں بھی کچھ نہ کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جو پایا اس کو عوام تک پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں۔

آج کے مشینی دور میں کلکتہ ہی پر کیا منحصر ہے، دہلی بمبئی، مدراس، حیدرآباد، جمشید پور، راوڑکیلا وغیرہ ہر جگہ یہ تاریکیاں ملتی ہیں اور اس طرح نظم مختص حلقہ سے نکل کر آفاقیت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر کسی نظم کا آفاق گیر ہونا مسلم ہو تو یہ شاعر کی نظر کی گہرائی مطالعہ و مشاہدہ پر دال ہے۔

حرمت صاحب اس طرح عام حالات اور عوامی جذبات کے مترجم بن جاتے ہیں اور یہ بات ایک بڑے شاعر ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

بقیہ اثر لکھنوی

منطقی استدلال شعر کو کس قدر بے کیف بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال غالب ہی کا یہ مطلع ہے: ؎

نہ کچھ تھا تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

معنویت کے لحاظ سے جو کچھ کہیے، شعر میں غنائیت نام کو نہیں۔ والسلام (باقی)

خیر طلب اثر

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

لہ مومن نے اپنے اس شعر میں:

دل لبسکہ پُر امید ہے عرض وفا کے بعد
جیسے وہ کچھ کہیں گے مری التجا کے بعد

لبسکہ بمعنی بہت استعمال کیا تھا۔ مولانا حامد علی خاں، سابق مدیر عزائم نے اس پر اعتراض فرمایا تھا کہ لبسکہ بمعنی چونکہ آتا ہے۔ لہٰذا یہاں لبسکہ غلط استعمال کیا گیا ہے۔ جس پر میں نے جناب اثر مرحوم سے استفسار کیا تھا، جواب میں انہوں نے یہ خط ارسال فرمایا تھا۔ (شفقت کاظمی)

قیصر سرمست

مولانا ابوالکلام آزاد

لانگ فیلو کہتا ہے کہ :-

"کسی عظیم شخص کی موت صدیوں تک انسانی زندگی کی راہیں روشن بنا دیتی ہے"

لیکن مولانا آزاد جیسی ہستی کی موت نے انسانی زندگی کی راہیں روشن نہیں، تاریک کر دیں۔ کیونکہ مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال اس وقت ہوا جب کہ ملک اور قوم کو ان کی بے حد ضرورت تھی اور اس سے قطع نظر مولانا آزاد کی موت ایک فرد کی موت نہیں بلکہ ایک مذہبی پیشوا، ایک قومی رہنما، ایک سیاسی، ایک ادیب، ایک صحافی، ایک قائد، ایک عالم، ایک مقرر اور ایک مفسر کی موت ہے۔ آپ جان سکتے ہیں کہ وقت واحد میں اتنی عظیم ہستیوں کی موت واقع ہو جائے تو مذہب، قوم، سیاست، ادیب، صحافت، ملک، علم اور دوسرے شعبوں کا کتنا زبردست اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اسی لئے میرے نزدیک مولانا آزاد جیسی شخصیت کی موت سے انسانی زندگی کی راہیں تاریک ہو گئی ہیں جب انسان زندگی کے اسرار حل کر لیتا ہے۔ تو اسے موت کا راز معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے کیونکہ موت زندگی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ اور اس راز کو حل کئے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ انہوں نے کبھی ایسے [illegible] نہیں لگا یا جسم میں اپنی تمام [illegible] کو صرف [illegible] سے [illegible] زندگی کے اس راز کو پانے کے لئے موت سے ہم کنار ہو گئے۔

[illegible] اپنی ہر صلاحیت [illegible] مختلف صلاحیتیں [illegible] یکساں طور پر شہرت اور مقام رکھتے ہیں۔ [illegible] ہم نہیں پاتے۔ [illegible] بہت کم لوگ ایسے ہیں جو مختلف میدانوں میں [illegible] کیونکہ ان صلاحیتوں [illegible] میدان ہوتے ہیں اور [illegible] عظیم [illegible]

[illegible]

کی تمام عظیم شخصیتوں پر غائر نظر ڈالئے آپ کو کوئی بھی ہستی ایسی نہیں ملے گی جو متضاد قسم کی صلاحیتوں پر یکساں طور پر عبور رکھتی ہو۔ جو سیاست میں نمایاں مقام رکھتے ہیں عموماً ان کی مذہبی حیثیت کچھ نہیں ہوتی اور جن کی حیثیت مذہبی اعتبار سے بلند ہوتی ہے وہ اکثر سیاست سے بے تعلق سے ہوتے ہیں۔ بالفرض محال اگر کوئی مذہب اور سیاست میں نمایاں مقام رکھتا بھی ہے تو وہ ادب کے میدان میں اناڑی ثابت ہوتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ کوئی بڑا ادیب، اچھا صحافی بھی ہو، اور ایک صحافی کا جید عالم ہونا یقینی نوادر میں سے ہے۔ ایک بڑا امام ضروری نہیں کہ ایک خاص فلسفیانہ نقطۂ نگاہ بھی رکھتے۔ مگر مولانا آزاد دنیا کی ان غیر معمولی اور گنی چنی ہستیوں میں سے ہیں۔ جو مختلف اور متضاد میدانوں کے شہسوار ہیں اور جن کا نہ کوئی ہمسر ہے اور نہ مدمقابل۔ آپ کی انہی دماغی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر مولانا شبلی نعمانی نے فرمایا تھا :-

"تمہارا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے تمہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور عجوبے کے پیش کرنا چاہیئے"۔

مولانا آزاد کی شخصیت ایسی ہی تھی کہ انہیں بطور عجوبے کے پیش کیا جاتا۔ وہ بیک وقت مذہبی پیشوا بھی تھے اور قومی رہنما بھی [illegible] سیاسی بھی تھے اور مسلم الثبوت ادیب بھی کامیاب صحافی بھی اور [illegible] جید عالم بھی تھے اور [illegible] فلسفیانہ نقطۂ نظر [illegible] بلا کا حاضر جواب مفسر بھی تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ [illegible] عالی اور مستند [illegible] تھے۔ مولانا کو خدا نے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سالان [illegible] کرسکا۔

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان
ہ کر سکا غالب کو تو صرف اپنی شاعری کا رونا تھا نہیں معلوم میرے ساتھ قبر
ن کیا کیا چیزیں ساتھ جائیں گی۔

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس ... ما
رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

"بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عالم طاری ہو
اتا ہے۔ مذہب علوم و فنون، ادب، انشا، شاعری کوئی، ایسی وادی نہیں جس
بے شمار نئی راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور
ان ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالامال نہ ہو، باوجود یکہ ہر روز اپنے آپ
عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں
جلوہ طرازیوں کو ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان تمام
لتوں سے گراں بار کیا اس نے شاید سروسامان کار سے تہی دست دکھنا چاہا۔
ری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا۔ مگر اس کے حوالے
دیا گیا۔" پہلے تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ایک انسان میں اتنی صلاحیتیں یکجا
ہو سکتی ہیں لیکن جب ہم کسی انسان کو اتنی متضاد صلاحیتوں کا مالک ماننے کے
خود کو اور اپنے ذہن کو تیار کرتے ہیں تو ہمارے ذہن کے پردے پر ایک
اور عظیم انسانی نقش کہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ابھر آتا ہے اور جب یہی
سان کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس وقت مولانا آزاد کی پُر رعب شخصیت
ن صور پر نظر آتی ہے۔

شیکسپیر کہتا ہے کہ "دنیا میں عقل سے سوچنے کا کام صرف پانچ فیصدی لوگ
ہیں اور پندرہ فیصدی یہ سمجھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہم سوچ رہے ہیں اور ۸۰
ی لوگ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔"

مولانا آزاد کا شمار اول الذکر پانچ فیصدی لوگوں میں ہوتا ہے۔ قدرت
سوجھ بوجھ کا وافر حصہ ودیعت کیا ہے وہ آستین اوپیلے کے
کہتے تھے کہ :-

... کہ اس میں فن کی فصل اگا تی ہے"
... دور اندیش تھے وہ جو بھی سوچتے جو بھی کرتے
... منزل کی جانب اکیلے ہی نکل پڑے تھے انہوں
... کارواں ان کا تھا ... لوگ رفتہ رفتہ ان

کے ہم خیال ہوتے گئے ان سے ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

"مذہب میں ادب میں سیاست میں فکر و نظر کی عام راہوں میں جس
طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔"

زمانے کا یا وقت کا وہ کیا ساتھ دیں گے۔ وہ زمانے سے نہیں زمانہ ان
سے تھا۔ ان کی فکر کی بلند پروازی ناپنے کے لئے زمانے کے پاس کوئی پیمانہ
نہیں تھا۔ اور نہ اتنی ترقی کر چکا تھا کہ انھیں سمجھ سکے۔ وہ بہت دور کی سوچتے
اور کہتے تھے لیکن سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "جو حل میں آپ
کو بتا سکتا ہوں وہ میرے لئے بہت پرانا حل ہے جو ۳۹-۴۰ برس پہلے
میں آپ سب کے سامنے رکھ چکا ہوں .... جو مشورہ میں دے
سکتا ہوں اس کے پیش کرنے میں میں نے کوئی کمی نہیں کی۔ میں کسی کے دل کو
تو بدل نہیں سکتا اور نہ کسی کے سر میں نیا دماغ تو رکھ نہیں سکتا۔"

وہ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن گمراہ ذہنوں کو راہ پر نہیں لا سکتے تھے۔
گمراہوں کو راہ راست پر لانا تو انسانوں کا کام ہو سکتا ہے لیکن گمراہ ذہنوں
کو صرف انبیاء ہی بدل سکتے ہیں۔ مولانا صحیح مشورہ دے سکتے تھے لیکن لوگوں کو
دل اور دماغ نئے نہیں دے سکتے تھے بقول حافظ محمد ابراہیم کے۔

"یہ ایسا صدمہ تھا جو اندر ہی اندر انہیں گھلاتا رہا اور عزم و ارادہ
کے بل پر چلنے والی جسمانی مشین بھی اسے برداشت کرتے کرتے تھک گئی" لیکن
ہمارے برف کی مانند سرد دماغ اور ہمارے ذہنوں نے ان کی ہر بات کے
الٹے ہی معنی نکالے۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ :-

"تمہیں یاد ہے! میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ
لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا
چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی
تو تم نے میری کمر توڑ دی۔"

اس کے باوجود وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ "جو پیچھے
ہٹا وہ پھر آگے نہیں بڑھا۔" اس لئے وہ صدق دل سے ملک اور قوم کی خدمت
کرتے رہے کیونکہ ان کی طبیعت کی افتاد ایسی ہی تھی۔ کہ زمانے کے بہت
سے حربے ان کے حق میں بیکار ثابت ہوئے۔ اپنی اسی طبیعت کی وجہ سے وہ
انگریز راج سے اور انگریزوں سے نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ جب جامعہ
ازہر اور بلاد اسلامیہ سے علم کی پیاس بجھا کر واپس ہندوستان لوٹے تو

ہندوستان کو بالکل ہی بدلا ہوا پایا۔ وہ پرسکون اور پرامن ہندوستان کہیں کھو گیا تھا۔ وہ یہاں ایک عجیب سی بے چینی گھٹی گھٹی محسوس کر رہے تھے۔ ان کی دوربین نگاہوں نے اس بے چینی میں بہت کچھ پا لیا۔ یہ عجیب سا اضطراب آنے والے طوفان کی پیش قیاسی کر رہا تھا انگریز ہماری ذہنیت سے کھیل رہے تھے۔ یہاں انہوں نے نفاق کے بیج بو دیئے تھے اور پھول پھل کے منتظر تھے اور دوسری طرف محبان وطن آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے اس ہیجانی دور میں ملک اور قوم کو ایک سچے قائد اور رہنما کی شدید ضرورت تھی۔ مولانا آزاد نے بھی اسی ضرورت کو محسوس کر لیا۔ انہوں نے اس موقعہ پر صحافت کے مشکل فن کو اپنایا اور اس میدان میں انہوں نے اس وقت قدم رکھا جبکہ شبلی، حالی اور نذیر احمد کا طوطی بول رہا تھا مگر مولانا وہاں بھی پہنچے تو کس شان سے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی زبانی سنئے۔

" مولانا ایک خاص ذہن اور دماغ کے ساتھ صحافت کے آسمان پر اس وقت طلوع ہوئے جب ہماری فضائے ادب روشن اور تابناک ستاروں سے مزین تھی۔ اردو کے عناصر میں حالی، شبلی، اور نذیر احمد زندہ تھے لیکن مولانا آزاد نے بقول شخصے دہلیز پر قدم رکھتے ہی نقارے پر ایسی زبردست چوٹ لگائی کہ سب کے کان انہی کی طرف لگ گئے اور سب کی نگاہیں ایک بارگی ان ہی پر اٹھ گئیں۔

" مولانا نے سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک اخبار "الہلال" کے نام سے جاری کیا جو اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نئی آواز ایک نئی دعوت اور ایک نیا پیغام تھا مولانا نے اخبار کے ذریعے اردو صحافت کو ایک نیا اسلوب بیان عطا کیا۔ اس اخبار نے قوم اور ملک میں ایک نئی لہر دوڑا دی پھر زندگی کے اس شعلہ کو بھڑکا دیا جو سرد ہونے ہی کو تھا۔ مولانا کی اس کاغذی پیسرین کا یکارنامہ ہے کہ "اس نے سوتوں کو جگا دیا۔ بے عملوں کو عمل پیدا کر دکھایا، مذہب اور اخلاق کے معاملے میں عقل اور دماغ کے دروازے کھولے تنگ کے جالوں کو صاف کیا اور ان طاقتوں کو نئے گلدستوں سے آراستہ کیا۔"

مولانا محمد علی نے "الہلال" کے متعلق صحیح ہی لکھا تھا کہ "اس نے اردو صحافت میں ایک نئی ماہ قائم کی" اس اخبار نے قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ورنہ اس سے قبل مسلمان پستی کے گڑھے میں پڑے تھے اور ان کے قوائے عمل شل ہو چکے تھے ان کے پاس بجز اوہام کے تار پود کے کچھ نہ تھا سیاست میں وہ اسی کو منبع مانے تھے جو سر سید

نے قائم کی تھی بقول خواجہ احمد فاروقی کے مولانا ہندوستان کے مشہور لیڈروں کی طرح سیاست کے میدان میں ادب اور صحافت کے راستے داخل ہوئے انہوں نے اس میدان میں اترتے ہی گوروں پر پے در پے حملے شروع کر دیئے وہی بار بار مولانا آزاد کرتے تھے جسے وہ حق سمجھتے تھے۔

برطانوی جبر شاہی سے نجات کی ان کے نزدیک دو ہی راہیں تھیں اور تیسری بات سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔

" میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے غرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں برطانوی گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آ جائے اگر باز نہیں آ سکتی تو مٹا دی جائے یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف یہی دو باتیں اس کے لئے کہی جا سکتی ہیں جو چیز بری ہے یا تو اسے درست ہو جانا چاہیئے یا مٹ جانا چاہیئے تیسری بات کیا ہو سکتی ہے"۔

یہ وہ نازک دور تھا جب کہ لیڈروں میں باہمی اختلافات بڑھ گئے تھے اور ان پر مایوسی نے پوری طرح اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ عوام اپنے قائدین کو اس عالم یاس میں دیکھ کر بدحواس اور ہراساں اور عملی سیاست میں حصہ لیتے ہوئے دامن بچا رہے تھے ایسے امتحانی اور ہیجانی وقت میں ہر شخص کی نگاہیں ایک ہی شخص کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ تلاش کر رہی تھیں جو اس سیاسی منجدھار سے ملک اور قوم کی کشتی کو نکال کر ساحل تک پہنچائے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ساحل سے اس طوفان کا نظارہ کر لینا ہی کافی سمجھ رہے تھے اس تیز و تند طوفان سے کشتی کو بچا لے جانا ایسے ہی ملاح کا کام تھا جو تجربہ، مہارت، قابلیت اور اپنے اندر خود اعتماد کی پاتا ہو یہ تمام اوصاف ابوالکلام آزاد میں موجود تھے چنانچہ انہیں ہی اس قومی کشتی کا ناخدا پایا گیا۔ مولانا آزاد کے لئے یہ انتہائی آزمائشی وقت تھا کیونکہ حالات بد سے بدتر اور تاریک ترین صورت اختیار کر رہے تھے اگر مولانا ان معمولی آزمائشوں سے گھبرا جائیں تو وہ مولانا ہی نہ ہوتے ان میں اور ایک عام آدمی میں فرق ہی کیا ہوا مولانا آزاد نے کبھی اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا حالات ہمیشہ مولانا کے آگے سر تسلیم خم کرتے رہے۔ اسی موقعہ پر مولانا آزاد نے ایک فارمولا پیش کیا جسے دونوں جماعتوں نے قبول کر لیا" مولانا آزاد نے فارمولے کے ذریعے ان لوگوں کو جو کونسلوں میں جا کر اندر سے عدم تعاون کرنا چاہتے تھے اس کی اجازت دی اور وہ لوگ جو اسے ایک غیر مفید مشغلہ سمجھتے تھے انہیں کانگریس تعمیری پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا یہ فارمولا قبول کر لیا گیا اور اس

طرح کانگریس کی تاریخ میں پارلیمنٹری پروگرام .... کی بنیاد رکھی گئی۔ مولانا کی سیاسی سمجھ اور دور اندیشی نے بڑے بڑے سیاست دانوں کو محوِ حیرت کر دیا۔

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کونسلوں کا داخلہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا اس کے باوجود انہوں نے اس مشغلہ کو جاری رہنے دیا کیوں؟ وجہ ان ہی کی زبانی سنئے۔

"مجھے اس حقیقت کا علم تھا کہ کونسلوں کا داخلہ ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا لیکن میری نظر مستقبل پر لگی ہوئی ہیں چوں کہ کانگریس کے ایک با اثر طبقہ کی پارلیمنٹری ذہنیت بن چکی تھی اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہ پروگرام کی غیر موجودگی سے بہتر ہے۔"

مولانا کی اس خداداد صلاحیت کا اعتراف "جان گنتھر" کو بھی کرنا پڑا وہ اپنی کتاب "اندرونِ ایشیاء" میں لکھتا ہے کہ۔

"آپ کانگریس کی تحریک کے دماغ اور روحانی پیشوا ہیں اگرچہ مولانا ایک مفکر اور عالم ہیں مگر کانگریس پارلیمنٹری کا سب کمیٹی کا کام کوئی معمولی کام نہیں تھا اس کے لئے انتہائی انتظامی قابلیت نظم و ضبط استعداد اور ہوشیاری کی ضرورت تھی کانگریس کی تاریخ اس بات کا شاہد ہے کہ مولانا نے جس غیر معمولی خوبی سے یہ کام سرانجام دیا اس سے صرف نہ ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں مولانا کی خداداد قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔"

مولانا آزاد کی شخصیت پر بحیثیت ایک مفکر اور عالم کے روشنی ڈالنا ایسا ہی ہے جیسے ایک معصوم سا بچہ کسی جہاندیدہ بزرگ کے کلام کی تشریح کرے۔ بحیثیت عالم کے مولانا کا جو مقام تھا وہ محتاجِ بیان نہیں پنڈت نہرو ان کے متعلق سے کہا کرتے تھے "ان کی اعلیٰ خصوصیت علم و فضل ہے ان کو دیکھ کر وہ فرانسیسی یاد آجاتے ہیں جو انقلابِ فرانس سے کچھ عرصے پہلے وہاں موجود تھے۔"

مولانا کو بعض حضرات مذہبی اتنے سے انکار کرتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ان کے جیسا سچا مذہبی شاید ہی کسی دوسرے میں ہو کسی شخص کا وحدانیت پر ایمان ہو یہ فیصلہ بھی ہو سکتا ہے اس کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے مولانا توحید کی وضاحت کس پورا اندازہ نہیں کرسکتے یہاں ملاحظہ فرمایئے۔

دنیا میں ہر انسان کے بے شمار عالم اور بہت سی بھٹکانے والی قوتیں ہیں لیکن مومن کے لئے صرف ایک ہی ہے اس کے سوا کوئی نہیں، وہ صرف اسی کے آگے جھک سکتا ہے اور صرف اسی کو مانتا ہے اس کی اطاعت کا حق ایک ہی کو ہے اس کی پیشانی کی جھکنے کی چوکھٹ ایک ہی ہے اور اس کے دل کی خریداری کے لئے بھی ایک ہی خریدار ہے۔"

غالباً معترض حضرات چاہتے تھے کہ ان کی رنگینیٔ طبع ختم ہو کر خشکیٔ طبع اس کی جگہ لے لے۔ "ملائیت" کا رنگ ان پر غالب آجائے مگر یہ ناممکن تھا۔ وہ ملائیت سے شدید نفرت کرتے تھے اگر ان میں ملائیت ہوتی تو وہ ہندو مسلم اتحاد کے اس قدر حامی نہ ہوتے مولانا آزاد قومی یک جہتی کی زندہ مثال تھے۔ ان کے یہ الفاظ ان کے غیر متزلزل ایقان کو اور ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کی خواہش کو ظاہر کرتے ہیں۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کرے کہ سوراج چوبیس گھنٹوں کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو عالمِ انسانیت کا نقصان ہے"۔

رام گڑھ میں مولانا نے متحدہ قومیت پر خطبۂ صدارت دیا جس کا طویل اقتباس پیش کر رہا ہوں جو کافی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے کس عمدگی سے یک جہتی اور بھائی چارگی کی تعلیم دی ہے اس کی داد صرف خاموشی ہی دے سکتی ہے۔

"ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا اور اس کی کشادہ سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی انہیں قافلوں میں آخری قافلہ پیروانِ اسلام کا بھی تھا یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے تھے لیکن پھر جب قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا ملاپ تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے

جس دن یہ قافلہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے
ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کیا۔
تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں اب اسلام بھی
اسی سرزمین پر ویسا ہی دعوے رکھتا ہے جیسا دعوے ہندو مذہب کا ہے
ہماری گیارہ صدیوں کی مشترکہ تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام
گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا
ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج،
ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس
پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں
مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بے
گانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا ...... یہ تمام
مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس
زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں
ہوئی تھی ہماری اس ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا
سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی
ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے
اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک
ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی
بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا ہمیں قدرت کے
فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"

خلوت کے شیدائی جلوت سے گریزاں مولانا مقرر ایسے تھے کہ ان کی تقریر
سنکر مخالف بھی وقتی طور پر ہی سہی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ "میں نے یہ جانا گویا
یہ بھی میرے دل میں ہے۔" مولانا آزاد فطرتاً خلوت کے شیدائی تھے مگر لوگ جانتے
تھے کہ وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں۔ اسی لئے انہیں ڈھونڈ نکالتے۔ اکثر حضرات
کے برخلاف ہجوم مولانا کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتا تھا وہ چاہتے تھے کہ
لوگ ان کی طرف سے رخ پھیر لیں تاکہ وہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں سے دور
ہو کر سیاست میں حصہ لے سکیں۔ وہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں سے دامن بچاتے
لیکن سیاسی زندگی کے ہنگامے انہیں ڈھونڈ ہی نکالتے۔ خود وہ کہتے تھے۔

"لوگ میری طرف سے رخ پھیر لیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل
گلا مند ہو اور منت گزار ہونے لگتا ہے کیونکہ جو ہجوم لوگوں کو خوش کر
دیتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر
کار رجوعِ ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی
اضطرار و تکلیف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں
کو نہیں ڈھونڈا تھا۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔"

مولانا کی افتادِ طبع ملاحظہ فرمائیے۔ جو بات لوگوں کے لئے سزا سمجھی جا
بات مولانا کے لئے سزا کا درجہ رکھتی تھی جب بھی انہیں معلوم ہوتا کہ فلاں قیدی
کو قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو وہ اس کی خوبیٔ قسمت پر رشک کرتے۔

"جب کبھی میں قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید
تنہائی کی سزا دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی آدمی کے لئے سزا
کیسے ہو سکتی ہے اگر دنیا بھی اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر
کے لئے حاصل کی جا سکتیں۔"

مولانا آزاد جنہیں مجبوراً زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے سنبھالنے
پڑے ان کا حال خلوت اور انجمن کی اس کشمکش میں یہ ہوا کہ وہ بہ تکلف خود
کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مولانا آزاد انسانوں کے
بہی خواہ تھے مگر بظاہر مردم بیزار۔ لیکن اس کے باوجود........

"تحریر ہی نہیں تقریر میں بھی مولانا کا جواب نہیں تھا۔ یقیناً ہندوستان
میں اتنا بڑا مقرر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ علمائے اسلام کا اجتماع ہو یا صرف
سیاسی پنڈتوں کا، نوجوانوں کی محفل ہو یا ضعیفوں کی مجلس ہو، منبر ہو
یا پلیٹ فارم، نماز جمعہ کا خطبہ ہو یا سیاسی جماعت کے سالانہ اجتماع
کی صدارت کی تقریر، ہر جگہ الفاظ کبھی اپنی نرم روی سے میدانوں کے
سبک رو دریا بن جاتے تھے اور کبھی دہکتے لپکتے شعلوں میں تبدیل ہو
جاتے تھے۔ وہ سامعین پر جادو کر دیتے تھے اور جو چاہتے تھے وہ وقتی
طور پر ذہنوں میں اتار دیتے تھے۔"

ان کا جادو صرف تقریر کی حد تک ہی نہیں چلتا تھا بلکہ ہر میدان میں
اپنا جادو چلاتے تھے اور جادو بھی وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ایک مرتبہ مولانا نے اپنی
تقریر میں یہ بات واضح کر دی کہ سیاست پھولوں کی سیج نہیں یہاں "ہر مرتبہ
پہلے ایمان ڈگمگاتے ہیں" اس میدان میں وہی سرخرو ہوتے ہیں جو
سر فروشانِ ملی اور مجاہدینِ حق پرست ہیں جن کے سر گردنوں پر نہیں ہتھیلیوں

پڑھتے ہیں "بجو پل تند رو جنگل کوہ و بیاباں سے گزر جاتے ہیں اور جن کی بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو"۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں آپ نے مسلمانوں کے ایک عظیم الشان اور یادگار جلسے کو خطاب کیا تھا جو جامع مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ آپ نے کہا کہ :- "یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو آخر کہاں جا رہے ہو، کیوں جا رہے ہو ؟

یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے ! ابھی کل کی بات ہے جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے خوف محسوس ہوتا ہے۔

عزیزو ! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے ....

.... عزیزو ! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور اپنی اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔"

ہم سورج سے کرنیں مانگ کر اپنی اندھیری راہوں میں اجالا تو نہ کر سکے لیکن لانے کرنوں کو ان راہوں میں بچھا دیا اور ان راہوں کو روشن کر دیا قرآن شریف تفسیر کی راہوں کو ہم نے تاریک کر دیا تھا لیکن یہاں بھی مولانا نے اپنے علم اور اپنی نگارش کے جوہر دکھلائے۔ مولانا کی نثر نگاری سے متاثر ہو کر سجاد انصاری یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "اگر قرآن اردو زبان میں اترتا تو ابوالکلام کی نثر میں اترتا"۔ قرآن کریم کی تفسیر مولانا آزاد سے پہلے بھی کی شاید ہی کوئی اور کر سکے۔ قرآن فہمی کو آسان سے آسان بنانے کے لئے ابتدا ہی سے تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اس راستے میں اکثر مفسرین نے ٹھوکریں بھی کھائیں جس سے ان کی تفسیروں میں پیچیدگیاں کچھ بڑھ گئیں۔ لیکن مولانا آزاد ہمیشہ کی طرح منفرد رہا اور حد تفسیر تک چھائے ہوئے معانی و تبیین۔ "ترجمان القرآن" نہ صرف مذہبی اعتبار سے قطع نظر علمی و ادبی حیثیت سے بھی شاہکار مانا جاتا ہے۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے سورہ بنی اسرائیل کی آیتوں میں توریت کے دس اوامر و نواہی TENCOMMANDNENTS کا ترجمہ کس عمدگی سے کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

"تمہارا پروردگار جس کسی کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے نپی تلی۔ وہ اپنے بندوں کی حالت کی خبر رکھنے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اور دیکھو افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو ہلاک نہ کرو۔ ہم ہی ہیں کہ انہیں بھی اور تمہیں بھی روزی دیتے ہیں۔ انہیں ہلاک کرنا بڑے گناہ کی بات ہے اور زنا کاری کے قریب نہ جاؤ یقین کرو وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے اور بڑی برائی کا چلن ہے۔ جب کوئی چیز ناپو تو پیمانہ بھر پور رکھا کرو اور جب تولو تو درست ترازو سے تولو یہ بہتر طریقہ ہے اور اچھا انجام لانے والا .... اور دیکھو جس بات کا تمہیں علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑو۔ یاد رکھو کان، آنکھ، عقل، سب کے بارے میں بازپرس ہونے والی ہے .... اور زمین پر اکڑ کے نہ چلو یقیناً تم زمین میں شگاف نہیں ڈال سکتے اور نہ پہاڑوں کی لمبائی تک پہنچ سکتے ہو۔ ان ساری باتوں کا یہ حال ہے کہ ان کی برائی تمہارے پروردگار کے نزدیک بڑی ناپسندیدہ ہے"۔

"اگر تمہارے ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو"

حضرت عیسیٰ مسیح کے اس ارشاد کے اکثر حضرات غلط معنی نکالتے ہیں۔ مولانا آزاد کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔ عین عقل کے مطابق ہے اور جی کو لگتی بات ہے "یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ تم اپنا گال آگے کر دیا کرو بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرو۔ بلاغت کلام کے یہ وہ مجازات ہیں جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور ہمیشہ یہ ٹھیٹھ جہالت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ان کے مقصود و مفہوم کی جگہ ... ان کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات یکسر درہم برہم ہو جائیں گی بلکہ انسان کا وہ تمام جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں پایا

محمود بالیسری

جدید اڑیا ادب اور گوپ بندھو داس

دورِ جدید کے اڑیا ادب میں ستیہ بادی ادب ایک خوبصورت موڑ ہے۔ وقت کے جدید تقاضے نئے ادب کو جنم دیتے ہیں۔ ادب کی تخلیق کا ذمہ دار محض فن کار نہیں، بلکہ اس کا ماحول ہوتا ہے۔ ادب کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے اور زندگی کا تعلق ہمیشہ سماج اور سیاست سے رہا ہے۔ انفرادی زندگی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہو بھی جائے، تو اجتماعی زندگی کو کوئی نئی تھرتھراہٹ بخش نہیں سکتی۔ جو ادیب عوام اور عصری ماحول سے دور ہو کر وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کرے گا۔ وہ زندگی کو صرف ایک بے معنی آواز کے سوا کچھ نہ دے سکے گا۔ بیسویں صدی کے آغاز تک انگریزوں نے سارے ہندوستان کو غلامی کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ لیا تھا۔ غلام ہندوستان اپنے دل و جگر میں احساسِ آزادی کے جذبے کو ابھار رہا تھا۔ یہ چنگاری آہستہ آہستہ سلگ کر شعلہ بن گئی۔ چاروں طرف آزادی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اسی فضا میں سانس لینے والا فن کار یقیناً قومی اور وطنی جذبات کو اپنے فن کا ترجمان بنائے گا۔ گوپ بندھو داس بھی ایک ایسا ہی فن کار تھا۔ اس نے بھی تحریکِ آزادی کا پرچم بلند کیا۔ اس نے اپنے ماحول کو بغور دیکھا۔ جہاں اپنی زبان و کلچر انگریزوں کی سفاکی سے ختم ہو رہی تھی۔ سمبل پور مدھیہ پردیش سے ملا ہوا تھا۔ کوراپوٹ اور گنجام مدراس سے ملا ہوا تھا۔ بالیسر بنگال کی زد میں تھا اور گوپ بندھو نے محسوس کیا کہ ہزار سالہ اڑیا زبان اور کلچر کو ختم کر دیا جا رہا ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر اس نے ۱۹۰۹ء میں ستیہ بادی میں "ایک ون ودیالیہ" کی بنا ڈالی۔ جہاں اس نے اپنے چار ساتھیوں کو لے کر اپنے بنائے ہوئے اصول کا سبق طلبا کو سکھایا۔ اڑیا زبان اور کلچر کی عظمت اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک اڑیسہ میں سب سے پہلے اسی ستیہ سے شروع ہوئی۔ گوپ بندھو داس نے اس تحریک کو فروغ دینے کے ۱۹۱۴ء میں ایک رسالہ "ستیہ بادی" نکالا اور اس کے بعد روزنامہ "سماج" کی بنا ڈالی، جو آج اڑیسہ کا سب سے پُراثر اور کثیر الاشاعت اخبار ہے۔

ستیہ بادی ادب کا بانی گوپ بندھو داس عوام کا شاعر تھا۔ اس نے عوام کے لئے عوامی زندگی سے اپنا مواد فراہم کیا۔ وقت کے تقاضوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ماحول سے اثر قبول کر کے اس نے اپنی تخلیقات پیش کئے۔ اس نے رسالہ ستیہ بادی میں لکھا ہے:

"عوامی ادب قومی ترقی کے بغیر ممکن نہیں۔ سماج کے چند گنے لوگ اگر پوری قوم کہلاتے، تو عوامی ادب کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ مگر جو لوگ کھیت میں ہل چلاتے ہیں۔ باغوں میں پانی دیتے ہیں، کشتی کھیتے ہیں، جنگل میں لکڑی کاٹتے ہیں۔ سوت کات کر کپڑے بنتے ہیں۔ یہ غیر تعلیم یافتہ چند لوگ، جو سکتا ہے قوم کا دماغ ہوں۔ مگر عوام میں قوم کا دل و جگر و صبر کتا ہے .... ہماری ادبی کاوش سے اگر عوام کو الگ کر دیا جائے، تو قومی ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اعلیٰ تخیل اور صحیح زبان سے مزین ادبی تخلیق نہ ہو۔ اس قسم کی

بھی جائیں گی، قوم اور زبان کو انتاہی فخر حاصل ہوگا۔ مگر یہ سب
م اور آسان نہ ہوں اور نچلے طبقے تک اگران کا پھیلاؤ نہ گیا، تو انہیں
دم کا سرمایہ نہیں کہا جا سکتا۔"

(ستیہ بادی - جلد ۳ - شمارہ ۴)

اڑیا ادب میں اُپیندر بھنج یا اس کے بعد رادھاناتھ کے زمانے
تاثیر دارانہ شاعری کا دور دورہ تھا۔ شاعری کو ایک تفریحی مشغلہ
مانا تھا اور راجاؤں اور مہاراجاؤں کی خوشنودی کی غرض سے
بزیں لکھی جاتی تھیں۔ ان سے عوام کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ زمانہ
یں صدی اور اٹھارہویں صدی کا زمانہ تھا۔ یہ زمانہ افراتفری کا زمانہ تھا۔
ں کے ظلم و ستم اور آپس میں جنگ و جدل اور خون ریزیوں سے پوری
کے اوراق رنگین تھے۔ مگر اس زمانے کی شاعری خصوصاً اوپیندر بھنج
ری میں بھی اس کا عکس ذرا بھی نظر نہیں آتا۔ اوپیندر بھنج کی شاعری
سا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت خون کی ندیوں کی بجائے دودھ اور
ں ندیاں بہتی تھیں۔ اس وقت حسینان وطن بھوک اور پیاس کا
ت فی الواقع ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھیں۔ مگر بھنج کی شاعری کا
سا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ سورگ سے اُروشی اور رمنیکا کو دھرتی
پر لایا ہے۔ قحط، بھوک، لوٹ، کھسوٹ اور خون خرابہ کی تصویریں
ں نظر نہیں آتیں۔ شاعروں کے دو طبقے تھے۔ ایک طبقہ مذہبی تبلیغ کے
کیا کرتا تھا اور دوسرا راجاؤں کی خوشنودی کے لئے۔ یہی وجہ ہے
وقت کا اڑیا ادب عوام سے بہت دور رہا اور عوام بھی اس
دور رہے۔ ادب کو تو والٹ وھٹ مین کے قول کے مطابق

"Comrade, This is no book who l_sches This Louches a max

ہیئے۔ البتہ یہ خوبی پہلی بار ستیہ بادی ادب میں پائی جاتی ہے۔ ستیہ بادی
سکھا دی نے اپنے ماحول سے اثر قبول کرکے عصری تقاضوں کے مطابق
ادب کی تخلیق کی۔ گوپ بندھو داس نے 'کارا کویتا'، کی تخلیق کی۔ نیل کنٹھ
نے 'کونارک'، بھارت اور ساہتیہ لکھی۔ گوداوریش مشرا نے 'کلنگا'
وغیرہ نظموں کے علاوہ 'سنہ ۱۸۱۷ء'، 'ابھاگن'، 'نر پاسینو'،
ناول اور بہت سارے افسانے لکھے۔ کرپاسندھو داس

کی موت بہت ہی کم عمر میں واقع ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے 'کونارک' اور
'بار باٹی'، کی تخلیق کی تھی۔ ان کے علاوہ 'باسو دیو مہاپاترا نے بھی شرالی
دھارا اور افسانوں کا مجموعہ 'دیہ بھارت' لکھا اور پنڈت لنگراج
نے بھی سبق آموز اور سیاسی مضامین لکھے۔

ستیہ بادی ادب کے رہبر گوپ بندھو داس نے اس ادب کو
بہت کچھ دیا ہے۔ اس کے دل و جگر میں ہمیشہ آزادی کی لگن تھی اور وہی
اس کے قلم سے بھی پھوٹ پڑتی تھی۔ اس کی نظموں کا مجموعہ 'بندو کا سن
چنتا' میں قومی نظمیں ہیں، جو دیش باسیوں کے دل کو جوش اور ولولوں سے
بھر دیتی ہیں، اور وہ بھی آزادی کی تحریک میں کود پڑنے کے لئے بے قرار
ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب کے آغاز کی پرارتھنا والی نظم سے ہی ملک قوم
سے والہانہ محبت جھلکتی ہے۔ اس نے بھگوان سے پرارتھنا کی ہے کہ وہ
اُتکل (اڑیسہ) ماتا کے مردہ جسم میں ایسی روح پھونک دے جس سے
اڑیسہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریک
کو آگے بڑھا سکے۔ گوپ بندھو داس کو دنیا کی ہر شئے آزادی کا سبق
دیتی ہے۔ اس نے مناظر فطرت کو آزادی کے راگ الاپتے تو دیکھا ہے۔ ایک
سوکھے کریلے کے پودے کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا تھا کہ اس پودے کو بھی کسی
کے سہارے چلنا پسند نہیں۔ ایک کریلے کا پودا یوں ہی بڑھ رہا تھا کہ
ایک لکڑی کی بلیا بھی لگا دی گئی جس سے وہ پودا مرجھا گیا۔ گوپ بندھو
داس کو محسوس ہوا کہ اس پودے کو بھی کسی کے احسان کی ضرورت نہیں ہے۔

گوپ بندھو داس کی دوسری کتاب 'کارا کویتا' ہے۔ گوپ بندھو
داس سنہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۴ء تک دو سال ہزاری باغ جیل میں قید رہا تھا۔
قید خانے میں اس نے بہت ساری نظمیں لکھی تھیں۔ ان سب نظموں کا
مجموعہ 'بندی کا رودا تما کتھا'، 'کارا کویتا' کہلاتا ہے۔ 'کارا کویتا'
۱۳ نظموں کا مجموعہ ہے، وہ یہ ہیں:-

(۱) نیتو دھام نیلا چولو — اس میں پوری کے نیلا چولو دھام یعنی
جگناتھ جی کی پاکیزگی سے متعلق بیان کرتے ہوئے مذہبی تو ہم پرستی
کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔

(۲) بو تھیتو پرا تو تو دانتم اسرو — شاعر نے اپنے ایک دوست
کے بارے میں جس نے اس کے دل کو مجروح کیا تھا، بیان کیا ہے۔

(۳)۔ کاہنی اُدچھو د باچالی گولے — اس میں شاعر نے بھگوان سے دعا کی ہے کہ وہ لوگوں کو انسانیت کی راہ دکھائے۔

(۴)— پتر دیکشو تر پو تو — یہ نظم شاعر کی مقبول ترین نظم ہے۔ ہزاری باغ جیل میں مقید رہنے کے زمانے میں شاعر کو اپنے مرحوم والد کی برسی پر پرارتھنا کرنے کا خیال آیا تاکہ ان کی روح کو شانتی ملے

پرارتھنا کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ شاعر کو خیال آیا کہ ایک قیدی کی پرارتھنا بھگوان قبول بھی کرے گا؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے ہندوستان کی آزادی کے لئے پرارتھنا کی۔

(۵)— بندھو ر دیبر دھو ہو تھا — دوستوں سے جدا ہو کر شاعر قید میں ہجر کے دن کاٹ رہا ہے۔ انہیں دوستوں کی یاد میں یہ نظم لکھی گئی ہے۔

(۶) بندی ر و سا ندھیو بھکتی — اس میں سامراج وادیوں کے خلاف چند تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

(۷) بندی ر د سودیشی چنتا — یہ نظم اڑیا ادب کے سرمایہ میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ اسے گوپ بندھو داس نے کالی داس کی شہرۂ آفاق نظم میگھ دوت کے انداز میں لکھا ہے۔ اس میں شاعر جیل میں رہنے کے باوجود اپنے تخیل میں موسم بہار کو محسوس کرتا ہے۔ نسیم سحری جن گلوں سے گذرتی تھی انہیں گلوں کے بارے میں شاعر اپنے تاثرات کو بیان کرتا ہے۔ مناظرِ فطرت کا بیان اس نظم میں کافی زندہ نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ 'بندی ر و سندھیا بھاونا'، 'کارا رے جو نے بندھو نکو بیوگ در تا سو نی باپو رے'، 'دیکھا دیو بارے'، اور 'پریمو ر و کی بیی پریشام'، وغیرہ نظمیں 'کارا کویتا' میں شامل ہیں۔

گوپ بندھو داس کی دوسری کتاب 'بندی ر و آتما کتھا' ہے۔ اس کی بھی تخلیق ہزاری باغ جیل میں ہوئی تھی۔ تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے کی وجہ سے گوپ بندھو داس کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ ہزاری باغ کو جاتے وقت راستے میں [illegible] کے دل میں بہت سارے خیالات اُبھرے۔ انہیں خیالات کو شاعر نے نظم کی شکل دی ہے۔ جیل میں شاعر اپنے [illegible] کی زبوں حالی کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو گیا تھا۔ [illegible] ابتدا میں اس نے دیش باسیوں سے کہا ہے کہ اس کی گرفتاری کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے۔ تحریک میں حصہ لینے والا [illegible] طرح جانتا ہے کہ اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہی اس کے ساتھ بھی ہوا۔ اس نظم میں شاعر نے دیش باسیوں سے کہا ہے کہ انگریز سرکار کو ہندوستان سے نکالنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ سودیشی تحریک میں سب لوگ مل کر حصہ لیں۔ انہیں تکلیف ضرور ہو گی مگر ان کی مصیبتیں، دکھ، درد کبھی رائیگاں نہ جائیں گی۔ گوپ بندھو داس نے اس نظم کے آخر میں تعمیری پہلو بھی پیش کیا ہے۔ دیش باسیوں کو گرام پنچایت کی بنا ڈالنے کی تلقین کی ہے۔

گوپ بندھو داس کی شاعری میں حب الوطنی کا جذبہ [illegible] موجود ہے۔ اس کا نظریہ پہلے وطن کی خدمت ہے اور بعد میں ادبی خدمت۔ اس کی ادبی سرگرمیاں وطن سے محبت کی وجہ سے ظہور میں آئی تھیں۔ وطن کی آزادی اور برادران وطن کی [illegible] و بہبودی کے لئے ہی وہ شاعری کرتا تھا اور اس کو اپنے اس نصب العین کے حصول میں کامیابی بھی نصیب ہوئی تھی۔ گوپ بندھو داس صرف ماضی کی خوش حالی کا راگ الاپتا نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ دشواریوں اور اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کا طریقہ بھی پیش کرتا ہے۔ گوپ بندھو داس کی ہر نظم سے سنہرے مستقبل کی امید بندھنے لگتی ہے۔ اس نے اہل وطن کو یقین دلایا ہے کہ امروز کی تیرگی فردا کی [illegible] کا پیش خیمہ ہے۔

پرویز شاہدی

خوابوں کی سیڑھیاں

علم و حکمت کی یہ فلک گردی
آسماں پر یہ دشت پیمائی
یہ قدم بوسیاں ستاروں کی
ماہِ تاباں کی یہ جبیں سائی

ارتقاءِ شعورِ انساں کے
سلسلے کی حسین کڑیاں ہیں
یہ وہ لمحے ہیں جن کے سینوں میں
لاکھوں ہی ماہ و سال رقصاں ہیں

فاصلوں کا یہ مضمحل پندار
وسعتوں کے یہ منفعل تیور
یہ فضائی مزاحمت کی شکست
یہ ظفریابیٔ نگاہِ بشر

شاعرانِ جمال آرا نے
ماہ و انجم کی پرورش کی ہے
آج کی ہر حقیقتِ روشن
کسی افسانے کی ترقی ہے

یہ شعاعوں کے سہمے سہمے تیر
یہ کشش کے لرزتے دام و کمند
خاک انجم شکار کا یہ کمال
یہ قمر افگنیٔ فکرِ بلند

ساکنانِ دیارِ حسنِ خیال
شعر لکھتے ہیں گیت گاتے ہیں
دے کے ترتیب اپنے خوابوں کی
نو بہ نو سیڑھیاں بناتے ہیں

یہ غرورِ وسائلِ پرواز
پرفشاں گرد کا یہ نازِ عروج
پستیوں کی یہ گردن افرازی
یہ شکستِ طلسمِ اوجِ بروج

انہیں خوابوں کی سیڑھیاں لیکر
آج سائنس بڑھتا جاتا ہے
دم بدم شکریہ ادا کرتا
ہر بلندی پہ چڑھتا جاتا ہے

شاعرانِ حیات ہیں ہم لوگ
ہاتھ سائنس کا بٹائیں گے
زندگی خواب دیتی جائے گی
سیڑھیاں ہم بناتے جائیں گے

امجد نجمی

شبِ طولِ الم

("جوئے کہکشاں" کا ایک ورق)

عارضِ شب پہ مچلتی ہے بہارِ گیسو
یا شبِ تار نے بکھرا دیئے تارِ گیسو
زلفِ شب آ کے رُکی شب کی کمر تک گویا
یونہی لہراتی رہے گی یہ سحر تک گویا
برقعِ ابر میں تاروں نے چھپائے چہرے
رات کے سر پہ سیاہی کے بندھے ہیں سہرے
اب کہاں ماہِ منور کی وہ زرّیں قبا؟
رات نے اوڑھ لی سرتابقدم کالی ردا
در و دیوار سیہ، سایۂ گلزار سیاہ
ڈالی ڈالی ہے سیہ، پھول سیہ، خار سیاہ
قمقمے راہ کے یوں، جلتے ہیں مدھم مدھم
دشتِ تنہائی میں جیسے کوئی وقفِ ماتم
یاد نے کس کی یکایک یہ جگایا جادو
دلِ آوارہ کسے ڈھونڈ رہا ہے ہر سو؟
یہ سلگتی ہوئی آہیں، یہ اُلجھتا ہوا دم
یہ شبِ طولِ جدائی، یہ شبِ طولِ الم

چشمِ مشتاق مری کس کی تمنائی ہے؟
کس کی تصویر پھر آنکھوں میں اُتر آئی ہے؟
شوقِ دیدار نہیں بیسود مچل کر آنکھیں
نیند کے سلیقے میں جب ڈھل گئیں یکسر آنکھیں
کس کی آہٹ نے یکایک مجھے چونکا ڈالا؟
خس کدے پر مرے یہ کون ہوا جلوہ فزا؟
دیکھ آؤں تو سہی کس نے پتہ کھڑکا؟
کون ہے؟ کوئی نہیں
کان نے کھائے فریب
آنکھ نے کھول دی آنکھ
"اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا"

حرمت الاکرام

دشمن

سو نہ جانا کہ ہے یہ رات بھی عاشور کی رات
ہو گا کیا اور کوئی نیند سے بڑھ کر دشمن
دیکھنا! آنکھ نہ اک پل کو جھپکنے پائے
ورنہ وہ صبح کہ ہے تیرے لہو کی پیاسی
شمر کی اُنگلیاں تھامے ہوئے بڑھ آئے گی
وقت سے پہلے ہی چمکائے گی نیزے کی اَنی
مسکرائے گی کہ مہمان نے دھوکا کھایا
اور وہ لمحہ کٹھن ہوگا، گراں تر ہوگا
مسکرائے کوئی ہم پر، یہ گوارا کب ہے!

کاٹ لے آنکھوں میں یہ رات کہ اے جانِ فرات!
صبح، کرنوں کا نشانہ نہ بنائے تجھ کو
زندگی ورنہ اندھیروں سے نہ پائے گی نجات
کیا خبر، کتنی زیاں کوش ہو اک رات کی نیند
نیند کا مول چکانا کوئی آسان نہیں
سو نہ جانا کہ ہے یہ رات بھی عاشور کی رات
ہو گا کیا اور کوئی نیند سے بڑھ کر دشمن



رفعت سروش

نئی صبح کی سوغات

ہوا،
جیسے طوفان میرے ہی جذبات کا ہو،
کہر،
جیسے پرتو مرے ہی خیالات کا ہو

•

تصور میں جس کے رہا رات بھر میں
امیدوں کے اس شوخ سورج کی کرنیں
فلک سے اُتر کر
فضا کے دھندلکے میں گم ہو گئی ہیں

•

نئی صبح لائی ہے میرے لئے
صرف شبنم کے موتی
...

راج نرائن راز

یہ سوچ...

لتا نوچ لو — یا
شجر کاٹ ڈالو
مُبادا کہ وہ پیڑ کی ڈال سے — پھر
لپٹ جائے، ایسے
ہو جیسے، اُسی کی
تمہیں ناگوارا جو اُن کا ملن ہو
لتا نوچ لو — یا
شجر کاٹ ڈالو
اگر وقت گزرے پہ تم نے کیا کچھ
تو بے سود ہوگا
یہ سوچو — تو پھر وہ لتا کب رہے گی

■■

مخمور سعیدی

ایک نظم

مٹے آثارِ عہدِ پارینہ — اک نئے دور کی پڑی بنیاد
کر رہے ہیں ہم اہلِ فکر و نظر — دمبدم تازہ بستیاں آباد

•

کچھ یہی وقت کا تقاضا تھا — اور یہی کچھ ہمارا ارماں بھی
زندگی کی نئی فضاؤں میں — ہوس آزاد بھی ہو عریاں بھی

•

حسنِ تہذیب ساتھ دے کہ نہ دے — رَو تمدّن کی پھیلتی جائے
نظر آجائے راہ میں جو کچھ — آگے پیچھے ڈھکیلتی جائے

•

خشک کر دے سمندروں کو اگر — تو نہ ہو کوئی ٹوکنے والا
کوہساروں کو پائمال کرے — تو نہ ہو کوئی روکنے والا

•

کیا بہت کچھ اجاڑ دینا بھی — پئے تعمیر تو ضروری تھا؟
مستقل ہے زیاں کا اک احساس — جو بہ ظاہر بہت عبوری تھا

ہر طرف سر اُٹھاتی دیواریں
تنگ و تاریک کارخانوں میں
اور دبتے سکڑتے یہ میدان
کھو گئے کھیت گم ہوئے کھلیان

•

گھٹ رہی ہے زمین کی وسعت
پھیلتے شہر تا کجا دیکھو
فاصلے ہیں کہ بڑھتے جاتے ہیں
اپنی اپنی حدیں بڑھاتے ہیں

•

بہتی لہروں کو ہم نے روک لیا
اور اب اپنی ضرورتوں کیلئے
گھر بنائے مچلتے دھاروں پر
ڈال دی ہے کمند تاروں پر

•

ہر طرف اک ہجوم گرسنگاں
آسمان و زمیں تصرف میں
ہر طرف بے گھروں کی کثرت ہے
اور پھر بھی جگہ کی قلت ہے

•

نہ رہے جب کہیں بھی گنجائش
سنگدل بندگانِ حرص و ہوس
تو ہم اس طرح سما جائیں!
بڑھ کے اک دوسرے کو کھا جائیں!

•

کچھ پرانے کھنڈر مگر اب تک
دے رہے ہیں صدا - پلٹ آؤ
ہے ہماری چھتوں تلے اب بھی
اک کشادہ فضا پلٹ آؤ

کمار پاشی

پرائی عورت

ہ مجھ سے دور رہ کر بھی مرے نزدیک ہے
س کے
بدن کا رس مری نس نس میں خوں بن کر مچلتا ہے
ہ میرے آسماں کی نیلگوں وسعت
ری دھرتی کا حصہ ہے

رے موسم سے صدیوں دور ہے :
س گھر کی ویرانی
ہاں وہ دیوتاؤں کے ستم ہنس ہنس کے سہتی ہے
بہت بیمار رہتی ہے

مجھے تم کیا بتاتے ہو: وہ کیا تھی
ور کیسی تھی
نہی پھولوں بھری شاخوں کے سایوں میں
سے میں نے بھی دیکھا تھا
سے میں نے بھی چاہا تھا
گر اس میں مجھے پاشی نہ کوئی گن نظر آتا
ما اس پہ نظم کیوں لکھتا!

ایک نظم

لال بھبوکا سے چہرے
اور شعلہ شعلہ آنکھیں
ابھی یہاں ہیں ابھی وہاں
زد میں ان کی سارا جہاں
لاوا رینگے نس نس میں
ونگ نہیں کوئی بس میں
چلیں تو بحر و بر کانپیں
رکیں تو یوں ہنکار بھریں
قید ہوں جیسے جسموں میں
وحشی گھوڑوں کی روحیں

کرامت علی کرامت

ایک کیفیت

چاند کے زخم سے رستا ہے لہو
شمعِ انفاس لٹاتی ہے گہربار آنسو
بام و در پر ہے مسلط غم و اندوہ کی تاریک ردا
کہکشاں سے ہے رواں پیپ کی جوئے سیال
شجرِ خشک کے سائے ہیں قیامت بکنار
پیاس ایک ایسا سمندر ہے
جو گہرائی پہ اپنی ہے سراسر حیراں

وقت کہتا ہے کہ رک جاؤں گا
نبض کہتی ہے کہ تھم جاؤں گی
رات کہتی ہے کہ کٹ جاؤں گی
درد کہتا ہے کہ بڑھ جاؤں گا

اے۔ سی۔ بہار

رباعیات

دل تیرِ نظر سے کبھی گھائل نہ ہوا
مہ پاروں کی جانب کبھی مائل نہ ہوا
میں جادۂ ہستی پہ رہا گرمِ سفر
رستے میں مرے حسن بھی حائل نہ ہوا

(۲)

میں جلوۂ رخسار کا سائل نہ
رنگِ رخِ محبوب پہ مائل نہ
تھا زخمیٔ شمشیرِ حوادث آ
حسنِ لبِ لعلین کا بھی قائل نہ

(۳)

سرگرمیٔ بازار کے قابل نہ رہا
شیدائیٔ ہنگامۂ محفل نہ رہا
آسودۂ منزل میں ہوا تو کس وقت
جب ولولۂ حصولِ منزل نہ رہا

ترلوک آنند (پنجابی)
ترجمہ آزاد گلاٹی

پت جھڑ

جب میں نے شیشے میں جھانکا
چہرہ پت جھڑ کا آیا نظر
وہ چہرہ میرا چہرہ نہ تھا

گھبرا کر صاف کیا میں نے
اس شیشے کو سو بار
کہ دیکھوں
میرا اصلی چہرہ ہے کس تہہ میں نہاں

ہر بار مگر پت جھڑ کا وہی چہرہ اُبھرا
تھک ہار کے میں نے مان لیا
یہ چہرہ میرا ہی ہوگا

کیا پڑی تھی شیشے کو آخر
وہ مجھ سے جھوٹ کہے؟!

آزاد گلاٹی

مر کے بھی....

رات کے جسم پہ جلتا ہُوا
یہ چاند کا گھاؤ
رات کی آنکھ سے بہتے ہوئے
تاروں کے یہ اشک!!

رات کی روح کا کرب
رات کی موت کے بعد
خون آلودہ سحر کے رُخ سے
یونہی چمکے گا
کہ
مٹ جائے گا ___؟

زندگی اگلے جنم میں اے دوست!
یونہی تڑپے گی
کہ
پائے گی سکوں ؟؟

قیصر قلندر

کشمیر اور سرما

مرے تخیل کے شاہزادو، جواں خیالو
حیات کی مرمریں شبیہو، حسیں غزالو
نفس نفس نغمگی جگا دو
نظر نظر رنگ سے جلا دو
قدم قدم روپ جگمگا دو
چمن چمن راگنی کھلا دو

مرے تصور کے گلستاں میں
حیات کے مضمحل مکاں میں
ہر ایک شے منجمد سراسر
پہاڑ برفاب کے ہیں پیکر
شجر شجر کا یخ کے ہیں زیور
نقاب ہے خاور حسیں پر
طرب کی محفل ہوئی ہے برہم
نگار گل ہے نہ حسن شبنم

نگاہ ایام جیسے پرنم
چمن نے پہنا لباس ماتم

فضا پہ ہے مرگ کی خموشی
حیات پابند نیم ہوشی
چمن میں ہے عام سخت کوشی
دلوں میں ہے عزم گل فروشی
یہاں جو کروٹ لی گلستاں نے
حیات یخ بستہ کے جہاں نے
خیال پامال و نوحہ خواں نے
بقا کی امید نیم جاں نے
سکوت شیشے کی طرح ٹوٹا
رکا تھا دھارا جو پھر سے پھوٹا
جواں ارادوں سے گیت پھوٹا!
یہاں پہ کوئی تھا گل نہ بوٹا
مرے تخیل کے شاہ پارو متیں بہا
جمال امید کو نکھارو حسیں بہا
نفس نفس نغمگی جگا دو
نظر نظر رنگ سے جلا دو
قدم قدم روپ جگمگا دو
چمن چمن راگنی کھلا دو ٭٭

مظفر حنفی

دو نظمیں

بے مقصد - بیکار

جھنجھناتے تار
سن سن بولتے بجلی کے کھمبے کے تلے
دو شخص
جن میں ایک بہرا،
دوسرا گونگا ہے،
جانے کس لئے،
سب سے کھڑے ہیں!

ابلاغ سے پرے

فضا میں ایستادہ روشنی کا ایک مینار،
اسی کے پاس اندھیارے کی دیوار،
اِدھر وادی فنا کی،
ہر طرف جس میں دھواں دھار،
جیسے گھرے ہیں کچھ رنگین بادل،
شوخ - گلنار،
اُس طرف خوشبو کی بوچھار،
ذرا ہٹ کر سمندر علم کا،
(جھاگوں کا انبار)،
ادھر الجھن ....
نہ جانے کیا ہے اُس پار!!!

وہاب دانش

فرد کی موت

اب تو چاروں طرف
اونچی اونچی فصیلوں کی بے مہری
چپ کھڑی
رات کی باڑھ پر
کالے کانٹوں کے لب اُگ چکے
تیرگی
کُھردری سی ہتھیلی پر
نوکیں لئے
سرد آنکھوں کی سرحد میں داخل ہوئی
درد کی اُنگلیاں
سانس کے تار میں گُھل گئیں
سارے ایذا رسانی کے بانکے جتن
کرسیوں پر سجے
فیصلہ زرد کاغذ پر لکھتے ہوئے
زعفرانی چمکتے ہوئے حرف سے
پڑھ بھی دو
آخری کوئی خواہش؟
میری پوچھ لو۔

وہاب دانش

شعلے کی زبان

اکثر بیٹھے بیٹھے
مَن میں
انجانا اِک شعلہ لپکے
لب پر جو آنے سے پہلے
اندر کی ساری بوندوں کو
رَہ رَہ جُھلسے
باہر آ کے
ٹھنڈے پتھر والے تن کو
گھیرے میں لے کے
چیخا ئے
پَل پَل جلتے دیکھ کے مجھکو
مجھ سے پوچھے:
"برف کے تودوں میں شامل
اِس جسم کو
کب تک راکھ کرو گے؟"

حسن فرخ

"پانی سے چمٹ گئے ہیں ہم"

ریستوران میں پھیلی ہوئی
آوازوں کے سیلاب میں بھی
فائلوں اور کلرکوں کی نگاہوں میں
بلکتی ہوئی تحریروں میں بھی
گھر کے اک کمرے میں
تنہائی کی آسیب زدہ سوچوں میں بھی
چند لمحے ہیں مرے ذہن کی گہرائی میں
جنھیں ماضی کی کسی سوچتی دھڑکن نے
کھود کر قبروں سے جذبوں کے جہنم میں جلا ڈالا ہے
راکھ کے ڈھیر کو دریا میں بہا ڈالا ہے

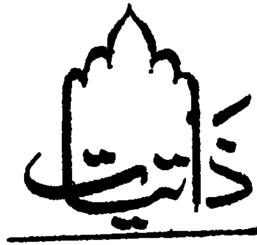
• • •

چند لمحے مری تاریک شعوری رَو کے
اک ابھرتی ہوئی تصویر کو
(جو جاگتی آنکھوں کا منارہ ہے)
مٹا دیتے ہیں

ایک جلتی ہوئی تیلی کو بجھا دیتے ہیں
لمحے،
جو چیختی روحوں کو کہا کرتے ہیں اپنا سایہ
پھینک آیا ہوں میں سائے کو تعیّن کی حدوں سے بھی پرے
اس کا سر دور کسی شہر کی سرحد سے
کیا کرتا ہے دل کی باتیں
پاؤں لیکن مرے قدموں سے چمٹ جاتے ہیں
ٹھوکریں کھا کے بھی موجوں کی
سمندر سے لپٹ جاتے ہیں

•

علی عباس امید



ذاتیات

روز و شب کی گردش سے
درد اُٹھتا رہتا ہے
زندگی کے زخموں سے
خون رِستا رہتا ہے
رات مثل ناگن کے
میرے پاس آتی ہے
مجھ کو ڈس کے جاتی ہے
میرے دل کے دامن پر
زہر پھیل جاتا ہے
اور صبح کی دیوی
تھال میں لہو لے کر
میرے ٹوٹے کھنڈر میں
آرتی سجاتی ہے
فکر و فن کی دنیا پر
یاس کی نظر کر کے
ہر ہی میں حسرت کی
سرنگوں تعاقب میں
کچھ حقیر سکّوں کے
گھر سے میں نکلتا ہوں

سورجوں کی بستی میں
بیچ کر خودی اپنی
نشتروں سے چھلنی ہو
دن ڈھلے پلٹتا ہوں
بے کواڑ دروازے
مضحکہ اڑاتے ہیں
خستہ حال دیواریں
اپنی بجھتی آنکھوں سے
مجھ کو دیکھ لیتی ہیں
سوگوار رہتی ہیں
رات مثل ناگن کے
میرے پاس آتی ہے
مجھ کو ڈس کے جاتی ہے

روز یونہی ہوتا ہے
زخم رِستے رہتے ہیں
درد اٹھتا رہتا ہے
زہر پھیل جاتا ہے
کامنا کی بستی میں

کلپنا کے آنگن میں
خاک اُڑتی رہتی ہے
بے بسی و لاچاری
مفلسی و مجبوری
آرزو کی میت پر
اشکبار ہوتی ہیں
پھر بھی مجھ سے کہتی ہیں
المیہ سہی لیکن
زندگی مسرت ہے

دل کو چھیڑتا ہوں میں
اس سے پوچھتا ہوں میں
زندگی : جو میری ہے
کیا یہی مسرت ہے
درد اٹھتا رہتا ہے
زخم کھلتے رہتے ہیں
خون رِستا رہتا ہے
زہر پھیل جاتا ہے
یہ اگر مسرت ہے

المیہ کہیں کس کو ؟
اور تب تصور میں
کوئی مجھ سے کہتا ہے
یوں نہ دل شکستہ ہو
دائمی اندھیروں میں
دیپ جگمگاتے ہیں
ننھے ننھے جگنو بھی
راستہ دکھاتے ہیں
جاں بہ لب مسافر کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی
کیف بخش ہوتی ہیں
آس کے سہارے تو
عمر کاٹ دیتے ہیں!

اور سوچتا ہوں میں
زندگی کے محبس میں
اک طویل مدت سے
جاں بلب ہوں، تنہا ہوں
درد اٹھتا رہتا ہے
زخم رستے رہتے ہیں

کامنا کی بستی میں
کالپنا کے آنگن میں
خاک اڑتی رہتی ہے
لوگ اک سہارے پر
عمر کاٹ دیتے ہیں
میں تو بے سہارا ہوں
جاں بلب ہوں، تنہا ہوں
(خوشبوئے بدن کیسی
لمس کا تصور کیا
سانس رک کے چلتی ہے)
کیسے روز و شب کاٹوں؟

چھوٹی چھوٹی خوشیاں گر
کیف بخش ہوتی ہیں
حوصلہ بڑھاتی ہیں
زندگی کی راہوں میں
برگِ گل بچھاتی ہیں
میری ایک خواہش ہے
کامنا ہے اتنی سی
داشکِ غم کے ہونٹوں پر
جاں فزا تبسم ہو

یاس بھی فسردہ ہو
زندگی کی ظلمت میں
دور تک اجالا ہو
پیریرنا ملے مجھ کو
غم میں مسکرانے کی
(ہنس کے زخم کھانے کی)
تو اگر عروسِ دل
مجھ کو صرف یہ کہہ دے
ندائے امتیاز علی عباس
آپ کیجئے وشواس
آپ کے تصورات
رات جگمگاتی ہے
صبح مسکراتی ہے
روح نثار ہوتی ہے
زیست گنگناتی ہے

اور تب میں سمجھوں گا
المیہ سہی لیکن
زندگی مسرت ہے!

ایڈمنڈ اسپنسر

سہیل اختر

دوامِ محبت

ریگِ ساحل پہ ایک دن میں نے
لکھ دیا نام اس سمن بر کا
اتنے میں ایک موج تند اٹھی
اور اس نام کو مٹا ڈالا
میں نے جوشِ جنوں میں پھر اک بار
نامِ محبوب ریت کے دل پر
اپنے دستِ وفا سے لکھ ڈالا
میری کوشش کو موجِ دریا نے
کر دیا آہ رائیگاں، لیکن
میری محبوب نے جو یہ دیکھا
خندۂ زیرِ لب کے ساتھ کہا
ہو کے اتنے عظیم شاعر بھی
کتنے سادہ ہو کتنے ناداں ہو
میری دو روزہ زندگانی کو
جاوداں اور مدام کرنے کی
سعیٔ ناکام کر رہے ہو تم
میری تو خود یہی تمنّا ہے
ریگِ ساحل پہ میرے نام کی طرح

میری ہستی بھی مٹ کے رہ جائے
سُن کے یہ بات میں نے اس سے کہا
آہ ایسا کبھی نہیں ہوگا
اس جہاں کی حقیر چیزیں سب
تصرفیاں میں ڈوب جائیں گی
سُن مگر اے مری حسین ہمدم
تیری ہستی رہے گی لافانی
اپنے اشعار کے توسط سے
تجھ کو کر دوں گا، جاوداں اِک
اور پھر آسماں کی رفعت پر
تیرا نام عظیم لکھ دوں گا
اور جب موت ساری دنیا کو
اپنے چنگل میں بھینچ ڈالے گی
اپنی الفت رہے گی پائندہ
اور اک آفتاب کے مانند
تا ابد یہ رہے گی تابندہ
اور ہم سرمدی ترنم سے
عشقِ لاہستی کے گیت گائیں گے

تضاد[1]

حیدر نایاب

جب سیاہ پردے پر
اِک سفید چمکیلا
بے قرار سا نقطہ
جگمگانے لگتا ہے
محوِ دید آنکھوں کو
جُز سفید نقطے کے
کچھ نظر نہیں آتا
آدمی کا پیکر بھی
اِک سیاہ پردہ ہے
اور ضمیر کا نقطہ
(جو بطورِ سرگوشی
جھلملاتا رہتا ہے)
نت نئے شعاعوں سے

ہر نگاہ کو اپنی
سمت کھینچ لیتا ہے
اور اس کے ہی دم سے
ہے وقارِ انساں کا،
ایک وقت ایسا بھی
آدمی پہ آتا ہے
جب ضمیر کا تارا
ابرِ خام کاری میں
خود بھی ڈوب جاتا ہے
اور بعد اس کے پھر
محوِ دید آنکھوں کو
آدمی کے پیکر میں
جُز سیاہ کاری کے
کچھ نظر نہیں آتا!

---

[1] اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مختلف ذہنی پیکر (IMAGES) سمرزم سے لئے گئے ہیں (ادارہ)

ڈاکٹر اختر اورینوی

دار پر چڑھ کے جو تجدیدِ وفا ہوتی ہے
اس وفاداری پہ سو جان فدا ہوتی ہے

جن کو دعویٔ خرد ہو ذرا آ کر دیکھیں
عشق کی راہ بہت ہوش ربا ہوتی ہے

درد میں ڈوبی نگاہوں کی زباں ہے گویا
اور باتوں سے گو یہ بات جدا ہوتی ہے

حُسن جب سوزِ محبت سے جلا پاتا ہے
کیا تجلّی پسِ فانوسِ وفا ہوتی ہے

ان حسیں آنکھوں میں ہے حسرتِ الطافِ کرم
دل ہی جانے یہ قیامت کی ادا ہوتی ہے

پھول کے دیدۂ پُرنم کا یہ انجام بخیر
پتّیاں جھڑتی ہیں شبنم بھی فنا ہوتی ہے

صبح تک حالِ دلِ زار پہ رو لو اختر
اُس گھڑی درد کے ماروں کی دوا ہوتی ہے

شفقت کاظمی

تھا جن سے ربطِ ضبط، نگاہیں بدل گئے
دل راحتوں کے درد کے سانچے میں ڈھل گئے

جب سے ہوئی ہے ان پہ ترے گھر کی راہ بند
کیا جانے کس طرف ترے وحشی نکل گئے

پہلی سی ہم پہ کیوں وہ توجہ نہیں رہی
تو اور ہو گیا کہ ہمیں کچھ بدل گئے

راہِ دیارِ دوست کی اللہ رے دلکشی
دیوانگانِ شوق جہاں سر کے بل گئے

نوبت نہ آئی عرضِ تمنّا کی آج تک
جب بھی ملے وہ آنکھ بچا کر نکل گئے

کچھ زندگی سے فیض نہ پایا تو کاظمی
محرومیوں کی آگ میں چپ چاپ جل گئے

شہاب جعفری

غزل

چلئے جنوں کی منزلِ بیدار کی طرف
اک قافلہ گیا ہے ابھی دار کی طرف

یا وہ متاعِ حسن ہم اہلِ نظر کہ آج
بکتے چلے ہیں مصر کے بازار کی طرف

یارو! زمانہ تو حاسد ہے، کچھ کہے
ہر حال میں ہیں ہم نگہِ یار کی طرف

مرتی ہے سر برہنہ صدائے سکوتِ سنگ
تیشہ ہے دفن دامنِ کہسار کی طرف

وارہ قافلوں کی صدا لوٹتی رہی
صحرا ہی چل پڑا ہے دلِ زار کی طرف

پتھر بھی وہ نوا کہ نہ دل سے نکل سکی
صحرا بھی وہ صدا کہ ہے کہسار کی طرف

•••

وفا ملک پوری

غزل

وہ سکونِ دلِ آشفتہ دلاں یاد آیا
اے غمِ زیست تو ایسے میں کہاں یاد آیا

جب کبھی فصلِ بہاراں میں عنادل چہکے
مجھ کو اے دوست ترا حسنِ بیاں یاد آیا

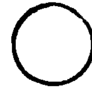
میں نے جو بات کہی تھی وہ نباہی تم سے
تم نے جو قول دیا تھا، مری جاں یاد آیا

تھی یہ نیت کہ خدا ہی سے کریں راز و نیاز
جب بھی سجدے میں جھکے، جورِ بتاں یاد آیا

میں نے کچھ یاد دلایا، تو کہا یاد نہیں
پھر ذرا سوچ کے کہنے لگے، ہاں یاد آیا

تو نے اے غنچۂ افسردہ بڑا کام کیا
کہ انہیں خندۂ پژمردہ دلاں یاد آیا

حضرت شیخ نے یہ کہہ کے اٹھائی دستار
رخصت اے بادہ کشو وقتِ اذاں یاد آیا



نازش پرتابگڈھی

چاندنی جب بھی گلی سے یارو
میرے ساغر میں ڈھلی ہے یارو

آج رندوں میں چلی ہے یارو
اب تو توبہ ہی بھلی ہے یارو

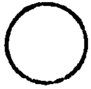
پھول بن جائے گا کچھ رات ڈھلے
درد ابھی صرف کلی ہے یارو

اس ادا سے وہ ہوئے محوِ خرام
زندگی ساتھ چلی ہے یارو

میرے ہی دل کا لہو کام آیا
شمع جب جب بھی جلی ہے یارو

حسن ہے صرف نگاہوں کا فریب
عشق سوزِ ازلی ہے یارو

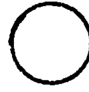
عشق افسانہ مگر بین سطور
حسن عنوانِ جلی ہے یارو



مہدی پرتابگڈھی

مہرباں ان کو پا رہا ہوں میں
جاگتا ہوں کہ سو گیا ہوں میں
اُف یہ رسمِ وفا کہ ان کے لئے
زخم کو پھول کہہ گیا ہوں میں
دیکھ لے اپنا عکس تو مجھ میں
زندگی تیرا آئینہ ہوں میں
مجھ سے روشن ہوئی ہے راہِ حیات
شمع کی طرح جل رہا ہوں میں
جانے کن منزلوں میں لایا جنوں
خود سے بیگانہ ہو چلا ہوں میں
راہ اپنی نکالی ہے میں نے
اپنی منزل کا رہنما ہوں میں
زخم کتنے رہِ وفا میں ملے
دل کے داغوں سے پوچھتا ہوں میں
سنگ اٹھنے لگے ہیں مجھ پر بھی
ایسی منزل پہ آ گیا ہوں میں
جس نے لوٹا مرا سکونِ حیات
پھر وہی لمحہ چاہتا ہوں میں
یہ بھی کیا زندگی ہے اے مہدی
ایک افسانہ بن گیا ہوں میں

شباب للت



کیا ملا جا کر ہمیں اِک دل رُبا کے شہر میں
لُٹ گئے ہم سادہ دل اس بے وفا کے شہر میں

آہ اِن جلوؤں سے اب منہ موڑنا دشوار ہے
وحشتِ دل کھینچ لائی کِس بلا کے شہر میں

گنگناتی ہیں فضائیں، رقص کرتی ہے بہار
جھومتی ہے چاندنی اُس مہ لقا کے شہر میں

غم کی پرچھائیں نظر آتی نہیں کوئی وہاں
عشرتِ کونین ہے اس دل ربا کے شہر میں

ہیں بِکاؤ مال حسن و عشق دونوں ہی وہاں
دل کی قیمت پوچھیے گا آپ جا کے شہر میں

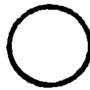
اپنا حق خود چھین سکتے تھا نہیں تھا حوصلہ
جا بسے ہم لوگ تسلیم و رضا کے شہر میں

زندگی ہے اصل میں اک خوبصورت فاحشہ
ہم بھی آئے برہنہ اس بے حیا کے شہر میں

بندہ پرور جب کبھی فرصت ملے آ جائیے
کچھ دنوں کے واسطے مجھ بے نوا کے شہر میں

کوچۂ جاناں کی ہے کچھ بات الگ ورنہ شباب
بن بلائے تو نہ ہم جائیں خدا کے شہر میں

اسلم سہیل



پیشِ نگہہ یار میں کچھ سوچ رہا ہوں
ٹھہرو کہ سرِ دار میں کچھ سوچ رہا ہوں

کونین کی ہر سوچ، مری سوچ میں گم ہے
اے نرگسِ بیمار میں کچھ سوچ رہا ہوں

یہ راہِ وفا اور یہ کانٹوں بھری دنیا
تنہا سرِ گلزار میں کچھ سوچ رہا ہوں

جا گردشِ ایام دبے پاؤں گزر جا
ہاں اے نگہۂ یار میں کچھ سوچ رہا ہوں

گم وسعتِ آفاق ہوئی جاتی ہے اسلم
شائد پسِ افکار میں کچھ سوچ رہا ہوں

پرکاش فکری

غزل

میں کہ اک آندھی گپھا میں قید ہوں
پھر ابھردوں کا سبق کیسے پڑھوں

پھول شاخوں پر بڑے مسرور ہیں
جی مگر یہ چاہتا ہے توڑ لوں

تو ابھی سایہ ہے، میرا جسم بن
تب کہیں جا کر تجھے اپنا کہوں

ہے بلا کا زور اس طوفان میں
کون جانے کس کی چوکھٹ پر گروں

گھر ہوئے تنکوں کی صورت منتشر
رات سڑکوں پہ بہا دریائے خوں

لوگ اتنے! اجنبی سارے مگر
آگ سینے کی کہاں ٹھنڈی کروں

پوچھتا ہے روز مجھ سے خواب میں
بول فکری! زہر پی کر سو رہوں

●●●

عنوان چشتی

ٹھہرے نہ ہم کہیں نہ ہے آوارگیٔ شوق
دشتِ جہاں میں مثلِ ہوا کھیلتے رہے
یوں بھی ہوا کہ رزم گہہ خیر و شر میں لوگ
نظریں چرا کے دل کا جوا کھیلتے رہے

یہ شام کے غبار میں لپٹی ہوئی شفق
لہرا رہے ہیں آگ کے شعلے سے دشت پر
شبنم چرا سکے گی نہ پھر آج رنگِ گل
نکلا ہے چاند — رات کو پھر اپنے گشت پر

اب کس کے زخمِ دل کا مداوا کرے کوئی
آنکھوں میں ہر کسی کی ہے نشتر چھپا ہوا
یارو کہیں یہ خوف کا آسیب تو نہ ہو
رستے میں اک پہاڑ سا کیا ہے کھڑا ہوا

ممکن نہیں کوئی مری تقدیر چھین لے
آنکھوں سے خواب، خواب سے تعبیر چھین لے

تہہ خنجر بھی ہیں نظروں میں چمن کے خا
اب مری حسرتِ تعمیر حجابوں میں نہ

نسیم فاروقی

غزل

ملا جو رنگِ ندامت خطا کے دامن میں
کہاں وہ حسن کسی پارسا کے دامن میں

خراشِ خار کو حسنِ سفر بنا کے چلو
لہو کے پھول ہوں ہر نقشِ پا کے دامن میں

ترے سفر سے دھڑکتے ہیں دل ستاروں کے
وہ منزلیں ہیں مری گردِ پا کے دامن میں

ترے لبوں کے تبسّم نے جو بکھیرے تھے
ابھی وہ پھول کھلے ہیں فضا کے دامن میں

یہ کس کے عارضِ رنگیں کو چھو کے آئی ہے
ہزار رنگ ہیں بادِ صبا کے دامن میں

انہیں ڈبو کے مسرّت ہوئی ہے طوفاں کو
جو سر چھپائے رہے ناخدا کے دامن میں

وہ جس سے تم نے ہزاروں کے گھر جلائے ہیں
وہ آگ خود کبھی دیکھو لگا کے دامن میں

کسی سے ہم نے محبت کی بھیک مانگی تھی
وہ خاک ڈال گیا مسکرا کے دامن میں

انہیں سے پھول بھی ملتے تھے ان کی قدر کرو
جو دوست لائے ہیں کانٹے چھپا کے دامن میں

یہ واردات ہر اک سنگِ میل پر لکھ دو
لہو کے داغ ملے رہنما کے دامن میں

جبینِ دوست پہ بل ہیں تو غم نہیں تسنیم
شکن نہ آئے ہماری وفا کے دامن میں

کفیل آذر

غزل

اپنے اس جرم کا اقرار کیا ہے میں نے
آپ کے غم کو بہت پیار کیا ہے میں نے

اپنے خوابوں کی سلگتی ہوئی تنہائی سے
آپ کا ذکر بہت بار کیا ہے میں نے

بارہا کھا کے ترے عارض و گیسو کی قسم
احترامِ رسن و دار کیا ہے میں نے

جانے اس جرمِ محبت کی سزا کیا ہوگی
آج ذکرِ لب و رخسار کیا ہے میں نے

بات کہنے کی نہیں آ چکی شہرت کے لئے
خود کو رسوا سرِ بازار کیا ہے میں نے



غزل

جعفر رضا نقوی

بخشا ہے جذبِ دل نے ہمیں حوصلہ نیا
آ راہ پر بتائیں تجھے راستہ نیا

ہے زندگی کا موڑ نیا راستہ نیا
اے دوستو! بناؤ کوئی قافلہ نیا

کشتی شکستِ خوردۂ طوفاں ہوئی تو کیا
ناکامیاں بھی دیں گی کوئی حوصلہ نیا

وحشت نے بڑھ کے دشت نوردی کی دی ہے داد
پاؤں میں جب پڑا ہے کوئی آبلہ نیا

اٹھی ہے میری سمت وہ چشمِ فسوں طراز
گذرے گا آج دل پہ کوئی حادثہ نیا

کیوں ملتفت ہوا ہے وہ بیگانۂ وفا
ہونے لگا ہے دل کو مرے وسوسہ نیا

دونوں طرف سے ربطِ مسلسل کے باوجود
ہر ہر قدم ہے عشق میں اک مرحلہ نیا

خرمن جلا، زبان کٹی، بال و پر کٹے
ہے گلستاں میں شام و سحر مشغلہ نیا

مانا، ہے آج فطرتِ انساں ہوا بدوش
لیکن قدم قدم پہ ہے اک فاصلہ نیا

•••

غزل

علیم افسر غازی پوری

یہ شب کی پیٹھ میں سورج کا وار تیکھا ہے
بکھر رہی ہے کرن کوئی خواب ٹوٹا ہے

کبھی خوشی کے بدن پر بھی رنگ جاتا ہے
وہ دل کے کونے میں جو یاد کا سپنولا ہے

شفق ہو، شام ہو، اور جھیل کا کنارا ہو
تو دل میں جذبۂ آوارگی اُبھرتا ہے

اُبھر گئے مری تخئیل کے بدن کے خطوط
کچھ ایسے لفظوں کا ان کو لباس بخشا ہے

وہ میرا حالِ پریشاں کبھی پوچھتے کیوں
کبھی گھٹاؤں نے صحرا کا حال پوچھا ہے

یہ کیا ہے؟ سوچ رہے ہیں پرندے شاخوں
سحر ہوئی بھی نہیں ہے، مگر اُجالا ہے

اُفق کے نیچے کہیں جل رہی ہے دل کی چتا
تبھی فضا میں ابھی تک دھواں سا پھیلا ہے

•••

ماجد الباقری

ناگن

کینی کو اپنی پچیس سالہ زندگی میں ثروکیہ کا کردار بہت پسند تھا۔ وہ
ں سے محبت کرنے لگا تھا اس کا خیال تھا کہ طویل بحری سفر طے کر کے فلپا کے
نت نظیر جزیرے میں ضرور جائے اور وہاں جا کر ثروکیہ سے اپنی محبت کا
ظہار کرے جہاں کی عورتوں اور مردوں کے بارے میں ثروکیہ نے اسے یقین
لایا تھا کہ وہ بہت بھولے بھالے اور معصوم سیرت ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں
ی نہیں لڑتے نہ ایک دوسرے پر دعوے نہیں کرتے، انہیں اپنی برتری اور
تری کا بالکل احساس نہیں۔ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور دل سے
ہتے ہیں۔ ان کا فن حسن کا مظہر ہوتا ہے اور زندگی کی طرف بھرپور رہنمائی کرتا
ہے۔ وہ بے کار باتیں کر کے وقت ضائع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ انسانی
ذبات کو مشتعل کرنے سے خاموش رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ لوگ
یسی شدت سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ حیران رہ جائیں۔
سے امید تھی کہ وہ وہاں ضرور سکون حاصل کر سکے گا۔

فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے ثروکیہ کے کہنے پر کائنات
کی تخلیق اور ارتقاء پر دو ضخیم تخلیقات پیش کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور اس
صنیف کی آمدنی سے فلپا کے سفر کے اخراجات کو پورا کرنے کا خیال تھا ابھی
رف ایک کتاب ہی پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس میں بھی باب "انسان اور جذبۂ
بت" ادھورا تھا۔ ثروکیہ، کینی کے نظریہ محبت کو سمجھنے کے لئے زور دے
ہی تھی کہ کینی جلد کوئی فیصلہ اپنے قلم سے صادر کرے تاکہ کتاب مکمل ہو جائے
ور فلپا جانے کا قصد بھی پورا ہو جائے، مگر کینی چونکہ تحقیق کے باوجود
سی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا اس لئے اس ضمن میں التوا کو ضروری سمجھ
رہا تھا اسے احباب نے بارہا اکسایا کہ وہ "کالج میگزین" میں رومانی افسانے
لکھا کرے تاکہ اس کے جی کا بوجھ ہلکا ہو۔ لیکن ایسی ہلکی پھلکی تحریروں کی
طرف اس کی طبیعت مائل نہیں ہوئی۔

وہ زندگی کے ہر شعبے میں با اصول تھا۔ وہ زندگی کو اپنے بنائے
ہوئے اصولی سانچوں میں ڈھالنے کا عادی تھا۔ اس کے باوجود اسے
کسی کی دل شکنی کبھی گوارا نہیں تھی۔ وہ جیسی خاموشی اور سادگی سے اپنی
زندگی گزار رہا تھا اس کا دل اس سے مطمئن تھا۔ اس کے ذاتی اور منفرد
رویہ کی وجہ سے کالج کے طلباء نے اسے اخلاقیات کے پیغمبر کا خطاب
دے رکھا تھا۔ اس کی سنجیدگی میں بڑی گمبھیرتا تھی۔ اس کے مطالعہ
مشاہدہ، تجربہ اور تعلیم نے اس کے قول اور فعل کو تجزیۂ زندگی سے اتنا ہم
آہنگ کر دیا تھا کہ غیر متعلق خواب بھی اسے دکھائی نہیں دیتے تھے اور اگر
کوئی خواب عجیب و غریب اسے دکھائی دیتا تھا تو وہ اکثر خواب ہی میں سمجھ
جاتا تھا کہ یہ خواب ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ توقع
کے خلاف ایک رات عالم خواب میں اس نے دیکھا کہ اس کی کتاب کی دونوں
جلدیں شائع ہو کر ملک کے گوشے گوشے میں مقبول ہو گئی ہیں اور ثروکیہ
نے اسے فلپا پہنچ کر خط لکھا ہے جس کے سہارے سے وہ اپنی تمام رکاوٹوں
کو ختم کر کے منزل کی طرف چل دیا۔ ان ہونی سی باتیں اس کا دل رجھا رہی
تھیں مناظر کی کیف سامانی اور فضا کی سحر انگیزی اس کے دل و دماغ
پر حاوی تھی۔ اب وہ اپنی پہلی نیند گاہ سے ہزاروں کوس دور آ گیا تھا۔
سفر کا آخری حصہ فالا کی آبنائے تھی جہاز یہاں لنگر انداز ہو گیا اس
نے تنہا سفر جاری رکھنے کے لئے ایک کشتی کا رخ کیا جس کے تختے گل چکے
تھے اور بلیوں کے اوپر بادبان جلے ہوئے کپڑے کی طرح لٹک رہا تھا۔

کیفی نے اس کشتی پر سوار ہونے کی ٹھان لی۔ ارادہ کرنے کی دیر تھی کہ بادبان کے چیتھڑوں میں پیوند لگ گئے پھر ایک نظر ڈالی تو کشتی صحیح و سالم تھی۔ [illegible] کیفی کی خواہشات اور جذبات کی تمثیل میں آگئے۔ [illegible] شفق رنگ شیشے کی تہیں کر دیں پینے لگیں پشتی [illegible] ہوئی دو سہ پانی کی خاموش سطح پر رینگتی۔ کا [illegible] سمٹ گئی۔ اندھیرے کے دل نیلی برقی لہروں میں تبدیل ہو گئے۔ اس کی روح کانپ رہی تھی۔ اس کی نظر سہارے کی تلاش میں مخالف سمت کو اٹھی۔ دل دل کی گہری سیاہی میں نامعلوم کا ایک جزیرہ گوہر شب چراغ کی طرح چمکتی ہوئی تھا۔ بادلوں کی طرح جگمگا رہا تھا۔ مسرت کا اثر قبول کرنے کے لئے اس کی نگاہ ابھی ٹھہر رہی تھی کہ سوکھے ہوئے پتوں کو روندتی ہوئی ایک ناگن۔ [illegible] ساتھ پھیلا کر کیفی اور [illegible] کے جزیرے سے کر نکل گئی۔ کیفی پر خوف اور حیرت کا عالم طاری تھا اس کے بعد یہ خواب روشنی کے سیاہ دھبے کی طرح سمٹا اور ذہنی قمقمے کے ایک نقطہ پر آکر غائب ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہی ہیلی بیری ہوسٹل کا سپاٹ سا کمرہ تھا اور الماری میں سجی ہوئی فلسفے کی کتابیں۔

کیفی شعوری طور پر سالسا کے اس حادثہ کو بھول چکا تھا جس کا ردعمل ۱۵ سال کے کامل وقفے کے بعد اس کے خواب میں رونما ہوا۔ سالسا اور کیفی دونوں ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ پلے اور بڑھے اور ساتھ ہی ساتھ گاؤں کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے رہے دونوں کی عمریں آٹھ اور نو سال کے درمیان ہوں گی۔ ایک شام جب کہ وہ دونوں بارش کے دنوں میں گھر کے قریب ایک باغ میں کھیل رہے تھے ایک ناگن رینگتی ہوئی آئی اور اپنا کام کر کے چلی گئی۔ سالسا بے ہوش زمین پر پڑی تھی اور کیفی سکتے کے عالم میں کھڑا تھا اس نے ناگن کو واپس ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا وہ بدحواسی کے عالم میں چیخا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ چھوٹی سی بچی ناگن کے زہر کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ وہ مر گئی اور اس کے منہ سے جھاگ نکلتے رہے۔ کیفی کو سالسا بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے سالسا کی اتفاقیہ جدائی کو مہینوں محسوس کیا وہ مہینوں بے کل رہا۔ تڑپتا رہا اور روتا رہا آخرکار یہی صدمہ اس کی زندگی میں ایک حیرت انگیز اور عجیب و غریب انقلاب لانے کا سبب بنا اور اس کی زندگی کے حقیقتاً اصولی اسی حادثہ کے خوف کی وجہ سے وضع ہوئے بہر طور وہ اسی کشمکش میں جیا اور جیتا رہا۔

۱۰ بجے صبح کے قریب ثروکیہ روپہلا غرارہ پہنے ابریشمی بالوں کے [illegible] اور ٹیسر گردن پر ڈالے آنکھوں پر نیلے شیشے کا چشمہ لگائے [illegible] ہاتھ میں دبائے بورڈنگ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوا۔ [illegible] جانے کے لئے تیار ثروکیہ کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ دراں کیفی اس کا ذہن بالکل محو ہو چکا تھا اور پندرہ سالہ پرانا حادثہ بھی اس کے لاشعور میں دفن۔ ثروکیہ کے آتے ہی اس کے چہرے پر بشاشت اور شگفتگی ظاہر ہونے لگی۔ اس نے نظر اٹھائی۔ ثروکیہ اس کے قریب آگئی۔

"آپ آگئیں" کہکر وہ اپنی کرسی خالی کر کے میز پر بیٹھ گیا۔

"اور سنائیے" وہ زیر لب مسکرایا۔

"[illegible] آج صبح آئی تھی۔ ذرا جلدی آگئی تھی۔ ناشتہ بھی میرے ہی ساتھ کیا ہے۔ کہہ رہی تھی آپ ضرورت سے زیادہ خاموش رہتی ہیں، کیا فلسفے کے علم اور سوچنے کی الجھی ہوئی عادت سے آپ کو وہ لذتیں میسر آجاتی ہیں جو بظاہر ہر ایک جوان لڑکی کے لئے ضروری ہیں۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" کیفی نے کہا۔

"میں نے اس سے یہی کہا کہ مجھے ان تمام لذتوں کا علم ہے اور ان کی تحصیل کے ذرائع پر بھی قدرت حاصل ہے مگر وہ تمام باتیں غیر ضروری ہیں جنہیں تم ضروری سمجھتی ہو۔"

کرانا میری طرف غور سے دیکھنے لگی "مگر یہ بات عجیب ہے کہ تم سے بے پناہ محبت ہے۔ جب کہ اس نے تمہاری محبت کا اعتراف کیا۔" میں نے کہا "تمہیں یاد ہے ایک مرتبہ تم نے مجھ پر کیفی سے اپنی ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا تھا جس پر میں نے جواب دیا تھا کہ ہنگامی ہو سکتا ہے روحانی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ دنیا میں ہر فرد ساتھی کی ضرورت ہے۔ سچے ساتھی کی خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ جنہیں انسانوں میں محبت نہیں ملتی وہ جانوروں اور گڑیا گڈوں سے پیار ہیں اور اکثر حالات میں جان بھی دے دیتے ہیں۔

کرانا بولی "سمجھوتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک کیفی بھی اس کا اظہار نہ کرے یہی سوال اگر میں تم سے پوچھوں تو تمہارا [illegible] جواب ہے جب کہ اظہار محبت کے معاملے میں کیفی بہت محتاط واقع ہوا

"میرے پاس بہت سے جوابات ہیں۔ میں صرف کردار سے متاثر ہوتی ہوں۔ جیسے تم نہیں سمجھ سکتیں" کرانا کی آنکھوں کے نرم گوشوں سے آنسوؤں کی لڑی پھسل کر میز پر بکھر گئی۔

"تم جواب صاف صاف الفاظ میں سننے کی کوشش نہ کرو۔ اس لئے کہ تم میرے خالص فلسفیانہ نظریات سے کانپ جاؤ گی۔ پھر بھی مجھے تمہاری حالت پر رحم آتا ہے۔ کوشش کرونگی کہ تمہیں میرے تعلقات کی وجہ سے ٹھیس نہ پہنچے۔"

کالج جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ کیفی میز سے اٹھا اور دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد اپنی اپنی کلاسوں میں داخل ہو گئے۔

ژروکیہ نے یہ دن کالج میں بڑی بے چینی اور اضطراب سے گزارا۔ چھٹی ہوتے ہی وہ سیدھی کیفی کے کمرے میں آئی۔ اب کیفی کے شعور پر لاشعور حاوی ہو رہا تھا۔ سماجی بہروپ اور خود ساختہ وضع داری کے پردے ایک ایک کر کے ذہن سے اٹھ رہے تھے۔ السا، بچپن، کھیل کود، ناگن اور جدائی اور اس رات کے غیر معمولی خواب کے ٹکڑے اس کے ذہنی خلا میں بکھر رہے تھے۔ یہ الجھن اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس کی تھی۔ ژروکیہ اور کرانا کے تعلقات نے اسے اور بھی الجھا دیا تھا۔ ژروکیہ کے پیروں کی چاپ سنکر اس نے اپنے چہرے سے مایوسی اور فکرمندی کے نقوش دور کرنے کی کوشش کی۔ پیشانی اور رخسار کے خطوط میں مصنوعی دلکشی اور شگفتگی کا رنگ بھر کر خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ مگر ژروکیہ کے چہرے پر گہری اداسی، کرب اور اضمحلال کا عالم دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔

"کیا ہوا آج بہت مغموم ہیں آپ" کیفی نے ژروکیہ سے کہا۔

"ہاں"! خلاف معمول میں آج بڑی الجھن محسوس کر رہی ہوں اور آپ کی مستقل خاموشی اس کا سبب ہے۔"

"میری خاموشی اس کا سبب ہے!"

"ہاں!"

"مجھے بھی بتایئے آپ کی الجھن کس طرح رفع ہو سکتی ہے" کیفی نے کہا۔

"دیکھئے کرانا آپ سے محبت کرتی ہے جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں"

"یہ غلط ہے" کیفی نے کہا۔

"یہ سچ ہے وہ میرے پاس بیٹھی گھنٹوں سسکیاں لے لے کر روتی رہی۔ آج کالج میں بھی نہیں آئی۔ وہ آپ کی بے پروائی پر اپنی مجبوری کے احساس سے آنسو بہاتی رہتی ہے"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ مجبور نہیں ہے۔ وہ جتنی مجبور ہے اتنی آزاد اور بے باک بھی ہے وہ ایک جذباتی لڑکی ہے جس سے اگر ایک مرتبہ بھی میں مسکرا کر بات کر لوں تو وہ ہمیشہ مجھ سے ہنسی اور مسکراہٹ کی خواہش مند رہے گی۔ اور آپ اس کا نام لے کر محبت کے مسئلہ پر مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتی ہیں۔ کیا آپ نے میری توجہ کو کبھی محسوس نہیں کیا فرق اتنا ہے کہ کرانا نادانی کی وجہ سے محبت کا اظہار کرتی ہے روتی ہے، چیختی ہے اور ہم سنجیدگی کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتے وہ محبت کم کرتی ہے اور اظہار زیادہ۔ ہم محبت زیادہ کرتے ہیں اور اظہار کم۔"

ژروکیہ کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ محبت کا دبا ہوا جذبہ نشہ کی طرح شرابی آنکھوں کے سرخ ڈوروں سے پھوٹنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ آج کیفی اپنی روحانی محبت کا اظہار کر ہی گیا۔ مگر کرانا کا تصور اسے پریشان کرنے لگا۔ اس نے سوچا کرانا کا کیا حشر ہوگا اس کی نظر میں اب میری کیا وقعت رہے گی اس نے پھر سوچا اور پھر کہا۔

"کیا آپ کو کرانا سے محبت نہیں؟"

"ہاں! مجھے کرانا سے محبت نہیں ہمدردی ہے اس لئے کہ میں اس کی نظر میں زیادہ اہم ہوں اور اخلاقاً میں نفرت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا" کیفی نے کہا۔

"آپ کو کرانا کے سامنے یہ بات صاف صاف کہنا ہوگی"

"نفرت کا اظہار میرے بس کی بات نہیں" کیفی نے کہا۔

"آپ بڑے بزدل ہیں"

"بزدل نہیں ایذا پسند ہوں۔ خود کو دکھ پہنچا کر لذت محسوس کرتا ہوں۔ یہی میرا آرٹ ہے۔ یہی میرا بہروپ ہے جس سے شاید آپ محبت کرتی ہیں"

"تو کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔" ژروکیہ نے پوچھا۔

"ژروکیہ تم میرے منہ سے محبت کا لفظ کیوں سننا چاہتی ہو۔ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں کیا یہ تم پر ظاہر نہیں؟ اس کے علاوہ تمہارے کہنے پر میں اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ میری شخصیت کا معاملہ ہے۔"

ژدوکیہ حیران ہوگئی۔ اس نے اپنے تصورات میں ایک آہنی گرہ کو چکر لگاتے ہوئے دیکھا اس نے سوچا کیفی واقعی سنگ دل ہے یہ کیسی بھیا محبت کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یہ سب کیا ہے ؟

"میرے نزدیک زندگی سے متعلق تجربہ کی معمولی سی کڑی اور تمہارے حق میں ایک عظیم حادثہ"

"آپ کے الفاظ ہی میرے لئے حادثے سے کیا کم ہیں" ژدوکیہ نے کرخت لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوا انسان اس کے مقابلے کے لئے صدیوں پہلے سے تیار ہے۔ حادثہ اب تو کوئی اجنبی حقیقت نہیں" کیفی نے کہا۔

"تو پھر میں جاتی ہوں"

"تم جا سکتی ہو اگر تمہیں اس سے خوشی میسر آئے"

"میں آپ سے پھر کبھی نہیں ملونگی"

"ژدوکیہ کوئی بات چلا کر نہ کہو میرا گلا گھٹنے لگا ہے۔ جو خاسب عمل چاہو شروع کردو اس سے مجھے زیادہ تکلیف ہو یا کم شرط یہی ہے یہ تمہیں خوشی حاصل ہو"

وہ اس فقرے کی تاب نہ لا سکی۔ اسے یقین تھا کہ کیفی صرف اسی سے محبت کرتا ہے مگر وضع داری کے پیش نظر یا کسی نامعلوم خوف کی بنا پر اظہار محبت کر کے پابند نہیں ہونا چاہتا۔ وہ کرسی پر خاموش بیٹھ گئی۔ جوش گریہ کی کیفیت طاری ہوئی اس نے ہونٹوں کو لاکھ دبایا مگر لبوں کو لرزش نہ ہوئی، نتھنے کپکپائے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو دو پٹے پر آ رہے۔

کیفی نے ایک بار اس کی طرف دیکھتے ہوئے جھرجھری لی پندرہ سال سے ذہن کے حسین ریشمی پردے پر دھول اور گرد پڑی ہوئی تھی ایک ہی جھٹکے میں صاف ہو گیا۔ پردے کی سطح آئینہ کی طرح جھلملا رہی تھی۔ اب وہ دور بہت دور فضا کے ان خیالی جزیروں میں گھوم رہا تھا جہاں ژدوکیہ پہلے رہتی تھی۔ جہاں اسے پہچاننے والا ژدوکیہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا اس پر اعصابی دورے کی گرفت سخت ہونے لگی ــــ یہ اعصابی دورہ اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری دورہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی تمام رگوں نے جسم کی ہڈیوں کو لوہے کے مضبوط تاروں کی طرح جکڑ لیا

اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ ناگن ڈس کر چلی گئی تھی۔ وہی ناگن جس نے سالسا کو ہلاک کیا تھا۔ وہی ناگن جو فاسفورس کے جزیرہ کو نگل گئی تھی۔ ناگن کے چھوٹے چھوٹے بچے کالے پیلے، سنہرے اور بھورے اس کے بھیجے میں رینگتے رینگتے خاموش ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی کتاب جسے وہ ترتیب دے رہا تھا اٹھائی۔ محبت کا باب ابھی ادھورا ہی تھا پھر بھی وہ ژدوکیہ کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں وہ امانت دینا چاہتا تھا۔ یہی کتاب تو اس کی تخلیق تھی۔ زندگی کا آخری وہ ہاتھ سے چھوٹ کر ژدوکیہ کی رانوں پر گری۔ وہ چونک کر کھڑی ہو کیفی کی نبض ڈوب چکی تھی اور ژدوکیہ جیسے اپنی ہی زبان سے کہہ رہی ہو میں ناگن ہوں، میں ناگن ہوں، میں نے اسے ڈس لیا ہے۔

اب وہ آہنی گرہ ژدوکیہ کے ذہن میں کھل چکی تھی جو کیفی کی محبت کی وجہ سے کافی مضبوط ہو گئی تھی۔

بقیہ مولانا ابوالکلام ازاد

گیا ہے یکقلم ختم ہو جائے گا۔"

یہ ہوئی سچی اور صحیح تفسیر بلاغت کلام کے مجازات اور مقصود کو صحیح طور پر سمجھ کر انہیں بیان کر دینا ہی تفسیر کا حق ادا کرتا ہے۔ اسی کہتا ہوں کہ ایسے ہی لوگوں کی موت سے انسانی زندگی کی راہیں تاریک ہو اپنے ایک خط میں مولانا آزاد شبلی نعمانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ـــ مولانا کی ذات نوع بنوع دکمال کے رنگارنگ مظاہر کا ایک عجیب مج جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں ــــــ سرتاسر بے مغز و بے پور ... وہ کیا گئے کہ علم و فن کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہو گیا"

اور میں کہتا ہوں کہ مولانا کیا گئے کہ نہ صرف علم و فن بلکہ قوم، سیا صحافت، تقریر و تفسیر کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہو گیا"

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

انسان تو بہت نکلتے ہیں مگر ابوالکلام آزاد جیسے انسان بہت نہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں ــــ ...

ثریا محمود ندرت

کسی نے ڈھونڈ لی منزل!

لکھنؤ کے ایک قدیم محلہ میں احسان اللہ کا بڑا سا ذاتی مکان تھا۔ گھر میں ان کی بیوی فریدہ اور تین بچے تھے۔ عزمیہ بڑی تھی منظر اور عروسہ اس چھوٹے تھے۔ احسان اللہ نے تمام عمر ملازمت ہی کی تھی اور اب پنشن پا تے۔ اس کے باوجود کہ ان کے ہاں دولت کی ریل پیل نہیں تھی وہ بڑی وار اور پرمسرت زندگی گذار رہے تھے۔ احسان اللہ اپنی پنشن پر قانع اور فریدہ بڑی کفایت شعاری سے گھر کا انتظام سنبھالے ہوئے تھیں۔ وہ سادہ خوراک اور سادہ زندگی کے عادی ہو چکے تھے لیکن تعلیم حاصل نے کے سلسلہ میں ان کے تینوں بچے کسی رئیس کے بچوں سے پیچھے نہیں تھے اور سے اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

اس کے برعکس احسان اللہ کے بڑے بھائی نعمان اللہ کے ہاں دولت راط تھی۔ ان کی شادی زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی والدین کی اکلوتی اولاد تھیں اس وجہ سے ان کی تمام دولت کی ہ مالک تھیں۔ شادی کے بعد انھوں نے شوہر کو تجارت کی طرف توجہ ئی اور نعمان اللہ نے بیوی کی افراط دولت سے کاروبار شروع کر دیا قی کرتے گئے۔ ان کے ایک ہی لڑکا تھا اخلاق، اور عزمیہ ہی سے ب تھی۔ اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد اخلاق سے اپنی نسبت کا ذکر تو نا تھا لیکن اسے دیکھنے کا اتفاق آج تک نہیں ہوا تھا کیونکہ اخلاق ر کا تمام تر حصہ ننھیال میں گذرا تھا۔ اس طرح شاید وہ احسان اللہ ا بیوی اور بچوں سے بھی واقف نہ تھا۔ نعمان اللہ نے خود بھی شادی بعد تمام زندگی اپنی سسرال الہ آباد میں گذاری۔ ان کا دھندلا لا سا نقش عزمیہ کے ذہن میں محفوظ رہ گیا تھا کیونکہ اس نے بھی کبھار دادی کی زندگی میں اپنے ہاں آتے دیکھا تھا اور چونکہ ہ منظر اور عروسہ سے بڑی تھی اس لئے اس کے ذہن میں ان کا ہلکا سا نقش موجود تھا۔

ایک بار الہ آباد سے نعمان اللہ کے منشی جی آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ اخلاق اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گیا ہے۔ یہ خبر عزمیہ تک بھی پہنچی۔ اسے بڑا دکھ ہوا۔ جو شخص ابھی سے اتنا لاپرواہ ہو سکتا ہے اس سے آئندہ کیا امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ عزمیہ کو اس کے جانے کا رنج نہیں تھا بلکہ اس کا ملال تھا کہ اس نے جاتے وقت اس کے والدین سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اگر وہ اس سے منسوب رہنا چاہتا تو اپنے چچا اور چچی سے مل کر جاتا اس کا فرض تھا۔ اس کے کردار کا یہ پہلو جب عزمیہ کے سامنے آیا تو اس کی طبیعت بوجھل ہو گئی۔ حالانکہ احسان اللہ، ان کی بیوی اور خود عزمیہ بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ ان سے اجنبیت اور دوری میں نعمان اللہ کی بیوی کا بہت بڑا ہاتھ ہے کیونکہ عزمیہ سے اخلاق کے رشتہ کی وہ شدت سے مخالف تھیں اور اپنے لڑکے کی نسبت کسی بہت ہی امیر گھرانے میں کرنا چاہتی تھیں لیکن نعمان اللہ اپنی تمام تر لاپرواہیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس رشتہ پر اب بھی قائم تھے۔ لیکن عزمیہ کو اخلاق اور اس کے والدین کی اس کشمکش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اپنی تعلیم عزیز تھی اور وہ ہر چیز سے بے نیاز پڑھائی میں مگن تھی اور وقت کا تیز رفتار پنچھی پرواز میں مصروف تھا۔

منظر کا بی۔ اے کا آخری سال تھا۔ عروسہ بھی آئی۔ اے کے فائنل ایئر میں تھی اور عزمیہ ڈاکٹری کے آخری سال میں تھی۔ انہی دنوں نعمان اللہ کے انتقال کی خبر ملی۔ تار پہنچتے ہی احسان اللہ فریدہ کے ساتھ الہ آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ عزمیہ، منظر اور عروسہ کو ان کے انتقال کا افسوس ضرور ہوا لیکن پھر دوسرے ہی دن انہوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں شروع کر دیں کیونکہ صحیح معنوں میں چچا کی محبت و شفقت سے وہ زندگی بھر محروم رہے تھے حتیٰ کہ انھوں نے ان کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ اسی لئے باوجود خوف

تعلق کے انہیں جتنا صدمہ پہنچنا چاہئے تھا وہ نہیں پہنچا تھا۔

احسان اللہ اور فریدہ چہلم کے بعد لکھنؤ آ گئے۔ فریدہ کے چہرے سے اداسی کی جھلک تھی اور احسان اللہ کے چہرے پر دکھ کی گھٹائیں تھیں حالانکہ ان کے ساتھ بھی نعمان اللہ کا سلوک بس واجبی سا تھا لیکن ان کا تعلق بچوں سے زیادہ گہرا تھا۔ اس لئے ان کا غم یقینی تھا لیکن مہینے دو مہینے کے بعد فضا معمول پر آ گئی۔

احسان اللہ باہر اپنے کمرہ میں لیٹے حقہ گڑگڑا رہے تھے فریدہ باورچی خانہ میں تھیں۔ بڑا دلکش منظر، اور عروسہ باغ کے علیحدہ علیحدہ گوشوں میں آم کے پیڑوں کی چھاؤں تلے بیٹھے کتابوں میں گم تھے کیونکہ امتحانات کے دن قریب تھے۔ باہر دروازہ پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی احسان اللہ کی آواز ابھری "کون ہے"؟ منشی جی نے دروازہ سے سر نکال کر مخصوص لہجہ میں جواب دیا: "میں ہوں سرکار، منشی احمد علی"۔ "اوہ"! انہوں نے گاؤ تکیہ کے سہارے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آیئے آیئے منشی جی، کہئے کیسے آنا ہوا۔ سب خیریت تو ہے نا"؟ منشی احمد علی احسان اللہ کے والد کے زمانہ سے ان کے ہاں ملازم تھے۔ احسان اللہ کے والد کے بعد نعمان اللہ نے انہیں اپنے ہاں رکھ لیا تھا۔ سبھی بچے منشی جی کی گودیوں کے کھیلے ہوئے تھے حالانکہ اب وہ نعمان اللہ کے ملازم تھے لیکن انہیں شروع ہی سے زیادہ احسان اللہ کے بچوں سے پیار تھا۔ اکثر وہ نعمان اللہ کے کام سے لکھنؤ آتے رہتے تھے اور جب بھی آتے خواہ چند گھنٹوں ہی کے لئے سہی لیکن وہ احسان اللہ کے ہاں ضرور آتے تھے۔ بچے سب ہی منشی جی سے بے حد مانوس تھے اور انہیں "منشی چچا" کہا کرتے تھے۔ منشی جی احسان اللہ کو چھوٹے سرکار اور فریدہ کو چھوٹی بہو کہتے تھے۔ "عنایت ہے سرکار کی"۔ منشی جی نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ آج ان کا چہرہ مضمحل سا تھا۔

احسان اللہ نے فریدہ کو آواز دی۔ انہوں نے منشی جی کو سلام کیا۔ "جیتی رہیے چھوٹی بہو، چھوٹے سرکار جیئیں، بچے سلامت رہیں"۔ انہوں نے مخصوص انداز میں دعائیں دیں۔ فریدہ چند لمحے ان سے باتیں کرتی رہیں۔ پھر پان اور شربت پیش کرنے کے بعد باورچی خانہ میں چلی گئیں کیونکہ سالن چولھے پر چڑھا تھا اور روٹیاں پکانا باقی تھا۔ منشی جی نے اس اثنا میں ایک لفافہ جیب سے نکال کر احسان اللہ کے آگے رکھ دیا اور کہا "یہ لفافہ بڑی بہو نے دیا ہے"۔ "بھابی نے"؟ قدرے چونک کر انہوں نے سوال کیا پھر جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی کہا۔ "مجھے بھابھی نے خط کیوں بھیجا ہے منشی جی؟ خیر، آپ ہی پڑھ دیجئے"۔ احسان اللہ نے لفافہ منشی جی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "میری عینک اندر ہے"۔ "جی"! منشی جی نے پریشان ہو کر ان کی جانب دیکھا۔ "میں پڑھوں"؟ "ہاں منشی جی، کیا حرج ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔ "یہ خط میں نے ہی لکھا ہے سرکار"۔ منشی جی نے لجاجت آمیز لہجہ میں جواب دیا "آپ مجھ سے نہ پڑھوائیں تو بہتر ہوگا۔ یہ خط کوئی اچھی خبر نہیں لایا ہے"۔ "کوئی مضائقہ نہیں منشی جی"، احسان اللہ نے منتشر مزاجی سے جواب دیا۔ "آپ پڑھئے، مجھے بھابھی صاحبہ سے کسی اچھی خبر کی توقع ہی کب ہے"۔

دوسرے لمحہ منشی جی نے چند سطور کا خط پڑھ کر لفافہ رکھ دیا۔ احسان اللہ نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔ "منشی جی! کیا اس رشتہ کی منسوخی میں صرف بھابھی کا دخل ہے یا اخلاق میاں کا ارادہ بھی شامل ہے"؟ "سرکار"! منشی جی نے افسردہ لہجہ میں جواب دیا۔ "بڑی بہو کا تو جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں شروع ہی سے اس رشتہ کی مخالف ہیں۔ اللہ بڑے سرکار کو کروٹ کروٹ نصیب کرے کہ یہ نسبت آج سے قبل انہیں کی ضد سے قائم تھی۔ ادھر بڑے سرکار کا مرنا اور ادھر اخلاق میاں کی آمد، سرکار! یہ دونوں چیزیں بڑی بہو کے ارادہ کی تقویت کا باعث بن گئیں۔ انہوں نے اخلاق میاں کے آتے ہی کچھ اس انداز سے آپ کی غربت و افلاس کی داستان سنانی شروع کر دی۔ اخلاق میاں نے چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ مجھے اس گھرانہ میں شادی کی ضرورت نہیں ہے۔ رشتہ توڑ دیا جائے اور اگر چھوٹے چچا بھی ابا حضور کی طرح اس رشتہ کی تکمیل پر اڑے رہے تو اس ضد کا نتیجہ تمام عمر ان کی لڑکی کو بھگتنا پڑے گا"۔ "منشی جی"! احسان اللہ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ "گستاخ کی یہ مجال! کہہ دیجئے ان نامرادوں سے کہ میں بھی اس رشتہ کو ختم کرتا ہوں۔ مجھے اپنی غربت، اپنا افلاس اور اپنی بچی کی زندگی عزیز ہے"۔ وہ اتنا کہہ کر قدرے رکے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ "مجھے اس کا غم نہیں کہ انہوں نے رشتہ کیوں توڑا۔ مجھے اس کا صدمہ ہے کہ رشتہ ٹوٹنے سے میری بچی کے مستقبل پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑے"۔ "خدا نہ کرے سرکار"! منشی جی نے پرنم آنکھوں کے ساتھ جواب دیا "جو ہوا، بہتر ہوا، بیٹیا پر آنچ نہ آئے۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مولا نے ہماری عزیز بیٹیا کو بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ اخلاق میاں تو سرکار، عزیز بی بی کے پیروں کی خاک کے برابر بھی

ں۔ خدا نے چاہا تو ہماری بٹیا کی نسبت اونچی جگہ طے ہوگی۔ کس بات
کی ہے ہماری عزّو بی بی ہیں۔ آپ ناحق فکر مند ہوتے ہیں سرکار، یہ
ہوں اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔" "ہاں منشی جی!" احسان
مند رہے پرسکون ہو کر جواب دیا۔

"آپ ٹھیک ہی فرماتے ہیں۔ خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں
۔ خدا میری بچی کا نصیبہ بلند کرے۔" "آمین۔" منشی جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پھر
تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہو گئے اور احسان اللہ رنج و غم سے نڈھال تکیہ
کے سہارے لیٹ گئے۔

عزمیہ انہیں بچپن ہی سے بہت زیادہ عزیز تھی۔ اور وہ امتحان کے
تی بعد اس کی شادی کے خواب دیکھ رہے تھے کیونکہ اخلاق عنقریب امریکہ
سے لوٹنے والا تھا لیکن اخلاق کے روٹھتے ہی رشتہ ختم ہو گیا۔ احسان اللہ کو
س کا نہیں تھا کہ ان کی بیٹی کا رشتہ ایک دولت مند گھرانے میں نہ ہو سکا
نہیں اس کا صدمہ تھا کہ کہیں اس رشتے کے ٹوٹنے کا اثر عزمیہ کی زندگی
نہ پڑے۔ اور رشتہ اس وقت ٹوٹا تھا جب کہ وہ عنقریب ہی اپنی بیٹی
سر پر سہرا دیکھنا چاہ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں انھیں کتنے زبردست
ذہنی اور قلبی صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔

یہ خبر گھر کے افراد سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ لہٰذا عزمیہ تک بھی پہنچی اور
اس نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ اس خبر کو سنا۔ دل میں ہلچل ضرور
تھا بھی صرف اس لئے کہ اس ضعیفی کے عالم میں اس کی وجہ سے اس کے
والد کو اتنے بڑے صدمہ کا بوجھ اٹھانا پڑا تھا۔ حالانکہ منگیتر ہونے کے باوجود
اخلاق کی ذہنی رفاقت کبھی حاصل نہ تھی نہ اس نے کبھی اس کی خیالی تصویر
ئی تھی، نہ اسے تصور میں لا کر دیکھنے کی کوشش کی تھی اور نہ کبھی ان دیکھے
کوں میں رنگ ہی بھرنا چاہا تھا لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ وہ کسی سے
منسوب ہو چکی ہے۔ یہی سبب تھا کہ آج تک اس نے کسی کو لفٹ نہیں دی۔ کالج
میں قدم رکھتے ہی ایسے بے شمار نوجوانوں نے اپنے جذبات کے احترا
امیدیں اس سے وابستہ کر رکھی تھیں لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود
نا کامی کا منہ دیکھنا پڑا اور نتیجتاً عزمیہ کالج بھر میں ہارڈ اسٹون کے
سے مشہور ہو گئی تھی۔ اس معاملہ میں سب سے زیادہ پیش پیش مشہود تھا
وہ اپنی شخصیت کے علاوہ پڑھائی کے اعتبار سے بھی کالج کے تمام طلبا میں

مقبول تھا۔ اکثر پروفیسر اس کی ذہانت کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس نے آج تک
کبھی کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کی تھی۔ اس کے جذبات کے اظہار کا انداز
بھی جداگانہ تھا۔ وہ اکثر جب عزمیہ کے قریب آتا تو اسے والہانہ انداز سے ایک
ٹک دیکھا کرتا۔ حالانکہ عزمیہ اس کی جانب مطلقاً نہیں دیکھتی تھی۔ لیکن ایسی
خبریں عزمیہ کو اس کی سہیلیوں سے ملتی رہتی تھیں۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ
اس کے خاص دوستوں کے حلقہ میں مشہود کے نام کے ساتھ اس کا ذکر بھی ہوا
کرتا ہے۔ اور جب نے

"زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔"

کی مصداق عزمیہ نے یہ محسوس کیا کہ ہو سکتا ہے زبان خلق میں سچائی کا عنصر
بھی شامل ہو تو اس نے اکثر سہیلیوں کی نظریں بچا کر اس بات کی صداقت کا
اندازہ لگانا چاہا اور یہ دیکھ کر اسے واقعی حیرت ہوئی کہ اس کی سہیلیاں
سو فیصدی سچ کہہ رہی تھیں۔ وہ کچھ اس انداز سے عزمیہ کی جانب دیکھا
کرتا جیسے اس کے وجود کو اپنی نگاہوں میں سمو لے گا۔ بعد میں عزمیہ کو
اس کا بھی احساس ہوا کہ اگر اتفاقیہ اس کی نظریں مشہود کی نظروں سے
ٹکرا جاتیں تو وہ فوراً نظریں بچا جاتا۔ اکثر عزمیہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ
اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے اور اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے ہونٹ
کپکپا کر رہ جاتے۔ شاید اسے ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ویسے اس نے کبھی
کبھار عزمیہ سے اسباق کے متعلق سوالات ضرور کئے تھے۔ حالانکہ وہ چاہتا
تو اپنے جذبات کا اظہار بھی کر سکتا تھا۔ لیکن یا تو عزمیہ کے سامنے اس کی
زبان گنگ ہو جاتی تھی یا جیسا کہ عزمیہ کی اکثر سہیلیوں کا خیال تھا اس کا
انداز پرستش ہی جدا ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہوتا تو شاید
مشہود کے لئے عزمیہ کے سوچنے کا انداز بدل چکا ہوتا لیکن عزمیہ کو کالج
چھوڑے چار سال بیت چکے تھے۔ بی۔ اے کے بعد وہ میڈیکل لائن
جوائن کر چکی تھی اور اس طرح ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فاصلہ پیدا
ہو چکا تھا۔

پھر بھی ایسے وقت میں اخلاق کے انکار سے عزمیہ کی خودداری مجروح
ہو گئی اور اس کی انا کو زبردست ٹھیس پہنچی جب کہ وہ عنقریب شادی کے
مقدس بندھن میں بندھنے جانے والے تھے گھر کے ہر فرد کو معلوم تھا اور
عزمیہ کی اکثر سہیلیاں جانتی تھیں کہ ڈاکٹری کی سند ملتے ہی اس کی شادی

ہو جائے گی۔ اب عین وقت پر رشتہ کے ٹوٹنے سے کیسی کیسی چہ میگوئیاں اور کیسی کیسی قیاس آرائیاں ہو سکتی تھیں۔ یہی سوچ سوچ کر اس کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ سب سے زیادہ فکر احسان اللہ اور فریدہ کی جانب سے تھی۔ انھیں اس وقت صحیح معنوں میں عزیزوں کے خون سفید ہونے کا پورا تجربہ ہو چکا تھا۔ چونکہ عزمیہ شادی کے قابل ہو چکی تھی اس لئے والدین اتنے بڑے بوجھ سے سبکدوش ہو جانا چاہ رہے تھے۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ ضعیفی میں فکر کے بوجھ سے آزاد ہوتے۔ احسان اللہ کی زندگی میں یہ صدمہ روگ بن کر چمٹ گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستر سے لگ گئے اور رفتہ رفتہ وہ گھڑی بھی آ پہنچی جب انھوں نے موت کو بخوشی گلے لگا لیا۔

ان سب مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے سے عزمیہ بڑی ہونے کے باوجود کسی بھی کام میں صلاح و مشورہ دینے کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ فریدہ الگ منہ لپیٹے دن رات رویا کرتی تھیں اور عزمیہ صدمہ سے نڈھال تھی۔ ایسے وقت میں منتظر اور عروسہ کے ذہن صحیح طور پر کام کر رہے تھے اور وہ دونوں احسان اللہ مرحوم کی تمام رسومات پوری کر رہے تھے۔

احسان اللہ کے انتقال کی خبر ملنے پر فریدہ کے بھائی ظہیر الدین نے کراچی سے تعزیتی خط کے ساتھ انہیں تاکید کی تھی کہ تم بچوں کے ہمراہ پاکستان آ جاؤ، بچوں کا مستقبل سنور جائے گا۔ "غم کے بادل چھٹے تو سبھی کی رائے پاکستان جانے کے حق میں ہوئی۔ فریدہ کی عدت تک تو وہ قدم بھی نہ ہلا سکتے تھے اس کے علاوہ بھی انھیں اپنے نتیجے کا انتظار تھا۔ ہاں، اس اثنا میں منتظر اور عروسہ نے اپنے مکان کو فروخت کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ چار ماہ کی مدت دیکھتے ہی دیکھتے گذر گئی۔ فریدہ کی عدت کے دن ختم ہو گئے اور ساتھ ہی ان کے نتیجے بھی نکل آئے۔ تینوں نہایت اچھی پوزیشن سے کامیاب ہو گئے تھے۔ اس موقع پر انھیں احسان اللہ کی یاد بڑی شدت سے آئی اور وہ فریدہ سے لپٹ کر خوب روئے۔

مکان بیچ کر انھیں پچاس ہزار روپے نقد ملے۔ ان لوگوں نے یہ رقم لے کر کراچی کی راہ لی۔ ظہیر الدین نے مکان کا بندوبست کر لیا تھا۔ مکان چھوٹا سا تھا لیکن چار افراد کے لئے کافی تھا۔ ظہیر الدین کا مکان ان کے گھر سے تھوڑی ہی دور پر تھا۔ ماموں کو انہوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ ممانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماموں کے دو بچے تھے۔ بڑا کامران اور اس سے چھوٹی ارجمند، وہ سب آپس میں جلد ہی گھل مل گئے اور اس طرح نئی فضا ان کے لئے خوشگوار ثابت ہوئی۔

ظہیر الدین نے منتظر کو تجارت کرنے کا مشورہ دیا اور خود منتظر کا بھی یہی ارادہ تھا کیونکہ ان کی کم مائگی پر رشتہ داروں کے ناروا سلوک اور عزمیہ کے رشتہ کی منسوخی نے یہ بات اس پر واضح کر دی تھی کہ دنیا میں عزت حاصل کرنے کے لئے دولت بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ منتظر نے بڑے پیمانے پر کپڑوں کی تجارت شروع کر دی اور چند ہی ماہ میں کاروبار چمک اٹھا۔

عروسہ کے لئے ظہیر الدین نے کامران کا پیام دیا تو فریدہ نے منظور کر لیا۔ عزمیہ اور منتظر بھی اس رشتہ پر خوش تھے پھر منتظر کی رائے پانے کے بعد فریدہ سے کہہ کر عزمیہ نے ارجمند کو منتظر کے لئے مانگ لیا۔ ظہیر الدین کا ارادہ تھا کہ وہ عزمیہ کے لئے کوئی لڑکا ڈھونڈھ کر اس کی شادی کے بعد منتظر اور عروسہ کی شادیاں کریں۔ لیکن عزمیہ نے صاف انکار کر دیا کیونکہ اس کا ارادہ ڈاکٹری کی اعلیٰ سند کے لئے جانے کا تھا۔ فریدہ اور خصوصاً ظہیر الدین کو عزمیہ کا فیصلہ پسند نہیں تھا لیکن اس کی ضد کے آگے انہیں مجبور ہو جانا پڑا۔ البتہ ارجمند اور عروسہ کے پیچھے پڑ گئیں۔ منتظر نے بھی دبی زبان سے اسے شادی کر لینے کا مشورہ دیا۔ شاید وہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ اخلاق کے انکار کی وجہ سے عزمیہ نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن جب اس نے انہیں سمجھایا کہ "فی الحال تم لوگ میرے ارادوں کو زنجیر پہنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں شادی سے قطعی انکار نہیں کر رہی ہوں بلکہ میں چاہتی ہوں ڈاکٹری کی اعلیٰ سند لینے کے بعد زندگی کا ساتھی منتخب کروں اور ساتھی ایسا ہو جو میرے خدمت خلق کے اس جذبہ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھے تاکہ میرے کام میں رکاوٹ نہ ہو۔" تو وہ لوگ بھی مطمئن ہو گئے۔

عزمیہ کی رائے جاننے کے بعد منتظر اور عروسہ کی شادیوں کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ عزمیہ خود بھی اس غرض سے جلد سبکدوش ہو

[illegible] چاہتی تھی کیونکہ شادی کے فوراً بعد ہی اس کا لندن جانے کا پروگرام [illegible] ہو چکا تھا۔

اس اثنا میں ان کے مکان کے سامنے والے مکان میں کرایہ دار آ چکے [illegible] عزمیہ نے کبھی کبھی ایک عورت کو بالکنی میں کھڑی دیکھا تھا اور اس عورت [کی] جانب اس کے متوجہ ہونے کا سبب [illegible] چھوٹی سی پیاری سی بچی تھی جو اکثر اس [کی] گود میں رہتی تھی۔ چھوٹے اور خصوصاً پیارے بچے عزمیہ کی سب سے بڑی [کمز]وری تھی۔ اکثر برآمدے میں جاتے ہوئے عزمیہ کی نظر اس طرف اٹھ جایا کرتی [تھی] اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اس بچی کو گود میں لے کر خوب سارے پیار کرے [لیکن ف]طری ہچکچاہٹ مانع تھی کیونکہ وہ کسی سے جلدی گھل مل جانے کی عادی [نہ]یں تھی اور اس کے برعکس عروسہ ہر کسی سے جلد مانوس ہو جاتی تھی۔

منظر نے ان دنوں ایک چھوٹی سی کار خرید لی تھی جو اس کے دفتر سے [آنے] کے بعد عزمیہ کے قبضہ میں ہوتی تھی۔ سیلز مین کپڑے پیک کر رہا تھا۔ اور عزمیہ [illegible] جھکانے کے بعد شو روم کے پاس کھڑی تھی۔ جب وہ پیکٹ لینے کے لئے پلٹی تو [اس] کے سامنے مشہود کھڑا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عزمیہ نے [illegible] نظریں جھکا لیں۔ آج چار سال گزر جانے کے بعد بھی مشہود کی آنکھوں [میں] وہی والہانہ جذبہ مچل رہا تھا۔ پیکٹ لینے کے بعد عزمیہ نے دزدیدہ نظروں [سے مش]ہود کی طرف دیکھا تو اس کی گود میں ان کے سامنے والے مکان کی پیاری سی [بچی] تھی اور پاس ہی بچی کی ماں کھڑی کپڑوں کا انتخاب کر رہی تھی۔ عزمیہ سمجھ گئی [کہ] بچی مشہود کی ہے اور وہ عورت اس کی بیوی ہے قبل اس کے کہ مشہود عزمیہ [سے ک]وئی سوال کرتا وہ تیزی سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نکل آئی۔ اس کے [دل ک]ا عجیب عالم تھا۔ محسوس یہ ہو رہا تھا کہ جیسے وہ زندگی کی سب سے بڑی بازی [ہار گ]ئی ہے حالانکہ کالج ہی کے زمانہ سے اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ مشہود اسے [چاہت]ا ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اس کی نہ ہو سکے گی [اور] خود عزمیہ بھی اپنے دل میں اس کے لئے ایسا کوئی جذبہ نہ پاتی تھی جو اس [کی] کشش کی تقویت کا باعث بنتا۔ ہاں اس کا اسے اعتراف تھا کہ جب خلاق سے [اس کی م]نگنی ٹوٹ گئی تو عزمیہ کو اکثر مشہود کا خیال آیا تھا اور اس نے اسے پوری [illegible] سے یاد کیا تھا۔ اس نے تمنا کی تھی کہ مشہود مل جائے اور وہ اپنی کشتی حیات [illegible] اس کے ہاتھوں میں سونپ دے۔ شادی سے فرار، اور زیادہ سے زیادہ

وقت تعلیم حاصل کرنے میں گزارنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مشہود کا انتظار کر سکے۔ نہ جانے کیوں اس کے دل کو اس کا یقین سا تھا کہ کبھی نہ کبھی زندگی کی راہ میں وہ دونوں ضرور ملیں گے۔ آج وہ وقت آ پہنچا تھا۔ مشہود اس سے بہت ہی قریب تھا۔ دن بھر میں وہ اس کی ہزاروں جھلکیاں دیکھ سکتا تھا۔ پچاسوں بار اس کی آواز سن سکتا تھا۔ لیکن اس قربت کے باوجود ان کے درمیان ایک آہنی دیوار حائل تھی۔ عزمیہ کا یقین سچا تھا اور اس نے مشہود کو زندگی کی راہ میں پا بھی لیا تھا لیکن حالات بدل چکے تھے۔ وہ شوہر اور باپ بن چکا تھا اور اس کی دسترس سے بہت دور ہو چکا تھا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ اپنے زخموں کا مداوا نہ کر سکتی تھی۔ دل کا درد حد سے گزر رہا تھا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ وہ اس وقت کی منتظر تھی جب درد حد سے گزر کر خود ہی دوا بن جاتا ہے۔

عزمیہ اس اذیت ناک ماحول سے جلد از جلد بھاگنا چاہ رہی تھی لیکن بغیر منظر اور عروسہ کی شادی کے وہ اپنے سفر پر روانہ بھی نہ ہو سکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شادی کے دن قریب آ گئے اور عزمیہ ایسی منہمک ہوئی کہ اسے سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ کیونکہ اس کے سوا انتظام کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ شادی کی تیاریوں کے ساتھ اس نے اپنے سفر کی تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ شادی کے دوسرے ہی دن روانہ ہو جائے لیکن فریدہ کے کہنے سے مجبوراً اسے چوتھی تک رکنا پڑا۔ عزمیہ ان تقاریب میں شرکت سے اس لئے بھی گریز کر رہی تھی کہ مشہود اپنی فیملی کے ساتھ ان تقریبوں میں شریک ہونے والا تھا۔ عروسہ کی اس کی بیوی سے جان پہچان ہونے کے علاوہ منظر اور کامران کی بھی اس سے صاحب سلامت تھی۔

چوتھی کے دن ایک بار پھر عزمیہ کا مشہود سے سامنا ہو گیا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ یہ واقعہ اب سے کچھ روز قبل پیش آیا ہوتا تو شاید عزمیہ مشہود کو ایسا موقع دے بھی دیتی لیکن اب حالات بدل چکے تھے اس لئے وہ مشہود کو ایسا کوئی موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔ اور اب کہنے کے لئے رہ کیا گیا تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنی شادی کی روداد سنا دیتا اور عزمیہ ایسی کوئی بات اس کی زبان سے سننا نہیں چاہتی تھی جس سے دل کے زخموں کو رسنے کا موقع مل سکے۔ اس کے زخموں نے ویسے ہی کافی خون اگلا تھا اور اب اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اس ماحول سے

نکل بھاگے۔

عزمیہ کی سیٹ پی۔ آئی۔ اے کے بوئنگ کے لئے بک ہو چکی تھی فریدہ اور ظہیرالدین سے رخصت کے وقت وہ ان کے گلے لگ کر خوب روئی۔ ان لوگوں نے آنسوؤں اور دعاؤں کے ساتھ اسے الوداع کیا منظر، ارجمند عروسہ اور کامران اس کے ساتھ ایرپورٹ تک آئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد لاؤڈ اسپیکر نے مسافروں کو اطلاع دی کہ "پی۔ آئی۔ اے کا بوئنگ طیارہ لندن کی پرواز کے لئے تیار ہے" اطلاع ملتے ہی عزمیہ بھی اٹھ گئی۔ منظر ارجمند عروسہ اور کامران کو گلے لگا کر وہ رو پڑی۔ ان لوگوں کی بھی آنکھیں پرنم تھیں پھر اس نے ان کی پیشانیاں چومیں اور خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ لوگ طیارہ کے پرواز کرنے تک اسے ہاتھوں کی جنبش سے خدا حافظ کہتے رہے جب طیارہ فضا میں پرواز کر گیا تو وہ لوگ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور عزمیہ بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کی دھار کو نکلنے سے رومال میں جذب کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

سفر کے دوران وہ کسی طرف دھیان نہ دے سکی بس تمام وقت رومال سے آنسوؤں کو صاف کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کو یہ عالم تھا کہ سر درد کی شدت سے پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی سیٹ کی پشت سے سر ٹیکے نڈھال سی پڑی رہی۔ وہ اس وقت چونکی جب لندن پہنچنے سے کچھ دیر قبل لاؤڈ اسپیکر نے اعلان کیا۔ اور یہ سنتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے کہ "اس طیارہ کے کپتان مشہود احمد فاروقی ہیں" اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل اس مرتبہ دھڑک کر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جائے گا۔ "ہائے اللہ"! وہ اپنے دل کو دبا کر رہ گئی جس کے سایہ سے بچ کر لندن بھاگ جانا چاہ رہی تھی وہ اس سفر میں میرا شریک تھا۔ اب کیا ہوگا؟ .... اس نے مجھے دیکھ تو نہیں لیا؟ طرح طرح کے پریشان کن سوالات ذہن کو ماؤف کئے جا رہے تھے اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ طیارہ سے چھلانگ لگا دیتی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جب اس نے اس شخص کی تمنا کی تو وہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا اور جب وہ اس سے بچنا چاہ رہی تھی تو وہ اس کا تعاقب کر رہا تھا! ان تمام باتوں کے باوجود عزمیہ کا ذہن یہ سمجھنے سے اب تک قاصر تھا کہ شادی ہو جانے اور ایک پیاری سی بچی کا باپ بن جانے کے بعد بھی مشہود کے دل میں اس کے لئے پہلے جیسے جذبات کارفرما تھے۔

گھبراہٹ کے عالم میں لندن ایرپورٹ پر اترتے ہوئے عزمیہ اپنا ایربیگ اپنی سیٹ ہی پر چھوڑ دیا اور جب ایرہوسٹس نے مسکرا کر اس کے ہاتھ میں تھمایا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور لرزتے قدموں سے سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

پاسپورٹ اور کسٹم چیکنگ کے بعد عزمیہ باہر اپنا سامان اٹھوا رہی تھی کہ مشہود کی آواز سن کر لرز گئی۔ وہ قلیوں کو ہدایت دے رہا تھا کہ سامان میری گاڑی میں رکھ دو۔ پھر وہ عزمیہ سے مخاطب تھا "آپ کہاں جائیں گی محترمہ؟" گھبراہٹ کے عالم میں اسے کوئی جواب ہی نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس کی قوت ارادی جواب دے چکی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنا سامان مشہود کی گاڑی میں رکھنے سے روک دے۔ وہ خاموش کھڑی رہ گئی۔ اور قلیوں نے تمام سامان اس کی گاڑی میں رکھ دیا۔ اور عزمیہ کے حواس بحال ہونے سے پیشتر ہی اس نے قلیوں کو پیسے بھی دے دیئے وہ مبہوت چونکی جب مشہود نے اس کے قریب آکر دھیرے سے کہا "یہاں آپ کے اس طرح کھڑے رہنے سے لوگ کیا سوچیں گے۔ آیئے ہم چلیں" نہ جانے ان الفاظ میں کیا جادو تھا کہ عزمیہ کے قدم خود بخود اس کے پیچھے بڑھنے لگے اور وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ "آپ کی قیام گاہ کہاں ہے؟"۔ مشہود نے گردن موڑ کر عزمیہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا "جی"، عزمیہ نے اس کی گہری نظروں کی زد سے محفوظ ہوتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔ "میڈیکل ہوسٹل"۔ "اوہ"! مشہود نے ہونٹ سکیڑ کر پوچھا "آپ ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں۔؟" "جی"۔ عزمیہ نے مختصر سے جواب میں ٹالنا چاہا۔ "جبھی آپ نہیں ملیں"۔ وہ اپنے آپ دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر یکایک عزمیہ کی جانب پلٹ کر سوال کر بیٹھا "آپ جانتی ہیں میں نے آپ کو کہاں کہاں ڈھونڈھا۔؟" "جی"! عزمیہ بوکھلا گئی۔ وہ اس غیر متوقع سوال کے لئے تیار نہیں تھی۔ اسے اپنی بے بسی پر شدت سے رونا آ رہا تھا کہ وہ کیوں اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اب نہ جانے وہ کیا کیا سوالات کرتا رہے گا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد عزمیہ نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ "ہوسٹل" آگیا تھا۔ مشہود نے نیچے اتر کر کار کا دروازہ کھول دیا اور عزمیہ کار سے اتر آئی اور "ہوسٹل" سے بچا اپنے بلاوے کا خط دربان سے پرنسپل کے پاس بھجوا دیا اور انتظار کرنے لگی

مشہود اس کے سامنے کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا اور عزمیہ نظریں جھکائے بے جلد سے جلد بلائے جان کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد مشہود لائٹر نکال کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس وقت عزمیہ نے اسے نظر بھر کر دیکھا اس کی شکل بے حد وجیہہ لگ رہی تھی اور اس کا خوبصورت جسم کیپٹن کی سفید وردی اور فلٹ نما سیاہ کیپ میں بڑا ہی شاندار نظر آرہا تھا۔ ابھی عزمیہ کی نظر ہٹی ہی تھی کہ ہوسٹل سے اس کا بلاوا آگیا اور دربان نے چند آدمیوں کی مدد سے اس کا سامان اٹھوانا شروع کر دیا۔

مشہود اس کے قریب آچکا تھا۔ عزمیہ کا دل دھڑک اٹھا۔ "سنئے" وہ بڑے ہی میٹھاس بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا "میں طیارہ لے کر کل رات کراچی لوٹونگا۔ اس وقت تک میرے دوست کی یہ گاڑی میرے قبضہ میں رہے گی۔ میں کل سہ پہر کو آؤں گا آپ تیار رہئے گا" "لیکن میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" عزمیہ نے جلدی سے انکار کرنا چاہا لیکن اس کی بات ختم ہونے سے قبل ہی مشہود نے اسے روک دیا "کیا آپ چند گھنٹوں کے لئے میرا ساتھ دینا گوارا نہیں کر سکتیں ۔ ؟" وہ دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دینا چاہ رہا تھا لیکن عزمیہ ان چنگاریوں کو شعلہ بننے سے پہلے ہی بجھا دینا چاہتی تھی۔ اس نے سختی سے انکار کر دینا چاہا۔ "لیکن مشہود صاحب! ایسی باتوں سے اب فائدہ بھی کیا جب کہ آپ ....." لیکن مشہود نے پھر عزمیہ کی بات کاٹی اور تحکمانہ لہجہ میں کہنے لگا "دیکھئے محترمہ، وقت کم ہے اس لئے مجھے اجازت دیجئے۔ ویسے کل سہ پہر میں آپ تیار رہیں گی۔" یہ کہہ کر وہ کار میں بیٹھ چکا تھا قبل اس کے کہ عزمیہ پھر کچھ کہتی۔ خدا حافظ کہتے ہوئے مشہود نے کار اسٹارٹ کر دی اور عزمیہ ایک انجانے جذبہ کے تحت اسے زیر لب "خدا حافظ" کہتی ہوئی ہوسٹل کی جانب مڑ گئی۔

عزمیہ ساری رات نہ سو سکی اور ہر لمحہ مشہود کی پرکشش شخصیت اس کے ذہن پر ابھرتی رہی۔ صبح جب اٹھی تو اس کی طبیعت بے حد بوجھل اور کسلمند تھی۔ ناشتے کے بعد وہ پرنسپل کے بلاوے پر ان کے پاس چلی گئی اور ضروری ہدایات کے بعد اپنے کمرہ میں لوٹ آئی۔ پڑھائی دوسرے دن سے شروع ہونے والی تھی اس لئے عزمیہ پھر بستر پر دراز ہو گئی اور اردو میگزین جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی دیکھتی رہی۔ لیکن دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار یہ سوچ کر طبیعت پریشان ہوئی جا رہی تھی کہ سہ پہر کو مشہود آگیا تو وہ کیا کرے گی۔ لیکن لاکھ سوچنے پر بھی اس کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور دیکھتے ہی دیکھتے دوپہر سر پر آگئی۔ کھانے کے بعد خواہ مخواہ بھی وہ آنکھیں بند کئے سونے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو گئی لیکن نیند کا کوسوں تک پتہ نہ تھا بلکہ آنکھیں بند ہوتے ہی مشہود کا سراپا ابھرتا اور وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ وقت اسی کشمکش میں گذرتا رہا اور تین بجتے ہی ہوسٹل کی نگران نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ "کیا بات ہے ؟" عزمیہ کے پوچھنے پر اس نے مشہود کا کارڈ پیش کیا۔ عزمیہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا "اب میں کیا کروں، یا اللہ! یہ شخص مجھے جینے نہیں دے گا۔" عزمیہ کو خاموش پا کر نگران نے پوچھا "کیا کہوں ان سے ؟" "بھیجدیجئے"۔ اس نے دبے لہجہ میں جواب دیا جیسے وہ اپنی شکست کا اعلان کر رہی تھی۔

دوسرے لمحہ مشہود کمرہ میں تھا۔ عزمیہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ گہرے سرمئی سوٹ اور سرخ نکٹائی پر سیاہ چشمہ نے اس کی شخصیت کا حسن نکھار دیا تھا۔ عزمیہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مشہود اسے اتنا اچھا لگ رہا تھا یا درحقیقت وہ چار سال میں اتنا جاذب نظر ہو گیا ہے؟ عزمیہ نے نظریں جھکا [illegible] مشہود اس کے قریب آچکا تھا۔ "ارے! آپ اب تک تیار نہیں ہوئیں ۔؟" "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" عزمیہ نے دھیرے سے جواب دیا۔ طبیعت کی خرابی کا حیلہ عزمیہ نے اس لئے کیا تھا کہ شاید اس طرح اسے مشہود کے ساتھ نہ جانا پڑے۔ "طبیعت آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ ......" یہ کہتے ہوئے وہ عزمیہ کے قریب جھک آیا اور سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگا "رات بھر سوئی نہیں ہیں۔ میں بھی تمام رات کروٹیں بدلتا رہا ہوں۔" "اف خدایا"! عزمیہ چونک پڑی۔ بے اختیار اس کی نظریں مشہود کے چہرہ سے ٹکرا گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا عزمیہ کو محسوس ہوا یہ شخص اس کے دل کی کیفیت سے آگاہ ہو چکا ہے کتنی صحیح تھی اس کی تشخیص۔ "میں آپ کا کوئی بہانہ نہ سنونگا۔ آپ چلیں گی اور ضرور چلیں گی، یہ میرا فیصلہ ہے"۔ مشہود کے تحکمانہ لب ولہجہ پر عزمیہ کو غصہ آنے لگا کیونکہ مشہود کا یہ انداز تخاطب اس کی بیوی ہی برداشت کر سکتی تھی۔ وہ اس پر کیوں رعب ڈال رہا ہے۔ لیکن جب عزمیہ نے اس کی جانب دیکھا تو وہ سراپا خلوص بنا بیٹھا تھا۔ عزمیہ کو رحم آگیا اور وہ کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ تیار ہو کر جب وہ قد آدم آئینہ کے سامنے آئی تو اسے محسوس ہوا کہ یہ چار سال قبل کی عزمیہ ہے جب وہ بی۔ اے کی طالبہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ مشہود

کے ساتھ جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ جب عزمیہ کو اس کا
احساس ہوا کہ بیوی اور بچہ کی موجودگی کے باوجود مشہود کے دل میں عزمیہ کی
محبت موجود ہے تو اس کا سر غرور سے تن گیا۔ اس کی ہار ہی اس کی جیت تھی۔ مشہود
کی بیوی اس کی ہو کر بھی اس سے دور تھی اور وہ دور ہو کر بھی اس سے قریب
تھی۔ اسی جذبے کے تحت وہ تیار ہو کر اس کے ساتھ چل دی۔

دونوں نے ایک عظیم الشان ہوٹل میں چائے پی اور پھر مشہود اسے
لندن کے مشہور مقامات کی سیر کرواتا رہا۔ مشہود کی رفاقت میں تھوڑی دیر
کے لئے عزمیہ سب کچھ بھول سی گئی۔ مشہود کی قربت میں گذرے ہوئے لمحات اس
کی زندگی کا حاصل بن گئے تھے۔

رات کو کھانے کے بعد مشہود نے اسے ہوٹل پہنچا دیا۔ عزمیہ نے کار سے
اتر کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو مشہود نے مسکرا کر اسے روک دیا۔ "میں جانتا
ہوں آپ شکریہ ادا کریں گی لیکن شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہئے کہ آپ نے میرا ساتھ
دیا۔" اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا۔ "آپ دو سال بعد لوٹ رہی ہیں نا؟
میں آ[illegible] گا۔ اور سنئے۔ آج رات آرام سے سو جائیے گا۔ میں بھی آج میٹھی
نیند سوؤں گا۔ خدا حافظ!" یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور
عزمیہ کو سوچتا ہوا چھوڑ کر تیز رفتاری سے چلا گیا۔

عزمیہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرہ میں پہنچ کر بستر پر گر گئی۔
اسے ہوش نہیں رہا کہ کب بستر پر گری اور کب سوئی۔ صبح جب اس کی آنکھ
کھلی تو تمام واقعات ذہن پر تصویر کی طرح یکے بعد دیگرے گذر رہے تھے
وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ اس وقت وہ مسرت سے سرشار تھی۔ اسے مشہود
سے بچھڑ جانے کا غم نہیں تھا بلکہ مسرت تھی کہ اس نے زندگی کے بڑے قیمتی اور
لمحے اس کے ساتھ گذار کر انہیں جاوداں بنا لیا تھا۔ بستر سے اٹھ کر غیر ارادی
طور پر جب وہ آئینہ کے سامنے پہنچی تو گلاب کا ایک سرخ پھول اس کے جوڑے میں
اٹکا ہوا تھا۔ وہ مسکرا پڑی اور پھول کو نکال کر عقیدت سے چوم لیا اور پھر اسے
احتیاط سے اپنی الماری کی دراز میں رکھ دیا۔

عزمیہ کو حیرت تھی کہ باوجود مشہود کو خود سے دور رکھنے کی کوشش
کے وہ خود ہی بے اختیارانہ اس کی جانب کھنچی جا رہی تھی۔ اس کی ہر احتیاط
ہر کوشش ناکام ہوتی جا رہی تھی اور مشہود دن بدن اس کے دل کی وادیوں
پر چھاتا جا رہا تھا وہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ بیوی بچے والا
تھا کیا اس صورت میں وہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی؟ لیکن اس کے قلب و ذہن
ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ مجبوراً اس نے خود کو حالات کے سپرد
کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

عزمیہ جب بھی تصورات کے شیش محل تعمیر کرتی مشہود کی بیوی اور بچہ کا
خیال اسے پاش پاش کر دیتا لیکن وہ ان خیالات کو جھٹک کر پھر اسی شیش محل
کی تعمیر میں مصروف ہو جاتی۔ زندگی کی ناؤ امید و بیم کی حالت میں ہچکولے کھاتی
اور وقت کی تیز رفتاری حال کو ماضی میں بدلتی رہی۔

کراچی سے فریدہ، منظر، ارجمند، عرشیہ اور کامران سبھی کے خطوط آتے
رہتے تھے۔ فریدہ سے یہ معلوم کر کے عزمیہ کی مسرت کی انتہا نہ رہی کہ ارجمند
کے ہاں بچہ ہونے کی امید تھی۔ سبھی لکھتے تھے کہ "آپا! تمہارے بغیر یہ گھر سونا
سونا سا لگتا ہے" لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیابی کے بغیر واپس نہیں جا سکتی تھی۔
وہ انہیں لکھا کرتی کہ "دو سال کا وقفہ ہی کتنا ہوتا ہے۔ پلک جھپکتے تو زمانہ گذر
جاتا ہے۔ دعا کرو کہ میں کامیاب ہو جاؤں تو دو ہی سال میں لوٹ آؤں گی۔"

دو سال ختم ہوتے ہی عزمیہ کا کورس مکمل ہو گیا اور اسے ڈاکٹری
کی اعلیٰ سند مل گئی۔ اس نے روانگی کی تمام تیاری کر لی اور چند روز کی شاپنگ
کے بعد کراچی روانہ ہو گئی۔

جب کراچی ایئرپورٹ پر طیارہ اترا اور عزمیہ کسٹم کے لئے جانے لگی تو اسے
آج سے دو سال قبل کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب لندن ایئرپورٹ پر مشہود سے ملاقات
ہوئی تھی۔ دفعتاً کسی نے پکارا "کیپٹن مشہود۔" "آ رہا ہوں" کی آواز کے ساتھ وہ عزمیہ
کے قریب تھا۔ "آپ؟" بے اختیار عزمیہ پوچھ بیٹھی۔ اسے حیرت کے ساتھ مسرت
بھی تھی۔ "مسافروں کی فہرست سے آپ کی آمد کا پتہ چل گیا تھا اس لئے موجود
ہوں۔ اور بتائیے ڈگری مل گئی نا؟" ایک ہی سانس میں اس نے ساری باتیں
پوچھ ڈالیں۔ اس کی دلی مسرت کا اظہار اس کے ہر انداز سے ہو رہا تھا اور
عزمیہ سوچ رہی تھی کہ اس نے دو سال پورے ہوتے ہی لندن سے آنے والے
مسافروں کی فہرست کی چھان بین شروع کر دی ہوگی۔ وہ مسکرائی۔ "آپ کی
دعاؤں سے کامیاب ہو گئی ورنہ دو سال اور رہنا پڑتا۔" "اس کامیابی پر دلی مبارکباد
قبول فرمائیے۔" مشہود نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "شکریہ!" عزمیہ
نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ "کیسا لگا آپ کو لندن کا ماحول؟" مشہود نے
اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ "میں نے گھومنے پھرنے پر زیادہ وقت صرف نہیں کیا

یہ میرا خیال ہے کہ مجھ جیسی اثر پذیر کے لئے وہاں کا ماحول سازگار نہیں یہی سبب ہے کہ آپ کے ساتھ چند گھنٹوں میں پچاسوں مقامات کی سیر کر ڈالی اور دو سال رہنے کے باوجود تنہا کچھ نہ کر سکی" عزمیہ نے جواب دیا۔ "آپ کو میرے ساتھ گذارے ہوئے لمحات یاد ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے" مشہود نے پھر وہی لب و لہجہ اختیار کیا۔ "ورنہ آپ کے رویہ سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ آپ مجبوراً میرا ساتھ دے رہی ہیں۔ اس اثنا میں میں نے کئی بار لندن کے لئے پرواز کی لیکن آپ تک پہنچنے کی جرأت نہ کر سکا۔" عزمیہ اس کے لہجے کی مٹھاس میں گم ہو گئی۔ مشہود کی قربت میں عزمیہ کو اس کا دیا ہوا سرخ گلاب کا تحفہ یاد آ گیا جو اس وقت بھی اس کے پاس محفوظ تھا۔ وہ مسرت سے سرشار اس کے ساتھ چلتی رہی اور اس کے تصور میں بے شمار سرخ گلاب مسکراتے رہے۔

منظر، ارجمند، عروسہ اور کامران، سب ہی ایرپورٹ پر عزمیہ کے استقبال کو موجود تھے اس نے ان کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے سبھوں کو گلے لگا لیا اور ان کی مبارک باد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ارجمند سے سوال کیا "ارے، تم پنکی کو نہیں لائیں۔ میری آنکھیں اسے تلاش کر رہی ہیں"۔ "آپی"، منظر نے مسکرا کر تسلی دی۔ "وہ گھر پر آپ کی منتظر ہے۔ بھیڑ کی وجہ سے اسے نہیں لایا۔" "تو جلد گھر چلو" عزمیہ کار کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

گھر پہنچتے ہی وہ فریدہ کے گلے سے لپٹ کر خوب روئی۔ اس پر مسرت موقع پر اسے احسان اللہ کی یاد بری طرح آئی۔ پھر ماموں نے گلے لگا کر دعائیں دیں اور وہ دوڑتی ہوئی اندر جا پہنچی۔ پنکی اپنی آیا کی گود میں سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ عزمیہ نے لپک کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیا اور دیر تک پیار کرتی رہی۔ عزمیہ کو اس سے والہانہ محبت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑی ہی پیاری اور خوبصورت سی بچی تھی اور اس سے بہت جلد گھل مل گئی۔ وہ دو سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے پھوپھی امی کہہ کر مخاطب کرنے پر عزمیہ اسے دیر تک کلیجے سے لگائے پیار کرتی رہتی۔

غسل سے فارغ ہو کر چائے کے دوران عزمیہ نے ان سب کو لندن سے لائے ہوئے تحفے دیئے۔ فریدہ اور ظہیرالدین کے لئے وہ مصلے کا تحفہ لائی تھی۔ ارجمند اور عروسہ کے لئے ساریاں تھیں، منظر اور کامران کے لئے اونی قمیصیں اور پنکی کے لئے بے شمار کپڑوں اور کھلونوں کے پیکیٹ تھے۔ سبھوں نے تحفے پسند کئے پھر وہ دیر تک انھیں لندن کے قصے سناتی رہی۔ پنکی اس کی گود میں سو گئی تھی اس نے اس کی پیشانی چومی اور اسے آہستگی سے اٹھا کر اپنے پلنگ پر سلا دیا۔

یہ عزمیہ کی خوش قسمتی تھی کہ جلد ہی اس کا تقرر گورنمنٹ میڈیکل کالج میں ہو گیا۔ اب اس کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گذرتا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک اس کی ڈیوٹی اسپتال میں ہوتی تھی۔ پھر چھ بجے سے رات کے نو بجے تک وہ ڈسپنسری اٹینڈ کرتی تھی۔ اس کے درمیان کا وقت پنکی کے لئے مخصوص تھا۔ پھر رات کو ڈسپنسری سے لوٹتے ہی پنکی کے ساتھ کھانا کھاتی اور اس سے باتیں کرتی پھر وہ سو جاتی تو عزمیہ کبھی فریدہ سے اور کبھی منظر، ارجمند عروسہ اور کامران وغیرہ سے گفتگو کرتی رہتی۔ اس طرح اس کا تمام وقت مصروفیتوں کی نذر ہو جاتا۔ گھر پر رہنے کا موقع بہت کم ملا کرتا سوائے اتوار کے، اور اس دن بھی پنکی کی وجہ سے فرصت نہ ملتی۔ ہاں، اتوار کی شام کو وہ اکثر پنکی کے ساتھ سیر کے لئے ضرور نکل جاتی تھی۔ گھر سے اس فرار کی وجہ مشہود تھا کیونکہ اس کا مکان عزمیہ کے مکان کے بالکل سامنے تھا اس لئے وہ اس سے بچنے کی غرض سے بھی زیادہ تر وقت باہر گذارنا چاہتی تھی۔ دراصل عزمیہ کو اس کی بیوی کا خیال بری طرح آ جایا کرتا تھا اور وہ اس تلخ حقیقت سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مشہود کی بیوی اس کی نظروں میں عزمیہ کے لئے مچلتے ہوئے محبت کے بے پناہ سیلاب کا اندازہ کر سکے۔ اور یہ ناممکن تھا کہ مشہود عزمیہ کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے وجود سے انجان بن جاتا لیکن عزمیہ ایک بار مشہود سے ملاقات کی خواہاں تھی۔ وہ لندن سے اس کے لئے جو تحفہ لائی تھی وہ اسے دینا ضروری تھا لیکن اس نے کراچی پہنچتے ہی اپنی آزادی خود ہی سلب کر ڈالی تھی اور مشہود تک پہنچنے کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ ایک اتوار کا دن ہوتا تھا جب وہ گھر پر رہتی تھی لیکن وہ مشہود سے اس کے یا اپنے گھر پر ملاقات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب ایک ہی راستہ تھا مشہود سے عزمیہ ڈسپنسری میں ملاقات کرتی یا پھر اتوار کی شام کو اس سے کسی اور جگہ مل لیتی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی اور وقت اسی ادھیڑ بن میں گذرتا جا رہا تھا۔

آج اتوار تھا۔ شام ہوتے ہی پنکی کو تیار کرنے کے بعد عزمیہ خود بھی تیار ہو چکی تھی سیاہ پرنٹ کی نارنجی ساری اور سیاہ بلاؤز میں وہ بے حد جچ

رہی تھی جب وہ باہر نکلی تو پنکی غائب تھی۔ عزمیہ نے اسے آواز دی تو وہ باہر سے دوڑتی ہوئی آئی۔ "کہاں گئی تھیں؟" عزمیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا "بٹو کے پاس"۔ "کون بٹو؟" عزمیہ نے سوال کیا۔ "وہ" پنکی نے مشہود کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "سامنے والی کوٹھی میں رہتی ہے۔ وہ اپنی امی کے ساتھ باہر جا رہی تھی۔ میں نے کہا میں بھی اپنی پھوپھی امی کے ساتھ گھومنے جا رہی ہوں"۔ "اچھا اچھا آؤ"۔ عزمیہ نے مسکرا کر اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا اپنی سیٹ پر بیٹھنے سے قبل عزمیہ کی نظر خود بخود اٹھ گئی۔ مشہود اپنی وردی میں ملبوس بالکنی میں کھڑا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اتنے دنوں کے بعد مشہود کو اپنے سامنے پا کر عزمیہ مسکرا دی۔ اس وقت اسے اطمینان تھا کیونکہ پنکی سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی بیوی اور بچی باہر جا چکی ہیں۔ "میں بھی آؤں؟" مشہود نے اشارے سے سوال کیا۔ "آیئے" عزمیہ نے بھی گردن کی جنبش سے جواب دیا۔ اس اثنا میں اسے مشہود کے تحفہ کا خیال آ گیا۔ اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا دوسرے لمحہ وہ اپنے کمرہ میں جا پہنچی اور تحفہ کا بکس لے کر فوراً لوٹ آئی۔ کار اسٹارٹ کر کے جب وہ مشہود کے گیٹ تک پہنچی تو وہ کپڑے تبدیل کر کے آ چکا تھا۔ اس نے دھیرے سے کہا "آپ آگے جا کر رکئے میں آ رہا ہوں۔ اس وقت گھر پر بھائی صاحب موجود ہیں"۔ "اچھی بات ہے" عزمیہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد مشہود آ پہنچا۔ اس وقت گہرے سرمئی پینٹ اور سفید شرٹ میں وہ کافی اسمارٹ نظر آ رہا تھا عزمیہ کار کا دروازہ کھول دیا۔ مشہود اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کہاں چل رہی ہیں"؟ اس نے سوال کیا۔ "جہاں آپ کہیں" عزمیہ نے جواب دیا۔ "سمندر کے کنارے چلئے"۔ مشہود نے عزمیہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "وہ خطرناک نظر آ رہا ہے"۔ عزمیہ نے مزاحاً جواب دیا۔ مشہود ہنس پڑا اور عزمیہ نے محسوس کیا کہ اس ہنسی میں اس کے دل کی آواز شامل ہے۔ "خدا کی پناہ! آپ کو مجھ سے بھی انکار نہیں"۔ اس کے اس جملہ نے عزمیہ کو چونکا دیا ساتھ ہی اسے تقویت بھی ملی۔ وہ اب بھی اس کا ہی طلب گار تھا لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکی پھر وہ پنکی سے باتیں کرتا رہا اور عزمیہ اس سے سوچتی رہی۔

پنکی ریت سے کھیل رہی تھی اور وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اندھیرا پھیلنے لگا تو دونوں اٹھنے لگے تو عزمیہ نے چپکے سے اپنے پرس سے بکس نکال

کر مشہود کے آگے رکھ دیا۔ "یہ آپ کا تحفہ"۔ "زہے نصیب" کہہ کر مشہود نے کھولا سیاہ مخمل کے خوبصورت سے کیس میں سنہری گھڑی جگمگا رہی تھی۔ "واہ" بے اختیار کہہ اٹھا۔ گھڑی اسے بہت پسند آئی اور عزمیہ کو اس کے اپنے تحفہ کا صلہ مل گیا۔ "لیکن یہ تحفہ اسی صورت میں قبول ہو گا کہ اسے آپ خود باندھ دیں"۔ مشہود کی اس جسارت پر عزمیہ کا شرم سے عجیب حال تھا لیکن اس کی خواہش کو ٹھکرا نہ سکی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گھڑی باندھ دی۔ "شکریہ"! مشہود نے اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا عزمیہ جھینپ کر سرخ سی ہو گئی۔ پتہ نہیں یہ شرم کے جذبات تھے یا دلی مسرت کے۔ ویسے عزمیہ دلی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ "اچھا یہ بتایئے اس جرم کی کیا سزا تجویز کی جائے جو ان دنوں آپ نے مجھ سے بچنے کے لئے اختیار کر رکھا ہے؟" مشہود نے پوچھا۔ "جی"! دوسرے لمحہ عزمیہ چونک پڑی "یا اللہ! یہ انسان دل کے بھید کیسے جان لیتا ہے"۔ "آپ نے خود کو اس قدر مصروف کر رکھا ہے کہ آپ کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ سے ہسپتال کا فون نمبر تک یا نہ ڈسپنسری کا۔ اگر کبھی مجھے آپ کی ضرورت پڑی تو کیسے آپ کو خبر ملے گی۔ میں تو بہت جلد یہاں سے رخصت ہو چکا ہوں گا"۔ عزمیہ کانپ گئی۔ "خدا نہ کرے"۔ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مسل ڈالا تھا لیکن وہ اپنے جذبات کا اظہار کھلے الفاظ میں نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے لیکن اندھیرا پھیل جانے کے سبب مشہود کی نگاہوں سے محفوظ تھے ورنہ پتہ نہیں وہ کیا کچھ کہہ ڈالتا۔ عزمیہ کی جانب سے اپنے جذبات کی پذیرائی کا حوصلہ نہ پا کر اکثر وہ اسی طرح سے اپنی موت کا ذکر شروع کر دیتا اور عزمیہ دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتی۔ "اچھا چلئے، اب کافی دیر ہو چکی ہے" مشہود ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھتے ہوئے بولا۔ عزمیہ جان بوجھ کر آگے بڑھ گئی اور رومال نکال کر آنسوؤں کو جذب کر ڈالا۔ وہ پنکی کو گود میں اٹھائے عزمیہ کے پیچھے چل رہا تھا۔ پنکی کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر مشہود کچھ دیر بعد اپنی سیٹ پر پہنچا تو اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا گجرا تھا جو اس نے ابھی ابھی پھول والے سے خریدا تھا۔ عزمیہ نے کار اسٹارٹ کر دی تو مشہود نے وہ گجرا عزمیہ کے جوڑے کے گرد لگا دیا اور وہ مزاحمت نہ کر سکی۔ مشہود کے والہانہ پیار بھرے انداز نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ "شکریہ"! عزمیہ مسکرا دی۔ وہ عزمیہ کو اب بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھے

رہا تھا کہ عزمیہ نے بھی اس کی نگاہوں کی آنچ سے گھبرا کر اپنی نظریں
جھکا لیں۔

"یہیں روک دیجئے" مشہود نے اپنے گھر سے تھوڑی دور قبل کہا۔
عزمیہ نے کار روک دی دوسرے لمحہ وہ اتر کر کھڑکی کے سامنے عزمیہ کے مقابل
کھڑا تھا۔ "پھر کب ملیں گی؟" "مل لوں گی" عزمیہ نے جواب دیا۔ "سچ کہہ رہی
ہیں یا ٹال رہی ہیں؟" مشہود نے مسکرا کر پوچھا "سچ کہہ رہی ہوں" اور دوسرے
لمحہ عزمیہ نے پرس سے اپنا کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا جس میں
ہسپتال اور ڈسپنسری کے فون نمبر درج تھے۔ "شکریہ! میں بڑا خوش
نصیب ہوں کہ آپ کے دل میں ....." اتنا کہہ کر وہ ارادتاً رک گیا اور
مسکرا کر عزمیہ کی نگاہوں میں جھانکتا ہوا چلا دیا۔ نہ جانے عزمیہ کتنی دیر اسٹیرنگ
پر سر ٹیکے خوابوں کی حسین وادی کی سیر کرتی رہی۔ وہ مسرت سے اس قدر سرشار
تھی جیسے شراب کی کئی بوتلیں پی ڈالی ہوں۔ کچھ دیر بعد جب پیچھے سے کسی نے
ہارن بجایا تو عزمیہ نے چونک کر جلدی سے کار اسٹارٹ کر دی۔

دوسرے دن عزمیہ ڈسپنسری میں تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس کا
دل کہہ اٹھا کہ یہ فون مشہود کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ "ہلو!" عزمیہ نے
پوچھا "ڈاکٹر عزمیہ؟" مشہود کی رس بھری آواز گونجی۔ "جی۔ فرمائیے۔"
عزمیہ نے جواب دیا۔ "ایک ضروری بات کہنی تھی آپ سے۔" اس نے مسرت بھرے
لہجہ میں کہا۔ "کہئے میں سن رہی ہوں۔" عزمیہ اسے مایوس نہ کر سکی۔ "آج میں
پکچر گیا تھا۔" "اچھا! کیسی پکچر تھی؟" عزمیہ نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے
ہوئے کہا کیونکہ اس وقت وہ اسی کو یاد کر رہی تھی۔ آج مریضوں کا پتہ نہیں تھا
اور اس وقت وہ بور ہو رہی تھی۔ "پتہ نہیں کیسی تھی۔" اس نے جواب دیا۔
"واہ! تو پھر آپ نے کیا دیکھا؟" عزمیہ نے پوچھا۔ "میں تو صرف ایک گانے
کی تعریف سن کر گیا تھا۔" عزمیہ کے پوچھنے پر اس نے جواب دیا۔ "تو پھر سنائیے
نا کہ مضمون کیسا تھا وہ گانا؟" عزمیہ کا جواب سن کر مشہود کے لہجہ سے
مسرت ٹپکنے لگی۔ "واقعی آپ سنیں گی؟" عزمیہ اس کے اس طرح پوچھنے پر
گھبرائی کہ پتہ نہیں کیا اوٹ پٹانگ گانا شروع کر دے گا لیکن ہاں کر چکی تھی
اس لئے نباہنا پڑا۔ "ضرور! آپ سنائیں گے تو کیوں نہ سنوں گی" عزمیہ کا حوصلہ
افزا جواب پا کر اس نے گانا شروع کر دیا۔ "بڑے سنگدل ہو، بڑے ناسمجھ ہو
تمہیں پیار کرنا سکھانا پڑے گا ہم ہوہو .... بڑے سنگدل ہو۔"

عزمیہ سمجھ گئی کہ پکچر جانے والی بات غلط تھی دراصل وہ اپنے دل کا حال گانے
کی زبان میں سنانا چاہ رہا تھا۔ عزمیہ نے بھی اسے ستانے کو کہہ دیا۔ "مشہود صاحب،
گانا تو کوئی خاص نہیں ہے بیکار آپ نے پیسہ ضائع کیا۔" "بن رہی ہیں نا،
خیر بنئے۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ آپ سمجھ چکی ہیں۔" مشہود نے کہا۔ "اچھا،
خدا حافظ!" عزمیہ نے جلدی سے جواب دیا۔ "اس وقت ایک مریض آگیا
ہے۔ اجازت دیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور میز پر سر ٹیک
کر سوچنے لگی کہ آخر مشہود کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں ایسی حرکتیں کر رہا ہے؟
لیکن لاکھ سوچنے پر بھی اس کے سوا کوئی بات ذہن میں نہ آسکی کہ ہو سکتا
ہے اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ ہو، اسے وہ مسرت نہ ملی ہو جس
کا وہ خواہاں تھا، اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ممکن ہے بیوی اس کے معیار
پر پوری نہ اتری ہو کیونکہ اس کا عزمیہ کو اچھی طرح یقین تھا کہ کالج ہی
کے زمانے سے وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور وہ محبت آج بھی قائم تھی
یہ اور بات تھی کہ اس وقت عزمیہ نے لفٹ نہیں دی اور اب جب کہ اس کے
دل میں مشہود کے لئے محبت کے سوتے پھوٹ پڑے تھے تو ان کے درمیان
آہنی دیوار حائل ہو چکی تھی لیکن اسے وہ کیا کرتی کہ لاکھ کوشش کے باوجود
بھی اپنے ذہن سے اس کا تصور اور دل سے اس کی محبت نہ نکال سکتی تھی۔
حالانکہ وہ جانتی تھی کہ مشہود اس کا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کا اس طرح ملنا یا
گفتگو کرنا دونوں کے حق میں بہتر نہ تھا لیکن وہ کیا کرتی جیسے جیسے وہ احتیاط
برتتی جا رہی تھی مشہود کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے تھے اور عزمیہ کی محبت
بپھرے ہوئے طوفان کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔

دوسرے دن پھر ڈسپنسری میں مشہود کا فون آیا۔ "ہلو!" عزمیہ نے
کہا "آپ کا مریض مشہود بول رہا ہے۔" اس نے شوخ لہجہ میں جواب دیا۔ عزمیہ
ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے دل پر جبر کر کے کہہ دیا "معاف کیجئے۔
میرے مریضوں کی فہرست میں اس نام کا کوئی مریض نہیں۔" "خدا کی قسم، میں
میں آپ کا بیمار ہوں۔" حسب دستور مشہود کے جواب پر عزمیہ نے خاموشی
اختیار کر لی۔ "دیکھا، خاموش ہو گئیں نا، یہی میری سچائی کی دلیل ہے کہ آپ
تجاہلاً پر خاموشی اختیار کر لیتی ہیں۔" "ایک بات کہوں مشہود صاحب؟"
عزمیہ نے کچھ دیر بعد اپنے حواس بجا کرتے ہوئے سوال کیا۔ "فرمائیے، میں
گوش بر آواز ہوں۔" اس کی مٹھاس بھری آواز گونجی۔ "مجھے اس طرح تنگ

کرسکیا ملتا ہے آپ کو ۔؟ عزمیہ کا جواب سنکر اس کا حیرت سے بھرپور جملہ گونجا جس میں طنز کی بھی جھلک شامل تھی۔ کیا آج تک آپ یہی سمجھتی رہی ہیں کہ میرا مقصد آپ کو تنگ کرنے کے سوا دوسرا نہیں ؟ ۔ دیکھئے عزمیہ، آپ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہیں تو اس کا کیا علاج، ورنہ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا دل میری محبت کو قبول کرچکا ہے .... آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں .... آپ کے دل نے میری خواہش کی ہے، مجھے چاہا ہے ..... آپ نے میرے خیال میں ڈوب کر راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں ... ۔ آپ کا دماغ میرے تصور سے آباد ہے، میں آپ کی ہر دھڑکن میں بسا ہوا ہوں .... ۔ کہہ دیجئے کہ یہ سب جھوٹ ہے، کر دیجئے اس حقیقت سے انکار، ڈال دیجئے اس صداقت پر فریب کا پردہ، لیکن نہیں ! آپ ایسا نہیں کرسکتیں۔ آپ مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرسکتی ہیں لیکن اپنے آپ کو فریب نہیں دے سکتیں۔ اگر آپ مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتیں، یا آپ کے دل میں کوئی دوسرا آباد ہے تو خدا کے لئے مجھے بتا دیجئے۔ میں آج سب کچھ سننے کے لئے تیار ہوں .... ۔ مجھے میری قسمت کے فیصلے سے آگاہ کر دیجئے۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں لیکن آپ کا یہ تجاہل عارفانہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے ..... مجھے ایکبار مار دلیجئے لیکن اس طرح میری زندگی سے نہ کھیلئے ...... ۔ "مشہود !"

عزمیہ بے اختیار سسک پڑی۔ مشہود نے حقیقت کے چہرے سے نقاب ہٹادی تھی اور عزمیہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ حقیقت سے آنکھیں چار کرسکتی۔ پھر اسے کچھ خبر نہیں رہی کہ وہ کب تک اس عالم میں ریسیور پر سر رکھے روتی رہی۔ کافی دیر رو لینے کے بعد اس کی طبیعت سنبھلی تو اس نے سر اٹھایا۔ ریسیور کریڈل میں رکھا اور منہ ہاتھ دھو کر ایک گلاس پانی پیا۔ پھر وہ کرسی کی پشت سے سر ٹیکے بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ پورے دو گھنٹے کے بعد جب وہ اس قابل ہوئی کہ اب کار چلا سکے گی تو اس نے گھر کی راہ لی۔

اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ عزمیہ اپنے کمرہ میں پہنچی تو پنکی بے چاری اس کا انتظار کرکے سو چکی تھی۔ عزمیہ اس کی پیشانی چوم کر پلٹی تو عروسہ نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "آج بڑی دیر کردی آپ نے آپا ۔ ؟" "ہاں" ، عزمیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ "آج اسپتال میں ایک سیریس کیس آگیا تھا اس لئے ڈسپنسری کے بعد پھر جانا پڑا ۔" "کھانا لاؤں ؟" عروسہ نے پوچھا۔ "نہیں ، میں بڑی تکان محسوس کررہی ہوں اس لئے اب سوؤں گی۔ بھوک بھی نہیں ہے۔"

ذرا دیر بعد عروسہ گلاس میں دودھ رکھ گئی۔ عزمیہ نے اٹھ کر دودھ پیا اور کلی کرکے بستر پر دراز ہوگئی۔ نیند کا کوسوں تک پتہ نہیں تھا آنکھیں بند کئے شام کے واقعات پر غور کرتی رہی پھر نہ جانے کب کروٹیں بدلتے بدلتے نیند آگئی۔

صبح جب وہ اٹھی تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سر پھٹا جا رہا تھا اور جسم جیسے سلگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اٹھ کر منہ دھویا اور عروسہ کو آواز دی۔ عزمیہ کی آواز پر ارجمند آگئی۔ "کیا بات ہے آپی ؟" اس نے عزمیہ کے مضمحل چہرہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بخار ہے اور جسم درد سے ٹوٹا جارہا ہے عروسہ سے کہو کہ اسپتال فون کر دے کہ میری طبیعت خراب ہے آج نہ جاسکوں گی۔" "ابھی کہہ دیتی ہوں" ارجمند نے جواب دیا "لیکن آپ نے دوائی کھائی ؟" "پہلے تم مجھے گرم دودھ دے جاؤ، پی لوں تو دوائی کھالوں گی۔" ارجمند دودھ لینے چلی گئی اور عزمیہ لیٹ گئی۔

شام تک بخار کم ہوگیا تھا اور جسم کے درد میں بھی افاقہ تھا۔ چائے پینے کے بعد کچھ تقویت محسوس ہوئی تو وہ فرید سے کہہ کر باہر برآمدہ میں آرام کرسی پر لیٹ گئی۔ پنکی چاہ رہی تھی کہ وہ ہر روز کی طرح اس سے خوب باتیں کرے اور کھیلے لیکن کچھ تو طبیعت کی خرابی کے باعث اور کچھ گذرے ہوئے واقعات کے تحت عزمیہ کا جی خاموش رہنے کو چاہ رہا تھا اس لئے اس نے پنکی کو پیار سے سمجھایا کہ "میری طبیعت خراب ہے۔ آج تم سے نہ کھیل سکوں گی تم لان پر کھیلو" ۔ وہ مان گئی اور اپنی چھوٹی سی سائیکل لے کر لان میں چکر لگانے لگی۔ عزمیہ آنکھیں بند کئے لیٹی مشہود کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد پنکی کی آواز اس کے کانوں میں پہنچی "دیکھئے، میری پھوپھی امی گھر پر ہیں نا ؟" عزمیہ نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا وہ مشہود کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ عزمیہ نے جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور پیشانی عرق آلود تھی۔ "کیا بات ہے مشہود صاحب ؟" کامران کی آواز آئی۔ "جی وہ ، بے بی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اس لئے میں ڈاکٹر کے پاس آیا تھا۔ اسپتال سے معلوم ہوا وہ آج نہیں آئیں پھر

نے بتایا کہ وہ گھر پر ہیں۔ اس لئے میں حاضر ہو گیا۔" اوہ" ! کامران نے جواب دیا "لیکن آپی شاید نہ جا سکیں۔ رات سے ان کی طبیعت خراب ہے۔ خیر، میں دریافت کرتا ہوں۔ آپی ؟" کامران نے دھیرے سے پکارا۔ عزمیہ نے آنکھیں کھول دیں۔ "کیسی طبیعت ہے اب ؟" "بہتر ہے" عزمیہ نے جواب دیا۔ "یہ مشہود صاحب آئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں بے بی کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ کیا آپ جا سکیں گی اس وقت ؟" "نہیں نہیں !" عزمیہ کے جواب دینے سے پیشتر مشہود نے کہا "رہنے دیجئے، آپ کافی نحیف نظر آ رہی ہیں۔" "چلئے !" عزمیہ نے اٹھتے ہوئے جواب دیا "اب تو میری طبیعت بہتر ہے۔" پھر عزمیہ نے کامران سے کہا "میرا بکس اور آلہ اٹھا لاؤ۔" "میں شرمندہ ہوں، میری وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑی ہے اور اس وقت بھی آپ...." مشہود نے کامران کے جاتے ہی دھیرے سے کہا۔ لیکن عزمیہ اس کی بات کاٹ کر کہہ اٹھی۔ "یہ میرا فرض ہے مشہود صاحب، تکلیف کیسی" کامران دواؤں کا بکس اور آلہ لئے آ گیا۔ مشہود نے بکس اور آلہ لے لیا۔ عزمیہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چلنے لگی۔

باہر ہی دروازہ پر عزمیہ کی مڈبھیڑ ایک ایسے شخص سے ہوئی جو شکل و شباہت کے اعتبار سے مشہود سے کافی ملتا جلتا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہی مشہود کے بھائی ہونگے۔ وہ پریشانی سے ٹہل رہے تھے۔ عزمیہ کو دیکھتے ہی انہوں نے مشہود سے دریافت کیا "آ گئیں ڈاکٹر ؟" "جی !" مشہود نے جواب دیا۔ "آیئے" انہوں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ عزمیہ کمرہ میں پہنچی تو بچی کمبل میں لپٹی ہوئی پلنگ پر سوئی تھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ بچی کی ماں اس کے قریب بیٹھی تھی اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ عزمیہ نے جلدی سے بڑھ کر آلہ لگایا اور بچی پر جھک پڑی۔ جانچ کے بعد اس نے ایک انجکشن لگایا اور دوائیں لکھنے لگی پھر اس نے بچی کی ماں سے کہا "یہ دوائیں آپ ابھی منگا لیجئے۔ میں یہیں بیٹھی ہوں۔ کیوں کہ دوا فوراً ملنی چاہئے بچی کو۔ دوسرا انجکشن پھر رات کو دینا پڑے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اسے...." عزمیہ اتنا ہی کہہ سکی تھی کہ وہ سسک پڑی۔ "ڈاکٹر! میری ماہ بچ جائے گی نا ؟" "دیکھئے" عزمیہ اسے سمجھانے لگی۔ "بچی کی طبیعت زیادہ سیریس ہے لیکن اب تک تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ہاں، آئندہ کے لئے میں نہیں کہہ سکتی۔ اس لئے جلد سے جلد اسپتال داخل کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔" "اچھا" مشہود کے بھائی نے سوال کیا "کیا اس وقت انتظام ہو جائے گا داخلے کا ؟" "ضرور !" عزمیہ نے جواب دیا "مشہود صاحب دوائیں لے آئیں تو آپ لوگ بچی کو لے کر اسپتال چلے جایئے۔ میں فون کر دوں گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے سب انتظام ہو جائے گا۔" "اچھی بات ہے" یہ کہہ کر مشہود کے بھائی پھر اسی طرح ٹہلنے لگے۔

مشہود اپنی کار سے گیا تھا اس لئے جلد ہی آ گیا اور عزمیہ نے چند دوائیاں بچی کو خود ہی کھلائیں پھر وہ اٹھ گئی۔ مشہود نے اس کا بکس اٹھا لیا۔ "مسعود !" بچی کی ماں نے مشہود کے بھائی کو مخاطب کیا۔ "ڈاکٹر سے دریافت کر لو کیا میں بھی دیدی بے بی کے ساتھ ..... " "ضرور !" "آپ گھبرایئے نہیں میں سب انتظامات مکمل کر دوں گی۔" عزمیہ نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ آج مشہود کی خاطر سب کچھ عزیز تھا اور وہ بچی کے لئے ہر قسم کی سہولت مہیا کر دینا چاہتی تھی۔ "رخسانہ، تم بچی کے ضروری سامان جلدی سے درست کر ڈالو۔" مسعود نے بچی کی ماں سے کہا۔ پھر وہ مشہود سے مخاطب ہوئے "اور مشہود تم ڈاکٹر کو پہنچا کر جلد آ جاؤ بے بی کے ساتھ میں تم اور تمہاری بھابھی جائیں گی۔"

"بھابھی" ! عزمیہ کا سر چکرا گیا قریب تھا کہ وہ گر پڑتی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لئے دروازہ تھام لیا۔ "یا خدا ! یہ میں کیا سن رہی ہوں ؟ یہ عورت! جسے میں آج تک مشہود کی بیوی سمجھ رہی تھی وہ اس کی بھاوج تھی اور یہ بچی، اس کی بھتیجی" ! "سنبھالو انھیں رخسانہ" مسعود کی آواز آئی۔ اور رخسانہ نے بڑھ کر عزمیہ کو تھام لیا۔ "آپ بیٹھ جایئے ڈاکٹر۔" انھوں نے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں صرف مجھے ایک گلاس پانی دے دیجئے۔" لیکن کچھ دیر بعد رخسانہ نے نیم گرم دودھ کا گلاس پیش کیا تو اسے پی کر عزمیہ کو تقویت محسوس ہوئی۔ اور وہ چند ہی لمحوں بعد اٹھ گئی۔ اب وہ اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس کر رہی تھی اور اس پر مشہود کی وارفتگی کا راز بھی ظاہر ہو چکا تھا۔ وہ اپنے رویہ پر حق بہ جانب تھا۔ عزمیہ نے اس کے سارے قصور معاف کر دیئے۔ مشہود اس وقت عزمیہ کے آگے چل رہا تھا اور اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ سارے قید و بند توڑ کر اس کے قدموں پر سجدہ کرے۔

عزمیہ گھر پہنچی تو مشہود کے منع کرنے کے باوجود فریدہ سے کہہ کر وہ اس کے ساتھ لوٹ آئی۔ کار مشہود ڈرائیو کر رہا تھا۔ عزمیہ اس کے ساتھ

آگے بیٹھ گئی۔ مسعود اور رخسانہ بچی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر تھے۔ ہسپتال پہنچ کر عزمیہ اٹینڈنٹ کے ذریعہ ان کے ساتھ اوپر پہنچی اور بچی کے لئے فوراً ایک کیبن مخصوص کر دیا۔ رخسانہ کے ساتھ وہ خود بھی ہسپتال میں رہی اور تمام رات بچی کی نگرانی کرتی رہی۔ صبح ہونے تک اس نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی سانس کی رفتار بھی بہتر ہو گئی تھی۔

ایک ہفتہ بعد بچی اچھی ہو کر ہسپتال سے لوٹی۔ عزمیہ نے ایک ہفتہ تک دن رات ہسپتال میں رہ کر خود اس کی نگرانی کی تھی۔ ان لوگوں نے بہتیرا چاہا کہ عزمیہ اپنی فیس اور ہسپتال کے اخراجات لے لے لیکن عزمیہ نے سختی سے انکار کر دیا کیونکہ یہ بچی اسے اپنی بھتیجی بچی کی طرح عزیز تھی۔ مسعود اور رخسانہ اس کے بے حد ممنون ہو گئے تھے۔ رخسانہ کہتی "تم نے میری بے بی کی جو خدمت کی ہے وہ ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔" "اور میرے ساتھ جو سلوک انہوں نے روا رکھا ہے وہ ایک دشمن ہی دوسرے دشمن سے رکھ سکتا ہے۔" مشہود کی آواز گونجی۔ عزمیہ چونک پڑی۔ "تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے عزمیہ نے؟" رخسانہ اس کی شرارت پر ہنس پڑی۔ "پوچھ لیجئے ان سے۔" وہ کمرہ میں داخل ہوتا ہوا بولا۔ "بیٹھی تو ہیں سامنے۔" "کیا کیا ہے بھئی تم نے میرے دلبر کے ساتھ؟" رخسانہ مشہود کی شرارت سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔ اور عزمیہ شرم سے سرخ ہو گئی۔ بھلا اس سوال کا وہ کیا جواب دیتی۔ "ڈاکٹر مسیحا ہوتا ہے دشمن نہیں۔" رخسانہ نے مشہود سے کہا۔ "عزمیہ کے اعجاز کا جیتا جاگتا نمونہ تو اللہ رکھے میری بے بی ہے۔" رخسانہ نے بٹو کو پیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ہنہ!" مشہود نے جواب دیا۔ "ہزاروں میں ایک مثال دی ہے آپ نے۔ ورنہ ان کا اعجاز تو میں جانتا ہوں۔ انہیں اس وقت خبر ہوتی ہے جب ان کا مریض چل بستا ہے۔" "اور تمہاری شاید یہی ڈیوٹی ہے کہ تم بیٹھے ایسے مریضوں کی تعداد گنتے رہو۔" رخسانہ کے جواب پر عزمیہ بھی ہنس پڑی۔ "یقین نہ آئے تو آزما لیجئے گا۔ جب میں مر جاؤں گا تب انہیں خبر ہو گی۔" مشہود نے بڑی صاف گوئی سے حال دل کہہ ڈالا تھا۔ "سن رہی ہو عزمیہ کیا کہہ رہے ہیں مشہود؟" رخسانہ کے سوال پر عزمیہ کٹ کر رہ گئی۔ "خدا نہ کرے۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا لیکن دوسرے لمحہ رخسانہ کی شوخ مسکراہٹ دیکھ کر اسے اپنی بے خودی کا احساس ہو گیا اور وہ تیزی سے اٹھ کر بھاگ گئی۔

دوسرے دن مسعود اور رخسانہ عزمیہ کے ہاں آ پہنچے۔ فریدہ ظہیرالدین سے باتیں کرنے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ عزمیہ ہسپتال سے لوٹی تو ارجمند کی زبانی معلوم ہوا کہ مسعود اور رخسانہ مشہود کے لئے اس کا رشتہ مانگنے آئے تھے اور فریدہ نے انہیں دوسرے دن جواب دینے کا وعدہ کیا ہے۔ "اب تو ہاں کر دیجئے آپی۔ مشہود صاحب تو ہر لحاظ سے بہتر ہیں۔" "مجھے منظور ہے۔" عزمیہ نے جواب دیا۔ ارجمند اس سے لپٹ گئی۔ "میری آپی!" اور فرط مسرت سے عزمیہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا اٹھے۔

دوسرے دن عزمیہ مشہود سے منسوب ہو چکی تھی۔ اور مشہود کی بھیجی ہوئی الماس کی انگشتری اس کی انگلی میں دمک رہی تھی۔

شام کو وہ ڈسپنسری پہنچی تو اسے مشہود کے فون کا انتظار تھا۔ نہ جانے کیوں آج اس کا جی اس سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ ٹھیک دو فون کی گھنٹی بجی اور عزمیہ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ریسیورا "ہلو" عزمیہ نے کہا۔ "منگنی کی مبارکباد قبول فرمائیے۔" اس کی محبت بھری آواز آئی۔ عزمیہ جھینپ کر خاموش ہو گئی۔ "دیکھئے، پھر آپ نے خاموشی اختیار کی؟" "پھر کیا کروں میں؟" عزمیہ نے اس کی چھیڑ سے تنگ آ کر جواب دیا۔ "کم از کم اخلاقاً مجھے بھی تو مبارکباد دیجئے۔" مشہود کے جواب پر عزمیہ ہنس پڑی۔ "اچھا بھئی میری جانب سے بھی مبارکباد قبول کیجئے۔" "شکریہ! زہے نصیب۔" مشہود نے ہنس کر جواب دیا۔ "ایک بات پوچھوں؟" "جی!" عزمیہ نے اس کے استفسار پر کہا۔ "سچ سچ بتائیں گی نا؟" "بالکل!" اس نے سرشاری کے لہجے میں جواب دیا۔ "اچھا یہ بتائیے کہ یہ رشتہ آپ کی مرضی سے طے پایا ہے؟" عزمیہ اس غیر متوقع سوال سے گھبرا گئی لیکن جواب دینا ہی پڑا۔ اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ "جی!" "تو پھر آج سے قبل تک آپ مجھ سے کیوں کترایا کرتی تھیں؟" "اس سوال کا جواب بے حد اہم ہے۔ میں کوئی بہانہ نہ سنوں گا۔" "اور میں نہ بتاؤں تو؟" عزمیہ نے بھی شرارت سے جواب دیا۔ "نہ بتائیے لیکن یاد رکھئے کہ مجھے پوچھنا بھی آتا ہے۔ اچھا، ٹھہرئیے میں آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔ اب عزمیہ بری طرح نروس ہو رہی تھی۔ مشہود آ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا کیا پوچھے گا اور کیسے کیسے سوالات کی بوچھاڑ کر دے گا۔ عزمیہ کو اس کا سامنا کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ لیکن اس سے

ضیاء حسنی

دکھ کے سائے

روشنی کی امید

برادر محترم آداب و خلوص !

کل بہ مشکل کارڈ بھیج چکا ہوں اور آج ایک بے گھر بابو کی ڈائری کے چند اوراق ارسال کر رہا ہوں۔ یہ بابو اسی عالم کس مپرسی میں مشغلہ نوشت و خواند کو بھی جاری کئے ہوئے ہے۔ پوری کہانی عام زندگی کے محور پر گھومتی ہے مصائب و آلام کے درمیان بابو ملتا جلتا ہے، ہنستا ہے، قہقہے لگاتا ہے، کہانیاں اور مضامین لکھتا ہے، کتابیں اور رسالے پڑھتا ہے۔ لیکن مایوس نہیں ہے۔ کہانی کو ملاحظہ فرمائیے۔ یقین ہے آپ اسے پسند فرمائیں گے۔

نیازکیش ضیا حسنی

ستمبر سنہ ء

نوکری کرتے ہوئے بارہ سال بیت گئے لیکن آج بھی میرے [illegible] کوئی مکان نہیں، کوئی ٹھکانا نہیں۔ جہاں میں یکسوئی [illegible] ساتھ دو سطریں بھی لکھ سکوں۔ مجھے پرفضا بنگلے کی ضرورت [illegible] ریڈیو، ٹرانسسٹر، فین اور کولر کی تمنا نہیں۔ میلوں پھیلے [illegible] شہر میں مجھے ایک کمرہ ہی مل جاتا۔ آہ! کئی کئی دن بیت [illegible] ہیں اور مجھے اپنے ذوق کی سیرابی کے لئے۔ ایک لمحہ بھی [illegible] ملتا۔ بوجھل دل کسی طرح ہلکا نہیں ہوتا۔

کئی دنوں سے موسم کافی خوشگوار ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ کالے کالے بادل آسمان پر منڈلاتے [illegible] ہیں۔ اور ذرا سی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ دھرتی [illegible] بارش کو ترس رہی ہے۔ کسان اب بھی لو لگائے ہوئے ہیں کہ [illegible] دھار بارش ہو تا کہ ان کے کھیت سیراب ہو جائیں اور وہ دھرتی کا سینہ چیر کر اس میں گیہوں اور چنے کے ہرے بھرے پودے اگائیں۔ ادھر حکومت بھی غذائی مسئلے کو الجھتا ہوا دیکھ کر فکرمند ہے۔ البتہ ذخیرہ اندوز بیوپاری ان حالات کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہے اسے اپنے بنک بیلنس میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ ہاں! بے گھر لوگوں کو کھلے آسمان کے نیچے لیٹنے کو ضرور مل جاتا ہے۔ میں بھی آجکل بے فکری سے راتیں گزار رہا ہوں پانی برستا تو کہاں ٹھکانا ملتا۔

۲۵ اکتوبر سنہ ۶۶ء

لکھنے پڑھنے کا مشغلہ کسی طرح جاری ہے۔ لائبریری میں کتابیں اور رسالے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ ایسی ایسی کتابیں پڑھ چکا ہوں جن کی خریداری میرے بس میں نہ تھی پڑھنا بھی زندگی کی ایک اہم ضرورت بن گیا ہے۔ اور یہ

ذرے کی مانند مہینوں سے پریشاں گھوم رہا ہوں اور نہ جانے کب تک بے سروسامانی رہے گی۔ مجھے دوسو روپے ملتے ہیں اور بائیس روپے اب حکومت نے بڑھا دیئے ہیں۔ لیکن میں بدستور بےگھر رہوں گا۔ سو روپیہ کرایہ کی مد میں دے نہیں سکتا۔ اور نہ پگڑی ہی دے سکتا ہوں اس لئے مجھے کوئی ٹھکانا ملنے کی امید نہیں۔ میرا پڑوسی مجھ سے کم تنخواہ پاتا ہے۔ اس کے پاس مکان بھی ہے کولر اور فریج بھی — ریڈیو دن بھر آن رہتا ہے۔ اچھا ہے بےچارہ۔ اس کی وجہ سے ایک ناآسودہ کلرک کے کان میں چند رسیلے بول تو پہنچ جاتے ہیں۔

۱۵ جون ۶۷ء

جاوید، ناہید اور ببّی کی یاد ستاتی ہے۔ فوزیہ گھر گرہستی کے چکر میں اس طرح پھنسی رہتی ہے کہ وہ مہینوں دو سطریں بھی نہیں لکھتی۔ پچھلی بار رجب میں حضر پور گیا تھا تو مجھے فوزیہ کا پیلا مرجھایا ہوا چہرہ نہ جانے کیوں کافی دلکش لگ رہا تھا۔ میں نے پیار کی بات جیسے ہی شروع کی تو وہ کہنے لگی۔ میں روٹیاں گن گن کر اپنے بچوں کو دیتی ہوں اور آپ کو عشق سوجھ رہا ہے۔

"قحط سے متاثر ہو کر دمشق والوں نے پیار کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن۔ تم مجھے بھوک میں بھی اچھی لگتی ہو فوزیہ!"

"ایسی باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا۔"

یہ کہتی ہوئی وہ کچن کی طرف چلی گئی اور میں گھنٹوں خاموش بیٹھا رہا۔

۱۰ جون ۶۷ء

یہاں اذیتوں کے ساتھ مجھے راحتیں بھی ملتی ہیں۔ بھیڑ میں ایسے لوگ بھی ملے ہیں جن کی انسانیت قابل رشک ہے۔ فٹ پاتھ کی زندگی بھی کافی جاذبیت رکھتی ہے۔ کوئی روکتا نہیں، ٹوکتا نہیں، کرایہ نہیں مانگتا۔ میرے ساتھی بھی کافی پرخلوص ہیں۔ گئی رات تک قصے، لطیفے اور چٹکلے سناتے رہتے ہیں ان ساتھیوں کے سہارے دن کی مشکلیں آسان دکھائی دیتی ہیں۔ دن بھی اچھا گذر جاتا ہے۔ جس خانے میں برقی پنکھے کے نیچے بیٹھا ہوا پانچ بجے تک لکھتا رہتا ہوں۔ درمیان چائے کا ایک دور بھی چل جاتا ہے۔ فروٹ، مکھن اور انڈے نہیں ملتے تو کیا ہوا۔ چائے کسی طرح ٹانک سے کم نہیں۔

صبح کو لطافت ہوٹل میں میرا دوست گرو مل گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ جہاں بیٹھتے ہو ہنسی ہی رہتے ہو۔ تمہاری کہانیوں کے کردار بھی ہنستے قہقہے لگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن تمہاری زندگی تو درد کی غزل بنی ہوئی ہے۔

"میری زندگی تو ڈھکی مندی ہے تم نے کیسے دیکھ لیا؟"

"کل تم اپنی ڈائری یہاں بھول گئے تھے میں نے اس کا ہر ورق پڑھ لیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ڈائری میری طرف بڑھا دی۔

باعثِ مسرت ....

"شاخسار" کے قارئین کے لئے یہ خبر یقیناً باعث مسرت ہوگی کہ رام کے صلاح کار سید حرمت الاکرام کو "کلکتہ: اک رباب" کی تخلیق پر حکومت یو۔پی نے ۵۰۰ روپے کے انعام کا اعلان کیا ہے۔ حالانکہ "کلکتہ: اک رباب" کی ادبی اہمیت اور سید حرمت الاکرام کی شاعرانہ عظمت کے مقابلہ میں یہ انعام کوئی خاص نہیں ہے پھر بھی کم ازکم یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ اس کتاب کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(ادارہ)

پروفیسر زہرہ جبیں

"چاہئے خوبرو لڑکی"

دونوں بہت دیر تک ثمینہ کا نظارہ کرتے رہے۔

"کیوں کیا خیال ہے"! عبید نے پوچھا۔

"ریجیکٹیڈ! صمد نے مسکرا کر کہا۔

"بیوقوف کا دماغ خراب ہو گیا ہے!" عبید نے
[illegible]ڑ کر کہا۔" اس میں کیا برائی ہے؟ دبلی پتلی نازک، بڑی
[illegible]ی آنکھوں والی۔ ملاحت سے بھرپور لڑکی ہے۔ آپ کی حُسن والی
[illegible]ط پوری ہو گئی۔ گھرداری، کام کاج، دستکاری وغیرہ میں
[illegible]ہر ہے۔ دستکاری کے نمونے آپ کو دکھا چکا ہوں۔ کام کاج
[illegible]تے خود آپ نے دیکھ لیا کس صفائی اور پھرتی سے کپڑے
[illegible]حوئیں کہ واہ واہ۔ اب رہی تعلیم کی شرط تو کافی تعلیم یافتہ
[illegible]ہے۔ اردو، ہندی، گجراتی اور انگریزی اچھی طرح جانتی ہے
[illegible]ی ڈگری کی چھاپ نہیں تو کیا ہوا۔ سب سے بڑی خوبی
[illegible]ن لڑکی میں یہ ہے کہ آزاد اور پھلم پھٹاک نہیں۔ آپ کی چوتھی
[illegible]رط بھی پوری ہو گئی۔ آپ کی تیسری اور چوتھی شرطوں میں بیر
[illegible]ہے۔ کوئی کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی آپ کو اسٹرمیاں کی
[illegible]ئے نہ ملے گی۔

"ملے گی یار اور ضرور ملے گی۔ میری چاروں
[illegible]رطیں پوری کا ہونا لازم ہیں۔ کسی اور لڑکی کا اتہ پتہ بتلاؤ۔"

"بس بھائی میں تو ہار آیا اس دھندے سے۔ آپ کوئی
[illegible]رشاہ والا ڈھونڈیئے۔ ابھی ابھی جا کر خالہ اماں کے سامنے
اپنا استعفیٰ پیش کئے دیتا ہوں۔

عبید چڑ کر منہ بناتا ہوا اور صمد مسکراتا ہوا
دونوں ثمینہ کے پڑوس کے چھجے سے اتر آئے۔ اور صمد کے
گھر پہنچے۔ عبید کی اماں بھی موجود تھیں۔ اور دونوں
بہنوں میں اس اہم معاملے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ عبید اور
صمد کی آمد نے ان کے جوش و خروش میں اور اضافہ کر دیا۔

"لے لو وہ آ گئے۔ اب کی بار تو لڑکی ضرور پسند
آئی ہو گی۔ خالہ نے خوش ہو کر کہا۔

صمد نے کہا۔" جی ہاں عبید کو بہت پسند آئی!"

"اے واہ کیا مشرفہ کی سوکن لانے کا ارادہ ہے!"
ماں نے ہنس کر کہا۔

"میرا تو کوئی ارادہ نہیں۔ خود عبید صاحب کا
ہی ارادہ ہے۔ جس لڑکی کو دکھاتے ہیں اسی پر لٹو ہو جاتے
ہیں۔ اور میں کنوارا بالا ڈلا نہیں پھسلتا۔ اب دیکھئے نا
سکتی سکتی مریل لڑکی تھی۔ اور اس پر کالا رنگ۔ سونے پہ
سہاگہ۔ آنکھیں البتہ بڑی بڑی سیاہ اور غلافی تھیں۔ اب لگے
آپ اس کی نزاکت، لطافت اور ملاحت کے قصیدے پڑھنے۔
خدا جانے خدا نے اس کو کیسی آنکھیں دی ہیں کہ بدنمائی بھی حسن
بن کر نظر آتی ہے۔ اچھا ہوا کہ مشرفہ بھابی کو خالہ اماں نے
پسند کیا ورنہ یہ کسی ببول کے درخت کی چڑیل کو پسند کر لیتے۔

اور اسے جنت کی حور سمجھ کر اس کی پرستش کیا کرتے "

"خدا نے ہمیں چھپر پھاڑ کر بیوی دی۔ تمہاری طرح سات جوتے نہ گھسے" پھرے۔ یہ کام ماں بہنوں کا ہوتا ہے۔ انہیں پر چھوڑ دو۔ جب دلہن آجائے گی تو گھونگھٹ الٹ کر دیکھ لینا چودہ طبق روشن ہوجائیں گے "

" میں اپنے دماغ کے طبق روشن کرنا چاہتا ہوں، دل کے نہیں۔ اپنی شریک حیات کو اپنی عقل سے چننا چاہتا ہوں، دوسروں کی عقل سے نہیں "

ذرا وکالت کیا پاس کر لی لہ اکڑتے پھر رہے ہیں صاحب کے دماغ ہی نہیں ملتے! آپ کے لئے تو الٹا سو نمبر رجایا جائے تو خوب جدت رہے کیوں وکیل صاحب!"

اے ہے عبید تو تو پنجے جھاڑ کر ہی بچے کے پیچھے پڑ گیا۔ ذرا لڑکیاں دکھائی پڑ رہی ہیں تو بیزار ہو گیا۔ ابھی ابھی میرے بچے نے لڑکیاں ہی کتنی دیکھی ہوں گی؟ عبید کی والدہ نے پوچھا۔

"کم سے کم دس پندرہ تو دیکھ لی ہوں گی! دیکھنے والوں کو ٹھیک یاد ہوگا" صمد کی والدہ نے دونوں لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیکھنے کے قابل ہوتیں تو یاد بھی رہتیں! دیکھنا نہ دیکھنا سب برابر ہے "

اُوہ رے دماغ جی چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ غ جنت میں پہنچ جاؤں۔ کوئی نہ کوئی حور ضرور پسند آجائیگی" نے ہنس کر کہا "وہ کالج کی پڑھی تو ہوگی نہیں۔ اس کے اور وہ جنت میں کام نہ کاج بالکل پھوہڑ ہی ملے گی" ماں نے کہا بالبس اب یہ تماشا بند کر۔ جیسے کہ عبید کہتا ہے۔ یہ معاملہ پر ہی چھوڑ دے"

" معاملہ نازک ہے ماں آپ لوگوں سے نہ نپٹے گا "

" عبید میں کہوں کہ فوزیہ کو دکھا دوں وہ ضرور چاروں یے بندی کر دے گی "

" بیکار ہے ماں! ان کو کوئی فوجی ہی پسند تو آئے "

" فوزیہ کو دیکھنا ٹیڑھی کھیر تھا۔ کیونکہ گھر کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا اور نہ جان پہچان والوں اس سے پہچان تھی۔ اس کے علاوہ پرانا وضعدار گھرانا ایم۔ اے پاس ہونے کے باوجود لڑکی پردے کی پابند صرف عبید کی ماں نے کسی تقریب میں اسے دیکھا تھا، وہ انہیں صمد کے لئے بہت پسند آئی تھی۔ اب صمد کے سپرد یہ کام ہوا کہ اس لڑکی کو ہتے چڑھائے۔ صمد طرح طرح سے نئی نئی ترکیبوں سے لڑکیاں دیکھی تھیں پچھوں سے اور چاندنیوں سے، پارکوں میں اور دکانوں میں، لڑکیوں کے گھر پر اور اپنے گھر پر دو تین لڑکیوں براہ راست ملاقاتیں بھی کیں لیکن انہیں یہ نہ معلوم ہو کہ مقصد کیا ہے کیونکہ صمد کسی لڑکی کی توہین نہ کرنا چاہتا تھا۔ فوزیہ سے راہ و رسم پیدا ہونے تک عبید اور صمد کی چھٹی کیونکہ کوئی اور لڑکی کسی کے خیال ہی میں نہ آتی تھی۔ شہر کی تمام لڑکیاں تقریباً دیکھی جا چکی تھیں اور چند دوسرے شہروں کی بھی لیکن دوسرے شہروں میں مارا مارا پھرنا وقت طلب خرچ طلب اور دقت طلب امر تھا۔ لیکن باہر کے چند لڑکیوں کے ورود کا انتظار رہتا۔

خوش باش صمد اب ذرا متفکر سا رہنے لگا تھا۔ اس بات کی اسے بڑی فکر تھی کہ کہیں کوئی شرط نہ چھوٹ جائے اور اس کی بات ہیٹی نہ ہو۔ ایک دن وہ اپنے خانے آفس میں قانون کی کتابوں کی ترتیب میں مصروف تھا اور اپنی حسین فکر دور کرنے کے لئے غالب کے اشعار گنگنا رہا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن ہاجرہ یہ مژدہ جانفزا لائی کہ پڑوسن کے یہاں مہ جبینوں کا جمگھٹ لگا ہوا ہے۔ اور اس وقت صمد کے لئے بڑا نادر موقع ہے کیونکہ سب زنانخانے کے صحن میں جمع ہیں اور بیچ کی دیوار کے روزن سے نظارہ ہو سکتا ہے

بیزاری پر مسکرا پڑا اُسے بھابی لانے کی بڑی جلدی
مانی تھا۔ وہ اس فوری مہم کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔
بتلا دیا کہ وہ لڑکیوں کے ناک نقشے اور دوپٹوں کے
رکھے۔ ورنہ لڑکیاں مکس اپ ہو جائیں گی۔ تو وہ ذمہ دار
خوش دلی سے ہنسا "گھبرا نہیں گڑیا۔ لڑکیاں مکس اپ
ں اور میں دھوکا بھی کھا گیا تو تجھ سے کچھ نہ کہوں گا۔
آئے گا۔ کیوں آئے گا نا؟! اچھا تو تو جا کر اس جگھٹ
جا اور جو لڑکی تجھے سب سے اچھی لگے اس سے خوب
میں ذرا تیری بھی پسند دیکھ لوں۔"
واہ میں اب گڑیا وڑیا نہیں میں اب میٹرک پاس
ا" ہاجرہ نے بن کر بگڑتے ہوئے کہا اور اپنا دلچسپ
م دینے کے لئے فوراً پڑوسن خالہ کے یہاں گھس

محمد نے انفرادی طور پر حسن کو پرکھنے کی کوشش کی
نظارۂ جمال کی اسے عادت نہ تھی۔ اب یہ
جگھٹ اس کے پیش نظر ہو گیا۔ تو وہ کچھ گھبرا سا گیا
پریوں کی پرائیوٹ ادائیں اور ناز و انداز دیکھ
اپنے آپ کو چور محسوس کرنے لگا۔ اور اسے خیالات
نے لگی کہ وہ ایک نہایت نازیبا حرکت کر رہا ہے
اسے اپنا مقصد یاد آیا۔ یہ احساس کم ہو گیا
کے سکون و عقل کی کسوٹی پر کسنا شروع کر دیا
کے ساتھ مجھے ان کے دوپٹے یاد رکھنا پڑیں گے۔
یہ یاد آنے پر وہ مسکرا پڑا پہلے اس پیلے دوپٹے
جائے۔ بہت چہک رہی ہے۔ ناک بہت خوبصورت
ناک۔ غنچہ دہن ہے، رخساروں پر سرخی ہے
رنگ کے ساتھ بہت بھلی لگ رہی ہے۔ جیسے برف
ار چھڑک دیا گیا ہو۔ آنکھیں کس قدر چمکدار
سے بھرپور ہیں۔ کاش کہ یہ ذرا بڑی ہوتیں۔ اور
دسیلی ہوتی۔ بس تھوڑی سی کیونکہ اس چہرے پر
بہت بڑی پیشانی بے ڈھب ہو جاتی ہے۔ سیاہ بال گردن
خوشنما ہے۔ بھنویں بنائی ہوئی ہیں چہرے پر سوٹ نہیں
کرتیں یہی تو ان ہندوستانی لڑکیوں میں کھوٹ ہوتی ہے
رموز میک اپ کرنا بھی نہیں جانتیں۔ لیکن اس کا قد!
ظالم اپنی جگہ سے اٹھے تو قد نظر آئے ...... اور یہ سیاہ
دوپٹے والی کس قدر گوری ہے۔ اُفوہ! شاید رنگ کو
نمایاں کرنے کے لئے ہی یہ دوپٹہ پہنا گیا ہے۔ اور ناک
کٹورا سی ہے۔ نہیں بہت کٹورا بھی نہیں۔ گول شیپ
کی گیند نما ناک ہے۔ گول چہرہ پر موزوں ہے۔ گال موٹے
موٹے۔ پیشانی چوڑی چوڑی۔ زلفوں کے چھلّوں سے
گھری ہوئی جیسے سفید کپڑے پر کالی جھالر لگا دی گئی
ہو۔ وہی ان نیچرل میک اپ۔ اب کھڑی کیوں ہو گئی
قد لانبا اور دھڑ ہلا ہوا ہے اس لئے اس سے بیٹھا
نہیں جاتا۔ یہ لڑکیاں کس قدر نمائشی ہوتی ہیں۔ پیلے دوپٹے
اور کٹاری ناک والی اپنی جگہ سے اٹھتی ہی نہیں ہو نہ ہو کچھ
دال میں کالا ہے۔ اب یہ سرمئی جوڑا دیکھیں۔ سرمئی دوپٹہ
سانولی رنگت۔ سیاہ آنکھیں کس قدر دلکش ہیں
یہ کٹورا سی ہیں یا نرگسی یا بادامی۔ لاحول ولا قوۃ!
آنکھوں کو بادامی کہنا تو گویا ان کو بدنام کرنا ہے۔ پتہ نہیں
یہ کس غیر شاعرانہ شاعر کی جدت تشبیہ ہے۔ یہ آنکھیں
دراصل غزالی آنکھیں ہیں۔ بیضوی چہرہ، صراحی دار
گردن۔ خوش پوش چھریرا خوبصورت جسم کس قدر پتلی
کمر ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کا انداز کتنا دل نشیں ہے اس قدر
مسکراتی کیوں ہے ظالم! اپنی دلکشی سے واقف ہے
کسی کے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا وہ گھبرا کر پلٹا عبید
تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ وہ سمجھا تھا۔ ابا میاں
ہیں۔ اگر وہ ہوتے تو وہ انہیں دوبارہ منہ دکھانے کے
قابل نہ رہتا۔ اس نے عبید کو اشارہ سے چپ
رہنے کو کہا اور کھڑکی کے ایک دراز کی طرف اشارہ کر دیا

عبید بھی کو ادھر متوجہ ہوا اور صمد نے پھر اپنے روزن پر آنکھ
جما لی۔ ماجرہ نے ایک نیلے دوپٹے سے بات کرتی نظر آئی۔
دوپٹے کی پشت تھی اور ماجرہ کا رخ اس کی طرف تھا۔ اس کی
بہن کس قدر خوبصورت ہے۔ اس میں کوئی نقص نہیں
اور یہ کلی پھول بن کر کیا غضب ڈھائے گی! کیا یہ بھائی
کی آنکھیں ہیں جو بہن میں کوئی نقص نہیں پا سکتیں۔ نہیں
دراصل اس کی بہن تیکھے نقوش والی ہے۔ وہ سرتاپا سانچے
میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اگر اسے ایسی لڑکی مل جائے تو وہ
آنکھ میچ کر اسے اپنی شریک حیات بنائے۔ اپنی شرائط کو
بھی خیرباد کہہ دے۔ اچانک ماجرہ نے اس لڑکی کے دونوں
ہاتھ پکڑ کر اسے گھما دیا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ کلی
پھول بن کر غضب ڈھا رہی تھی۔ کیا ماجرہ اپنے حسن سے
واقف ہے جو اپنے ہی جیسے حسن کا انتخاب کیا؟ یہ صرف
اتفاق ہے۔ اس نے دونوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔
کچھ تھوڑا بہت فرق نظر آتا تھا۔ مثلاً اس لڑکی کی
پیشانی زیادہ وسیع تھی۔ زلفیں زیادہ طویل تھیں۔ قد ماجرہ سے
نکلتا ہوا تھا۔ رنگت زیادہ کھلی ہوئی تھی۔ ناک بھی ماجرہ
کی ناک سے زیادہ لانبی لیکن آنکھیں بالکل ویسی ہی۔ بھویں
بھی ایک ہی جیسی سیاہ اور گھنی پلکیں یکساں لانبی۔ وہ
وہ لڑکی اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔ وہ روزن سے ہٹ
آیا۔ بس اسے کسی اور کے حسن کے مقابلے کی ضرورت
نہیں۔ عبید بھی اپنے مقام سے کھسک آیا اور دونوں
صمد کے کمرے میں پہنچے۔

"کہو بھائی! گوہر مقصود ہاتھ لگا یا نہیں؟"

"اتنی لڑکیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا بڑا
مشکل کام ہے۔ عبید تم بتلاؤ کہ بہترین کونسی تھی؟"

"ایں کیا دو چار پسند آگئیں؟ کیا شرعی آزادی
سے کام لینے کا ارادہ ہے؟"

حقیقت تو یہ ہے کہ چار کا معائنہ اور مشاہدہ کیا
اور چاروں بری نہ تھیں۔ تم اپنا انتخاب تو بتلاؤ۔"

"انفرادی طور پر تو مجھے ہر لڑکی پسند آتی رہی لیکن
اس مجمع میں تقابلہ کرنے کا موقع تھا۔ اس لئے میں ایک کا انتخاب
کر سکا۔ مجھے تو وہ ہری بنارسی والی لڑکی حسین اور بہترین
لگی یعنی نمبر ایک۔ سفید تاروں کی ساڑی والی نمبر دو
سرخ ساڑی نمبر تین۔ بہت زرق برق اور بھڑکیلی لڑکی
تھی۔ مگر تھی لاجواب۔ نمبر چار وہ قوس قزح ساڑی والی بڑی رنگین
مزاج معلوم ہوتی تھی۔ ہونٹ لپ اسٹک سے پُتے ہوئے
تھے۔ اس کا حسن صرف میک اپ نہیں تھا۔ دراصل وہ حسین
ہے۔ اگر اس قدر میک اپ نہ کرے۔ اور سادگی اختیار
کرے تو زیادہ حسین نظر آئے اور زیادہ کو میں دیکھ نہ پایا۔
تم نے ضرور کوئی فیصلہ کر لیا۔ اس لئے مجھے بھی کھسکا دیا۔
مجھے بڑا لطف آ رہا تھا اور یہ شعر یاد آ رہا تھا۔

"خوب آپ کا شاعرانہ احساس جاگ اٹھا ذرا
ہم بھی آپ کے شعر سے مستفید ہوں!"

مستفید ہونے کی بجائے کہیں آپ نقصان نہ اٹھائیں
مگر سن لیجیے۔

کہاں لے جاؤں میں دل کو بہت ہی عشق مشکل ہے
یہاں پریوں کا جمگھٹ ہے وہاں حوروں کی محفل ہے

"اے بھائی! نظارۂ جمال سے تیرا دل نہ بھرا تھا تو کیوں ہٹ
گیا۔ میں تو اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے
اپنے انتخاب کے بعد فوراً ہٹ گیا۔ اور یہ ساڑیاں کس طرف
تھیں میں نے تو دیکھی نہیں۔ میں نے دو بڑے دوپٹے دیکھے۔"

"دوپٹے تو میں نے سرسری طور پر دیکھے۔ تمہاری طرح
الجھ نہ گیا۔ دوپٹوں میں تو کوئی حسین نہیں تھی۔ دراصل جوڑوں کی
جگمگاہٹ آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ حسن کو تو ساڑیوں
میں دیکھنا چاہیے۔"

"ہونہہ تمہارا خیال غلط ہے۔ دوپٹے۔ غرارے اور شلوار
بہترین لباس ہیں۔ شانہ اور اور شانوں پر ادا کس قدر دلکش لگتی

...س ہوتا ہے۔ ساڑیوں میں تو لڑکیاں ڈنڈے کے ڈنڈے
...یں اس لئے میری توجہ اس طرف نہیں گئی۔"
خیر اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا خیال ہے۔ اب ذرا اپنا
...ب تو بتلائیے؟

اور صمد نے اپنا انتخاب بتلایا۔ ناجرہ کے آنے پر نیلے دوپٹے
...ا در پتہ پوچھا گیا۔ اس کا نام فوزیہ تھا اور اسی شہر کی تھی۔ یہ وہی
تھی جس کا حوالہ صمد کی خالہ نے دیا تھا۔ گھر والے بہت
...ئے کہ آخر معاملہ پٹ گیا۔ صمد شاداں تھا کہ خدا نے کیا
...گی مراد دی ہے۔ بالکل ہیرن کی شبیہ! فوزیہ کے گھر تک
...حاصل کی گئی اور پیام رسانی شروع ہو گئی۔ لڑکی کے والدین
...رشتہ داری کا رجحان امید افزا تھا۔ کیونکہ انہیں یہ گھرانا
...بہت پسند آیا لیکن تقدیر صمد میاں کا منہ چڑا رہی تھی۔
...وز خلیل منہ لٹکائے آیا اور خبر سنائی کہ۔ یار غضب
...لڑکی نے تمہیں دیکھ لیا۔

صمد ہنس پڑا "مجھے دیکھ لیا؟ بڑے غضب کی بات
... لیکن کیا غضب ہو گیا؟ اس نے مجھے کب اور کہاں
...یکھا۔ میں نے تو بہ کوشش کی تھی کہ یہ نوبت ہی نہ آئے۔"

"یار بالکل بھولے ہو۔ بہر دکھوے کو ان کے گھر
...ئے اور پھر بھی نوبت نہ آتی۔ تم سمجھتے ہو کہ صرف اس کے
...امی اور والد نے ہی تمہیں دیکھا۔ ارے صاحب شیشوں کے
...ب سے سارے زنانخانے اور محلے والیوں نے تمہارا ملاحظہ
...مشاہدہ کیا۔ اگر گئے تھے تو ذرا منہ پر کالک وغیرہ مل کر اور
...بدنما ماسک پہن کر گئے ہوتے۔ اور یہ ڈھب الول جلول
...لباس پہنا تھا! گئے تو زمانے بھر کے حسین اور خوش پوش
...ر بن کر"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ آج تمہاری باتیں بہت الٹی الٹی
...سمجھ سے بالاتر!"

"ارے بندہ خدا فوزیہ نے تم سے شادی کرنے سے انکار
...کہتی ہے ایسا حسین جمیل شوہر مجھے نہیں چاہئے۔

"بکواس کرتے ہو مجھے بنا رہے ہو بھئی یہ کوئی ہنسی
مذاق کا موقع نہیں۔ مجھے سچ مچ اس لڑکی سے عشق ہو گیا ہے
اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں بے موت مر جاؤں گا۔"

"پھر تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ اس لڑکی کا
خیال یہ ہے کہ شوہر کو بدشکل ہونا چاہئے۔ اگر بدشکل
ملنا ممکن نہ ہو تو کم سے کم بیوی سے تو خوبصورتی سے بہت
ہی گھٹ کر ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ بیوی کی شامت بلا دیتا
ہے۔ اپنے جمال و جلال کے گھمنڈ میں بیوی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں
اور بیوی کے پاس تو حسن کا ایک ہی ہتھیار ہوتا ہے اور وہ
میاں کے جمال و جلال اور قوت کے سامنے بالکل بیکار
ہو جاتا ہے اور بیچاری کو دب کر بلکہ لونڈی بنکر
رہنا پڑتا ہے۔ اور آپ کے معاملے میں تو سونے پر سہاگہ
ہو رہا ہے۔ ایک تو وکیل صاحب اور اس پر ایسے
خوش لباس اور اسمارٹ وکیل لوگ بڑے منطقی ہوتے
ہیں۔ جیسے اپنے موکلوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں اور
ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بیوی پر بھی رعب
جماتے رہتے ہیں۔"

"یار مجھے بیوقوف نہ بناؤ۔ بس اب مجھ سے
برداشت نہ ہو سکے گا۔"

"تمہارے سر کی قسم! میں مذاق بالکل نہیں کر رہا
ہوں۔ خود مشرف نے یہ باتیں سنی ہیں۔ والدین نے لاکھ
سر پٹکا کہ وہ ان بیہودہ خیالات کو خیرباد کہے اور
ایسا اچھا شوہر ہاتھ سے نہ جانے دے۔ لیکن اس کے
خیالات بھی بڑے پختہ ہیں۔ ایم۔ اے پاس ہے نا! بہت
ہٹ کی پکی ہے۔ کسی کی ایک نہیں سنتی۔ مجھے بہت ہی افسوس
ہے۔ صمد بلکہ دلی رنج ہے جانے دو کم بخت کو۔ اس گروپ
کی تو بہت سی لڑکیاں اچھی تھیں۔ ہم کوئی دوسری لڑکی
ٹرائی کریں گے۔"

لیکن صمد پر تو جیسے اوس پڑ گئی۔ اور سانپ سا سونگھ گیا

عبید بہت سہارنے کے بعد چلا آیا۔ وہ بہت دیر تک ایک
سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ
کا" یہ پر یقین رکھنے والا شدید ترین عشق میں مبتلا ہو چکا
تھا۔ اسے اس وقت ہوش آیا جبکہ ہاجرہ نے اس کے
گلے میں اپنے ہاتھ ڈال دیئے۔ اور اس کی پیشانی چوم کر
کہا۔"

"جانے دو بھائی جان کمبخت کو ہم اس سے بھی اچھی
بھابی لائیں گے۔"

صمد کے آنسو ٹپک پڑے۔

"نہیں ہجو! ایسی کوئی بھابی اب تمہیں مل نہیں سکتی"

پھر ہاجرہ نے تجویز پیش کی کہ وہ خود فوزیہ کے
کے پاس جائے گی اور اسے رضامند کرے گی۔ کیونکہ
فوزیہ اس کی بہت گہری دوست بن چکی تھی۔ صمد نے
یہ تجویز بھی پیش کر دی کہ وہ فوزیہ سے یہ درخواست
کرے کہ اس کا بھائی اس سے صرف ایک مرتبہ ملنا چاہتا
ہے۔ جب ہاجرہ نے فوزیہ کو منانا چاہا تو اس نے ہنس کر ہاجرہ
کے دونوں رخسار پر ایک چپت لگا دیا۔ اور کہہ دیا
کہ اس کا فیصلہ پتھر کی لکیر ہے۔ اور صمد سے ملاقات کرنے
سے بھی انکار کر دیا۔

اگرچہ گھاؤ بہت گہرا تھا لیکن صمد نے اپنے آپ کو سنبھالا
وہ قیس و مجنوں کی انتہا کو نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت
سے عاشق دیکھے تھے جو تپ عشق اتر جانے کے بعد شادیاں
رچا کر خوش و خرم زندگی گذار رہے تھے اور زندگی کے
جھمیلوں میں ایسے پھنسے تھے کہ کبھی بھول کر ہی انہیں اپنی
پہلی محبوبہ کی یاد آتی ہو گی۔ اس نے والدین کو اختیار دے دیا کہ وہ
اس کی دیکھی ہوئی لڑکی سے سلسلہ جنبانی کریں لیکن پانسہ پلٹا ہوا
تھا۔ ان لڑکیوں میں سے کوئی نہ ملی۔ کسی کے والدین نے انکار کر دیا
کسی کا رشتہ پہلے کہیں طے ہو چکا تھا۔ اور کوئی اپنے منازل
عشق طے کر رہی تھی۔ یہی قصہ عبید کی پسند کی ہوئی لڑکی کا ہوا

صمد شکست پر شکست کھاتا رہا۔ اور مسکراتا رہا۔ اس نے
وہ مات کھائی تھی کہ اب کوئی شکست اس کے لئے شکست
نہ تھی۔ اس کی شرطیں ہوا ہو چکی تھیں۔ اس کی خالہ اور پھو[illegible]
اسے پھر لڑکیاں دکھانی چاہیں۔ لیکن اس نے انکار کر[illegible]
اس کے علاوہ اس کی دادی بگڑ کھڑی ہوئی کہ یہ تو
بہت ہوا! اب انہوں نے یہ معاملہ اپنے ہاتھوں میں
لے لیا۔ کدھر پیغام رسانی ہو رہی ہے اور کیا فیصلہ
ہو رہا ہے۔ صمد اس سے بالکل بے پروا اور بے نیاز
تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ ستارے اس کے
مخالف ہیں۔ وقت گذرتا جا رہا تھا اور اس سا[illegible]
میں سب کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔

آخر کسی دور دراز رشتہ دار کے ذریعہ
کسی دوسرے شہر میں بات طے پا گئی اور صمد کے
والدین صمد کو لے کر گئے اور لڑکی بیاہ لائے۔

شب عروس صمد کے لئے بڑی جانکاہ تھی
فوزیہ کی یاد! اپنی شرائط اور اصولوں کا خون! اپنے
مردانہ زعم کی شکست!

فوزیہ کی یادگار! فوزیہ کا نرالا اصول تھا۔ جو
وہ اپنا چکا تھا۔ کیونکہ حلیمہ نہتّا تھی!

بقیہ افسانے

"سندری تم کس سے شادی کرو گی"

"ڈاکٹر صاحب سے" اس نے میری طرف اشارہ کیا

(۱۰) مقام

محبت کا صحیح مقام —

رات........

شادی کا صحیح وقت

بعد دوپہر........

بیوی کو تحفے دینے کا وقت

سرِ شام



اعجاز احمد بٹ

(۱) زندگی میں ایک بار ....

دو راکٹ اکھٹے چاند پر اترے ۔ دونوں کی کھڑکیاں
ں ۔ دونوں میں سے ایک ایک آدمی باہر نکلا ۔ ہر ایک
رے پر شفاف نقاب تھا ۔ ہاتھ میں سٹین گن کی قسم کا
ہتھیار ۔ پاؤں میں کسی دھات کے جوتے ....
ں فوجی انداز میں قدم بڑھانے لگے ۔

جب دونوں ایک ٹیلے کے قریب ملے تو پہلے نے
رے سے کہا ۔

" ہینڈز اپ .... اگر آگے بڑھنے کی کوشش
اڑا دیئے جاؤ گے "

" یوشٹ اپ .... اگر زیادہ آواز نکالی
ا گلا دبا دیا جائے گا ۔

" تم کون ہو "

" تم کون ہو "

" میں نیچے کی دنیا کا انسان ہوں "

" میں اوپر والی دنیا کا انسان ہوں " اس نے اوپر
ہ کیا "

" آؤ پھر دونوں مل کر چاند والے انسان کو تلاش کریں "

" عورت یا مرد "

" میں تو عورت کی تلاش کروں گا " نیچے دنیا والے
انسان نے کہا ۔

" مجھے تو مرد کی تلاش ہے ۔ ہمارے ملک میں عورتیں ہی
عورتیں ہیں — مرد نہیں ۔

اور پھر دونوں کی آنکھیں ملیں

اور اوپر والی دنیا کے انسان نے خول اتار دیا اور
سراپا حسن بن کر سامنے آ گیا ۔

(۲) اکھاں وارث شاہ نوں !

جب ایٹم بم نے ساری فضا کو دھواں دھار کر دیا اور
عظیم المرتبت انسان کے حصے بکھرے ذرات بن کر اڑ گئے عمارت
زمین پر آ رہی ۔ تو بچے کھچے ملبے میں سے ایک ادھیڑ عمر
جسم نے سر اٹھا کر ایک کٹے ہوئے سر پر اپنے ہونٹ جما دیئے
اس نے اپنی سوکھی سوکھی آنکھیں جھپکا کر گویا
اشاروں سے کہنے لگی
آج وارث شاہ نوں ....

(۳) ہمارا بھی ......

جب رات کے اندھیرے میں برقعہ اوڑھے وہ رات کے راہی کے ساتھ ایک گھر میں داخل ہوئی تو اس نے جلد نقاب الٹ دیا ......

نہ ... نہ ... ابھی نقاب نہ اٹھا ..... کوئی پہچان لے گا ....

محلے ہمسائے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے"

پہچان لے گا تو ہمارا کیا لے گا ...... مفت میں پبلسٹی ہو گی۔

"پبلسٹی ......" اس نے زیر لب کہا "پبلسٹی تو تمہاری ہو گی اور بے عزتی ......"

وہ روبانسا ہو گیا ......

(۴) محبت بم اور سائنسداں

جب ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم عورت کی زلفوں کو تہہ و بالا نہ کر سکے۔ تو ایک سائنس داں نے آگے بڑھ کر سوال کیا.... اے حوا کی بیٹی ..... وہ کیا جادو ہے جو تیرے پاس ہے۔ اور جس سے تیری جان محفوظ ہے .....

حوا کی بیٹی نے جھکی جھکی پلکیں اٹھا کر سائنس داں پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ تو وہ پکار اٹھا۔

"نہیں — نہیں — یہ عظیم ہے اس پر بم مت پھینکو"

(۵) فرسٹریشن

میرے ضمیر نے مجھ سے کہا "حلال کی روٹی کھایا کر"
میرے دماغ نے جواب دیا "احساس کمتری غالب آجائے گا"
"احساس کمتری پر غالب آجاؤ" ضمیر نے غصہ سے کہا
"پھر فرسٹریشن ہو جائے گی" دماغ نے جل بھن کر جواب دیا۔

(۶) پیلے ہاتھ

"امی تمہارا ہاتھ کیوں پیلا ہوتا جا رہا ہے"
"تمہارے ہاتھ جو پیلے کرنے ہیں بیٹی"

(۷) نان سنس

"یو شٹ اپ نان سنس۔ تم نے ہمارے بازو لگایا۔ ہمارے بازو کو تھپکی دی۔ آنکھوں کے اشارے سڑک کے اس کنارے بلایا۔ اور یہاں اندھیرے میں ہنسنا شروع کر دیا۔ راسکل .... (آہستگی) تم نے پے منٹ (Payment) نہیں کیا تم بڑا

(۸) فرض شناسی

مریخ پر جب عورت نے اپنا خول اتارا تو اس کی ابھری ہوئی چھاتی اور ننگی ہوتی بیک نمایاں ہو گئی۔ سب مریخیوں نے اسے گھیر لیا۔

"یہ زمین والوں کا چوتھا ایجنٹ ہے۔ اسے راکٹ میں بند کر کے مشتری میں بھیج دو۔" سب مریخیوں نے مطالبہ کیا۔

جب ان کا سردار آگے بڑھا تو کہنے لگا۔
"آج رات مجھے اس کی سٹیٹمینٹ لینے دو کل اسے بھیج دیں گے۔"

(۹) نئی نسل

میں نے ننھی منی سندری کو گود میں بھر لیا اور اپنے پرحدت ہونٹ اس کے گالوں پر جما دیئے۔ وہ ان کے ساتھ بچپن کا کام ختم کر کے چلی گئی۔

شام کو بچے باہر کھیل رہے تھے۔ میری ننھی بچی نے کھیل ہی کھیل میں پوچھا؟

ڈرامہ

عبدالحنان

رضیہ سلطانہ

کردار ـ
رضیہ سلطانہ ـ التمش کی بیٹی ـ دلّی کی ملکہ ـ
جمال الدین یعقوب ـ ایک غلام
لیلٰے ـ جمال کی بیوی ـ
فیروزہ ـ رضیہ کی خادمہ
التونیا ـ سرہند کا گورنر
معیز الدین بہرام اور دیگر
وقت ـ رات کا پچھلا پہر
مقام ـ ۱۲۳۹ کے لگ بھگ کی دلی ـ

پہلا منظر

پردہ اٹھتا ہے تو دلی کا شاہی اصطبل دکھائی دیتا ہے۔ اصطبل سے کچھ دور ہٹ کر ایک کٹیا ہے۔ کٹیا کے چاروں طرف نیم اور دوسرے درخت ہیں۔ سامنے میدان ہے۔ میدان ہی کے پاس ایک چبوترہ ہے۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔

کٹیا سے باہر پتھریلی زمین پر لیلٰے بے قراری سے ٹہلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی عمر بیس کے لگ بھگ ہوگی۔ خوبصورت تو نہیں البتہ جاذب نظر ضرور ہے۔ ہر طرف رات کا گہرا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ لیلٰی کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی کی راہ تک رہی ہے۔ وہ ٹہلتے ہوئے اسی چٹان پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور اپنی بند مٹھی کھولتی ہے۔ مٹھی کھلتے ہی دو بالے جو چاندنی میں نظر آتے ہیں۔ وہ دونوں کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ٹکٹکی باندھ کر حسرت سے ان کی طرف دیکھتی ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کا درد سمٹ کر آ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کچھ ہی دیر میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔ اسی وقت پیچھے سے جمال الدین یعقوب دھیرے سے آ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ایک تر و تازہ کڑیل نوجوان ہے ـ شاہی اصطبل کا ملازم خاص ـ

جمال (بہت ہی آہستہ سے) لیلٰے ـ

لیلٰے ـ (حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے ـ اور پھر مڑ کر آواز کی طرف دیکھتی ہے ـ اور جمال کو اپنے پاس کھڑا پا کر خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہے اور پھر اس کی گردن میں باہیں ڈال کر ـ اُفوہ ! تم آ گئے .... تم آ گئے .... میں تو ناامید ہو چلی تھی ـ

جمال ـ خدا کی مہربانی ہے ـ لوٹ آیا ـ

لیلٰی ـ (اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہے اور گھبرا جاتی ہے ـ) .... یہ.... ! یہ کیا.... ؟ سارے چہرے پر زخموں کے نشان ـ کئی زخم... ....یہ شیر کی وجہ کر ہے ـ

جمال ـ ہاں ـ اس نے کاندھے بھی زخمی کر دیئے ہیں ـ

لیلٰی ـ (بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں) پہلے چلو میں ان زخموں کو دھو کر پٹی باندھ دوں پھر باتیں کریں گے ـ (جلدی سے کٹیا میں جاتی ہے ـ اور اندھیرے میں ٹٹول کر چراغ روشن کرتی ہے)

جمال ـ (باہر سے) اب تک تم نے چراغ نہیں جلایا ــــ ؟

لیلٰی ـ زندگی کا چراغ تو اب آیا ہے پھر پہلے سے اجالا کیسے کرتی ـ مجھے تو بہت ہی ڈر لگ رہا تھا ـ (وہ باہر پانی کا برتن اور دوسرے سامان کے ساتھ آتی ہے)

جمال ـ ڈر ــ ؟ کیسا ڈر ــ ؟ اوہ ! سمجھا اس شیر کا ــ

لیلٰی ـ (جمال کے چہرے کو پانی سے صاف کرتی ہے ـ پھر کاندھے کا زخم صاف کرتی ہے اور کچھ لگا کر پٹی باندھتی ہے) اب تم یہیں ٹھہرو میں تمہارے لئے کھانا لاتی ہوں ـ آج میں نے تمہارے لئے خاص پسند کی چیزیں بنائی ہیں ـ (وہ

دوبارہ اندر چلی جاتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد کھانا لئے آتی ہے)

جمال ۔ اگر میں لوٹ کر نہیں آتا تو ان چیزوں کو کیا کرتیں ۔ ؟

لیلیٰ ۔ (ہاتھ سے اس کا منہ بند کرتے ہوئے) ایسی بات نہ کہو۔ خدا کے لئے پھر ایسی بات مت کہنا ۔

جمال چٹائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے سامنے ہی لیلیٰ بیٹھ جاتی ہے ۔ اور برتن سے کھانے کی چیزیں نکال کر جمال کی طرف بڑھاتی ہے۔

جمال ۔ تم نے نہیں کھایا کیا ۔ ؟

لیلیٰ ۔ کھا لوں گی ۔

جمال ۔ کھا لوگی نہیں کھاؤ (زبردستی لقمہ اس کے منہ میں ڈالتا ہے)

لیلیٰ ۔ (ہنستی ہوئی) اب بتاؤ شام کو تم گئے تو کیا ہوا ۔ ؟

جمال ۔ ہاں ۔ تو میں اور دوسرے دو غلام تینوں مل کر وہاں گئے ۔ تم تو جانتی ہی ہو سرکاری حکم کے مطابق مجھے بھی وہاں جانا پڑا تھا۔

لیلےٰ ۔ ٹھیک تم نے کہا تھا کہ سلطانہ صاحبہ کچھ غلاموں کو شیر سے لڑانا چاہتی ہیں ۔

جمال ۔ میدان میں امراء بیٹھے تھے۔ تخت شاہی پر سلطانہ صاحبہ بیٹھی تھیں تب ہی کچھ نوکر اکھاڑے میں شیر کا ایک پنجرا لے آئے ۔ پنجرے کا دروازہ کھلا ۔ ایک غلام اندر دھکیل دیا گیا شیر نے ایک ہی جھپٹ میں اسے چیر ڈالا ۔

لیلےٰ ۔ (آنکھیں بند کر) اُف !

جمال ۔ سب ہی خوشیوں سے چیخ چلا رہے تھے پھر دوسرا غلام بھی اسی طرح دھکیل دیا گیا اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے کا ہوا تھا۔ آخیر میں ۔ میں بچ رہا تھا ۔ میں پنجرے کے اندر داخل ہوا۔ باہر سے تالیاں بجی جا رہی تھیں ۔ وہ سب سمجھ رہے تھے میں بھی اب کچھ ہی دیر میں شیر کا لقمہ بن جاؤں گا ۔

لیلےٰ ۔ بند کرو جمال ۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی ہے ۔

جمال ۔ عورت ہو نا ۔ اگر تم وہاں رہتیں تو نہ جانے کیا حال ہوتا ۔؟ مجھے دیکھتے ہی شیر جھپٹا ۔ اور میرے کاندھے پر ایک پنجہ مارا ۔ میں نے اس کا منہ ....

لیلےٰ ۔ (خوشی اور جوش میں) کیا ! کیا !!

جمال ۔ میں نے اس کا منہ مروڑ دیا ۔ اور اس کے پیٹ میں ایک زبردست گھونسہ جڑ دیا شیر کراہتا ہوا وہیں پر ڈھیر ہو گیا ۔

لیلےٰ ۔ (اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگتی ہیں) شاباش کیا اچھا کام کیا ۔

جمال پانی پیتا ہے ۔

لیلےٰ ۔ آگے کیا ہوا ۔ ؟

جمال ۔ سلطانہ صاحبہ نے مجھے اپنے پاس بلایا ۔ میری طرف غور سے دیکھا اور کہتی ہوئی "تم بہادر ہو" اپنے ہاتھوں کا ایک کنگن نکال کر مجھے انعام دیا ۔ (جیب سے سونے کا ایک کنگن نکالتا ہے)

لیلےٰ ۔ (خوشی سے) واہ ! کیسا آب دار ہے ۔

جمال ۔ (کنگن لیلےٰ کے ہاتھوں میں پہناتا ہے) کیوں اب تم کیسی لگتی ہو ۔ ؟

لیلےٰ ۔ بتاؤ تو بھلا ۔

جمال ۔ ٹھیک سلطانہ صاحبہ کی طرح ۔

لیلےٰ ۔ (اٹھ کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی ہے) میں سلطانہ صاحبہ لگتی ہوں نا ۔ ؟ اس لئے ان ہی کی طرح چلونگی ۔ (دور دور قدم رکھتی ہوئی چلتی ہے)

جمال ۔ (زور سے ہنستے ہوئے) اہو ۔ ہا ہا ۔ بہت اچھی لگ رہی ہو ۔ خدا کی قسم بہت ہی اچھی لگ رہی ہو ۔ میری سلطانہ صاحبہ ۔ (یکایک لیلےٰ کے آنچل سے بالا زمین پر گر جاتا ہے ۔ لیلےٰ ایکدم سے سرد پڑ جاتی ہے ۔ وہ جھک کر بالا اٹھا کر چھپا لینا چاہتی ہے لیکن جمال دیکھ لیتا ہے)

جمال ۔ یہ کیا ہے ۔ ؟

لیلےٰ ۔ وہی بالے ہیں ۔

جمال ۔ ہاں بھول گیا تھا ۔ اگر شیر کے منہ سے بچ کر نہیں آتا تو ان کا کیا کرتیں ۔ ؟

لیلےٰ ۔ تم نے شام کو کیا کہا تھا ۔ ؟

جمال ۔ اچھا تو تمہیں شام کی باتیں اب تک یاد ہیں ۔ کیا تم میری آخری خواہش پوری کرتیں ۔ ؟

لیلیٰ ۔ خواہش ہی کیا میں تمہارا حکم بجا لاتی ۔ چاہے اس کے لئے میری جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔

جمال ۔ ابھی سینیا جا کر پھر لوٹ آئیں گیا ۔ ؟

لیلیٰ ۔ ہرگز نہیں ملکہ میں نے بھی تمہیں اپنی آخری خواہش بتا دی تھی۔

جمال ۔ چاہے جو ہو اب اس کی ضرورت نہیں ۔ میں لوٹ آیا۔ (انگڑائی لیتا ہے) ۔

لیلیٰ ۔ شائد تمہیں نیند آرہی ہے ۔ ؟ چلو سو جاؤ ۔

دونوں کیٹا میں جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک سناٹا چھایا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد لیلیٰ کیٹا سے نکل آتی ہے اور چٹان پر بیٹھ کر بالا ہاتھ میں لئے گہری سوچ میں ڈوب جاتی ہے۔ اسی وقت ایک عورت سیاہ لبادہ اوڑھے اس کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے۔ آہٹ پاکر لیلیٰ مڑ کر دیکھتی ہے۔ اور عورت کو کھڑا پا کر خود بھی کھڑی ہو جاتی ہے۔)

لیلیٰ ۔ آپ کون ہیں ۔ ؟

عورت ۔ تمہارا ہی نام لیلیٰ ہے ۔ ؟

لیلیٰ ۔ جی ہاں ۔ آپ کی تعریف ۔ ؟

عورت ۔ میں ...... میں ...... میں ... سلطانہ نے بھیجا ہے۔

لیلیٰ ۔ سلطانہ صاحبہ نے ۔

عورت ۔ ہاں ۔

لیلیٰ ۔ (حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے) کس لئے ۔ ؟

عورت ۔ معلوم نہیں۔ لیکن کل انہوں نے تم دونوں کو محل میں بلایا ہے۔ یہ انگوٹھی (انگلی سے انگوٹھی اتار کر بڑھاتی ہے) اگر دربار میں کوئی روکے تو اسے دکھا دینا۔ (اتنا کہہ کر وہ پلٹ جاتی ہے اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ باتوں کی آواز سن کر جمال باہر نکل آتا ہے)

جمال ۔ کون تھا ۔ ؟

لیلیٰ ۔ ایک عورت ۔ (ساری باتیں بتاتی ہے)

دونوں کیٹا میں پھر چلے جاتے ہیں۔

دوسرا منظر ۔

سورج غروب ہو چکا ہے۔ شاہی محل کے ایک خاص کمرے میں فرش پر قالین بچھا ہے۔ دیواروں پر ہر طرف آئینے آویزاں ہیں۔ کھڑکیاں کھلی ہیں جس سے نیلا آکاش اور اکا دکا تارے نظر آتے ہیں۔ فیروزہ باندی چھتوں میں لٹکے فانوس روشن کرنے میں مشغول ہے۔ رضیہ سلطانہ ایک کونے میں جانماز پہ بیٹھی تلاوت میں مصروف ہے۔ جب وہ تلاوت کر لیتی ہے تو قرآن کو جزدان میں رکھتی ہے۔ اور ٹہلتی ہوئی کھڑکی کے پاس آجاتی ہے۔

رضیہ سلطانہ (دھیمے لہجے میں) فیروزہ ۔

فیروزہ ۔ (فانوس روشن کرتے ہوئے) حکم ملکہ عالیہ !

رضیہ ۔ جاسوس اور کیا کہہ رہے تھے ۔ ؟

فیروزہ ۔ یہی کہ توپ خانے میں، باغوں میں، راستے اور گلیوں میں ہر طرف اسی بات پہ سرگوشیاں ہو رہی ہیں ۔

رضیہ ۔ کیا تم بھی یقین کرتی ہو ۔ ؟

فیروزہ ۔ نہیں بیگم صاحبہ ۔

رضیہ ۔ (مسکرا کر) ایک اور حیرت کی بات بتاؤں۔ کل رات میں اس غلام کی کیٹا پر بھی گئی تھی ۔ یہ سب میں جان بوجھ کر کر رہی ہوں ۔

فیروزہ ۔ کل آپ نے اس غلام کو اپنا کنگن بھی دیا تھا۔

رضیہ ۔ ہاں اس نے شجاعت اور جوانمردی کے جوہر دکھائے تھے۔ وہ اس سے بھی اچھے انعام کا مستحق تھا۔

فیروزہ ۔ ملکہ عالیہ ۔ ؟

رضیہ ۔ کہو رک کیوں گئیں ۔

فیروزہ ۔ سنتی ہوں آپ کا انعام دینا امرا کو پسند نہیں آیا۔ ایک غلام کو سلطانہ صاحبہ کا اپنے ہاتھ کا کنگن دینا اور پھر.........

رضیہ ۔ اور کیا ۔ ؟ بولو ۔ ؟

فیروزہ (سہم کر) معاف کیجئے ملکہ عالیہ۔

رضیہ ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

فیروزہ (جھجکتے ہوئے) اور اس غلام کی طرف مسکرا کر دیکھنا۔ دیکھ کر

یہ کہنا تم بہادر ہو لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کر دیا ہے ۔

رضیہ ۔ (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) شک ___ ؟ کیسا شک ۔ ؟

فیروزہ ۔ (کانپنے لگتی ہے) معاف کیجیے بیگم صاحبہ ۔

رضیہ ۔ میں سمجھ گئی ۔ اس شک کے پیچھے کون کام کر رہا ہے ۔ میرا بھائی اور التونیا شاہی تخت پانے کی لالچ میں ایک گہری سازش کر رہے ہیں ۔ رعایا کو بھڑکانے میں ان کا ہی ہاتھ ہے ۔ (کچھ دیر کھڑی سوچتی ہے) ٹھیک ہے انہیں شک کرنے دو ۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ بہرام اور التونیا اپنا مطلب نکالنے کے لئے کہاں تک گر سکتے ہیں ۔

فیروزہ ۔ سلطانہ صاحبہ ۔

رضیہ ۔ میں سلطانہ ضرور ہوں مگر کچھ اور بھی ۔ معلوم نہیں یہ بات رعایا کیوں بھول جاتی ہے ۔

(وہ آکر مسند پر بیٹھ جاتی ہے) سیڑھیوں پر کچھ آہٹ ہوتی ہے) شاید کوئی آ رہا ہے ۔

فیروزہ ۔ جی ہاں جہاں پناہ ___

رضیہ ۔ شاید وہ لوگ آ گئے ___ ؟

فیروزہ ۔ کون ___ ؟

رضیہ ۔ جمال الدین یعقوب اور اس کی بیوی ۔

فیروزہ ۔ (حیرت سے) جمال الدین ۔

رضیہ ۔ ہاں وہی غلام ۔

فیروزہ ۔ ملکہ عالیہ ۔

رضیہ ۔ (جیسے کسی گہری سوچ سے چونکی ہو آپ ہی آپ بڑبڑاتی ہے) ہاں یہ ٹھیک رہے گا ۔ مجھے سہارے کی ضرورت ہے ۔ مجھے جانباز بہادروں کی ضرورت ہے ۔ آج سب ہی میرے دشمن نظر آتے ہیں مگر میں بھی دیکھوں گی (پھر وہ فیروزہ سے مخاطب ہوتی ہے) جاؤ پہلے تم لیلے کو بلا کر لاؤ ۔ جمال سے کہنا وہ کچھ دیر انتظار کرے ۔

فیروزہ ۔ (سر جھکا کر عاجزی کے ساتھ) ملکہ عالیہ ___ (اور چلی جاتی ہے ۔)

رضیہ سلطانہ مسند پر اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے ۔ تھوڑی دیر بعد فیروزہ لیلے کو لے کر آتی ہے ۔

رضیہ ۔ لیلے ۔

لیلے ۔ (گھٹنے ٹیک کر) سلطانہ صاحبہ !

رضیہ ۔ اس قالین پر بیٹھ جاؤ ۔

لیلے ۔ ملکہ عالیہ ۔ (قالین پر بیٹھ جاتی ہے)

رضیہ ۔ تم کس ملک سے آئی ہو ___ ؟

لیلے ۔ ابی سینیا سے ملکہ صاحبہ ۔

رضیہ ۔ کیا جمال الدین یعقوب کو تم وہیں سے جانتی ہو ۔ ؟

لیلے ۔ نہیں ___ ہم دو جگہوں کے رہنے والے ہیں ۔ ہم اس غلام بنا کر لائے گئے تھے ۔ وہ اصطبل میں اور میں دوسری کام کرتی تھی ۔ جمنا کے کنارے ایک دن ہماری ملاقات ہوئی تھی

رضیہ ۔ اپنے وطن کی یاد تو آتی ہوگی ___ ؟

لیلے ۔ بہت آتی ہے ملکہ صاحبہ ۔ جب ہم اور جمال چاندنی رات میں چٹان پر بیٹھتے ہیں تو سامنے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے وہ پہاڑ ابی سینیا کی یاد تازہ کرتا ہے ۔ اپنے وطن کا نام کر جمال کی آنکھیں بھر آتی ہیں ۔ کہتا ہے کہ اگر حاکم راضی ہوں تو دونوں چل کر وہیں رہیں ۔

رضیہ ۔ فیروزہ ___

فیروزہ ۔ جی ملکہ عالیہ ۔

رضیہ ۔ ہاتھی دانت کا وہ صندوقچہ ادھر لانا ۔

فیروزہ ۔ ملکہ عالیہ ۔ (جاتی ہے)

(رضیہ خاموش رہتی ہے ۔ فیروزہ صندوقچہ لا کر رضیہ کی طرف بڑھاتی ہے ۔)

رضیہ ۔ (صندوقچہ کھول کر) دیکھو اس میں کیا ہے ___ ؟

لیلے ۔ موتیوں کا ہار ۔

رضیہ ۔ اور ___ ؟

لیلے ۔ جواہرات ۔ اشرفیاں ۔

رضیہ ۔ (صندوقچہ بند کرتی ہے) اس بکس کو تم لے لو ۔

لیلےٰ ۔ (حیرت اور گھبراہٹ سے) میں !

رضیہ ۔ ہاں تم ۔

لیلےٰ ۔ مگر کیوں ملکہ صاحبہ ؟

رضیہ ۔ اس کو لے کر اپنے وطن چلی جاؤ اور چین سے رہو ۔

لیلےٰ ۔ (خوشی کے ساتھ صندوقچہ لے کر) آپ بڑی مہربان ہیں بیگم صاحبہ ۔

رضیہ ۔ تم وطن کب جاؤ گی ۔ ؟

لیلےٰ ۔ آج ہی رات کو حضور ۔ اس بات کو سن کر جمال کس قدر خوش ہوگا ۔

رضیہ ۔ (اٹھ کر تھوڑی دیر ٹہلتی ہے) سفر تو تمہیں اکیلے ہی کرنا ہوگا ۔

لیلےٰ ۔ (گھبرا کر) اور جمال ۔ ؟

رضیہ ۔ اس کے بارے میں ابھی مت سوچو ۔

لیلےٰ ۔ (پھٹی پھٹی نظروں سے رضیہ کو دیکھتی ہے پھر رک رک کر) نہیں ملکہ صاحبہ (صندوقچہ رضیہ کے قدموں پر رکھ کر) میں ابی سینیا نہیں جاؤں گی ۔

رضیہ ۔ (تحکمانہ لہجے میں) لیلےٰ ۔

لیلےٰ ۔ ملکہ عالیہ ۔

رضیہ ۔ تم وطن جاؤ یا نہ جاؤ لیکن جمال کے ساتھ نہیں رہ سکتیں ۔

لیلےٰ ۔ کیوں ۔ ؟ بغیر کسی خطا کے قید خانے میں رکھیں گی ۔ ؟

رضیہ ۔ (مسکراتی ہے) نہیں ۔ قید خانے میں نہیں بلکہ وہ محل میں رہے گا ۔ مجھے اس کی ضرورت ہے ۔

لیلےٰ ۔ (کچھ مطمئن سی نظر آتی ہے) اس کو قید خانے میں رکھیں گی ۔؟ اسے شیر کے منہ میں نہیں دیں گی ۔ ؟

رضیہ ۔ (ہنس کر) ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن تم مجھے غلط مت سمجھنا
رضیہ ۔ مجھے جمال کی بہت ضرورت ہے ۔ آج میں بہت کمزور ہو گئی ہوں ۔ مجھے جمال جیسا بہادر چاہیئے ۔ میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں مجھے کرنے دو ۔ مجھے دیکھنا ہے اور کیا کیا گل کھلتا ہے تم مجھے غلط مت سمجھنا

لیلےٰ ۔ جمال الدین تمہاری امانت ہے اسے میں لوٹا دوں گی ۔ ضرور لوٹا دوں گی ۔

لیلےٰ ۔ (مایوس کن لہجے میں) جیسا حکم ملکہ عالیہ ۔

رضیہ ۔ یہ صندوقچہ تم لیتی جاؤ ۔

لیلےٰ ۔ میں تو اپنا سارا خزانہ چھوڑے جا رہی ہوں پھر اسے لے کر کیا کروں گی ۔ ؟ الوداع ملکہ عالیہ ۔ الوداع ۔ (جھک کر سلام کرتی ہے اور آہستہ آہستہ چل کر دوسری طرف چلی جاتی ہے)

رضیہ ۔ میں کیسی خود غرض ہوں فیروزہ (مسند پر بیٹھ جاتی ہے) مگر اس میں خود غرضی کیسی ۔ ؟
میں تو لوگوں کو یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ جو وہ سب سوچ رہے ہیں غلط ہے ۔ بالکل بے بنیاد ۔ فیروزہ جمال کو بلا لاؤ ۔

فیروزہ ۔ جیسا حکم ملکہ عالیہ (جاتی ہے)

تیسرا منظر

شاہی محل کا ایک کمرہ ۔ شام کی اداسی کمرے میں پھیلی ہوئی ہے ۔ اسی کمرے میں جمال کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے ۔ دروازہ کھلتا ہے ۔ رضیہ سلطانہ داخل ہوتی ہے ۔ جمال اسے دیکھ کر ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے ۔

رضیہ ۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے تم یہاں آئے ہو کافی فکرمند رہتے ہو ۔ ؟

جمال ۔ نہیں سلطانہ صاحبہ ۔

رضیہ ۔ میں نے تمہیں جس غرض سے یہاں رکھا ہے وہ تم کو معلوم نہیں شاید ۔ ؟

جمال ۔ نہیں ۔

رضیہ ۔ میں جانبازوں اور سرفروشوں کی قدر کرتی ہوں ۔ آج التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کو ہر چہار طرف سے خطرے نے گھیرا ہے کیا تم میرے کچھ کام آ سکتے ہو ۔ ؟

جمال ۔ آپ حکم دیں غلام اپنی جان تک دے سکتا ہے ۔

رضیہ ۔ تم بار بار اپنے کو غلام کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہو ۔ میں تمہیں .... میں تمہیں ....

جمال ۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں سلطانہ صاحبہ ۔

رضیہ ۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں ۔ تم غلام تھے مگر اب میں تمہیں دوسرا عہدہ

دینے والی ہوں۔ وہ عہدہ .... (اسی درمیان فیروزہ ہانپتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ اور رضیہ کے سامنے جھک جاتی ہے)۔

رضیہ۔ (کچھ خفگی سے) یہی تمہارے آنے کا موقع تھا فیروزہ ؟

فیروزہ۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) وہ .... وہ بہت بری.....

رضیہ۔ کیا وہ۔ وہ کر رہی ہو ۔ ؟

فیروزہ۔ جاسوس نے بہت بری خبر لائی ہے سرہند کے گورنر التونیا نے بغاوت کر دی۔ اور وہ بھاری فوج کے ساتھ اس طرف کوچ کر گیا ہے آپ کے بھائی بہرام بھی ان سے مل گئے ہیں۔

رضیہ۔ (بے چین ہو کر ٹہلنے لگتی ہے) اوہ ! تو آخر یہی ہوا — ٹھیک ہے۔ جمال تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ دشمنوں نے سر اٹھایا ہے مجھے تمہاری بہادری پر فخر ہے۔

جمال۔ آپ حکم دیں غلام اکیلا ہی ان کے لئے کافی ہے۔

رضیہ۔ نہیں ۔ ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ فیروزہ تم فوراً افسروں کو میرے پاس حاضر کرو۔ ہم آج ہی ان کے مقابلے کے لئے جائیں گے۔

(فیروزہ جاتی ہے)

چوتھا منظر

قید خانہ کا ایک کمرہ۔ کمرہ کے اوپر ایک کھڑکی ہے۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔ ہوائیں تیز چل رہی ہیں۔ کبھی کبھی بارش کی بوچھار کمرے میں بھی آجاتی ہے۔ ایک کونے میں چھوٹا سا دیا آندھی کی زد سے بچنے کی کوشش میں کانپ رہا ہے۔ مدھم روشنی کبھی تیز کبھی ہلکی ہو جاتی ہے۔ سامنے رضیہ سلطانہ کھڑی نظر آتی ہے۔ اس کے بال بکھر کر شانوں پر لہرا گئے ہیں۔ آنکھیں ویران، چہرے پر سوچ کی لکیر۔ دروازہ کھلتا ہے۔ ایک عورت لبادے میں لپٹی اندر آتی ہے۔ روشنی جب اس پر پڑتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لیلےٰ ہے۔

لیلےٰ۔ (گھٹنے کے بل جھک کر) جہاں پناہ !

رضیہ۔ (چونک کر) کون ہے ؟ اس طوفانی رات میں کون اس بدنصیب قیدی کو پکارنے آیا ہے ؟

لیلےٰ۔ بیگم صاحبہ !

رضیہ۔ (ہنس کر) جہاں پناہ ! بیگم صاحبہ — مجھے کس سے ملا

لیلےٰ۔ میں ہوں بیگم صاحبہ۔ میں ....

رضیہ۔ آج میں اکیلی ہوں۔ نہ کوئی میرا اپنا ہے۔ نہ کوئی ہمدرد سر چھپانے کو بھی جگہ نہیں ایسی حالت میں کون میرا مذاق اڑانے کو آیا ہے۔

لیلےٰ۔ مذاق نہیں بیگم صاحبہ۔ آپ میرے لئے آج بھی وہی رضیہ سلطانہ ہیں۔

رضیہ۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ ؟

لیلےٰ۔ کیوں ملکہ عالیہ ۔ ؟

رضیہ۔ اس موقع پر جبکہ میرے سائے سے بھی لوگ دور بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں تم اپنی جان خطرے میں ڈال کر میرے پاس آئی ہو۔ میرا بن کر اس پیار سے پکارنے والا آج بھی کوئی ہے ۔ ؟

لیلےٰ۔ ملکہ عالیہ۔ ملکہ عالیہ ۔ !! (آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر زمین پر گر جاتے ہیں۔)

رضیہ۔ ارے تم رو رہی ہو۔ میری حالت پر تمہیں ہنسی نہیں آئی ۔ آ تم کون ہو ۔ ؟

لیلےٰ۔ مجھے نہیں پہچانا بیگم صاحبہ !

رضیہ۔ رضیہ آج کسی کو نہیں پہچانتی اور نہ ہی رضیہ کو کوئی آج پہچانتا ہے۔ آج تو رضیہ خود اپنے آپ کو پہچاننے سے ڈرتی ہے۔

لیلےٰ۔ میں ہوں لیلےٰ جہاں پناہ۔

رضیہ۔ (چونک کر) لیلےٰ ۔ ؟

لیلےٰ۔ جی ہاں۔

رضیہ۔ یعنی جمال کی بیوی۔

لیلےٰ۔ ہاں۔

رضیہ۔ کیا تمہیں جان کا خوف نہیں۔ اوہ۔ سمجھی۔ تم شاید اپنی امانت لینے آئی ہو۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری امانت سنبھال کر رکھوں گی مگر بدنصیبی کے سیاہ بادل جمال پر بھی چھا گئے۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگا؟ میں تمہیں کیا منہ دکھاؤں۔ چلی جاؤ لیلےٰ۔ خدا کے لئے مجھ منحوس کے پاس سے چلی جاؤ۔

لیلے ۔ (روتی ہوئی) خدا کے واسطے ایسی باتیں مت کیجئے سلطانہ صاحبہ ! میں نے اپنی خوشی سے جمال کو آپ کے حوالے کیا تھا ۔

رضیہ۔ سچ ۔

لیلے ۔ سچ ۔ آپ جہاں پناہ سلطانہ ہیں اور میں ایک ادنیٰ کنیز ۔

رضیہ۔ مگر تم نے ایسا کیوں کیا ۔ ؟

لیلے ۔ اس وقت تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی جان خطرے میں ہے ۔ آپ کی جان ہماری جان سے زیادہ قیمتی ہے ۔ اس لئے بعد میں مجھے خوشی ہوئی کہ اب آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔

رضیہ۔ تم نے جو عظیم قربانی دی ہے اس کو میں کبھی نہیں بھول سکتی ہرگز نہیں بھول سکتی ۔ مگر تم یہاں تک کیسے آئیں ۔ ؟

لیلے ۔ التونیا نے مجھ سے گذارش کی ہے کہ میں آپ سے .... (اس بیچ اس کے ہاتھوں سے بالا گر جاتا ہے) ۔

رضیہ۔ یہ کیا ہے ۔ ؟ (جھک کر اٹھاتی ہے) اوہ ! اسے میں نے کہیں پہلے بھی دیکھا تھا ۔ ؟ کہاں دیکھا تھا یاد نہیں آتا ۔ ؟

لیلے ۔ یہ جمال کے کان کے بالے ہیں ۔ اس کی ماں نے دو برس تکلیف اٹھا کر بالے بنوائے تھے ۔ جس وقت جمال شیر سے لڑنے جا رہا تھا اس وقت اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں مر جاؤں تو تم ابی سینیا جا کر یہ بالے میری ماں کو دے دینا ۔ اسی لئے سلطانہ صاحبہ ۔ !

رضیہ۔ کیا تم ابی سینیا جاؤگی ؟

لیلے ۔ جی ہاں سلطانہ صاحبہ !

رضیہ۔ اس طوفانی رات میں ۔

لیلے ۔ جی ہاں سلطانہ صاحبہ !

رضیہ۔ میں ایک بات کہوں مانو گی ؟

لیلے ۔ حکم دیجئے سلطانہ صاحبہ ۔

رضیہ۔ یہ بالے تم اس کی ماں تک لے جانا چاہتی ہو نا ۔ ؟ تم مجھے دے دو ۔ سمجھنا تم نے اس کی ماں کو دے دیا ۔

لیلے ۔ (حیران ہو کر) سلطانہ صاحبہ ! آپ سچ مچ عظیم ہیں ۔ کاش لوگ آپ کو سمجھ سکتے (روتی ہے) ۔

اسی وقت التونیا جو باہر کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا کمرے میں داخل ہوتا ہے ۔ اور جھک کر رضیہ کو سلام کرتا ہے)

رضیہ۔ کون ؟

التونیا ۔ میں آپ کا خادم ۔ مجھے معاف کرنا سلطانہ صاحبہ ! میں نے آپ کو غلط سمجھا ۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ آپ صرف سلطانہ ہی نہیں اپنی رعایا کی ماں بھی ہیں ۔

رضیہ کی آنکھوں میں اُداسی اور بھی گہری ہو جاتی ہے ۔
پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے ۔

یوگ راج

بدبو

روہیش کی شادی کو دو ڈھائی سال سے اوپر کا عرصہ گذر چکا تھا لیکن وہ اسے ابھی تک کل کی بات ہی سمجھتا تھا۔ کہاں تو صبح کا گھر سے نکلا ہوا رات کے دس گیارہ بجے سے پہلے گھر نہیں آتا تھا اور کہاں اب دفتر سے سیدھا گھر کو بھاگتا۔ لنچ کے بعد سے پانچ بجنے کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ یہی چاہتا کہ جب وہ گھر پہنچے تو وہاں سوائے اس کی بیوی کے اور کوئی نہ ہو۔ اگر وہ اس کے پاس نہ بیٹھی رہے تو کم از کم اس کی نظروں کے سامنے ہی گھومتی رہے۔ اس لئے اگر کوئی کام اسے کرنا ہوتا تو وہ رسوئی میں ہی ایک طرف کرسی اور میز لگا کر بیٹھ جاتا۔ کام بھی ہوتا رہے اور جب جی چاہے بیوی کو بھی گردن اٹھا کر دیکھ لے۔ شادی سے پہلے اس کی کہانیاں خشک فلسفے اور سخت زندگی کی گرد سے اٹی رہتی تھیں۔ اب ہر کہانی ایک خوبصورت رومانی ناول بن گئی تھی۔ اس کی تحریر میں کالی داس کے سے سنگھ روت اور رتو سنگھار کی سی رومانیت اور رنگینی آ گئی تھی۔ روہیش ان کہانیوں میں اپنی بیوی کے ساتھ دنیا کے ہر خوبصورت شہر میں ہنی مون منانے گیا تھا۔ اس نے کشمیر کی ڈل جھیل میں شکارے میں بیٹھے بیٹھے اس کی زندگی میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا تھا۔ اب شاید اس کی زندگی میں اس بیوی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

لیکن یہ کمبخت بھنگن کبھی کبھی اس کی برف کی مانند شفاف اور خوب صورت تیز رفتار بھاگتی زندگی کو ایسے ہی روک لیتی تھی۔ اس کے دماغ کے پرسکون سمندر میں ایک ہلچل سی مچا دیتی۔ وہ اپنے تصور کی خوبصورت وادیوں میں اپنی بیوی کے ساتھ سیر کو نکلتا تو یہ کم بخت پرانے پیوند لگے ملبوس ہاتھ میں میلا کچیلا کنستر لئے کہاں سے آ نکلتی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ بھنگنیں کم بخت اتنی خوبصورت کیوں ہوتی ہیں۔ ان کے حسن میں اتنا نمک کہاں سے آ جاتا ہے۔ ان کے جسم کا ایک ایک انگ تکلف کے لئے کیوں اکساتا ہے۔ وہ جب کبھی سب کی نظریں بچا کر اس بھنگن کو دیکھتا تو اس کے سارے جسم میں خواہ مخواہ ایک سنسنی سی دوڑ جاتی تھی۔ شرافت کے کثیف اندھیرے میں وہی ایک شیطانی خواہش بار بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گستاخی کی جرأت کے لئے اکساتی۔ روہیش کو اس کا جسم ایک بہت بڑی دیوار کی مانند لگتا جس پہ ایک ہی چیز کی فروخت کے لئے مختلف مگر جاذب نظر اور پر اثر الفاظ میں کئی اشتہار چسپاں ہوں۔ اس کی بڑی بڑی شوخ آنکھیں۔ سانولا رنگ۔ بھرا بھرا گول چہرہ۔ ہنستے مسکرانے والے باریک ہونٹ اور ان ہونٹوں میں سے جھانکتے ہوئے سفید موتیوں کی مانند چمکدار دانت۔ روہیش کے سینے میں اچھلتی کودتی ندی کی مانند بے بس شیطانی خواہش کی طرح اس کے سینے کا ابھار۔ کالی کالی گوشت سے بھرپور تنی ہوئی پنڈلیاں۔ آخر وہ کہاں کہاں دیکھے۔ روہیش لاکھ سوچتا کہ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ گھر میں بیوی تھی جو اسے بے حد شریف سمجھتی تھی۔ اور وہ اراد تاً شریف رہنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن یہ نگاہ کم بخت تو بس کچھ نہ پوچھئے۔ بھنگن کے چہرے پہ پڑتے ہی یوں پھسل جاتی تھی جیسے ہموار ڈھلوان سے کوئی چیز لڑھکا دی جائے یہی حال ہوتا تھا جب نیچے سے اوپر دیکھتا تھا تو۔

روہیش سوچتا کہ یہ بھنگن کے چہرے پہ یہ سدا بہار ہنسی بھی اس کے جسم کے باقی اجزا میں سے ایک ہے۔ یا وہ روہیش کے سینے میں مچلتی خواہش کو اچھی طرح بھانپ گئی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ مسکراہٹ اسے اس قدر گھبرا دیتی کہ اسے یہ خیال ہوتا کہ اس کی پیشانی تر ہو جاتی۔ دماغ میں کچھ اس طرح اتھل پتھل سی مچ جاتی کہ وہ مجبوراً وقت سے بہت پہلے دفتر کو بھاگ کھڑا ہوتا۔ اور بس کی قطار میں کھڑے کھڑے دھیان آتا کہ لنچ کا پاس تو وہ گھر ہی بھول آیا ہے۔ اس ڈر سے

واپس گھر نہیں جاتا تاکہ کہیں اس کا یہ شک یقین میں نہ بدل جائے۔
ی حالت میں جبکہ کم بخت بھی بالوجی آپ کی یاد بہت کمزور ہے......
وجی ...... اور رومیش یہ سوچ کر اور بھی پریشان ہو جاتا
اگر اس کی بیوی کو پتہ چل گیا تو ؟ بلبیری اس کے سینے میں چھپی
شیطانی خواہش کو بھانپ سکتی ہے تو بیوی کو بھی تو شک ہو سکتا ہے۔
ر واقعی یہ شک ہو گیا تو اس کے شریف پتی کا جو حال ہو گا اسے سوچ
ر رومیش لرز اٹھتا۔

بلبیری کافی عرصہ سے ان کے گھر کی صفائی کا کام کر رہی تھی۔ اس
ماں اور چھوٹی بہن کو اس گھر میں کام کرنے کی بالکل اجازت نہیں تھی
یونکہ وہ صفائی کو پوری صفائی سے اور ٹھیک طرح سے نہیں کرتیں لیکن
بیری تو کٹکا لگاتے ہوئے فرش پہ اس طرح بچھ بچھ جاتی تھی مانو کپڑا
گھسا گھسا کر فرش کی نئی تہہ نکال دے گی۔ ایسا لگتا تھا کہ بلبیری اس کپڑے
سے نہیں بلکہ اپنے جسم سے اس فرش کو صاف کر رہی ہے۔ یہ فرش بھی کمبخت
بھی تو بہت ہی گندا ہو جاتا تھا۔ لیکن بلبیری بھی فرش کی گندگی کو اس کپڑے
ب جذب کئے بغیر چین نہ لیتی تھی۔ وہ پوری جان مار کے کام کرتی تھی اسی
لئے رومیش کی بیوی اس کو دو روپے زیادہ دینا منظور رکھتے لیکن کام
بلبیری ہی کرے گی۔

بلبیری کی ہر ادا ہر حرکت اور ہر بات اکسانے والی ہوتی جس سے
رومیش کو بڑی پریشانی ہوتی تھی کیونکہ اس کے کم زور سینے سے شیطانی خواہش
کی لہریں اس دیوانگی سے ٹکرانے لگتی تھیں کہ اسے ایسا لگتا کہ اس کا سینہ
پھٹ جائے گا۔ اور اس کی شرافت .... اس کی شرافت گندگی کی
طرح زندگی کے فرش پہ بکھر جائے گی۔ اس فرش کو تو بلبیری صاف
کر لیتی ہے لیکن اس کی زندگی کا فرش اگر ایک بار گندا ہو گیا تو اسے کوئی
صاف نہ کر سکے گا۔ رومیش کو اپنی شرافت بڑی عزیز تھی وہ شریف رہنا
چاہتا تھا جب وہ اپنی شرافت کو ہاتھ سے جاتے دیکھتا تو چڑ چڑا ہو جاتا
تھا۔ خواہ مخواہ بیوی سے لڑنے لگتا۔ اگر روٹی گرم ہے تو کیوں گرم ہے۔
اس کا منہ جل رہا ہے۔ اگر سبزی میں نمک ہے تو اتنا کیوں ہے۔ نہ چاہتے
ہوئے جب اس کی نظر بلبیری کے چہرے پہ پڑتی ہے تو بلبیری کے
ہونٹوں پہ وہی فخریہ ہنسی رومیش کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ مانو کہہ رہی ہو۔

"بالوجی ڈرتے کیوں ہو۔ میں اتنی گندی تو نہیں۔ میرا رنگ کالا ضرور
ہے لیکن روح نہیں۔ میرا جسم کالا نہیں ہے میری جوانی کالی نہیں ہے
اور پھر یہ رنگ بڑا پکا ہے۔ اس کو آپ لاکھ دھوئیے اترتا نہیں۔ یہ
رنگ آپ کو نہیں لگ سکتا۔ ڈریئے نہیں۔"

بلبیری کی شادی ہو چکی تھی لیکن گونا ابھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے
اپنے خاوند کو اچھی طرح سے دیکھا بھی نہیں۔ وہ اپنے خاوند کے متعلق اس سے
زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح سے لوگوں کے گھروں کی
صفائی کرتا ہے۔ اور ٹوٹی پھوٹی ہندی میں گندے گندے خط لکھتا ہے۔
جن کا بلبیری کبھی جواب نہیں دیتی۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی جواب ہوتا
ہی نہیں تھا۔ اگر لکھنا پڑھنا جانتی تو جواب بھی سوچ لیتی۔

رومیش تو چھٹی کے دن کافی دیر سے اٹھتا ہی تھا لیکن اس کی
بیوی بھی چھٹی کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی تھی۔ اکثر جب بلبیری صفائی کرتے
کرتے ان کے کمرے تک آتی تو اس کی بیوی نیند سے جدوجہد کرتی ہوئی
دروازہ کھولتی۔ رومیش کو اٹھاتی۔ "بلبیری صفائی کرنے بھی آگئی۔"
جب رومیش آنکھ کھولتا تو بلبیری جھاڑو دیتی ہوئی اثبات
میں اسی شوخ مسکراہٹ کا مظاہرہ کرتی اس کی یہ مسکراہٹ کتنی
معنی خیز ہوا کرتی تھی۔ کیا وہ یہ سب کچھ سمجھتی ہے۔ کیسے ؟ اسے کیا پتہ
کہ شادی کس لئے ہوتی ہے۔ کیوں ہوتی ہے۔ وہ تو ابھی اپنے خاوند کے
پاس رہی ہی نہیں۔ اس کی ابھی اصل شادی کہاں ہوئی ہے۔ چاہے
گرمی کا موسم ہو چاہے سردی کا وہ کمرے میں ہی سوتے تھے۔ بلبیری اس
کی بیوی کو کئی بار کہہ چکی تھی کہ کیا آپ کو گرمی نہیں لگتی۔

رومیش کی بیوی میں ایک بہت بڑا عیب تھا۔ وہ یہ کہ وہ ہر سال
کے آخر میں گھر کو بھاگ جاتی تھی۔ ویسے یہی کہتی رہتی تھی کہ میں آپ کے
بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ خطوں میں بھی یہی لکھے گئے کہ راتوں کو نیند
نہیں آتی۔ راتیں جاگتے جاگتے کٹ جاتی ہیں۔ سونا چاہتی ہوں تاکہ تم
کو سپنوں میں ڈھونڈوں لیکن نیند نہیں آتی۔ اور کبھی تین چار مہینے سے
پہلے واپس نہیں آتی۔ جب وہ چلی جاتی تھی تو رومیش گھر میں بہت کم رہتا تھا
صرف سونے کے لئے ہی گھر آتا تھا۔ یا چھٹی کے دن دیر تک سوتا رہتا تھا۔
اور پھر تیار ہو کر باہر نکل جاتا۔ ایک جب اس کی بیوی اپنے میکے گئی تو بلبیری

کو اچھی طرح سمجھا گئی کہ صفائی روزانہ دونوں وقت ہونی چاہیئے۔ اور روشن کو تاکید کر گئی کہ وقت پہ گھر آجایا کرو۔ اس طرح گھر گندا رہتا ہے۔ روشن ویسے تو دونوں وقت باقاعدگی سے گھر میں حاضر ہوتا تھا لیکن بس بلبیری کے کام ختم ہونے کا انتظار کرتا اور پھر بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ بلبیری جب کام کرتی رہتی تو روشن باہر برآمدے میں ہی بیٹھا رہتا کیونکہ کبھی کبھی تو بس یہ کم بخت آنکھوں آنکھوں سے زبردستی اپنی طرف کھینچنے لگتی تھی۔ اس شریف آدمی کے حواس باختہ ہو جاتے تھے۔

اور پھر...... ......

ایک دن صبح سے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور بارش ہو رہی تھی۔ روشن نہا دھو کے دفتر جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ بارش کو دیکھ کر تو اس نے اندازہ لگا لیا کہ بلبیری آج نہیں آئے گی۔ لیکن پھر سوچنے لگا اگر آ ہی گئی تو بے چاری کو اس بارش میں پھر بھیگتے بھیگتے واپس جانا پڑے گا۔ اور انتظار کرتا رہا۔ گھڑی نے دس بجا دیئے لیکن بارش کے رکنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اب اسے بلبیری کا انتظار نہیں تھا۔ بلکہ بارش کے تھمنے کا انتظار تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ بارش میں شرابور بلبیری سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ سفید کپڑے کالے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے جسم کی ایک ایک چیز بھیگے کپڑوں سے باہر جھانک رہی تھی۔ کم بخت بلبیری کو آج کیا ہو گیا ہے۔ یہ ایسے میں کیوں آ گئی۔ کپڑے جیسے پہنے ہی نہ ہوں۔ کس بری طرح سے کانپ رہی تھی۔ اور پانی کے قطرے کیسے گر رہے تھے مانو کوئی بھیگی ساڑھی نچوڑی جا رہی ہو۔ روشن کو نہ جانے ایک دم کیا ہو گیا تھا۔ اسے بلبیری سے تپش سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے شعلے کی لپیٹ اس کی جانب بھڑک رہی ہوں۔ یہ بھیگا شعلہ۔ پانی میں شرابور شعلہ روشن کو سوکھے گھاس کی مانند جلا کر راکھ کر گیا۔ بلبیری تھا روشن کو دیکھتی ہوئی معذرت طلب نگاہوں سے مسکراتی ہوئی اندر کام کرنے چلی گئی۔ روشن بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیا اور بولا "کام پھر کر لینا۔ پہلے تم اپنے لئے چائے بنا کر پی لو۔"

"نہیں بابو جی۔"

"نہیں کیا دیکھو تو کس طرح کانپ رہی ہو۔ سردی لگ جائے گی۔"

"لیکن بابو جی۔"

"گیس پہ پانی رکھ دو۔ جلدی ہو جائے گا۔"

بلبیری شاید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مسکراتی ہوئی گیس کی طرف چل دی۔ پانی سٹو پر رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کے لئے بھی بنا دوں بابو جی؟"

"میں ......؟"

"آج مجھے گندگی تھوڑی سی لگی ہو گی۔ آج تو میں جی بھر کے نہا رہی ہوں۔"

روشن کوئی جواب دیئے بغیر اپنے کمرے میں جا کر کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ آج جیسے صفحے کا ہر لفظ بلبیری تھا۔ بلبیری کی مسکراہٹ۔ بلبیری کا بھیگا بھیگا جسم۔ روشن کی رگ رگ میں ایک لاوا سا کھولنے لگا۔ جسم چنگاریاں سی بھڑکنے لگیں۔ اس لئے پنکھا فل پہ چلا دیا۔ لیکن گرمی اب بھی ویسی ہی تھی۔ یہ روشن کو کیا ہو گیا تھا۔ باہر تو موسلادھار بارش ہو رہی ہے اور اسے گرمی لگ رہی تھی۔ کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

بلبیری جب چائے کا پیالہ لے کر آئی تو اتنی زور سے پنکھا چلتے دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔

"ارے بابو جی یہ پنکھا کیوں چلا دیا؟"

"گرمی لگ رہی ہے بلبیری۔"

"گرمی؟" بلبیری حیران سی رہ گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں گرمی کیسے لگ سکتی ہے۔ وہ تو ابھی تک سردی سے کانپ رہی تھی۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ روشن نے بلبیری سے کہا۔

"بلبیری یہ پیالہ یہاں رکھ دو اور اپنی چائے بھی یہاں لے آ"

وہ اپنا پیالہ لینے چلی گئی۔ روشن نے چائے کا ایک گھونٹ پیا "کم بخت چائے کتنی اچھی بناتی ہے۔"

بلبیری آکر روشن کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی اور چائے پیتے بولی۔

"بابو جی آپ بیوی جی کو بلا لو"

روشن نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"اس بارش میں کوئی اپنی بیوی سے دور تھوڑے ہی رہتا ہے"

روشن بلبیری کا جواب سن کر کچھ حیران سا ہو گیا۔ بلبیری کو آ

ہو گیا ہے۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔

"بابو جی آج میرے میراروکی چٹھی آئی ہے۔ میری آپا نے پڑھ کر
[illegible]نی تو اس میں یہی لکھا تھا۔"

روملیش نے پوچھا۔ "کیا لکھا تھا ؟"

"یہی کہ تم چلی آؤ۔ بارش میں کوئی اپنی جورو سے الگ نہیں رہ سکتا
[illegible]ں بابو جی یہ ٹھیک ہے"

بلبیری نے یہ سب کچھ ایسے کہہ دیا جیسے اس میں کوئی خاص بات نہ ہو
[illegible]ن روملیش تو جیسے ابھی جل کر راکھ ہو جائے گا۔ اس نے اپنا آپ بچانے کے
[illegible] سہارا ڈھونڈا۔

"ہاں۔ لیکن تم چل کر صفائی کر دو۔ جاؤ"

"لیکن بابو جی اس بارش میں صفائی کیا کروں ؟"

"کچھ بھی کر دو۔ لیکن بلبیری مجھے بہت گرمی لگ رہی ہے۔ میرا جسم
[illegible]جا جا رہا ہے۔"

"تو میں کیا کروں بابو جی ؟" بلبیری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے
[illegible]ے پوچھا۔

"تم کیا کرو گی ......"

"لیکن بابو جی گرمی کیسے لگ سکتی ہے۔ باہر تو جور کی برکھا ہو رہی ہے۔
[illegible]راصل یہی ہے۔"

اگر تمہیں یقین نہیں ہوتا تو ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔ جسم بھٹی کی مانند جل
[illegible] رہا ہے۔" روملیش نے چڑ کر کہا۔ بلبیری نے اسی بچکانہ تجسس سے اپنا بھیگا
[illegible]یگا ہاتھ جب روملیش کی پیشانی پہ رکھا تو اس کے اندر بھڑکتی آگ اور بھی
[illegible]ز ہو گئی۔ گو بلبیری اس وقت اس کے کافی قریب تھی لیکن ایسا بھی نہیں
[illegible]ھا کہ اوپر گرمی بڑھتی ہو۔ پر روملیش کو ایسا لگ رہا تھا مانو بلبیری کے
[illegible]سم کی ساری بدبو اس نے نتھنوں میں گھسی جا رہی ہے۔ بھیگے کپڑوں سے
[illegible]یگا بھیگا جسم شعلے کی مانند لپکتا ہوا اس کی آنکھوں کو چندھیا رہا
[illegible]ھا۔ بلبیری کا بھیگا بھیگا دوپٹہ جب انجانے میں اس کے ننگے بازو
[illegible]ڑا تو اسے ایسا لگا جیسے بلبیری ہی اس پہ گر پڑی ہے۔ اس کے
[illegible]نے میں ایک اتھل پتھل سی مچ رہی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ بلبیری اس
[illegible]تنے قریب کیسے ہو گئی ہے۔ یہ پنکھا اتنی تیزی سے چلنے کے باوجود اتنی

کم ہوا کیوں دے رہا تھا۔ یہ بھیگی بھیگی آگ اس کی جھولی میں کس نے ڈال دی تھی۔ لاوے کی مانند کھولتی ہوئی کس کی سانس اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ یہ کون اس کے ساتھ چمٹا جا رہا تھا۔ یہ فرش اتنا گندا کیوں ہو گیا ہے۔ اب اسے کون صاف کرے گا۔ اب وہ اس گندگی کو کیسے جھیلے گا۔ روملیش کی سانس بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ اور اس کے اندر بھڑکتی آگ کے شعلے اپنی معراج کو پہنچ کر ٹھنڈے ہو جانا چاہتے تھے لیکن یہ کیا ــــ بلبیری نے اسی معصومیت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بابو تمہاری طبیعت اچھی نہیں۔ تم آرام کرو۔" اور خود باہر چلی گئی۔

•• آگ جو معراج کی آخری حدوں کو چھونے ہی والی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ حد اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ تپش اور تیز ہو گئی۔ پنکھے کی ہوا راحت پہنچانے کی بجائے اس آگ کو اور ہوا دے رہی تھی۔ جیسے کسی بھٹی میں منوں آگ جل رہی ہو۔ اور اس بھٹی میں روملیش کو پھینک دیا گیا ہو۔ وہ بھاگ کر غسل خانے میں آ گیا۔ اور پانی کے ٹب میں اپنے آپ کو گرا دیا۔ لیکن گرمی اب بھی ویسی ہی تھی۔ اس نے پانی کا فوارہ بھی پورے زور پہ چلا دیا۔ اور پورے زور سے جسم کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح ملنے لگا جیسے مساموں میں پانی گھسا رہا ہو۔ یہ کیا ؟ یہ بدبو کیسی ہے۔ جو ایک دم اس کے سارے جسم سے آ رہی تھی۔ یہ تو بلبیری کے جسم کی بدبو ہے۔ جو اس کے دماغ پہ سوار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے جسم پہ خوب صابن ملا لیکن بدبو تو جیسے تیز ہی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے سانسوں کی گرمی تو جیسے کبھی کم ہی نہ ہو گی۔ روملیش نے لاکھ کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا۔ بلبیری کے جسم کی بدبو ویسے ہی اسے اپنے انگ انگ سے آ رہی تھی۔ وہ جس قدر بلبیری سے بھاگنا چاہتا تھا بلبیری اس کے اتنی ہی قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی گرفت روملیش کے جسم پہ اسی طرح مضبوط تھی۔ وہ بھیگی بھیگی ویسے ہی روملیش کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔ وہ یہی سوچتا کہ کیا اس بدبو کا کوئی علاج نہیں۔ کوئی ایسی بارش نہیں جو اس آگ کو بجھا دے کوئی ایسی موت نہیں جو بلبیری کو نگل جائے۔ جس کی فولادی بانہوں نے اس کے سارے وجود کو جکڑ رکھا ہے۔

••

نسیم محمد جان

آسمان کا رنگ

شانتی کی بھی عادت عجیب ہے ہمیشہ کمرے میں سوتی ہے۔ اور روشنی کئے بغیر تو سو ہی نہیں سکتی۔ میں آنگن میں پڑا کتنی بار پہلو بدل چکا ہوں۔ مگر آج ماضی کی یاد ہاتھ دھو کر کسی بیمہ کمپنی کے ایجنٹ کی طرح پیچھے پڑ گئی ہے۔ بیچاری نیند ایک دو بار دبے پاؤں میرے پاس آئی بھی تو مجھے تنہا پا کر بھاگ گئی اور اب شاید روٹھ گئی ہے۔ رات جوان ہو چکی ہے اس کے گندمی رنگ پر چاند کا جھومر بڑا حسین لگ رہا ہے۔ گاؤں تو آٹھ بجتے بجتے قبرستان معلوم ہونے لگتا ہے۔ دن بھر تھکے ماندے لوگوں پر نیند کا نشہ بہت جلد چڑھ جاتا ہے مگر اب میرے پاس شاید وہ نہ آئے گی۔ قصور میرا ہی ہے۔ اتنی رات گئے تک میں سچین سے باتیں کرتا رہا جو یہاں سے تقریباً تیس میل دور اپنی کوٹھی میں آرام کر رہا ہو گا۔ ہوا یہ کہ میں کسی کام سے شہر گیا تھا یکایک ایک موٹر میرے برابر آ کر رکی اور میں ایک طرف ہو گیا۔ مگر اپنا نام سن کر پیچھے دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا۔ سچین بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ وہ جھکتا ہوا آگے بڑھا۔ اور کار سے اتر کر اس بے تکلفی سے مخاطب ہوا کہ میں حیرت کا مجسمہ بن کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا کہ اس شخص میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی؟ اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ سچین کے متعلق کچھ دیر پہلے تک جو رائے رکھتا تھا وہ صحیح ہے یا اب جو رائے قائم کر سکتا ہوں وہ۔

سچین میرے کالج کے دنوں کا دوست ہے۔ اس وقت کا دوست جب ساری دنیا کسی رنگین فلم کی ہیروئن معلوم ہوتی ہے۔ پھر ہوسٹل کی زندگی، گھر سے آزادی اور بزرگوں سے چھٹکارا۔ صبح آٹھ بجے سے رات کے دس بجے تک کے وقت پر صرف اپنا اختیار رہتا جیسے وقت نہ ہو پٹرول بھری نئی کار اور واقعی دن اس شان سے گزرتے تھے جیسے سیٹھ کالوناتھ کی نئی ماڈل کی گاڑی مین روڈ لگایا کرتی ہے۔

ہم لوگ سائے کی طرح صبح سے شام تک ساتھ رہا کرتے تھے۔ اچھی طرح یاد ہے جنوری کا پہلا ہفتہ تھا یکایک بخار آ گیا۔ ایک دن تو اس امید میں ہوسٹل پڑا رہ گیا کہ شام تک طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر دوسرے روز بھی بخار کم نہ ہوا تو رائے یہ ہوئی کہ یونیورسٹی کے ہسپتال میں منتقل ہو جانا چاہیے اور آٹھ بجتے بجتے میں سچین کے ساتھ ہسپتال کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ رات کے دس بجے تک بیٹھا رہا۔ جانے لگا تو میں نے اپنا پرس اس کے حوالے کر دیا۔ جو ہسپتال میں کسی طرح بھی محفوظ نہ تھا۔ دو روز تک سچین بھی میری وجہ سے کالج نہ جا سکا۔ میری طبیعت تو ٹھیک ہو گئی تھی پھر بھی دو تین روز ہسپتال ہی میں رہا

اس دن صبح ہی سے موسم کچھ ٹھیک نہ تھا۔ شام ہوئی تو ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں میں سچین کا انتظار کرتے کرتے تھک کر نا امید ہو چکا تھا تو وہ تقریباً آٹھ بجے وارڈ میں داخل ہوا۔ وہ بھیگ گیا تھا مگر پھر بھی رات کے دس بجے تک میرے پاس ہی بیٹھا رہا اور اپنی کامنی کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ شاید اسے سردی زیادہ لگ رہی تھی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ شام کو وہیں چلا گیا تھا اسی لئے اسے آنے میں دیر ہو گئی۔ کامنی کے متعلق میں کچھ اچھی رائے نہ رکھتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ اور اس کے گھر والے سچین کو پھانسنے کی فکر میں ہیں۔ پھر بھی سچین کی باتیں سنتا رہا۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کسی دوست کی ساری باتیں کسی کو پسند آجائیں اگر دوستی نباہنی ہو تو کچھ ایسی باتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ جو بالکل پسند نہ ہوں۔ غالباً سچین کا بھی یہی خیال تھا اسی لئے ہوسٹل کی چار سال کی زندگی میں ہماری دوستی میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔

پھر مجھے بیمان یاد آ گیا جسے ہم لوگوں نے خوب الّو بنایا تھا۔ تھا تو وہ امیر گھرانے کا چشم و چراغ۔ مگر اول درجے کا کنجوس تھا۔ شام کی چائے کے لئے ہم لوگوں کو "گل ناز" میں جانا ہی پڑتا تھا۔ جہاں سچین اور بیمان کے علاوہ دو تین اور مخلص دوست پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے جہاں تک بل دینے کا سوال تھا۔ حساب دوستاں در دل والی بات تھی دل ہی دل میں حساب رکھتے تھے۔ کل میں نے بل ادا کیا تو آج کسی اور کی باری ہے۔ مگر کمبخت بیمان شاید دل میں بھی حساب رکھنے کا قائل نہ تھا۔ ایک دن جب اس کا منی آرڈر کالج میں آیا تو دوستوں نے پروگرام بنا لیا اور بیمان کو ساتھ لئے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ بظاہر سچین نے ہی سب کو مدعو کیا تھا اور یاروں نے خوب مزے لے لے کر کھایا جیسے سب اپنے ہاضمہ کا امتحان لے رہے تھے۔ جب بل آیا تو سچین کی بڑے ہی ڈرامائی انداز میں اپنی جیب ٹٹولی وہ چہرے سے پریشانی ظاہر کرنے میں سو فیصدی کامیاب تھا میں نے فوراً پوچھا کیا بات ہے۔

"شاید منی بیگ کمرے میں ہی رہ گیا"

"بھیا! منی آرڈر تو ابھی آیا ہے بل دے دو"

میں بیمان سے مخاطب تھا۔

بل تو اس نے ادا کر دیا۔ مگر اتنا چراغ پا ہوا کہ بل دینے کے تین چار روز کے بعد تک شام کی چائے میں بھی شریک نہ ہوا۔

میرپور آیا تو اچانک ایک دن سچین سے ملاقات ہو گئی۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ ہم دونوں کی پوسٹنگ ایک ہی جگہ ہو گئی تھی۔ پھر ہم لوگوں کے تعلقات رفتہ رفتہ اس قدر گہرے ہو گئے کہ آفس کے بعد لوگ ایک کو دیکھ کر دوسرے کی موجودگی کا یقین کر لیتے تھے اس کے آفس کے بڑا بابو کہتے تھے کہ وہ آفس والوں کے ساتھ اس کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ کچھ دنوں کے بعد یہ سن کر مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اس کا بوڑھا چپراسی رگھوناتھ سسپنڈ ہو گیا۔ آفس والوں کا کہنا تھا کہ اس پر جو الزامات لگائے گئے تھے وہ بوگس تھے حقیقت صرف اتنی تھی کہ اس نے ایک دن سچین کے گھر کا کام کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ چھ ماہ سے کر رہا تھا کبھی کبھی انسان جن مظالم کو برسوں برداشت کرتا ہے۔ یکایک اس کی مخالفت کے لئے خود کو کچھ اس طرح تیار کر لیتا ہے کہ یہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس نے مظالم بھی برداشت کئے ہیں۔ جب میں نے سچین سے دریافت کیا تو کہنے لگا۔

تم نہیں جانتے۔ وہ بڑا بدمعاش اور بد تمیز ہے۔ اب پتہ چلے گا۔ اور پھر میں نے یہ سوچ کر گفتگو کا موضوع بدل دیا کہ مجھے اس کی آفس کی زندگی سے کیا لینا دینا ہے۔

انہیں دنوں سچین نے ایک امتحان میں شاندار

کامیابی حاصل کی اور ایک بڑا افسر بن کر چلا گیا پھر کئی برسوں تک
اس کے متعلق مجھے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔

ادھر کچھ دنوں سے میں بہت زیادہ پریشان تھا۔
بات یہ تھی کہ سوشیل اور نریندر اب انجینئرنگ کالج میں پڑھنے
لگے تھے۔ اس گرانی کے زمانے میں دونوں کے ہوسٹل کے
اخراجات پورے کرنا میرے لئے آسان کام نہ تھا۔ اس لئے
میں کوشاں تھا کہ میرا تبادلہ اسی شہر میں ہو جائے تاکہ ایک ساتھ
رہنے پر خرچ میں کچھ کمی آجائے مگر میری ہر کوشش بے کار
ثابت ہو رہی تھی۔

ایک دن اچانک مجھے یہ خبر ملی کہ سچین ہمارے ہی
محکمے میں آرہا ہے اور ہمارے تبادلے کا اختیار اسی کو ہوگا تو
میری خوشیوں کی انتہا نہ رہی جیسے ہی معلوم ہوا کہ اس نے
چارج لے لیا ہے میں شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔ ادھر
اس سے ملاقات کئے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے تھے۔ سیدھے آفس
پہنچتے ہی ایک کاغذ پر اپنا نام اور پتہ لکھ کر چپراسی کے حوالے
کیا اور باہر ہی انتظار کرنے لگا۔ چپراسی واپس آکر اپنے
سٹول پر بیٹھ گیا تو مجھے حیرت ہوئی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ
وہ کارڈ دیکھتے ہی مجھے بلا لے گا۔ میں نے فوراً دریافت
کیا۔

"کیا تم نے کاغذ دے دیا؟"

"ہاں"

"وہاں اور لوگ بھی ہیں کیا؟"

"نہیں"

آدھ گھنٹہ گزر گیا تو دروازہ کھلا اور چپراسی مجھ
سے کہنے لگا "صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں اندر گیا تو سچین ٹیبل پر جھکا کسی فائل پر کچھ لکھ
رہا تھا۔ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ
مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ایسا لگتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور اتنا زوردار
کہ میری تو عقل ہی گم ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ میں اس جملے کے لئے
تیار نہ تھا۔ وہ مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔

"کیا آپ کو مجھ سے کچھ کام ہے؟"

"میں اتنی دیر میں سنبھل چکا تھا۔

"سر! ہم دونوں میرٹھ میں ساتھ رہے ہیں۔ کالج میں
ہم جماعت بھی رہ چکے ہیں۔"

"ہوں گے۔ کہئے کام کیا ہے؟"

"کچھ نہیں صرف ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔"

"اچھا"

میں باہر نکل آیا اور پسینے سے بھیگ گیا۔

پھر میں نے اپنے تبادلے کی کوشش ہی کرنی چھوڑ دی
حالانکہ میرے آفس کے بہت سے ساتھیوں کا تبادلہ ان کی
مرضی کے مطابق ہوتا رہا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ان کی سفارش
کرنے والا کوئی بااثر آدمی ہوا کرتا تھا۔ میرا بھی تبادلہ ہوا
اور میں احمد نگر آگیا۔ پہلے شہر سے بارہ میل دور تھا اب
تیس میل۔ مگر اس سے فرق ہی کیا پڑتا تھا۔ جب سوشیل
اور نریندر ہوسٹل میں رہ رہے تھے تو ان کے لئے جیسے
بارہ میل ویسے تیس میل۔

آج دو سال کے بعد سچین سے اچانک ملاقات
ہو گئی تو اس کی بے تکلفی دیکھ کر حیران رہ گیا اور وہ اس قدر
بضد ہوا کہ مجھے مجبوراً اس کے بنگلے تک جانا ہی پڑا۔ سجے
سجے ڈرائنگ روم میں اس کی بیٹی کرشنا پر تکلف
ناشتہ لگا رہی تھی۔ میں نے پوچھا

"پہچانا تم نے"

"نہیں چاچا"

اور مجھے آج کی کرشنا اور اس وقت کی کرشنا میں
کوئی فرق نہ معلوم ہوا۔ جب وہ میری گڈی کے سامنے گھٹنوں کھیلا
کرتی تھی۔ سچین کی بیگم بھی پاس ہی بیٹھی کرشنا کی تعریف کر رہی تھی

میں بھی خوش تھا مگر بار بار سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر اتنی
بڑی تبدیلی آئی کیسے اور اب مجھے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ یہ
وہی سچین ہے جس نے ایک دن کہا تھا "میں نے کہیں آپ کو
دیکھا ہے"۔ "کہیے کیا کام ہے" سچین کی بیگم نے کسی بار
سوشل کے متعلق پوچھا جیسے انہیں یقین ہی آ رہا ہو کہ وہ
انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے۔ چلتے چلتے مسز سچین
کہنے لگیں

گڈی کی ممی کو ایک دن ساتھ لائیے نا بہت جی
چاہتا ہے دیکھنے کو۔ اگر ممکن ہو تو آئندہ اتوار کو ہی لے آئیے!

گھر لوٹا تو میں گھنٹوں ان کے اخلاق کی تعریف شانتی
سے کرتا رہا۔ مگر کچھ دیر پہلے جب ساری باتیں میری سمجھ میں آگئیں
تو اپنی بیوقوفی پر خوب ہنسی آ رہی ہے۔ آخر مجھے پہلے ہی ان کی
بیٹی کرشنا نظر کیوں نہ آئی جو اب جوان ہو چکی تھی۔ شاید
سوشل کے متعلق نہیں ابھی کچھ پتہ چل سکا تھا۔ یکایک
بوندا باندی ہونے لگی اور میں ماضی سے پیچھا چھڑاتا ہوا کمرے
میں جو داخل ہوا تو ہر طرف تاریکی تھی۔ شانتی بھی
جاگ رہی تھی میں پوچھ بیٹھا

کمرہ بالکل تاریک کیوں ہو رہا ہے؟

کہنے لگی

لگتا ہے لالٹین میں تیل کم تھا۔

بقیہ:- بزم شاخسار

شاخسار نے جس طرح ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اس سے کس کو
انکار ہو سکتا ہے لیکن ابھی اس بام عروج پر نہیں پہونچا ہے جس پر
ہم اسے متمکن دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس بار حصہ نثر کافی دقیع ہے۔ مقالے سبھی خوبصورت
ہیں اور محنت سے لکھے گئے ہیں خصوصاً "علامت کا ماضی
وحال" اور "جگر بریلوی کی غزل" اچھے خوبصورت اور فکر انگیز
مقالے ہیں۔ افسانوں کا حصہ اب کے بہت جاندار ہے خصوصاً
محترمی جوگندر پال ایم اے کا افسانہ "غروب" لائق تحسین
ہے۔ ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب نے ایک نئے موضوع پر کامیابی
کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کامیاب
سیاست داں ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب ادیب بھی ہیں۔

نظموں کا حصہ ہمیشہ ہی دقیع رہا ہے اور اس بار بھی
ہے۔ غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار خوب ہیں ؎

بھڑکنے نہ دیں گے جہنم زمیں پر
ہم اس کے لئے تو جناں چھوڑ آئے
(ابر احسنی)

اور ہم سے کیا ہوگا اپنے دل کو سمجھا لیں
صبح ہو نہ ہو لیکن رات بیت جائیگی
(مظہر امام)

دھڑک اٹھا ہے مرا دل تڑپ گئی ہے نگاہ
کوئی قریب سے گزرا ہے زندگی کی طرح
بہت فسردہ سہی زیب یہ تبسم گل
تم ایک بار تو ہنس لو، چلو اسی کی طرح
(زیب غوری)

دنیا کو ہم نے درس وفا کب نہیں دیا
کب ظلمتوں میں نور بداماں نہیں رہے
وہ عظمتیں حیات کی حاصل نہ کر سکے
طوفاں میں حادثوں کے جو خنداں نہیں رہے
(شبنم فہمی)

ہم نے ہر ذرہ کو بخشی ہے تبسم کی ضیا
ہم ہی پھر ننگ وفا دہر میں کہلائے میاں
(اطہر عزیز)

دوسروں کے درد کا احساس کچھ ہوتا نہیں
آدمی جب تک کہ غم کی آگ میں جلتا نہیں
(سیف سمستی پوری)

سید نثار مصطفےٰ کا "تجریدی آرٹ" بھی اچھا ہے۔

آسیہ بانو انجم

پاسِ وفا کی خاطر

سہیلیاں ہاتھوں میں مہندی رچا رہی ہیں۔ بہن مانگ کو افشاں سے منور کر رہی ہیں۔ بزرگ سہاگ کی دعائیں دے رہی ہیں اور کوئی تصورات کے دھندلکے میں میرا انتظار کر رہا ہے لیکن میرا دل تمہارے پاس بھٹک رہا ہے۔ اور ـــــ یادوں کے چند تنکے گردشِ زمانہ کے تند تھپیڑوں سے بکھر گئے ـــــ کاش ـــــ میں یادوں کے ان منتشر تنکوں کو ایک بار صرف ایک بار یکجا کر کے سینے سے لگا سکتی، پلکوں پر روشن کر سکتی!

سوچتی ہوں اپنے جذبات کو قربان کرنے کے بعد بھی تمہاری خوشیاں واپس نہ لا سکی تو؟ اس تصور سے میرا دل ہر لمحہ سہما جاتا ہے اور پھر طرح طرح کے خیالات پے بہ پے ذہن کے دریچوں سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں ـــــ

میں نے بچپن سے ہوئی منگنی کو توڑ دیا ـــــ دنیا میرے اس جذبے کو ایثار و قربانی سے تعبیر کرے گی ہو سکتا ہے کچھ الزام بھی لگیں۔ کیونکہ دنیا میں کچھ اچھی نظر رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے کم ظرف بھی ہیں جن کے نزدیک ہر حسن معیوب ہوتا ہے ـــــ لیکن میں جانتی ہوں! میں نے ایسا اپنے فرض سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ اپنے ایمان کے آگے میرا سر جھک گیا ـــــ محبت میرا ایمان تھا اور میرے ایمان کے تم جز تھے جس کی حفاظت میرا فرض تھا ـــــ یہ اس محبت کا فرض تھا جو میں نے دس سال سے تم سے کی ہے۔ تم بھی اسے شاید میرا انتقام سمجھ رہے ہو۔ پاگل ـــــ! مجھ جیسی بزدل لڑکیاں انتقام لینے کے لئے نہیں پیدا کی گئیں ہیں ان کی زندگی تو خود نہ جانے کتنے انتقامات کی نذر ہوتی رہتی ہے۔

میں نے جو کچھ کیا محبت کو سلیقے سے نباہنے کے لئے۔ اسی سلیقے سے جو میر کے اشعار میں ملتا ہے اور میر کے اشعار تو میری زندگی کے ترجمان ہیں جو مری تمہاری

سجھوں کی زندگی کی ایک کڑی ہے۔ تم کوئی غیر تو نہیں میرے اپنے ہو۔ ہم ایک دو برس کے ساتھی نہیں پورے بیس سال کے ساتھی ہیں۔ لیکن وقت کے ظالم تھپیڑوں نے مجھے تم سے چھین کر دور بہت دور پھینک دیا۔ تم آج بھی بے قصور ہو راحش! کسی معصوم بچہ کی طرح جس کی ہر غلطی معصومیت کی نذر ہو جاتی ہے۔

پھر سوچتی ہوں شاید میں تمہارے قابل ہی نہ تھی ورنہ قدرت اتنا خوبصورت انتقام کیوں لیتی کہ خود دعا دینے والے ہی کو زمانہ کی نظر لگ گئی ـــــ میں نے بھی تو تمہیں دعا دی تھی کہ دنیا کی ساری خوشیاں تمہارا حصہ بن کر تمہارے دامن میں سمٹ آئیں۔ لیکن ان خوشیوں میں میں نام کی کوئی شئے نہیں۔

اور کنواریوں کی طرح اس وقت میرا دل سہاگ کی خوشبو سے بوجھل نہیں ہو رہا ہے۔ میں آنے والے لمحوں کے کیف و سرور سے بے نیاز اس وقت صرف تمہارے تصور تمہارے خیال میں کھوئی ہوئی ہوں۔ یہ لمحے بہت قیمتی ہیں راحش۔ خدا جانے پھر اس کے بعد تمہیں یاد بھی کر سکوں گی یا نہیں؟

خدا کرے کہ میرے دل کا دھڑکنا بند ہو جائے زمانہ کی رفتار یہیں ٹھہر جائے کیونکہ آنے والے چند ہی لمحوں میں مجھے کسی اور کا ہونا ہے۔ یہ دل جس کے نہاں خانوں میں صرف تمہاری تصویر سجی تھی، یہ روح جس پر تمہاری محبت کے بادل چھا گئے تھے اب ان سب پر ایک خول چڑھانا ہوگا تاکہ زندگی کے دن پورے کر سکوں۔

میرے آنسوؤں کو نہ دیکھو میں تمہیں بے وفا نہ کہوں گی یہ تو میری قسمت کا قصور تھا کہ تم میرے اتنے قریب آ کر دور چلے گئے۔ میرے اندر ہی کوئی کمی رہی ہوگی تمہاری مرضی کے مطابق خود کو ڈھال تو لیا تھا لیکن خودی نے

ہری انا پسندی نے کبھی یہ پسند نہ کیا کہ تم سے وفا کی بھیک مانگوں بیتے لمحوں کا واسطہ
ں محبت کا مفہوم سمجھاؤں۔

راحش زندگی تنہا بھی گذاری جا سکتی ہے یادوں کے سہارے ! تمہیں
ہوگا ایک بار تم نے کسی بات پر مجھے مغرور کہا تھا اور میں نے مسکرا کر کہا تھا،
راحش ! پہلے خودی پھر دل " ——— اور آج میری خودی نے
ی " انا " نے دل کی آواز کو دبا ہی دیا ——— ورنہ میرے گلے میں اس
ت یہ شادی کا طوق کیوں ہوتا جس سے ہر لمحہ مجھے سکون ملنے کی بجائے میری الجھنیں
چیدگی اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ میرا دل ایک ایک کر کے ان لمحوں کو اپنی گہرائی میں
اپنا چاہتا ہے جن میں تمہاری یاد کے سائے بھٹک رہے ہیں ———

اس روز بھی ایسی چہل پہل تھی جب میں گھر سے پہلی بار اتنی دور تعلیم حاصل
نے جا رہی تھی۔ دو سال کا وقفہ اُف خدا ——— ! میرا دل کانپ جاتا
اتنی طویل مدت — تم سے دور رہ کر کیسے جی سکو نگی لیکن امید کی کرنیں میرے
رد خیالات کو جلا بخشتی رہیں کہ اس کے بعد تو ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔
دل بھی آج کی طرح اداس اداس تھا فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت دل میں
رکی ایک شمع روشن تھی اور اس وقت اس شمع کی لو نے تھرتھرا کر دم توڑ دیا۔
، جو میں نے عقد کے وقت ایک نئی منزل پر گامزن ہونے کا اعتراف کیا۔
کاش ——— اے کاش ! ان کانوں نے ناظم کے
ے راحش کا نام سنا ہوتا۔

سی طرح اس دن بھی مجھے گھر سے دور بھیجنے کی تیاری ہو رہی تھی ۔
ل تھے۔ تم سب سے دور الگ ایک درخت کے نیچے سگریٹ کے دھوئیں میں اپنی
یوں کو اڑا کر اپنی خلش کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔
سل ہی پھر اُس نے تسلی دی کہ تم میری جدائی کے غم میں اداس ہو۔ کاش اس
تم میرے دل کی ان بے ربط دھڑکنوں کو سن سکتے تو شاید سمجھتے کہ ہر نئی دھڑکن
یک نئی کہانی سنا رہی ہے ۔

مہ خاندان کی پہلی لڑکی آج پہلی بار گھر سے بہت دور پڑھنے جا رہی تھی
ل بوجھل تھا، فضا اداس تھی ——— اور میں خیالوں میں کھوئی سب
ہتو ملاقات تک پہنچ ہی گئی ——— تمہاری آواز درد و کرب میں ڈوب
ہوئی اور میرے احساس کی دنیا کو اور افسردہ کر گئی "تم جا رہی ہو بسیں" !
تو یہ سب بعد کیا نظر آ رہا ہے آپ کو ، میں نے حسب عادت اپنے غموں کو
اپنی شوخی میں سمو لینا چاہا۔

"آج تو سنجیدہ ہو جاؤ" ——— تمہاری آنکھوں کے پیمانے
چھلک گئے۔ میں تڑپ اٹھی بے تاب ہو گئی اتنی ہی دیر میں خود کو سنبھال چکی تھی۔

"اوہ ! مرد ہو کر روتے ہو مجھے ایسی بزدلی پسند نہیں غموں میں مسکرانا
سیکھو کانٹوں کی چبھن میں بھی پھولوں کی نرمی محسوس کرو... منزلیں خود بخود آسان
ہو کر سامنے آ جائیں گی، ہواؤں کے رخ بدل جائیں گے راستے کے چراغ جگمگا کر تمہارے
راستوں کو منور کر دینگے ——— میں تو پھر آؤنگی۔ بالکل اسی
طرح ——— اور ہاں سگریٹ زیادہ مت پینا صحت کا خیال رکھنا اسٹرانگ
ٹی سے پرہیز کرنا یہ تو آخری سال ہے محنت سے پڑھنا ہوگا، میں حسب عادت تم کو
اور نہ جانے کیا کیا ہدایتیں دیتی رہی کہ غزالہ ہمارے درمیان آ گئی اور خیالات کا تسلسل
درہم برہم ہو گیا۔ غزالہ کے اس طرح درمیان میں آ جانے سے میرا محبت بھرا دل سہم
گیا۔ محبت و وہم تو لازم و ملزوم ہیں جیسے وہم کے بغیر محبت میں پختگی نہیں آتی، یہ
میرا خیال تھا کیوں کہ مجھے تو تمہارے پاس سے گذرنے والی ان ہواؤں سے بھی جو
تمہارے جسم کو چھو کر جاتی تھیں جلن ہوتی تھی۔ میں تم سے کچھ اور نہ کہہ سکی میرے سینے میں
جذبات کا ایک طوفان بپا تھا جو کسی نہ کسی طرح باہر آ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے
جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ کیونکہ میں انسان کے اندر انانیت پسند کرتی ہوں یہ وہ
جذبہ ہے جو انسان کو خودی کے سب سے بلند مینار پر بٹھا دیتا ہے جہاں خدا
بندے سے خود پوچھتا ہے، "بتا تیری رضا کیا ہے ؟"۔

میں چلی آئی تھی لیکن غزالہ کا آخری وقت میں تجھے تم سے جدا کر دینا کبھی
کبھی وہم بن کر میرے تصور میں چپکے سے جھانکتا ہے ——— جیسے اس
نے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا ہو ہش ! ایسا نہیں سوچتے ، انسان اتنا خود
غرض نہیں ہو سکتا ! میں اپنے دل کو تسلی دیتی۔

میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ میں لوٹ آئی دل میں نہ جانے کتنے ارمانوں
اور خوابوں کو دلہن کی طرح سجا کر لائی تھی ——— جن میں دو سال
کی تبدیلیوں نے آگ لگا دی تھی۔ وہ سب تبدیلیاں صرف ایک کے باعث تھیں۔
وہ تم تھے ! دل نے یقین نہیں کیا کہ تم بدل گئے ہو لیکن حالات بن کر جو کچھ سامنے
آتا رہا وہ آنکھوں کے یقین کے لئے کافی تھا کیوں کہ تمہارے سوا سبھی مجھ سے ملنے
آئے ——— محبت نے نرمی سے دل پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دی کہ تم بہت مشغول
رہے ہو گے۔ اس خود فریبی میں مبتلا ہو کر دل کی آواز پر میں تمہارے گھر خالہ امی

سے ملاقات کے بہانے آگئی۔

خالہ امی نے گلے لگا لیا۔ وہ ہمیشہ سے مجھے بہت چاہتی تھیں اس لئے مجھے ناز و غرور تھا کہ میری محبت اوروں کی طرح سماج کی آہنی دیواروں سے ٹکرا کر سسک سسک کر دم نہیں توڑے گی مجھے اعتماد تھا اپنی محبت کی لگن اور جستجو پر اور اپنے خدا پر۔

زریّو میرے گلے سے لپٹ گئی اور حسبِ معمول میرے کان میں شرارت سے اس نے کہا بھائی میرے کانوں میں شہنائیوں کے مدھر سُر رس گھولنے لگے ہیں میری پلکیں حیا کے مارے بوجھل ہو گئیں۔ پاؤں میں پازیب کی جھنکار پیدا ہو گئی اور ہر طرف سہاگ کی خوشبو پھیل گئی ——— پھر۔ میں مدھر سُروں میں وہ گیت گنگنانے لگی جو سہاگ رات کو ڈھولک پر گائے جاتے ہیں۔ راحش! دل بھی کیسے کیسے خواب ذہن و احساس کی آنکھوں میں سجا لیتا ہے دل کی اس سادگی پر ہنسی آتی ہے کہ یہ کیوں کبھی کبھی اتنا خوش فہم ہو جاتا ہے۔ آنکھیں خواب دیکھنا کب چھوڑیں گی، جبکہ صدیوں سے انھیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں مل رہا ہے۔ بتاؤ راحش! تمہیں بتاؤ چاند کب تک یوں ہی بھٹکتا رہے گا موجیں کب تک یوں ہی ساحل کی تمنا میں ساحل ہی سے ٹکراتی رہیں گی۔

میں تو تمہاری یاد کو دل کی گہرائیوں میں چھپائے لوٹ آئی تھی لیکن تمہیں اس دولت کی ضرورت ہی کب تھی یہاں آکر جو کچھ دیکھا وہ دل توڑ دینے کے لئے کافی تھا ——— تمہاری میز کی دراز میں تمہاری اور غزالہ کی تصویر میرا مذاق اڑا رہی تھی! میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہی سنائی باتوں پر یقین کر لینے کے لئے کافی تھا کہ تم غزالہ میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہو۔

میں نے اُف نہ کی ——— کہ کہیں میرے زخموں کے سلگنے کی مہک تم کو نہ مل جائے — خدا کرے تمہاری محبت کا صلہ تمہیں مل جائے میری ہار تمہاری جیت بن جائے تو یہ سودا کچھ زیادہ گراں نہ پڑے گا ——— میرا چمن بہار کے دیدار سے محروم رہا تو کیا ہوا' خدا تمہاری زندگی کے ہر لمحے کو بہار کا پُر تکلف جھونکا بنا دے! اپنے لئے میں یہی سمجھوں گی کہ —

اب کے گلشن میں نئے رنگ سے آئی تھی خزاں
اور ہم سادہ نظر سمجھے بہار آئی تھی

انسانی محبت قربانیوں کی انتہا نہیں جانتی محبت میں فنا ہو جانا ہی محبت کی فتح ہے اسد پھر سے

مجھے نہیں ہے خوشی گوارہ اگر وہ ہو صرف انفرادی
بچے ہو سارے جہاں سے نسبت مجھے وہ غم بھی قبول ہو گی

میرے خیالات کا تسلسل زریّو کی آواز پر ٹوٹ گیا "اپی! وہ جان آگئے!" میں چونک پڑی خالہ امی سے ملے بغیر میں دوسرے راستے آگئی تاکہ تم سے سامنا نہ ہو سکے کس دل سے تمہارا سامنا کرتی
میں خوش تھی کیونکہ اہل دل راہ محبت میں ہر بازی ہار کر سب کچھ لٹا کر بھی یوں خوش رہتے ہیں جیسے انہیں دولت کونین مل گئی ہو!

میرے لئے اچھے رشتوں کی کمی نہیں تھی کیونکہ میرے پاس وہ سب تھا جو ایک متمول گھرانے کی شان ہوا کرتی ہے تم نے کتنی آسانی سے ان یادوں کو منتشر کر دیا تھا جنہیں میں نے بڑے ارمان سے چن چن کر دل کے نہاں خانوں میں سجا رکھا تھا۔

میں یہ جاننے کے باوجود انکار کرتی رہی کہ میری "ہاں" سے میرے والدین کے چہرے شگفتہ ہو سکتے تھے میں تم سے شادی کرنے سے انکار کر چکی تھی اور کہ مجھے تم سے محبت نہیں تھی تم تو آج بھی میرے لئے میرے سب کچھ ہو تمہاری یادوں کے سہارے تو میں جئے جا رہی ہوں، ورنہ اس زندگی کو یہ صدمے کب کے موت کنار کر دیتے۔

جب میں نے خالہ امی کو تیار کرنے کی کوشش کی کہ وہ تمہاری شادی غزالہ سے کر دیں تو وہ حیرت سے میرا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ انہیں شبہ تھا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

میری قربانیوں سے متاثر ہو کر یا غزالہ سے کچھ بدگماں ہو کر تم نے اپنا ہاتھ پھر میری جانب بڑھایا لیکن میں اپنا راستہ بدل چکی تھی میں دور نکل گئی فاصلے بڑھتے گئے کیونکہ مجھے تمہارا تو اعتبار تھا تمہاری محبت کا اعتبار نہیں کبھی کبھی میرے حوصلوں کے قدم تمہیں دیکھ کر ڈگمگا جاتے مگر اب تم ناامید ہو چکی تھی ——— تمہاری اداسی مجھ سے دیکھی نہ جاتی لیکن وہی خودداری جو مجھے ڈس دی، اسی کے باعث میں کچھ نہ کہہ پاتی تو اپنے ان بے قلب آنسوؤں کو تاریکی کے دامن میں جذب کر دیتی جو تمہارے درد کی تپش سے پگھل جاتے تھے۔

راحش! عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے اور جب کرتی ہے تو ہر بازی ہار کر اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ عورت کی محبت قربانیوں کی

انتہا نہیں جانتی وہ تو محبت کے بیکراں سمندر میں خود کو ڈبو کر اس خزانے کو پاتی ہے جیسے کوئی غوطہ زن سمندر کی تہہ میں جا کر ہی موتی پاتا ہے ——— وہ نہیں چاہتی کہ کوئی اس کے وجود کو بھی پاسکے ——— اور پھر ——— !

میں بے رخی پر اتر آئی کیونکہ غزالہ کو تم سے محبت تھی ——— اور مجھے بھی ——— ! اس لئے تاکہ میں ان لمحوں کو سنبھال کر رکھ سکوں جو تم نے محبت کی ابتدا میں مجھے پیار سے سونپے تھے !

میرے گھر کی خوشیاں اس دن لوٹ آئیں جب حسب معمول ایک رشتہ آنے پر میں نے انکار نہیں کیا ——— "شاد منزل" شاداب ہو اٹھی میرا جسم زہن بنا دیا گیا کسی اور کو سونپنے کے لئے۔

میں جا رہی ہوں راحش ! تمہاری دنیا سے دور بہت دور !! پاس وفا کی خاطر !! ایک بار پھر لوٹ کر آؤنگی تاکہ خالہ امی کو اس بات پر آمادہ کر سکوں کہ وہ غزالہ کی شادی تم سے کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات نہ ٹالیں گی۔ شاید اس طرح میں تمہاری خوشیاں واپس لاسکوں۔

بقیہ۔ کسی نے ڈھونڈ لی منزل

بچا چھڑانا بھی ممکن نہ تھا۔

دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور مشہود تیر کی طرح عزمیہ کی جانب لپکا۔ عزمیہ مجرم بنی خاموش بیٹھی رہ گئی۔ جب مشہود بالکل قریب آگیا تو اس کی شوخ نگاہوں کی تاب نہ لا کر عزمیہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔ "دیکھئے، اس کی ضرورت نہیں۔ آپ جواب دینے کا وعدہ کر چکی ہیں۔" مشہود نے اس کا ہاتھ چہرے سے ہٹا دیا۔ "تو یہ کہئے ابھی سے دلہن بننے کی مشق کر رہی ہیں؟" جملہ کار گر ہو گیا اور عزمیہ نے پھر چہرہ چھپالیا۔ وہ بری طرح نروس ہوئی جا رہی تھی اور مشہود اس کے کترانے کا سبب جاننے کے لئے بیتاب تھا لیکن عزمیہ سبب بتا کر خود کو اس کے مذاق کا نشانہ بنانا نہ چاہتی تھی۔ "اگر آپ اسی طرح خاموش رہیں تو پھر مجبوراً مجھے قسمیں دینی پڑیں گی۔" اب عزمیہ کے لئے جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مجبوراً اسے انکشاف کرنا پڑا۔ "میں رخسانہ کو آپ کی بیوی سمجھ رہی تھی۔ بیوی اور بچی کی موجودگی میں آپ کا یہ انداز .... پریشانی کا باعث تھا ...... اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ .... میں آپ کا گھر اجاڑنا نہیں چاہتی تھی ......" عزمیہ کے جواب پر مشہود قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ پھر دھیرے سے اس کے قریب آکر کہنے لگا۔ "میرا گھر اجاڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ بسانا تو چاہتی ہونا؟" عزمیہ جھینپ کر رہ گئی۔ "فرض کرو" مشہود نے کہنا شروع کیا "میری شادی ہو بھی چکی ہوتی تو کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہیں خود سے قریب پاکر میں فرض کا پابند رہ سکتا تھا؟ آج مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ میں نے کالج کے زمانہ سے تمہاری پوجا کی ہے، تمہیں چاہا ہے، تمہارا تصور زندگی کی راہوں میں ہر لمحہ میرے ساتھ رہا ہے، تمہاری یادوں کی شمع میرے دل کو روشنی بخشتی رہی ہے۔ میں نے چھ سال تک تمہاری جستجو کی اور آخر تمہیں پا ہی لیا۔ اب بتاؤ، مانتی ہو نا کہ میں تمہارا پیار ہوں؟"

مشہود کی باتیں، اس کا انداز گفتگو اور اس کا لب و لہجہ عزمیہ کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ شدت جذبات سے اس کے آنسو بہہ نکلے۔ مشہود نے بڑی محبت سے اس کے آنسوؤں کو اپنے رومال میں جذب کر لیا لیکن مدت کا کھولتا ہوا لاوا بڑی تیزی سے ابل رہا تھا۔

دوسرے لمحہ عزمیہ مشہود کے مضبوط بازوؤں کے حلقہ میں تھی۔ "میں تمہاری ہوں مشہود! مجھے ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں چھپالو۔" وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر کہہ اٹھی۔ اور فرط محبت سے اپنا سر مشہود کے چوڑے سینے پر ٹیک دیا۔ مشہود کی انگلیاں اس کے بالوں میں شانہ کر رہی تھیں اور اس کے آنسوؤں سے مشہود کی قمیص بھیگتی جا رہی تھی۔

نذیر احمد یوسفی

غمگسار

بنگلور - ۸ اکتوبر ۱۹۶۶ء

اچھے تنویر -

تمہارا اخلاص نامہ مل گیا تھا - مگر ان دنوں کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ عین وقت پر تمہاری محبت کا جواب نہیں دے سکا - اس فروگذاشت کے لئے معافی تو نہیں مانگوں گا کہ معافی غیروں سے مانگی جاتی ہے - اپنے بہر حال اپنے ہیں - اور اپنوں سے ایسی مغائرت زیب نہیں دیتی - ویسے بھی اس اخلاص کے دیوانہ پن کا اظہار ہوتا ہے - اور چونکہ اس معاملہ میں میں نہایت مخلص واقع ہوا ہوں، اس لئے میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ مجھے کوئی اس نگاہ سے دیکھے جس کا خیال ہی میرے لئے سوہان روح ہے -

تم نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ آج کل میری عادتوں میں کچھ ایسی ویسی باتیں زیادہ آگئی ہیں جب میری اس بگڑی ہوئی عادت کے بارے میں تمہیں کچھ اتنا پتہ ہے تو یقیناً وہ باتیں بھی تمہیں معلوم ہو ہی چکی ہونگی جو ابھی تازہ ترین ہیں - یعنی یہ حادثہ جس کا ذکر میں کر رہا ہوں اپنی نوعیت کا پہلا اور نہایت دلچسپ واقعہ ہے - میری زندگی کا جس کی جھلک تم نے بارہا دیکھی ہے - کیونکہ تم میری زندگی میں اس وقت سے آئے ہو جب کہ میں توتلی زبان سے مدرسہ میں مولوی محمد دین صاحب سے اردو کا قاعدہ پڑھنے جایا کرتا تھا - کیا ہوا اگر ہمارے زمانہ اور گردش شب و روز نے ہمیں ایک دوسرے سے ہزاروں کلومیٹر دور پھینک دیا ہے -

خط کی طوالت مجھے اس بات پر اکسا رہی ہے کہ پہلے وہ واقعہ تمہیں سنا دوں کہ جو ابھی تازہ ہے، اور جس کے بارے میں تمہاری بھابی نے تھوڑا بہت لکھ ہی دیا ہوگا ورنہ میری عادت پر تم کبھی انگلی نہ رکھتے

ایک دن کام میں مصروف تھا کہ کمرشی بابو جو آج کل میرے ڈیپارٹمنٹ میں ایک بائیس سالہ متناسب الاعضا، اور گوری رنگت کے

زندہ باش

نوجوان کو میری مشین پر لائے - اور یہ کہکر مجھے اپنی جانب مخاطب کیا -

"سراج! تمہارے ہیلپ کے لئے یہ آدمی لا دیا ہے ابھی یہ ASWAL ہے -

مجھے تو بھی ایک مددگار کی ضرورت تھی جیسا کہ ملکوں مشین پر تیز ہو رہے تھے میری مدد کرتا - مجھے اس کی ذات سے تھوڑی دلچسپی تھی - کئی دن یوں ہی گذر گئے - کام کی باتوں کے علاوہ کبھی کسی دوسرے موضوع پر گفتگو ہوئی بھی تو بس یہی کہ اس نوجوان کا نام مراد تھا - اس نے چوتھے دن بڑی دھیمی آواز میں بتایا "سراج بھائی میری ایک بڑی بہن ہے بیوہ ہے ایک ننھا سا بچہ بھی ہے اس کے لئے ایک اچھا سا کماؤ اور شریف آدمی کی ضرورت ہے - جسکے ہاتھ اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں - ہم لوگ غریب آدمی ہیں - میری کمائی سے گھر کا خرچ چلتا ہے جس میں میں، بہن اور ایک بوڑھی ماں بھی ہے

تم کو تو معلوم ہے کہ تمہاری بھابی آج تین برس سے کچھ ایسی بیماری میں مبتلا ہیں کہ جان کے لالے پڑے ہیں ایک سانس کے بعد دوسری سانس کی آمد کی کوئی امید نہیں رہتی - بھلا بتاؤ ایسی عورت ایک جوان، تندرست اور جذباتی مرد کے لئے کیا رعنائی اور جاذبیت اپنے اندر رکھ سکتی ہے - میں اکتا گیا تھا میری محبت میں اب کھوٹ سا آچلا تھا - اس لئے جب اس نے یہ کہا تو سچ جانو مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا کہ وہ میری درد بھری کہانی سے واقف ہے، وہ میرا درد بٹنا چاہتا ہے، وہ میرے مرض کو جانتا ہے اس کا علاج چاہتا ہے - وہ میرے غم سے آشنا ہے اس کا مداوا چاہتا ہے - میری بے قراری کو جانتا ہے اس کا قرار چاہتا ہے -

میں نے اپنے مصروف ہاتھوں کو روک لیا - اس کی شکل کچھ اس انداز میں دیکھی کہ وہ چند ثانیہ کے لئے گھبرا سا گیا - شاید اس کی باتوں سے

ری محسوس کی ہو۔ مگر خلاف توقع میں نے جھٹ سے یہ کہا کہ۔
یں شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ میں کنوارا تو نہیں ہوں۔ مگر
نوارا ہی رہتا۔ تین سال سے میری بیوی بیمار ہے نہ مرتی ہے نہ
اس موت وحیات کے دوراہے پر کھڑی ہوئی ہے۔ نہ جانے کون
پنی طرف کھینچ لے۔

موت وحیات کے اس کھیل میں میں ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا
اگر تم اور تمہاری ماں اور خود تمہاری آپا مجھے اس قابل سمجھیں
ہے۔ مراد خوش ہو گیا۔ اس کے مضمحل چہرے پر خوشی صاف
دکھ رہی تھی۔ اس نے پرامید لہجے میں کہا: "منظری کل میں اپنی ماں
کے بارے میں ذکر کروں گا۔ امید ہے کہ وہ راضی ہو جائیں گی
آپ میں وہ ساری خوبیاں مل رہی ہیں جس کی انہیں تلاش ہے
آپ کی پہلی بیوی بہ قید حیات ہیں۔ اگر آپ نے حق پسندانہ رویہ
کوئی حرج نہیں۔

اور بات دوسرے دن پر رکھ کر ختم کر دی گئی۔

وہ رات کس طرح گذری نہ بتا سکوں گا۔ دوسرے دن کارخانے
سے ملاقات ہوتے ہی میں نے اپنی خواہش کا انجام پوچھا۔ مراد
اماں نے آپ کو بلایا ہے۔ شام کی چھٹی پر ہم دونوں ساتھ چلیں گے
اندر ایک بڑی سی چارپائی تھی جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ دوسری
پیچھے پر چھوٹا سا آئینہ رکھا تھا۔ جس کے نزدیک ہی سستے قسم کی ہندو رنگ
موعات بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اور چاروں اور کی دیواروں میں
کلینڈر اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے فوٹو آویزاں تھے۔

سامنے کے دروازہ پر ٹاٹ کا پردہ لگا ہوا تھا۔ بوسیدہ اور
۔ مراد مجھے چارپائی پر بٹھا کر اندر چلا گیا۔ میرے تنفس کی رفتار
اور حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ پردہ کے عقب سے آنے
والوں کی کھنک اور ہلکی سرگوشیوں نے مجھے ہلکان کر دیا کہ اتنے
چائے کی پیالی لئے ہوئے آگیا۔ میں نے پیالی تھام لی اور کوشش
کے ہونٹوں سے جو آواز نکلی وہ تھی "پانی پلاؤ۔"
مراد نے مراد آبادی گلاس میں پانی پلایا۔ چائے اور پان کے
آیا۔ مگر راستے بھر یہ سوال میرے ذہن میں رینگتا رہا کہ مراد

نے اپنی بہن کو کسی بہانے سامنے کیوں نہیں آنے دیا۔ تو کیا بغیر دیکھے
ہی میں شادی کر لوں۔ نہ جانے وہ کیسی ہو۔؟ نہیں بغیر دیکھے میں زبان
نہیں دے سکتا۔

صبح کو کارخانے میں ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا: "واہ بھئی
خوب کل تو چائے پان پر ہی ٹرخا دیا۔ کام کی بات تو کچھ ہوئی ہی نہیں۔
ہاں تو۔" مراد نے فوراً کہا۔ "اماں اور آپا نے تو پردے کے عقب
سے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ آپ دونوں کو پسند ہیں۔"
پسندیدگی کی اطلاع پا کر میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ تاہم میں نے
ہنستے ہوئے کہا۔ خوب! تمہاری ماں اور آپا نے تو مجھے دیکھ لیا۔ مگر میں
نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ بھئی! مجھے بھی تو حق ہے دیکھنے کا۔ یہ کہاں کا انصاف
ہے۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں نے اس کی مشکل حل کرنے کی کوشش کی۔
کل سینما لیکر آجاؤ۔ دیکھتی ہیں کہ نہیں سینما وغیرہ۔
برسوں ہو گئے۔ ویسے کل پوچھ کر آؤں گا۔ تب پروگرام بنایا
جائے گا۔ کیوں؟ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی سہی۔" میں نے اثبات میں گردن ہلا
دی۔ اور ہم دونوں کام میں منہمک ہو گئے۔

X———X

اتوار کا دن تھا۔

سینما میں بھیڑ کافی تھی۔ اچھی فلم ہونے کی بنا پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے
تھے۔ میں نے پہلے ہی ایک دوست کے رسوخ سے اپر کلاس کے تین ٹکٹ
خرید لیے تھے۔ بس اب مجھے مراد اور اس کی ان دیکھی آپا کا انتظار تھا
جو ابھی آنے والے تھے۔

قریب میں ٹیکسی رکی۔ مراد کے ہمراہ ایک عورت اتری۔ قرینے
اچھی ساڑی میں ملبوس یہ عورت جس کے سر پر آنچل اس انداز سے رکھا
تھا کہ میں اس کی صورت صحیح طور سے نہ دیکھ سکا۔ تاہم مہین دھاگے سے
بنائی ہوئی ساڑی کے ریشوں سے چھن کر آتی ہوئی تنویر حسن نے میری
آنکھوں کو چکاچوند ضرور کر دیا تھا۔ میں نے لپک کر مراد سے کہا میرے
پیچھے پیچھے آجاؤ۔ اور میں ہال میں داخل ہونے کے لئے سیڑھیاں طے
کرنے لگا۔ ہال کی مدھم روشنی میں کرسیوں پر ہم سب کچھ اس ترتیب
سے بیٹھے کہ مراد کی آپا ہم دونوں کے درمیان میں آگئی۔ چونکہ بالکل وقت

پھر ہم لوگ داخل ہوئے تھے۔ اس نے بیٹھتے ہی ینوز ریل چلنے لگا۔

مجھے بے قراری تھی۔ اس لئے میری نگاہیں زیادہ تر مراد کی آپا کے چہرہ کا طواف کرتی رہیں اور میں اس کی حسین آنکھوں میں ہی جھانکتا رہ گیا۔ ایک گہری جھیل جس کے کنارے پر بڑی پھسلن تھی۔ ایک گہری کھائی جس میں گر جانے والا زندگی بھر نکل نہیں سکتا۔ ایک سرسبز وادی جس میں تا حیات مقید رہ جانے کی خواہش عود کر آئے۔ ایک نیلا سمندر جس میں ڈوب کر ابھرنا کفران نعمت ہے۔ ایک بہار بکنار چمن، جس کی فرحت افزا رسیلی ہوائیں اور دل کش مناظر آشفتہ کر دیں۔ اور ان جادو جگاتی آنکھوں کی سحر، پھر سرخی لئے ہونٹوں کی جھپک نوکیلے مژگان گوری رنگت اور سینوں کی دلکشی نے حسین چہرہ نے مجھے اتنا بے بس کر دیا کہ میرے ہاتھ بہکنے لگے ... جذبات کے دھاروں نے اتنا بے بس کر دیا کہ میں ہال سے باہر آ گیا۔ کیا کروں بھوکے انسان کے آگے خوان نعمت رکھ کر یہ امید کہ وہ ہاتھ بھی نہ لگائے۔ ظلم ہے۔ نہیں تو اور کیا ہے، مجھ سے صبر نہ ہو رہا تھا۔ اس لئے میں باہر آ گیا، کہیں ایسا نہ میری بے تابی کسی کے لئے وجہ پریشانی ہو۔ کوئی میری اس بے چارگی اور آمادگی کا مذاق اڑائے ـــ ہال سے باہر آنے کے چند ہی منٹ بعد فلم بھی ختم ہو گئی۔ جس کے بارے میں میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ستر فٹ فلم بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا ـــ مراد اور اس کی آپا میرے قریب ہی آ گئے۔ مراد کی آپا نے مری طرف دیکھا، ان آنکھوں میں ایک خواہش، ایک التجا ایک حسرت تھی۔ "آپ بھی چلئے ہمارے ساتھ ـ" مراد نے کہا۔

"نہیں ـ آج نہیں کسی دوسرے دن۔" خواہش کے باوجود میں نے انکار کر دیا۔ نہ جانے کیوں، اور پھر ٹیکسی پر بٹھا کر ان دونوں کو میں نے رخصت کر دیا۔

نہ جانے بیتابی ملاقات اور بیکلی دل کو بھی پیار کہتے ہیں تا کیا۔ کیونکہ مراد کی آپا سے ملاقات کے بعد میری طبیعت میں کچھ اس قسم کے انقلاب آ گئے تھے ـ میں جو لفظ پیار اور الفت سے ناواقف تھا، اپنے اندر اسی طرح کے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ ایک بے چینی تھی جو رنگ و بے میں تحلیل ہو گئی تھی۔ لمحہ بھر کو چین نہیں ملتا تھا۔

دوسرے ہی دن میں مراد کے یہاں جا پہنچا، مراد گھر پر نہیں تھا

اس کی آپا تھیں۔ اسی کمرے میں مجھے جگہ ملی۔ جہاں میں پہلی بار
پر لئے شمع دکھائی حاضر ہو تھا۔ میری بے خودی اور وارفتگی
نشے نے مراد کی آپا کو بھی از خود رفتہ کر دیا تھا۔ کیا کیا مانعی ہوئی
موضوعات کو ہم نے اپنے پاؤں سے روندا اور کس کس وادی
ہوئے ہم لوگ یکجا ہوئے، یہ کسی کو نہیں معلوم ـ

شام کی رنگت سیاہ ہو گئی تھی ـ

اور درختوں کے سائے غائب ہو چکے تھے۔ میں واپس
تو مراد کی آپا رضیہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "اتنی جلدی بھی کہاں
جائیے گا۔" جذبات کا وہ ریلا جو میرے حوصلوں سے روک رکھا
نشہ ہی ایسا ان آنکھوں میں تھا کہ آشفتگی جاگ اٹھی اور ہوش
دروازے بند ہو گئے ـ

بھیا سا تھا نا۔ بہت پیارا سا بیٹا ہمارا، یاد کیجئے

x ــــــــ x

یہ نہیں کہ مجھے تمہاری بھابھی سے نفرت ہو چکی تھی اور
سمجھتا تھا۔ نہیں مجھے ان سے ہمدردی تھی، ان کی بے چارگی
میں اپنی خواہش اور جنسیت سے مجبور تھا اسی لئے میں گھر کے
سے فرار پا کر اس تازہ اور دلکش فضاؤں میں سانس لینا
خیال کرتا تھا۔ جہاں میری روح کو آسودگی اور تمناؤں کو
گھر میں رات کو سونا، کھانا اور ضروری اشیا کا مہیا کر دینا
گیا تھا۔ ورنہ میں تمہاری اور میری ملاقات کب کی ہو چکی ہوتی ـ

وقت کے پاؤں تھم سے گئے تھے، کمبخت سنیچر جانے
سے ملاقات کو جاؤں، کیونکہ یہی ایک مناسب دن تھا۔ تب
بھابھی سے فرصت پاتا تھا۔ ورنہ دوا، انجکشن اور انہیں وقت پر
ہی تو میرا کام تھا کارخانے کی ڈیوٹی کے علاوہ۔

دوسری ملاقات میں میں نے محسوس کیا کہ رضیہ کے انداز
شوخی اور گہرائی زیادہ آ گئی ہے، پہلے جو جھجک، شرم اور
وہ سب یک لخت ختم ہو گئی تھی اب بات بات پر متبسم ہونٹوں
تا بناک چہرہ کی دلکشی اور قاتل انداز دیکھنے کو ملتے تھے۔
اور محبت نے رضیہ کو پوری طرح اعتماد کے شکنجے میں لے لیا تھا

…ا ہے کہ رضیہ کے بارے میں تم نہایت مخلص تھا۔ تمہارے
…رکھا تھا کہ آئندہ ماہ تک تیں اس سے شرعی طور سے نکاح
…بعد میں ساری اُلجھنوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کروں گا۔ ابھی سے
…بیان کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔

…اور میرے تعلقات استوار ہوتے ہی میری تمام ذہنی پریشانیاں
…تھا وہ اضمحلال اور افسردگی جو میرے ذہن پر سوار رہتے تھے
…تھا میرے چہرے سے ہوتا تھا۔ دور ہو گئے تھے۔ میں ان دنوں
…ہو۔ جس کا انکشاف کبھی کبھی میرے حرکات و سکنات کر دیتے
…اری بھابی ٹوک دیتی تھیں، حالانکہ حتی الامکان میں تمہاری
…سامنے مسکین ہی بنا رہتا تھا۔

×——×

…آج کے دن بھی گھر پر نہیں تھا۔ اس کی ماں بھی محلہ میں کہیں
…ا۔ دروازہ کھولنے والی رضیہ ہی تھی جوں ہی میں کمرے میں
رضیہ نے عجیب والہانہ پن کے ساتھ میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی
…کیوں میرا دل آج دھڑک رہا تھا۔ بار بار شاید آپ ہی کا
…رہا تھا۔ "شاید اس دل مضطرب کو قرار آ جائے۔" تو اس
…سمجھنے لگی میں بھی کسی کے دل کا سرور اور کسی کے لئے وجہ قرار ہوں کیونکہ
…آپ اتنی قدر کیا جانیں۔"

"قدر شناسی کا شکریہ۔" شریر ہاتھ بہکے۔

"ارے ہوں۔" وہ مچلی۔ "اتنا پینا بھی اچھا نہیں کہ پاؤں ڑ…
…نے لگیں۔"

"کمبخت پی کہاں، کسی نے پلا دیا ہے۔" میں نے اسے باہوں کے
…لے لیا۔ جیسے رند بلا نوش نے جام تھام لیا ہو۔

"کون ہے وہ ساقی۔"

"رضیہ نام ہے اس کا۔"

"اچھا جی۔" اور پھر میں نے اس کے ہونٹوں کی امرت کا ایک جام
…لیا۔

قربت نے جذبات کو بیدار کیا، جام نے نشہ دیا اور بے خودی کی بڑھتی
…لمحے بھی ایک بار پھر اس حسین وادی میں کھو سے گئے۔ جہاں
کی ہواؤں میں نشہ ہے۔ جہاں کی فضاؤں میں نغمے ہیں۔ جہاں کی
بہاروں میں فرحت ہے۔ جہاں کے مناظر میں نور و نکہت کا سیلاب،
جہاں کے جھرنے گیت گاتے ہیں، جہاں کے طائروں کی چہچہاہٹ خوش نوا
موسیقی سے کم نہیں۔

رات آ گئی تھی، اس لئے میں چلا آیا۔ آنے سے چند ہی منٹ قبل
مراد بھی آ چکا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ کل وہ میرے ملنے آئے گا۔ میں انتظار
کروں، میرے دل میں کوئی کھوٹ تو تھا نہیں کہ اسے آنے سے منع کر دیتا،
میں نے کہہ دیا کہ تمہیں تو پتہ معلوم ہی ہے آ جاؤ گے میں منتظر ہوں گا۔

بچہ راستے پر پان دوکان کے نزدیک میں بیٹھا ہوا تھا۔ شام کے پانچ
بج چکے تھے۔ انتظار کا شباب اب ڈھلنے لگا تھا۔ اور میرے اعصاب مضمحل سے
ہو گئے تھے، تب میں نے یہ خیال کر کے کہ شاید مراد کسی خاص وجہ کر نہ
آ سکا ہو۔ گھر کی جانب ہو لیا۔ کیونکہ شام کا ناشتہ اسی کے انتظار میں میں نے
بھی نہیں کیا تھا۔ خلاف توقع گھر کا دروازہ بند پایا تو آوازیں دیں، مگر کوئی نتیجہ
برآمد نہیں ہوا، تب دستک دی، وہ بھی دھیمے سروں میں کہ تمہاری
بھابی کو ہول نہ ہونے پائے، چوتھی آواز پر جب دروازہ کھل گیا تو میری
پریشانیوں کو قرار کی منزل ملی ورنہ میرے حواس پراگندہ ہو رہے تھے کہ
کہیں خدانخواستہ ایسی ویسی بات تو نہیں ہو گئی ...... اور ابھی میرے
حواس مکمل طور سے قابو میں بھی نہیں آئے تھے کہ یک بیک تمہاری بھابی نے
حملہ کر دیا ایسا حملہ جو تین سال کی طویل مدت میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے
بڑا ہی دلکش ہوتا اگر ان کی صحت قابل ضامن ہوتی، مگر یہاں تو.....
بڑی مشکل اور ہزار منتوں کے بعد جب بیگم نے اپنے دندان مبارک سے
میرے رخسار کو آزاد کیا تو تکلیف سے میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو ڈبڈبا
آئے، اور غصہ کا عالم نہ پوچھو، مگر اس سنگ بیوہ کی نحیف عورت پر کیا غصہ دکھاتا۔

تمہاری بھابی نے جو تشدد روا رکھی تھیں اور جن کے ہونٹوں پر غصہ
کی وجہ سے ایک نشہ اور کپکپی تھی بپھری شیرنی کی طرح کہا۔" میں دیکھ تو
رہی تھی کہ اکثر جناب والا کی سواری آتے جاتے دس منٹ گھر کے بعد کہاں جایا
کرتی ہے، میری طرف سے بے پرواہی کی خاص وجہ آج معلوم ہو گئی۔
بھلا ہونٹوں پر مسکراہٹ ہر چہرے پہ شادمانی اور حرکات و سکنات میں لاابالی
پن کیوں نہ ہوتا۔ جناب نے میرے لئے ایک سوکن جو تلاش کر لی ہے۔ چھی چھی

کرامت علی کرامت

نقد و نظر

۱۹۶۷ء کی منتخب شاعری ۔ سال نو کا ایک قابل قدر تحفہ ہے جسے

راج نرائن راز اور کمار پاشی جیسے ذہین فن کاروں نے اردو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ حالانکہ ۹۶ صفحات کے اس مختصر مجموعے میں ہر شاعر کی صرف ایک غزل یا نظم شامل ہے پھر بھی اس کے مندرجات کے مطالعہ سے نئی شاعری کی سال بھر کی ادبی مسافت سے متعلق مجموعی طور پر اندازہ ہو جاتا ہے۔ شروع میں راج نرائن راز نے پیش لفظ میں نئی شاعری کو سمجھنے میں جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، ان کے اسباب و علل دریافت کرتے ہوئے انہیں بجا طور پر شاعر کی سطح ذہانت، کم جانے پہچانے حقائق آسانی سے گرفت میں نہ آسکنے والے خیال اور غیر معمولی اختصار کے ساتھ مستعمل استعارات سے وابستہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راج نرائن راز کا پیش لفظ نہایت عالمانہ ہے۔ لیکن اس میں انہوں نے بعض ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن کا تعلق نئی شاعری کے بنیادی فلسفے سے ہے اور جن پر واقعی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس پیش لفظ کو پڑھنے کے بعد نئی شاعری سے متعلق میرے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں :-

(۱) نئے معاشرے کا تنہا شاعر کیا واقعی تنہا ہے ؟

(۲) بین الاقوامی ادب میں جدیدیت کے تحت جو تاثریت، رمزیت، استقبالیت، مکعبیت، پیکریت، اظہاریت، فوق الواقعیت اور وجودیت جیسے ادبی تجربے آئے ہیں، کیا ان سب میں تنہائی، مایوسی، اور بے یقینی کا جذبہ پایا جاتا ہے ؟ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ کون سا وصف ہے جو سب میں مشترک ہے ؟

(۳) کیا نئی شاعری کی بے معنیت سراسر غلط رجحان ہے ؟ اس بے معنیت کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے ؟

(۴) کیا جدید شاعری میں موضوع، الفاظ اور اسلوب کے لئے نثر کی سی سادگی کی ضرورت ہے ؟

(۵) موجودہ انسان کی نظر میں مذہبی قدروں کی اہمیت کیا ہے اور یہ نئی شاعری پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہیں ؟

(۶) کیا اردو کی نئی شاعری موجودہ حیات کے ہر پہلو کی نمائندگی کرتی ہے ؟

میں اپنی معلومات کی روشنی میں ان کے جوابات پیش کر رہا ہوں۔

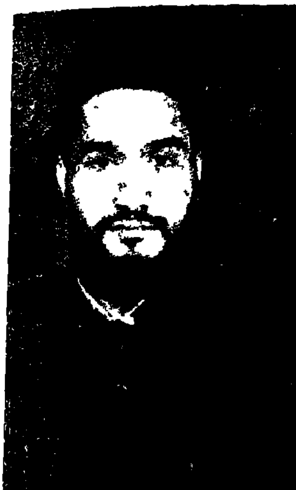
(۱) میری رائے میں نئے معاشرے کا تنہا شاعر واقعی اتنا تنہا نہیں ہے جتنا کہ اردو کی نئی شاعری میں اسے پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کیونکہ جدید شاعر کو اپنے ساتھ "وقت" کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔ بقول ایچ ڈی مراد کہ سائنسی علوم نے جدید شاعر کے ذہن میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وقت ہمارے ہی اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جدید شاعری زمانۂ قدیم کی مشرقی رمزیت (ORIENTAL MYSTICISM) اور زمانۂ وسط کی معرفت (MEDIEVALTHEOLOGY) سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔

(۲) بین الاقوامی ادب میں جدیدیت کے تحت جتنے تجربے ہوئے ہیں، ان میں اس قدر تنوع ہے کہ ان میں قنوطیت بھی پائی جاتی ہے اور رجائیت بھی، روحانیت بھی پائی جاتی ہے اور واقعیت بھی، تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے اور مابعد الطبیعیات بھی۔ لیکن جدید شاعر کے ذہن میں ان متضاد کیفیتوں کے باہمی امتزاج سے جو نفسیاتی پیچیدگی (COMPLEXITY) پیدا ہوتی ہے جدید شاعری اسی پیچیدگی سے عبارت ہے۔ الغرض ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگی کا



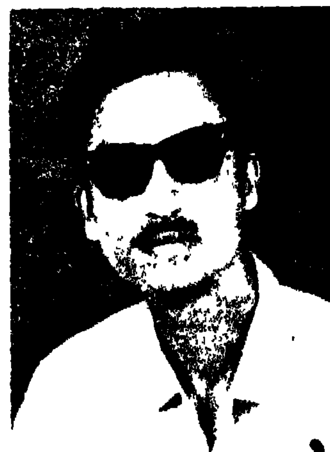


رونق دکنی سیمابی



تسخیر فہمی

اس شمارہ کے چند فنکار



کامل صدیقی لکھنوی



وہاب دانش

اُردو زبان کا منفرد علمی اور ادبی جریدہ

شاخسار

چوتھی جلد — شمارہ ۳

مُدیرِ اعلیٰ
امجد نجمی

ترتیب و تزئین
کرامت علی کرامت — حیدر نایاب

صلاح کار
حرمت الاکرام — محمد انوار
مظہر امام — احمد حسین آزاد

اِس جلد کی قیمت ۷۵ پیسے

سالانہ چندہ کی قیمت ۳ روپے

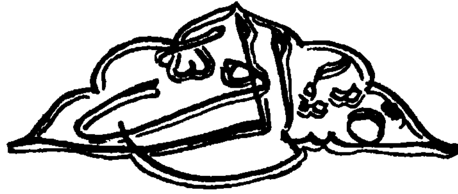
پتے
(۱) مدیر "شاخسار" بخشی بازار، کٹک ۱
(۲) رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک ۱

[نجمی] مدیر، مالک و ناشر نے "ایجوکیشنل پریس" رمنا روڈ، پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر "شاخسار" بخشی بازار کٹک ۱ سے شائع کیا۔

ترتیب

شاخسار ۱۹۶۸ء شمارہ ۳

صفحہ



بھمبئی کے ادبی سانحہ کے بعد ترقی پسندوں اور جدیدیت کے حامیوں کے درمیان آپس میں حملوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوچکا ہے۔ جو روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے اور گتھیاں سلجھنے کی بجائے الجھتی ہی جاتی ہیں۔ یوں تو عام قاری کو اس میں پہلوانوں کی کشتی اور زور آزمائی کا لطف آتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ سلسلہ تخلیقی ذہن کے لئے یقیناً مضر ثابت ہوگا۔ جو فن کار اس تنازعہ میں حصہ لیتے ہیں وہ اگر اپنا قیمتی وقت تخلیقی عمل کے لئے صرف کرتے تو اس سے یقیناً ادب کا بہتر فائدہ ہوتا۔ ادب میں کس دور میں معرکہ آرائیاں نہیں ہوئی ہیں؟ لیکن ہر چیز کا ایک قرینہ ہوتا ہے اور انتہا پسندی چاہے جس طرف سے ہو ہمارے نزدیک قابل مذمت ہے۔

ترقی پسندوں اور جدیدیت کے حامیوں کے درمیان یہ تنازعہ دراصل تنازعہ للبقا ہے جس کی اساس قدرت کے ان قوانین پر قائم ہے جن سے ارتقا کا عمل ظہور میں آتا ہے لیکن ادبی تنازعہ کی شکل کچھ اور ہونی چاہیئے یعنی یہ کہ ایک دوسرے کی ذاتیات پر حملہ کرنے کے بجائے فن کاروں کو بہتر سے بہتر چیز کی تخلیق میں منہمک ہو جانا چاہیئے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر بعض رسائل اس آگ کو اور ہوا دینے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

تو برائے وصل کردن آمدی - نے برائے فصل کردن آمدی

اردو کے ادیبوں کو (چاہے وہ جس نظریہ پر ایقان رکھتے ہوں) ذاتیات میں نہ الجھ کر ٹھوس ادبی خدمات کے لئے خود کو وقف کر دینا چاہیئے۔ اس وقت جبکہ خود اردو زبان کے حقوق کا تحفظ سب سے زیادہ اہم مسئلہ بن گیا ہے محض نظریاتی اختلافات کی بنا پر آپس میں دیواریں کھڑی کرنا کسی طرح مستحسن نہیں۔

کچھ دنوں سے ادبی حلقوں میں مشاعرے کی افادیت زیر بحث رہی ہے۔ اس بحث کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ ہماری جدید شاعری رفتہ رفتہ خارجی آہنگ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اور مشاعروں میں جدید شعراء ترنم والے غزل گو شعراء کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ میرے خیال میں اس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ مشاعرے کا تعلق اردو زبان و ثقافت کے خاص مزاج سے بہت گہرا ہے۔ انگریزی کے ایک شاعر نے اردو کی شاعری کی سحر آفرینی پر رشک کرتے ہوئے کہا تھا کہ مشاعروں کے ذریعہ جس طرح اردو شاعری عوام تک پہنچ پاتی ہے اس طرح انگریزی شاعری نہیں پہنچ پاتی۔ غرضکہ مشاعرے کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اور اگر شاعری کی روح کو

عوام تک پہنچ جانا مقصود ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مشاعرہ بھی اس کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ چونکہ اردو کی نئی شاعری عموماً عوام کے لئے رکھی نہیں جاتی اس لئے نئے شعراء کو مشاعروں میں اپنی ناکامی پر مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ مشاعرے کی جو خوبیاں اور خامیاں ہیں دونوں اظہر من الشمس کے مصداق ہیں۔ مشاعرے کے حامی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کی خامیاں کیا ہیں اس کے باوجود یہ لوگ محض سیاسی مصلحت پسندی کی بنا پر ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ ورنہ یہ بحث آگے نہ بڑھتی اور مشاعرے کے مخالف اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کی خوبیاں کیا ہیں اس ضمن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ قول نقل کرنا چاہوں گا جو انہوں نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا۔

> "اردو شاعری، اس کی روایت اور قواعد و ضوابط کو آج اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس کی محفلیں (مشاعرے) بھی اعتدال سے منحرف ہیں۔ لیکن ان کا اعجاز تو دیکھئے، اردو شاعر کہیں کا ہو کسی قوم اور مذہب یا مسلک سے تعلق رکھتا ہو، دہلی اور لکھنؤ ہی کا ساختہ، پرداختہ یا رہا سہا معلوم ہوگا۔ اس زبان کو جو قبول عام نصیب ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔"

اردو کے مشاعرے مختلف دور میں مختلف قسم کے فرائض انجام دیتے آئے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام میں یہ نوابوں اور جاگیرداروں کی خوشنودی کا باعث رہے۔ آزادی کی تحریک کے دوران مشاعروں نے عوام کے دل میں ایک نیا حوصلہ پیدا کیا۔ موجودہ دور میں۔ مشاعرے قومی یکجہتی کے سلسلے میں بہت اہم فرائض دے سکتے ہیں۔ مثلاً کسی ایک خطے کا شاعر ملک کے کسی دوسرے خطے کے مشاعرے میں مدعو ہو تو وہاں اپنے خیالات سے دوسروں کے ذہن کو منور کر سکتا ہے اور وہاں کی تہذیب و ثقافت سے اپنی شاعری کے لئے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کے ثقافتی امور کی ہمت افزائی ملک کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے سلسلے میں یقیناً ایک نیا اور خوش آئند اقدام ثابت ہوگی۔

کرامت علی کرامت

ایک ضروری اعلان

اس وقت جبکہ کاغذ کی گرانی کے ساتھ ساتھ پوسٹل اخراجات میں کافی اضافہ ہو چکا ہے ہندوستان کے تقریباً ہر رسالے نے اپنی قیمت بڑھادی ہے۔ "شاخسار" کے زرمبادلہ میں ہم نے ابتک اس لئے کوئی اضافہ نہیں کیا تھا کہ "شاخسار" کے خریدار غیر ضروری طور پر زیر بار نہ ہوں لیکن ہم نے بہت سے خریداروں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بالآخر یہ فیصلہ کیا ہے کہ جنوری ۱۹۶۹ء سے "شاخسار" کے صفحات میں کچھ اضافہ کر کے اس کا زر سالانہ پانچ روپیہ کر دیا جائے۔ البتہ اس سے قبل جو احباب خریدار بنیں گے ان سے صرف تین روپیوں میں سال بھر رسالہ پہنچا کرے گا

منیجر

سبط نبی صمیم

پرانی بات

•

تو میرے من کے مندر کی پریم پجارن تھی
ہم دونوں نے اک دن یہ پیمان کیا تھا،
تیرا دکھ، سکھ میرا ہوگا
ہم دونوں اک ساتھ رہیں گے!

•

تیرے پیار میں دنیا کی رنگینی پاکر
میں ان خوابوں کی رنگین محفل تک پہنچا
جو میں نے تنہا دیکھے تھے!

•

تیرے پیار کے ہمراہی تھے
ظلمت کے پوشیدہ بادل
جن میں گھر کر ——
خوابوں کی محفل سے نکل کر، میں تنہا تھا
اور بادل تھے ——!

•

تو مجھ سے کچھ دور کھڑی تھی۔
آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔
بیچ میں بادل سینہ تانے
ہم دونوں کو گھور رہے تھے!

•

جیسے ہم دونوں کا ملنا
بات ہو کچھ انہونی بات —— !!

صبا اکرام

اور اس کے بعد....

تو پھر ایسا لگا مجھ کو
کہ جیسے دونوں دیواروں نے
مجھ کو کس کے دابا ہو
مری رگ رگ میں
جو اک درد پنہاں تھا
کئی صدیوں سے
اتنا بڑھ گیا جیسے
کہ بس اب ختم ہی ہو جائے گی ہر شئے
—— یہ آنکھوں کے سیہ روزن
یہ خون اور گوشت کا مجلس
حرارت کی سرکتی، بھاگتی ندی
تو پھر ایسا لگا مجھ کو
کہ جیسے سیکڑوں قطرے لہو کے
یک بیک
دل کی کمان سے چھوٹ کر
گم ہو گئے، گویا
کسی مدہوش وادی میں
اور اس کے بعد
—— اور اس کے بعد
پہیلی تیرگی ہر سمت چھائی تھی
رگوں میں درد تھک کر سو چکا تھا!

•

شمیم نوید

شہر گہی

کیا ہو ؟
کیوں یہ اس شہر کی چاندنی بجھ گئی ۔؟
کیوں یہاں روشنی ہی نہیں ؟
چاندنی ہو نہ ہو
روشنی ہو نہ ہو
کوئی خوشبو تو ہو
کوئی آہٹ تو ہو
کیا یہاں مجھ سے پہلے کوئی اور آیا نہیں ۔؟
کیا خبر !
ہاں مگر اب یہاں دور تک
نیم جاں ساعتوں کا دھندلکا ہے اور سوگ ہے
سوگ اور خامشی
خامشی اور میں
مگر میں بھی زندہ نہیں

■ ■ ■

شاہد ماہلی

"نروان"

یگ بیتا ہے
اک بوڑھے پیپل کے نیچے
گوتم کو نروان ملا تھا
چنتاؤں سے مکتی ملی تھی
بدھی ملی تھی، گیان ملا تھا
جانے کب سے
چنتاؤں کا بوجھ اٹھائے
بھٹک رہا ہوں
اک دن لوگو !
یہیں کسی پیپل کے نیچے
مجھ کو بھی نروان ملے گا
چنتاؤں سے مکتی ملے گی
بدھی ملے گی، گیان ملے گا

■ ■ ■

ب الرحمٰن کوثر

آئینہ

پ نے توڑ دیا آئینہ
ں سے یہ بات سمجھ میں آئی
ب بینی کی ہے کچھ آپ کو عادت شائد
نِ غیر پہ آنے ہیں نظر داغِ سیہ
ت پر آپ کو کچھ ناز بھی ہے

ھ کچھ سوچ کے میں نے اے دوست!
ر دیا سامنے اک آئینہ
نے کیا بات کہی تھی اُس نے
بھنجلا گئے اور توڑ دیا آئینہ
— خود اپنا بھرم کھول دیا

●●●

عزیز الرحمٰن بھاگل پوری

"باندھ"

دریا کے چوڑے سینے پر
باندھ بنا کر
ہم دونوں نے
اِک دن
جن بپھری موجوں کے رُخ کو ہنس کر پھیر دیا تھا
آج وہ بپھری موجیں پھر سے
میرے گھر تیرے آنگن میں
ناچ رہی ہیں
دونوں اس میں ڈوب رہے ہیں
باندھ وہ شائد ٹوٹ گیا ہے

●●●

نزار غازی پوری

زندگی

ٹمٹماتا، کپکپاتا اک دیا ہے
سامنے اک طاق پر
جیسے ہو حالت کسی مفلوج کی
اور کمرے میں ہر اک سوا لگنی کھینچی ہوئی
اس طرح، جیسے کہ ہو مکڑی کا جال
اک طرف دیوار کی اک کیل پر لٹکی ہوئی
ایک میلی سی قمیص
پاس ہی اک لالٹین
جس کا شیشہ ٹوٹ کر باہر کے ٹب میں جا پڑا ہے!
ایسے وحشت ناک سے ماحول میں
ناگہاں ہوتی ہے جب آہٹ کوئی
چونک اٹھتی ہے مری روح حزیں
کانپ جاتا ہے مرا ہر رونگٹا
اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ خود کمرہ مرا
دوڑتا ہے مجھ کو کھانے کے لئے
ڈر کے مارے منہ چھپا لیتا ہوں چادر تان کر
اور بے ادوان کی اک کھاٹ پر لیٹا ہوا
سوچتا رہتا ہوں میں
'زندگی'
کیا اسی کا نام ہے؟؟

●●●

وسیم شعلہ

آس

جھلستا بدن، تلملاتی زباں
بہر سمت اک آگ اگلتا سا منظر
مری روح پر بے بسی چھا گئی ہے
رگ و پے میں خون منجمد ہو چکا ہے
ستارے نگاہوں کے دھندلا رہے ہیں
منظم سیاہی مجھے ڈس چکی ہے
مری زندگی کے کھنڈر میں
جو آواز پہنچے
تو وہ بھی سیہ تیرگی سے ہراساں
پلٹ کر لرزتی ہوئی بھاگ آئے
مگر! ایک دھندلی سی امید پر
جی رہا ہوں
کہ شاید!
کوئی صور پھونکے
کہ شاید یہاں پھر سے میری رگ و پے میں خون
دوڑ جائے!

●●

وہاب دانش

"چاندنی اُڑ ساتھی"

جدید میزان پر

زیرِ نظر مقالے میں پیش لفظ کے اقتباس سے مضمون کے لئے مواد فراہم کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ راج نرائن راز کی قبول کردہ سچائیوں کی روشنی میں اس کی تخلیقات کو پرکھا جائے تاکہ جس بات کا دعوٰی پیش لفظ میں کیا گیا ہے۔ وہ کہاں تک صداقت پر مبنی ہے اور خود اپنی بنائی ہوئی کسوٹی پر وہ کس حد تک کھرا ثابت ہوتا ہے، اس کا علم ہو سکے۔

اقتباس اول :-

"ہر حادثے اور واقعے کا ردِ عمل ہر شخص پر مختلف ہوتا ہے۔ مختلف ردِ عمل سے انفرادی فکر و نظر سے پرانی سچائی کے نئے پہلو اجاگر ہو سکتے ہیں۔ ان نئے پہلوؤں کو واقعی نئے زاویئے سے دیکھنا اور پھر مؤثر ڈھنگ سے بیان کرنا، پرانی سچائیوں کو نیا بنا دیتا ہے۔ میں ایسے تخلیقی لمحے کو وقت کا حاصل سمجھتا ہوں"

حادثہ اور پھر اس کا ردِ عمل۔ چوٹ کے بعد تلملاہٹ۔ بے چینی۔ یہاں پر ایک پرانی سچائی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ شاعر چونکہ سماج کا ذی حس فرد ہوتا ہے۔ اس لئے ہر لمحہ اس کے لئے رنج و حسرت، فنا و بقا کا پیامی ہوتا ہے۔ مثلاً پھول جیسے چہروں اور پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹ پر وقت کی جبری گرد اور سفاک دھول کی دبیز تہہ دیکھنے کے بعد جو ردِ عمل ہوتا ہے۔ اس کی چبھن دل کے آر پار ہو جاتی ہے اور ایک بے پناہ خواہش انگڑائی لیتی ہے کہ تیز و تند جھڑی ہی لگ جائے تاکہ ساری گرد اور کثافت ڈھل جائے۔ یا پھر طوفان ہی آ جائے کہ یہ گرد اپنی گرمی جیپ کے ساتھ پاش پاش ہو جائے اور محرومی، یاس اور ناامیدی سجانے والے یہ لمحے، نگاہوں میں عذاب گھولنے کے عمل سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جائیں۔

راز نے اس پرانی سچائی کو نظم "ردِ عمل" میں اپنی انفرادی فکر و نظر کے زاویئے سے دیکھا ہے۔ تاکہ پرانی بات، نئی سچائی میں بدل جائے اور تخلیقی لمحہ وقت کا حاصل بن جائے"

نظم "ردِ عمل" جو نہایت نرم و نازک لہجے میں کہی گئی ہے۔ اظہار و بیان کی اچھوتی خوبصورتی کے ساتھ سبک رفتار ندی کی طرح بہتی ہے۔ ابلاغ کی بلندی یہ ہے کہ نری خطابت کی حدود سے نکل کر ایک ذہن اپنا تأثر دوسرے ذہن تک پورے خلوص اور سادگی کے ساتھ منتقل کر دے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کے اندر کا "دہ" جو نہایت مہذب ہے شاعر کی سادگی اور سچائی کی لہروں میں جھوم رہا ہے۔

"پھول پتوں پہ گرد تہہ در تہہ
دیکھ کر آنکھ بھیگ جاتی ہے
دل میں ایک پھانس سی کھٹکتی ہے
میری خواہش تھی، تیز بارش سے
گرد دُھل جائے، پھول پتوں کی
اور اُن پر نکھار آ جائے

کوئی صورت اگر نہیں اس کی
میری خواہش ہے، تیز طوفاں کا
تند، سفاک ایک ہی جھونکا
لے اڑے تاکہ، پھول پتوں کو
کوئی صورت نجات کی نکلے
جو نگہ کا عذاب ہے وہ مٹے

پہلا مصرعہ ایک حادثہ ہے۔ ایک پرانی سچائی
دوسرا بند۔ ایک ردعمل، جو نازک احساسات کی آنچ ہے۔
دوسرے سے تیسرے بند کے عروج تک شاعر کے دل میں ایک
ایسی خواہش جو ردِعمل کی پہلی منزل ہے۔ جنم لیتی ہے جس کی
خوبی صلح جوئی اور غیر تخریبی جذبے کے اظہار پر مبنی ہے۔ اور
اگر اس محسن جذبے کی تکمیل ناممکن ہے، تو پھر تند و تیز جھونکا
ہی علاج بن سکتا ہے۔ یہاں تک آتے آتے راز کی اوج کا دھارا
خاص قریب کی ادبی تحریک کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ایک خوبصورت
نظم کا اختتام اس جگہ پر ہو جاتا ہے۔ جو کسی طرح بھی وقت کا
حاصل نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کسی بھی حادثے کا ردعمل وہی ہو
سکتا ہے، جو آپ سے قبل والی نسل کے شعری سرمائے کا
طرۂ امتیاز رہا ہے، تو پھر اس تحریک سے بچھڑ کر نئی راہ نکالنے
کی ضرورت ہی کیا ہے؟

دوسرا اقتباس:

" اجتماعی یا قومی سطح پر آج ہم دورِ ابتلا سے گذر رہے
ہیں۔ اس ابتلا کی پرچھائیاں ہماری زندگی کے سبھی شعبوں پر
پڑ رہی ہیں۔ میں نے ان پرچھائیوں کو سامنے سے نہیں ایک
رخ سے دیکھا ہے اور تاثرات و خصائص کو تاثرات کی
شکل میں نظموں میں ڈھالا ہے۔ تاہم خوشیوں کی خواہش میں
میں نے سہل پسندی اور خوش فہمی کو اپنا شعار نہیں بنایا۔
دکھوں کو میں نے مظلوموں کی طرح جھیلا، دیکھا نہیں ہے
اس لئے میرا تعلق جذباتی نہیں، فکری ہے۔"

اس اقتباس کے دو حصے ہیں۔ پہلا یہ کہ اجتماعی
اور قومی سطح پر آج ہم دورِ ابتلا سے گذر رہے ہیں۔ دوسرا
یہ کہ اس ابتلا کو ہم نے مظلوموں کی طرح جھیلا ہے۔ دیکھا
نہیں ہے۔ اس لئے ہمارا تعلق جذباتی نہیں، فکری ہے۔

یہاں جس یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آج زندگی
کے ہر شعبے میں درد ہی درد، اور پرچھائیاں ہی پرچھائیاں ہیں
اس کی جھلک دیکھنے کے لئے اکثر اس نے دو ایسے آئینوں اور
چہروں کی ضرورت محسوس کی ہے، جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ پہلا
آئینہ ہے دوست کا چہرہ۔ دوسرا محبوب کی آنکھیں۔ دو
ہر لمحہ ان کھائیوں اور جھیلوں میں جھانکتا ہے اور سوال بھری
نگاہوں سے پوچھتا ہے " بتا میری آنکھوں میں تو نے کیا دیکھا ہے؟"
جس کی مثال مندرجہ ذیل نظم " تضاد" میں یوں ملتی ہے۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا
دکھ کی نگری دیکھی ہے کیا؟
بولا: آپ کے چہرے پر یہ
کالے بادل کا سایہ ہے!
آپ کی ان چپ چپ آنکھوں میں
ایک اداس نگر سا کیا ہے؟
پوچھا اپنی محبوبہ سے
تم نے کبھی دیکھی ہے کیا؟
قوس مسرت کی ست رنگی
ہنس کر بولی ہاں دیکھی ہے
اور اس نے اپنی آنکھوں کو
گاڑ دیا میرے چہرے پر
کھو گئی وہ میری آنکھوں میں

اس نظم میں شاعر آج کے سماج میں پھیلے ہوئے ڈھلتے
سائے، سیاہیوں سے لدی دکھ بھری پرچھائیوں کو جھیل
رہا ہے اور اپنے قریب، اردگرد، زرد چہروں پہ تلخ خارجی
ہونے کا تسلط دیکھ کر یہ محسوس کئے بنا نہیں رہ سکا ہے کہ
صرف وہی اسیرِ غم نہیں بلکہ اس کی "وہ" بھی اسی کرب میں [illegible]

مبتلا ہے۔ ایک خلیج دوسرے خلیج کے سامنے کھڑی ہو کر کہتی
کہ اب گہرائیوں میں ریت ہی ریت ہیں، خوشی کی کوئی موج
ں مسرت کا کوئی کنول نہیں۔

مندرجہ ذیل نظموں میں راز نے اندرونی تہہ در تہہ
وں کو جس کی پوروں سے چھو کر دیکھا گیا ہے اور سچائی بیان
نے میں جس بھولپن کا سہارا لیا ہے اس سے بہت ساری
ہ حقیقتوں کو، جو پچھلی کئی صدیوں سے ایک تسلسل کے
تھ آج ہمیں گھیرے میں لئے ہوئی ہیں۔ احاطہ کر لیا ہے۔
۔ پسپائی، فیصلہ، بے بسی، کھاری جھیل اور یاد میں جس
کامی، سرگوشی اور مدھم لب و لہجے میں شکایت کی گئی ہے
کچھ اسی کا حصہ ہے۔ مگر کہیں کہیں ان نظموں میں یہ بھی محسوس
ہے کہ نثر کی زبان سے بے حد قربت نے اس اثر کو زائل کر
جس سے قاری کا ذہن مستور گرہوں کو کھولنے کا کام لیتا ہے۔

تیسرا اقتباس:

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ صنعت کاری اور شہری زندگی
ن کی تنہائی اور سائنسی ترقی موت سے خوف کا سبب ہے۔
یہ تمام امور مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ اول تو ہمارے یہاں
ت کاری اور شہری زندگی کی وہ سطح پیدا نہیں ہوئی۔ جس پر
۔ انسان دوسرے انسان سے بیگانہ ہو جائے۔ پھر جس
ی انتشار کا ذکر ہم بار بار کرتے ہیں ہمارے آس پاس
بھی لوگ اس ثقافتی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہمارے
رواج، دن تہوار اور میلے ٹھیلے اس کی اچھی مثال ہے"۔

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ذیل کی نظم "رات
خوشبو" کو پڑھنے کے بعد جدید شاعری پر عائد کردہ اس الزام
ت حد تک ازالہ ہو جاتا ہے کہ آج کی شاعری تنہائی زدگی
یوس کن مستقبل کی ترجمان ہے۔ ممکن ہے چند شعرا جدید
اتھ یہ الزام بہت حد تک صحیح ہو۔ مگر کم از کم راز کی
ات میں خواہ مخواہ کی ذہنی گھٹن کی مثال نہیں ملتی۔ زندگی
ہوئی تنہائی کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا کم سے کم اس نظم کو
پڑھنے کے بعد تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ راز کی تنہائی کی حیثیت
میں ہمہ گیر درد سے مماثلت رکھتی ہے۔

کھول کے شب نے بند قبا
اپنا دامن پھیلایا
ایک اندھیرا سا چھایا
زرد شرارے جیسے پھول
تیرگی میں افسردہ سے تھے
گم سم تھے کچھ پیڑ اور پہاڑ
چمپا، گیندا اور گلاب
بوٹے، پودے، ننھی گھاس
جنگل پر تھا رات کا راج
لیکن کچھ ہے ایسی بات
شب کی ردا چھوٹی نکلی
اس کی زد سے باہر تھی
خوشبو رات کی رانی تھی

آج جہاں شہروں کے ہجوم میں فرد تنہا ہے۔ بھیڑ میں تنہائی
کا عالم ہے اور ہر وقت آدمی کسی انجانے، ان دیکھے حادثے
سے کچل کر مر جانے کے خوف سے پیلا ہے۔ وہاں راز کو رات
کی آمد، سیاہی کی یلغار اور اندھیرے دامن کے پھیلاؤ کے
باوجود تنہائی کا احساس پریشان نہیں کرتا، بلکہ وہ ایک
(seer) کی حیثیت سے تمام چیزوں کو دیکھتا ہے۔

مثلاً زرد شراروں کو جو پھول سے ہیں، افسردگی میں لپٹے
ہیں۔ گم سم کھڑے پہاڑ، چپ چاپ درخت، چمپا، گیندا اور
گلاب کے پیلے اور لال پھول، پودے، بوٹے، ننھی گھاس،
سبھوں پر رات کا تسلط ہے۔ سارا جنگل رات کی عملداری میں
ہے۔ رات کی اس بھیانک تاریکی اور مہیب سناٹے میں بھی
شاعر اداس اور مغموم نہیں، خوف زدہ اور ہراساں نہیں۔ کیونکہ
اس کے وجود پر ایک ایسی خوشبو سایہ فگن ہے، جس کے اثر سے
اس کا ذہن سرشار رہتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ رات کا جادو

لاکھ گنا سہی، خوشبو پر اس کا قبضہ ناممکن ہے۔ قائم رہنے اور ہمیشہ غالب رہنے والی شئے بہرحال خوشبو ہے۔ رات اور خوشبو جو علامتی مضمون میں استعمال کئے گئے ہیں اس کی وسعت میں آج کل نا امیدی اور امید کے سارے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں اور شاید اسی لئے اس نے دعویٰ کیا ہے "مجھے یہ تمام امور مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ "جنگل پر تھا رات کا راج" کے بعد بڑی آسانی سے راز ایک ایسی فضا ہموار کر سکتا تھا، جہاں سے فرد کی تنہائی، اکیلے پن اور مایوسی کا عمیق رچاؤ شروع ہوتا ہے جس کی سنسان سرحد خاموش کی اندھی فصیلوں سے جا ملتی ہے۔ مگر چونکہ وہ خود اس معاملے میں بے حد صاف گو واقع ہوا ہے۔ اس لئے رات کی نراجیت بھی اسے مایوس نہیں کر پاتی اور ایک زندگی بخش، امید افزا اور یقین پرور وجود کا سہارا لے کر آگے بڑھ کر وہ یہ کہتا ہے " رات کی چادر بالکل جھوٹی " خوشبو (امید) کو وہ ڈھک کر زائل نہیں کر سکتی۔ خوشبو جو اس کے وجود کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ رکھتی ہے۔ یہی اس کی رفیق تنہائی ہے۔ جو اُسے تنہائی زدگی کا شکار بننے سے روکتی ہے اور یہی خوشبو کوندا بن کر نظم "عرفان" میں نمودار ہوتی ہے :

پھیل گیا میری آنکھوں میں
سَو راتوں کا گھور اندھیرا
اور مجھے محسوس ہوا یوں
گھور اندھیرے کے سینے میں
میں بجلی کا اِک کوندا ہوں

سَو راتوں کے اندھیروں کے بوجھ اور دبیز پردوں پر چمکتا ہوا سورج کا ننھا سا ٹکڑا ۱/۱۰۰۰۰۰۰ حصہ جو کسی بھی نوک پر چمکتا ہے۔ وہی راز کی تنہا بھی اور اندھیرے میں بجلی کا کوندا ہے، جو بیری کی شنن اور تاریکی وقتی ہے۔ اس بے پناہ طاقت اور اس کے سہارے وہ آج کی بے چارگی، بے یقینی، گھٹن اور تنہائی کے "مصنوعی امور" کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ ہے۔ شہروں کے ہجوم اور انجان بھیڑ کا ذکر اس کے یہاں نہیں ملتا۔ "کاش"

ایک نظم "نیا سال" "استعجاب" میں اس کی اپنی پہچان کے متحرک ہونے کا احساس سان پر چڑھا ہوا ہے۔

چوتھا اقتباس:

میری نظموں میں ایک مستقل رعنائی ہے۔ لیکن یہ رعنائی کسی شخص کے تصور سے نہیں۔ تاہم اس کے معنی یہ نہیں کہ میں جو آفاقی جذبے سے یکسر عاری ہوں۔ میرے لئے اس نوع کی نظم ہیں۔ دوم ان کی نوعیت مختلف ہے۔ ان میں یاد ہے، یار ہے، نہ ناز و نیاز، نہ وصل کی لذت نہ جدائی کے نوحے۔"

اس اقتباس کی روشنی میں، میں خود چاہوں گا کہ راز، اُن ہی دونوں نظموں کی مثال پیش کروں، جس کی طرف اس نے خود قاری کا ذہن مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔

پہلی نظم :— میں اور تو ....

میرا اور تمہارا رشتہ
رشتہ ہو ندی ساگر کا
کاش کبھی ایسا بھی ہوتا
لیکن کیا انکار ہو اس سے
ایک بھیانک سچائی ہے
میں نہ ہوں ندی، تم نہ ساگر
میری ہستی نار ہو جیسے
نازک مکڑی کے جالے کا
کافی جس کو اک جھونکا ہے
تم شبنم کا وہ قطرہ ہو
جو سورج کی پہلی کرن سے
اپنی ہستی کھو بیٹھے گا

اس نظم کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن کو ایک لطیف اشارہ ملتا ہے۔ وہ یہ کہ اب رومان کے انقلاب تک اور ازل سے پرچم تک کی تگ و دو کا زمانہ لد چکا ہے اور ایک ایسی عالمگیر و آفاقی تمنا کروٹیں لے رہی ہے کہ میرا اور تمہارا رشتہ ندی اور ساگر کا سا ہو جائے۔ لیکن یہ ایک بھیانک سچائی ہے

ے افکار مشکل ہے کہ نہ تو میں ندی ہوں اور نہ تم ساگر۔ میری
ری کی نزاکت تو دیکھو کہ مکڑی کے جالے کا گمان ہوتا ہے۔ اور
ہے۔ تم اپنی ساری رعنائیوں، جلوہ سامانیوں اور خوبصورتیوں
باوجود ایک قطرۂ شبنم ہی ہو — جیسے سورج کی پہلی کرن
ملا دے گی۔

دوسری نظم بھی قریب قریب اسی قبیل کی ہے۔ محبوب
اپنے وجود سے الگ رکھ کر سوچنے اور محض تصورات
دیواروں پر کمندیں ڈالنے کی سطح تک اترنا اسے گوارا
نہیں اور شاید یہی وہ جذبۂ عشق ہے، جو آفاقیت سے
سر خالی نہیں۔ اور جس کی جڑیں بہت دور تک ماضی، حال،
ور مستقبل تک سرایت کر گئی ہیں۔ ان مضمون میں راز نے
بہت بلند ہو کر عشق کو برتا ہے کیونکہ اس کی غیر مرئی محبوب
بھی ہے "تنہائیوں کی سرگوشی" "پل پل صحراؤں کا شہر" میں
کبھی" ایک نظم"، دو کیفیتیں، بے موسم گل ..... میں ملتی ہے
اور یہی مقام ہے، جہاں سے راز کی اپنی انفرادیت کی دھیم
لکیر ابھرتی ہے۔ یعنی غیر ذی روح حقیقتوں کو زندہ جاوید
پیکے بدن کا روپ دے کر پیار کرنے کا انداز۔ اور عشق میں
وہ والہانہ پن، جو خالص جسمانی پیکروں سے منسلک ہوا کرتا ہے۔

اب آخر میں "سنے" نام سے شمس الرحمان فاروقی کے
پیش لفظ سے مندرجہ ذیل اقتباس نقل کر کے اتنی سی بات کہوں گا
۔ راز کی اپنی آواز اس لئے بھی بہت صاف اور غیر مبہم ہے
اس کا اندازِ بیان بہت سلجھا ہوا ہے، اس حد تک کہ کبھی کبھی
می نثر کا دھوکا ہوتا ہے — اور :

"جب شاعر اپنے دور سے بہت حد تک ہم آہنگ ہوتا
ہے، تو اس کی زبان اپنے عہد کی زبان سے بہت دور نہیں ہوتی
یسے زمانے میں شاعر نسبتاً زیادہ ابلاغ کا اہل ہوتا ہے اور
یل کی مسرت اس کے شعر کا موضوع ہوتا ہے۔ ایسے عہد میں شاعر
زبانی اور ذہنی مسائل کو الجھانے سے زیادہ سلجھانے کا کام انجام دیتا ہے"

ضمان اللہ ندیم

عاجزؔ قادری

(تحقیق)

عاجزؔ قادری، صوبہ بہار ضلع دربھنگہ کی ایک مردم خیز بستی موضع کوروئی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام شمس الدین حسین عاجزؔ تخلص اور "ملّا" لقب آپ کو دیا گیا۔ اس کا سبب خود ہی ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ جو سید شاہ ضیف اللہ[1] قادری قدس سرہٗ کی شان میں ہے ؎

السلام اے شاہ ضیف اللہ نام
اے خدائے پاک کے مہماں سلام
آپ شفقت سے مجھے دیتے نشاں
گاہ تبریزی کبھے ملّا میاں
میرے شفقت کرنے والے السلام
میرے ملّا کہنے والا السلام
شائقِ اشغالِ شب خیزی سلام
کہنے والے مجھ کو تبریزی سلام

عاجزؔ کی پیدائش کب ہوئی اس کی صحیح صحیح نشاندہی تو نہیں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ہنوز بے حد تلاش و جستجو کے بعد کوئی ایسی تحریر نہیں ملی۔ جس سے عاجزؔ کے سن ولادت پر روشنی ڈالی جاسکے۔ یوں تو عاجزؔ نے اپنے خاندانی حالات کا ایک تذکرہ بھی فارسی نثر میں مرتب کیا ہے۔ لیکن اپنے حالات کے ضمن میں کہیں بھی انہوں نے اپنی تاریخ پیدائش نہیں لکھی حالانکہ اور جن لوگوں کے حالات اس تذکرے میں ہیں۔ ان کی تاریخہائے پیدائش قلم بند کرنے کا حتی الامکان التزام کیا گیا ہے۔ یوں تو ایک شعر میں بھی انہوں نے اپنی عمر بتائی ہے۔ لیکن یہ نہ پتہ چل سکا کہ یہ شعر انہوں نے کس سن میں کہا ہے۔ پھر بھی اس کی روشنی میں کسی حد تک ان کے سال پیدائش کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ذیل میں وہ شعر نقل کیا جاسکتا ہے: ؎

ز عمر بگذشت شصت و پنجم دریغ دردا تراندیدم
اگر بہ بینم بسجدہ افتم بنقشِ قدمت بہ محمد

یہ شعر نہایت صاف و صریح ہے اور اس سے بخوبی ان کے سال پیدائش کا پتہ چل سکتا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس شعر کا سن تخلیق ہی معلوم نہیں ہے۔ اس لئے ہماری خاطر خواہ رہنمائی ناتمام ہے۔ مگر عاجزؔ کے خلف اصغر[2] مولانا محمد افضال الرحمن

---

1. موصوف، عاجزؔ کے پیر حضرت سید شاہ منصور علی رزاقی القادریؒ کے خالہ زاد بھائی تھے اور عاجزؔ سے ان کے بڑے گہرے مراسم و روابط تھے۔ ندیم
2. مولانا موصوف عاجزؔ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور ...

بیان ہے کہ "وہ (عاجز) اس شعر کی تخلیق کے بعد آٹھ برس بد تک زندہ رہے"[1] اب ذرا ہم اس بیان کی روشنی میں عاجز کی تاریخ پیدائش کی تعیین کریں۔ عاجز کی وفات ۱۳۳۹ھ میں اپنے مولد و مسکن کوروٹی میں ہوئی[2]۔ ان کے سن وفات کا پتہ مولانا افضال الرحمٰن شمسی کی تاریخ وفات[3] سے چلتا ہے۔

از یں جہاں رفت بدار البقا آں صاحب حال

۱۳ ھ ۳۹

اور اس کی تصدیق عاجز کے خلف اکبر مولانا مفتی محمد فیض الرحمٰن کے قطعۂ تاریخ وفات سے بھی ہوتی ہے۔ جو سرمز ار ... بنہ ہے اور ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

حضرۃ والد کہ بُد اہلِ خدا

از ہمہ بیگانہ با حق آشنا

اختر برج صفا و شمس دیں

از وجودش بود در عالم ضیا

در شب جمعہ ربیع آخریں

بود پنجم کاں شدہ از ما جدا

در پئے سالِ فنا چوں فیض شد

تا بماند یاد تاریخ قضا

از سر حسرت ندا آمد ز دل

از جہاں فرمود رحلت رہنما

۱۳۳۱ھ + ۸ = ۱۳۳۹

اگر مولانا محمد افضال الرحمٰن شمسی کے مذکورہ بالا بیان وہ اس شعر کی تخلیق ... الخ کو صحیح مان لیا جائے، تو اس حساب سے اس شعر "ز عمر بگذشت شصت و پنجم .... الخ" کا سال تعلق ۱۳۳۱ھ ہجری ہی قرار پاتا ہے اور عاجز کا سن پیدائش ۱۲۶۶ھ قرار پاتا ہے۔

عاجز کی پیدائش ایک رئیس و مرفہ الحال گھرانے میں ہوئی آپ کے والد کا نام شیخ پیر بخش تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا کر ملتا ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ دیارِ عرب سے لشکر اسلامی کے ساتھ واردِ ہند ہوئے اور دکن میں اقامت اختیار کی۔ عاجز کے مورث اعلیٰ شیخ اختیار خاں کے نام سے موسوم تھے۔ خاں کا خطاب بادشاہ وقت سے ملا تھا۔ تین چار پشتوں تک آپ کا خاندان مراسم خسروانہ سے بہرہ ور ہوتا رہا اور شاہانِ وقت نے ان کی جاگیر اور ان کے خطاب کو برقرار رکھا۔ کچھ مدت تک ان کا خاندان دکن میں اقامت گزیں رہا۔ بعدہٗ اپنی جاگیر کے انتظام کے سلسلے میں اپنی جاگیر کے صدر مقام موضع کوروٹی میں آکر آباد ہوا۔ عاجز شیخ اختیار خاں کی گیارہویں پشت میں ہیں آپ کا خانوادہ بہر صورت ممتاز رہا اور اس میں ہمیشہ علم و فضل اور اوج و اقبال کا دور دورہ رہا[4]۔

---

[4] "تذکرۂ خاندانی" قلمی و غیر مطبوعہ، مؤلفہ عاجز از ص ۶ تا ص ۹۔ ندیم

بقیہ حاشیہ[5]

[5] اخلاق حسنہ، نیک نفسی، صبر و حلم، انکساری و عاجزی، متانت و سنجیدگی، تقویٰ و پرہیزگاری اور علم دوستی و علم پروری کی وجہ سے مقبولِ عوام و خواص ہیں اور صحیح معنوں میں اپنے والد کے صحیح جانشین ہیں۔ پیشِ نظر دیوان عاجز انہیں کی عنایتوں سے اس ہیچ مداں کو ملا ہے۔ آپ نے اپنے والد کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب بھی "غزۂ صبیحین" کے نام سے کیا ہے۔ یہ انتخاب چند دشواریوں کی بنا پر زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا ہے۔ مولانا کو تصنیف و تالیف سے گہرا شغف ہے۔ اس مضمون کے سلسلے میں میں نے مولانا سے کافی استفادہ کیا ہے۔ جس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔ ندیم

[1] [2] [3] "غزۂ صبیحین" مرتبہ مولانا افضال الرحمٰن شمسی خلف عاجز۔ قلمی و غیر مطبوعہ ——— مولانا شمسی ایک عالم باعمل ہیں موصوف عاجز کے پوتے صاحبزادے ہیں۔ ان دنوں مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں مدرس و مفتی کے عہدے پر متمکن ہیں۔ آپ کو شاعری کا شوق اپنے والد سے میراث میں ملا ہے۔ آپ کے اقوال و افعال سے بھی اس مضمون کی ترتیب میں کافی مدد ملی ہے۔ جس کے لئے مولانا موصوف کا بجد ممنون و شکر گزار ہوں۔ ندیم

عاجزؔ کی تعلیم و تربیت شروع میں اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں اپنے وطن میں ہی اس زمانے کے بعض اہل علم و فضل کے زیر نگرانی ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب امراء و رؤساء اور اہل علم کے یہاں فارسی زبان و ادب کا بول بالا تھا۔ یوں تو نخل اردو بھی برگ و بار لا چکا تھا اور لوگ اس سے متمتع بھی ہو رہے تھے۔ لیکن اہل علم فارسی زبان میں ہی لکھنا پڑھنا باعث فخر و مباہات خیال کرتے تھے اور کسی دوسری زبان کو لائق اعتنا تصور نہ کرتے تھے۔ چنانچہ عاجزؔ کی ابتدائی تعلیم بھی فارسی ہی میں ہوئی۔ ساتھ ہی انہوں نے عربی و دینیات کی تعلیم بھی حاصل کی اور تینوں فنون میں خوب مہارت بہم پہنچائی بعد ازاں قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ مگر خدا کو انہیں کچھ اور ہی بنانا منظور تھا۔ اس لئے ان کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور یہ قانون کے امتحان میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئے اور اس طرح خدائے تعالیٰ نے انہیں اس پیشے سے بچا لیا۔

عاجزؔ نے ۲۷ صفر المظفر ۱۲۹۶ھ، شب پنجشنبہ، بعد نماز عشا عمدۃ الصالحین، قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین حضرت سید شاہ منصور علی رزاقی القادری بانسوی قدس سرہ العزیز کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ حضرۃ ممدوح حضرت سید شاہ عبد الرزاق بانسوی بے کمر رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ کامل و صوفی عامل کے خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا خانوادہ ہمیشہ علم و فضل کا گہوارہ رہا۔ حضرت عبد الرزاق بے کمرؒ کے فیوض و برکات روحانی سے آج بھی دنیا منور ہے حضرت منصور علی قدس سرہٗ بھی اپنے دور کے ممتاز و کامل صوفیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ کا مزار مبارک آج بھی ملکی چک (دربھنگہ) میں مرجع خلائق ہے۔ یوں تو عاجزؔ خود ہی صلح کل، تقویٰ و طہارت، صبر و حلم، قناعت و توکل اور متانت و سنجیدگی وغیرہ اخلاق حسنہ سے آراستہ تھے۔ سید شاہ منصور علیؒ جیسے صوفی و مرشد کامل کی صحبت و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اس قطرے کو گہر بنا دیا۔ اب تک تو علوم ظاہری سے ہی متصف تھے۔ اب علوم باطنی کے رموز و اسرار سے واقف ہو گئے۔ عاجزؔ نے عمر بھر نامساعدات زمانہ اور شدائد روزگار کا مقابلہ بڑی ہی ہمت و پامردی سے کیا اور کبھی حالات نامساعدت کے شاکی نہ ہوئے۔ مخالفین اور دشمنوں نے ایذا رسانی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن ان کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہ ہوئی اور کبھی صبر و شکیب کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ دوستوں اور عزیزوں سے برابر لطف و شفقت فرماتے۔ تمام عمر صلح و آشتی ان کا شیوہ رہا۔ تا حیات انہیں اوصاف کے حامل رہے۔ چنانچہ اپنی اس روش کا تذکرہ خود ہی ایک شعر میں کیا ہے: ؎

نہ با کسے داشت صلح و جنگے کہ بود بکسیں قہر مولا

نثار فرما تو رحمتِ خود بجان و جسم و مقام عاجزؔ

چوں کہ عاجزؔ کی طبیعت کو ادب سے فطری مناسبت تھی۔ اس لئے ان کا دل بچپن سے ہی ادھر مائل تھا۔ ان کا اس میلان طبع نے اشہب ذوق کے لئے تازیانے کا کام کیا اور ان کے دل میں ادب کے مطالعہ کی خواہش پیدا ہوا تھوڑی ہی مدت میں انہوں نے مطالعہ سے کافی استعداد و صلاحیت بہم پہنچائی اور ان کی طباعی و ذہانت کے جوہر کھلنے لگے۔ زبان و ادب کے گہرے مطالعہ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ تصوف نے اس سونے کو اور جلا بخشی اور زبان و ادب کا صحیح مذاق ان میں پیدا کر دیا۔ عروس شعر کی دلکشی و رعنائی انہیں پہلے ہی اپنی طرف متوجہ کر چکی تھی۔ بزرگوں کی صحبت، علمی و ادبی ماحول، علم و ادب سے گہرے شغف اور پیر طریقت کی علم دوستی، ادب پروری و نظر نے انہیں عروس شعر کی گیسو آرائی کی طرف اور بھی مائل کر دیا اور عاجزؔ نے بھی چمن شاعری کو اپنے خون جگر سے سینچنا شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی اور اپنے ہمعصروں کے شانہ بشانہ سخنوری شروع کی۔ یہی وہ زمانہ

تھا۔ جب نواب سید سعادت علی خاں سعادت والیٔ ریاست بیجو پور (دربھنگہ) تلمیذ حضرت داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا نواب موصوف خود ایک اچھے شاعر تھے۔ آپ کی یادگار ایک دیوان مرصع ہے۔ نواب صاحب موصوف نے یہ دیوان نولکشور پریس لکھنؤ میں ایک کثیر رقم خرچ کر کے طبع کرایا تھا۔ دیوان واقعی کافی دیدہ زیب ہے۔ نواب موصوف کے درباری شاعروں میں حضرت حفیظ جونپوری بہت مشہور ہیں۔ نواب ممدوح کا دربار اس اطراف میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں اکثر بزم ہائے سخن سجی ہیں اور داغ و امیر نے اکثر ان مجلسوں میں شرکت کی ہے۔

دیوانِ عاجز قلمی و غیر مطبوعہ دو سو پچاس صفحات کو محیط ہے۔ حمد، نعت، منقبت، مثنوی، قصیدہ، غزل مستزاد، قطعات، تاریخیں، ٹھمریاں، جھومر، اور گیت بھی کچھ اسی دیوان میں ہیں۔ کلام تین طرح کے ہیں اردو، فارسی اور ہندی۔ اردو کلام دو حصوں پر منقسم ہے، باقافیہ و ردیف اور بے قافیہ ردیف۔ دیوان کے پہلے حصہ میں اردو کلام ردیف وار مرتب ہوا ہے پھر بے قافیہ و ردیف۔ بعدہٗ ہندی کلام ہے اور آخری میں فارسی کلام ہے۔ فارسی میں ردیف کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ دیوان کی ترتیب ۱۳۳۶ھ میں ہوئی، جس کی تصدیق ذیل کے قطعۂ تاریخ سے ہوتی ہے۔

جو دیوان کے آخری صفحات پر درج ہے ؎

مادۂ تاریخ ترتیب دیوان

بحمد اللہ کہ بہ صفاتِ عاجز
مرتب شد بعنوانے کہ او خواست
ربیع الاولی آخر بود خوش وقت
کہ از ترتیب ایں اوراق برداخت
تامل سالِ ہجری می نمودم
کہ احیانا دلم آواز برداشت
مبارک برق ایں دیوان عاجز

خطِ آزادی دیوان عقبی است

۳۶ ۱۳ھ

یوں تو عاجز نے تینوں زبانوں (اردو، فارسی، ہندی) میں دل کھول کر دادِ سخن دی ہے۔ پھر بھی کلام اردو مقابلہ میں زیادہ ہے۔ فارسی کلام نسبتاً کچھ کم ہے اور ہندی سب سے کم ہے۔ لیکن جو بھی کلام ہے، وہ اچھا خاصا ہے۔ عاجز چونکہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" پر ایمان کامل رکھتے تھے۔ اس لئے کبھی کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ ان کی گوشہ نشینی نے اس کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اصلاحِ کلام پر توجہ کر سکیں۔ اسلئے کلام میں کہیں کہیں ثقالت و ناہمواری ہے۔ تغزل کی چاشنی بھی کم ہی ہے۔ لیکن اتنا پھیکا سیٹھا بھی نہیں ہے کہ حلق سے نیچے ہی نہ اترے۔ اردو کلام ردیف وار (الف تا ی) مرتب ہوا ہے۔ فارسی و ہندی میں ردیف کا التزام نہیں ہے۔ یوں تو اردو و فارسی کا کلام بھی کم وزن دار نہیں ہے۔ لیکن کلام ہندی بہت مختصر ہے۔ مگر خوب ہے اور سوز و گداز سے مملو ہے۔ ہندی آج کی ہندی نہیں ہے۔ بلکہ یہ 'اودھ' کے نواحی علاقوں میں بولی جانے والی "پوربی" ہے۔ ان کا کلام دیکھ کر ان کی اس قدرت و مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ جو انہیں اس زبان میں حاصل تھی۔ دراصل یہ مہارت 'اودھ' کے دیہاتوں کی مرہونِ منت ہے۔ کیونکہ پیر طریقت کی وجہ سے اکثر ان کا قیام بانسہ شریف، بڑا گاؤں، گونڈہ، لکھنؤ، ہزاری باغ (بہار) اور حیدرآباد دکن میں رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ان جگہوں کے رہن سہن، طور طریق اور بول چال سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے ان جگہوں سے ان کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ اکثر اشعار میں ان جگہوں کا ذکر آیا ہے۔ بانسہ، جو ان کے مرشد کا وطن ہے۔ اس کے متعلق تو کئی نظمیں ان کے دیوان میں ہیں اور طرح طرح سے اس کے متعلق خیال آرائیاں

کی گئی ہیں۔ یہاں ایک ہی شعر پہ اکتفا کرتا ہوں۔ ذرا خیال آفرینی و عقیدت ملاحظ فرمایئے : ؎

محراب عبادت ہے، مسجد ہے۔ مصلّٰی ہے
مکّا ہے، مدینا ہے، سب کچھ میرا بانسا ہے

بڑا گاؤں کے متعلق بھی اکثر اشعار ان کے دیوان میں ملتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہوا شسن سان بانسہ اور بڑا گاؤں
چھپے زیر زمیں رونق عشقؔ ہیں

لکھنؤ کے ذکر کے ساتھ ساتھ وہاں کے فضلائے روزگار کا تذکرہ بھی موصوف نے اکثر اپنے اشعار میں کیا ہے خصوصاً ان لوگوں کا جن سے عاجزؔ کے دوستانہ مراسم دروابط تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ایک نظم کے چند اشعار پیش کرتا ہوں، جس میں مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کا ذکر شد و مد سے کیا گیا ہے ؎

باری میاں ہیں خادم حرمین لکھنوی
فضل و کمال ان کو خدا نے دیا ہے خوب
روشن ہے نام ان کا عجم سے عرب تلک
آمادگی کا ان کے یہ ثمرہ ملا ہے خوب
بندہ نوازیاں ہیں یہ پروردگار کی
ہم ایسے عاصیوں پہ کیا کیا عطا ہے خوب

مندرجہ بالا اشعار اس نظم سے ماخوذ ہیں جو ۱۳۳۱ھ کے "واقعہ مسجد کانپور" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اسی طرح ایک نظم میں حضرت سید عبدالرزاق انصاری فرنگی محلی لکھنوی کا ذکر بھی آیا ہے : ؎

سلامٌ علیٰ خواجۂ لکھنوی
سلامٌ علیٰ نائب بانسویؒ
سلامٌ علیٰ والیٔ بیکساں
سلامٌ علیٰ مالکِ ملکِ جاں
سلامٌ علیٰ عالم بے بدل
چراغ منور فرنگی محل

ایک مکتوب جو ۱۳۱۳ھ کا نوشتہ ہے اور شاعر نے وطن کو روی سے حیدر آباد دکن اپنے پیرزادہ حضرت سید فرخند علی قدس سرہٗ کی خدمت میں تحریر کیا ہے اس سے اور اس طرح کے دوسرے بہت سے مکاتیب سے حیدر آباد دکن سے ان کے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ ایک شعر ملاحظ فرمایئے

محاق غم میں کیوں گھٹتا ہے بنگالؔ[1]
دکن میں ہے، مہ کامل کسی کا

پروفیسر کرامت علی کرامت نے اپنی تالیف "آ... کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "پہلے شاعری صرف ذ... جذبات کی تسکین کے لئے کی جاتی تھی اور اس سے شاعر اپنی ذاتی نمود و نمائش یا تشہیر و اشاعت مقصود نہ تھی[2]۔ پروفیسر کرامت علی کرامت کا یہ بیان بہت حد تک صحیح ہے۔ شاعری صرف تسکین خاطر کا ذریعہ بھی اور ہے۔ چونکہ پہلے تشہیر و اشاعت کے اس قدر وسیع ذرائع و وسائل حاصل نہ تھے اس لئے بہت سے لوگ گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔ دوسرے کچھ لوگ یوں بھی چھپنے چھپانے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا اصل مقصود تسکین خاطر اور اظہار خیال تھا تشہیر و اشاعت سے غرض نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر و ادیب اپنے زمانہ کا عکاس ہوتا ہے، وہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہر شاعر اپنے زمانہ کی بات کرتا ہے، ایسا کرنا ناگزیر امر ہے۔ ایک انسان جو کچھ دیکھتا ہے، سنتا یا محسوس کرتا ہے وہی کچھ وہ کہتا ہے۔ شاعر بھی انسان ہی ہوتا ہے، وہ جو دیکھتا ہے، سنتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہی کچھ کہتا ہے اگر کوئی شاعر اس کے علاوہ کہے تو اس کی شاعری حقیقت کے خلاف ہوگی۔ چونکہ وہ اپنے ہی گردوپیش سے شاعری کا مواد

---

[1] برادر زادہ و پیر و مرشد عاجزؔ — ندیم

[1] اس وقت بہار و بنگال دو صوبے نہ تھے۔ — ندیم

[2] میں نے اصل الفاظ کے بجائے مفہوم ادا کیا ہے۔ — ندیم

ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بہرحال اپنے دور، اپنی تہذیب، اپنی
معاشرت اور اپنے تمدن کا عکاس و ترجمان ہوتا ہے۔ اس لئے
زمانہ جس طرح کا ہوتا ہے۔ ویسا ہی ادب پروان چڑھتا ہے
پہلے لوگ مذہب سے قریب تھے۔ ہمارے ماحول اور ہمارے
ذہن و عقائد پر مذہب مکمل طور سے حاوی تھا اس لئے ادب
بھی مذہب سے قریب تھا۔ پہلے ادباء و شعراء اپنی تصانیف
اور اپنے دیوان کی ترتیب میں بھی مذہب کو ملحوظ رکھتے تھے۔
اب جبکہ سائنس و عقلیات نے اپنا سکہ جما لیا ہے۔ اشتراکیت
کا بول بالا ہے اور مذہب سے ہماری وابستگی اتنی نہیں
رہ گئی جتنی پہلے تھی۔ اس لئے اب ہمارے احساسات و جذبات
کا مذہب سے متعلق رفتہ رفتہ کم ہوتے جا رہے ہیں اس
لئے اب ہمارا ادب بھی دھیرے دھیرے مذہب سے دور
ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے چوں کہ مذہب کا تسلط تھا اس لئے
اکثر شعراء نے حمد و نعت، مناقب و مدائح سے آگے کچھ کہا
ہی نہیں۔ چوں کہ عاجزؔ بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس لئے
ان کے کلام میں بھی یہی چیزیں ہیں۔ دوسری طرف بھی انہوں نے
توجہ کی ہے، مگر بہت کم۔

شاعری درحقیقت اظہار جذبات کا نام ہے، استادانِ فن
، نکتہ دان ادب، جدت پسند، طبائع اور کہنہ مشق شعراء
ان جذبات سادہ کو زبان و بیان، طرز ادا، بندش الفاظ،
اچھی تراکیب، استعاروں کنایوں سے رنگین و لطیف بنا دیتے
ہیں۔ عاجزؔ کے کلام میں ان چیزوں سے قطع نظر جذبات کی
فراوانی ہے۔ یہ صرف شاعری نہیں، بلکہ محبت و عقیدت کا
نذرانہ ہے۔ جسے سادہ مگر دل کش و دلنشیں انداز میں پیش کیا
گیا ہے۔ یہ وہ نذرانۂ خلوص ہے، جو "بارگاہ محبوب" میں
بصد ادب و احترام پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے خیال آفرینی
سے زیادہ دل کی نمائش ہے۔ کلام میں بہت زیادہ رنگینی
نہیں لیکن سادہ طرز ادا میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ بھی
"کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" کے مصداق ہے۔

"کلام بلیغ" تو نہیں ہے۔ ہاں "کلام فصیح" کی عمدہ مثال ہے۔
نمونۂ کلام ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :-

جب سرنامہ پہ لکھا وصف اس رحمان کا
ہو گیا قرآں نما، مطلع مرے دیوان کا

* * *

جس طرف کو دیکھئے اظہار ہے اسرار کا
دونوں عالم میں ہے جلوہ احمدِ مختار کا

* * *

گر نہ ہوتی حضور کی صورت
کچھ نہ بنتی ظہور کی صورت
مرتے دم سامنے ہو عاجزؔ کے
یا الٰہی حضورؐ کی صورت

* * *

محی الدینؓ تم ہو میں ہوں بے جان
لب نوشیں سے "قُم" فرماؤ یا غوثؒ
رہے گی کب تلک یوں نامرادی
اب عاجزؔ پہ کرم فرماؤ یا غوثؒ

* * *

خوشی سے یہ عالم ہے عشّاق کا
نہ جامے میں پھولے سماتے ہیں آج

* * *

جسم عاجزؔ سے جدا ہووے تو جا کر ٹھہرے
یا خداوندِ سردارِ دو عالم میں روح

* * *

غنی ہے کامرانِ ذی دول سے
گدائے نامرادِ شہر بغداد
جنیدؒ و شبلیؒ سے کتنے ہوئے ہیں
اکابر خاک زادِ شہر بغداد

* * *

قند و نبات میں ہے کہاں اس قدر مٹھاس
تقریر آپ کی ہے دلا، جس قدر لذیذ

گو بندۂ ناچار ہوں، کم زور ہوں لیکن
ہے ناز ہمیں قوتِ بازوئے علیؓ پر

تم چلے گھر ہمکو اے سرورؑ چھپا نہ چھوڑ کر
مرغِ دل جاتا ہے نکلا آشیانہ چھوڑ کر

چشمِ بیمار کی تاثیرِ شفا بخشی کو
دیکھ لیں کاش تو ہو جائیں مسیحا بیہوش

تمہارا کشتہ ہے فارغ علاجِ حکماء سے
ہے بلکہ خود ہی مسیحائے روزگار مریض

روئے روشن سے ترے ہے صبحِ خنداں کو فروغ
کاکلِ شب رنگ سے شامِ غریباں کو فروغ
تیرے طلعت سے ہے خورشیدِ درخشاں کو فروغ
عکسِ پیشانی سے حاصل ماہِ تاباں کو فروغ
نسبت دنداں سے ہے دُرِّ عدن کو آب و تاب
سرخیٔ لب سے ترے لعلِ بدخشاں کو فروغ

جہاں میں پہلے بہت آئے پیشوائے طریق
وے نہ تم سا پیرؒ نہ رہنمائے حقیق

رشکِ بہارِ خلد ہے بغداد کی زمیں
طوبائے باغِ جاں قدِ رعنائے غوثِ پاکؒ

تصدق ترے خالِ رخسار پر
زرِ طشتِ اخضر سلام علیک

پائے نجات بحرِ غمِ حشر و نشر سے
چاہِ ذقن میں آپؐ کے گر ڈوب جائے دل

شہہِ اولینؐ، سرِ عالمؐ سلام
مہہِ آخرینؐ فخرِ آدمؑ سلام
خداوند صدیقِ اکبرؓ سلام
جگر بندِ فاروقِ مضطرؓ سلام
چراغِ شبستانِ حیدرؓ سلام
دل و جانِ خاتونِ محشرؓ سلام

خداوند عالم کے پیارے حسینؓ
ید خاص حق کے سنوارے حسینؓ

خس و خاشاک سے لیں کار مرہم
کہاں ہیں سینہ بریان مدینہ

سرِ سرتاجِ سلطانی، محی الدین جیلانیؒ
جلیسِ تختِ ربانی، محی الدین جیلانیؒ

حامی جو اپنا ہے وہ امامِ ہمامؓ ہے
سلطانِ دیں حسین علیہ السلام ہے
یارب کہوں حسینؓ، نکل جائے اپنا دم
عاجزؔ کی یہ دعا، یہ تمنا مدام ہے

مظہرِ نورِ خدا، روئے رسولِ عربیؐ
مشک و عنبر سے گُندھا بوئے رسولِ عربیؐ

---

[1] وقتِ رخصت صاحبزادۂ پیرو مرشد حضرت سیّد شاہ فرخند علیؒ یہ نظم کہی گئی۔

مشتری ذات ہے پوچھو تو ابھی ہو ارزاں
دو جہاں قیمت یک موئے رسولِ عربیؐ[۱]

سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اردو کلام دو حصوں میں منقسم ہے، با قافیہ و ردیف و بے قافیہ و ردیف۔ پہلے حصہ کلام ردیف وار درج ہے اور دوسرے میں ردیف کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ ردیف وار جو کلام ہے (اور جس کا انتخاب نذرِ قارئین کیا گیا) زیادہ ہے اور اس سے بہت ہی کم ایسا کلام ہے، جو بے ردیف مرتب ہوا ہے۔ لیکن دونوں کے تقابلی مطالعہ و موازنہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ردیف کی پابندی کی وجہ سے پہلے حصہ میں بہت سے اشعار صرف بھرتی کے ہیں۔ دوسرے حصہ میں کلام کی مقدار کم ہے۔ لیکن جو کچھ ہے جاندار ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ذیل میں انتخاب کلام پیش کیا جاتا ہے:

شوق ہے یارب جمالِ مصطفےٰ ہم دیکھتے
صورتِ محبوب میں جلوہ ترا ہم دیکھتے
گوش والا میں پہنچتا نعرۂ "روحی فداک"
آپ مڑ کر مسکراتے، یہ ادا ہم دیکھتے
دیدۂ حق بیں اٹھاتے آپ اور تیر نگاہ
پار ہو جاتا جگر سے بے خطا ہم دیکھتے

ترے روضے کی ہے دلدار چادر
جگر پیوند ہے ہر تار چادر
سرِ دربار ہے مستی کا عالم
ادب اور حاملان بار چادر
معنبر زلف کی بو باس پا کر
ہے رشکِ نافۂ تاتار چادر
جگر چاکانِ رزّاقی کو بس ہے
رفو کے واسطے یک تار چادر

[۱] حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی کی طرف منسوب ہے "ندیم"

بدرگاہِ اطہر شہِ بے کمر
جناب عبدالرزاقِ قطبِ عصر
بصد عجز و آداب تعظیم کر
طرف سے مرے عرض تسلیم کر
اذاں بعد کہنا کہ اے خوش خرام[۱]
کہ تربت میں ہے ایک تیرا غلام
کوئی اس کا ہمدم نہ ہمراز ہے
نہ مونس ہے کوئی نہ دمساز ہے
تلاشی ہے جس کا ملا دیجئے
نصیب اس کا سویا جگا دیجئے
تردّد سے اس کو رہا کیجئے
ہے بیمار اس کی دوا کیجئے
لبِ خشک تشنہ کو تر کیجئے
تہی کاسۂ دل ہے بھر دیجئے

السّلام اے صوفیٔ ساغر بدست
السّلام اے مست صہبائے الست
السّلام اے اسمِ عنف ہی جلی
کسوتِ عبّاد بالائے علی[۲]
السّلام اے لالۂ باغِ حسینؓ
اے سراپا داغ از داغِ حسینؓ

---

[۱] خطاب بہ صبا ندیم

[۲] حضرت سید شاہ عباد علی رزاق القادریؒ برادر اکبر حضرت سید شاہ منصور علی مرشدِ عاجز، آپ کا مزار مبارک بھیورہ ضلع دربھنگہ میں واقع ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ بھیورہ عاجز کے وطن کورونی کے بالکل متصل ہے۔ دونوں بستیوں کی سرحدیں اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہیں کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سی بستی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ بھیورہ ایک قدیم بستی ہے۔ یہاں بہت سے اہل علم پیدا ہوئے۔ یہاں کے امراء و علما کی شہرت آج بھی اس اطراف میں ہے۔ یہاں کے اہل علم (خصوصاً سیدۂ ناچیز کے خاندان کے اکثر حضرات) کا تذکرہ مؤلف "آئینۂ تربت"

آپ نے مذکورہ بالا اشعار سے اندازہ لگایا ہوگا کہ جہاں ردیف کی پابندی نہیں وہاں شاعری کی فکر رسا نے کھل کر جولانی دکھائی ہیں اور کس کس طرح بلند پروازیاں کی ہیں۔ اب تک آپ نے عاجزؔ کے اردو کلام سے لطف و حظ اٹھایا۔ اب ذرا فارسی کلام پر بھی ایک نگاہ طائرانہ ڈال لیں۔ کیونکہ بڑی ناانصافی ہوگی اگر ہم عاجزؔ کے فارسی کلام سے قطع نظر کریں۔ ذیل میں فارسی کلام کا انتخاب نذرِ قارئین کیا جاتا ہے :-

اے دل بر رعنائے من، از من چرا رنجیدہ
اے جانِ روح افزائے من، از من چرا رنجیدہ

اے شاہ کشور گیر من، گاہے نظر بر من فگن
اے ماہِ پُر تنویر من، گاہے نظر بر من فگن
اے مالکِ مختار من، جمشید جاں دار لے تن
قائم تبو ملکِ بدن، گاہے نظر بر من فگن
تو صاحبِ ہر خانہ، در کعبہ و بت خانہ
از من چرا بیگانہ، گاہے نظر بر من فگن

یوسف بہ مصر خویش نہ بازار می رود
نقدِ روان ز دستِ خریدار می رود

ذاتِ تو ابرِ سخا، دستِ تو دریائے عطا
روئے تو یوم صفا، موئے تو لیلائے شبی[1]

افلاک خیم، بر جبیں شبنم، جوزائے کمر، بہرام خدم
بر تختِ زمیں سلطانِ قدم منصور علیؒ، منصور علیؒ
رخسار قمر، خورشید علم، جادوئے نظر ابروئے ستم
افگنده نگاہے، بر دلم، منصور علیؒ، منصور علیؒ

---

[1] درشان صاحب زادۂ والا محترم۔ ندیم

[1] اے زہرت شمس گردوں روزِ گرداں آمدہ
وی ز بہرت شمع شب افروز گریاں آ
مصحفِ رخسار تو با خط و خالِ عنبریں
طلبۂ حق را بجائے رحل و قرآں

خون ہا ز دیدہ می چکد، دل ہا بہ پہلو می تپد
قمری گریباں می درد سرو خراماں نی[2]

نگاہے لطف بر حالم معین الدین اجمیریؒ
گدائے بے پر و بالم معین الدین اجمیر
مزارت مرجع دوراں، غبارت سرمۂ پاکاں
نثارت جانِ عشاقاں معین الدین اجمیر
چو عاجزؔ خاکِ راہ تو، در آمد در پناہِ تو
بود کافی نگاہے تو معین الدین اجمیریؒ

کے شود یارب دلم قرباں ادائے غوث پاکؒ
تن نثارِ آستانہ جاں فدائے غوث پاکؒ
بر سرِ درویش ما مالم، دیدہ را بینا کنم
گر بدست آید غبارِ کفش پائے غوث پاکؒ

فلک سرنگوں سوئے تو غوث اعظمؒ
ملک ست بر بوئے تو غوث اعظمؒ
نگہائے گیتی کجا رنگ و بوئے
گرفتہ از خوئے تو غوث اعظمؒ

---

[1] درشان صاحب زادۂ والا قدس۔ ندیم

[2] درشان صاحبزادۂ موصوف ۔ یہ نظم وداعی ہے۔ صاحبزادہ موصوف جب شاعر کے وطن سے رخصت ہو کر اپنے وطن تشریف لے جا رہے تھے اس وقت شاعر کے دل پہ جو گزری اس نے اسے الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ ندیم

تو ز خورشید فلک ہست کہ عالم افروز
ذرۂ حسن زکات است رسول عربی
از مے کشان مصطفیٰ عشق مصطفیٰ
مستیٔ بادۂ شب اسرا بخی رود

فارسی کلام قارئین کرام کی نظروں سے گذرا جس سے
انہیں عاجز کی فارسی دانی و سخن پردازی کا بخوبی اندازہ ہو گیا
ہو گا۔ فارسی کا مطالعہ ان کا کافی وسیع تھا۔ جس کا اندازہ
ان کے مضامین نظم و نثر کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ انہوں نے فارسی
نظم و نثر میں جو گل کاریاں کی ہیں۔ وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ
ان کی قدر کی جائے۔ ان کی قادر الکلامی اس سے بھی ظاہر ہے کہ
وہ ہر طرح کے خیالات کی ادائیگی پر پوری طرح قادر ہیں۔ چاہے
وہ نظم میں ہو، یا نثر میں۔ انہوں نے جو منظوم مکاتیب اپنے پیر زادے
رشید الدین فرخند علی اور دوسرے احباب کی خدمت میں رقم کئے ہیں
وہ میرے دعوی کا بین ثبوت ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے شاعر
کی قادر الکلامی کا پتہ تو چلتا ہی ہے۔ ساتھ ہی مکتوب الیہ سے
شاعر کے دیرینہ تعلقات اور گہرے ربط کا بھی پتہ چلتا ہے۔
ذیل میں ایک طویل خط کا ایک مختصر سا اقتباس پیش
کرتا ہوں، جس سے ناظرین کو ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہو گا
دیکھئے شاعر نے کیا خوب مضمون آرائی کی ہے اور خیالات
کی ادائیگی کتنے مختصر مگر خوبصورت طرز ادا اور بحر پورے
پیرائے میں کی ہے ؎

اے طبیب[1] دل محبت کیش
مرہم زخم سینۂ درویش
بود یک روز طبع بس خستہ
شادی و غم درون پیوستہ
گہ بدل می گذشت گریہ کنم
گاہ می آمدے کہ خندہ زنم

نیک چون وجہ آن نہ ظاہر بود
عجبے حیرتے ہمی افزود
ناگہان بادۂ بہار آمد
بوئے گیسوئے مشکبار آمد
نامۂ دل نواز شاہ آمد
آرزو مند را نگاہ آمد

آپ نے مذکورہ بالا اقتباس سے شاعر کی قادر الکلامی
کا اندازہ لگایا۔ اب ذرا کلام ہندی کی بہار دیکھئے
اور اس سے لطف حظ اٹھائیے۔ اردو و فارسی کی طرح اس
میں بھی تصوف کی چاشنی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ گرچہ اس کی
مقدار بہت کم ہے لیکن جو بھی ہے خوب ہے اور جی کھول کر
داد سخن دی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ "آتش شوق" شاعر
کے سینے میں دھیرے دھیرے سلگ رہی ہے اور اس کا دل
دھیمی دھیمی آنچ میں جل رہا ہے۔ اس کا سارا وجود محبت
کی آنچ سے پھوڑے کی مانند ٹپکا پڑتا ہے اور وہ گھبرا کر
کہہ اٹھتا ہے ؎

اب نا کرہوں پیت کہو سے
یا ہی چھیو مورے جان کا روگ

آیئے ہندی کلام کی بہار دیکھئے اور شاعر کے دل کی
سوزش و تپش، گداختی و گرمی کا اندازہ لگایئے: ؎

موری جھکے سجریا پھول بھری
باری بس اُن کے جوبن من ہولسے ہرے چھڑی
موری جھکے سجریا پھول بھری
اپنے میاں[2] پہ واری عاجز جیسے بھئی مانگ سہاگ بھری
موری جھکے سجریا پھول بھری
ملنا ہو تو مل لے ٹو ہی[3] پھر نہ ہو یہیں سنجوگ
جیڑا رے ہم پردیسی لوگ
(ابتاً)

---

[1] خطاب بہ رشید الدین فرخند علی
[1] حضرت رشید الدین منور علی پیر و مرشد عاجز [2] پیروگ بوقت رخصت از استاد پیر

نعیم

ہوت بھنسار بنے جیہوں بدلیسوا سپنا ہوئیہیں ای نگری کے لوگ
جیڑا رے ہم پردیسی لوگ
یاد جو انہیں ہمکا یہ دلیسوا بیاک بیاک گیہوں بیروگ
جیڑا رے ہم پردیسی لوگ
اب ناکر یہوں پیت کیہو سے یا ہی بھیو مورے جان کا روگ
جیڑا رے ہم پردیسی لوگ

بیروگ کے بعد ساون کی بہار دیکھئے یہ ساون آیا' ہر طرف گھٹائیں چھائی ہیں، کلیاں کھل رہی ہیں، نسیم عروسانِ چمن سے اٹکھیلیاں کرتی چھیڑتی گزر رہی ہے' ہر طرف بہار کا سماں ہے۔ ایسے مست کر دینے والے پربہار موسم میں ایک "برہمن" اپنے پیتم سے دور اپنی سونی مڑیا میں بیٹھی اپنے "ساجن" کی راہ دیکھ رہی ہے' اس کی منتظر نگاہیں راہوں میں بچھی بچھی جاتی ہیں' لیکن "پیتم" کا دور دور تک پتہ نہیں۔ اسی کش مکش انتظار میں دن گذر جاتا ہے اور شام آ پہنچتی ہے۔ رہی سہی آس بھی ختم ہو جاتی ہے اور "برہا" کی ماری کا دل بھر آتا ہے اور آنکھوں میں شمعیں جل اٹھتی ہیں اور دل سے ایک نالہ بلند ہوتا ہے: ؎

پیا بن مڑیا موری رے سونی لاگے
لاگت پنٹ اہنار

دن ساون کا سہاؤنا رے نیٹ بھیونا بو جھائے
رینی ڈیرو ری سیجیا کنڈو گو لاگے سون سان لاگے چوؤ دیس
پیا بن مڑیا موری لے سونی لاگے
لاگت .. ..

ہرا سے چھوٹی سہو لیے سوریا لے ہنس کھیل کرے سکھ چین
اگیا لکو موری امڑی جو مٹیلے بجر کھو باری بیس
پیا بن ....

رسن لاگے پیا نہیں آئیل لے دکھ مور اچڑھت اکاس
ہمرے بیدیسی بھئے جوگی رمتا ہو ہم ہوں بناؤں جوگن بھیس
پیا بن ....

انتظار کرتے کرتے آخر پیمانۂ صبر و شکیب چھلک پڑتا ہے اور جب اسے کوئی راہ نہیں سوجھتی ہے، تو ایک مسافر کو قاصد بنا کر "پیتم" کے دوارے بھیجتی ہے: ؎

گور تورے لاگوں بھیا بٹوہیارے
ہمری سمد ریا لئے ...... جا

کیا سندیس بھیجتی ہے' ذرا عاجزؔ کی زبان سے سنئے: ؎

کیسے کہوں دل کی بتیا، نہیں آوے پیا نہ لکھے پتیا

تصوف نے جو "آتشِ شوق" شاعر کے دل میں بھڑکائی ہے اور جو سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ دیکھئے آپنے پیر کی تعریف کتنے خوبصورت پیرائے میں کی ہے: ؎

نبیؐ و علیؑ و حسنؑ، حسینؑ و عابدؑ کے تن من
رزاقؒ کے ہیں پیارے لالن منصور علیؒ میرے من

حضرت محبوبِ سبحانی کی تعریف کرتے ہوئے خدمتِ اقدس میں اپنی عرض گزارتے ہیں: ؎

بڑے پیر جیلانی محبوب سبحانی دین نبیؐ کے جیویا
عاجزؔ پہ اب دیا نجر ہو تم ہی ہو جگ کے کھیو
مورو نیّا پار لگیتا

ایک "معراج نامہ" کے دو شعر پیش کر کے مضمون ختم کرتا ہوں: ؎

ہے دھوم اکاس پہ آوت ہیں بطحا کے باسی سانوریا
کوئی تازہ کسجان کا ٹیرت ہیں، کوئی صلِ علیٰ کی بانسریا
او گھٹ گھاٹ گھڑا بھاری پگ لرجت عاجزؔ پنہاری
گھٹو اد توری جاؤں واری موری بھر دیہو من کی گاگریا



عزیز

(رپورتاژ)

ایک حسین شام

سات بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی ہیں۔ احاطۂ خانقاہ
ہ میں آہستہ آہستہ لوگ اکٹھے ہونے لگے ہیں۔ ابھی کچھ ہی دیر
بزم سخن اڑیسہ کٹک کا ایک سو انتیسواں ماہانہ مشاعرہ شروع
نے والا ہے۔ آج کچھ گرمی زیادہ ہونے کے سبب خانقاہ
باہر ہی نشست کا انتظام کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ آ گئے ہیں
کچھ آ رہے ہیں۔ صدر بزم حضرت امجد نجمی حسب معمول حیران و
پریشان ٹہل رہے ہیں۔ انہیں اس بات کی ہمیشہ شکایت رہتی
ہے۔ خصوصاً شعراء حضرات سے کہ وہ لوگ وقت کی پابندی
کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے۔ ایک کونے میں بزم کے نائب صدر
ظہیر الامین صاحب اور سیف الدین صاحب حیدرآبادی محو
گفتگو ہیں۔ تقریباً ساڑھے سات بجے کرامت علی صاحب
کرامت، اپنی مخصوص چال سے پنڈال میں داخل ہوتے ہیں ان
کے ہمراہ جعفر رضا نقوی نصیر آبادی اور پروفیسر مسیح اللہ مسیح ہیں۔
تھوڑی دیر بعد ظہیر اشرف نوز اور عظیم منگولی بھی تشریف لے آتے ہیں
... صدیقی لکھنوی پہلے ہی سے آ چکے ہیں۔ سامعین کی تعداد میں بھی
اس دوران کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ نجمی صاحب اب مزید انتظار
کے بغیر جلسہ کے آغاز کا اعلان کرتے ہیں۔ صدارت کے لئے جناب
سیف الدین صاحب کا نام تجویز کیا جاتا ہے۔ جس کی تائید
حافظ محمد رفیق درد کرتے ہیں۔ اب رفتہ رفتہ کارروائی شروع
ہوتی ہے۔ سب سے پہلے عظیم منگولی نائب سکریٹری بزم سخن گذشتہ
مشاعرہ کی رپورٹ پڑھ کر سناتے ہیں۔ اس کے بعد نقد و نظر کے
تحت جعفر رضا نقوی گذشتہ مشاعرہ میں پڑھے گئے کلام پر
ایک فکر انگیز اور سیر حاصل منظوم تبصرہ سامعین کے سامنے پیش
کرتے ہیں۔ منظوم تبصرہ پڑھے جانے کا یہ پہلا موقع تھا اس لئے
سامعین کافی محظوظ ہوئے۔ نقد و نظر کے بعد اڑیسہ کے مشہور
فٹ بال کھلاڑی عبدالمجید عرف بچن کی جواں سال موت پر صدر
جلسہ کی طرف سے ایک تعزیتی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ جسے
حاضرین جلسہ منظور کرتے ہیں۔

اب مشاعرہ کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے قمرالدین
قمرؔ کا نام پکارا جاتا ہے۔ قمر اپنے مخصوص انداز میں تحت اللفظ
اپنی تازہ غزل سنانے لگتے ہیں۔ محفل کے کسی کونے سے دبی دبی
زبان میں واہ واہ کی آواز آ رہی ہے۔ پتہ نہیں کھل کر تعریف
کرنے میں سامعین اپنی کونسی توہین محسوس کر رہے ہیں۔ بہرحال
غزل پسند کی جاتی ہے۔

قمرؔ کے بعد شوکت رحیمؔ کا نام پکارا جاتا ہے۔ رحیمؔ جہاں
ایک خوش گو شاعر ہیں، وہاں ایک خوش گلو قوال بھی ہیں۔ ایک
خاص ترنم میں سامعین کو دعوتِ عمل دیتے ہیں:

ے وفا کی راہ میں ہستی مٹا دے، سوچتا کیا ہے
دکھا دے پھر سے دنیا کو تری شان ادا کیا ہے

اب رحمان شاکرؔ تشریف لاتے ہیں۔ یہ پرانے لکھنے والوں
میں سے ہیں۔ غزل جتنی پیاری کہتے ہیں، آواز بھی ماشاءاللہ
اتنی ہی پیاری ہے۔ ایک ادا کے ساتھ غزل سرا ہوتے ہیں:۔

گو لاکھ وہ روٹھیں ہم سے مگر ہم ان کو منائے جاتے ہیں
تکمیل محبت کی خاطر ہر غم کو اٹھائے جاتے ہیں

محفل سے واہ واہ کا شور بلند ہوتا ہے۔ کچھ سخن فہم سنجیدہ طور پر سوچنے میں محو ہیں کہ شعر کا دوسرا مصرعہ "تکمیل محبت کی خاطر ہر ناز اٹھائے جاتے ہیں" ہوتا تو شعر کتنا حسین ہوگیا ہوتا۔ بہرحال شاکر صاحب بقیہ اشعار سنا کر اپنی جگہ آ بیٹھتے ہیں۔

اب صدر صاحب محمد ایوب صابر کنگی کا نام پکارتے ہیں۔ ایوب صاحب نہ صرف وضع قطع سے مولانا ہیں، بلکہ واقعی مولانا ہیں اور دیوبند سے فارغ ہیں۔ موصوف کے اشعار ایسے زوردار نہ ہونے پر بھی ان کی غزل بحیثیت مجموعی پسند کی جاتی ہے۔

ایوب صابر کے بعد معشوق شہید تشریف لاتے ہیں آپ بھی ایک پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ شعر عمدہ کہتے ہیں مگر انداز بدلتا رہتا ہے۔ گویا ابتک انہوں نے اپنی شاعری کی کوئی خاص راہ متعین نہیں کی ہے۔ کبھی کبھی آپ کے کلام میں شاعری میں نت نئے تجربات کے علمبردار جناب کرشن موہن کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

دیکھ کر آج شہریوں کا عمل
مسکراتے ہیں اہلِ دشت و جبل
بجھ گئی جلتے جلتے شمعِ وفا
گر پڑا حسرتوں کا تاج محل
ہو ہی جائے گا فیصلہ دل کا
آپ رہیئے تو اپنی ضد پہ اٹل

پوری محفل جھومنے لگتی ہے۔ ایک ایک شعر پر سامعین کھل کر داد دیتے ہیں۔ خاص کر معشوق صاحب جب یہ شعر سناتے ہیں۔

تو بدلتا ہے کیوں جہاں کے ساتھ
ہو جو ہمت تو خود جہاں کو بدل

تو یہاں سامعین کی حالت قابل دید ہوتی ہے۔ ہر طرف سے مکرر ارشاد، مکرر ارشاد کی آواز بلند ہونے لگی غزل کافی پسند کی جاتی ہے۔

اب صدر صاحب ضمیر خاں ضمیر کا نام پکارتے ہیں آپ بزم کے ایک قدیم غزل گو شاعر ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ بہت دنوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے ابھی تک وہ اپنی شاعری سے مطمئن نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مشاعرہ میں آپ کا ایک جداگانہ رنگ دیکھنے کو ملتا ہے کبھی آپ اقبال اور جوش سے متاثر نظر آتے ہیں تو کبھی جدید ترین دور کے کسی فلسفہ طراز کے پیچھے اندھی دوڑ لگاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ترنم بھی ماشاء اللہ آپ نے بہت عمدہ پایا ہے۔ آپ کے ترنم سے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت آپ کے پڑھنے کا انداز ہے۔ رک رک کر، ٹھک ٹھک کر ایک ایک لفظ کو اس کی پوری ادائیگی کے ساتھ پیش کریں گے آپ کا سنانے کا انداز کچھ اس طرح ہوتا ہے، جیسے کہ زبان حال سے کہہ رہے ہوں:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

اور یہی سبب ہے کہ سامعین کی داد سے بے نیاز ایک دلنشیں انداز سے کچھ یوں غزل سرا ہوتے ہیں:

اسی کو کہتے ہو تم ننگِ خاندانِ چمن
وہ جس نے زندگی بھر گلستاں کا ساتھ دیا

ابھی سامعین کی واہ واہ تھمی نہیں ہے کہ آپ اپنی پیاری ما زبان کی بے بسی و بے چارگی پر ایک عمدہ سا شعر پیش کرتے:

وہی ہوئے ہیں بضد، نام تک مٹانے کو
جنہوں نے مدتوں اُردو زبان کا ساتھ دیا

ضمیر صاحب کے بعد بزم کے ایک نوجوان شاعر صمد صمصام تشریف لاتے ہیں اور تحت اللفظ میں کچھ اس طرح غزل سرا ہوتے ہیں:

اے دلِ نادان بتا، بچ کر کہاں تک جائے گا
دام رنگ و بو نے گا، تو جہاں تک جائے گا

دل جلے ایسے ہیں ہم گر آہ کر دیں ایک بار
اٹھ کے یہ شعلہ جگر سے آسماں تک جائے گا

صمصام کے بعد قادر شریف رونق محفل میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ آپ کا انداز مزاحیہ ہونے کے علاوہ بیک وقت متفکرانہ، فلسفیانہ، اور خطیبانہ ہے۔ کبھی کبھی تو آپ مزاحیہ اشعار کے دوران ایک ایسا سنجیدہ شعر پڑھ جاتے ہیں کہ سامع کے لئے آپ کا مزاحیہ اور سنجیدہ شاعری میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ شاعری میں کس قسم کی پابندی کے قائل نہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے اکثر و بیشتر اشعار آزادی کی کھلی ہوا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں:

رونق صاحب کے بعد اطہر عزیز کا نام پکارا جاتا ہے حاضرین کی نظر یک بیک ایک دبلے پتلے نوجوان کی طرف اٹھتی ہے، جو ایک شان بے نیازی سے ڈائس کی جانب بڑھتا ہے ابھی اہل مجلس اس غریب کے بارے میں کوئی نظریہ قائم ہی نہیں کر پائے ہیں کہ وہ ایک مخصوص لہجہ میں مترنم ہوتا ہے۔

اپنی پرچھائیں سے خود آپ الجھ جاؤ گے
شیش محلوں میں اگر سایوں سے کترا ؤ گے
یوں کریدا نہ کرو راہ میں چلتے چلتے
راکھ کا ڈھیر ہوں کیا مجھ میں بھلا پاؤ گے

سامعین میں سے کچھ کھل کر داد دے رہے ہیں۔ کچھ غزل کا یہ نیا روش دیکھ کر مجسمۂ حیرت و استعجاب بنے ہوئے ہیں اور جب ان کے کانوں سے نوجوان کا یہ شعر ٹکراتا ہے۔

میں ہوں بھٹکے ہوئے موسم کا سمٹتا بادل
تم مرے ساتھ چلو گے، تو بھٹک جاؤ گے

تو یہاں سامعین سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ واقعی انداز، لب و لہجہ نیا ہونے کے باوجود شعر کافی جاندار ہے۔

اب بہار الدین ریاض صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ ہیں تو ایک ترقی پسند شاعر مگر ذہن بالکل جدید رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مختلف وقت میں مختلف انداز سے غزل سرا ہوتے ہیں۔ آپ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں خصوصاً آزاد نظموں میں نئے نئے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ غزلیں بھی بڑی پیاری کہتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز بھی جداگانہ ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی کلاس لے رہے ہوں۔ نہایت آہستہ روی کے ساتھ رک رک کے تحت اللفظ میں سنائیں گے۔

مجھ کو کچھ احساس نہیں ہے، کیسا غم اور کیسی خوشی
نفرت کے گلشن بھی ملے ہیں، چاہت کے ویرانے بھی
اہل چمن نے خود ہی چمن کا، دن دہاڑے لوٹا سہاگ
رنگ چمن کو دیکھ کے اب تو ہنستے ہیں ویرانے بھی

سامعین کھل کر داد دیتے ہیں۔ ایک ایک شعر کو دوبارہ سہ بارہ سنانے کی فرمائش کی جا رہی ہے۔ واہ واہ کے شور سے محفل گونج رہی ہے اور جب ریاض صاحب اس شعر پر پہنچتے ہیں:

چاند کا چہرہ زرد ہوا ہے، اک انجانی دہشت سے
دل کے دشمن بنتے چلے ہیں، اپنے بھی بیگانے بھی

تو پوری محفل پھڑک اٹھتی ہے۔ اہل مجلس کھول کر داد دیتے ہیں اب بزم کے ایک کہنہ مشق شاعر مولوی عبد اللطیف صاحب عارف کا نام پکارا جاتا ہے۔ موصوف تو پہلے کچھ معذوری ظاہر کرتے ہیں۔ پھر ڈائس کے پاس آ کر کافی تلاش کے بعد جیب سے ایک پرزی نکالتے ہیں۔ ایک نظر سامعین کے چہروں پر ڈالتے ہیں۔ سبھوں کو ہمہ تن گوش پا کر غزل شروع کرتے ہیں۔ چونکہ موصوف نے اپنے کلام کی کوئی نقل بزم کے حوالہ نہیں کی اسلئے نمونہ کلام یہاں نہیں دیا جا سکا۔ پھر بھی جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے، غزل بڑی جاندار تھی اور غالباً انعام ہے۔ ناکام ہے وغیرہ قافیہ ردیف پر کہی گئی تھی۔ ایک شعر پر تو سامعین کھل کر داد دیتے ہیں اور مکرر ارشاد کی فرمائش کرتے ہیں۔ جس پر مولوی صاحب حسب معمول مسکرا کر اپنا پورا مصرعہ دہرا دیتے ہیں" ارے صاحب کیا رکھا ہے اس شعر میں جو دوبارہ سنایا

جائے۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے اور پھر موصوف بقیہ اشعار
سُنا کر اپنی جگہ آ بیٹھتے ہیں۔

آپ کے بعد ظہیر اللہ صاحب نور تشریف لاتے ہیں۔ آپ
"بزمِ سخن" کے بانیوں میں سے ہیں۔ مگر اب مصروفیت کا یہ حال ہے
کہ سال میں ایک دفعہ یا زیادہ سے زیادہ دو دفعہ (اگر وہ بھی
یاد رہا) مشاعرہ میں حاضری دیتے ہیں۔ آپ ایک نظم گو شاعر ہیں
خصوصاً آزاد نظمیں بڑی پیاری کہتے ہیں۔ نظمیں اکثر مختصر ہوتی
ہیں مگر ایک دیرپا تاثر لئے ہوئے۔ اس بار بھی آپ نے ایک
چھوٹی سی خوبصورت نظم "پردہ نشیں سے خطاب" سنائی۔
افسوس کہ موصوف نے پردہ نشیں کو پردہ نشینی ہی میں رکھا اور
اس کی کوئی نقل بزم کے حوالہ نہیں کی، ورنہ کچھ اظہارِ خیال
کیا جاتا۔

ظہیر اللہ نور کے بعد حافظ محمد رفیق درد نے ایک بڑی
ہی جاندار غزل اپنے ناقابلِ تقلید ترنم میں سنائی۔ یوں تو آپ کی
غزل کے ہر شعر حسین ہوتے ہیں۔ اس پر آپ کا پُرسوز ترنم تو
کچھ اور کیفیت پیدا کرتا ہے۔ آپ غزل سرا کیا ہوتے ہیں پوری
محفل پر چھا جاتے ہیں۔ ہر شخص آپ کے ترنم سے مست
ہو اٹھتا ہے۔ ایک عجیب ادا کے ساتھ غزل سرا ہوتے ہیں۔

مرے ساقی بس اتنا کام کر دے
جھکا کر آنکھ خالی جام بھر دے
جلے گا دامنِ فصلِ بہاراں
چمن میں دل جلا جب آہ کر دے

سامعین ہیں کہ اُچھل اُچھل کر داد دے رہے ہیں۔
ظہیر اللہ نور پر تو گویا ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے
ایک ایک شعر کو دوبارہ سنانے کی فرمائش کر رہے ہیں اور
جب درد نے اپنا یہ شعر پڑھا:

کوئی ایسا نظر آتا نہیں ہے
جو لے کر شامِ غم، نورِ سحر دے

تو یہاں اہلِ محفل کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ ہر شخص
مسحور ہو اٹھتا ہے۔

اب جعفر رضا نقوی اپنی ایک غزل بڑے ہی دلک
میں پیش کرتے ہیں۔

چھینے نہ کوئی مجھ سے متاعِ غمِ جاناں
اس درد نے بخشا ہے مجھے زیست کا عنواں

شعر کے دوسرے مصرعہ پر سامعین ذرا چونکتے ہیں کہ
شاعر نے کس مصلحت کے تحت یہاں زیست کا عنوا
شاید شاعر کی نظر محاسنِ شعر سے زیادہ محاسنِ جذبات پر
اب نقوی صاحب اپنا اگلا شعر بڑے ہی خوبصورت ا
پیش کرتے ہیں:

مانا کہ ہیں گُل زینتِ دامانِ گلستاں
کانٹوں کو دعا دو کہ بنے ہیں جو نگہباں

شعر بجا حسین تھا۔ بے حد داد ملتی ہے۔ ابھی اہلِ محفل ا
ہی پر سر دھن رہے ہیں کہ موصوف ایک اور خوبصورت
سنانے لگتے ہیں:

کیسا ہے یہ اس دور کا معیارِ ترقی
انسان کے سایہ سے ہے انسان گریزاں

شعر دورِ حاضر کے انتشار کی بھرپور عکاسی کرنے کے سبب کا
پسند کیا جاتا ہے۔ مکرر ارشاد کی فرمائش سے محفل گونج
ہے۔

نقوی صاحب کے بعد عظیم بنگلوری تشریف لاتے ہیں۔ پہلے
آپ ایک قطعہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک تازہ غزل اپ
مخصوص ادا اور مقبول لہجہ میں سناتے ہیں۔ سامعین آپ کے
شعر سے اتنا لطف اندوز نہیں ہوتے، جتنا کہ آپ کے پڑھنے
کے انداز سے۔ موصوف اس وقت ۷۰ سال کے لگ بھگ ہیں۔
مگر کلام میں رومانیت کے وہ تیور ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ بڑے
ہی پیارے الفاظ میں تحت اللفظ میں سناتے ہیں:

کیا کر گئی ہے کس کی نظر کچھ نہ پوچھئے
اب تک اچھل رہا ہے جگر کچھ نہ پوچھئے

عظیم صاحب تو اگلا شعر پڑھنے میں محو ہو جاتے ہیں اور
یہاں محفل کا تحفل اچھلنے لگتی ہے۔ اب آپ اپنا آخری شعر
پیش کرتے ہیں ؎

دنیا مری تلاش میں، میں اس سے دور دور
کس میں ہے عیب کس میں ہنر کچھ نہ پوچھئے

اب ملک کے معروف و مقبول شاعر کرامت علی کرامت
تشریف لاتے ہیں۔ آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں
آپ نے جہاں گہرے اور سنجیدہ مطالعے سے صنفِ شاعری میں
ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے، وہاں آپ سلجھے ہوئے
تنقیدی اور غیر تنقیدی مضامین سے بھی حلقۂ ادب میں کافی
مقبول ہیں۔ آپ ایک طویل نظم بعنوان "روایت کی طرف
واپسی مع اس نوٹ کے " "جدیدیت کی گھٹی ہوئی فضا سے
روایت کی طرف واپسی" سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں
پہلے تو حاضرین عنوان ہی کی لمبی چوڑی تمہید پر چونکتے ہیں۔
ظاہر ہے لفظ مطلق جدیدیت، سے مراد "صالح اور سطحی
جدیدیت" دونوں لی جا سکتی ہے۔ اب اگر شاعر صالح جدیدیت
سے روایت کی طرف لوٹنا چاہتا ہے، تو یہ سامع کے لئے ایک
حیرت انگیز اور تعجب خیز حادثہ سے کم نہیں۔ کیونکہ ابھی حال
ہی میں موصوف نے ایک خط کے جواب میں اس بات کا کھل کر
اعتراف کیا ہے کہ — "میری نظر میں صالح جدیدیت سے
انکار کفرانِ نعمت کے برابر ہے۔"

اب اس قول کے بعد یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی
ہے کہ موصوف کا ارادہ تعمیری جدیدیت سے فرار نہیں، بلکہ
تقلیدی اور تشہیری جدیدیت (جو عام طور پر سطحی ہوتی ہے)
ہی سے بیزاری ہے۔ ایسی جدیدیت ہی کی مسموم فضا میں شاعر
کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور وہ روایت کی آغوش
میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سطحی اور
بے مقصد جدیدیت سے واپسی صرف روایت ہی کی طرف کیوں
ہو؟ کیا موجودہ توانا اور صحت مند جدیدیت اس وسعت کی
حامل نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر نئے موضوعات، نئے تجربات
کو سمو سکے؟ اگر حاصل نہ بھی ہے تو موصوف ہی کے الفاظ میں
اس بات کی ہر جدید شاعر کو کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ نہیں
کہ بالکل روایت کی طرف واپس ہی لوٹا جائے۔ آج جبکہ
اردو شاعری کو محض روایت کی سطح سے الگ کر کے اسے
ایک نیا آہنگ، نیا اسلوب دیا جا رہا ہے، بندھے ٹکے اصول،
فرسودہ روایتوں کی محدود فضا سے باہر لاکر اسے ایک نئی
راہ، ایک نئی منزل سے روشناس کیا جا رہا ہے۔ وہاں پھر
روایت کی طرف لوٹنا ایک مضحکہ خیز معاملہ معلوم ہوتا ہے۔
بہر حال جہاں تک لفظ "واپسی" کا تعلق ہے یہ راقم الحروف
کی نظر میں محض وقتی ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ کل شاعر
موصوف ایک نظم بعنوان "جدیدیت کی طرف واپسی" لے کر
سامعین کے سامنے حاضر ہوں۔ قطع نظر تمام شبہات کے نظم
کافی تاثر انگیز اور بھرپور ہے۔ ایک ایک بند سامعین کو
اپنی طرف متوجہ کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ خاص کر یہ بند ؎

وہ مرمریں رنگیں قبا
وہ احمریں دستِ حنا
جس طرح ہو خونِ شفق
جیسے کسی کا دل ہو شق

تشبیہات و استعارات کا ایک حسین و دل آویز مجموعہ معلوم
ہوتا ہے۔ سامعین داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اور جب آپ
اپنے آخری بند پر پہنچتے ہیں :

؎ محبوب کی شیریں نظر
رخسار کی شام و سحر
اور تمتماہٹ حسن کی
جس سے ہو روشن زندگی
گلنار سے لب کی ضیا
باہوں کا پُر خم آسرا
ان سب کی چاہت اب بھی ہے — ان کی ضرورت اب بھی ہے۔

تو یہاں سامعین پر ایک عجیب کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے
گویا ہر شخص زبان حال سے کہہ رہا ہو بیشک

ان سب کی چاہت اب بھی ہے
ان کی ضرورت اب بھی ہے

آخر میں نجم الشعراء حضرت امجد نجمی کا نام پکارا جاتا ہے۔ آپ ہیں تو بزم کے صدر، مگر نائب صدر، سکریٹری، نائب سکریٹری سبھوں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ گویا امجد نجمی کا دوسرا نام "بزم سخن" ہے اور یہ واقعہ ہے اراکین بزم کی تمام سرگرمیاں، کٹک کی ادبی فضا کی تمام چہک دمک آپ ہی کے دم سے ہے۔ آپ ہی کے زیر سرپرستی "ایسے، ویسے، کیسے کیسے ہو گئے"۔۔۔ آپ کے نام کے اعلان کے ساتھ ہی سامعین کچھ سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ گویا حقیقی شاعری اب سننے میں آئے گی۔ آپ ایک چھوٹی سی نظم "وہ نہیں آئے" سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ آپ کے سنانے کی ادا بڑی نرالی ہوتی ہے۔ جب تک ایک ایک مصرعہ سامعین کے ذہن پر نقش نہ ہو جائے آگے نہیں بڑھیں گے۔ خود بھی جھومتے جائیں گے اور ساتھ ساتھ اپنے مخصوص دمسحور کن لہجے سے سامعین کو بھی جھومنے پر مجبور کرتے جائیں گے۔ آپ نے جب بھی کوئی کلام مشاعرہ میں پیش کیا ہے، پوری محفل میں ایک سماں بندھ گیا ہے۔ چاہے آپ ١٩٦٨ء کی کوئی چیز پیش کریں یا ١٩٢٨ء کی کیا مجال اہل جلسہ ذرا بھی بے اطمینانی محسوس کر سکیں۔ ایک عجیب سے چونکا دینے والے انداز میں آپ سے مخاطب ہوں گے: ؎

چھٹ گئی ظلمت
کٹ گئی رات
پھٹ گئی پو
گم ہوئے تارے
کھو گیا چاند
چھن گئی شبنم
ڈھل گئے باغ
کھل گئیں کلیاں
ہنس دیئے پھول
اڑ گئے پنچھی
جاگ اٹھی خلق
ہو گئی صبح
چڑھ گیا سورج
بڑھ گئے سائے
وہ نہیں آئے
وہ نہیں آئے

نظم کے حسین اختتام پر سامعین کے دلوں پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، وہ شاہ ظفر کے اس قطعہ سے بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے: ؎

وہ ہم سے وعدہ کر جاتے ہیں اکثر شب کے آنے کا
مگر آتے نہیں ہرگز کہ جا کر بھول جاتے ہیں
گذر جاتی ہے ساری رات کہتے کہتے یہ ہم کو
اب آتے ہیں، اب آتے ہیں، اب آتے ہیں، اب آتے ہیں

جناب صدر کے شکریہ کے بعد مشاعرے کی کارروائی ختم ہوتی ہے۔

ال صدیقی لکھنوی

مزاحیہ

حضرت دل

ہیروشیما پر بم گرا - ناگاساکی تباہ ہوگیا - دنیا میں نہ جانے کتنے انقلاب آئے مگر دل کی دنیا میں کوئی تبدیلی نہ آئی - دلوں کی روایات قائم رہیں - میٹھا میٹھا درد کبھی ڈبڈبا، کبھی اچھلنا، کبھی روٹھنا، کبھی منانا بس یہی گویا دل کا شیوہ تھا - دلوں کی اپنی زبان تھی، اپنے احساسات، اپنا ایک مقام تھا - مگر خدا جانے مغربی ڈاکٹروں پر بیٹھے بیٹھے کیا وحشت سوار ہوئی کہ دل کی دنیا میں بھی چاقو چھری لے کر گھس آئے - دلوں کو کاٹ کر دلوں میں ایک ہلچل مچا دینے - ایک دل کاٹ کر دوسرے میں لگا دیا - دوسرے کو تیسرے میں اور کبھی دونوں کو کاٹ کر بڑا کا دل لگا دیا - بتائیے صاحب دل نہ ہوا گویا بچوں کا کھلونا ہوگیا - اہل دل کو غالباً کبھی یہ گمان بھی نہ گزرا ہوگا کہ خدانخواستہ حضرت دل پر کبھی ایسا وقت بھی گزر سکتا ہے - مگر دل پر خنجر چلا کر مغربی معالجین نے جس بزدلی کا ثبوت دیا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے - جناب دل کا مرتبہ کچھ اس قدر بلند تھا کہ ان سے شکایات کی جاتی تھیں، مشورے کئے جاتے تھے غرضکہ زندگی کے تمام اختیارات دل کو سونپ دیئے جاتے تھے - ملاحظہ ہو -

آئے تھے ابھی ہو کے پشیماں جہاں سے، پھر دل کا تقاضہ ہے کہ اک بار وہیں اور آپ محفل سے لاکھ شرمندگی اٹھا کر واپس آئے ہوں - کتنے ہی پریشان کیوں نہ ہوئے ہوں یا میلوں سفر سے تھک گئے ہوں لیکن اگر دل کا تقاضا وہیں دوبارہ جانے کا ہوا تو آپ کی مجال نہ تھی کہ ٹال جاتے - بلکہ یہ وقتی تقاضا اور بڑھ کر تمام عمر کا تقاضا ہو جاتا تو آپ تب تک جاتے جب تک کہ آپ میں چلنے کی سکت باقی رہتی اور سچ پوچھئے تو اس میں مصلحت بھی تھی کبھی مرادیں بر آئیں تو کبھی درد لطیف سے مالا مال ہوگئے - دنیائے دل کا ایک معیار تھا اور زندگی کی جراءت نہ تھی کہ اس کی وجہ سے دل کی انفرادیت پر حرف تک آ سکتا مگر صاحب، کمال تو یہ ہے کہ اس قدر عروج ہونے کے باوجود بھی کسی قسم کا حجاب یا نہ عمل نہ تھا - زندگی کو پورے طور سے اظہار خیال کی آزادی فراہم تھی زندگی پریشان ہو کر کہہ اٹھی تھی - اے میرے دل کہیں اور چل - غم کی دنیا سے دل بھر گیا -

اور اگر بہت بیزاری ہوئی تو دل سے جواب طلب ہوتی کہ "دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے" مگر فوراً ہی منت و سماجت کرنے لگتی کہ خدارا دیر نہ کر اور بتا دے کہ "آخر اس درد کی دوا کیا ہے" - دل کی جواں ہمتی کا یہ عالم تھا کہ لوگ قسمت تک بدلنے کا بیڑا اٹھا لیتے تھے اور اگر ناکام ہو کر رونا شروع کر دیا تو زندگی کو بھلا یہ کب گوارا تھا کہ وہ دل کو روتا ہوا دیکھ سکتی "نہ رو اے دل کہیں رونے سے تقدیریں بدلتی ہیں" غرضکہ دل سے زندگی تھی اور زندگی سے دل اور ایک کے بغیر دوسرے کا وجود گویا ممکن

نہ تھا۔ مگر ہائے رے وقت کی ستم ظریفی کہ زندگی کی خاطر دل پر چھری چلا دی جائے اور زندگی پھلے پھولے۔ حالانکہ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کا رویہ ابھی پورے طور سے نہیں بدلا ہے کیونکہ دل پر خنجر زنی کے تمام حادثات میں صرف ایک ہی زندگی ایسی بے وفا نکلی جو دل کی غارت گری کے باوجود بھی فنا نہ ہوئی پھر بھی زندگی کی یہ روش اگر عام ہوگئی تو دل اور زندگی کا وہ محکم رشتہ جو ازل سے ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ دل کو چاک کر دینا تو دور رہا یہاں تک کہ ٹھیس لگ جانے سے اگر ٹوٹ جاتا تھا زندگی بیزار ہو کر مٹنے پر آمادہ ہو جاتی تھی۔

مگر خدا بھلا کرے ہمارے ماڈرن ڈاکٹروں کا کہ ان لوگوں نے دل اور زندگی کے درمیان میٹھی چھری چلا کر رشتۂ پاک کا توازن درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ جبکہ ایک زمانے میں دل اور زندگی کے توازن کا یہ حال تھا کہ زندگی کو اسیر دیکھ کر دل اس قدر زور سے دھڑکنے لگتا تھا کہ گویا ایک محشر بپا ہو جاتا تھا اور جب تک زندگی کو نجات نہ حاصل ہو دھڑکنیں بڑھتی ہی جاتی تھیں۔

کاش کہ کوئی ان سرپھرے ڈاکٹروں کو سمجھا سکتا کہ

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"!

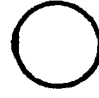
پھر بھی دل پر تجربہ کرنے کی ان کی خواہش اگر زور پکڑ گئی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں شوق سے تجربات کیجئے دل سے کھیلئے کیونکہ یہ چیز ہی کھیلنے کی ہے۔ مگر کم از کم چاقو چھری والا خطرناک کھیل تو نہ کھیلئے۔ دل کے تقاضوں کا خیال رکھئے اور پھر دل کو پرکھئے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ کے مشاہدات میں چار چاند لگ جائیں گے اور آپ خود بخود دل پر چھری چلا دینے کو کم ظرفی قرار دینے لگیں گے۔ آپ کو دل پر تجربہ کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اہل نظر کا تتبع کیجئے اور پھر دل کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ دل کی دھڑکنیں کس باقاعدگی یا بے قاعدگی کے ساتھ بڑھتی گھٹتی ہیں۔ دھڑکنیں گننے اور اتار چڑھاؤ ناپنے کے آلات لگائیے اور پھر اپنا ریسرچ شروع کیجئے

اس قسم کے ادھورے مضامین کے حل تلاش کیجئے کہ آج دل کس نظروں سے دیکھا گیا۔ دن میں دو بار کیا اچھا کیا اور معلوم کیجئے کہ آخر نظر میں کس قسم کی کیفیات تھیں دل ڈوبتا بھی تھا اور ابھرتا بھی تھا۔ ضرب و تقسیم کی مدد سے پتہ لگائیے کہ ایک نظر دیکھنے اور بار بار دیکھنے دل کی دھڑکنوں میں کیا نسبت قائم ہوتی ہے۔ اور دل کے اتار چڑھاؤ کا رشتہ تعداد نظر سے ہے یا کیفیاتِ نظر سے۔ ترچھی نظر سے دل کا درجۂ حرارت عام حالت سے کتنی ڈگری بڑھتا یا گھٹتا ہے۔ کتنے ڈائیٹر پاور کا چشمہ لگا کر دیکھا جائے تاکہ دل ہائے کہہ کے رہ جائے دل لگانے کا صحیح وقت معلوم کیجئے۔ تحقیقات کیجئے کس عمر میں دل لگانا مفید ثابت ہو سکتا ہے اس اہم بات کا انکشاف کیجئے کہ کس زاویے سے دیکھئے پر دل بے قابو ہو کر رہ جائے گا۔ غرضیکہ آپ کے تجربات سے اتنے بیش قیمت نتائج برآمد ہوں گے کہ آپ اہل نظر میں اسی قدر مقبول ہو جائیں گے۔ جتنا کہ چھری چلا کر نہ لہٰذا دلوں کی حوصلہ افزائی ہوگی دیوں پر نظریں بھی جچی تلی پڑا کریں گی۔ ذہنی انتشار کم ہوگا۔ بے پناہ محبت کا دورہ دورہ ہوگا۔ دیوانگی کم ہوگی اہل دل ذرا ذرا سی بات پر اپنے گریباں چاک نہ کر دیا کریں گے جس سے خواہ مخواہ کپڑا ضائع ہوگا اور اس طرح آپ ملک کی معاشی حالت بھی سدھار سکیں گے۔ ڈاکٹر حضرات ہماری رائے مان کر یہ پتہ لگائیں کہ دل زندہ اور مردہ کیوں ہو جاتے ہیں۔ زندہ دل میں کتنی کیلوری گرمی موجود ہوتی ہے؛ کیا زندہ دل کی گرمی نکال کر مردہ دل کو دینے سے وہ زندہ ہو جائے گا۔ غرضیکہ تحقیقات کا یہ اتنا وسیع میدان ہے کہ اگر ایک بار یقین محکم کے ساتھ داخل ہو گئے تو تمام عمر نہ نکل سکیں گے اور ساتھ ہی اس لعنت عمل سے نجات بھی پائیں گے جو دو دلوں کو زبردستی جوڑنے

پ کرتے ہیں۔ اب آپ ہی دیکھئے تاکہ آپ کے سائنس نے ترقی تو بہت کرلی ہے مگر آج تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ غلط انداز نظروں سے دیکھنے پر دل ٹوٹ کیسے جاتا ہے۔ ایا یہ واقعی ٹوٹتا ہے یا محض چٹخ جاتا ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو چٹخنے سے جو دراڑ پڑ جاتی ہے کتنی ملی میٹر کی ہے۔ اپنی کاوشوں سے معلوم کیجئے کہ روشن دل کیا ہوتا ہے اور اس میں "لیومین" روشنی موجود ہوتی ہے۔ کیا دل کو جلانے بجھانے کے لئے آن آف سوئچ بھی لگایا جاسکتا ہے اور اگر اسے آپنے ممکن کر لیا تو پھر آپ صحیح طور پر یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے کہ وقت مقررہ تک دل کے سوئچ کو آن یا آف رکھنے سے زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ لہٰذا یہ بھی پتہ لگ سکے گا کہ درازی عمر کے لئے سوئچ کو آف رکھنے سے حاصل ہوسکے گی یا آن رکھنے سے آپ خود ہی محسوس کریں گے کہ آپ کا اشتیاق اس حد تک بڑھ جائے گا کہ آپ دن رات کوئی نہ کوئی تجربہ کرتے ہی رہیں گے جس سے آپ یہ بھی معلوم کرنا چاہیں گے کہ نظر سے دل پر کس قسم کا "انڈکشن" تو نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو اس کا اثر کتنی دیر تک قائم رہتا ہے۔ کیا نظروں کی تیزی بڑھا دینے سے قیام اثر کا وقفہ بڑھایا جاسکتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تجربہ کیجئے کہ ایک بھاری بھرکم پہلوان اور ایک دوشیزہ کی نظروں سے نکلتی ہوئی شعاعوں میں ایسا کون سا فرق ہے کہ ایک تو دل کی دھڑکنوں کو بالکل کم کر دیتی ہے دوسری کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ ایجاد کیجئے کہ کیا نظر سے نکلتی ہوئی ان شعاعوں میں رد و بدل کرکے ایکسرے (X-RAY) کا کام لیا جاسکتا اور اگر یہ تجربہ کامیاب ہوگیا تو گویا دل کی دنیا سنور ہی جائے گی۔ اس سے بین الاقوامی فائدہ یہ ہوگا کہ عشاق آہ سرد بھر کر یہ نہ کہہ سکیں گے کہ "کاش آپ میرے دل کو دیکھ سکتے۔" لہٰذا ظاہر ہے کہ عاشق و معشوق حقائق کو مدنظر رکھ کر رشتے قائم کریں گے جس سے معیار عشق بلند ہوگا اور سماجی زندگی کہیں زیادہ خوشگوار ہوجائے گی۔ طلاق کی لعنت غائب ہوجائے گی کیونکہ شوہر اور رفیقہ حیات دونوں ہی کے دل ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے رہیں گے جس سے اگر خدانخواستہ ایک دل بدلنے بھی لگا تو نظروں کی تیزی کو بڑھا گھٹا کر اسے اپنی حالت پر لے آیا جائے گا اور وقت طلاق کے ان جملوں کا نام و نشان تک نہ رہے گا کہ کاش! ہم لوگوں نے ایک دوسرے کے دل کو دیکھا ہوتا!" ذرا ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیے کہ دلوں کو ادھر ادھر سے کاٹ کر ادھر ادھر لگا دینا کس قدر تخریبی عمل ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک نوجوان لڑکا دوشیزہ سے عشق فرماتا ہے اور اس عشق کے ہاتھوں اس کے دل میں درد لطیف پیدا ہوتا ہے۔ ایسے میں ہمارے "دل کاٹ" ڈاکٹر بغیر کچھ سوچے سمجھے تیز چھری لے کر اس نوجوان کا دل کاٹ کر اس کی جگہ ایک اسی سالہ بزرگ کا دل فٹ کر دیتے ہیں اور طرہ یہ کہ انسان کی عمر کا براہ راست تعلق دل سے ہے۔ لہٰذا آپ ہی فیصلہ کریں کہ اس نوجوان کا دل بدل جانے کے بعد اپنی محبوبہ سے اپنی بیٹی کا سا سلوک کرنا ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟ بھلا یہ زیادتی کسی ڈاکٹر کے شایان شان ہے۔ غرضکہ ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ ڈاکٹر حضرات ہمارے ان مشوروں پر غور کرنے کے بعد اپنی غلطی کو محسوس کریں گے۔ اپنی چھریوں کو زنگ لگنے کے لئے چھوڑ دینگے اور ساتھ ہی ساتھ دل کی لطافت کو بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ آئندہ کبھی دل کی دنیا میں دل کاٹنے کے روح فرسا حادثات پیش نہ آئیں۔



رونق دکنی سیمابی



ایسا بھی وقت آیا ہے، ایسا بھی ہوگیا
ہم ڈھونڈتے ہی رہ گئے، وہ دل میں کھو گیا

دردِ اس کا کربِ ریز بھی ہے خوش مذاق بھی
پلکوں کی جھالروں میں جو موتی پرو گیا

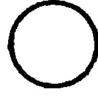
وہ اور ہو گئے نگہہ دسترس سے دور
اندیشۂ نشاطِ تصوّر بھی ہو گیا

خوشبوئے شب لطافت رعنائی سحر
دل خوش ہوں اس پہ کیا جو سرِ شام سو گیا

اوہام کے اندھیرے اُجالے میں آگئے
ڈھلکا جو اشک آنکھ سے قندیل ہو گیا

صنفِ ادب کے آج تقاضے ہی اور ہیں
رونق جو رہ گیا، وہ خلاؤں میں کھو گیا

قاضی عبدالجلیل جلیل



چین تجھکو نہیں کیوں گردشِ ایّام ابھی
رند کے ہاتھ سے چھلکا ہے کوئی جام ابھی

گلشنِ ذوقِ سخن آج فسردہ تر ہے
ہے بہاروں میں فضائے غم و آلام ابھی

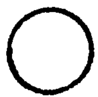
غنچہ و گُل کے تبسّم میں ہے وہ سوزِ الم
جس کے احساس سے غافل ہیں گُل اندام ابھی

بے خبر، جہد و عمل، جادۂ منزل ہے یہاں
حاصلِ زیست نہیں، راحت و آرام ابھی

اور کیا چاہیے جذبات کی دنیا میں جلیلؔ
خلشِ دل ہے ترے عشق کا انجام ابھی



صلاح الدّین نیّر



یہ مانا زندگی خود حادثوں کی آز
مگر ان حادثوں میں بھی مجھے جینے کی خو

کئی موسم بہ اندازِ خزاں آئے گئے،
نگارِ زندگی پر آج بھی پھولوں کی بارش

ہمارا نام بھی اوراقِ گُل پر خون سے
چمن والو! شکستہ دل کی یہ پہلی گذارش

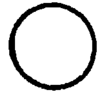
طریقِ عشق میں کچھ احترام اے سنگ بد
یہاں پتھر پگھل جاتے ہیں مجنوں کی

مسلسل کرب میں کچھ وقفۂ راحت بھی
مری محرومیوں کی مجھ پہ یہ بھی اک نوازش

ٹپکتا ہے اگر پھولوں کا رس مکتوب سے تیرے
تو پھر یہ زہر میں ڈوبی ہوئی کس کی نگارش

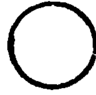
چلو نیّر! ہم اپنے داغہائے دل بھی دکھلائیں
سُنا ہے محفلِ رنداں میں زخموں کی نمائش ہے

محمود سعیدی



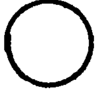
نہیں آساں یہ راہ، مشکل ہے
عقل و دل کا نباہ، مشکل ہے
کیا کہیں پاسِ پردہ داریٔ حسن
جرأتِ یک نگاہ مشکل ہے
دلِ بے آرزو، کبھی بن جائے
حسن کی جلوہ گاہ، مشکل ہے
دل ربائی کی منزلیں آساں
نوازی کی راہ مشکل ہے
نہ رکھیں تجھ سے عفو کی امید
ہم سے ہو یہ گناہ، مشکل ہے
سہل تھا لطفِ پے بہ پے بھی، اور اب
کرم گاہ گاہ مشکل ہے
غم سے کوئی پناہ کی صورت
اے دلِ غم نباہ مشکل ہے
لاکھ غم سے دھواں ہوئے دل
لب تک آجائے آہ، مشکل ہے
خود شناسانِ عشق کا مخصوص
زندگی سے نباہ، مشکل ہے

علی عباس امید



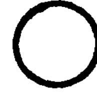
سانس بنتے ہوئے لفظوں میں سراپا لکھ دے
صفحۂ وقت پہ لکھنا ہے تو چہرہ لکھ دے
موسمِ ظلم بنایا ہے، تو پھر دیر نہ کر
سبزہ و برگ کی قسمت میں بھی شعلہ لکھ دے
دور تک سفرِ ہستی پہ بچھے ہیں پتھر
اب ضرورت ہے کہ ہر ہاتھ میں شیشہ لکھ دے
عارضِ درد کھلے، اشک تبسم بن جائیں
بھول کر بھی کبھی ایسا کوئی لمحہ لکھ دے
ریگ زارِ غمِ ہستی کے ورق پر معبود
آدمی لکھ ہی چکا ساتھ میں تشنہ لکھ دے
آندھیاں توڑیں حوادث کی ہر اک شب جن پر
التجا ہے کہ انہیں شاخوں میں پتہ لکھ دے
جس کا عنوان کتابوں میں بھی ڈھونڈے نہ ملے
میری تقدیر میں ایسا کوئی صفحہ لکھ دے
میری تحریروں نے غنچوں کو زباں بخشی ہے
شہر کے ہر در و دیوار پہ مژدہ لکھ دے
چشمِ امید سے ٹپکا ہے حقائق کا لہو
ہے تقاضہ کہ اسی راہ میں سجدہ لکھ دے

سلطان اختر



لپٹ کے روئی ہوا جب شکستہ شاخوں سے
لہو ٹپکنے لگا زرد زرد پتوں سے
کسی نظر میں خوش اخلاقیاں بھی طنز نہ ہوں
اداس ہو کے ہی ملیے اداس لوگوں سے
دل و نگاہ کی پاکیزگی کو ڈس لیں گے
نظر بچا کے گذریئے ادا فروشوں سے
وہ مہرباں جنہیں دعویٰ تھا بے گناہی کا
لہو ٹپکتا ہے اب اُن کی آستینوں سے
خزاں کی دھوپ سے زردا گئیں ہری شاخیں
دبیز چھاؤں گریزاں ہوئی درختوں سے
سوائے نیند پریشاں کے اور کچھ نہ ملا
اداس لوٹے ہیں ہم خواب کے جزیروں سے
جہاں بھی تیرگیٔ مصلحت بڑھی اختر
کرن سی پھوٹ پڑی ذہن کے دریچوں سے

ساحل مانکپوری



برق سوزاں سے جل رہی ہے گھٹا
آج تو آگ اُگل رہی ہے گھٹا

اُن کی زلفوں سے ہو کے شرمندہ
راہ کترا کے چل رہی ہے گھٹا

دیکھ کر حُسنِ گیسوئے پُرخم
رشک کھا کھا کے جل رہی ہے گھٹا

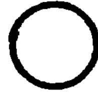
ہے نہ ساقی نہ ساغر و مینا
آج یہ مجھ کو کھَل رہی ہے گھٹا

عکس پڑتا ہے زلفِ شبگوں کا
میرے ساغر میں ڈھل رہی ہے گھٹا

بھر کے گگری میں اپنی گنگا جل
کتنی اِٹھلا کے چَل رہی ہے گھٹا

آج ساحل بجائے پانی کے
بجلیاں کیوں اُگل رہی ہے گھٹا

مدحت الاختر



گھر بھی جب جلنے لگے، تو چونک اٹھے
ہم تو سمجھے تھے دیوالی ہو گئی

دھوپ میں کچھ اور تیزی آ گئی
چاندنی کچھ اور کالی ہو گئی

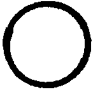
جس میں جیتے جاگتے رہتے تھے ہم
اب وہی دنیا خیالی ہو گئی

کورے کاغذ پر کوئی تصویر تھی
وہ بھی رنگوں کی سوالی ہو گئی

بھر گیا جی حسرتِ تعبیر سے
خواب کی زنبیل خالی ہو گئی



تسخیر فہمی



موسم کے سرد و گرم کا ہم پر اثر
یعنی ملالِ گردشِ شام و سحر
کیا دل لگی ہے رہبرِ دوراں وہ لوگ
راہوں کے پیچ و خم کی جنہیں کچھ خبر
مجھ کو جنوں نے بخش دیا ہے شعو
دل رو رہا ہے پھر بھی مری آنکھ تر
چاہوں تو ہر کسی کو بتا دوں یہ د
تم نے مجھے تباہ کیا ہے — مگر
ہے اک عظیم سانحہ بالائے س
میری تباہیوں کی انہیں کو خبر نہی
کیا دور ہے کہ جس سے بھی ملیے وہ خود
گویا خلوصِ دل سے کوئی بہرہ ور نہیں
لوگو! تمہاری دولتِ احساس کیا ہوئی
ہنستے ہیں بے لبوں پہ مگر اس قدر نہیں
مجھ تیرہ بخت عشق کو راحت کہاں نصیب
میرے الم کدہ میں خوشی کا گزر نہیں
ہوتے ہو دل گرفتہ جو فہمی کبھی کبھی
شاید مذاقِ عشق ابھی معتبر نہیں

قیصر تسنیم

غزل

کوئی نہ جانے، کوئی نہ سمجھے میرے پاگل من کی بات
گھوم رہا ہوں نگر نگر میں ایک تمہاری یاد کے ساتھ

اس نگری میں پریم کی باتیں مورکھ ایسی آشا چھوڑ
اس نگری کے رہنے والے کرتے ہیں ہر بات میں گھات

کیسی کیسی آشائیں تھیں، کیسے کیسے سپنے تھے
مورکھ من نے بھولے پن میں کھائی ہے کس کس سے مات!

کب سے تمہارے موہ میں راہی بھٹک رہا ہے ڈگر ڈگر
چھایا ہے گھنگھور اندھیرا، آؤ پکڑ لو اب تو ہاتھ

جیسے دکھ کے مارے من میں تم بن کیسی پیڑا ہے
دن تو جوں توں کٹ جاتا ہے۔ کاٹے نہیں کٹتی ہے رات

تم کیا جانو کالی گھٹائیں کیا برسایا کرتی ہیں
آگ لگاتی ہے تن من میں، جب بھی آتی ہے برسات

کس موسم کی آس لگائے قیصرؔ اب تک بیٹھے ہو
پھولوں کی رُت آتے آتے، سوکھ نہ جائیں من کے پات

سید شکیل دسنوی

غزل

بیٹھے رہیں گے تھام کے کب تک یوں خالی پیمانے لوگ
بڑھے نہ حد سے تشنہ لبی اور پھونک دیں میخانے لوگ

ہم دنیا کو دے کر خوشیاں، غم بدلے میں لیتے ہیں
ڈھونڈھے سے بھی کہاں ملیں گے ہم جیسے دیوانے لوگ

کیا جانیں یوں دل کے کتنے زخم ہرے ہو جاتے ہیں
چھیڑ کے بات اک ہرجائی کی آتے ہیں سمجھانے لوگ

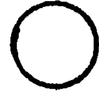
اک شاعر دیوانہ سا کیوں نگری نگری پھرتا ہے
آئے یا نہ سمجھ میں آئے گڑھتے ہیں افسانے لوگ

پھونک کے اپنا آج نشیمن، صحنِ چمن کو نور دیا
لاج چمن کی رکھ لیتے ہیں ہم جیسے دیوانے لوگ

دل پر کتنے زخم لگے ہیں، تب جا کر یہ جانا ہے
اپنوں سے تو اچھے ہیں، ہر صورت یہ بیگانے لوگ



حافظ رفیق دردؔ



تم نہ سمجھو مجھے ذرّے کے برابر یارو
قطرے قطرے سے بھی ہوتا ہے سمندر یارو

جسم کی شاخ پہ کچھ پھول کھِلے زخموں کے
آج بھی کھول کے مارا کرو پتھر یارو

تم مری لاش کو رہ رہ کے تکو گے کب تک؟
ڈھانک دو ڈھانک دو اب خاک کی چادر یارو

راہ میں راہنما چھوٹ گئے تو کیا ہے؟
اپنے احساس کا آئینہ ہے رہبر یارو

غنچے غنچے سے درون دروں کی صدا آتی ہے
کیا کوئی آیا ہے خوشبو کا پیمبر یارو

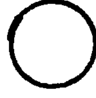
جس کا سایہ بھی دکھائی نہ دیا، تم کو کبھی
اس کا دامن مرے ہاتھ آیا ہے اکثر یارو

ہم وہی، ناؤ وہی اور وہی دریا ہے
تھم گئے سیکڑوں طوفان بھی اٹھ کر یارو

جانے کیا بات ہے شیشوں کے جزیروں میں مجھے
آج ہر سمت نظر آتا ہے پتھر یارو

...ر دردؔ نے دیکھا ہے اس دور کے انسانوں کو
وادئ نور میں کھاتے ہوئے ٹھوکر یارو

انجمؔ صہبائی



حادثے ہجر کے جس دم دلِ بیتاب میں تھے
زخم لمحوں کے کئی دیدۂ بےخواب میں تھے

نیند گردش میں تھی سوکھے ہوئے پتوں کی طرح
گذرے لمحوں کے مناظر ہی مرے خواب میں تھے

جب بھی زخموں سے ترے نام کی خوشبو مہکی
نقش یادوں کے کئی دیدۂ پُرآب میں تھے

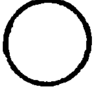
مٹ گئی گردشِ ایام کی صورت یارو
کتنے یادوں کے مناظر شبِ مہتاب میں تھے

پھر نیا چاند نئے درد کا درماں ٹھہرا
قافلے وقت کے ورنہ رہِ سیلاب میں تھے

بچ کے آئے ہیں دو جان سلامت انجمؔ
دشمنِ جان کئی حلقۂ احباب میں تھے



جمیل کلیمی



وہ جا رہا ہے چاند شبِ غم بچو
سورج کی تیز دھوپ میں ہم سب کو

کچھ لوگ ابھی پرانی ڈگر پر ہیں گام
اُن کو بھی لائیے نئی منزل پہ موڑ

برسوں کا یہ جمود کسی طور ختم
رکھ دیجئے حیات کے شانے جھنجھوڑ

صادق ہے عشق تو نئے اصنام آذ
ہم کیوں نہ خود تراش لیں پتھر کو تو

تجھ کو بھی کچھ خبر ہے ترے سنگِ در سے ہم
اٹھے ہیں خود ہی آخرِ شب سر کو پھوڑ کر

تاریکیوں کو لے کے گئی رات تو جمیلؔ
جنگل کے پیڑ پیڑ پہ چڑیوں کو چھوڑ کر

رمزؔ سیتاپوری



تصویرِ فن ابھی تو ادھوری ہے دوستو
اک ایک قطرہ دل کے لہو کا نچوڑ دو

یہ کائنات گوشۂ مرقد سے کم نہیں
اتنی جگہ نہیں ہے جو کروٹ بدل سکو

تم بھی مرے وجود سے باہر نہ جا سکے
اے جادۂ حیات کے گم گشتہ قافلو

کس درجہ تیز رو ہے یہ دورِ حیاتِ نو
اے رہروانِ مردہ مرا ساتھ چھوڑ دو

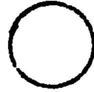
جس دل کو دیکھئے وہ ہے اک زخمِ خونچکاں
لے جائیں ہم کہاں جگرِ لخت لخت کو

یوں جگمگا اٹھا ہے، تصوّر کا آئینہ
اک ساتھ جیسے سیکڑوں دلزدوں کا رقص ہو

ہر ایک کے لئے نہیں میری زبانِ فن
پاس آئے اب وہی جو پیمبر سے کم نہ ہو

اے رمزؔ جاگنے سے نہ کم ہوگا دردِ ہجر
لمبی ہے غم کی رات ذرا دیر سو بھی لو

ناظرؔ صدّیقی



کیفیتِ بہار کے زیرِ اثر ملی
انجام سے ہر ایک کلی بے خبر ملی

دل پہ نظر پڑی تھی کہ حیران رہ گئے
ہم خود ہی کھو گئے، جو تری رہگذر ملی

جتنے بھی غم ملے، وہ مجھے مستقل ملے
جو بھی خوشی ملی وہ بہت مختصر ملی

دل میں کسی کی یاد کے نشتر چبھو گئی
کچھ اس ادا سے آج نسیمِ سحر ملی

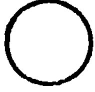
کیا کیا گلے کئے ہیں زبانِ خموش نے
مدّت کے بعد ان سے جو میری نظر ملی

صحنِ چمن میں جشنِ بہاراں تو ہو گیا
مانا گلوں کو عمر بہت مختصر ملی

ناظرؔ غمِ حیات سے بچ کر نہ جا سکے
پہنچے جہاں بھی، گردشِ شام و سحر ملی



نصیرؔ پرواز



لذّت خلوصِ لمس مداراتِ جامِ عمر
اتنے تکلّفات کا کیا اہتمامِ عمر

اب کیوں نہ زندگی کو فقط آرزو کہیں
ہم نے تو آرزو میں گزاری تمام عمر

خوابوں کے گیت شوق کی غزلیں طلب کے شعر
لکھتی رہی ہے سوگ میں ڈوبا کلام عمر

جلتے رہے گلوں کے جگر جس کی آگ میں
دیتی رہی اُسی کو بہاروں کا نام عمر

پھر کیا سمجھ سکے گی مرے غم کی عظمتیں
جب خود سمجھ نہ پائی، تو اپنا مقام عمر

ہر اک قدم سراب کی پرچھائیاں ملیں
پروازؔ جب بھی بھٹکی کہیں تشنہ کام عمر



"نغمۂ شاہین"

میکسم گورکی
روسی کہانی
مناظر عاشق ہرگانوی

پہاڑ کے اوپر ایک سانپ رینگ رہا تھا۔ آگے دھند سے بھری ہوئی ایک گھاٹی میں رک کر وہ نیچے سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

اوپر آسمان میں سورج چمک رہا تھا اور نیچے سمندر کی لہریں چٹانوں سے اونچی آواز میں ٹکراتی ہوئی ٹوٹ رہی تھیں ___

اچانک ایک باز جس کے پروں سے لت پت تھے اور جس کے سینے میں زخم کا نشان تھا، آسمان سے نیچے اس گھاٹی میں گرا، جہاں سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔

نیچے گرتے ہی باز کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ جانکنی کی حالت میں چٹان پر اپنے بازو جھٹکنے لگا۔ سانپ ڈر گیا اور وہاں سے ایک سمت چل پڑا۔ لیکن تبھی اس نے دیکھا کہ پرندہ بری حالت میں ہے اور چند ہی لمحوں میں مر جانے والا ہے۔ اس لئے وہ لوٹ کر باز کے پاس آیا اور بولا "تم اتنی جلد مر جاؤ گے کیا ___؟

"ہاں، اب میں کچھ ہی دیر کا مہمان ہوں" باز نے آہ بھر کر کہا۔ لیکن میں بہت جی چکا ہوں۔ میں نے خوشی کا مزہ چکھا ہے۔ میں آسمان میں اڑا ہوں۔ تمہاری طرح میرا مشاہدہ ادھورا نہیں تم کبھی آسمان کو اس طرح نہیں دیکھ سکو گے، جیسا میں نے دیکھا ہے۔"

"آسمان؟" کیا میں آسمان میں رینگ سکتا ہوں، مگر میرے لئے تو یہ چکنی گھاٹی ہی اچھی ہے" اس آزادی کے دیو باز سے سانپ نے کہا۔

باز، سانپ کی باتوں پر دل ہی دل میں ہنس پڑا۔

اور سانپ نے سوچا ___ کوئی اڑتا ہے، یا رینگتا ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہر چیز کا ایک ہی اختتام ہے۔ ہر کو آخر زمین میں سما جانا ہے۔

اچانک باز نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اس گھاٹی میں ز دوڑائی۔

گھاٹی کے دراروں میں سے پانی رِستا ہوا بہہ رہا تھا اور گھاٹی کی ہوا میں موت کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

باز نے پوری طاقت سے چیخ کر اداس لہجے میں کہا "آسمان میں اڑنا ___ کاش ایک بار میں پھر سے اڑ سکوں میں دشمن پر حملہ کروں گا اور اپنے سینے سے اس کا سر کچل ___ آہ دشمن کے ساتھ لڑنے کی ان دیکھی خوشی!"

سانپ نے سوچا۔ اگر باز کے دل سے ایسی چیخ نکل سکتی ہے اور آخری لمحے میں ایسی خواہش ابھر سکتی ہے، تو آسمان میں رہنا یقیناً بہت خوبصورت ہوگا۔

اس نے باز سے کہا "رینگتے ہوئے اس چٹان کے سر پر آؤ اور نیچے چھلانگ لگا دو۔ شاید تمہارے پر اچھا

بھاری بوجھ اٹھا سکیں اور پھر سے آسمان میں اڑنے لگو گے
باز کے جسم میں لرزش پیدا ہوئی۔ اس نے تکلیف سے ایک چیخ ماری اور چٹان کے سرے کی طرف بڑھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنے پر پھیلائے، گہری سانس لی اور آنکھوں میں چمک بھر کر چھلانگ لگا دی۔

وہ ایک پتھر کی طرح گرا اور گرتے ہی اس کے پر ٹوٹ کر بکھر گئے۔

وہ سمندر میں گرا تھا۔ ایک لہر نے اسے اپنے ہاتھوں میں نرمی سے تھام لیا، اس کا خون دھویا، اسے اپنے جھاگ میں لپیٹ لیا اور پھر سمندر کے نیچے لے گئی۔

سمندر کی لہریں چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی اداسی میں رو رہی تھیں اور باز غائب ہو چکا تھا۔ سمندر میں دور و نزدیک اس کا کہیں نام و نشان بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔

سانپ بہت دیر تک کنڈلی مارے بیٹھا، باز کی موت اور آسمان کے لئے اس کے پیار کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اس نے سمندر کے پھیلاؤ کا جائزہ لیا، جہاں سپنے جنم لیتے ہیں اور دل کی بےچینی دور ہوتی ہے۔

"بھلا کیا دیکھا تھا اس ابھاگے باز نے اس آسمان کی وسعتوں میں؟ ایسے پرندوں کو کیا حق ہے کہ اڑنے کی باتیں کر کے دوسروں کو بےچین کریں؟ آسمان میں کیا ہے؟ اس سب کا ایک ہی اڑان میں مجھے پتہ لگ سکتا ہے۔ چاہے وہ چھوٹی سی ہی اڑان کیوں نہ ہو؟" سوچتے سوچتے اس نے اپنی کنڈلی اور کس لی۔ پھر وہ اچھلا، اور دھوپ میں کوئی لمبی کالی چیز چمکی۔

لیکن رینگنے والے کبھی اڑ نہیں سکتے۔ سانپ نیچے چٹان پر گرا تھا۔ لیکن وہ مرا نہیں، وہ ہنسا اور اس نے سوچا "تو یہ ہے اڑنے کا مزہ" اور گرنے کا مزہ ــ اے بیوقوف پرندو! جو زمین کو جانتے نہیں، وہ اس پر رہ کر خوشی کا مزہ نہیں لوٹ سکتے۔ وہ صرف آسمان میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن آسمان میں ہے ہی کیا۔ بیشک بہت روشنی ہے وہاں، لیکن کوئی سہارا نہیں ہے ــ اب کوئی پرندہ اپنی باتوں سے مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اب میرے سامنے ساری اصلیت آ چکی ہے۔ میں نے آسمان دیکھ لیا ہے۔ میں اس میں اڑا ہوں اور اس کا پورا پتہ لگ گیا ہے مجھے۔ میں وہاں سے ایسا گرا ہوں کہ مرتے مرتے بچا ہوں۔" یہ سب سوچتے ہوئے اس نے ایک پتھر پر کنڈلی ماری اسے خود پر بڑا غصہ تھا۔

نیچے سمندر چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر رہا تھا اور لہریں اونچی آواز میں کنارے کی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں ــ!

اطالوی - البرٹو موراویا
ترجمہ - حسن نظامی کیرانی

گرمی کا مذاق

گرمی کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ مجھ میں ابھی تک پختگی نہیں آئی ہے۔ اسی لئے تو یہ بات میرے دماغ میں نقش نہیں ہو سکی ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری بیوی ہے۔ میرا بچّہ ہے اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ گھر سے فرار ہونے کی خواہش شدید ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں گرمی کے موسم کا کتنا ہاتھ ہے۔ یہ میں کہہ نہیں سکتا۔

امیروں کے گھروں میں سویرے ہی دروازے کھڑکیاں بند کر لئے جاتے ہیں۔ رات کی خوشگوار ہوا بہت دیر تک لطف دیتی رہتی ہے۔ ان کمروں میں چمکدار فرنیچر، سنگ مرمر کا فرش اور چاروں طرف بہے پھول اس دھیمی روشنی میں اپنا سماں باندھے رکھتے ہیں۔ سب کچھ اپنی جگہ پر خالص، صاف ستھرا، پیاس لگتی ہے۔ تو کوئی شاندار ٹرے میں منقش شیشے کے گلاس میں برف ملا پانی یا شربت پیش کرتا ہے۔ پانی میں پڑی برف کی کھنکھناہٹ ہی تازگی دینے کو کافی ہے لیکن غریبوں کے یہاں یہ بات کہاں ہے۔

پہلے ہی دن دندناتی ہوئی گرمی بند کبوتر خانے جیسے کمرے میں چلی آتی ہے اور اپنی سلطنت قائم کر لیتی ہے۔ پانی پینا ہو تو باورچی خانے کے نل سے ایسا پانی ملتا، جیسے کہ گرم سورج ہو۔ اندر بیٹھنے ڈولنے کی جگہ نہیں ملتی۔ ساری چیزیں میز، کرسی، کپڑا اور گھر کا سارا سامان جیسے کہ گرمی کے مارے سوج گیا ہو۔ گھر کے سارے لوگ صرف بنیائن یا قمیص پہنے نظر آتے ہیں۔ وہ بھی پسینہ سے تربتر اور۔ اور کھڑکی بند کرو تو سانس گھٹتی ہے۔ کیونکہ رات کی مانند ہو اس کمرے میں وہاں سے آتی ہے، جہاں رات کو کچھ آدمی سو ہوں۔ کھڑکی کھولنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ سورج ہی اندر آ گیا ہے اور ہم کمرے میں نہ ہو کر سڑک پہ ہوں اور کمرے کی ساری چیزیں گرم ہو کر بھاپ دینے لگتی ہیں۔ گرمی میں لوگوں کا دماغ گرم ہو جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ طبیعت بھی گرم ہو جاتی ہے۔ امیر کو غصہ آئے بھی تو وہ چوتھے کمرے تک چہل قدمی کرے گا۔ مگر غریبوں کو تو ڈبے میں بند مچھلیوں کی طرح رہنا ہے۔ گرمی اور گرد آلود آب و ہوا میں یا پھر گھر سے نکل جائیں۔

گرمی کے دنوں میں ہی ایک دن میں اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ جھگڑ پڑا۔ بیوی کے ساتھ کیونکہ سبزی میں نمک زیادہ تھا اور جلی ہوئی تھی۔ سالے کے ساتھ کیونکہ اس نے میری بیوی کی طرفداری کی تھی۔ جبکہ وہ میری کمائی کھا رہا ہے۔ سالی کے ساتھ۔ سالی کے ساتھ کیونکہ اس نے میری طرفداری کی، وہ بھی اس لئے کہ میں اسے اچھا لگتا ہوں۔ ماں کے ساتھ کیونکہ اس نے میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ والد کے ساتھ کیونکہ کھانے کے وقت انہیں شور و غل پسند نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی ننھی بچی کے ساتھ کیونکہ وہ میرا شور سن کر رو دی تھی۔ میں اچانک کرسی سے اٹھا۔ اپنی جیکٹ اٹھائی اور کہا—

"میں تم سب سے تنگ آگیا ہوں۔ اکتوبر تک واپس آجاؤں گا جب موسم ٹھنڈا ہو جائے گا" اور میں باہر چلا گیا۔

میری بیوی، میرے پیچھے دوڑی اور بولی کہ آج اس نے گاجر کا حلوہ بنایا ہے، جو کہ مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ خود کھا جائے اور میں سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔

میں اپنا محلہ چھوڑتا ہوا ٹائبر ندی کے کنارے آگیا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ کنارے پر لگی ریلنگ بھی گرمی سے تپ رہی تھی۔ چاروں طرف پٹرول کے ٹینک، اونچے بجلی گھر اور دوسری اونچی عمارتوں سے گھرا یہ علاقہ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کہ روم نہ ہو کر کوئی صنعتی شہر ہو۔ میں آگے کی جانب بڑھتا گیا۔ جہاں پکی سڑک کے ایک طرف کچی سڑک تھی اس پر ہو لیا۔ کم سے کم اتنی گرمی تو نہیں تھی۔ کچی سڑک پر بھی چلتا گیا۔ یہ ہمارے گھر کے نزدیک ہی ہے۔ مگر میں اس طرف زیادہ نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے ڈھیر نظر آنے لگے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ تو سارے روم کے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ ہے جہاں کوڑا کرکٹ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سی بن گئی تھیں۔

میری ہمت آگے جانے کی نہیں تھی۔ لیکن واپس لوٹنے کا بھی دل نہیں تھا۔ اتنے میں ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جیسے کہ کوئی اپنے کتے کو بلا رہا ہو۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ لیکن مجھے وہاں پر کوئی کتا دکھائی نہ دیا، حالانکہ ایسی جگہ پر تو کتوں کو ہونا چاہیئے تھا۔ وہ بھی شاید گرمی کے مارے آرام کر رہے تھے۔ پھر مجھے کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں کے پیچھے ایک جھونپڑی دکھائی دی جس کی دیواریں ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ اور چھت کی جگہ پر پرانی ٹین کی چادریں تھیں۔ دروازے پر کھڑی لگ بھگ آٹھ سال کی ایک بچی مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھی۔ اس کے گندے اور سفید چہرے پر ابھی سے بختلی کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کے بکھرے بالوں میں خشک گھاس اور گرد بھری تھی۔ اس کی پوشاک بھی معمولی تھی۔ ایک ٹاٹ کے تھیلے میں چار سوراخ تھے۔ دو ہاتھ اور دو پاؤں کے لئے۔

جیسے ہی میں اس کی طرف مڑا۔ اس نے پوچھا "کیا آپ ڈاکٹر ہیں —؟"

"نہیں — کیوں؟ کیا تمہیں ڈاکٹر چاہیئے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر آپ ڈاکٹر ہیں، تو اندر آئیے، میری ماں بیمار ہے" اس نے کہا اور وہ اندر چل دی۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ اندر پہنچتے ہی مجھے محسوس ہوا، جیسے کہ میں کسی کباڑی کی دکان میں آگیا ہوں۔ کیونکہ چاروں طرف چھت سے پرانے کپڑے اور برتن لٹک رہے تھے۔ میں اپنا سر بچاتا ہوا جھک کر آگے کی جانب بڑھا، تو ایک اندھیرے کونے میں چیتھڑوں کا ایک گٹھر دکھائی دیا۔ اس گٹھرے میں سے ایک آنکھ جھانک رہی تھی۔ نزدیک جانے پر میں نے دیکھا کہ اس کی دوسری آنکھ پر سفید بالوں کی لٹ تھی۔ وہ عورت عمر دراز دکھائی دے رہی تھی۔ مگر مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو چمک آئی وہ کسی عمر دراز عورت کی نہیں لگی۔ وہ بولی — "اچھا تم پھر آگئے؟"

بچی ہنس پڑی جیسے کہ جو تماشہ وہ دیکھنا چاہتی تھی اس کی خواہش کے مطابق وہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور چند خالی ٹین کے ڈبوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔

"میں تو تم کو جانتا بھی نہیں" میں نے کہا "تم کو کیا تکلیف ہے اور کیا یہ بچی تمہاری ہے؟"

"ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔ میری ہے اور تمہاری بھی" اس عورت نے کہا

بچی پھر ہنسی۔ اتنے میں عورت اپنے چیتھڑوں میں سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور میری طرف انگلی سے اشارہ کرتی ہوئی بولی — "ہاں تمہاری تو ہے۔ سست، کاہل، نکمے آدمی"۔ ان الفاظ کو سن کر بچی خوب ہنسی۔ جیسے کہ اسی کو سننے کے لئے وہ مجھے اندر لائی تھی۔ مجھے بھی غصہ آگیا۔

میں نے کہا "تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں کیا کہہ چکا

ہوں کہ میں تمہیں جانتا بھی نہیں۔"

"نہیں جانتے؟ نہیں جانتے تو پھر لوٹ کر کیوں آئے؟" اس نے تیکھی آواز میں پوچھا۔

"کیوں آیا۔ میں تو یہاں سے جا رہا تھا۔ اس بچی نے مجھے اندر لایا۔"

"ہاں ہاں اب تو یہی کہو گے" پھر وہ بچی سے بولی۔ "لانا تو میرا کالا بیگ"

بچی نے ایک کالا مخملی بیگ اسے لاکر دیا۔ اس میں سے ایک کاغذ نکالتی ہوئی وہ عورت بولی "یہ دیکھو۔ یہ تمہاری اور میری شادی کا پرچہ۔ اب بھی تم انکار کرتے ہو؟"

"لیکن میرے ساتھ تمہاری شادی نہیں ہوئی" میں نے اس کے پاگل پن کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ چیتھڑوں سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ تیس سے اوپر کی نہیں تھی۔ وہ چلائی۔ "تو تم انکار کرتے ہو۔ تم کمینے۔ کاہل"

میں دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم آرام کرو" بچی اٹھ کر خوشی کے مارے ناچ رہی تھی۔

"رکو، اتنی آسانی سے تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ تمہیں ایک سال ہوگیا ہے۔ گھر سے بھاگے ہوئے تم جانتے ہو؟ میں نے اور تمہاری بچی نے کیسے گزارا ہے یہ سال۔ ہم نے کیا نہیں کھایا" غصے کے مارے وہ آگے نہ کہہ پائی۔ پھر وہ سانس درست کر کے بولی۔ "وہ تم بتا دو میری بچی اپنے باپ کو بتا دو کہ تم نے کیا کھایا ہے۔ اور کیا پہنا ہے"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں ابھی ابھی اپنی بیوی اور بچی کو ذکر کر آیا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ عورت پھر چلائی ——

"بیو تو مت دیکھو۔ ہماری حالت دیکھو" اتنے میں دوسری طرف سے آہٹ ہوئی۔ تو میں اس جانب دیکھنے لگا۔ ایک نوجوان عورت پیچھے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

"آپ اس کی باتوں کا خیال نہ کریں۔ سب آدمی اسے اپنے شوہر لگتے ہیں۔ جو اسے چھوڑ کر کہیں گیا۔ لیکن مر گیا ہے۔ یہ شیطان بچی لوگوں کو بلا کر یہاں لاتی ہے اور تماشہ دیکھتی ہے"

وہ بچی کی طرف لپکی۔ لیکن بچی ناچتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی۔ اور مجھ سے بولی "تم مان گئے اندر آنے کو اور ڈر بھاگ گئے تھے۔ کتنا ڈر گئے تھے؟" .... یہ کہہ کر وہ تالیاں بجا کر ناچنے لگی۔

نوجوان عورت اس پاگل عورت کی جانب مڑتی ہوئی بولی "یہ تمہارے شوہر نہیں ہیں۔ آرام کرو" اور پاگل عورت پھر چپ چاپ ان چیتھڑوں میں بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی جیب سے سو "لیرا" کا ایک نوٹ نکالا اور بچی کے ہاتھ میں تھما کر باہر بھاگ آیا۔ بھاگ ہی آنا کہنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ گھر پہنچ کر ہی میں نے سانس لی۔

میری بیوی نے کھانا اور گاجر کا حلوہ گرم کر کے کھلایا۔ اور کھڑی ہو کر برتن دھونے لگی۔ میں نے چپکے سے گردن کو چوم لیا۔

کچھ دنوں بعد میں نے اپنی بیوی کو وہ واقعہ سنایا۔ یہ سوچ کر کہ اس بچی کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ میں پھر اس طرف گیا۔ لیکن وہاں ان کچرے کے ڈھیروں میں مجھے نہ تو کوئی جھونپڑی ملی۔ نہ دونوں عورتیں اور نہ ہی وہ بچی۔ شاید میں راستہ بھول گیا تھا۔ لیکن میری بیوی تو کہتی ہے کہ گھر لوٹنے کے لئے میں نے ایک فرضی واقعہ کا سہارا لیا ہے۔ ورنہ کیا منہ لے کر گھر لوٹتا۔

بقیہ افسانچے

کوشش اٹھنے کی تھی —— لیکن اٹھ نہیں پائی۔ وہ گر کر خاموش ہوگئی ——!

اور نرس بھاگ کر وارڈ سے نکل گئی ——!

وہ کھڑا دیکھتا رہ گیا ——!

(بقیہ صفحہ ۵۲ پر)

اگسٹس موئیر
عامر فہیم ثناء اللہ

سلور ماسک

جناب پولیس ابتک سلور ماسک پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ میں نے ڈاکٹر لوئیس رافیل سے کہا "میرا تو خیال ہے وہ اسے گرفتار بھی نہیں کر سکے گی۔

میں نے انہیں ایک شام کے اخبار کی سرخی دکھائی۔ یہ اخبار میں نے ہارسے سٹریٹ سے پیکاڈیلی انسٹی ٹیوٹ سے خریدا تھا۔ میں دوپہر کے بعد وہیں ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے نوٹس تیار کرتا رہا تھا۔

"اچھا تم بھی اس کے متعلق سوچ رہے ہو۔ ڈاکٹر رافیل نے شیری کا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ واقعی چالاک آدمی ہے۔"

"چالاک! جناب یہ لفظ اس کے لئے موزوں نہیں وہ تو ابلیس ہے۔ ابلیس۔ ایک ماہ کے اندر تین کامیاب وارداتیں جناب اب تو بڑے بڑے ریسٹوران خالی نظر آتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم تھا۔ کہ میں نے اسے ابلیس کیوں کہا۔ پتہ نہیں کون تھا جس وقت واردات کرتا تھا تو چہرہ پر سفید چاندی کی طرح کا چمکدار ماسک لگائے ہوئے ہوتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اخبارات اسے سلور ماسک کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اخبار، پولیس یا عوام کو اس کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔

"میں دو اور دو کو چار بنانے کی کوشش کر رہا تھا ڈاکٹر نے کہا۔ وہ غالباً گہری سوچ میں تھا۔ اس نے شیری کا خالی گلاس میز پر رکھا اور دونوں ہاتھ ڈریسنگ گون کی جیبوں میں ڈال لئے۔ "تم کہو گے کہ جواب تو چار ہی آئے گا۔ مگر یہ آسان نہیں ......" اس نے فوراً موضوع بدل دیا "کیا تمہیں وہ لنچ پارٹی یاد ہے۔ جو میں نے دو دن پیشتر اپنے چند دوستوں کو دی تھی۔

"جناب مجھے اچھی طرح یاد ہے"۔ میں نے جواب دیا ڈاکٹر میری بات کو سمجھ کر مسکرایا۔ میں دو ماہ سے ڈاکٹر رافیل کا پرسنل سکریٹری تھا۔ اس سے پہلے کرمنل انویسٹیگیشن ڈیپارٹمنٹ میں تھا اور ریٹائر ہوا تھا۔ وہ دو ماہ سے کتاب تصنیف کر رہا تھا جس پر رات دن محنت ہو رہی تھی وہ اس دوران دو تین آدمیوں کے سوا کسی سے نہیں ملا اور یہ آدمی بھی وہ ہوتے تھے جن سے کتاب کے لکھنے میں مدد ملتی تھی اور اس وقت مجھے سخت حیرت ہوئی جب اس نے دو دن پیشتر لنچ پارٹی دی تھی۔

میرا خیال ہے تمہیں وہ پارٹی کیوں یاد ہے کہیں اس سپینی لڑکی سینوریتا کورڈوا کی وجہ سے تو یاد نہیں۔

میں تمہیں الزام نہیں دوں گا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت ہے۔ اچھا ہوا جو لیڈی ٹریوانی اسے اپنے ساتھ لے آئی۔

میں اس بات سے انکار نہ کرسکا۔ وہ ایک سپینی لڑکی تھی۔ ایک بڑے ہوٹل مارکوئیس ہوٹل میں ڈانسر تھی اور چند ماہ کے اندر لندن کی سوسائٹی میں نام پیدا کرلیا تھا اور لوگ اسے صف اول کی رقاصہ قرار دیتے تھے۔ اب وہ دوسرے ہفتے سے ہالی ووڈ میں بطور اداکارہ کام کرنے والی تھی۔ آج رات اس کا آخری ناچ ہونے والا تھا۔

تم بھی آج ہوٹل جاکر اس کا رقص دیکھو۔ میرا تو جی چاہتا ہے اپنے ساتھ کوئی لڑکی لے جاتا۔ ڈاکٹر رافیل نے کہا۔

"یہ تو بڑی مسرت کی بات ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اور دل ہی دل میں ڈاکٹر کو دعائیں دینے لگا۔ مگر لڑکی کی تلاش ایک مسئلہ تھا۔

"مگر تم جاکر کیا کروگے وہ تو رقص نہیں کرے گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"رقص نہیں کرے گی" میں نے حیرانگی سے کہا "کیوں وہ رقص کیوں نہیں کرے گی۔ آج تو اس کی آخری رات ہے۔"

ہاں وہ رقص نہیں کرے گی اس نے چند لمحے میری طرف دیکھا۔ "میرے ساتھ آؤ میں تمہیں ایک چیز دکھاؤں" اور لائبریری سے ملحق کمرے کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو حیرت سے میرا منہ کھل گیا کیونکہ بستر پر کسی لڑکی کا جسم تھا۔ اور وہ جسم سینوریٹا کورڈووا کا تھا۔ اس کے سرہانے ایک باوردی نرس بیٹھی تھی۔ سینوریٹا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ زرد تھے اور آپس میں چپکے ہوئے تھے۔ سانس تیزی سے آجا رہا تھا۔

"ابھی تک کوئی فرق نہیں جناب" نرس نے کہا۔

[illegible] ڈاکٹر نے جواب دیا اور بستر کے ایک طرف بیٹھ گیا اور اپنی انگلی اس کی نبض پر رکھ دی۔ اس کے بعد وہ اٹھا اس ادھیڑ عمر نرس کو مختلف ہدایتیں کیں ایک انجکشن لگایا۔

"اگر کوئی تبدیلی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دو" اس نے کہا اور ہم واپس لائبریری میں آگئے۔

میں نے جو کچھ دیکھا وہ مجھے ششدر کرنے کے لئے کافی تھا تقریباً آدھے درجن سوالات میری زبان سے باہر نکلنے کو بے تاب تھے مثلاً سینوریٹا یہاں کیسے آئی؟ کس طرح اس حالت میں پہنچی، زخمی کرنے والا کون تھا؟ ڈاکٹر اس معاملے میں کب شامل ہوا۔ مگر میں نے اس خواہش کو دبا دیا۔ کیونکہ میں دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کسی معاملے پر سوچ رہا تھا۔

"کیپٹن والڈ چند لمحوں بعد آجائے گا۔ شاید کوئی معلومات بہم پہنچائے۔" ڈاکٹر رافیل نے اچانک کہا۔

کیپٹن والڈ .... میں نے ذہن پر زور دیا۔ اور یاد آگیا کہ ایک آدمی سٹیفنسن والڈ لیڈی ٹریوانی اور سینوریٹا کے ساتھ آیا تھا۔ شاید کورڈووا اور وہ دوست تھے۔ افواہ تھی کہ وہ جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔ کیونکہ تقریباً ایک ماہ سے وہ اکٹھے نظر آرہے تھے۔ مجھ سے بھی ملا تھا۔ بڑا خوش اخلاق آدمی تھا۔ اور خوش قسمت بھی۔

سینوریٹا کو والڈ ہی اپنی کار میں یہاں لایا تھا۔" رافیل نے کہا۔ "سینوریٹا پکیڈلی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی ہے والڈ اس سے پانچ اور چھ کے درمیان اس سے ملنے گیا۔ تو یہ بے ہوش تھی اور فلیٹ میں اکیلی تھی۔ اس کی نوکرانی باہر تھی اس نے سینوریٹا کے ڈاکٹر کو فون کیا مگر وہ نہ آسکا اس لئے وہ اسے میرے پاس لے آیا۔ اس وقت اس کی طبیعت بڑی خراب تھی اور وہ بے ہوش تھی۔"

کیا آپ کو پتہ چل گیا ہے کہ اسے کیا ہے؟" میں نے پوچھا "میرا مطلب ہے کہ وہ جلد اچھی ہو جائے گی۔"

ہاں! مگر اس کی حالت بڑی خراب ہے۔ ڈاکٹر نے موٹا مصری سگریٹ سلگایا اور خالی ماچس آتش دان میں پھینک دی۔

"کیا کام کرسکتی ہے جناب؟" میں نے پوچھا
"نہیں ہرگز نہیں" رافیل نے جواب دیا: "اب
اسے خود ادا رہنا پڑے گا۔ کیونکہ اسے جو دوا دی گئی ہے۔
اس کا نام ایپیترو کسن ہے۔ اس کا ذائقہ وائن کی طرح
ہوتا ہے۔ اور پلایا بھی وائن میں گیا ہے۔ تم کہو گے کہ مجھے
دوائی کا کس طرح معلوم ہو۔ تو یہ ہے کہ یہ دوائی جہاں
لگ جائے نشان پڑ جاتا ہے۔ اور یہ سینوریٹا کے ہونٹوں
پر لگی ہوئی تھی۔ اسے یقیناً پورٹ میں ملا کر پلایا گیا ہے۔
"مگر یہ سب کس نے کیا؟" میں چلایا
رافیل نے کندھوں کو جھٹکا دیا۔ کیپٹن والڈ
بتاتا ہے۔ کہ جب وہ اوپر جا رہا تھا تو سیڑھیوں پر سے
ایک آدمی آتا ہوا ملا تھا۔ مگر وہ اسے نہیں جانتا۔
"وہ کون تھا؟"
"میں بھی تمہاری طرح انجان ہوں ......
اور جب میں نے یہ معاملہ دیکھا تو اسے سڑائی چینین کا انجکشن
دیا۔ اور اب وہ ہوش میں آئی تو کچھ پتہ چلے گا۔ اور شاید
کچھ بتائے۔ وہ اپنی جان نہیں دینا چاہتی۔ اس کے
پیچھے کیا مصلحت ہے۔ ہم اس سے انجان ہیں ....
وہ شاید والڈ آ گیا ہے۔ وہ سینوریٹا کے فلیٹ گیا تھا
تاکہ معلوم کرسکے کہ کہیں وہ وہاں کوئی چیز تو نہیں چھوڑ گیا
اس آدمی کی نشاندہی کرسکے جو اسے سیڑھیوں پر
ملا تھا۔"

ایک کار مکان کے باہر آ کر رکی اور وہ یقیناً
اپنی والڈ کی تھی۔ وہ ہٹا کٹا آدمی تھا۔ عمر تقریباً
۴۰-۴۵ سال تھی۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں تشویش
کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔
"کتنا خوفناک واقعہ ہے۔" اس نے کہا۔ "ڈاکٹر
اب وہ کیسی ہے؟"
"الامان بخشی!" ڈاکٹر نے کہا۔ "کچھ ٹھیک!"

"نہیں جناب" والڈ نے کہا: "اس نے وہاں کوئی نشان
نہیں چھوڑا۔ فلیٹ کے نیچے والے لوگ بھی نہیں بتا سکے کہ وہ
کون تھا۔ میں اب خود اسے نہیں پہچان سکوں گا۔ کیونکہ میں نے
اس پر طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔" پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔
ڈاکٹر آپ کا شکریہ ....
میں نے مارکوہسٹ ہوٹل فون کر دیا کہ وہ لوگوں کو
آگاہ کر دیں کہ سینوریٹا آج رقص نہیں کرے گی۔ ویسے میں نے
اسے تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا۔
"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر رافیل نے کہا۔ "مگر تم سے یہ غلطی
ہوئی ہے۔ تمہیں پولیس کو اطلاع کر دینی چاہیئے۔"
"مگر یہ بڑا جھنجھٹ ہے۔ اس طرح سینوریٹا کے اسکنڈل
کو اخبارات ہوا دیں گے اور وہ بدنام ہو جائے گی۔"
"کچھ بھی ہو ہم پولیس کو اطلاع نہ دے کر سخت غلطی کر رہے
ہیں۔"
"ڈاکٹر آپ کی بات ٹھیک ہے۔ مگر میں زیادہ تشہیر نہیں
چاہتا۔" اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اپنی انگلیاں ایک
دوسرے میں پیوست کر دیں۔ "اگر وہ جلد ہوش میں نہ آجائے تو شاید
بتا سکے۔" اس نے انگلیاں علٰحدہ کیں اور ماتھا تھام لیا۔ "
خدا کرے جلد ہوش میں آئے اور بتائے کہ یہ کیا راز ہے۔ ڈاکٹر
میں ایمانداری سے کہہ رہا ہوں۔ میں بہت خوفزدہ ہو چکا ہوں۔"
میں نے دیکھا واقعی اس بے چارہ کو بہت تشویش ہے
اور سخت صدمہ پہنچا ہے۔ وہ مجسم غم نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر رافیل کمرے
میں ٹہل رہا تھا۔ پھر وہ اچانک بولا۔
جانتے ہو جب تم مجھے اس آدمی کے متعلق بتا رہے تھے تو
میرے ذہن میں کیا خیال آیا۔ ".......... مجھے فوراً یہ خیال
آیا وہ سلور ماسک ہو گا۔ اور یہ کام بھی اسی کا ہے یا پھر ممکن ہے
میرا خیال غلط ہو۔ کیونکہ .... میرا مطلب ہے میں نے
اسے ابتک نہیں دیکھا۔" اور کندھوں کو جھٹکا دیا جو اس کی
عادت تھی۔ "مگر ہاں جانے سے پہلے ایک ایک پیگ سینوریٹا کا

جام صحت کے طور پر ...."

اور اس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتا۔ دروازہ اچانک کھلا۔ اور وہاں ایک اجنبی رافیل کے بوڑھے نوکر کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور بوڑھے کا رنگ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ ہم تمام ششدر رہ گئے۔

"معاف کیجئے" اجنبی نے کہا۔ اس کی آواز جیسے بہت دور سے آرہی ہو۔ اور آواز میں غیر ملکی انداز شامل تھا۔ "ڈاکٹر رافیل؟" رافیل نے سر ہلایا اور غصے سے جواب دیا۔

"میں اس وقت مصروف ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے ڈاکٹر میں بھی ایک اہم کام کے لئے آیا ہوں۔ اس کی پتلی انگلیاں فیلٹ ہیٹ سے کھیل رہی تھیں اور عمر غالباً پچاس سال تھی۔ لمبا۔ دبلا۔ مگر کپڑے اچھی تراش کے تھے۔ اس کی ذہین آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مگر چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

"میں کہہ چکا ہوں میں مصروف ہوں۔ رافیل نے کہا۔ اور جواباً وہ آدمی ہلکا سا جھک گیا۔

"معافی چاہتا ہوں میں اپنا تعارف نہیں کرا سکتا۔ مگر یہاں میری دوست موجود ہے۔ سینوریٹا کورڈووا۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ وہ یہاں موجود ہے۔ رافیل غصے سے بولا۔"

"میں اس کے فلیٹ سے آرہا ہوں۔ اس کی نوکرانی نے بتایا ہے کہ وہ علیل ہے اور آپ کے یہاں ہے۔ اور میں اس کا حال پوچھ سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اس کا حق ہے اور وہ میری دوست ہے۔" اجنبی نے اپنی سرد مہری مگر با اخلاقی قائم رکھی۔ اور

اور اچانک میرے قریب کھڑا ہوا کیپٹن ڈانلڈ آگے بڑھا اس کی گھورتی آنکھیں اجنبی کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے ابھی کہا ہے کہ تم اس کے فلیٹ سے آرہے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تم پانچ اور چھ کے درمیان کہاں تھے؟" اس نے پوچھا۔

"پانچ اور چھ کے دوران ...." اجنبی نے دہرایا۔

"پانچ اور چھ کے دوران ...." اس نے اپنی نگاہ سے پہلے رافیل کو دیکھا اور پھر مجھے اور پھر ڈانلڈ پر جا دی "نہیں میں وہاں نہیں تھا جہاں تم سوچ رہے ہو۔ مجھے تو سے آئے ابھی ایک گھنٹہ ہوا ہے۔

چند لمحے کمرے میں سکوت طاری رہا۔ اور پھر رافیل نے اس خاموشی کو توڑا۔

"مسٹر .... میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور تم مس کورڈووا کے دوست بھی ہو۔ مگر میں اب اس کا معالج ہوں اور ہر قسم کی احتیاط برت رہا ہوں مجھے افسوس ہے کہ آپ اس سے نہیں مل سکتے۔ وہ تم سے آپ پر آگیا۔

"میں نہیں مل سکتا ....؟" اجنبی نے سرد مہری سے کہا۔

"یہ سوال غیر ضروری ہے۔"

"اجنبی نے سر جھکایا۔ اور دروازہ کھولا۔ تو ڈاکٹر نے کہا۔ "اگر تم اپنا نام اور پتہ بتانا چاہو ..."

"نہیں میں بعد میں فون پر دریافت کر لوں گا۔ اجنبی نے دوبارہ اپنی گردن میں تھوڑا سا خم پیدا کیا اور باہر چلا گیا۔

"وہ عجیب آدمی ہے۔ بلکہ شیطان" ڈانلڈ بڑبڑایا۔ پھر اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ آپ نے اس کے متعلق کیا رائے قائم کی؟"

"میں خود حیران ہوں۔ شاید ابھی اور کچھ معلوم ہو۔" رافیل نے کہا۔ "اچھا کیپٹن اگر کورڈووا میں کوئی تبدیلی ہوئی تو میں تمہیں فون کر دوں گا۔ شاید تم مارکو کیٹی ہوٹل میں ٹھہرے ہو نا۔

"ڈاکٹر اسے جلد اچھا کیجئے۔ آپ ...... میرا مطلب ہے۔ آپ جانتے ہیں ہم کتنے گہرے دوست رہے ہیں۔" ڈانلڈ نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

تھوڑا سا شرما گیا۔

"میں جانتا ہوں" ڈاکٹر رافیل مسکرایا۔

رافیل نے خاموشی سے ڈنر لیا۔ اور پھر اوپر چلا گیا میں اپنے نوٹس لے کر لائبریری چلا آیا۔

پھر وہ ایک گھنٹے تک نہیں آیا۔ میں حیران تھا کہ کیا بات ہے۔ آج وہ حسب معمول واپس نہیں آیا۔ اور جب واپس آیا تو کہا۔ "مریڈتھ! آج ہم کیبرے دیکھنے مارکوئیش ہوٹل میں چل رہے ہیں۔

میں حیران تھا کہ پتھر میں جونک کیسے لگ گئی اور دماغ میں کیا سمائی کہ فوراً کیبرے کی جانب متوجہ ہو گیا میں نے گیراج سے کار نکالی۔ اور دس بعد ڈاکٹر کو مارکوئیش ہوٹل پہنچا دیا۔ میں نے ہوٹل کسی پارکنگ میں کار پارک کی ہم دونوں اکٹھے اندر داخل ہوئے۔ رافیل سیدھا ریسیپشن کی طرف چلا گیا اور کیپٹن وائلڈ کا پوچھا۔

کیا آپ ڈاکٹر رافیل ہیں انہوں نے آپ کا پیغام نوٹ کر لیا تھا۔ اور اب میں انہیں بھیج رہا ہوں۔ کلرک نے کہا۔

جلد ہی دو منٹ بعد کیپٹن وائلڈ آ گیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ لبریز تھا۔ "ڈاکٹر اب وہ کیسی ہے۔"

"وہ ابھی تک زیر علاج ہے۔ اور کل تک باہر آ جائے گی۔ رافیل نے جواب دیا۔

اوہ شکریہ ڈاکٹر۔ میں کل اس کے اعزاز میں پارٹی دوں گا۔ ڈاکٹر کہیں مجھے ملتوی تو نہیں کرنی پڑے گی۔ آج تو اس کی جگہ نینا لیگلانی رقص کر رہی ہے۔" وہ ذرا جھجکا "ڈاکٹر اس مجرم سلور ماسک کا پتہ چلا۔" ویسے اس معاملے میں میں کافی فکرمند رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ کورڈووا کو رقص سے روکنا چاہتا ہے۔ مگر کیوں یہ وہی بتا سکے گا۔ میرا ذہن تو خالی ہو چکا ہے۔ پھر اس نے کورڈووا لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ جو ڈائننگ ہال کی طرف جا رہے تھے۔

"ہاں ڈاکٹر اس آدمی نے فون کیا جو بغیر نام بتائے اندر گھس آیا تھا۔

رافیل نے نیم وا آنکھوں سے وائلڈ کو دیکھا وہ یہاں موجود ہے۔ مگر ہمیں پولیس کو بتا دینا چاہئے تھا۔ اور اگر آج رات کچھ ہو گیا تو کیا ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ میں تم مریڈتھ تینوں ہو جائیں گے۔ اور اگر سلور ماسک نے آج یہاں ڈاکہ ڈالا۔ تو یقیناً ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔

"آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔" وائلڈ نے کہا۔ مگر مجھے اس میں کورڈووا کے لئے مصیبت نظر نہیں آتی۔" اس کے بعد وہ ہم سے جدا ہو کر اپنی ایک مہمان جو اس وقت اندر آ رہی تھی چلا گیا۔ میں اور رافیل بعد میں ڈائننگ ہال چلے گئے۔ آدھے درجن لوگ ڈائننگ فلور پر رقص کر رہے تھے۔ اور بینڈ آخری دھنیں بجا رہا تھا۔ ہال لوگوں سے بھر گیا۔ تمام اس بات سے واقف تھے کہ آج کورڈووا کی بجائے نینا لیگلانی رقص کر رہی ہے۔ مگر میرے ذہن میں کورڈووا کی وہ تصویر رقص کر رہی تھی جو وہ سفید لباس پہنے بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ اور ایک نرس اس کے سرہانے بیٹھی اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ رافیل نے کچھ آرڈر دیا اور میں چونک پڑا۔ بیرا میز پر کچھ کھانے کا سامان اور شیمپین رکھ گیا۔

کیبرے بالکل کاروبارانہ انداز میں شروع ہوا پہلے آدھی درجن لڑکیوں نے آ کر رقص کیا۔ اور اس دوران ایک آدمی پیانو پر ایک گیت سناتا رہا جب اختتام ہوا تو میں اور رافیل نے بیک وقت کیپٹن وائلڈ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر مسکرایا

اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ رافیل نے شیمپین سے لبالب بھرے ہوئے گلاس پر تیرتے بلبلوں کو دیکھا۔ اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ جب روشنی گل ہوگئیں تو نینا یگلانی کی باری تھی۔

اور ایک روشنی دائرے کی صورت میں چکرانے لگی۔ آرکسٹرا والوں کی دھنیں چھیڑ دیں اور پھر روشن دائرہ اسٹیج کے سنہرے پردوں پر چلا گیا جہاں نینا یگلانی موجود تھی۔ اس کی نیم عریاں سڈول رانیں اور پنڈلیاں تھرتھرا رہی تھیں اچانک تمام ہال اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوگیا ہے ایمپریر جو ایک کونے سے تمام ہال کی روشنیاں کنٹرول کر رہا تھا۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی۔ آرکسٹرا پانچ سکنڈ تک دھنیں بجاتا رہا۔ پھر خاموش ہوگیا۔ اور پھر وہاں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ ہال کے درمیان سے کوئی بولا۔

میں نے اور رافیل نے سانس روک لئے اور پھر ایک عورت کی چیخ سنائی دی اور دوبارہ خاموشی چھا گئی اچانک ایک آٹومیٹک پستول کی نال نظر آ رہی تھی۔ اور پھر روشنی آگے بڑھی آواز آئی۔ کہ ہر کوئی آرام سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہے سلور ماسک وہاں موجود تھا اس نے ہیروں کا نکلس ایک عورت کا گردن سے اتار لیا جو آخر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں روشنی میں اس کی خوفزدہ آنکھیں چمکتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک جوڑا قیمتی پتھروں کے کنگن کا اتارا۔ اور اس کی ٹارچ کی روشنی ہم سے تقریباً دو گز دور بیٹھی ہوئی ایک عورت پر پڑی اور ایک سفید ہاتھ نے اس کے گلے سے موتیوں کا ہار اتار لیا۔ ہاتھ جس کا بھی تھا۔ لمبی انگلیوں والا۔

میں نے محسوس کیا کہ رافیل اب اپنے پیروں پر اٹھ کھڑا ہوا ہے اور کسی بھی لمحے چھلانگ لگانے کو تیار ہے۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور اچانک رافیل کے منہ سے حیرت سے آہ نکلی۔ اور ہم دونوں نے کرسیاں چھوڑ دیں

اور آگے بڑھے اور ٹارچ یکدم بجھ گئی اور ایسا معلوم جیسا اسے کوئی لڑ پڑا ہے۔

اس دفعہ رافیل نہیں جھجکا۔ اس نے کہا "ہربرٹ ہوشیار" اور جیسے ہی ہم درمیانی میز کی طرف بڑھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بھاگ اٹھا ہو اور اس وقت روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ ایک تنومند جسم فرش سے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ اس کی سفید ٹائی گردن سے پھٹ چکی تھی۔ قمیض کوٹ کے اندر ہونے کے باوجود تار تار ہو چکی تھی۔ کوٹ کے بٹن ٹوٹ چکے تھے اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"وہ کوئی دیو ہے .... شیطان" اس نے کہا "بڑی طاقت ہے اس کے پاس۔ مگر وہ کس دروازے سے گیا ہے۔"

یہ الفاظ جس نے ادا کئے تھے وہ کیپٹن وائلڈ تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ میری توقع سے زیادہ طاقتور تھا۔ پھر اس نے رافیل اور میری طرف اشارہ کیا۔ اگر آپ چند لمحے پہلے آ جاتے تو ہم اسے گرفتار کر لیتے۔

میں نہیں سن سکا کہ رافیل نے کیا جواب دیا کیونکہ اس وقت تک ہمارے اردگرد لوگوں کا ایک ہجوم لگ چکا تھا۔ پھر تقریباً چھ آدمیوں نے باہر جانے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت تک سلور ماسک کام کر کے جا چکا تھا

~~~~~

کیپٹن وائلڈ ہمارے ساتھ رافیل کے گھر آیا۔ کار اترکر لائبریری کی طرف گئے۔ رافیل نے دروازہ کھولا اور کہا "تم اندر بیٹھو میں ابھی واپس آتا ہوں اور پھر وہ ششدر رہ گیا۔
~~~~~

کیونکہ برقی انگیٹھی کے قریب وہی آدمی جس نے شام کو اپنا نام دیتے بتانے سے انکار کیا تھا بیٹھا آگ سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اس کا اورکوٹ ایک کرسی پر پڑا ہوا تھا۔ اور اس نے شام کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ مسکرایا۔

آپ دیکھ رہے ہیں میں واپس آگیا ہوں۔" وہ اپنی متین آواز میں بولا۔ اس سے پہلے کہ میں لندن سے چلا جاؤں سینورٹیا کو ضرور ملوں گا۔" واضح رہے میں آج رات یا ہر جا رہا ہوں۔"

رافیل میں اور ڈانلڈ کیے بعد دیگرے اندر داخل ہوئے۔

کیا تم سفر پر جا رہے ہو۔ میرا مطلب ہے کسی لمبے سفر پر" رافیل نے کہا۔

" ہاں کچھ وقت کے لئے۔" اس نے کہا اور مڑا۔" میں اب سینورٹیا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

" کیا تم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے؟ ہم تمہیں پورے سینورٹیا سے ملا دیں گے۔ رافیل نے اطمینان سے کہا

" نہیں مجھے آج رات ہی جانا ہے۔ اس آدمی نے پہلی بار سخت لہجہ میں کہا۔

میرا دوست کیپٹن ڈانلڈ کہتا ہے کہ تم ایک گھنٹہ بیشتر مارکو شیشش ہوٹل میں تھے۔ رافیل نے کہا۔

" میں قسم کھاتا ہوں۔" ڈانلڈ نے کہا

" کیا مطلب؟" وہ آدمی غرایا۔

" تمہیں معلوم تھا کہ سینورٹیا کو ڈاکٹر یہاں زیر علاج ہے" رافیل نے قہقہہ لگایا۔ اور کیا تمہیں حیرت تھی۔

کیسی حیرت" اجنبی نے کہا۔ براہ مہربانی اس کی وضاحت کریں۔

آج سلور ماسک نے مارکو شیشش ہوٹل میں اس ماہ کا پورتھا یا پانچواں ڈاکہ ڈالا۔ تم نے غالباً سلور ماسک کا نام سنا ہوگا۔" رافیل مسکرایا۔

تو اس کا میری دوست سے کیا تعلق ؟ اجنبی نے کہا۔

بہت گہرا تعلق ہے تمہیں معلوم ہے وہ آج شام سے زیر علاج ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے وہ سلور ماسک سے واقف اور وہ چاہتی ہے کہ پولیس کو بتا دے۔ اس کی یہ حب الوطنی قابل تعریف ہے۔ سلور ماسک یہ نہیں چاہتا اس لئے اس نے اسے نقصان پہنچایا۔ تم اسے دیکھنا چاہتے ہو" رافیل نے انکشاف کیا۔

کیسے؟ اجنبی نے پوچھا۔

بھئی بات یہ ہے کہ سینورٹیا کی عادت ہے کہ وہ ایک ہی گلاس میں پورٹ اور وائن ملا کر پیتی ہے۔ اور بسکٹ ساتھ کھاتی ہے۔ یہ وقت پانچ اور چھ کے درمیان کا ہوتا ہے۔ سلور ماسک پانچ اور چھ کے درمیان وہاں گیا۔ چوری یا چالاکی سے اس کے گلاس میں "ایرسیتھروکسن" جو ایک امریکی دوا ہے۔ ڈال دی۔ تاکہ وہ وقتی طور پر خاموش رہے اور سلور ماسک آج رات غائب ہو جائے۔ مگر دوائی زیادہ مقدار میں ڈال دی گئی اور اس کے مرنے کا خطرہ لاحق ہو گیا اور اس وجہ سے کہیں اس پر قتل کا الزام نہ لگ جائے وہاں سے غائب ہو گیا۔ رافیل نے اولاً انکشاف کیا۔" سمجھ گیا اجنبی نے اثبات میں سر ہلایا۔

اب فرض کرو کہ وہ اس وقت اس کمرے میں موجود ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے اس ملک سے نکل جائے۔ بہر حال ایک چیز تمہیں اور دکھاؤں۔ رافیل نے انگیٹھی کے قریب نصب شدہ گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور نرس نمودار ہوئی۔ اس نے اس سے کہا" ہم تیار ہیں نرس"

پھر وہ اجنبی کی طرف مڑا۔

تم یقیناً پوچھنا چاہو گے کہ مجھے کس طرح پتہ چلا کہ سینورٹیا کو سلور ماسک نے زخمی کیا ہے۔ تو سنو! ایرسیتھروکسن جس کسی کے ہاتھ یا جلد پر لگ جائے نشان ڈال دیتی ہے اور بہت عرصہ بعد جا کر اترتی ہے۔

رات جب وہ ہمارے قریب سے اس عورت کا نکلس اتار رہا
تھا تو مجھے اس کی انگلیوں کا مشاہدہ کرنے کا جو موقعہ ملا۔
اور وہ شخص یہاں موجود ہے
اس وقت دروازہ کھلا۔ دروازے میں سینوریٹا
کورڈووا نرس کے سہارے موجود تھی۔ اس کا چہرہ زرد
ہو رہا تھا اور نگاہوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ یہ منظر
زیادہ اچھا نہ لگا۔
اس وقت ڈاکٹر رافیل۔ اجنبی کی طرف دیکھ کر
مسکرایا۔
"سارجنٹ اپنا شکار سنبھالو"
اور اس اجنبی نے بندر کی پھرتی کے ساتھ
کیپٹن وائلڈ کو پکڑ لیا۔ تھوڑی کشمکش کے بعد وہ
قابو میں آگیا۔ ڈاکٹر دور کھڑا مسکراتا رہا۔ اور حیرت
سے میری آنکھیں باہر کو ابلی پڑی تھیں۔
اس کی جیب میں ایک سلور ماسک۔ ایک
آٹومیٹک پستول۔ ہیروں کا نکلس، قیمتی پتھروں کے
کنگنوں کی جوڑی اور موتیوں کا ہار بطور ثبوت موجود
ہے۔ سارجنٹ ویسے مجھے امید نہ تھی کہ تم اتنا اچھا
پارٹ ادا کرو گے" ڈاکٹر نے کہا۔
"شکریہ ڈاکٹر" سارجنٹ نے کہا اور
وائلڈ کو باہر لے جانے لگا۔
پھر دو سارجنٹ کیپٹن وائلڈ، میریڈیتھ،
سینوریٹا کورڈووا، اور نرس ہال جبکہ میرا ملازم
بھی سینوریٹا کورڈووا کا جام صحت پینے لگے۔
اس نے شیری کا گلاس بھرا اور حلق میں
انڈیل دیا۔

بقیہ "پتھر ٹوٹے ڈگلی گگی"

اور جب وہ اسے حالات کی تبدیلی کہہ کر رضامند کر رہا
تو وہ اسے بزدل اور کمزور ٹھہرانے لگتی۔ اور اس سے یوں
ہوتی۔ اگر میں بھی جمیلہ کی طرح ایک مالدار باپ کی بیٹی ہوتی تو
میرے سامنے بھی جھک سکتے تھے۔ اس مطلب یہ ہوا کہ تمہا
سب اصول کھوکھلے اور بے بنیاد تھے۔ تم سچی محبت، فرض
اور اصول کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے زر و جواہر کی تلاش
"صوفیہ مجھے معاف کر دو!! اس سے پہلے کہ جب
اپنے اصولوں کا گلا گھونٹ سکوں میں ان پر اپنے آپ کو
اس طرح قربان کر دوں گا جیسے ایک دن میں نے تمہیں جھینے
پر چڑھا دیا تھا۔ رک جاؤ صوفیہ میں آرہا ہوں"
اس کی اس حرکت پر دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے
طالب علم گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ دروا
کھول کر باہر جا چکا تھا۔ جمال اور افضال نے اس کا
پیچھا کیا لیکن رات کے اندھیرے میں وہ اسے نہ پا سکے
دوسرے دن صبح جب اس کی لاش ندی کے کنارے سے
مچھلیاں پکڑتے ہوئے مچھیرے اٹھا کر کالج میں لائے
تو تمام لڑکے لڑکیاں اس کی اچانک موت پر افسوس
ظاہر کرتے ہوئے تبصرہ کر رہے تھے۔ لیکن جمیلہ نے نخوت
سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔
"وہ پتھر تھا۔ پتھر بھی کبھی پگھلے ہیں۔ وہ ٹوٹا
کرتے ہیں۔ وہ بھی ٹوٹ گیا"

بقیہ افسانچے صفحہ ۲۲ کا

"ندامت"

چاندنی سوئی گلیوں سے گزر کر دروازے کو تھپتھپاتی ہے
لیکن آواز نہیں آتی ——— چھپر پر چڑھ کر آنگن میں اتر گئی اور پھر
ٹہلنے لگی۔ آخر کار تھک کر واپس ہوئی اور ایک اونچے ٹیلے پر
ٹھٹھک گئی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اور دور
برگد کے نیچے چاندنی [illegible]

افضال نیازی



ے ۔ایس ۔ کالج کے پرنسپل آفس کے سامنے کافی بھیڑ
ی۔ میں بھی جا کر اسی میں شامل ہو گیا۔ دس بارہ امیدوار وہاں
جود تھے اور سب ایک دوسرے کے نمبر جاننے کی کوشش کر رہے
ے۔ چند ہی منٹ بعد مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جتنے لوگ موجود
ب ان میں میرے نمبر سب سے زیادہ تھے۔ اس بات کا علم ہوتے
ہی میں دل ہی دل میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ دوسرے
یدوار بھی مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے، جیسے میرا
زر بحیثیت لیکچرر ہو چکا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی چند انٹرویو
ں شرکت کر چکا تھا۔ لیکن ہر جگہ کوئی نہ کوئی بہتر امیدوار آ جاتا
ں اب تو ایک خدشہ تھا کہ خدا کرے کوئی سفارشی امیدوار ان
گوں میں موجود نہ ہو۔ بہرحال میں نے ان اندیشوں کو اپنے ذہن سے
دور کر دیا، اور کامن روم کے ایک کونے والی کرسی پر بیٹھ کر بیچینی
ے چار بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ تنہائی میں آتے مجھے رضیہ
ید آ گئی۔

رضیہ میری زندگی کی وہ بہار تھی جسے میں نے بہت مشکل
سے حاصل کیا تھا، اور جبکہ وہ میرے بالکل قریب تھی، تو
سکے ابو کی یہ شرط کہ شادی سے پہلے میرا برسر کار رہنا ضروری
ے، ہماری جدائی کا باعث بن گئی تھی۔ رضیہ کا خیال آتے ہی
ں کھو سا گیا اور اس کی وہ دل آویز مسکراہٹ جو ہر وقت
سکے سرخ ہونٹوں پر رقصاں رہتی ہے، رہ رہ کر میرے
ل میں چٹکیاں لینے لگی۔ ابھی میری سہانی پرواز کا آغاز ہی
تھا کہ سامنے سے قیصر آتا ہوا دکھائی دیا ۔۔ ہماری نظریں ٹکرا گئیں
لیکن اس نے ایک جھٹکے سے اپنے سر کو گھما کر اپنی بے التفاتی
کا اظہار کیا اور دوسرے امیدواروں کے جھنڈ میں شامل ہو گیا
آہ اسے دیکھتے ہی میری ساری دنیا لٹ گئی۔ کیونکہ وہ میرا
کلاس فیلو رہ چکا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کے نمبر مجھ
سے زیادہ ہیں۔

ہم کبھی اچھے دوست تھے۔ جب میں نے پہلی بار یونیورسٹی
میں قدم رکھا، تو قیصر ہی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد
نجم، سریش، خلیل اور کئی دوسرے لڑکے ہمارے گروپ
میں شامل ہو گئے۔ ایم۔ اے۔ انگلش کا پہلا سال تھا۔ جس
میں لڑکے اور لڑکیاں ملا کر ہم چوبیس طلباء تھے۔ چند ہی ماہ
گزرے تھے کہ ہمارا پہلا ٹیسٹ ہوا جس میں میں نے سب سے
زیادہ نمبر حاصل کئے۔

وقت نے کب کس کی راہ دیکھی ہے۔ ہمارا سالانہ امتحان
ہونے کو تھا، چند دن باقی تھے۔ طلباء کی شوخیاں ختم ہو چکی تھیں
اس دوران قیصر ایک رات میرے کمرہ میں آیا اور چپکے سے
میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں بولا:

"کیا بات ہے ڈیئر، بہت اداس نظر آ رہے ہو؟" میں
نے سوچا موسم کی عام بیماری، یعنی یہ بھی ابھی، کورس پورا نہ ہونے
کا رونا لے کر بیٹھ جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ بولا:

"آہ خورشید تمہیں کیا بتاؤں، بس ایک غم کھائے

جارہا ہے۔ یونیورسٹی بند ہو چکی ہے اور رضیہ نے آنا چھوڑ دیا ہے۔ تین دن ہو گئے اسے نہیں دیکھا۔

میں چونک پڑا۔ اس نے کبھی کنایوں میں بھی اس بات کا اظہار نہ کیا تھا کہ وہ رضیہ سے پیار کرتا ہے۔ اس نے اکثر لڑکیوں کا ذکر کیا۔ لیکن رضیہ کا نام کبھی زبان پر نہ لایا۔ وہ کم سخن ضرور تھا۔ لیکن مجھ سے بےحد بےتکلف تھا۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا "تم آج پہلی بار رضیہ کے متعلق ایسی بات کہہ رہے ہو۔"

"بات یہ ہے کہ ......" وہ ہچکچایا "مجھے خود اس سے پہلے معلوم نہ تھا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ آج تین دن سے نہیں دیکھا اور نہ آئندہ بہت دنوں تک دیکھنے کی امید ہے، اس لئے کچھ عجیب سی حالت ہو رہی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ اس پورے سال میں میں نے کبھی رضیہ سے بات نہیں کی۔ اس سے دور دور رہا۔ میں ہر لڑکی سے گھل مل کر بات کرتا تھا۔ لیکن میں جب بھی رضیہ کے قریب جانے کی کوشش کرتا، تو میرا دل دھڑکنے لگتا اور میرا خیال ہے سردیوں میں بھی پسینہ کی بوندیں میرے ماتھے پر ابھر آتی ہوں گی۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"پہلے بتاتے تو کچھ کرتے تمہارے لئے" میں مسکرا دیا "اب تو امتحان کی تیاری کرو۔ آئندہ سال رضیہ سے تمہاری دوستی کرا دوں گا اور شادی ―― وہ تو بہر حال اندھا کھیل ہے۔ کوشش کرنا تمہارا کام ہے۔"

"یار خورشید! رضیہ کے مسکرانے کا انداز کتنا پیارا ہے! وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے۔ کلاس میں چاہے سنجیدہ سے سنجیدہ لکچر ہو رہا ہو۔ لیکن جب بھی اس کی طرف نظر جاتی، وہ مسکراتی ہوئی نظر آتی تھی" اس نے کہا۔

میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور بات کا رخ موڑنے کے لئے کہا "اچھا بتاؤ شیلے کی شاعری کے کون کون سے نوٹس تم نے تیار کر لئے ہیں۔"

"ہر وہ نوٹ جہاں مسکراہٹ ہے! لیکن خدا غارت کرے ان رومانی شاعروں کو ہر وقت روتے ہی رہتے ہیں کیٹس بھی روتا رہتا تھا۔ کیا کرتا بیچارا، اس نے اپنی ساری محبت فینی پر جو نچھاور کر دی تھی۔ فینی تو اس وقت بھی مسکرا رہی۔ جب کیٹس اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ نہیں میرے دوست۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم وعدہ کرو کہ میرے لئے ہر ممکن کوشش کرو گے"

وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ پھر اس کی جذبات میں تھرتھراتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"مسکراہٹ تو رضیہ کی فطرت ہے۔ بھلا وہ دوسروں کی مسکراہٹ سے اپنے باریک ہونٹوں کو کیوں سجائے گی۔ ابدی مسکراہٹ تو سوتے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر رقصاں رہتی ہوگی"

"اچھا بند کرو بکواس! کام کی باتیں کرنا ہو تو بیٹھو ورنہ چلے جاؤ۔" میں مصنوعی غصہ سے بولا

وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا ―― اور جاتے جاتے ایک خلش میرے دل میں چھوڑ گیا ―― رضیہ ؟؟؟ کتنی بار میرے ذہن میں سوال بن کر ابھری تھی۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی اس لئے اکثر لکچرر کی عنایت بھی اس پر رہتی تھی اور اس کی کتابوں پر ڈپارٹمنٹ کے کسی نہ کسی رنگین مزاج کا نام لکھا رہتا۔ میں نے ایک بار اس سے ایک کتاب پڑھنے کے لئے مانگی۔ جب اس نے مجھے وہ کتاب دی، تو میں نے دیکھا کہ اس پر ڈاکٹر اظہار کا نام لکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا

"یہ کتاب آپ کو کہاں سے ملی؟"

"میں اتنا جانتی ہوں کہ چرا کر نہیں لائی۔ لوگ دیتے ہیں اور میں نے رکھ لیا۔ ہاں اگر آپ کو صرف میرے ہی پیسوں سے خریدی ہوئی کتاب پڑھنا ہے، تو میں مجبور ہوں۔" اس کا لہجہ تیز تھا۔ شاید میرا اس طرح پوچھنا اسے ناگوار گزرا تھا

"نہیں مس رضیہ، میرے اس سوال کا قطعی یہ مطلب

ڈاکر میں آپ کے ذاتی معاملات میں دخل انداز ہوں۔ یہ کتاب
کٹ میں مل رہی ہے۔ میں نے چند دن ہوئے ڈاکٹر اظہار کے
ن یہ کتاب دیکھی، تو ان سے صرف دو گھنٹے کے لئے مانگی تھی
نوں نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اس طرح کتابیں
نے سے طلباء میں کتابیں نہ خریدنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے"

یہ سن کر وہ مسکرائی اور بولی "ڈاکٹر اظہار نے پرسوں
شام کو چپراسی کے ذریعہ مجھے اپنے کمرہ میں بلایا اور بولے
یہ یہ کتاب بہت امپارٹنٹ ہے۔ اسے اپنے ہی پاس
و۔ جب پڑھ چکو واپس کر دینا۔ لیکن کسی کو دکھانا نہیں"

"لیکن آپ نے ان کی ہدایت پر عمل نہیں کیا ہے"

"شاید میں ایسی ہدایت پر عمل نہیں کر سکتی، جو ہمارے
ستانہ ماحول میں خلیج بن جائے۔ اگر انہیں میری یہ بات
ند نہیں ہے، تو وہ بصد شوق اپنی کتاب واپس لے سکتے
ہیں ——"

کتنی برجستگی تھی اس کی باتوں میں۔ شاید اس کی
ی ادا نے مجھے اس کا اتنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ اکثر لائبریری
رڈیپارٹمنٹ میں مختلف موضوع پر فکر انگیز بحث کرتی
ہ خوبصورتی اور سمجھداری کا حسین سنگم تھی ——— قیصر
ے جانے کے بعد اسی طرح کے اور نہ جانے کتنے چھوٹے بڑے
خیالات ذہن میں ابھرتے رہے۔

تصورات کا یہ وجود امتحان کی گھبراہٹ میں غائب
ہو گیا۔ اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے
پھر بھی اپنے چچا کے یہاں چھٹیاں گذارنے چلا گیا۔ جاتے
قت وہ بے حد اداس تھا، کھویا کھویا سا۔

وقت نے ہمیں پھر یکجا کر دیا۔ قیصر وقت سے پہلے
گیا تھا۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچا اور میرے آتے ہی آتے
شیام، سری واستوا، راشد، سمیع، نجمہ، نکہت، اشرف،
روزنہ اور تقریباً سبھی ساتھی آ چکے تھے۔ لیکن رضیہ کا
ہیں پتہ نہ تھا۔ فائنل کا گروپ جا چکا تھا اور ہماری جگہ
نئے لڑکے، لڑکیوں نے لے لی تھی۔ جب نتیجہ کا موازنہ ہوا تو پتہ
چلا میرے نمبر سب سے زیادہ ہیں اور قیصر میرے بعد تھا
ایک ہفتہ گذر گیا اور ڈیپارٹمنٹ معمول پر آنے لگا تھا۔
لیکن رضیہ ابھی تک لاپتہ تھی۔ ہم نے اکثر آپس میں
اس کی غیر موجودگی کا ذکر بھی کیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ اور
گذر گیا۔

اسی دوران ایک دن شام کو قیصر میرے کمرہ میں
آیا، وہ اسی طرح اداس تھا۔

"کہو اچھے تو ہو" میں نے پوچھا

"ہا۔۔۔ں ۔۔۔ آ۔۔۔ ں ۔۔۔ طبیعت بہت بور ہے"
اس نے آہستہ سے کہا۔

"وہ تو تمہاری صورت سے ظاہر ہے۔ کیا رضیہ کے نہ
آنے کا اتنا افسوس ہے"

"بس یہ سمجھ لو کہ اگر وہ نہ آئی، تو مجھ سے فائنل نہیں
ہو سکتا خورشید!" اس نے آہ سرد بھر کر کہا:

"ابے تیرا دماغ خراب ہے۔ آئے گی کیوں نہیں،
ابھی دو ہفتے بھی تو نہیں ہوئے ہیں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ
یہاں ایسے لوگ بھی ہے، جو کئی کئی دن پہلے آ جاتے ہیں"
میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

ہم بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ اکثر دوران گفتگو رضیہ
کا ذکر آتا۔ وہ جاتے جاتے مجھ سے وعدہ لے گیا کہ میں ضرور
اس کی مدد کروں گا۔

جس دن رضیہ آئی، قیصر بیحد خوش تھا۔ اس کے گول سے
چہرے پر ایک تمتماہٹ تھی۔ میں نے اس کے پاس سے گذرتے
ہوئے ایک جملہ پھینکا "آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔"

جواب میں وہ مسکرایا تھا۔ لیکن وہ صرف مسکراہٹ
نہ تھی۔ ہنسی اور مسکراہٹ کے بیچ کی کوئی شئے، شاید
وہ اس کی خوشی کی انتہا ہو! وہ لیکچر کو دیکھ کر آگے بڑھ
گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے کلاس میں چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے دیکھا قیصر لائبریری کے کونے والی کرسی
پہ بیٹھا رضیہ سے کچھ باتیں کر رہا ہے۔ لیکن اس کی نظریں نہ اٹھتی تھیں
مجھے کچھ بچپنی سی محسوس ہوئی۔ اس کے جانے کے بعد میں رضیہ کے
پاس گیا ـــــ

"آداب"

"آداب"

"کہئے مس رضیہ آپ کا مزاج تو بخیر تھا نا؟" یہ اس سے
میں رضیہ سے میری پہلی گفتگو تھی۔

"ہاں بالکل! کیا میں آپ کو بیمار نظر آتی ہوں؟ جتنے جاننے
والے ہیں، مجھ سے یہی سوال کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی مسٹر قیصر بھی
میری عیادت کر کے گئے ہیں،" وہ تنگ کر بولی۔

"بھئی، مجھے بھی آپ بیمار نظر آتی ہیں" میں نے اسے
چڑانے کے لئے بہت سنجیدگی سے کہا

"کیا؟" وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

"مس رضیہ کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں، جو غیر شعوری
طور پر اپنا اثر کرتی ہیں اور انسان کو اس کا علم بھی نہیں ہو پاتا"
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"اور بعض پختہ شعور رکھنے والے دوسرے کے لاشعور
کی بیماریوں کا اندازہ محض صورت دیکھ کر ہی لگا لیتے ہیں کیوں؟"
اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا

"یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے"

"ورنہ آپ کس قابل تھے" اس نے برجستہ کہا۔ ہم
دونوں ہنس دیئے۔ اس قدر زور سے کہ لائبریری میں بیٹھا ہوا اسسٹنٹ
اپنا چشمہ درست کرنے لگا اور ہمیں خاموش ہونا پڑا۔

اسی دن شام کو قیصر میرے کمرہ میں آیا اور آتے ہی لیٹ
گیا۔ بولا "تمہارا بہت بہت شکریہ! یار رگھو ونش کہہ رہا تھا
کہ تم آج رضیہ سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ جیو میرے
لال، تم نے ضرور میرے متعلق بات کی ہوگی"

"اچھا الگ ہٹو۔" میں اسے دھکیلتے ہوئے بولا "یکایک
بات تھوڑے ہی ہو جاتی ہے۔ کر دوں گا فکر نہ کرو۔ تم بھی تو
بات کر رہے تھے"

"یار! میں تو سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ اسے دیکھ کر
بات کیا کروں" تھوڑی دیر بعد بولا "اب تم ہی میری منزل
آسان کر سکتے ہو!" وہ آج بہت اچھے موڈ میں تھے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا اور میں رضیہ سے قریب ہوتا چلا
گیا۔ قیصر کچھ دنوں تک تو اس غلط فہمی کا شکار رہا کہ میں اس کی
مدد کرنے کے لئے رضیہ سے ملاقات بڑھا رہا ہوں۔ لیکن یہ راز
بہت دنوں تک راز نہ رہ سکا۔ کیونکہ اسٹوڈنٹس ہی نہیں
اسٹاف میں بھی یہ بات پھیل گئی تھی کہ ہم دوستی کی خطرناک
حدود کو چھو رہے ہیں۔ میری اس حرکت کو اساتذہ نے بھی
اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ نہ جانے کیوں؟)

میں اور قیصر ایک دوسرے سے دور دور رہنے لگے۔
یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا، جبکہ ہم نے رسمی طور پر بھی
ایک دوسرے سے بولنا چھوڑ دیا۔ کبھی کبھی قیصر کی خاموشی
میرے ضمیر کو ہلکے سے جھنجوڑتی۔ لیکن میں اپنے آپ کو سمجھا کر
مطمئن کر لیتا تھا کہ اس میں میرا قصور نہیں۔ اگر رضیہ نے مجھے پسند
کیا، تو یہ اس کی مرضی تھی اور اس نے قیصر سے پیار نہ کیا، تو
یہ بھی اس کی مرضی تھی۔ ہماری دوستی میں اسی کی پسند کو زیادہ
دخل تھا۔

اسی طرح کے وہم و گمان میں کھویا رہنا، میرا معمول ہو گیا
تھا۔ میرا بیشتر وقت رضیہ کے ساتھ یا اس کے خیالوں میں گزرتا
قیصر نے بالکل گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

ان سب ہنگاموں کا نتیجہ جب برآمد ہوا، تو مجھے ہوش آیا
کہ میں اگر ایک بازی قیصر سے جیت گیا، تو دوسری ہار گیا۔
میری سیکنڈ پوزیشن تھی اور قیصر فرسٹ تھا۔

اور وہی قیصر آج پھر مجھے دوسری مات دینے کے لئے
میرے سامنے تھا۔ کاش وہ اس انٹرویو میں آنے سے پہلے
کسی حادثہ کا شکار ہو جاتا۔ میں اس کے لئے اس وقت ہر اس

ائی کا خواہش مند تھا، جو اسے مجھے ناکام بنانے سے روک دے۔
!! کاش میں رضیہ کے پیار میں اتنا مدہوش نہ ہو گیا ہوتا، تو
ہ بھی قیصر کی طنزیہ مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتا
نیہ ۔۔ ڈگری ۔۔ شادی ؟؟؟ میرا ذہن چکرا رہا تھا
ے میں پرنسپل آفس کی گھنٹی بجی اور ایک کلرک ہاتھ میں
ٹ دبائے باہر آیا اور بولا ۔

"مسٹر خورشید وارثی اندر تشریف لے جائیں"
میں لڑکھڑاتے قدموں سے سیکشن کمیٹی کے سامنے
ڑا ہوا۔ حکم ہوا بیٹھ جاؤ ۔ میں بیٹھ گیا۔ سوالات شروع ہوئے
ز تو یاد نہیں۔ اختتام شیکسپیئر اور برنارڈ شا کے نظریات
وازنہ پر ہوا ۔ مجھے اس ٹاپک پر کافی عبور تھا ۔ میں برجستہ
تا رہا اور میں نے اس بات کو محسوس کیا کہ چند اراکین میرے
نے کے انداز کو قابلِ تحسین نگاہوں سے دیکھ رہے تھے
ریباً ٢٠ منٹ کے بعد جب میں باہر آیا تو کمرہ سے گھنٹی
واز سنائی دی ۔ اس کے آگے میں کچھ نہ سن سکا ۔

میں کالج کمپاؤنڈ سے نکل آیا ۔ اسی طرح خیالوں میں کھویا
کر سامنے ایک بہت پرانے وضع کا رسٹوران نظر آیا
اس میں جا کر بیٹھ گیا ۔ سورج کافی جھک گیا تھا ۔ میں شام
انتظار میں چائے کی دو پیالیاں پی گیا ۔

ب راکھ سورج کی کرنوں کے ساتھ دب گیا تھا ۔ میں چہل قدمی
ہوا رگھوونش کے گھر (جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا) کی جانب
ھنے لگا، وہاں پہنچا، تو رگھوونش کی چھوٹی بہن رتنا نے
دازہ کھولا ۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر چلی گئی
تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی، تو اس کے ہاتھ میں
ک لفافہ تھا، جس پر میرا نام لکھا تھا ۔ میں گھبراہٹ کے عالم
ا اسے حیرت سے دیکھتا رہا ۔ یہاں مجھے جاننے والا کون
سکتا ہے ؟ اتنے میں مجھے رتنا کے ہنسنے کی آواز سنائی
، وہ کہہ رہی تھی :

"بھیا، یوں کیا دیکھ رہے ہو، ہو سکتا ہے، آپ کا
کوئی پرانا ساتھی ہو اور آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہو ۔ دیدی
جب بیٹھک میں آئیں، تو انہیں یہ لفافہ فرش پر پڑا ہوا ملا تھا"
میں چونک پڑا اور میں نے لفافہ چاک کیا ۔ لکھا تھا :

"پیارے خورشید !

میری تحریر دیکھ کر چونکو نہیں ۔ حادثات نے ہی تو ہمیں
جنم دیا ہے اور اسی نے ہمیں یکجا کیا ۔ حادثہ تو وہ بھی تھا جس نے
مجھے فرسٹ دیا اور تمہیں سکنڈ !

"آج جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرے بعد تمہارے نمبر سب سے اچھے
ہیں، تو میں تمہیں گھبراہٹ کے عالم میں پرنسپل کے کمرہ میں جاتے ہوئے چھوڑ
کر واپس چلا آیا تھا ۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہاں تم رگھوونش کے یہاں ٹھہر
سکتے ہو اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ رضیہ سے تمہاری شادی اسی لئے
نہیں ہو رہی ہے کہ تم برسرِ کار نہیں ہو ۔ میرے انٹرویو نہ دینے سے
تمہاری تقرری کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں ۔ خدا تمہاری مدد کرے ۔

"کتنی خوشی ہوگی مجھے دو دھڑکتے ہوئے دلوں کو ملا کر تم
اندازہ نہیں کر سکتے خورشید ! رضیہ سے کہہ سکو، تو میری دلی
مبارک باد کہہ دینا ۔

"مجھے پرسوں پونا میں ایک اور انٹرویو میں شریک ہونا ہے
اگر شام کی گاڑی نہ مل سکی، تو میں وہاں وقت پر نہ پہنچ سکوں گا ۔"

"کسی حادثہ کا انتظار کرو میرے دوست، ہم کبھی نہ
کبھی ضرور ملیں گے ۔ !"

تمہارا قیصر

میری پلکیں، خدا جانے آنسوؤں کے بوجھ سے، ندامت
یا احسان کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھیں، مجھے ایسا محسوس
ہو رہا تھا، میری یہ فتح، فتح نہیں، شکست ہے !



یوسف جمال

پتھر ٹوٹے گلی گلی

یوں تو سندر گڑھ کو کئی وجوہ سے خاصی اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ پہلے وہ مہاراجہ رگھو ناتھ شنکر دیو کی راجدھانی تھا اور اب ان کی حکومت کے زوال پذیر ہونے کے باوجود وہاں کی چوڑی کشادہ سڑکیں اور گذرے ہوئے دور کے راجاؤں مہاراجاؤں کی عمارتیں، جاہ و جلال اور شان و شوکت کا پتہ دیتی تھیں۔ لیکن موجودہ دور میں اسی شہر کی شہرت کی خاص وجہ سائنس کالج ہے۔ اسی شہرت سے متاثر ہو کر مجید نے راجگانگپور سے منتقل ہو کر سندر گڑھ کے سائنس کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

مجید کم گو، سنجیدہ اور تنہائی پسند واقع ہوا تھا۔ کالج کے سیکڑوں طالب علموں میں سے صرف جمال اور افضال ہی اس سے راہ و رسم بڑھا پائے تھے۔ یہ لانبے قد کا دبلا پتلا نوجوان ان تمام منفرد خوبیوں یا عیبوں کے علاوہ از حد خشک مزاج بھی تھا۔ لازم تھا کہ اس کی خشک مزاجی کالج کی خوشگوار فضا میں ہر کسی کو ناگوار گزرتی۔ کالج اپنے دامن میں رنگ و بو، خوشبوؤں اور شرارتوں کے جھماکے اور قہقہوں سے بھرپور تفریحات سمیٹے ہوئے تھا۔ لیکن وہ ان سب تکلفات سے بے نیاز اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد استوار کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی کالج میں چہل پہل کا دور دورہ تھا اس کی معطر فضا میں کچھ ایسی کشش جاذبیت اور دلفریبی تھی کہ یہ ہر ایک دھڑکتے ہوئے دل پر اثر انداز ہو کر اسے عاشقانہ محویت میں گم کر رہی تھی۔ دلفریب اور خوشگوار موسم سونے پر سہاگہ کا کام کر رہا تھا۔ چاروں طرف رنگ برنگ ہشاش بشاش چہرے خوبصورت تتلیوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ نقرئی قہقہے نوجوان دلوں کو گرماتے ہوئے فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ لیکن مجید اس سحر انگیز ماحول سے بے خبر کالج کے ایک کونے میں تن تنہا خاموش اور گم سم بیٹھا تھا۔ گویا وہ زندگی کے کسی دلفریب پہلو سے سمجھوتہ نہ کرنے کی پکی قسم کھائے ہوئے تھا۔ اس کے موڈ کا آج تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ دوستوں میں بیٹھے ہوئے خوش گپیوں کے درمیان اچانک نہ جانے اس پر کیا دورہ پڑتا کہ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر دور کسی ویران یا سنسان جگہ پر جا کر اپنے خیالات میں غرق ہو جاتا اور گھنٹوں وہیں بیٹھا رہتا۔ نہ جانے آج بھی وہ اسی عالم میں کامن روم میں سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے الجھنیں، تفکرات اور پریشانیاں عیاں تھیں۔ شاید وہ دنیا بھر کی مشکلوں کو آسان کرنے کی کوشش میں گرفتار تھا۔ ان سب مسئلوں میں سے اہم ترین اور مسئلہ صوفیہ اور جمیلہ کا تھا۔

صوفیہ ایک غریب خاندان کی فرد تھی۔ اس کا باپ معروف خاں ہسپتال کی ایمبولنس کار چلاتا تھا۔ صوفیہ

ماں باپ مجید کو بہت چاہنے لگے تھے ۔ وہ انہیں اپنی اولاد کے برابر عزیز تھا ۔ ان کے پیہم اصرار پر وہ ہوسٹل چھوڑ کر ان کے گھر ہی پر رہنے لگا تھا ۔ خاندان کا کوئی فرد اسے غیر نہ سمجھتا تھا ۔ وہ بلا جھجک اور روک ٹوک کے زنان خانے میں بھی آنے جانے لگا تھا ۔ اس نے اپنی شرافت بلند اخلاق اور نیک اطوار کے بل بوتے پر سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا ۔ وہ گھر لوٹنے میں ذرا بھی دیر لگا دیتا تو ہر کوئی اس کے لئے پریشان ہو اٹھتا ۔ ان مہربانوں میں سے ایک صوفیہ بھی تھی ۔ لیکن اس کا لگاؤ دوسروں کے لگاؤ سے الگ نوعیت کا تھا ۔ وہ مجید کو دل ہی دل میں چاہنے لگی تھی اور رات دن اس کے خواب دیکھنے لگی تھی ۔

اس کے برعکس مجید نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے صوفیہ کو اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں ذرا بھی مدد ملتی ۔ وہ اونچے خیالات کا مالک تھا ۔ پڑوس میں ان دونوں کے بارے میں کچھ کھسر پھسر بھی ہوئی تھی لیکن اسے اس کی کوئی فکر نہ تھی کیونکہ اس کا دامن ہر طرح سے پاک و صاف تھا ۔ بلکہ اس نے کئی بار صوفیہ کو بھی دوسروں کے سامنے خاص احتیاط برتنے کی تاکید کر دی تھی تاکہ انکی کوئی نادانستہ لغزش اس کے والدین کے لئے عمر بھر کی بدنامی کا ٹیکہ نہ بن جائے ۔ اس نے صوفیہ کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس کی حیثیت وہاں پر ایک پڑوس کی سی ہے ۔ وہ شاید تعلیم ختم ہوتے ہی وہاں سے چلا جائے گا ۔ کیونکہ اس کے ماں باپ نے اسے صرف اسی مقصد کے لئے وہاں بھیجا تھا ۔ وہ اس قسم کی محبت کو فضول شئے قرار دیتا ۔ اس کی نظروں میں محبت ہمالیہ کی چوٹیوں سے بھی اونچی ، پاک اور متبرک چیز تھی جسے پانا یوں آسان کام نہ تھا ۔ دو جسموں کے ملاپ کو محبت کہنے والوں پر وہ لعنت بھیجتا تھا ۔ اس کے نظریے میں محبت کا مطلب دو روحوں کا ملاپ تھا ۔ روحانی محبت دل کو دوام بخشتی ہے ۔ یعنی محبت دل کی آنکھوں سے ایک دوسرے کو پا کر وصال انگیز محبت حاصل کر لیتی ہے ۔

اس نے اپنے نظریہ کا اظہار کئی بار صوفیہ پر کیا تھا لیکن صوفیہ عمر کے تقاضے اور شباب کے دیوانہ پن کے جھٹکوں سے مجبور ہو کر اس کی ان زاہدانہ باتوں سے گھٹن محسوس کرنے لگتی ۔ وہ ہر حالت میں مجید پہ قابض ہونا چاہتی تھی اسے اُس کے اتنے قریب رہ کر اس سے یوں دور رہنا ہرگز منظور نہ تھا ۔ وہ چاروں پہر اس کی خیالی تصویر دل میں بسائے اس کی قربت کے لئے بیقرار رہتی ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجید اس سے کتراتا ہے ۔ اور کسی نہ کسی بہانے اس سے اکیلے میں ملنے سے گریز کرتا ہے ۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی جانب کھینچتی ہی جاتی ۔ اسی دل کی کرشمہ سازی نے اس سے ایک دن مجید کو ایک خط لکھوایا ۔ جسے پڑھ کر مجید وقتی طور پر بوکھلا اٹھا تھا ۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے ۔ صوفیہ نے لکھا تھا ۔

" مجید ! آخر مجھ میں ایسی کون سی خرابی ہے کہ تم مجھ سے سامنا ہوتے ہی دور بھاگنے لگتے ہو ؟ مجھ میں کس شئے کی کمی ہے ؟ جو میں تمہارے مزاج پر اتر نہیں پاتی ۔ شاید میرا قصور یہ ہے کہ میں نے تم سے ٹوٹ کر محبت کرنے کی غلطی کی ہے ۔ میں نے تمہیں چاہا ۔ تمہیں پوجا ، تمہیں اپنے رگ رگ میں بسایا ۔ تمہیں ہر طریقے سے پانے اور خوش کرنے کی کوشش کی ہے ———— اور اس کے بدلے میں تم نے آج تک مجھے دو میٹھے الفاظ کی بھیک تک نہیں دی ۔ کیا اس دنیا میں محبت کا یہی صلہ ہے ؟ اور اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو چکی ہوں کہ اگر میرے لئے تمہارے دل میں کوئی جگہ نہیں اور میرا وجود تمہارے لئے ایک بے کار سی شئے ہے تو کیوں نہ میں اس وجود کو ہی نیست و نابود کر ڈالوں ، شاید تم مجھے اس دنیا میں نہ پا کر کبھی بھولے بھٹکے سے میری تربت پر آنے پر مجبور ہو اٹھو اور مجھے اپنی محبت کا جواب محبت سے مل جائے ۔

وہ آنے والے ہولناک حادثات کا عکس صوفیہ کے خط میں دیکھ کر لرز اٹھا ۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ اس

آنے والے طوفان کو کیوں کر روکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ صوفیہ
ایک معصوم لڑکی ہونے کے علاوہ ازحد ضدی ہے۔ وہ اپنی ضد کو
عملی جامہ پہنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی۔ آخر اس نے
ایک بار اس سے تنہائی میں مل کر اسے اس ارادے سے
باز رکھنے کی کوشش کی۔ موت کے بعد ماں باپ کی چیخ و پکار
اور خواہ مخواہ کی بدنامی۔ دو چھوٹی بہنوں کے تاریک مستقبل
اور خود مجید کی باقی ماندہ زندگی کی آشفتہ حالی کو بھی وہ کسی
خاطر لانے پر آمادہ نہ تھی۔ اس کی بس صرف ایک ضد تھی
"مجید کی ہاں!"

آخر اس نے آخری حربہ کام میں لاتے ہوئے اس
سے پوچھا۔

"کیا تم سچے دل سے مجھے پیار کرتی ہو؟"

"اس کے لئے جو بھی قربانی تم چاہو! دینے کے لئے
تیار ہوں۔"

"تو پھر سنو! صوفیہ اگر تم کو مجھ سے سچی محبت ہے تو
میں تم سے مجھے بھلا دینے کی قربانی چاہتا ہوں۔"

صوفیہ اپنے ہی دام میں پھنسے صیاد کی طرح لرز اٹھی
پھر آنسوؤں کی موسلا دھار برسات اپنے حسین و غمگین چہرے
پر برساتی ہوئی سر جھکائے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔ اس
ملاقات کے دوسرے دن مجید نے صوفیہ کا گھر چھوڑ دیا۔ معروف
خاں اور اس کی بیوی نے اسے بہت روکا۔ لیکن وہ پڑھائی
میں ہرج ہونے کا حیلہ بہانہ بنا کر پھر ہوسٹل میں چلا گیا۔
پھر چند ماہ بعد اس نے سنا کہ صوفیہ کی منگنی ہو گئی ہے۔
خبر سنتے ہی کچھ دیر کے لئے وہ قدرے اداس ہو گیا لیکن اس نے
کمال ضبط سے کام لے کر اس واقعے کو ذہن سے نکالنے کی
پوری کوشش کی۔ پھر اس نے جب یہ سنا کہ عنقریب صوفیہ
بیاہی جائے گی تو اس کے خیالوں میں ایک عجیب طوفان سا آتا
ہوا محسوس ہوا۔ وہ کئی روز تک پریشان بھی رہا۔ لیکن
بالآخر اس نے اس طوفان کو بھی اپنی سنجیدہ طبیعت کے
دامن میں سمیٹ لیا۔

شادی والے دن وہ معروف خاں کے گھر پر
تھا۔ اس نے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے
صوفیہ کو دلہن بنے ہوئے بھی دیکھا۔ اس کا چہرہ چودھویں
کے چاند کی طرح پوری تابناکیوں سے چمکتا ہوا دیکھا
تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے صوفیہ کی جگہ آج
چاند اپنی تمام تر سحر آفرینیوں کے ساتھ اس کمرے میں اتر آیا
اور پورے کمرے کو بقعۂ نور بنا رہا ہے۔ کمرے میں سے ایک
عجیب سی سحر انگیز مہک پھیل گئی تھی۔ وہ زیادہ دیر کمرے میں
نہیں ٹھہر پایا تھا۔ کیونکہ صوفیہ سے نظر ملتے ہی اسے ایسا
جیسے وہ وہاں پر ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہو۔ شادی
بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اور دلہن کی روانگی کے فوراً بعد
اسے وہاں پر ایک عجیب قسم کی ویرانی سی محسوس ہوئی۔ وہ
عرصہ سے تنہائی پسند رہا تھا لیکن اس تنہائی میں اس کا
سانس گھٹنے لگا۔ صوفیہ کی ملتجی نظریں تیر بن کر اس کے سینے
کی تہہ تک پہنچی رہیں۔ لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ
وہ سب حادثات کو ذہن سے کھرچ کر دور پھینکنے میں
کسی حد تک کامیاب ہو گیا۔

وہ صوفیہ کے قصے کو پوری طرح بھلا بھی نہ پایا تھا کہ جمیلہ
ایک بلائے ناگہانی کی طرح اس کے دل و دماغ پر مسلط
جمیلہ ـــ الٹرا ماڈرن ماحول کی ایک زندہ جاوید
تصویر تھی۔ اس کا باپ ابوالحسن سیاست کی بساط
ایک بہت بڑا کھلاڑی مانا جاتا تھا۔ گھر میں ہر طرف دولت
کی ریل پیل تھی۔ اس نے چاندی کا چمچہ منہ میں لئے آنکھیں کھولی
تھیں اور سونے کی برسات میں پروان چڑھی۔ کچھ قدرت
اسے اپنی عنایتوں سے نوازا تھا اور کچھ دولت کی فراوانی
نے اسے مصنوعی غرور و تمکنت بخش رکھی تھی۔ وہ ہر اس
چیز کو زبردستی پا لینے میں لذت محسوس کرتی جسے دوسرے
نایاب سمجھتے۔ آخر اس کی نظر بھی مجید کی خود دارانہ حیثیت

سنجیدہ طبیعت پر پڑی اور وہ اسے رام کرلینے میں اپنی
ن تصور کر بیٹھی۔

جمیلہ کی خوبصورتی اور خودسری پورے کالج پر عیاں
سبھی لڑکے شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد منڈلانے
وری کوشش کرتے وہ نت نیا دوست منتخب کرکے
ردوں کو چکر میں ڈال دیتی۔ اسے یقین تھا کہ مجید بھی دوسروں
رح ایک نہ ایک دن خود بخود اس سے راہ و رسم بڑھانے پر
ہو جائے گا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ مجید اس کی جانب
آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تو اس نے موقع
قع اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی انتہائی کوشش
اور جب وہ اپنے مقصد میں ناکام رہی تو مجید کے اس
کو اپنی انا کی شکست مان کر جذبۂ انتقام کی جوالا مکھی
نی۔ اس نے قسم کھا لی تھی کہ وہ مجید کو اپنے قدموں پر
ھکا کر ہی دم لے گی۔ اب اسے اس نام سے بھی ایک عجیب
چڑ سی ہو گئی تھی وہ مصنوعی محبت جتاتے ہوئے مجید کے قریب
ہو کر طرح طرح کی ناگوار حرکتیں کرتی اور ہر بہانے، مجید کے
گلے کا ہار بننے کی کوشش کرتی۔ کئی مرتبہ مجید ان ننگی اور فحش
حرکتوں کے زیر اثر اپنی راہ سے بھٹکنے لگتا لیکن جلد ہی اپنے
ز بودہ خیالوں کے لبادہ کو اوڑھنے میں کامیاب ہو جاتا۔
اور پھر اپنے ارادوں کی چٹان پر جا بیٹھتا۔ وہ جمیلہ سے متنفر تھا
وہ اس جدید نسل کو فیشن اور سوسائٹی کے لوازمات کی آڑ میں
جنسی بھوک مٹانے کا سامان قرار دیتا۔ اسے اس ماحول سے
کراہیت سی محسوس ہوتی۔ وہ ایسی تہذیب و معاشرت پر جو مشرق
اور کی لاش پر استوار کی جا رہی ہو لعنت بھیجنے لگتا۔ وہ اس
ماحول سے جلد از جلد دور بھاگ جانے کا خواہش مند تھا۔
لیکن اپنے ماں باپ کے خواہشات کا خیال اسے تعلیم پوری
کرنے پر مجبور کر دیتا۔

یہی وجہ تھی جس کے زیر اثر مجید کالج کی رنگینیوں سے
دور اور محفلوں سے غیر حاضر رہتا۔ وہ تھوڑی دیر کی مسرت
کے لئے اپنا مستقبل برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر اس نے
ایک دن جمیلہ کو بری طرح پھٹکار دیا۔ جمیلہ مجید کی زبان سے
اپنے لئے ایسے الفاظ سن کر سکتے میں آگئی ——اور——
اسے اپنے کردار پر شرم سی محسوس ہوئی۔ لیکن دوسرے
لمحہ اس پر امارت کا نشہ طاری ہو چکا تھا اور اس نے
مجید کے منہ پر تھوکتے ہوئے اسے جتایا تھا۔ اسے معلوم
ہونا چاہیے کہ وہ کس باپ کی بیٹی ہے اور اس کے
ایک اشارہ پر مجید کی جوانی اور خودداری پاش پاش
ہو کر رہ جائے گی۔ جمیلہ نے اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ
وہ جو کچھ چاہتی ہے ہو کر رہتا ہے۔ اور اگر وہ کسی کھلونے
کو نہیں پاتی ہے تو اسے توڑ کر ہی دم لیتی ہے اس کی نظروں
میں مجید کی حیثیت ایک پالتو کتے یا زرخرید غلام کی سی تھی
جسے وہ حسب منشا اپنے پیچھے بھاگنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

مجید نے اسے "ایں خیال است و محال است و
جنون است" کا نعرہ لگاتے ہوئے صاف صاف
کہہ دیا تھا کہ اگر وہ ایسا سمجھتی ہے تو سخت غلط فہمی میں
مبتلا ہے۔ دنیا میں محبت ہی ایک ایسی نعمت ہے جو
کوشش سے حاصل نہیں ہوتی۔ اسے دوسری قیمتی سے
قیمتی اشیاء کی طرح خریدا بھی نہیں جا سکتا۔ اور وہ تو
اس کی محبت کو سرے سے محبت ہی نہیں سمجھتا۔ اس کی
نظروں میں جمیلہ محبت کے نام پر ایک سیاہ دھبہ تھی جسے
وہ کسی قیمت پر اپنے گال پر چسپاں کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

آج مجید اسی ادھیڑ بن میں غرقاب وقت کے
تقاضوں اور اصولوں کی مانگ کے درمیان گیہوں کی
مانند پس رہا تھا۔ وہ جمیلہ کے انتقام کے ڈر سے اس سے
سمجھوتہ کر لینے کے بارے میں سوچنے لگتا تو اس کی نظروں کے
سامنے صوفیہ کا تصور ناچنے لگتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ جیسے
وہ کہہ رہی ہو کہ مجید اگر تمہیں حالات کے سامنے یوں گھٹنے
ٹیک دینے تھے تو مجھے جیتے جی جہنم رسید کرنے میں کیا مصلحت تھی؟

نثار احمد صدیقی

افسانچے

"ناگن"

ایک جوان برگد غرور سے سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور نزدیک ہی ایک پودا۔ نرم و نازک سا۔ بڑھتا ہے جوان برگد کی طرف۔ اس نے مڑ کر دیکھا "بڑھنے دو" خوبصورت ہے اور حقیر — اس پر چھا جاؤں گا۔ اپنے مضبوط باہوں میں بھینچ لوں گا۔ بڑھتے بڑھتے اس کے سایہ تلے آ گئی وہ اس پر چھا گیا۔ برگد اب بھی جوان تھا —!

وہ بھی برگد کے ریشے ریشے میں سما گئی۔ برگد کی نظریں کچھ نیچی ہو گئیں۔ اور ایک دن برگد اس کی زندگی سے اوب گیا — وہ احتجاج کرتا مگر اس کی سننے والا کون تھا حسن بہر حال معصوم ہے۔ اور صنف نازک —!

برگد جھکتا گیا۔ پھر لوگوں نے دیکھا برگد سوکھ کر گر گیا۔ اور دور نازک سا ننھا پودا اکڑ کر مسکراتا رہا —!!

"تضاد"

نیلگوں فلک کے نیچے زمین ہے۔ اس پر کانپتے ہوئے سوکھے پاؤں اور ننگے بدن سے پسینے کے قطرے زمین پر ٹپکتے ہیں جو خون ہے انسان کا —! اور بھاگتا ہوا سورج کے نیچے ایک انسان دوسرے انسان کا بوجھ اٹھائے اپنی پیٹھ پر رواں ہے اور سڑک دھوپ سے جل رہی ہے

مفلس پر ہنستا ہے انسان جو خود بھی کسی کا محتاج ہے انسان کیا ہے؟ ہمدردی، انسانیت، اخلاق سب کچھ ہے لیکن چند سنہرے سکے اور چمکیلے سوٹ اس کی راہ میں حائل ہیں۔ ہر انسان کا خون سرخ ہے۔ خاکی پتلے دونوں ہیں تضاد پھر کیسا؟

"جسم"

شام —!

رنگ کھل اٹھے — دو جسم قریب آئے۔

پھر —! شعلہ لپکا — شعلوں کو ہوا مل گئی —

شعلے اور بھڑک اٹھے — بھڑک کر پرسکون ہو گئے —!

اور پھر ایک ابن آدم کی تخلیق کی بنیاد پڑ گئی —!

"شاک"

"نہیں" —!

نرس حیران کھڑی رہی —! اشفاق گھبرا گیا

شائستہ اٹھ بیٹھی —!

"دوا دے دیجئے" —؟ "پی چکی"

"نرس کے ہاتھ سے گلاس ٹکرا گیا — نرس حیران تھی اور خاموش —!

قریب — اور قریب — بہت قریب —

"نہیں" — ایک چیخ فضا میں ابھری —!

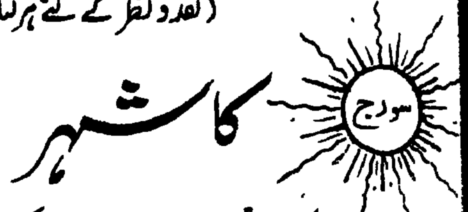
"مگر وہ چیخ پر نرس تڑپ کر آزاد ہو گئی —!

"اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں —"

پروفیسر کرامت علی کرامت

نقد و نظر

(نقد و نظر کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں روانہ کریں)



ترقی پسند تحریک کے تعطل کے بعد مدت مدید تک شاعری کا "جمود" ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا لیکن قدرت کا قانون ہے کہ ہر حرکت کے بعد جمود اور ہر جمود کے بعد حرکت کا دور آتا ہے اس لئے خدا خدا کر کے جمود کا بت ٹوٹا اور جدید شاعری نے اردو ادب کو ایک نئی حرکت عطا کی۔ گذشتہ چند سالوں میں بہت سے جدید شعراء کا مجموعہ کلام شائع ہوا۔ اس طرح کے مجموعہ کلام کی تعداد اتنی اچھی خاصی ہے کہ "جدیدیت" کو نظرانداز کرنا جدیدیت کے مخالفوں کے لئے بھی ممکن نہیں۔ چند سالوں میں جدید شاعری کی شکل میں جو شاعری ہمارے سامنے آئی وہ زیادہ تر لمحاتی شاعری تھی۔ لمحاتی شاعری سے میری مراد ایسی شاعری ہے جو شاعر کے لمحاتی تاثرات کو شعری پیکر میں سمونے کا نتیجہ ہو۔ ایسی شاعری میں عموماً شاعر کو زیادہ دیر تک غور و فکر کرنے یا پیچ و تاب کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ غرضکہ ... کہ جدید شاعری میں مفکرانہ نظموں کی تعداد بے حد کم ہونے کی وجہ سے نئی شاعری کی رفتار سے میں مطمئن نہیں تھا لیکن شہاب جعفری کا مجموعہ کلام "سورج کا شہر" پہلا مجموعہ کلام ہے جس کی اکثر نظمیں مفکرانہ نظر آئیں۔ ان نظموں کے لئے شاعر نے اپنا منفرد مفکرانہ لب و لہجہ متعین کر لیا ہے جس میں متانت اور سنجیدگی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کا خیال ہے کہ شہاب جعفری کے یہاں علامتوں کی تجریدیت جو معنوی حسن پیدا کرتا ہے۔ اس میں ہندوستانی بولیوں کے نازک، کومل، مدھر اور ہلکے پھلکے الفاظ سے بھی اضافہ ہوتا ہے۔ میری رائے میں شہاب جعفری نے اپنے گیت اور بھجن میں ہندوستانی بولیوں سے ضرور استفادہ کیا ہے لیکن ان کی انفرادیت جن مفکرانہ نظموں میں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے ان پر ہندوستانی بولیوں کا کچھ اثر نہیں ہے۔ ان کی نظموں میں "سورج" مختلف علامتی معنویت لئے ہوئے ابھرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر "سورج زدہ" ہے۔ سورج اس کا مونس و غم خوار بھی ہے اور خود اس کے وجود کا رازدار بھی۔ سورج کبھی رفتار وقت کا احساس دلاتا ہے تو کبھی شاعر کے پرواز جسم میں ڈوبتا اور چڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ "سورج" کو کس طرح شاعر نے اپنے مختلف جذبات کی علامتوں کی حیثیت سے استعمال کیا ہے اس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:—

سب اپنا "سورج" سے منہ چھپائے، تلاش میں وقت کی ہراساں
کسی کو اتنی بھی شام ملتی نہیں کہ تھوڑا اداس ہو لیں

——————— (سورج کا شہر)

کب تک آوارہ اور بے سہارا پھروں — کاش اپنے ہی "سورج"
سے پھر جا ملوں (ذرے کی موت)

———————

کل آسمان، چاند اور سورج کو پوجتے تھے۔

اور آج بھی تم خود اپنی ڈھالی ہوئی مشینوں کے سامنے سر جھکا رہے ہو
خدائے خالق کو تم نے نادم کیا تھا کل تک .
اور آج انسانیت کی تذلیل کر رہے ہو (خدا کی واپسی)

میرے اندر ڈوبتے چڑھتے ہوئے سورج کی
جسم میرا روشنی ہی روشنی (میں)

شاعر خود اپنی تلاش میں سرگرداں ہے اور زمان و مکان کی وسعت و پنہائی کے درمیان اپنا مقام متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ راہِ جستجو میں خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا ہے۔ بلکہ قدرت کی ہر بے جان شئے مثلاً سورج، سمندر، بہتا پانی، ہوا وغیرہ کو اپنا ہمسفر اور ہمراز تصور کرتا ہے اور ان میں بھی اسی ذوقِ جستجو کا سراغ لگاتا ہے جو خود اس کے اپنے اندر ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے ان اشیاء سے مخاطب ہو کر اظہاریت پسندانہ (Expressionistic) انداز میں جس طرح اپنے جذبات کا پرخلوص طور پر اظہار کیا ہے وہ بہت ہی موثر ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) سمندر، ارے او سمندر

ارے او ابد کے مسافر سمندر!
کب سے پتھر بنا، جس میں دردِ سکوتِ ازل منجمد ہو گیا ہے۔
تیری راہ میں خشک لب، بے زبان، بے نوا ہو کے پیاسا
پڑا ہوں۔ (ان جان فاصلے)

(۲) رفیقِ ازل، بہتے پانی

یہ پتھر ترے ماتھیوں کی ہے بھولی ہوئی اک نشانی .
(ادھوری ہستیاں)

(۳) ہوا اے ہوا!

میں ترا ایک اننگ ایک لہرا تھا
صدیوں ترے ساتھ دشت و دمن کوہ و صحرا میں
آزاد و سرشار پھرتا رہا ہوں۔
(تسخیر فطرت کے بعد)

(۴) سن اے بہتے پانی! تو بڑھتے ہوئے وقت کی ایک ز
میں پتھر! — میں گزرے ہوئے وقت کا ایک پیکر
میرے اور تیرے زمانے جہاں مل رہے ہیں
وہاں کوئی ٹھہرے ہوئے وقت کا بھی نشان ہے،
(حال کے انتظار میں)

شاعر کو اپنے اندر ایک ایسا "میں" چھپا ہوا نظر آتا ہے جس "میں" کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ شاعر کی آتما کے ان گنت روپ نور کی مانند ایک دوسرے میں یوں تحلیل ہو جاتے ہیں جیسے شاعر کے اندر شاعر کا "میں"۔ میں اور تم کا تضاد ملاحظہ فرمائیے۔

پاپ، پن، عشق و ہوس، نیکی بدی
ان سب کی اس تجرید میں
کون ہے کس کے تعاقب میں پتہ چلتا نہیں
زندگی کے سارے روپ آپس میں گم۔
ان میں ہر روپ ایک "میں" ہے، ایک "تم"
(میرا ہے)

نظم "ٹھہراؤ" میں شاعر کو بجا طور پر شکایت ہے
کہ دل کے رشتوں کو اب مانتا نہیں کوئی
کسی کو اپنے سوا جانتا نہیں کوئی
شاعر انسان کی عظمت پر یقین کامل رکھتا ہے اور ذہنِ انسان کو قدرت کا ایک وقیع کارنامہ تصور کرتا ہے۔ اپنی نظم "اپنا جنم" میں کہتا ہے:—
تصورات کی باہوں میں کائناتِ وسیع
سمٹ رہی ہے تو انسان بنتی جاتی ہے
خود شناسی اور خود آگہی کی منزلوں سے گزرنے کے بعد ہی شاعر کو عرفان کا یہ درجہ حاصل ہوا ہے۔
شہاب جعفری کی کامیاب نظموں میں، میں خاص طور پر سورج کا شہر، خدا کی واپسی، معاہدہ، انجانے فاصلے، ادھوری ہستیاں، تسخیر فطرت کے بعد، حال کے انتظار میں

رہا ہے۔ شہرنامے، وجدان، میں، ہاتھ کی لکیریں کا ذکر
کرنا چاہوں گا۔ سورج کا شہر، خدا کی واپسی ان دونوں
نظموں کی ٹکنیک ان کی دوسری نظموں کی ٹکنیک سے
مختلف ہے۔ نظم سورج کا شہر، غریب شہر کی ڈائری
کے چند اوراق پر مشتمل ہے۔ نظم "خدا کی واپسی" اخبار
کی اس خبر پر مبنی ہے کہ ایک دیوانہ شہر کے راستوں میں یہ اعلان
کرتے ہوئے دیکھا گیا کہ وہ پیمبر ہے اور گنہگار خلق کے نام وہ
آسمان سے خدا کا پیام لایا ہے۔ جہاں پہلی نظم میں ڈائری
کے اوراق کی آخری سطریں لہو کے دھبوں سے مٹ گئی ہیں۔
وہیں دوسری نظم میں دیوانے کو لوگ پتھراؤ کرکے مار ڈالتے
ہیں اور اس کا پیغام نامکمل رہ جاتا ہے۔ اس کے باوجود
اس غریب شہر اور اس دیوانے کی باتوں میں ایسی سچائی ہوتی
ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان نظموں کی ٹکنیک شاعر
کے مرکزی جذبات سے مطابقت رکھتی ہے اور ابلاغ میں
جذبات کی اضافی فراوانی کا حق ادا کرتی ہے۔ شہاب جعفری
کی دیگر کامیاب نظموں کا راز یہ ہے کہ ان میں مستعمل علامتوں
اور ذہنی پیکروں سے وابستہ جذباتی کیفیات کی لہریں
قاری کے ذہن میں وسیع اور عمیق تجربات کو ابھارلانے کے علاوہ
خود آپس میں مل کر سالم کلیت کی شکل اختیار کرتی ہیں۔

اکثر کامیاب نظم گو شعراء میں دیکھا گیا ہے کہ نظموں
کے لئے اپنا لہجہ متعین کر لینے کے بعد غزلوں کے لئے بھی اسی
لہجے کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ شہاب جعفری نے بھی اپنی غزلوں
میں اپنی نظموں کا مخصوص باوقار اور سنجیدہ لہجہ استعمال
کیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

زندگی پیاس اب اشکوں سے بجھا لینے دے
یہ بھی اپنا ہی لہو ہے کوئی زہراب نہیں

ساحل آب و سراب ایک ہے منزل منزل
تشنگی کرتی ہے سیراب نہ غرقاب مجھے

مفہوم نوائے راز کیا ہے؟
آوازِ شکستِ ساز کیا ہے

جہاں میں حوصلۂ روزگار کھو دیتے
جو تیرا غم بھی نہ ہوتا تو آج رو دیتے
گلوں نے پھینک دی شبنم تنک مزاجی سے
یہ چند قطرے بھی زخم بہار دھو دیتے

بھرتی ہے سر برہنہ صدائے سکوت سنگ
تیشہ ہے دفن دامنِ کہسار کی طرف
آوارہ قافلوں کی صدا لوٹتی رہی
صحرا ہی چل پڑا ہے دل زار کی طرف
پتھر بھی وہ نوا کہ نہ دل سے نکل سکی
صحرا بھی وہ صدا کہ ہے کہسار کی طرف

میرے حق میں اشک پیہم کے لئے ہزار دامن
انہیں کیا کروں جو آنسو نہ رکیں نہ بہنا چاہیں

شہاب جعفری کی "رباعیات" میں ان کی انفرادیت
ابھرتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ البتہ ان کی منظوم تمثیل "یہ میری
دنیا، یہ میری جنت" ایک قابل قدر تخلیق ہے، جس کے تمام
کردار چند تصورات اور علامات ہیں جن کو مشخص کرکے پیش
کیا گیا ہے۔ ان تصورات اور علامات میں اس طرح انسانی
جذبات بھر دیئے گئے ہیں۔ کہ یہ اشیاء ہماری ہی طرح جیتی
جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس تمثیل میں
حسن اور عشق دو اہم کردار ہیں جو عالم بالا میں ایک دوسرے
سے جدا ہو جاتے ہیں۔ حسن اس دنیا میں عورت کی شکل میں
جنم لے کر شہنشاہ زمانہ کے سامنے رقص و نغمہ پیش
کرتا ہے اور ایک معمار کا فن بن کر جنت ارضی کی تعمیر کا سبب بنتا
ہے۔ شہنشاہ معمار کا ہاتھ کاٹ ڈالنا چاہتا ہے تاکہ اس

جنت ارضی کا کوئی ثانی نہ بن سکے۔ اس پر قاصد اور معمار دونوں پر احتجاج کرنے کی وجہ سے دونوں کو حراست میں لے لیا جاتا ہے تنہائی کے عالم میں مختلف روحیں ان پر قہقہہ لگاتی ہیں۔ ادھر عالم بالا میں عشق تنہا ہونے کی وجہ سے ایک کہرام برپا کرتا ہے۔ زمین سے عرش بریں تک ایک تہلکہ سا مچ جاتا ہے۔ عرش الٰہی پر صبح ازل کی طرح کن فیکون کا سرور چھاتا ہے اور (حسن و عشق کے وصل پر) رحمت یزداں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگتے ہیں اور یہیں تمثیل اختتام کو پہنچتی ہے۔ یوں تو پلاٹ کا ارتقا خاص طور پر قابل ذکر ہے لیکن جو چیز مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر نے حسن و عشق کا تمام فلسفہ نچوڑ کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اردو کے دیگر جدید شعرا کو بھی اس طرح کی منظوم تمثیل کی طرف توجہ دینی چاہئے۔

کالی داس، دانتے اور بیدل سے لے کر غالب، اقبال ٹیگور اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ تک کی لازوال تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ جب تک مربوط فکر منظم جذبات کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو، تو ادب عالیہ کی تخلیق کا تصور ناممکن ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اردو کے اس نوجوان شاعر کے کلام میں ان دونوں عناصر کا حسین و جمیل امتزاج ہوا ہے۔ چنانچہ "سورج کا شہر" کی اشاعت سے اردو کی جدید شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ کتاب چھ روپیوں میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی [illegible] سے مل سکتی ہے۔

پُروائی

شباب للت کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جو نظموں، غزلوں، دوہوں اور ترجموں پر مشتمل ہے۔ ان کی نظمیں محاذ جنگ سے لے کر پیام تاشقند اور خاندانی منصوبہ بندی تک قومی اور سماجی مسائل کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہیں

لیکن ان نظموں میں جذبات کا وہ خلوص نہیں ملتا جو ان کے پہلے مجموعۂ کلام "مضراب" کی بعض نظموں میں موجود ہیں خصوصاً وہ نظمیں جنہیں شاعر نے اپنی رفیقۂ حیات کے غم مفارقت میں لکھا تھا۔ زیر نظر مجموعہ میں انہوں نے گیتا کے بعض بند کا جو ترجمہ کیا ہے وہ میرے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان ترجموں میں شاعر نے شاعری کے ساتھ ساتھ اشلوکوں کی روح کو بھی برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو:—

यदा यदा हि धर्मस्य
ग्लानिर्भवति भारत अभ्युत्था-
नमधर्मस्य तदात्मानं सृजाम्यहम्
परित्राणाय साधूनां विनाशाय
च दुष्कृताम धर्म संस्थापनार्थाय
सं भवामि युगे युगे ।

گیتا کے اس بند کا شباب للت نے یوں ترجمہ کیا ہے:—

دکھیوں کے لئے باعثِ راحت بن کر
ہر شکل سے دافعِ اذیت بن کر
جب ظلمتِ باطل کا عمل ہوتا ہے
آتا ہوں میں تنویرِ حقیقت بن کر

ترجمہ ہو بہو ہو سکنے کے باوجود، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ترجمے کے ذریعہ اصل کی روح تک پہنچ جاتے ہیں۔ شباب للت نے ہندی بحروں میں بعض اردو کے خوبصورت دوہے لکھے ہیں۔ ان کی غزلوں میں زیادہ تر اشعار روائتی قسم کے ہیں۔ پھر بھی انہوں نے ایسے دلکش اشعار کہے ہیں۔

(۱) ڈال دی ہے کانچ میں بھی جان تیرے عکس نے
دیکھ کر تجھ کو دھڑک اٹھا ترے درپن کا دل

(۲)

اب ڈھل گئی ہیں روح کی ساری کثافتیں
تا عمر غرقِ بادہ گساری رہا ہوں میں

(۳)

اک ذرہ حقیر سہی پھر بھی اے ندیم
کل بزمِ کائنات پہ بھاری رہا ہوں میں

شباب للت اکبر

"دل بے خبر سنبھل جا کوئی مسکرا رہا ہے
وہ نگاہ اٹھ رہی ہے وہ پیام آرہا ہے

جیسے روایتی قسم کے اشعار کے بجائے مذکورہ بالا اشعار کی طرح شعر کہیں گے تو امید قوی ہے کہ وہ اردو ادب کو بہت کچھ دے سکیں گے۔

"پُروائی" چار روپیوں میں مکتبہ اردو ادب، جموں (توی) سے مل سکتی ہے۔

فنِ لطیفہ گوئی

مسکراہٹ ایک ایسی جبلت ہے جو صرف انسان کے لئے مخصوص ہے اور جو کسی جانور میں پائی نہیں جاتی۔ لہٰذا مسکراہٹ یا ہنسی کے ذریعہ انسان دوسرے جانوروں سے ممتاز ہوتا ہے فنِ لطیفہ گوئی کی اساس انسان کے اسی جبلت پر قائم ہے۔

احمد جمال پاشا نے زیرِ تبصرہ کتاب میں بہت سے لطیفوں کو جمع کرکے انہیں ایک مبسوط پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا ہے پیش لفظ میں احمد جمال پاشا نے لطیفوں کے نفسیاتی عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے تہذیبِ انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ لطیفوں کے ارتقائی عمل کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ احمد جمال پاشا نے لطیفوں کو (۱) تبسم آفریں (۲) خندہ دنداں نما (۳) قہقہے اور (۴) کثیفے۔ ان چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دراصل لطیفوں کا تعلق اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ جو قاری کی مخصوص ذہنی ساخت کے علاوہ اس کے موڈ mood پر بھی منحصر ہے۔ ایک لطیفہ کسی شخص کے لئے تبسم آفریں ہو تو وہی لطیفہ دوسرے کے لئے خندۂ دنداں نما کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا احمد جمال پاشا کی اس طرح کی تقسیم سائنٹفک نہیں ہے احمد جمال پاشا کا خیال ہے کہ زیادہ تر لطائف غیر معمولی شخصیات، واقعات و حالات سے جنم لیتے ہیں یا منسوب ہیں۔ لیکن زیرِ نظر کتاب میں سوائے ایک دو کے باقی کوئی لطیفہ غیر معمولی شخصیات و حالات سے وابستہ نہیں ہے۔ بہرکیف "فنِ لطیفہ گوئی" پر احمد جمال پاشا کا مقالہ بہت ہی دقیع اور عالمانہ ہے۔ اس دور میں جبکہ زندگی کا تناؤ (Tension) کافی بڑھ گیا ہے۔ لطیفے سن کر چند لمحوں کے لئے مسکرا دینا یا ہنس لینا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے زیرِ نظر مجموعہ "فنِ لطیفہ گوئی" میں بکھرے ہوئے لطیفوں کو یکجا کر کے احمد جمال پاشا نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

یہ کتاب تین روپیوں میں پنچ پبلشرز۔ سرداری منزل کچا احاطہ، لکھنؤ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

اردو شاعری میں تاج محل

تاج محل پر لکھی گئی نظموں کا ذکر آتے ہی میرا ذہن سب سے پہلے خود شاہ جہاں کی لکھی ہوئی اس نظم کی طرف جاتا ہے۔

زہے مرقدِ پاک بلقیسِ عہد — کہ باقوئے آفاق راگشت مہد
منور مقامے چو باغِ بہشت — معطر چو فردوس عنبر سرشت
بریں بقعۂ پاک والا مقام — ترشح کناں ابرِ رحمت مدام
ہوائش ز عفت حجاب آفریں — نسیمش ز غنچہ است خلوت گزیں
خداوند روزی رسانِ حیات — بریں درکند چشم بجو برات
اساسش بود چوں زمیں پائدار — چوں ایمانِ صاحب دلاں استوار

چو در محکمیش پرداختند
برائے بقا ماشنے ساختند

شاہجہاں کی یہ نظم مجھے سنگ مرمر کے تاج محل کی
طرح حسین وجمیل معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہ نظم "تاج محل" پر
لکھی ہوئی سب سے پہلی نظم ہے۔ اردو، ہندی، بنگالی، اڑیا
تیلگو اور دیگر علاقائی زبانوں کے علاوہ بیرونی ممالک کی زبانوں
میں بھی "تاج محل" پر لکھی ہوئی نظموں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ
موجود ہے۔ ۱۹۶۳ء میں جب امریکہ کے جدید شاعر PAUL-
ENGLE - ہندوستان آئے تھے تو انہوں نے بھی
"تاج محل" پر ایک جدید نظم کہی تھی جس میں انہوں نے تاج محل
کے گنبد کو عورت کی پستان کے ساتھ تشبیہہ دی ہے۔ اردو زبان
میں ابتک "تاج محل" پر جتنی نظمیں لکھی گئی ہیں، وہ سب
ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ شجاع خاور نے پہلی بار ان سب
کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ اردو اور تاج محل
کا جو گہرا رشتہ ہے۔ وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس
قول سے بہتر طور پر ظاہر ہو سکتا ہے کہ "مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ
ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ
تین نام لوں گا۔ غالب، اردو اور تاج محل۔ یہ ہندوستان
کی تہذیبی پیداوار ہیں" الغرض ہندوستان کی دو ہی مشترکہ
تہذیب اگر عمارت کی شکل اختیار کرتی ہے تو تاج محل بن جاتی
ہے۔ اور اگر زبان کی شکل اختیار کرتی ہے تو اردو بن جاتی
ہے۔ اور اگر انسان کی شکل اختیار کرتی ہے تو غالب بن جاتی
ہے لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ یوں تو اردو میں نظیر اکبرآبادی
سے لے کر ساحر لدھیانوی تک متعدد شعراء نے "تاج محل" پر نظمیں
کہی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ٹیگور کے اس بنگالی شعر
کا جواب پیش نہ کر سکا:۔

"اک بندو نینیر جل
کالیر کپول تلے سبھرہ سمو جول.
اے تاج محل"

یعنی "عارضِ وقت پر چمکتا ہوا ایک قطرۂ شفاف آنسو
—— یہ تاج محل"

"تاج محل" دیکھ کر بلگانن نے وہی بات کہی، جو
ساحر نے اپنی نظم "تاج محل" میں کہی تھی۔ اس سے
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام اشتراکیت پسندوں کے سوچنے کا
انداز یکساں ہوتا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں شجاع خاور نے ہر نظم پر اپنے طور پر
تنقید بھی کی ہے جو نہایت بچکانہ ہے۔

یہ کتاب ایک روپیہ پچھتر پیسوں میں اردو
پبلی کیشنز دہلی ۶ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

عروج آدم

نئی شاعری کے فلسفہ طرازوں کی اجارہ دارانہ
گروہ بندیوں نے جس شاعر کے ساتھ سب سے زیادہ ناانصافی
کی ہے وہ ہے رفعت سروش جدید ذہن و شعور کے ہر
پہلو موجودہ حیات کے مسائل پر گہری نظر رکھنے کے
باوجود انہیں وہ پذیرائی نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ
مستحق تھے۔ "عروج آدم" رفعت سروش کا دوسرا
مجموعۂ کلام ہے جو تین طویل نظموں اور چار منظوم تمثیلوں
پر مشتمل ہے۔ ہر نظم یا تمثیل کے ساتھ کچھ نہ کچھ "مقصدیت"
وابستہ ہے جس کے پس پردہ شاعر کا سیاسی اور سماجی شعور
کارفرما ہے۔ اپنی نظموں "روح تاشقند" "نغمہ خواب"
اور "روشنی اور منزل" میں شاعر نے بالترتیب شاستری
نہرو اور گاندھی کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا
ہے "عروج آدم" "نئی صبح" "شعور حیات" اور شکست زندگی
رفعت سروش کی تمثیلی نظمیں ہیں جو "خلائی سفر" بھوک
اور امن عالم جیسے اس دور کے اہم مسائل سے متعلق ہیں۔
یہاں پھر وہی پرانا مسئلہ "شاعری میں مقصدیت کا" ہم
ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ شعر میں مقصدیت کے اظہار کے
وقت عموماً شاعر کو ایسی دشوار گزار راہوں سے گزرنا
پڑتا ہے جہاں اسے پھونک پھونک قدم رکھنا ضروری

ہوتا ہے۔ ورنہ شاعر ذرا سی بے توجہی سے کام لے تو شعر میں مقصدیت کا عنصر غالب آجائے گا جس سے شاعری کی شکل مسخ ہو کر رہ جائے گی یہی حال زیر نظر مجموعہ میں شامل شدہ رفعت سروش کی اکثر نظموں کا ہے۔ البتہ ان کی تمثیلی نظم "نئی صبح" ان کی واحد نظم ہے جس میں مقصدیت کے باوجود شعری حسن مجروح نہیں ہوتا منظوم تمثیل "نئی صبح" وقت، رات، انسان، شیطان اور صبح انہیں پانچ کرداروں پر مبنی ہے۔ نظم کا آغاز، وقت اور رات کی گفتگو سے شروع ہوتا ہے جس میں وقت اور رات کے اس قول کی تردید کرتا ہے کہ نعمت وقت کو انسان نے ٹھکرا دیا ہے، وقت رات کو عظمت انسان کا احساس دلاتا ہے۔ اور اس کی خاطر تیرہ و تار فضا میں ستارے بھر دینے کا حکم صادر کرتا ہے۔ رات کے اس اعتراض پر کہ انسان نے چاند ستاروں اور سبکسار نظاروں کا سکون چھینا ہے۔ وقت جواب دیتا ہے کہ یہ انسان نہیں بلکہ پیکر انسانی میں بندۂ ابلیس ہے جو ایسا کرتا ہے۔ اس کے بعد شیطان اپنے رقص خونیں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ نفرتیں منہ چڑاتی ہوئی اپنے بگولوں کر دفضاؤں میں پرواز کرنے لگتی ہیں۔ کتنے ضحاک کاندھوں پر پھنکارتے ہوئے اژدہے لے کر اور کتنے نمرود دہکتی ہوئی آگ لے کر جنت نشان کرہ ارض پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ وقت شیطان سے دریافت کرتا ہے کہ کیا وہ ایلورا اور اجنتا کے نقوش، افلاطون کے خوابوں، خیام و ہومر کے نغموں، شکسپیر، کالی داس، غالب، اقبال اور ٹیگور کی شاعری کو نیست و نابود کرنا چاہتا ہے۔ شیطان جب کہتا ہے کہ اس کی بھی خواہش ہے کہ نہ کوئی نغمہ رہے نہ کوئی صدا تو وقت کہتا ہے کہ شیطان تخریب عالم نہیں بلکہ خودکشی کر رہا ہے۔ وقت رخصت ہوتا ہے تو شیطان سے اپنی فتح سمجھ کر قہقہے لگاتا ہے۔ لیکن اچانک شیطان خود اپنے تخریبی عمل کا شکار ہو جاتا ہے اور غیب سے گولیاں اس کا سینہ چھیدتی چلی جاتی ہیں آخر میں وہ انسان کے رحم و کرم کی بھیک مانگتا ہے لیکن مایوس ہو کر سسک سسک کر دم توڑتا ہے۔ تب صبح اپنے جلو میں وقت کی برکتیں اور زندگی کی نئی عظمتیں لے کر آتی ہیں اور یہیں نظم اختتام کو پہنچتی ہے یوں تو رفعت سروش نے تمام تمثیلیں اسٹیج کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی ہیں لیکن اس تمثیل میں جو بات خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ پلاٹ کے ارتقاء کا عمل خود کرداروں کے اپنے اندر سے معرض وجود میں آتا ہے جبکہ ان کی دیگر تمثیلوں میں شاعر منظوم تمہیدوں کے ذریعہ پلاٹ کو آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ منظوم تمثیل "نئی صبح" ہر اعتبار سے کامیاب ہے۔ اس دور میں جبکہ اکثر جدید شعراء میں مایوسی، بے یقینی اور تنہائی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ انسان کے درخشاں مستقبل پر یقین رکھنا یقیناً شاعر کے سلجھے ہوئے ذوق کا ثبوت دیتا ہے جس سے اس کی انفرادیت ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ البتہ تمثیلی نظم "شعور حیات" میں رفعت سروش نے اپنا جو یہ فلسفہ پیش کیا ہے:۔

وہ بھوک کی تپش تھی جس نے سوز زندگی دیا
غذا کی آرزو تھی جس نے ذوق آگہی دیا
یہ علم و فضل و فلسفہ یہ بھوک کی تلاش ہیں
یہ فن، یہ شعر، یہ ادب، یہ نغمۂ معاش ہیں

اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ میری رائے میں جسمانی بھوک کی تشفی کے لیے جس طرح ہمیں مادی غذا کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی بھوک کی تشفی کے لیے علوم فنون، مذہب اور جمالیات جیسی روحانی غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

بہرحال مجھے امید ہے کہ رفعت سروش انسان کی قوت عمل آزادی فکر و نظر اور قیام امن عالم کے سلسلے میں جو صحت مند نظریۂ حیات رکھتے ہیں اس سے دوسرے جدید شعراء بھی مستفید ہوں تو اردو ادب میں یقیناً ایک سنہرے دور کا آغاز ہوگا

"عروجِ آدم" پانچ روپیوں میں مجلس اشاعت ادب دہلی ملا سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ماہنامہ کتاب لکھنؤ (مراٹھی کہانی نمبر)

مدیر ماہنامہ "کتاب" نے ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں پر خاص نمبر نکالنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ لائق تحسین بھی ہے اور دوسرے رسالوں کے لئے قابل تقلید بھی۔ اس دور میں جبکہ غیر ملکی ادبی رجحانات کی اندھی تقلید (چاہے ان رجحانات کی نوعیت جو بھی ہو) ایک عام وبائی شکل اختیار کرچکی ہے۔ ایسے خاص نمبر کی اہمیت یقیناً مسلم ہے جن سے ہم علاقائی زبانوں کے مختلف ادبی رجحانات سے واقف ہوسکتے ہیں۔ اور ان کو مدنظر رکھتے ہوئے خود اپنے ادبی تحریکوں کی سمت و رفتار متعین کرسکتے ہیں۔ مختلف علاقائی زبانوں کی ادبی روایتوں کا عرفان حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان زبانوں پر غیر ملکی ادبی رجحانات کا کسی حد تک اثر پڑا ہے اس کا بھی علم حاصل کرسکتے ہیں۔ اردو کو اس بات کی سہولت حاصل ہے کہ اس کے ادیب ہندوستان کے ہر علاقہ میں موجود ہیں۔ اس لئے اس طرح کے خاص نمبر اردو میں جتنی آسانی سے نکل سکتے ہیں ہندی کے علاوہ کسی دوسری علاقائی زبان میں اتنی آسانی سے نہیں نکل سکتے۔ زیر تبصرہ مراٹھی کہانی نمبر کے مرتب نور پرکار قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے مراٹھی کے بیس نمائندہ افسانوں اور چار مضامین کا ترجمہ پیش کرکے مراٹھی کے افسانوی ادب سے متعلق ہماری معلومات میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں کی طرح مراٹھی کے افسانوی ادب نے بھی گذشتہ ساٹھ ستر سال میں ارتقاء کے بہت سے مدارج عبور کرلئے ہیں مراٹھی کے افسانوی ادب میں ہری بھاؤ آپٹے، ورگر وجر کا وہی درجہ ہے جو اردو میں ڈپٹی نذیر احمد، اڑیا میں فقیر موہن سیناپتی اور بنگالی میں سرت چندر وغیرہ کا۔ دواکر کرشن، کھانڈیکر، ادر بھرڑکے کو شیگورا در پریم کا ہم عصر تصور کیا جاسکتا ہے۔ دور جدید کے افسانہ نگاروں میں گنگا دھر گاڈگل، اروند گوکھلے اور وینکٹیش ماڈگلکر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کی تخلیقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مراٹھی کا جدید افسانوی ادب ہندوستان کی کسی بھی دوسری علاقائی زبان کے جدید افسانوی ادب سے پیچھے نہیں ہے۔ غرضکہ سید جمیل احمد (مدیر کتاب) نے مراٹھی نمبر نکال کر ہم اردو والوں پر بڑا احسان کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ دوسری علاقائی زبانوں مثلاً اڑیا، بنگالی، آسامی، تیلگو وغیرہ پر بھی اسی طرح کا خاص نمبر نکالیں گے۔

بزم شاخسار

شمس الرحمٰن فاروقی ــــــ الہ آباد

شاخسار کا تازہ شمارہ کچھ دن ہوئے ملا تھا۔ بحیثیت مجموعی اس کا معیار بہتر ہو رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک اس کے لئے کوئی قابل ذکر چیز نہ بھیج سکا۔ بہرحال اس فرض سے جلد از جلد عہدہ برآ ہونے کی کوشش کروں گا۔ آپ کا مضمون شعری تنقید کے چند بنیادی مسائل باوجود شدید اختلافات کے انتہائی دلچسپ، وقیع اور فکر انگیز ہے۔ مجھے فرصت ہوتی تو میں آپ کے اٹھائے ہوئے مسائل پر کھل کر گفتگو کرتا۔ اس وقت صرف چند واقعاتی Factual بیانات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔

(۱) آپ فرماتے ہیں (ص ۸۴ پیراگراف ۱) کہ تحریک میں آپ کے مضمون "نظم، نثر اور شعر" کی اشاعت کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی اور عابد علی عابد کے مکتوبات چھپے۔ اس بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ آپ کا مضمون محرک بحث تھا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ محرک بحث میرا مضمون تھا۔ جو مدیر تحریک نے اوراق لاہور سے Digest کر کے "مانگے کا اجالا" کے تحت شائع کیا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد اور اس کے حوالے سے آپ نے اپنا مضمون "نظم، نثر اور شعر" لکھا۔ چنانچہ "نظم، نثر اور شعر" کے پہلے ہی پیراگراف میں میرے مضمون مطبوعہ اوراق و تحریک کا حوالہ موجود ہے۔ لہٰذا اصل بحث اس ہیچ مرز کے مضمون سے شروع ہوئی ہے۔

(۲) آپ لکھتے ہیں (ص ۱۷):

> شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ شعر کی بندش میں نثر کی طرح سلاست اور چستی ہونی چاہیے اور شعر کو نثر کی طرح سادہ اور رواں ہونا چاہیے۔ یہاں وہ شعر کی زبان کو نثر کے قریب کرنا چاہتے ہیں۔

آپ نے میرے اصل الفاظ نقل نہیں کئے ہیں، اور غالباً حافظے پر بھروسا کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ نے میری بات کہیں سے کہیں پہنچا دی ہے۔ میں نے شعر کی زبان کو نثر کے قریب کرنے کی تلقین کہیں نہیں کی ہے۔ ملاحظہ ہو اوراق مئی ۱۹۶۶ (ص ۱۴۹) اور تحریک نومبر ۱۹۶۶ (ص ۳۸۴)۔

> مشرق و مغرب کی تنقید اس بات پر متفق ہے کہ اگر شعر کی نشست الفاظ اور بندش نثر کی طرح سادہ اور فطری ہو تو یہ شعر کا بڑا حسن ہے ...... اگر شاعر ضرورت شعری سے مجبور نہ ہو جائے اور الفاظ کی نشست وہی رکھے جو عام بول چال میں ہوتی ہے تو یہ اس کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

ان جملوں سے یہ کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ میں شعر کی زبان کو نثر کے

نزدیک لانا چاہتا ہوں میرا سارا نظریہ ہی یہ ہے (یہ کوئی صرف میرا نہیں ہے) کہ شعر اور نثر کا فرق اصل زبان کا فرق ہے میں نے صرف یہ کہا ہے کہ شعر کا بڑا حسن یہ بھی ہے کہ اس کی نشست الفاظ اور بندش نثر کی طرح فطری ہو یہ ایک نحوی Synta ctical مسئلہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق شعری زبان سے بالکل نہیں ہے

(۳) اسی صفحہ پر آپ کہتے ہیں

اسی اثنا میں ان (فاروقی) کا ایک
مضمون نظر سے گذرا جس میں انہوں نے اپنے
نظریات کی یوں وضاحت کی ہے کہ نظم میں ہر لفظ
اسی جگہ رکھا گیا ہو جہاں قواعد کی رو سے اسے
ہونا چاہیئے۔"

مفصل حوالہ نہ ہونے کی وجہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آپ نے میرا یہ جملہ کہاں سے نقل کیا ہے۔ میں نے بہت غور کیا لیکن مجھے یاد نہ آیا کہ میں نے ایسی بات کب اور کس سیاق و سباق میں کہی ہے؟ از راہ کرم اس بات کی وضاحت فرمائیے کہ یہ جملہ آپ نے میرے کس مضمون سے نقل کیا ہے۔ یہ بھی استدعا ہے کہ آئندہ اس قسم کے "خطرناک" بیانات نقل کرتے وقت حوالہ ضرور دے دیا کریں کہ یہ کہاں پائے جاتے ہیں۔ آپ کے منقولہ جملے سے بظاہر ملتی جلتی بات میں نے اپنے اوراق والے مضمون میں کہی تھی (اقتباس اوپر دے چکا ہوں) لیکن میں نے کوئی عام حکم نہیں لگایا تھا کہ شعر میں الفاظ کی ترتیب نثر کی سی ہونا ضروری ہے۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر ایسا ہو تو یہ شعر کا بڑا حسن ہے اور شاعر کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

(۴) میں اپنے اس خیال پر اب بھی قائم ہوں کہ "جذبات نام کی چیز کا ادب سے کوئی بنیادی تعلق نہیں ہے"۔ لیکن اس خیال کی اس ایلیٹ کا مشہور قول نہیں جو آپ نے نقل کیا ہے۔ جذبات کا اظہار اگر نہ بھی ہو، صرف حقائق یا صرف تجربات یا صرف مشاہدوں کا اظہار ہو تو بھی شعر بن سکتا ہے۔ یعنی شعر جذبات کے بغیر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کا شعر سے کوئی بنیادی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں جذبات کی اضافی فراوانی کیا سرے سے جذبات ہی نہیں ہیں۔ ہاں حقائق، تجربات، مشاہدہ ضرور ہیں۔ یہ اشعار جذبات انگیز (Emotive) ضرور لیکن جذبات پر مبنی (Emotional) نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ جذبات انگیز (Emotive) اور جذبات پر مبنی (Emotional) میں فرق نہیں کر پاتے:

حقائق اور مشاہدات:-

تو پست فطرت اور خیال بسا بلند
اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند (غالب)

تجربات اور حقائق:-

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن استادن نشستن خفتن و مردن
(صائب)

مشاہدات و تجربات:-

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش (داغ)

حقائق

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا (غالب)

مشاہدات

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے (میر)

تجربات

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے (میر)

دنیا کی شاعری اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

تازہ شمارہ میں ذکا صدیقی اور طلحہ رضوی برق کے خطوط دلچسپ رہے۔

کرامت علی کرامت

[برادرم۔ تسلیم چونکہ میں نے اپنا مضمون "تحریر"

نے لکھا تھا (جو طوالت کی وجہ سے "تحریک" میں شائع نہ
ہوا) اس لئے اس مضمون میں میں نے قصداً آپ کے "اوراق"
مضمون کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس بحث میں دلچسپی لینے والے
"تحریک" کو پہلے سے اس کا علم ہے کہ اصل بحث کہاں سے شروع
۔ ویسے "تحریک" میں میرے مضمون کی اشاعت کے بعد
ی مسائل زیر بحث آئے ہیں ان پر روشنی ڈالنا مقصد تھا اس لئے
کے "اوراق" والے مضمون کے حوالے کے بغیر بھی میرا یہ مضمون
ذ مکمل ہے ۔ بہرکیف یہ کوئی اہم بات نہیں ۔ اب آپ کے
ے ہوئے دیگر سوالات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا
ہوں گا ۔

بقول آپ کے، شعر میں نشست الفاظ اور بندش نثر
کی طرح فطری ہو، تو یہ شعر کا بڑا حسن ہے ۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر لفظ
سی جگہ موجود نہ ہو جہاں اسے قواعد کی رو سے ہونا چاہیے تو
نشست الفاظ اور بندش نثر کی طرح فطری ہو ہی نہیں سکتی
پ آزاد بحر کے امکانات پر بحث کرتے ہوئے اس کی کامیابی کیلئے
یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ "پوری نظم کی ترتیب الفاظ نثر کی طرح
فطری اور سادہ ہو۔ ہر لفظ اسی جگہ رکھا گیا ہو جہاں قواعد کی رو سے
سے ہونا چاہیئے" (ملاحظہ ہو شب خون جلد ۲ شمارہ ۱۴ ص ۱۷)
حالانکہ میری رائے میں یہ کوئی ضروری نہیں ۔ شاعر کے مرکزی جذبات
خود اپنے لئے طریقہ اظہار چاہتے ہیں جس پر کسی طرح کی پابندی عائد
نے کا میں قائل نہیں ہوں ۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر شعر کی نشست الفاظ اور بندش میں
نثر کی سی سادگی ہونا حسن نہیں ہے تو مشرقی تنقید اب تک بندش
کی چستی، بندش کی صفائی کے حد سحر تک پہنچ جانے کی کیفیت
سہل ممتنع وغیرہ سے بہت زیادہ دلچسپی لیتی رہی ہے سراسر
گمراہ تھی ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے (تحریک، فروری ۱۹۶۷ء
ص ۳۳) آپ کا پورا نظریہ شعری اس مفروضے پر مبنی ہے حالانکہ
آپ نے اس مفروضے کی صحت یا عدم صحت پر کوئی تشفی بخش
بحث کی ہی نہیں ۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ غالب کا یہ شعر

ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

جس میں نثر کی سی سادگی اور سہل ممتنع ہونے کی خوبی نہیں ہے
وہ ان کے اس شعر سے

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کم تر درجے کا ہے ؟ یا یہ کہ دوسرے شعر میں سہل ممتنع کی خوبی
ہونے کی وجہ سے پہلے شعر کے مقابلے میں غالب کی قادرالکلامی
کا بہتر طور پر اظہار ہوتا ہے ؟ میری رائے میں دونوں طرح کے
اشعار میں غالب کی قادرالکلامی کا یکساں طور پر اظہار ہوا ہے
کیونکہ پہلے شعر میں جہاں پیچیدہ قسم کے ذہنی پیکر کے استعمال کی
وجہ سے جذباتی کیفیات کی موجیں ہمارے تحت الشعور اور لاشعور میں
عمیق تہوں سے بعض خفتہ تجربات کو شعور کی سطح تک ابھار لانے
کی اہلیت رکھتی ہیں ۔ وہیں دوسرے شعر میں سادگی بیان کے
باوجود تلازم الفاظ سے ہمیں بعض ایسے پیچیدہ نفسیاتی حقائق
کی طرف اشارے ملتے ہیں جن کی وجہ سے جذباتی کیفیات کی
گہری اور وسیع موجیں آپس میں مل کر سالم کلیت کی شکل
اختیار کرتی ہیں ۔

شاعر کے ایسے تجربات جو سادگی اظہار کے متقاضی ہوں
ان کے لئے ژولیدہ بیانی سے کام لینا کسی طرح مستحسن نہیں ہے
اس اعتبار سے "سہل ممتنع" کی ترکیب میرے نزدیک بامعنی ہے ۔
لیکن اس نئی شاعری کے دور میں اس ترکیب کا جتنا غلط استعمال
ہوا ہے، شاید اس سے قبل ایسا کبھی نہیں ہوا ۔

پتھر کی بھوری اوٹ میں لالہ کھلا تھا کل
آج اس کو نوچ لے گئیں دو بچیاں جناب

جیسے تیسرے درجے کے شعر میں "نثر کی سی سادگی" "بندش کی صفائی"
اور سہل ممتنع کی خصوصیات کو شعر کا بہت بڑا حسن کہنا
ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے ؛ مندرجہ بالا شعر میں "پتھر کی بھوری
اوٹ"، "لالہ"، "کل اور آج"، "دو بچیوں کا نوچ لینا"

(جذبیاں کیوں ؟) وغیرہ سے وابستہ ذہنی پیکر جن جذباتی کیفیات کی موجوں کو ابھارتے ہیں ان کے باہمی امتزاج سے سالم کلیت پیدا نہیں ہوتی ۔

آپ کا نظریہ ہے کہ شعر اور نثر کا اصل فرق زبان کا فرق ہے ۔ یہ فرق دراصل زبان کا فرق نہیں بلکہ جذبات کی اضافی فراوانی کا فرق ہے ۔

آپ نے جن اشعار کا حوالہ دیا ہے ان میں حقائق، تجربات یا مشاہدات کا پایا جانا فطری ہے ۔ کیونکہ مشاہدات، تجربات یا حقائق کا عرفان حاصل کئے بغیر شعر کی تخلیق کیسے ممکن ہو سکتی ہے ؟ یہی وہ سنگ و خشت ہیں جن سے شعر کی عمارت بنتی ہے ۔ آپ اگر یہ ماننے کو تیار ہیں کہ منقولہ اشعار جذبات انگیز ہیں تو آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اشعار جذبات پر مبنی نہیں ہیں ؟ "جذبات انگیز" سے مراد "ذہن قاری میں جذبات پیدا کرنے والا" اور "جذبات پر مبنی" سے مراد "دوران تخلیق ذہن شاعر میں جذبات کی پیداوار" ہے ۔ دوران تخلیق شعر شاعر کے ذہن میں ماقبل شعور اور شعور اور ادراک ان دونوں کی کارفرمائی سے جو ذکاوتی ہیجانات پیدا ہوتے ہیں وہ کس طرح جذباتی رفتار سے معمور رہتے ہیں ۔ اس کا دوبارہ ذکر غیر ضروری سمجھتا ہوں ۔ البتہ اتنا کہنا چاہوں گا کہ ذہن شاعر کا تخلیقی عمل (CREATION) اور ذہن قاری کی تخلیق ثانی (RE-CREATION) عمل اور ردعمل (ACTION & REACTION) کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اس لئے آپ نے جن اشعار کو جذبات انگیز کہا ہے وہ جذبات پر مبنی بھی ہیں ۔ آپ نے مجھ پر "جذبات انگیز" اور "جذبات پر مبنی" میں فرق نہیں کر پانے کا الزام لگایا ہے ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ خود "جذباتی شدت" اور "گراں قدر جذباتی تجربات" میں فرق نہیں کر پاتے ۔

آپ سے درخواست ہے کہ اپنے نظریۂ شعری پر نظر ثانی کریں ۔

حرمت الاکرام ـــــــــ مرزا پور

محبی کرامت صاحب! آپ کا مقالہ "شعری تنقید کے بنیادی مسائل" مفصل، واضح اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اعتدال و توازن کا بھی حامل ہے ۔ زیادہ خوبی کی بات یہ ہے کہ نظریہ کی تشریح اور اعتراضات کے جواب میں اظہار خیال کا انداز نہایت سنجیدہ، ٹھوس اور علمی ہے ۔ انتہا پسندانہ اور سطحی نہیں ۔ یہ مقالہ کئی اعتبار سے غور طلب ہے اور "جذبات کی اضافی فراوانی" کا نظریہ اہل ادب کی خصوصی توجہ چاہتا ہے ۔ ضرورت ہے کہ اس پر مزید سوچا اور لکھا جائے، مگر کھلے ذہن کے ساتھ ۔ اس موضوع پر آپ کے جو مضامین "نگار" پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں ۔ وہ "شاخسار" میں دوبارہ چھپ جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟ آپ کے خیالات یکجا اور مربوط طور پر "قارئین" تک پہنچ سکیں گے ۔

علی عباس امید ـــــــــ بھوپال

مشترکہ شمارے نے تو چونکا دیا ۔ ہر اعتبار سے پسندیدہ ہے ۔ آپ کا مضمون آپ کی بالغ نظری کا آئینہ دار ہے ۔ اس میں آپ نے جو Modern Set theory پیش کی ہے وہ قابل قدر منفرد کوشش ہے ۔ مناظر عاشق کا انٹرویو اچھا ہے ۔

نظموں میں امجد نجمی، کمار پاشی، حسن فرخ اور حمید ... کی تخلیقات پسند آئیں ۔ میری نظم کا ایک مصرعہ "روح شادر ہو" کے بجائے "روح شادر ہوتی ہے" چھپ گیا ہے ۔

وفا ملک پوری، پرکاش فکری، اخوان چشتی اور کفیل کی غزلیں خوب ہیں ۔

"بزم شاخسار" کافی کارآمد ہے ۔

متین سروش ـــــــــ پونا

میں نے آپ کا مقالہ "شعری تنقید کے چند بنیادی مسائل" کا مطالعہ بطور خاص کیا ۔ آپ نے ہر پہلو پر تفصیل سے سیر حاصل بحث کی ہے ۔ آپ کا یہ مقالہ اردو تنقید میں

تحقیقی اضافہ ہے۔ یہ اردو کے طالب علموں کی رہبری کا سرچشمہ ہے ہی لیکن ایسے شعراء اور تنقید نگاروں کی بھی آنکھیں کھولنے والا ہے جو ذہنی کج روی میں اوٹ پٹانگ بحثیں کرتے رہتے اور ادبی اسٹنٹ چلاتے رہتے ہیں۔ امید کہ آپ اس قسم کے مضامین کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

عروج احمد عروج ——— جالنہ

تازہ شاخسار میں آپ کا مضمون "شعری تنقید کے بنیادی مسائل" کافی اثر انگیز ہے۔ یہ مضمون نام نہاد نقادوں کے لئے جو موقعہ بے موقعہ اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں بہت طور پر رہنمائی کر سکے گا۔ علیم اختر صاحب کا مضمون ڈاکٹر زور کی شخصیت پر نئے زاویے سے روشنی ڈالتا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کا انٹرویو، اور قیصر سرمست کا مضمون بے حد پسند آئے۔

شہاب جعفری، پرکاش فکری، کفیل آذر اور جیدی یت ب گاڑھی کی غزلیں پسند آئیں۔ کمار پاشی احمد اکرام الحق، راز، وہاب دانش، حیدر تاب، حسن فرخ، اور کرامت علی کرامت کی نظمیں اچھی ہیں۔

پرکاش فکری ——— رانچی

مجموعی طور پر خاص نمبر کافی بھاری بھرکم ہے۔ آپ کا مقالہ تو جیسے پڑھنے کی چیز ہے۔ اور سمجھنے کی بھی۔ تبصرے آپ نے بڑے تفصیلی کئے ہیں۔

ظہیر صدیقی کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں آپ نے بعض باتیں بڑے پتے کی کہی ہیں۔ مگر آج کی شاعری کو ذات پر مرکوز "انا" کی حدوں میں قید سمجھ لینا ٹھیک نہیں۔ آج کے شاعر خارجی موضوعات سے اگر بے توجہی برتتے ہیں تو محض اس وجہ سے کہ خارجی موضوعات پر کی ہوئی شاعری کی رسوائی ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اردو میں خارجی شاعری کی کامیاب مثال کے طور پر آپ بھی صرف 'کلکتہ اک رباب' ہی کا نام لے سکتے ہیں۔ حالانکہ اس ضمن میں فسادات پر قاضی سلیم کی نظم۔ عادل منصوری کی "قلم اٹھالئے گئے" اور ویریندر دیپک کی 'کرفیو میں اک رات سڑک پر' کا نام لیا جانا چاہئے تھا۔ یہ نظمیں خارجی موضوعات اور داخلی احساسات کا کامیاب توازن پیش کرتی ہیں۔ شہاب جعفری صاحب کا خط بھی غور طلب ہے۔

مساجد الباقری ——— راولپنڈی

شاخسار کا پیش نظر شمارہ خوبصورت کتابت وطباعت ضخامت اور مواد کے انتخاب کے معاملے میں پچھلے تمام شماروں پر سبقت لے گیا ہے۔ سارے ارباب فکر ونظر کا بھرپور تعاون حاصل ہو گیا ہے جو کہ اس کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہے نقش اول، شعری تنقید کے چند بنیادی مسائل، نقد ونظر، اور بزم شاخسار میں موجود پروفیسر کرامت علی کرامت کی تحریروں سے نہ صرف جدیدیت سے متعلق ان کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت ہوتی ہے بلکہ شاخسار کی پالیسی کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے اگر جذبات سے کام نہ لیا اور رجحانات میں نہ الجھے تو یہ امر یقینی ہے کہ "شاخسار" آہستہ آہستہ جدیدیت کا ایک مخصوص "دبستان" یا "اسکول" بن جائے گا۔ آپ نے جن جن صاحبوں کی تصویریں لگائی ہیں سب ہی کے تو چہرے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں۔ پرویز شاہدی مرحوم حق مغفرت کرے۔ "شاخسار" کے صلاح کار اردو بولتے ہوئے مثلث دل پر نقش ہو گئے ہیں۔

احمد ابراہیم علوی ——— لکھنؤ

کرامت صاحب کا تحریر کردہ "نقش اول" خوب ہے مجھے اس سے کلیتاً اتفاق ہے۔

جدید شاعری اگر محض ایک تجربہ ہے تو ہم اس کے کامیاب

نتائج کا انتظار کر سکتے ہیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ جدید شعراء اس کو
تجربہ ملنے کے لئے تیار نہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جدید شعراء اپنی شاعری سے زیادہ
اپنی بحث سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو اپنی نامقبولیت
کی بنا پر قطعی بے اثر ہوتی ہے۔

جدید شعراء سے کسی کو خدا واسطے کا بیر نہیں پھر
جدید شعراء کیوں باغیانہ طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کو
اپنا لب و لہجہ بدل کر ادبی زبان میں اپنا مقصد سمجھانا چاہیے۔
یہ ضروری نہیں کہ کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہ کوئی معجزہ کر لیں گے۔

شاعری کی روح خلوص، صداقت اور تاثر میں مضمر
ہے لیکن جدید شاعری ان سب سے بیر رکھتی ہے پھر کیسے کام
بنے گا۔ اور کیسے جدید شاعری اس لائق ہو سکے گی کہ ہم صاحبان
علم و فن کے درمیان فخر سے اسے پیش کر سکیں گے۔

جدید شاعری اگر محض روایت سے بغاوت ہے
تو یہ کوئی صحت مند رجحان نہیں، ہر روایت بری نہیں ہوتی۔

میں جدید شاعری کے بارے میں ایک مضمون لکھ چکا ہوں
اس لئے مزید کچھ لکھنا پسند نہیں کرتا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس سلسلے
میں "شاخسار" میں جو بحث چل رہی ہے وہ کافی سلجھی ہوتی ہے
اور خود "شاخسار" کا رویہ مجھے پسند ہے۔ لیکن میں یہ محسوس
کر چکا ہوں کہ جدید شعراء اپنے خیالات دوسروں پر تھوپنے کی
فکر میں اس حد تک منہمک ہیں کہ کسی کی اچھی بری سننے کے لئے
تیار ہی نہیں۔ لہذا بہتر ہے کہ اب ہم اس بحث سے احتراز
کریں۔

شیخ حبیب اللہ ——— کٹک

آپ کے رسالہ میں نقد و نظر کے باب میں ۱۹۶۷ء
کی منتخب شاعری پر تبصرہ پڑھا تو یہ معلوم کر کے انتہائی خوشی ہوئی
کہ آپ دنیا مادیت سے روحانیت کی طرف پھر سے آنے
والی ہے۔

بقول علامہ اقبالؒ

ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست
گرچہ کس در ماتم او زار نیست

باایں ہمہ متعدد مفکر ایسے بھی ہیں کہ خدا یا مذہب یا رو
کو لاطائل نظریہ تصور کرتے ہیں۔ پروفیسر ڈی۔ ل
کہتے ہیں:-

علم بردار ان مذاہب کی طرف سے عقلیت
جماعت پر جو عام الزام لگایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تم
انکار کر کے کمزوروں، غریبوں سے، مصیبت
مظلومین سے اس امید اور اعتقاد کو چھین لینا چاہتے
ایسا قادر مطلق خدا موجود ہے جو ان کی نگرانی کرتا ہے
ان کی دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے اور جو
تکلیفوں کا بدلہ لینے اور ناانصافیوں کو انصا
بدلنے کے لئے تیار و آمادہ رہتا ہے۔ تم یتیموں
بیواؤں کی اس زندہ امید سے محروم کر دینے پر
ہو کہ ایسی طاقت و ہستی موجود ہے جو ایک کا
اور دوسروں کا محافظ بننے کے واسطے آمادہ ہے
باپ اور ماؤں کی۔ بھائیوں اور بہنوں کی
امید کو خاک میں ملا دینا چاہتے ہو کہ وہ اپنے ان عز
سے پھر ملیں گے جن کو موت نے ان سے جدا کر دیا
تم تمام بنی نوع انسان کی اس امید پر پانی پھیر
چاہتے ہو کہ وہ مر کر دوبارہ زندہ ہوں گے۔ اور
ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کیا تمہارے پاس ان مذہبی
عقائد کا جو انسانوں کو مصائب زندگی برداشت
کرنے کی طاقت بخشتے ہیں۔ کوئی نعم البدل موجود

یہ حضرت اس کے بعد ژولیدہ بیانی کے
گفتگو، سائنسی انکشافات اور خطوط و خم
سے تمام عقائد مذہبیہ کا ابطال فرما کر یہ نعم البدل
کرتے ہیں۔

ہمارے واسطے یہ لازم ہے کہ ہم زندگی کو خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو شرافت اور رحم دلی سے اس حد تک مالا مال رکھنے کی کوشش کریں جس حد تک کہ ہم میں اس کی صلاحیت موجود ہے۔ ہماری اولاد کو یہ بات سکھائی جائے کہ کوئی سخت کلمہ یا ناروا سلوک نہ کبھی واپس کیا جا سکتا ہے نہ اس کا کبھی تدارک کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی قربانی اس کا کفارہ ہو سکتی ہے اس لئے اس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہئے۔

نطشے کو بھی یہی جنون سوار تھا۔ اور اقبال نے کہا تھا:۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

بہر کیف آپ نے یہ لکھا ہے .... یہی سبب ہے کہ آئین سٹائین جیسا سائنس داں خدا پہ یقین رکھتا تھا۔ MILNE نے سائنسی علوم پر بحث کرتے ہوئے قادرِ مطلق کی ہستی سے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔

اگر آئین سٹائین کے معتقدات مذہبی پر روشنی ڈالی جائے تو یہ قومی خدمت عالیہ ہوگی P MILNE محاکمات کا بھی خاکہ شاخسار میں پیش کیا جائے۔ یہ دور لامذہبیت ہے اور اس کی سخت ضرورت ہے کہ حق پرستوں کا خصوصاً ان لوگوں کے جو ماہر سائنس ہیں۔ خدا کے متعلق خیالات کی تبلیغ و اشاعت کی جائے۔

اقبال متہاس ـــــــ سیالکوٹ

ادھر پچھلے کئی برسوں سے یہ بات سننے میں آ رہی ہے کہ پاک و ہند میں مجلاتی صحافت کا سہاگ اجڑ چکا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس منفی نقطۂ نظر کی وجہ صرف یہ ہے کہ ادب سے قاری کی وابستگی محض واجبی سی ہے یا پھر اسے قبول کا سا اثر رکھنے والا ادب پڑھنے کو نہیں ملتا تو وہ نئے ادب اور نئے ادب کے نمائندہ ماہناموں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتا ہے۔

شاخسار کا سالنامہ ایسے تمام خدشات کی نفی کرتا ہے۔ اس سالنامہ کے مندرجات کی روشنی میں موجودہ اُردو ادب کی رفتار کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے اور یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ اس رفتار کی روشنی میں اردو ادب کے مستقبل پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

رونق دکنی سیمابی ـــــــ جمشید پور

اس دور ابتلا میں بھی اس قدر ستھرا اور معیاری نمبر نکال کر آپ لوگوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو والے آندھی میں بھی چراغ جلانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ مقالات سبھی اچھے ہیں۔ مگر صاف گوئی اگر بارِ خاطر نہ ہو تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اسلوب بیان کے واضح کرنے کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ ہم غیر ملکی ادبا، شعرا، یا مفکروں کے انگریزی حوالے دے کر اچھے خاصے مضمون کو بوجھل بنا دیں۔ کیا ہمارے ملک میں ایسے مفکروں، دانشوروں، سیاست دانوں، مذہبی پیشواؤں، عظیم صحافیوں کی کمی ہے کہ ہم اوروں بالخصوص غیر ملکی صحافیوں کے دست نگر رہیں۔ کیا آج کے یہ غیر ملکی شعرا، ادبا، اور فصحا بھی ہماری طرح ہمارے بزرگوں کے حوالے دیتے ہیں۔ شاید ایسا نہیں ہے؟

[اگر غیر ملکی ادبا کم مائیگی کے شکار نہیں تو ہم ان کی تقلید کیوں کریں؟ اچھی چیزیں جہاں بھی نظر آئیں ہمیں ان سے استفادہ کرنا چاہئے۔ ادارہ]

آہ پروفیسر پرویز شاہدی یا ایک عظیم شاعر اور ادیب کی بے وقت موت یقیناً برسوں خون رلائے گی۔

"خوابوں کی دنیا" ان کی کامیاب نظم ہے جو سائنسی کارناموں کی حمایت میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ امجد نجمی، حرمت الاکرام، کرامت علی کرامت، قیصر قلندر اور علی عباس امید کی نظمیں پسند آئیں۔

غزلیں بہ نسبت نظموں کے بہت کم ہیں۔ ذیل کے

چند اشعار نے ضرور متاثر کیا ہے۔

پھرتی ہے سر برہنہ صدائے سکوت سنگ

تیشہ ہے دفن دامن کہسار کے قریب

(شہاب جعفری)

تو نے اے غنچۂ افسردہ بڑا کام کیا

کہ انہیں خندۂ پژمردہ دلاں یاد آیا

(وفا ملک پوری)

اف یہ رسم وفا کہ ان کے لئے

زخم کو پھول کہہ گیا ہوں میں

(مہدی پرتاب گڑھی)

افسانوں میں ثریا محمود ندرت کی تخلیق "کسی نے ڈھونڈلی منزل" بڑی پیاری ہے جیسے دھوپ میں شدید پیاس کے وقت روح افزا اور ذائقہ دار شربت۔

اندرجیت — امرتسر

شاخسار کا خاص نمبر باصرہ نواز ہوا۔ واقعی اگر خاص اور عام کی تقطیع کرنا ہو تو شاخسار کا خاص شمارہ لغت کا کام دے سکتا ہے۔ چونکہ میں فطرتاً افسانہ نویس ہوں، اس لئے اس حصے کو زیادہ غور سے پڑھتا ہوں۔ افسانہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ البتہ محترمہ ثریا محمود ندرت نے منزل ڈھونڈنے میں بہت دشوار گذار راہوں کا سہارا لیا ہے۔ شاید غلط خضر راہ سے پالا پڑ گیا ہوگا۔ یوگ راج کی "بلو" اور ماجد الباقری کی "ناگن" قابل داد تخلیقات ہیں اور ان سے سب بڑھ کر جو افسانہ پسند آیا وہ ہے نسیم محمد جان کا "آسمان کا رنگ" اسے حصہ حکایات کا ماحصل افسانہ کہا جائے تو مبالغہ آمیزی نہ ہوگی۔ بہت اچھا لکھتے ہیں یہ صاحب! پہلی بار پڑھا ہے انہیں۔ نازکشی کی پوری غزل مرصع ہے۔ یہ شعر بہت غضب کا ہے

پھول بن جائے گا کچھ رات ڈھلے

درد ابھی صرف کلی ہے یارو

اسلم آزاد — پٹنہ

"شعری تنقید کے چند مسائل" بڑا فکر انگیز اور معلوماتی مضمون ہے۔ رفعت سروش، ناز، مخمور، ہاشمی، حسن فرخ، اختر اورینوی، شہاب جعفری، کفیل آذر اور علیم افسر کی تخلیقات بڑی پیاری ہیں۔ اکثر افسانے بھی پسند آئے۔ بحیثیت مجموعی شاخسار کا پیش نظر شمارہ وقیع اور گرانقدر ہے۔

نازقادری — برہمپورہ

"شاخسار" کا مشترکہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ پرویز شاہدی مرحوم، علی عباس امید، امجد نجمی، کرامت علی کرامت کی نظمیں اور اختر اورینوی، شفقت کاظمی، شہاب جعفری، وفا ملک پوری، نسیم فاروقی اور کفیل آذر کی غزلیں قابل تحسین ہیں۔ ماجد الباقری، پروفیسر زاہدہ جبیں، یوگ راج اور نسیم محمد جان کی کہانیاں کافی پسند آئیں۔ مقالے بھی خوب ہیں۔ "بزم شاخسار" بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

حبیب ہاشمی — فتح پور

حضرت پرویز شاہدی کے سانحۂ ارتحال پر آپ نے جو تعزیتی نوٹ سپرد قلم کیا ہے اختصار کے باوجود اس سے مرحوم کی زندگی کے تمام گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں۔ مرحوم کی اچانک موت سے بلاشبہہ اردو ادب کو جو نقصان عظیم ہوا ہے اس کی تلافی مشکل سے ہو سکے گی۔

یوں تو تمام مقالات ادبیت اور افادیت کے حامل ہیں مگر پروفیسر کرامت علی کرامت نے "شعری تنقید

بنیادی مسائل" پر جس شرح و بسط سے گفتگو کی ہے
وہ خاصے کی چیز ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کا "ژاں پال
سارترے انٹرویو" اور قیصر سرمست کا "مولانا ابو الکلام
آزاد بھی پسند آئے۔

محمد غفار صدیقی کا "فارسی کی صوفیانہ شاعری" جو
صرف تین صفحات پر مشتمل ہے نہایت نامکمل اور تشنہ مضمون
ہے۔ بہتر ہوتا کہ موصوف اس عنوان کے تحت ایک مبسوط
مقالہ تحریر فرماتے جو قارئین کے لئے مفید اور کارآمد ہوتا
حصۂ نظم کافی جاندار ہے۔ امجد نجمی، سید حرمت الاکرام
محمود سعیدی، قیصر قلندر اور حیدر نایاب کی نظمیں
قابل تعریف ہیں۔

علاء الدین حیدر وارثی ـــــ دربھنگہ

افسانوں میں ماجد الباقری، پروفیسر زہرہ جبیں
وگ راج اور نسیم محمد جان کی کوششیں کامیاب ہیں۔

آذر قریشی بھنڈاروی ـــــ ناگپور ۲

شاخسار کا شمارہ ۱-۲ ۱۹۶۸ء موصول ہوا۔
بزم شاخسار' میں محترم طلحہ رضوی برق صاحب اور مکرم صبا
اکرام صاحب کے خطوط پڑھے ـــــ ع

"رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف"

بات لفظ بَرَہنَہ اور بِرَہنَہ سے شروع ہوئی تھی
لیکن برا ہو خوش فہمی اور خود پرستی کا کہ اس کی ہنا بیں لسانی
رنگی نے دوسروں کے وجود بھی برہنہ کر دیئے۔ بات
اندر آگے بڑھی کہ وہ الفاظ بھی اس آندھی میں گھر
گئے جو بالاستثنا بولے اور لکھے جاتے ہیں۔
خِضَر۔ خِضْر۔ بَرَہمَن۔ بِرَہمَن۔ بَرہمَن۔ دُلہن۔ دُولہن
دُلہَن۔ موسِم۔ موسَم۔ کَلِمَہ۔ کَلْمَہ۔ طَرَح۔ طَرْح۔
اور اسی قبیل کے تخیَّل۔ تخیُّل۔ تغیّر۔ تغیُّر۔ تمیز اور
تمیُّز۔ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے الفاظ میں تو کوئی معنوی اختلاف و
تفریق نہیں ہے لیکن ـــــ طَرَح اور طَرْح میں معنوی فرق
ہے اور اسی فرق کی طرف میں نے صبا اکرام صاحب کو
متوجہ کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میرا اندازِ تخاطب کہیں کہیں
سخت ہو گیا تھا جس کا جواب بھی انہوں نے اسی طرح دیا
اور اب رفت و گزشت کے طور پر یہی کہنا پڑے گا کہ

" نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے

لیکن نَظَر کو نَظْر لکھنے اور بولنے کا جواز تو ضابطۂ
جمہور لسانیات میں شاید کہیں نہیں مل سکے گا (اُردو
جمع میں اعراب و سکون کے بدل جانے کی بات بھی عجیب ہے۔
حضور! اردو جمع میں حرکات و سکون کو بدلا جاتا ہے۔
نہ کہ کسی منفرد لفظ کی حرکات و سکون کو ـــــ ضرورتِ
شعری کے تحت شاعر کو اس تصرف کا حق دے دیا جائے
اور یہ اختیارات اسے حاصل ہو جائیں تو زبان اور لسانی
سارے قواعد ستیاناس ہو کر رہ جائیں گے۔ شاعر جب
چاہے گا اور جس لفظ کو چاہے گا۔ طَرَف۔ طَرْف اور نَظَر
نَظْر کی طرح۔ اثر۔ قمر۔ جگر۔ سحر وغیرہ الفاظ کو بھی اپنے
تصرف میں لانے لگا ـــــ اور بات جب آگے بڑھے گی
تو ببانگ دہل یہ بھی کہہ اٹھے گا کہ ـــــ یہ میرا تصرف ہے
ـــــ میں اسے جائز سمجھتا ہوں ـــــ میں اس قید و بند
کا قائل نہیں ہوں وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ آج کے بعض شعراء
کا وطیرہ ہے۔ اور اب تو صبا اکرام صاحب نے اپنے
مکتوب گرامی کی اختتامی سطور میں اس آزادی کا اعلان
بھی دیا ہے کہ

اس طرح کے اعراب کی تبدیلیاں طرفہ صاحب
کو ناپسند ہیں تو ہوا کریں، مگر آج کا کوئی بھی جدید شاعر ان
معمولی تبدیلی اعراب کے الزام سے بچنے کے لئے کوئی اعلیٰ
مضمون قلم بند کرنے سے ہرگز باز نہیں آئے گا۔ چاہے

اسی کی وجہ سے عالم لسانیات میں غدر مچ جائے یا قیامت اٹھ پڑے۔"

"ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

ٹھیک ہے صاحب! ——"جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے" —— ہم قدامت پرست، لکیر کے فقیر، اصول و قواعد کے بندے اور ضابطے کے غلام تو آخر تک یہی کہیں گے کہ ضرورت شعری کے تحت غیر مستثنیٰ الفاظ کی حرکات و سکون کو بدل دینا ذہنی اور فکری شکست ہے۔

اب لفظ خُود کے قافیہ کے ساتھ بَد۔ کے قافیہ کا استعمال تو یہ فارسی شعرا کے یہاں جائز ہوگا۔ اردو قواعدِ شاعری میں اس آزادی کی کہیں گنجائش نہیں ہے۔ یہ آزادی ایطائے جلی کا عیب اور تقلیدِ غلط روی کا سبب بن جائے گی —۵

"چھوڑے نہ خلق کو مجھے کافر کہے بغیر" (غالب)

مرزا غالب نے پر اور گھر۔ کے قوافی میں۔ کافر۔ کا قافیہ غلط استعمال نہیں کیا ہے —"کافر کہنا —" اردو کا ایک فصیح محاورہ ہے۔ جو کسی زیادتی یا انتہائی پیار اور محبت کے جذبے میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً —— بڑا ظالم ہے —— بڑا کافر ہے —— غالب کے شعر میں "کافر" کفر کا فاعل نہیں ہے۔ یہ قافیہ کلیتاً مثال نہیں بن سکتا۔ کافر بکسر فا عربی ہے لیکن اُردو میں بقیدِ محاورہ بہ فتح ہی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس قافیہ کو مثال بنا کر ہمارے جدید شعرا ضرورت شعری کے تحت۔ ماہر۔ ساحر۔ ظاہر اور شاعر وغیرہ کو بھی پر اور گھر کے قوافی بنا بیٹھیں۔

طَرَف اور ظَرف کا قضیہ بھی نَظَر اور نَظْر کی نوعیت کا ہے۔ میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی سحر البیان میں ایسے تصرفات کئے ہیں جنہیں ان کے اپنے مختارات کہنا چاہئے۔ یہی وجہ تو ہے کہ مثنوی سحر البیان کا پایہ بہ لحاظ زبان و فن مثنوی گلزار نسیم سے بہ[تر] نہ ہو سکا۔ گو مقبولیت سحر البیان ہی کو ہے سلیس تر بحر، سلاست اور اچھوتے کردار کی وجہ سے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے دور میں ایسے تصرفات جائز سمجھے جاتے ہوں —— اب زبان بہت صاف ہو چکی ہے اور اصول و قواعد مسلّم ہو گئے ہیں۔

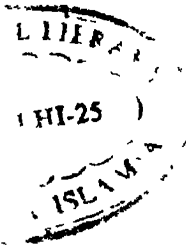
اساتذہ اور اکابرین علم و ادب کی فروگزاشت یا ان کے اپنے نجی تصرفات و مختارات پر حرف گیر ہونا میرا شیوہ نہیں ہے۔ بشریت سب کے ساتھ ہے جیسا کہ طلحہ رضوی برق صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں لکھ دیا ہے کہ:-

"ممکن ہے کہ اسی (طَرَف اور ظَرف) اصول کے تحت اور ایسی ہی مثالوں کے پیش نظر ضیا اکرام صاحب کو نَظَر و نَظْر میں بھی مغالطہ ہوا ہو —— یہ فطرت بشری ہے —— اور ہم سب ہی بشر ہیں۔"

لیجئے بات ختم ہو گئی اور ختم ہو جانی چاہئے۔ محبی حق مچھر پوری کے مکتوب کی روشنی میں عرض ہے کہ —— دُلہَن —— دُولَھن یا دُلْہن ازروئے لغت صحیح ہیں۔ مگر دُلہَن بروزن چمن زیادہ فصیح اور معتبر ہے۔

[ہمارے نزدیک طَرَح اور طَرْح دونوں بمعنی "مانند" جائز ہیں۔ ورنہ طرفہ قریشی صاحب کی کسی اور بات سے ہمیں اختلاف نہیں بہرکیف اس سلسلے کو یہیں ختم کیا جاتا ہے ادارہ]






AKBARI





محمد علوی



اطہر عزیز



غلام مرتضیٰ راہی اور مظفر حنفی

اردو زبان کا منفرد علمی اور ادبی جریدہ

چوتھی جلد

دو ماہی شاخسار کٹک

شمارہ ۴-۵

— مدیر اعلیٰ —

امجد نجمی

— ترتیب و تزئین —

کرامت علی کرامت — حیدر نایاب

— صلاح کار —

حرمت الاکرام — محمد انوار

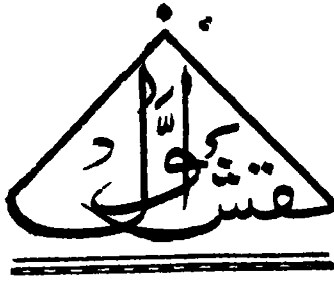
مظہر امام — احمد حسین آزاد

اس جلد کی قیمت	سال بھر کی قیمت
ایک روپیہ ۵۰ پیسے	۳ روپے

پتے

(۱) "مدیر شاخسار" بخشی بازار، کٹک ۱
(۲) رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک ۱

امجد نجمی مدیر، مالک و ناشر نے "لیبل لیتھو پریس" رمنہ روڈ، پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر "شاخسار" بخشی بازار، کٹک ۱ سے شائع کیا



کہا جاتا ہے کہ آئنسٹائن اگر سائنس میں نظریۂ اضافیات کی ایجاد نہ کرتا تو کوئی اور صاحب نظر یہ کام انجام دے دیتا۔ یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں ایک بڑی حد تک صداقت کا پہلو موجود ہے۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جس پر انسان کا ذہن اپنے ماحول کے زیر اثر ایک خاص قسم کے ردعمل کے لئے تیار رہتا ہے اور ایسے ہی وقت میں مخصوص قسم کے ذہنی رجحان کا ارتقاء و عروج ممکن ہے۔ مثال کے طور پر جب روس نے پہلی بار خلا میں راکٹ چھوڑا، تو اس کے چند دنوں کے بعد امریکہ بھی اس میں کامیاب ہو گیا۔ حالانکہ روس اور امریکہ میں اس سلسلے کی جو تحقیقات ہوتی ہیں، وہ صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہیں اور ایک ملک کو دوسرے ملک کے طریقۂ کار کا علم نہیں ہوتا۔ غرض کہ کسی خاص قسم کے ذہنی رجحان کے لئے جب ماحول سازگار ہو جاتا ہے تو عموماً کوئی بھی صاحب نظر آگے بڑھ کر اس رجحان کو نقطۂ عروج تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ سائنس اور تہذیب کی تاریخ میں جو بات ممکن ہے، کوئی سبب نہیں کہ تاریخ ادب میں وہ بات ممکن نہ ہو۔ لہٰذا ہمارے ادب میں جدیدیت کا رجحان اگر مغربی ادب کے ذریعہ نہ پہنچتا تو بھی خود ہمارے اندر ایسے ادیب پیدا ہو جاتے، جو اس نوعیت کے رجحان کی پرورش کرتے کیونکہ خود ہمارے ملک میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں جو نئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، وہ کلاسیکل ادب کے مسلمہ اصول کی عمارت کو مسمار کرنے کے لئے کافی تھیں۔ جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "جدیدیت" کے تحت غیر ممالک کے ادب کے علاوہ خود ہمارے ملک کی مختلف علاقائی زبانوں میں بھی ادب عالیہ کی تخلیق ہوئی ہے، تو اردو ادب میں جدیدیت کے امکانات سے مایوسی کا کوئی معقول سبب نظر نہیں آتا۔ لیکن ہمارے ادب کا سب سے بڑا المیہ خود ہمارے جدید شعراء و ادباء کی تقلیدی ذہنیت کا ہے۔ جس کی طرف اشارہ کر کے نیاز فتحپوری نے کہا تھا کہ "جب ہم اُردو کی جدید شاعری کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہم کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ اس چمن میں گُل بوٹے تو کم پائے جاتے ہیں لیکن سبزۂ بیگانہ زیادہ" اکثر جدید نقادوں کا حال یہ ہے کہ ان کا ادبی نظریہ سراسر مغربی تنقید سے مستعار ہے۔ حالانکہ مشرقی ادب خصوصاً سنسکرت کے ادب سے بھی انہیں بہت کچھ مل سکتا تھا۔ اس طرح مشرق اور مغرب دونوں پر گہری نظر رکھ کر کھلے ذہن کے ساتھ غور کرنے پر ان کے اندازِ فکر میں انفرادیت پیدا ہو سکتی تھی

نئے شعراء نے غالباً اب تک غور نہیں کیا کہ نئی شاعری کی شکل میں جس نوعیت کی چیزیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ ان کا ترجمہ اگر ہم بین الاقوامی ادب کے سامنے پیش کریں، تو اس ترجمے کا معتدبہ حصہ بیرونی ممالک کی بیشمار تخلیقات کے درمیان دب کر رہ جائے گا۔ کیونکہ ان تخلیقات میں ہماری تہذیب و ثقافت کا عکس واضح طور پر نظر نہیں آتا۔ زمانۂ قدیم سے اب تک ہندوستان میں منفرد ذہن و شعور رکھنے والے متعدد ادیب پیدا ہوئے ہیں۔ کالی داس، بیدل، نظیر اکبرآبادی، غالب، اقبال اور ٹیگور،

...ں اعتبار سے اپنے اپنے دور کے منفرد شاعر تھے کہ ان لوگوں نے اپنے اپنے زمانے میں جس طرح کی شاعری کی اس طرح کی
...عری اس زمانے میں دنیا کے کسی بھی گوشے میں نظر نہیں آتی ۔ جس ملک کی روایت اتنی شاندار ہو، وہاں کے جدید شعراء
...کی ایسی چیزیں کیوں نہیں پیش کر سکیں گے ۔ جنھیں بین الاقوامی ادب میں فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے ؟ ضرورت اس
...ں کی ہے کہ مایوسی ، بے بسی اور تنہائی " کو فلسفے کا درجہ نہ دے کر موجودہ حیات کے لامتناہی پہلو کا غائر مطالعہ
...یا جائے ، سائنس کے محض تخریبی پہلو کو سامنے نہ رکھ کر اس کے تعمیری پہلو کو بھی مد نظر رکھا جائے اور اپنے فن کی بنیاد
...پنی تہذیب و ثقافت کی شاندار روایت پہ قائم کی جائے ۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ کسی ملک کی اپنی
تہذیب و روایت سے وابستہ ادب کو آج بین الاقوامی ادب میں اہمیت نہیں دی جاتی ۔ اس سال جاپان کے
...اول نگار " یاسوناری کاوابتا (Yasunari Kawabata) " کو اسی لئے نوبل پرائز کے قابل تصور کیا گیا کہ اس کی
تحریریں جاپانی ذہن کی روح کی عکاسی کرتی ہیں ۔ اس لئے ہمارے جدید ادب میں بھی ہندوستانی مزاج جو بنیادی طور
...ر صلح کوشی و امن پسندی سے مرکب ہے ۔ اس کی صحیح ترجمانی ہونی چاہیئے ۔

ادھر اردو ادب میں علامتی افسانوں پر کچھ کامیاب تجربے ہوئے ہیں ۔ علامت اور پیکر کا استعمال حالانکہ جدید شاعری
کی راہوں سے افسانے میں آیا ہے ۔ لیکن اگر غور کیا جائے ، تو زمانۂ قدیم سے مختلف مذاہب میں ان اشیاء کا سراغ
...سی نہ کسی شکل میں مل جاتا ہے ۔ جنت اور دوزخ کا تصور انسان کی نیکی اور بدی کی علامت نہیں تو اور کیا ہے ؟ پیکری
...شاعری میں جس طرح ذہنی پیکر کی مدد سے قاری شاعر کے ماورائی تجربات تک پہنچتا ہے ۔ اسی طرح ہندوازم میں مجازی
...پیکروں کو ذہن نشین کر کے قادر مطلق کے تصور تک پہنچ جاتا ہے ۔ جدیدیت میں " مکعبیت " کا تصور بیسویں صدی کی پیداوار
ہے ۔ لیکن اس کے کئی ہزار سال قبل سے " جگن ناتھ " کی تعمیر میں مکعبیت کا آرٹ نظر آتا ہے ۔ غرض کہ جدیدیت کے یہ تمام
...رجحانات زمانۂ قدیم سے کسی نہ کسی شکل میں مختلف مذاہب کی گود میں پرورش پاتے رہے ہیں ۔ جس طرح ہر مذہب کا مقصد
ہوتا ہے ' روحانی نجات ' اسی طرح ہر ادب کا مقصد ہوتا ہے " تاثر آفرینی اور جمالیاتی نشاط ۔ اس لئے اگر علامتوں میں تاثر آفرینی
نہیں ہے ، تو ان کا استعمال بیکار ہے ۔ علامتوں کے استعمال کے بغیر بھی تخلیق میں تاثر پیدا ہو سکتا ہے اور علامتوں کے استعمال
کے باوجود تاثر آفرینی اور جمالیاتی سرخوشی کے فقدان کے سبب تخلیق ناکامیاب ہو سکتی ہے ۔ لہٰذا علامت کو بہشت سے
...اترا ہوا " من و سلویٰ " تصور نہ کرنا چاہیئے ۔ شاعری میں علامتوں کا مقصد تحت الشعور کے بعض تجربات کو باہر نکال لانا ہوتا ہے ۔
...لیکن ان تجربات کو باہر نکال لانے کے بعد ان کی حیثیت وہی ہوتی ہے ، جو کسی خارجی شئے کی ہو سکتی ہے ۔ اس سے زیادہ کچھ
نہیں ۔ لہٰذا علامتی افسانوں میں اگر علامت کا مقصد محض تحت الشعور کے تجربات کو ابھار لانا ہو تو اسے کوئی بڑا کارنامہ نہیں
...کہا جا سکتا ۔ البتہ اگر ان علامتوں میں " جذبات " کی روح پھونک کر جان ڈال دی جائے ۔ جس سے یہ علامتیں ہماری ہی طرح چلتی
پھرتی اور جیتی جاگتی اشیاء معلوم ہوں ، تو ان علامتی افسانوں کو یقیناً کامیاب تخلیق کا لقب عطا کیا جائے گا ؛

کرامت علی کرامت

رام لعل

لمحوں کی آزادی

خودکلامی کو میں 'لمحوں کی آزادی' کا نام دے رہا ہوں کیونکہ اُس وقت آدمی اپنے آس پاس سے بے نیاز ہو کر صرف لمحوں کا تابع ہوتا ہے، لمحوں کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ خود کو گالی بھی دے بیٹھتا ہے۔ خودکلامی اور ڈائری لکھنے میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ڈائری لکھتے وقت بھی وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس کا مکمل وجود بے لباس ہوتا ہے۔ بے لباسی اور عریانی میں ایک خاصا فرق ہے۔ عریانی ایک خاص مفہوم کے ساتھ مستعمل ہے۔ عریانی اور فحاشی! یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں! ذہن کو صدیوں پرانے مباحثے کے لئے تیار کرنے لگ جاتے ہیں۔ بے لباسی میرے ذہن میں ایک خاص مفہوم کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ میں اسے ڈائری لکھتے وقت ہی محسوس کر سکتا ہوں۔ جب میں بے ربط اور مبہم جملوں کا سہارا لیتا ہوں! جب میں خود کو سمجھانے کے لئے لکھتا ہوں! بار بار یاد دلانے کے لئے لکھتا ہوں! جب میرے آس پاس کوئی نہیں ہوتا! صرف میں ہی خود کے قریب ہوتا ہوں۔ اور بے لباس ہوتا ہوں اور آزاد لمحوں کی مکمل گرفت میں ہوتا ہوں لیکن وہ لمحے مجھے کسی قسم کی قید کا احساس کرائے بغیر میرے اندر کے آدمی کا اظہار بن جاتے ہیں۔

آج اپنے ساتھیوں کے سامنے میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے وہ خوش نہیں ہوئے ہوں۔ بعض بزرگ ادیب تو بے حد خفا ہو جائیں گے۔ لیکن میں اپنے اختلاف کو دبا کر نہیں رکھ سکا۔ میرا مقصد کسی کو آزار پہنچانا بھی ہرگز نہیں تھا۔ بس اپنے محدود فکر کا اظہار ہی مطلوب تھا۔ میرے بعض ساتھی چاہتے ہیں۔ ہم لوگوں میں سے کوئی بھی دہلی نہ جائے۔ ہم دہلی کیوں نہ جائیں۔ ہم لوگ وہاں جا کر سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ پوری آزادی سے کہہ سکتے ہیں۔ وہاں ہمیں بہت سے ہم خیال مل جائیں جن کی تعداد پرانے لوگوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔ لیکن یہ لوگ بائیکاٹ کو ہی موثر اقدام سمجھتے ہیں! لیکن وہ غلطی پر ہیں!

کہاں او بھی شیکر کرے
شونار کرن کلش بھرے
اوشا کہاں آشیش مانگے
ہولو آندھار پار!

کس کی تاجپوشی کے لئے سونے کی کرنیں کلس کو بھر رہی ہیں؟
اوشا کس کا آشیرواد مانگ کر اندھیرے کو پار کر کے آئی ہے؟
— کبھی کبھی اپنے بنگالی دوست مزمدار کے پاس جا کر

میں ٹیگور اور دوسرے بنگالی کویوں کے گیت سنتا ہوں ۔
کی آواز اچھی نہیں ہے ۔ سرسوتی سے وردان کیوں نہیں
گت؟ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے بھی وہ یونہی سا
لیکن جب گیت سناتا ہے تو اس کی غیر دلچسپ شخصیت
پرکشش ہو جاتی ہے ۔

اے دن آجی کار گھرے گو
کھلے دیو دوار
آجی پراتے سورج وادھا سپھل ہولو کار

دن آج کس کے گھر کا دوار کھول دیا ! آج صبح
سورج کا جاگنا کس کے لئے سپھل ہوا ؟

ایکس کو میں سیاسی سوجھ بوجھ کے معاملات میں خاصا
تھیوری کہا کرتا ہوں ۔ وہ آج کل ایک عجیب سے بزنس
میں مصروف ہے ۔ شاید وہ فوری طور پر بہت سا روپیہ
کمانا چاہتا ہے ۔ روپیہ کمانے کے لئے آدمی کتنا بے رحم
جاتا ہے ! کس قدر بے ہمدرد ! آج اس نے مجھے ایک
بار میں بیٹھنے کے لئے انوائیٹ کیا ۔ اس کے ساتھ اس کے
دو فیلڈ آفیسر بھی تھے جو شکل وصورت اور باتوں سے
سٹریٹ' معلوم ہوئے ۔ ان کی ساری گفتگو پبلک
سے زیادہ سے زیادہ روپیہ اینٹھنے کے موضوع تک ہی
محدود رہی ۔ دونوں میری پلیٹ میں سے مچھلی کے قتلے کانٹے میں
پھنسا پھنسا کر اپنے پاس کے سامنے رکھتے رہے ۔ شاید
نشے کے عالم میں ہی انہوں نے یہ حرکت کی ہو ! لیکن ایکس
بے خبر کیوں بیٹھا تھا ؟ آج اس نے نہ گزشتہ [illegible]
[illegible] ذرے تنگ پر ۔ اچانک موڈ میں آ کر
کہنے لگا ——کوئی مجرم ہی دنیا کا بہترین انسان ہو سکتا ہے
کیا اس نے جرم کو ایک راست فعل ثابت کرنے کی کوشش
کی ؟ شاید اسے اس کا احساس جرم پریشان رکھتا
ہے جس سے وہ کسی نہ کسی دلیل سے نجات حاصل کرنا
چاہتا ہے ۔ اس نے کہا —— جو قتل کرتا ہے وہی زندگی کی صحیح
قدر و قیمت بھی جان سکتا ہے ۔ مجھے یقین ہے اس نے ابھی تک
کوئی قتل نہیں کیا ہے لیکن شاید وہ ایسا کر سکتا ہے ۔
وہ دراصل کسی امکانی قتل سے پیش از وقت ہی خوفزدہ ہے
یا ممکن ہے کہ وہ اپنے فیلڈ آفیسرز سے ہی خوف کھانے
لگا ہو ۔ ان کے سامنے اس قسم کی باتیں کہہ کر انہیں کسی امکانی
اقدامات سے باز رکھنا چاہتا ہو ۔

وقار عظیم کی کتاب ' داستان سے افسانے تک'
کو پھر شیلف سے اٹھا لایا ہوں "بعض دفعہ کئی مصنفوں نے
ایک ہی قصے کو لے کر داستان لکھی مثلاً الف لیلیٰ'
طوطا مینا، حاتم طائی وغیرہ کے قصے ۔ لوگ بھی ایک ہی
قصے کو بار بار سننا پسند کرتے تھے "—— ایسے لوگ
آج بھی موجود ہیں جو ایک ہی پلاٹ کے ناولوں و افسانوں کو
بار بار پڑھ کر بھی بور نہیں ہوتے ۔ ہماری فلمیں بھی سالہا سال
سے اسی قسم کے رجحان کو پیش کر رہی ہیں ۔ لیکن سینما ہال پھر بھی
بھرے رہتے ہیں ۔ لوگوں کی بیشتر تعداد اس بات میں
بڑی مسرت محسوس کرتی ہے کہ وہ کہانی کی ساری
دلچسپ ڈیولپمنٹس (Developements) کا اندازہ
خود ہی کر لیتے ہیں ۔ ان کی اس کمزوری کو ہمارے بعض لکھنے
والوں نے خوب خوب ایکسپلائٹ کیا ہے ایسے قلم کار
کوئی تخلیقی ذہن نہیں رکھتے ۔ کاوش سے جی چراتے ہیں ! ایک
ہی پلاٹ پر ذرا سے ہیر پھیر کے ساتھ سو سو ناول لکھ چکے ہیں
اور وہ پوری طرح مطمئن بھی ہیں ، کیوں نہ ہوں ؟ ان سے
پبلشر بھی خوش اور قارئین بھی خوش ! کیا ایسے ناول اردو
ادب کا حصہ بن سکیں گے ؟ ہمیں اچھی طرح پورا احساس
ہے کہ پڑھنے والوں کی بڑی تعداد ہمارے ساتھ نہیں ہے
ان قلم کاروں کے ساتھ ہے جو حقائق کی دنیا سے دور
رہ کر لکھتے ہیں محض دلچسپی کے نقطۂ نظر سے لکھتے ہیں رومان

وقت گفتگو۔ باہر سے کچھ لوگ بھی آ گئے ہیں مشاعرے کے سلسلے میں سیمنار کی خبر سن کر یہاں بھی چلے آئے ہیں۔ پنڈت آنند نرائن ملّا، جگن ناتھ آزاد!

میں نے اپنا طویل مقالہ دوسرے دن شام کو سب سے آخر میں پڑھا تھا۔ اگرچہ بہت تھک چکا تھا۔ لوگ بھی تھکے ہوئے تھے۔ سرور صاحب کا اصرار تھا کہ افسانوں پر سارے مقالات سن لیے جائیں۔ دوسرے دن صبح ناول پر سیشن ہے اس سے پہلے ان مقالات پر بحث کر لیں گے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا ہوں۔ اردو معلّے میں دو مرتبہ کہانی سنا چکا ہوں۔ سیمپوزیم کے سلسلے میں میرا یہ پہلا تجربہ ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میرا مقالہ کامیاب رہے گا کیونکہ خود کو میں نے کبھی نقاد نہیں سمجھا ایک پریکٹس کرنے والا ورکنگ رائٹر ہی کہا ہے۔ مقالہ پڑھنے سے پہلے بھی یہی کہا لیکن مقالہ سن لینے کے بعد بہت سے لوگوں نے مجھے مبارک باد دی۔ کئی لوگوں نے ہاتھ ملائے۔ سرور صاحب، ملا صاحب، زاہدہ زیدی، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد حسن اور قمر رئیس کی مبارکبادیں ابھی تک یاد آ رہی ہیں مجھے یقین نہیں آتا!! محمد حسن کا کہنا ہے۔ تم نے افسانے کے سارے ہی پہلوؤں پر بحث کر لی ہے۔ اب میں نئی بات کونسی کہوں گا؟ مجھے کل کی تقریر کے لئے رات کو نئے سرے سے سوچنا پڑے گا۔

سیمنار ختم ہو گیا ہے بہت سی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں۔

"جدیدیت کی تلاش کو میں آدمی کا وقار سمجھتا ہوں"۔

"سیمنار کا مقصد جدیدیت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا نہیں تھا۔ ذہنوں کو سوچنے کے لئے بس تیار کرنا ہی تھا!"

"جدیدیت کوئی تحریک نہیں محض ایک رجحان ہے۔ جو ترقی پسند تحریک کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوا ہے"۔

"جدیدیت اینٹی پروگریسو نہیں ہے"۔

"جدیدیت کے پیچھے سی آئی اے کا ہاتھ ہے"۔

"ہم اپنے دماغوں کی کھڑکیاں ہر طرف سے کھلی رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ مشرق و مغرب دونوں کے خیالات سے مستفید ہو سکیں۔"

"اس وقت تو صرف مغرب کی ہی کھڑکیاں کھلی رہ گئی ہیں۔"

"کیونکہ اس وقت ہوا صرف مغرب کی طرف سے ہی آ رہی ہے۔"

قہقہے! قہقہے!

ہم سب گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے ہیں رات کا کھانا کھانے سے پہلے کچھ اور گپ شپ کر لینا چاہتے ہیں اپنے اپنے کمرے سے نکل کر شمس الرحمٰن فاروقی کے کمرے میں جمع ہو گئے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، وحید اختر، وارث کرمانی، قاضی عبدالستار، براج کومل، ہرچرن چاولہ، فاروقی اور میں، محمد حسن، قمر رئیس اور گوپی چند نارنگ، خورشید الاسلام سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اس سیمنار میں نہیں آئے وہی سب سے زیادہ زیر بحث رہے ہیں۔ ان کی کمی فزیکل طور پر یقیناً محسوس ہوئی۔ لیکن ذہنی طور پر وہ پوری طرح ہمارے ساتھ رہے ہیں:۔

اس وقت اردو ادب ڈسکس نہیں ہو رہا ہے چرکیں اور اسی قبیل کے دوسرے شعراء کا کلام سنا جا رہا ہے اموشنز (EMOTIONS) ریلیز ہو رہی ہیں۔ ہر شخص خود کو بے حد لائیٹ محسوس کر رہا ہے۔ ہم نے کھانا بھی اسی کمرے میں منگا لیا ہے۔ ایک دسترخوان بچھا لیا ہے اس کے سب نے اپنی اپنی نظمیں سنائی ہیں۔ ایک عجیب سی کیفیت میں "براج کومل، میں نے تمہیں اتنا پسند پہلے کبھی نہیں کیا تھا جتنا اس وقت کر رہا ہوں۔ ایک نظم اور سناؤ!"

میں نے تجویز پیش کی "اب ہم سے افسانے بھی سنئے
جناب!" یہ سن کر سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعض کو
مشاعرہ میں شرکت کرنا یاد آگیا ہے۔ بعض کے دل میں
سردار جعفری سے ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی ہے! وہ مشاعرے
میں میں گئے۔

سردار جعفری کو گھیر گھار کر اپنے کمرے میں لے آئے
ہیں۔ ہمارا سامان بندھا پڑا ہے۔ سب لوگ اِدھر اُدھر کہیں
کہیں بیٹھ گئے ہیں۔ سردار، قمر رئیس، بلراج کومل، قاضی
عبدالستار، چاولہ اور میں۔ سردار جعفری پوچھ رہے ہیں
جب ہم لوگ جوان تھے تو اپنے نمائندہ نئے شاعر کے طور پر
فیض اور مجاز کا نام پیش کیا کرتے تھے۔ آپ لوگوں کے
پاس ایسے کون کون سے نام ہیں؟

پھر وہ خود ہی جواب دینے لگتے ہیں "خلیل الرحمٰن اعظمی
نیا نہیں ہے۔ وزیر آغا نیا نہیں، عمیق حنفی تو گزشتہ
بیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔

سردار جعفری کے سامنے کسی کا جمنا مشکل ہو رہا ہے
بیس سال سے شعر کہنے والا بھی تو نیا ہو سکتا ہے۔ نئے سے
دبیس سال کی عمر ہرگز نہیں ہے کوئی کوئی بیس سال کا
ادیب بھی بوڑھا ہو سکتا ہے۔ مغرب میں پچاس سال کی عمر سے
زیادہ کے بھی بعض ادیب ابھی تک نئے ہیں۔ نیا ہونے کا تعلق
ذہن سے ہے۔ سوچنے کے طریقے سے ہے۔ لب و لہجہ اور
اظہار سے ہے۔!

سردار کے سامنے میں نے کم سے کم دو لیکچررز کو گھٹنے
ٹیکتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ یہ دونوں بھی خود کو نیا ہی کہتے ہیں
نئی ذہنیت کے اعتبار سے سردار کے سامنے جیسے سکڑ کر
رہ گئے۔ اردو ادب کی بدقسمتی ہی کہوں گا اسے! اس
عہد کی گریٹ ٹریجڈی!!

لمحوں کی دہلیز ـــــ شدید بوریڈم کے لمحات اچانک
ایک غیر معمولی خوشی سے ہمکنار ہو گئے COUNTER-BALA-
NCED) ہو گئے۔ لیکن اسے اپنے جذبات کی تبدیلی کے پیچھے
اس تحریک کا قطعًا احساس نہ ہو سکا جو دراصل ایک
انجانے فریب کا نتیجہ تھی (افسانے کی تھیم)

کیٹو نے اپنے گھر سے دور رہ کر تعلیم پائی ہے ایک
دوسرے بہت بڑے شہر میں۔ اس کی زندگی میں اپنے
ماں باپ اور گھر سے کہیں زیادہ اب اس کے دوستوں کی
ہی اہمیت ہے جب وہ چھٹیوں میں گھر آتی ہے تو
وہاں اسے اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ اسے
اپنی ماں سے بے حد چڑ ہے جو اکثر و بیشتر اسے نصیحتیں ہی
کرتی رہتی ہے۔ لڑکوں سے دور رہنے کی تلقین کیا کرتی
ہے۔ (خود رات کے اندھیرے میں اپنی چارپائی سے
اٹھ کر اس کے باپ کی چارپائی پر چلی جاتی ہے!) اسے
جلد از جلد تعلیم پوری کر کے شادی کر لینے کے لئے کہا کرتی
ہے (تیری عمر کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بن چکی ہیں)
کیٹو کو ماں سے کہیں زیادہ اپنا باپ اچھا لگتا ہے کیونکہ
اکثر وہ اس کی حمایت ہی کرتا ہے۔

کیٹو لڑکوں کو فلرٹ کرنے میں زیادہ خوشی محسوس
کرتی ہے۔ ایک لڑکے سے سول میرج بھی کر لیتی ہے
لیکن وہ لڑکا اس کی زندگی کو نہ سکون دے سکتا ہے نہ ہی
حفاظت کا احساس۔ مکان کا کرایہ تک ادا نہیں کر سکتا
اس کی پسند کے کپڑے نہیں خرید سکتا۔ وہ خود بھی اس
اچانک محبت اور شادی کی وجہ سے اپنے کیریئر کو ختم
ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ دونوں اکثر لڑتے رہتے
ہیں۔ اور ایک دوسرے پر غراتے ہیں۔ لیکن رات کو
ایک دوسرے سے لپٹ کر سو بھی جاتے ہیں۔ دو سال کے
بعد بالآخر الگ ہو جاتے ہیں۔ کیٹو کی گود میں ایک چھوٹی سی

لڑکی ہے جسے لئے ہوئے وہ اپنے گھر آجاتی ہے۔ اسکا باپ مرچکا ہے۔ اس کی ماں زندہ ہے۔ وہ اسے کچھ نہیں کہتی۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ ایک عجیب سی خاموشی سے وہ ساتھ رہنے لگتی ہیں۔

IF WE WERE ALL SUDDENLY

"SOMEB-DY EES" — جیمز جوائس

ایک ایسی نسل آنے والی ہے۔ جو اپنے سے نسبتاً برتر آسودہ، برسراقتدار لوگوں سے آنکھیں ملا کر بات کرسکے گی وہ کسی کی دھونس کو برداشت نہیں کرے گی۔ کسی کی زبان سے گالی یا بدکلامی سن کر فوراً اس کے منہ پر تھپیڑ دے مارے گی یہ کیفیت ان دیہاتی لڑکوں کے چہروں پر لکھی ہوئی ملتی ہے جن کے آباؤ اجداد انگریز اور دوسرے حاکموں کو آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوجاتے تھے۔ ان کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ آجکل گاؤں کے لڑکے شہروں میں کلرک، بس ڈرائیور، یا کنڈکٹر بن کر چلے آتے ہیں۔ ان کا شہر کے لوگوں اور افسروں کے ساتھ ٹھیک طرح سے نباہ نہیں ہوپاتا۔ وہ ہمیشہ ایک CONFLICT میں مبتلا رہتے ہیں۔ شہر کے آداب سے انہیں چڑ سی محسوس ہوتی ہے۔ خالی وقت میں جب بھی اکٹھے ہوتے ہیں شہریوں کے اخلاق و آداب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ 'تشریف لائیے — آداب عرض' — 'آپ کو زحمت تو نہیں ہوئی' وغیرہ جملوں کو ایک خاص طنز کے ساتھ دہراتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں۔ کبھی کبھی بس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ مسافروں کو ٹھوکر لگاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

گاؤں کی تلاش میں تہذیب کی ہلکی سی جھلک سے بھی چھپ جانے کی آرزو دراصل آدمی کی حیوانی کی طرف مراجعت ہے

کوٹھیوں بنگلوں کے اندر پیڑ، پودے، بیلیں وغیرہ اگانا، پکنک کے پروگرام، جنگلوں میں جاجا کر منانا، آزادی سے ناچنا، ایسے رسٹورانوں کا پتہ لگانا جو اندر سے جنگل گپھاؤں کا سا سماں پیش کرتے ہوں، آرام دہ (کشن دار) صوفوں کی بجائے کھردرے بانسوں و بیدوں کی بنی کرسیاں مہیا کرتے ہوں — یہ سب جنگل کی طرف لوٹ جانے کی خواہش کا ایک لاشعوری اظہار ہے۔ شہر میں آدمی جلدی بوڑھا ہوجاتا ہے۔ تہذیب سے دور رہ کر آدمی بہت دیر تک جوان رہ سکتا ہے!

بیس برس کی عمر کے آس پاس آدمی کے اندر مرجانے کی خواہش بے حد شدید ہوتی ہے۔

—— ورڈز ورتھ

میرے اندر ایک دوسرا آدمی بھی رہتا ہے جو مجھ سے ہمیشہ خفا رہتا ہے۔

تھامس براؤنز

وہ سب — ننگے بدن (صرف لنگوٹ پہنے) ہاتھوں میں چمکتے ہوئے تیز نیزے اٹھائے کھڑے تھے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوبے ہوئے۔ میں کتنی دیر تک ان کی طرف گہری نظر سے دیکھتا رہا۔ شاید یہی وہ لوگ ہیں جن کی تلاش میں اپنے بچپن سے کرتا پھر رہا ہوں میں نے پیدا ہوتے ہی رونا شروع کردیا تھا۔ شاید پچھلے جنم میں انہی لوگوں سے بچھڑ گیا تھا! مجھے اب سب کچھ یاد آنے لگا ہے۔ یہی تھے وہ لوگ! یہی تھے وہ لوگ! میں انہیں پہچان رہا ہوں۔ میں ابھی ان کے نام بھی بتادوں گا۔ مجھے کچھ وقت دیجئے۔ میں ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ اب ان سے الگ نہیں رہوں گا!

انہوں نے مجھے جنگل کے اس کنارے پر لا کھڑا کیا۔ ہزاروں میلوں تک وہ مجھے کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے۔ ایک ریلوے لائن دھرتی کی چھاتی کے ساتھ جونک کی طرح چپکی ہوئی خون چوس رہی تھی۔ میں وہاں گھٹنوں کے بل کتنی دیر تک بیٹھا رہا۔ گھٹنوں میں سر دیئے۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں چپکے چپکے رو رہا تھا۔ سسک رہا تھا جیسے میں اپنی ماں سے زبردستی الگ کر دیا گیا ہوں۔ جنگل ہی میری حقیقی ماں ہے۔ لیکن میرے بدن میں اب رینگ رینگ کر بھی اس کی طرف واپس جانے کے لئے طاقت نہیں رہ گئی ہے —— اچانک میرے کانوں کو انجن کی سیٹی سنائی دیتی ہے۔ بہت دور سے آتی ہوئی آواز۔ گاڑی میری طرف دھیرے دھیرے بڑھتی چلی آ رہی ہے اور میں زور زور سے رونے لگتا ہوں۔

اگر آدمی اپنے بیوی بچوں سے شدید محبت کا احساس کرنا چاہتا ہے تو وہ کبھی کبھی لمبے وقفے کے لئے ان سے دور چلا جایا کرے۔ ان سے دور جا کر وہ ان کے لئے یقیناً تڑپے گا! انہیں یاد کرے گا! ان کے بارے میں سوچے گا۔ دوسری عورتوں کے بارے میں بھی یقیناً سوچے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ نرمی اور محبت سے پیش آئے گا۔ دوسروں کے بچوں سے بھی پیار کرے گا۔

دہلی —— صبح سویرے مسنرم —— آگئیں۔ اپنے پتی سے کہیں زیادہ تنقیدی شعور رکھتی ہیں کسی افسانے کا معمولی سا پوائنٹ بھی اٹھا لیتی ہیں تو اس کی اہمیت تسلیم کرا کے ہی رہتی ہیں۔ میرے افسانوں کے متعلق کبھی کبھی مجھے خط لکھا کرتی ہیں ان کے خطوط خاصے دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان میں گھریلو عورتوں کی سی لڑنے جھگڑنے کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ کچھ دیر تک افسانوں پر ہی باتیں رہیں۔ جو افسانے انہوں نے اس عرصے میں پڑھے تھے، عورتوں کے لکھے ہوئے افسانوں کے بارے میں ان کی رائے ہے وہ REALISTIC نہیں ہوتے۔ ان میں لکھنے والیاں اپنے ذاتی وجود کے ساتھ یعنی عورت کے وجود کے ساتھ نہیں ابھرتیں۔ امریکہ اور یورپ کی قلم کار خواتین اپنے فطری اظہار میں زیادہ کامیاب رہتی ہیں۔ ہندوستان میں ہندی اردو میں لکھنے والی عورتیں لکھتے وقت بھی گھونگھٹ کاڑھے رہتی ہیں۔ جیسے انہیں اپنے افسانوں میں بھی گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی دوسروں کے ساتھ بات کرنی ہو! کچھ دیر بعد ان کے پتی بھی آ گئے۔ ہم تینوں گھومنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ چار گھنٹے تک سپر مارکیٹ میں رہے۔ یہ دراصل فراڈ مارکیٹ ہے۔ یہاں کوئی چیز سستی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ بہت سی چیزیں ایک جگہ اکٹھی رکھ لی گئی ہیں اور خریدار بھی ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وہ جگہ دلچسپ معلوم ہوئی۔ ہم لوگوں اور چیزوں کو ایک سی دلچسپی سے دیکھتے پھرے۔ کتابوں کے کاؤنٹر میں کی کتابیں دیکھیں۔ موسٹ پاپولر ناول نگاروں پر ایک سی بے ساختگی سے پھبتیاں کسیں اور قہقہے لگائے۔ رع ر، گ ن، م ن گ، غ ک، وغیرہ کی کتابوں کے الگ الگ ریک بنے ہوئے تھے مسنرم نے کہا یہ سب بیسٹ سیلرز (فٹ پاتھ والوں کے) ناول ہیں۔"

کتابوں کے درمیان: چلتے چلتے ہم سمرسٹ ماہم، ڈکنز، جیمز وغیرہ کے سامنے پہنچ گئے۔ میں نے کہا یہاں GREAT- UNRECOGNISED رائٹرز کی کتابیں دکھائی نہیں دیتیں۔

ابھی دکھاتی ہوں ان کی کتابیں!" وہ جیسے یہاں پہلے کئی بار آ چکی ہے۔ زمین پر بیٹھ کر سب سے نچلے خانے میں کتابوں کو الٹتے پلٹتے ہوئے بولی۔ ہماری یہ پوری صدی ہی ڈرامیٹک سسٹرز سے بھری پڑی ہے۔ کچھ ایک نے تو واقعی تاریخ کو بدل دینے کا کارنامہ انجام دے لیا ہے۔ باقی

وقت اور زمانے کی بس عکاسی ہی کرتی ہیں ۔ !"

میں نے سیمول بیکٹ کی ایک کتاب کھینچی جسے اس نے اپنے ہاتھوں میں لے کر بتایا : "میں نے یہ پڑھی ہے آپ بھی اسے ضرور پڑھئے لیکن بیکٹ کے ناول حقیقت اور سماجی مطالعے سے خالی ہی ہوتے ہیں ۔ سماج اور انسانیت کے ساتھ ان کا کوئی خاص رشتہ استوار نہیں ہوتا ہے ۔ اگرچہ بہتری ذو سر فیکل معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت کوئی خاص فلوسفی منتج نہیں ہوتی ہے ان کے ناولوں سے ۔

میری نظر نارمن میلر، ہنری مِلر، کنگزلے آمس، بل ہاپکنز، ارس مرڈاک، جان دین پر جا پڑی ۔ ایک ساتھ کئی کتابیں پڑی تھیں ۔ لیجئے سب کے سب ایک بُک میں ایک ہی جگہ ایک ساتھ مل گئے ۔

اس نے کہا ــــــ آپ کو معلوم ہے یورپ کا بالکل نووارد شاعر کیا کہتا ہے ۔ ان کے بارے میں ؟ غصہ تو اب اوٹ آف ڈیٹ ہو گیا ہے ۔ وہ تو سن پچاس کے ہی ادیبوں کی فطرت کا تقاضا تھا ۔ نیو جنریشن ایک بہتر شعور کی مالک ہے ۔ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی ۔ کاؤنٹر پر جا کر میری پسند کی چار پانچ کتابوں کا بل خود ہی ادا کر دیا ۔ میں اسے منع کرتا رہ گیا ۔ بولی "یہ میری طرف سے تحفہ ہی سمجھئے نا ۔ لیکن انہیں پڑھئے گا ضرور پھر ملیں گے تو اس کے بارے میں گفتگو کریں گے ۔

میں نے کافی ہاؤس میں چلنے کی دعوت دی تو اس نے کہا ــــ کافی تو لین کی کینٹین میں پی جا سکتی ہے ۔ میں وہاں جا کر موڈرن انڈین لٹریچر کے نئے نئے امیدواروں سے نہیں ملنا چاہتی ۔ ہم آپ سے یہیں سے رخصت ہوں گے اس کے بعد آپ ان سے جا کر ملئے گا ۔

محمود ہاشمی کافی ہاؤس میں تنہا تھا ۔ بچھڑ ہیں ہم دونوں ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہوئے اچانک مل گئے ملتے ہی کافی ہاؤس سے باہر نکل گئے ۔ ایک دکان سے

اب ہم دونوں اور ایک قریبی رسٹوران میں جا بیٹھے ۔ یہں ہمیشہ محتاط ہو کر پینی پڑتی ہے ۔ رسٹوران کے مالک بیرے کے ساتھ یقیناً سازش کر کے مجھو دا نور ہتے ہیں ۔ ڈسٹرب معلوم ہوا ۔ اپنے سارے احباب سے خفا بہت ہم اپنی اپنی SENSITIVITY کھو بیٹھے ۔ اپنے خول سے باہر آ گئے ۔ جلدی جلدی بہت سی باتوں پر متفق بھی نظر آئے ۔

۱ ۔ بیسویں صدی میں صرف دو ہی قسم کے لوگ ہیں ۔ کامیاب اور خوشامد سے اپنا کام بنا لینے والے یا ناکام اور حساس قسم کے لوگ ! ۔ دوسری قسم کے لوگ بے وقوف بھی ہوتے ہیں لیکن ذہین بھی !

۲ ۔ آنے والے سنیچر کو ہم لوگ (بلراج کومل، بیرا میزا، کمار پاشی، راج نرائن راز، زبیر رضوی، تت دی) میں شرکت کرنے کے لئے امرد ہر پہنچیں گے ۔ سے مجبور رہ جائیں گے اور ممکن ہوا تو پھر سب کے سب لکھنؤ چلیں گے ۔

۳ ۔ رسالوں میں خطوط کا جواب دیتے وقت یا خطوط لکھتے وقت خود کو تجریدی بیانات دینے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے ۔

رسٹوران سے باہر آئے تو آٹھ بجنے والے تھے ۔ میری گاڑی چھوٹنے میں پون گھنٹہ رہ گیا تھا ۔ ابھی مجھے گھر سے (والدین کے گھر سے) اپنا اٹیچی لانا تھا ۔ میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور اسکوٹر سے فلمستان کی طرف چل پڑا ۔ (وہیں قریب تانا رود ماڈل ٹاؤن میں ہمارا مکان ہے)

کبھی کبھی دوست سے مل کر میرے اندر یہ طور پر UNDER-PRIVILEGED ہونے کا احساس بڑھ جاتا ہے لیکن یہ احساس ہمیشہ نہیں طاری رہتا

کہ کسی محبت میں سماجی طور پر بھی UNDER PRIVILEGED کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے لیکن اس قسم کے احساسات سے کہاں تک بچا جاسکتا ہے؟ ہم دراصل کیا ہیں؟ یہ بات بھلا کر ہم بھیڑ میں گھومتے رہیں تو زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ دھکے کھا کر، پیچھے رہ کر خاموشی سے سننے اور سونگھنے اور دیکھنے میں بھی بڑا سکھ ہے! کیوں رام لعل، کیا تم ایسا محسوس نہیں کرتے؟

دہلی سے لوٹا تو بیوی نے بتایا۔ سنیچر وار کی شام کو سردار جعفری آئے تھے۔ افسوس ہوا کہ ان سے ملاقات نہ ہو سکی! ان سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ ابھی بیوی سے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ منظر سلیم آ گئے۔ ان کے ساتھ فراق صاحب سے ملنے کے لئے چل پڑا۔ اتفاق سے فراق صاحب اپنی قیام گاہ پہنچ چکے تھے۔ لان پر ٹہل رہے تھے۔ دیکھتے ہی خوش ہو اٹھے۔ بڑی محبت سے گلے سے لگایا اور بولے۔ میں اس وقت دنیا کی گریٹ ٹریجڈیز پر غور کر رہا تھا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ راماین اور مہابھارت درحقیقت ٹریجڈیز ہی ہیں اور ان کی عظمت ٹریجڈیز ہونے ہی میں ہے۔

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ دنیا میں جتنی بڑی بڑی مذہبی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب المیہ ڈراموں سے بھری پڑی ہیں۔ "گردچے کا خیال بھی یہی ہے۔ ٹریجڈی کا کے خاص معنی مذہب کے ہی ہو سکتے ہیں۔"

'TRAGEDIES, IN THAT ONLY SENSE OF THE WORD WHICH HAS ANY DISTINCTIVE MEANING, CAN NO LONGER BE WRITTEN IN EITHER THE DRAMATIC OR ANY OTHER FORM AND THE FACT IS NOT TO BE ACCOUNTED FOR IN ANY MERELY LITERARY TERMS — THE TRAGIC SOLUTION OF THE PROBLEM OF EXISTENCE, THE RECONCILIATION OF LIFE BY MEANS OF THE TRAGIC SPIRIT, THAT IS TO SAY, NOW ONLY A FICTION SURVIVING IN ART WHEN THAT ART HAS BECOME AS IT PROBABLY WILL, COMPLETELY MEANINGLESS, WHEN WE HAVE CEASED NOT ONLY TO WRITE BUT TO READ TRAGIC WORKS, THEN IT WILL BE LOST AND IN ALL REAL SENSES FORGOTTEN, SINCE THE DEVALUATION FROM RELIGION TO ART TO DOCOMENT WILL BE COMPLETE.

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہاں اچانک سید احتشام حسین اور محمود الحسن رضوی آ گئے اور شام کو پھر ملنے کا پروگرام بن گیا۔ شام کو چار بجے ملنے کا وقت مقرر ہوا۔ میرے ہی گھر پر میں نے کچھ اور لوگوں کو بھی مدعو کر لیا۔ فراق صاحب کو میں تین بجے ہی گھر لے آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ باتیں کریں گے میٹنگ سے پہلے بھی۔ میٹنگ میں کل سولہ آدمی تھے۔ فراق صاحب نے باقاعدہ میٹنگ سے پہلے ہی جو بات چیت چھیڑ رکھی تھی وہی چلتی رہی — مجھے اقرار ہے کہ تقریباً ۳۵-۴۰ برسوں سے اردو کیا عالمی پیمانہ پر بھی شاعری میں انحطاط ہے۔ کیا غزل کیا نظم! شاعری ایک بحران میں مبتلا ہے اور نہ جانے کب تک مبتلا رہے! میں جدیدیت کا مخالف نہیں ہوں۔ نہ اس کو قابل گردن زدنی قرار دیتا ہوں لیکن میں منتظر ہوں ابھی تک کوئی عظیم جدید نظم تخلیق نہیں ہوئی ہے۔

لکھنؤ میں کوئی بھی جدید شاعر نہیں ہے کم سے کم اس قسم کے

رویے کو پیش کرنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا۔ اس قسم کے مباحثوں میں جتنے لوگ شریک ہوتے ہیں سب کے سب جدیدیت کی مخالفت میں ہی کچھ سننے کے متمنی ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کا رویہ جدیدیت کا مذاق ہی اڑانے والا ہوتا ہے جسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے تخلیقی سطح پر تلاش و جستجو کی کوئی خواہش ان کے دل میں کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ اس قسم کی بے چینی بھی ان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ مجھے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء کا زمانہ یاد آتا ہے (اس وقت میں ۱۵ — ۲۲ برس کی عمر میں تھا) ترقی پسند اور جدید ادب کی تحریک بڑے زور و شور سے چل رہی تھی۔ اس تحریک کے بھی بہت سے لوگ مخالف تھے۔ مذاق اڑانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن تحریک بڑھتی رہی ''توانا'' ہوتی رہی۔ مخالفت ختم ہو گئی۔ کچھ تھک کر گئے۔ بعض احساس جرم کی وجہ سے فرسٹریٹیڈ ہو گئے۔ کسی نئی چیز کا ضد میں آ کر مخالف بن بیٹھنا اپنی ہی تخلیقی قوتوں کو بیکار بنا دینے کے مترادف ہوتا ہے۔

جب میٹنگ ختم ہو گئی تو فراق صاحب اور میں ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ ہمارے ساتھ دو اور دوست بھی تھے۔ فراق صاحب نشے میں کہیں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ قریب قریب سب ہی اب بے تکلف ہو چکے تھے۔ ایک مرتبہ پہلے بھی فراق صاحب ہماری کمپنی میں اس طرح جم گئے تھے۔ تب اکنامکس کے پروفیسر ڈاکٹر ڈی۔ پی سنگھ (جنہیں اردو ادب سے گہرا عشق ہے) اور دو نوعمر شاعر یوسف سرسوی اور اقبال ندیم موجود تھے۔ فراق صاحب نشے میں آ کر جگر اور اقبال پر بولنے لگے تھے۔ طیش میں آ کر اقبال کو ''پنجابڑا'' کہہ ڈالا۔ ڈاکٹر ڈی۔ پی سنگھ نے ہنستے ہوئے انہیں بتایا۔ لام لعل بھی تو پنجابی ہے۔ لیکن وہ اپنی دھن میں مست رہے، بولتے ہی رہے۔

۔خدا خدا کر کے وہ مختصر سی نشست ختم ہوئی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر کو سدھارے فراق کا قیام میرے یہاں تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ میرے اسٹڈی روم (جو ڈرائنگ روم بھی ہے) سیلنگ فین آن کرا کر رضائی اوڑھ کر سو گئے۔ پنکھا اس لئے آن کرایا کہ وہ گاڑھی جاڑے کا احساس چاہتے تھے۔ صبح میں بیڈ ٹی لے کر ان کے پاس گیا اور کہا — ''فراق صاحب اتفاق سے صبح اٹھتے ہی اقبال کا ایک شعر ذہن میں گونجنے لگا ہے۔ اگر وہ اتنا بڑا شاعر نہیں تھا تو یہ شعر کیسے کہہ گیا —

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے میرا انتظار کر!

یہ سن کر فراق صاحب مسکرا دیئے۔ چائے کا پیالہ میرے ہاتھ سے لیا۔ سگریٹ کو ایش ٹرے میں کچلا اور بولے۔ دیکھو راہی میں اینٹی اقبال نہیں ہوں۔ میرا ایک دکھ بھی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں اس کی تعریف کیوں کی ہے؟ یہ ساری تعریف مجھ ہی کو کرنی چاہیئے تھی۔!''

جس رات کا میں ذکر کر رہا تھا اس روز بھی فراق صاحب پورے جلال میں آ چکے تھے۔ جدیدیت کے سبب گذشتہ کئی صدیوں کے افکار سے ملا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں اپنے اشعار بھی سناتے جاتے تھے۔ میرا ذہن بڑا عجیب ہے۔ ادھر ادھر بہت بھٹکتا ہے۔ یوں بھی الکوحل سے متاثر ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں فراق صاحب نے کون کون سی باتیں کہیں۔ کاش! ایسے وقت ہم ٹیپ لگا سکتے۔ (ایک مرتبہ ستیش بترا کے گھر ٹیپ آن کر دیا گیا تھا) اکثر کتنی قیمتی قابل قدر باتیں ریکارڈ ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ میرا ذہن بھٹک کر دور چلا گیا۔ میں جیب سے کاغذ نکال کر کچھ لکھتا رہا۔ دوسرے دن اس کاغذ کو دیکھا تو اس پر لکھا تھا

اپنے ہمزاد کی تلاش میں

تھکا ہوا خدا

میں کتنا بدصورت ہوں

مجھے یاد نہیں ان جملوں کا فراق صاحب کی باتوں کے ساتھ کوئی ریلیشن ہے یا نہیں! لیکن یہ جملے میرے ذہن میں

ان کی باتوں کے ردعمل کے طور پر ہی ابھرے تھے۔ شاید میں نے انہیں
پڑھنے، افسانوں کے عنوانات کے لئے ہی لکھ لیا ہو! عنوانات
کے اعتبار سے یہ جملے اب بھی بڑی اپیل رکھتے ہیں۔

دہلی جانے والی گاڑی میں امروہہ تک جا رہا ہوں۔ کل
زبیر رضوی کی شادی ہے۔ میرے ساتھ دو امریکی بھی ہمسفر ہیں
آج کل امریکن یہاں بہت آئے ہوئے ہیں۔ پیس کور میں ہزاروں
لوگ ہیں کئی کئی مہینے یہاں رہ جاتے ہیں۔ مختلف شہروں میں
میرے ہمسفروں میں ایک انجینئر ہے۔ گذشتہ اکیس ماہ سے یہاں
رہ رہا ہوں - نوجوان ہے۔ آرٹ اور لٹریچر کے بہت قریب
ہے۔ مجھ سے بہت سے سوالات پوچھ رہا ہے — "ہندوستانی
مغرب کے قریب کیوں ہوتا جاتے ہیں؟ آپ لوگوں کے فنِ
تعمیرات میں، فلاسفی، ادب میں مغرب زیادہ سے
زیادہ گھستا جا رہا ہے۔ جبکہ آپ کے پاس اپنے مذہبی نظریات ہم سے
کہیں زیادہ مضبوط اور پائدار ہیں جو ہمیں بھی اٹریکٹ کرتے
رہتے ہیں!

میں نے اسے بتایا ہے فنِ تعمیر میں اب مشرقیت یا
مغربیت کا سوال اتنا اہم نہیں رہ گیا ہے۔ ڈیکوریشن کی حد تک
ایسا یقیناً ہے لیکن اصل سوال اکنومی کا ہے۔ ہم نے بہت سی
بڑی عمارتیں روسی فنِ تعمیر کے طرز پر بھی بنائی ہیں۔ کم سے کم
جگہ پر سستے میں اونچے اونچے ڈھانچے تیار کرکے ان میں
دیواریں اور چھتیں اور پارٹیشن ڈال کر کلرکوں کے بیٹھنے کے لئے
جگہیں بنا لینا ہی ہمارا مقصد ہے۔ مکانات کے سلسلے میں بھی یہی
کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک بڑی سرکاری عمارات کا تعلق ہے ان پر
مشرقیت کی چھاپ تو اور گہری دکھائی دیتی ہے۔ آرٹ اور
لٹریچر اب بھی بہت جلد اثر قبول کرتا ہے۔ پیرس، نیویارک
روم، لندن، نئی دہلی ایک دوسرے سے بہت دور نہیں ہیں
سائنس کی ترقی اور سفر کی تیز رفتاری نے ایک دوسرے
تک اپنے خیالات و نظریات کو پہنچانا بہت آسان کر دیا ہے۔

اسی وجہ سے کوئی خیال اور کوئی نظریہ دیر تک نہیں چلتا
معلوم ہوتا ہے بہت سے خیالات ایک دوسرے میں گڈمڈ
ہوتے جا رہے ہیں۔ جیسے آپ اپنے یہاں کی نقل کہہ رہے ہیں۔
ہو سکتا ہے آپ کے یہاں اس کا اور جن کہیں اور کا ہو۔
مذہب کی چھاپ اگر یہ ہمارے یہاں بہت گہری اور
نمایاں ہے اور ہم لاشعوری طور پر روزمرہ کی زندگی
میں اس کا استعمال بھی کرتے ہیں لیکن اسے ہم اپنے نئے
ادب کا حصہ نہیں بنا رہے ہیں۔ یہ بات واقعی قابلِ غور ہے
ہم نے مذہب کے خلاف بھی بہت لکھا ہے۔ جن لوگوں نے
مذہب کو اپنی سیاست کا حصہ بنایا ہے ان کو بھی ایکسپوز
کیا ہے لیکن ہم مذہب کی جڑیں کمزور نہیں کر پائے۔ یہ
نقطۂ نظر ادیبوں شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے اپنایا۔
لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ شاید اس لئے کہ ہمارے بعض
ترقی پسند رہنما اپنی ذاتی زندگی میں بے حد کٹر قسم کے مذہبی
بنے رہے ہیں۔ اب تو وہ کھلم کھلا مذہبی جلسوں میں شریک
ہوتے ہیں۔ گھروں میں ہون اور کیرتن کرتے ہیں اپنے یہاں شادی
بیاہ تک میں مذہبی رسوم کو روا رکھتے ہیں۔ ان کی یہ دو عملی
ادب میں ایک نئے ردعمل کو جنم دینے کے لئے ذمہ دار
ثابت ہوئی ہے۔ نئے ادیبوں میں بہت سے کسی نہ کسی مذہبی
جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر خود کو مذہبی
تو نہیں بنا پایا لیکن ایسی کہانیوں کا سواگت ضرور کروں گا
جس میں کوئی کردار اپنے حقیقی ماحول سے بغیر کسی کھونٹے
کے آئے گا!

امروہہ میں دو روز بہت اچھے گزرے۔ زبیر کی
شادی میں بلراج کومل، محمود ہاشمی اور بلراج مینرا دہلی سے آئے
تھے۔ جیپ میں بجنور تک کا سفر بھی دلچسپ رہا۔
دھول اور سفر کی تھکان کے باوجود ہم سب نے اس کا
لطف اٹھایا۔ شعر و ادب سے زیادہ لطیفے سنا اور

سنائے گئے۔ سامودہ کے ایک کالج میں رئیس نجمی نے ایک "شام ادب" کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میں نے ایک پنجابی افسانہ "چاپ" اور بلراج کومل نے چند نظمیں سنائیں۔ مقامی شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا۔ بارہ ایک بجے تک خاصی رونق رہی۔ زبیر اپنی دلہن کے ساتھ "سہاگ رات" منا رہا تھا!

صبح ملنے آئے گا تو اُس سے پوچھیں گے ؎

جن کیداں گذاری آ رات سوہنیا! (اے چاند! تو نے رات کس طرح بسر کی!)

غلط دوستوں کے انتخاب نے مجھے ہمیشہ تکلیف پہنچائی ہے۔ سائیں کو میں بہت اچھا آدمی سمجھتا تھا لیکن وہ بے حد کروکڈ (CROOKED) ثابت ہوا ہے۔ جس شہر میں پہلے رہتا تھا وہاں بھی وہ ایسی حرکتوں کے لئے بدنام تھا۔ اسی بنا پر اُسے وہ شہر چھوڑنا پڑا کیونکہ وہاں سب لوگ اس کے مخالف ہوگئے تھے۔ یہ بات اس کے بہت سے قریبی لوگوں سے معلوم ہوئی ہے۔ اس نے خود بھی اس شہر کو چھوڑنے کے سلسلے میں اسی قسم کی باتیں سنائی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا اس شخص کا کیا کروں۔

عبدالحلیم شرر کے ایک ناول "فردوس بریں" کا ایک کردار شیخ علی وجودی ہے شر اور بدی کا مثالی کردار۔ علم و دانش، زہد، اتقا اور روحانی کمال! اکیس کے اندر قریب قریب یہی خصوصیات موجود ہیں۔ ایک عجیب مجموعہ اضداد ہے۔ کسی بھی آدمی سے دور ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ اگرچہ اب میں اسے ہفتوں نہیں ملتا اور بڑا سکون محسوس کرتا ہوں۔ جس روز اس سے ملاقات ہو جاتی ہے میں پھر ڈسٹرب ہو جاتا ہوں۔

کبھی کبھی آدمی موت کے کس قدر قریب پہنچ جاتا ہے وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں سے پریشان ہو کر مرجانے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے ایسے جھگڑے گھر کے باہر بھی ہوتے ہیں وہ ان جھگڑوں کے درمیان خود کو غیر محفوظ نہیں بلکہ بے حد ANNOYED محسوس کرتا ہے۔ بہ سنجیدگی سے مرنے کے طریقے سوچنے لگتا ہے۔ اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُسے کوئی ایسا آدمی مل جاتا ہے جو اس بات سے قطعاً باخبر نہیں ہوتا کہ اس وقت وہ دل میں کون سا خطرناک ارادہ کئے بیٹھا ہے لیکن وہ اُسے اپنی باتوں میں لگا لیتا ہے۔ یعنی اسے اپنی دنیا میں لے آتا ہے۔ اس مایوس آدمی کے دل میں زندگی پھر سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اگرچہ بڑی افسردگی لیے اپنی معمول سے بھری ہوئی دنیا میں پھر لوٹ آتا ہے یہ حقیقت بھی کس قدر تکلیف دہ ہے کہ وہ اس کو بے اعتقادی سے جسٹیفائی کرنے پر مجبور ہے جو وہ بالکل پسند نہیں کرتا۔

لائبریری کی کتابوں میں کبھی کبھی بہت سی چیزیں پڑی ہوئی مل جاتی ہیں جنہیں میں جمع کرتا رہتا ہوں بس کے ٹکٹ، دواؤں کے پرسکرپشن، روز مرہ حیات بکھرے خط، پرنسپل کے نام اسٹوڈنٹس کی نام کے لئے دھمکی —— میرا خیال ہے ابھی اور بہت چیزیں ملیں گی۔!

رات بھر جاگتا رہا ہوں، نیند نہیں آئی کیوں صبح سویرے جشن جمہوریہ کے سلسلے میں دہلی اسٹیشن سے ہونے والی کمنٹری لگادی۔ نیند بار بار ٹوٹ جاتی آخر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لکھنؤ جیسے شہر میں یوم جمہوریت کبھی کوئی بڑا پروگرام نہیں منایا جاتا۔ لکھنؤ کے لوگ دہلی سے مرعوب رہتے ہیں یہ اچھی بات نہیں ہے شہر بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا بڑا دہلی ہے۔ عجیب سی بے کیفی رہی کولڈ ڈے چلتی رہی۔ دونوں کی طرح آج بھی چھت پر قومی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ کئی سال

جب وہ بہت چھوٹا تھا اس نے یہ بات مجھ سے سیکھی تھی۔ اب
وہ ہر سال جھنڈا لہرایا کرتا ہے۔ پتہ نہیں وہ آزادی کی
تھرل (THRILL) کو بھی اسی طرح محسوس کرتا ہے
یا نہیں جس طرح کبھی ہم لوگوں نے محسوس کی تھی۔ وہ آزادی
کے بعد ہی پیدا ہوا ہے۔ میں بھی جب بچپن میں آزادی
کی تحریک زوروں پر تھی اسی طرح جھنڈا لہرانے میں بھی
اور تحریک کی سنسنی ابھی تک میری رگوں میں موجود ہے جیسے
آزادی کے بعد کا شدید اقتصادی بحران بھی ختم نہیں
ہو پایا —!

آج میں نے چلتی گاڑی سے اترنے کی کوشش
کی ہے مجھے کرنیل گنج اسٹیشن پر اترنا تھا۔ لیکن میری آنکھ
لگ گئی تھی۔ اچانک نیند کھلی تو گاڑی کرنیل گنج سے چھوٹ
رہی تھی تو جلدی سے میں اتر پڑا۔ بعد میں افسوس بھی ہوا۔ میں نے
ایسا کیوں کیا؟ بھلے ہی میرا پورا دن غارت ہو گیا ہوتا۔ گونڈہ
نکل گیا ہوتا تو وہاں بھی کوئی کام تو نہ ہوتا لیکن چلتی گاڑی
سے اترنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ کتنی دیر تک میرے
بدن میں بے اطمینانی موجود رہی۔ میں نے خود سے وعدہ
کیا۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ ریلوے کے جگہ جگہ لگائے
ہوئے سائن بورڈ یاد آ رہے ہیں — اصولوں کا پالن کرو
اور اپنے بچوں کے پاس ہنسی خوشی گھر لوٹو۔ ساڑھے نو
بجے اور دو گھنٹا ہوئی، جب آپ ڈیوٹی سے آف ہو کر گھر جائیں گے
تو بیوی اور بچوں کو اپنا منتظر پائیں گے! پاپا آپ کس وقت
گھر آئیں گے، صبح آپ کے بچے نے آپ کی ٹانگوں سے لپٹ کر
پوچھا تھا۔

نہرو کی کتاب 'نہرو آن ورلڈ ہسٹری' لے آیا ہوں۔
نہرو کی بعض باتیں دل کو چھونتی ہیں۔ سب کو ڈائری میں نقل
کرنا بہت مشکل کام ہے۔ کچھ تو لکھ ہی لوں گا —

دوسری دنیا سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ایسی
دنیا میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں ان کے وچاروں سے ذہن بھرا
ہوا ہے۔ اگر اسی دنیا میں میں نے صحیح راستہ پا لیا تو میں مطمئن ہو جاؤں گا
اگر یہیں پر میرے فرائض مجھ پر پوری طرح واضح ہو سکتے ہیں تو میں
کسی دوسری دنیا میں جانے کے لیے خود کو تکلیف نہیں دوں گا

'کسی ایسے سماج میں رہنا خاصا خطرناک ہے جس نے
خود کو ایک خول کے اندر سیٹ کر رکھا ہو'

'اعتقاد اور سائنس اور علم ساتھ ساتھ
بآسانی نہیں چلتے ہیں!'

'بہت سے ملک میں مذہب بے حد نفع بخش
بزنس بن چکا ہے۔'

اگر آپ امریکہ جائیں جو کہ بے حد ترقی یافتہ ممالک
میں سے ہے تو وہاں بھی آپ کو مذہب ایک بہت بڑی
انڈسٹری کی شکل میں نظر آئے گا جس کی ترقی کا دار و مدار
ہوتو ر کی ایکسپلائٹیشن پر ہے!

ہندوستان کو ایک نئے مذہب کی ضرورت
ہے۔ یہ ضرورت نہ قدیم ہندو مذہب پوری کر سکتا
ہے نہ اسلام جس نے سینکڑوں برس تک یہاں
حکومت کی ہے۔

شہرت ہی ان کی مشترکہ داشتہ ہے۔ وہ
سب اسی پوزیشن (Possessions) پر فخر
کرتے ہیں۔ کچھ بزرگ ادیبوں کے ساتھ گیا سے الہ آباد
تک سفر کیا۔ ان کی باتوں سے بار بار اس بات کا
احساس ہوا۔ ان کے ساتھ اڈجسٹمنٹ
کرنے میں خاصی دقت پیش آ رہی تھی صرف عمر کے فرق
کی وجہ سے نہیں۔ موضوعات، اظہار، زبان و بیان کے معاملے
میں بھی خود کو ان سے بہت مختلف محسوس کرتا ہوں۔ چاہتا

چاہتا اس موضوع پر ذرا تفصیل سے لکھوں ۔

دہلی میں سجاد ظہیر صاحب کی لڑکی کی شادی میں قرۃ العین حیدر سے پہلی بار ملاقات ہوگئی ۔ وہیں شیخ عبداللہ کو بھی بہت قریب سے پہلی بار دیکھا۔ سیلف کانشس بہت تھے ۔ کچھ گھبرایا ہوا بھی ۔ پتہ نہیں کیوں؟ موہن راکیش، راجندر اوستھی، ڈاکٹر محمد حسن، سلام مچھلی شہری ۔ غلام ربانی تاباں، اور کئی دوسرے ادیب ملے ۔ سب کے ساتھ تھوڑی سی گفتگو رہی ۔ محمد حسن کے ساتھ ان کے تازہ مضمون جدیدیت ــــ نئی ترقی پسندی، پر باتیں ہوئیں ۔ مجھے یہ مضمون کئی اعتبار سے پسند ہے ۔ ایک تو اس میں جدیدیت کے رجحان کا اندھا (Condemnation) نہیں ہے نئے ترقی پسند ذہنوں کو نئی تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لئے دعوت دیتا ہے۔ کسی نئے رجحان کو سیاسی عینک لگا کر دیکھنا غلط ہوتا ہے ۔ سجاد ظہیر اور سردار جعفری نے اس سلسلے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ قابل تعریف نہیں ۔ اورنگ آباد میں گذشتہ دسمبر میں بیدی اور مخدوم محی الدین کے ساتھ کافی تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی ۔ وہ بھی سردار جعفری کے اس رویہ کے خلاف تھے کہ کسی نئے رجحان کو ٹھیک طرح سے سمجھے بوجھے بغیر ہی اس کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جائے ! بعض جدیدیت کے حامی نئے لوگ بھی یقیناً کھلے ہوئے انٹی پروگریسو ہیں ۔ یہ تو ان کا ذاتی معاملہ ہے ۔ لیکن سارے کے سارے نئے ادیب و شاعر انٹی پروگریسو کہاں ہیں؟ سجاد ظہیر یا سردار جعفری کا مخالف ہونا انٹی پروگریسو کیسے ہو سکتا ہے ؟ بعض باتوں میں میں بھی سجاد ظہیر اور سردار جعفری سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن وہ مجھے انٹی پروگریسو کیوں نہیں سمجھتے ۔ ہم نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اسے ابھی تک کسی نے بھی کنڈم نہیں کیا ۔ اسے ادب کے طور پر سب نے قبول کیا ہے ۔ ا ادب کو خالص ادب ہی سمجھتے ہیں ۔ ہم سے میری مراد میر ہم عمر ادیب ہیں ۔ جو گذشتہ دس پندرہ سال سے میر آگے پیچھے یا میرے ساتھ لکھ رہے ہیں ۔ لیکن مجھے ان ک طرف سے بولنے کا حق ہی کیا ہے ؟

سجاد ظہیر کے گھر سے نکل کر زیرا اور میں ریڈیو اسٹیشن گئے ۔ وہاں سے لال کنواں پہنچے ۔ جہ ر محمود ہاشمی منتظر تھے ۔ رات کو کافی دیر تک باتیں ہوئیں ۔ لکھنؤ کی، علی گڑھ کی، حیدرآباد اور بمبئی کی اور دہلی کی ۔ ہم بہت سے معاملات میں اتفاق رائے نہیں رکھتے پھر بھی جب ملتے ہیں تو کھلے دل سے ملتے ہیں ۔ دل کے کسی بھی خانے کو مقفل کر کے نہیں ملتے ۔

دہلی میں آج کی شام قمر رئیس اور ڈاکٹر محمد حسن نے لے لی ہے ۔ انہوں نے جاوید وششٹ سے بھی ملا دو اصحاب اور بھی تھے ۔ رات کو دیر تک باتیں ہوتی رہیں ساتھ ساتھ پینے اور کھانے کا سلسلہ بھی رہا ۔ قمر رئیس

ہم سب کو پڑھتے رہتے ہیں لیکن پریم چند سے آگے بڑھتے ۔ ان کی باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے ۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پریم چند ہی ہمارے ایک دیوار بن جاتے ہیں ۔

گذشتہ دس برسوں میں سب سے زیادہ جس شخص افسانے پڑھے ہیں اور ان پر بڑی محنت سے لکھا ہے ا ڈاکٹر محمد حسن قابل ذکر ہیں ۔ وہ اب بھی پڑھتے رہتے جیسا کہ ان کے ساتھ باتیں کر کے احساس ہوتا ہے ا ان کا بڑے افسانے کا مطالبہ پرانے زمانے کا ۔ نئے افسانے کو وہ نئے حالات کے سانچے میں دیکھنے ک تیار نظر نہیں آتے ۔ میرا خیال ہے وہ اپنے سنہ ۱۹۶۰ء مضمون (مطبوعہ سوغات نمبر ۵) سے ذہنی طور پر آگے نہ

ا اپنے زمانے کا بہت ہی بھرپور مضمون تھا۔ اس کے
الٰہ محمد حسن کی اموشنل وابستگی تو تسلیم کی جاسکتی ہے
لن ان کی نئی ترقی پسندی کی روشنی میں پرانے ڈھرے کے
ناؤں کے ساتھ ذہنی وابستگی والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

آج بھی میں دہلی میں ہوں اور پورا دن متھنگ لنی میں
ہا ہے۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتا رہا کسی سے ملنے کو جی نہیں
بتا۔ شام کو کافی پینے کے لئے ٹی ہاؤس میں گیا۔ تھوڑی
ر بعد بلراج کومل اور بلراج مینرا آگئے۔ گھنٹہ بھر ان کے ساتھ
را۔ کافی پیتے رہے۔ سگریٹ پھونکتے رہے اور ادھر ادھر
باتیں کرتے رہے جو عام طور پر ذہن پر بوجھ نہیں بنتیں۔ میں نے
راج کومل کے نئے افسانے 'دکنواں' کی تعریف کی جو تازہ شب خون
شائع ہوا ہے۔ (مینرا نے کہا کہ مجھے پسند نہیں آیا یہ افسانہ!
ں نے کوئی جواب نہ دیا مسکرا دیا بس!) میرا خیال ہے بلراج
ل شاعر سے کہیں اچھا افسانہ نگار ثابت ہوگا۔ میں نے اسے
بات کہی تو اس نے تسلیم نہیں کیا۔ بولا ــــ "میں شاعر
نا اچھا ہی کار ہونگا اور افسانہ نگار بھی۔ یعنی دونوں اصناف
ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کی کوشش کروں گا"

جب کوئی بڑا ادیب مرجاتا ہے تو اس کے رشتے دار
رقریبی دوست عجیب عجیب سے بیانات دینے لگتے ہیں۔
رِم سے اپنے قریبی تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے جھوٹ بھی بول جاتے
ہیں۔ ان کی باتوں سے کسی حد تک مرحوم کی سوانح حیات مرتب
نے میں مدد تو مل سکتی ہے لیکن اصل آدمی تو اپنی شخصیت کے
شتر اور اہم ترین اسرار اپنے ساتھ ہی لئے ہوئے رخصت
ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے مرجانے کے بعد اس کے بدترین
شمن تک اپنی نفرت کا زہر کھو بیٹھتے ہیں۔ بعض وہ دوست
لی جو مرحوم کی کمزوریوں سے واقف رہے ہیں اب کچھ
تے ہوئے جھجکتے ہیں!

موجودہ سماج کی تعمیر میں عورت نے کونسا قابل قدر
حصہ لیا ہے؟ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتی۔ بارہا ایسا ہوا
ہے کہ عورت کی وجہ سے ہی مردوں کے مضبوط ترین باہمی
رشتوں میں دراڑیں سی پڑ گئی ہیں۔ لیکن مرد کی مرد کے
ساتھ اتنی گہری رفاقت ہے (جن کی وجوہ پر تفصیل سے
پھر کبھی تبصرہ لکھوں گا) کہ اسی کی بنیاد پر سماج کا یہ ڈھانچہ
تعمیر ہوا نظر آتا ہے۔
عورت مرد کو جسمانی مسرت تو دے سکتی ہے
ماں کے روپ میں ممتا اور بہن کے طور پر بہن کا بے پناہ پیار
بھی لیکن وہ اسے کوئی ایسی قوت نہیں دے سکتی جو سماج
کو تعمیر کرنے اور اسے مضبوط بنانے میں معاون ثابت ہو سکے
صرف بچے دینا ہی اس مقصد کے لئے کافی نہیں ہے۔

دہلی میں ترقی پسند تحریک کے تیس سالہ جشن میں
ایک پیپر پڑھا جس میں تحریک کے روشن پہلوؤں کے علاوہ
بعض ادیبوں کی تیس سالہ تہذیبی فسطائیت Cultural
dictatorship کا بھی ذکر تھا۔ خواجہ احمد عباس نے
وہاں تو پیپر کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا لیکن بمبئی
جا کر میرے خلاف بلٹز میں پورا آخری صفحہ صرف کر ڈالا۔
اس کے بعد وہی مضمون اذکار میں بھی شائع کرایا! ایک ملاقات
میں سردار جعفری نے مجھ سے کہا ـــ میں نے عباس سے
کہا ہے اپنے سے چھوٹوں کے خلاف نہیں لکھنا چاہیے ـــ
میں نے ہنستے ہوئے پوچھا ـــ "کیوں! کیا اس سے بڑوں کا
قد چھوٹا ہو جاتا ہے؟ یا چھوٹوں کا قد بڑھ جاتا ہے۔ انہوں نے
کوئی جواب نہیں دیا مسکرا کر رہ گئے۔ اپنی تحریک پر دیانتداری
سے تنقید کرنے سے ہی میرا اعتماد مضبوط ہوا ہے۔

ہولی کی شام کو بیگم حیات اللہ انصاری کے یہاں
لکھنؤ میں قرۃ العین حیدر سے دوسری ملاقات ہوئی۔

رات کو دس بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ سیتیش بنرا بھی تھے۔ عینی اب پینتالیس کے قریب ہے لیکن ابھی تک چارمنگ! ان عورتوں میں سے ہے جو عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ اور دلکش ہوتی جاتی ہے۔ باتوں میں بے پناہ فرینک اور چیرفل! ابھی تک ان مریچیور! اس کے اندر انیس بیس سال کی ایک شوخ لڑکی (آئی۔ ٹی۔ کالج والی) کبھی ابھی تک زندہ ہے اگر شادی ہوگئی ہوتی تو ممکن ہے وہ ایک سنجیدہ قسم کی عورت ہوتی۔ جدیدیت کی مخالف ہے۔ ادب کو خانوں میں بانٹنے کی بھی سخت مخالف! لیکن اس بات سے متفق کہ ادب مختلف زمانوں کی عکاسی کرتا آیا ہے۔ اور اس پر بضد کہ ادب کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ کافی حد تک سیف کانشس! بولی میرے بارے میں کئی قسم کی Myths مشہور ہو چکی ہیں۔ میں نے کہا ہمارے لوگ ہیرو ورشپ میں گہرا درک رکھتے ہیں۔ دیویوں اور دیوتاؤں کے بارے میں اپنے آپ بھی بہت سے قصے گڑھ لیتے ہیں۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی لیکن میں نے اسے ایک ایسی خاتون یا حسن کے بارے میں کوئی Myth ہو نہیں سکتی۔ دلچسپ، تعلیم یافتہ، ڈپلومیٹک اور بے حد چارمنگ خاتون کے بارے میں اور کیا کہوں؟

دوسرے روز صبح چھ بجے وعدے کے مطابق عینی اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔ ایک ٹرک میں بیٹھ کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ بہت سا پرانا سامان تھا۔ اس کے والد کے زمانے کا۔ کراکری تصاویر۔ قالین وغیرہ۔ بڑے بڑے بکسوں اور بنڈلوں میں پیک کیا ہوا۔ انہیں وہ اپنے ساتھ بمبئی لے جا رہی تھی۔ وہ بہت جلد نروس ہو جاتی تھی اور پھر تھوڑی سی فرینڈلی گفتگو کے بعد نارمل بھی نظر آنے لگتی تھی۔ اسے سی آف کرنے کے لئے اسٹیشن پر بیگم حیات اللہ انصاری شہناز مصطفے (ایڈوکیٹ خاتون) اس کی بہن لیلیٰ، شوہر عینی کے اسکول کے پرانے منیجر پرتھوی راج سرلا استوا اور اس کی بیٹی بھی آئی۔ سرلا استوا جی نے بتایا عینی نے اس کے اسکول (مہاتما گاندھی ہائی اسکول) سے ۱۹۴۱ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔

بعض لوگ مجھے ایک کامیاب افسانہ نگار کہتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ بات کیا سوچ کر کہتے ہیں۔ میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک ری جکٹڈ رائٹر ہی ہوں۔ میں بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال نہیں بنا پایا۔ بہت سے دوست میرے مخالف اپنے آپ ہو جاتے ہیں۔ بعض کو میں نے خود مخالف بنا رکھا ہے!۔

None But the Brave
deserve the Fair "dryden"

ناولوں کے رومانی دور میں ہیرو ایک بہادر عاشق ہوا کرتا تھا۔ لیکن ہمارے دور میں وہ ایک زنا کار (seducer) ہے غنڈا ہے۔ یہ بھی رومانیت کی ہی ایک شکل ہے —— کالن وِلسن

دہلی سے لوٹتے وقت علی گڑھ تک ڈاکٹر مونس رضا اور ڈاکٹر سراج الدین کا ساتھ ہو گیا۔ مونس رضا معصوم رضا راہی کے بڑے بھائی ہیں۔ ایک دوسرے سے غائبانہ تعارف کافی عرصہ سے تھا۔ ڈاکٹر سراج الدین نے ایک دوسرے سے متعارف کرا دیا تو ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔ رات بارہ بجے تک باتیں کرتے آئے۔ وہ کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرر ہیں۔ کسی کام سے کچھ مہینوں کے لئے علی گڑھ آئے ہوئے ہیں۔ باتوں میں قاضی عبدالستار کا ناول "دارا شکوہ" کا ذکر کافی رہا۔ وہ بھی تاریخ میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا شبخون والا "دارا شکوہ" پر تبصرہ پڑھ چکے تھے۔ اس تبصرہ پر بھی

[illegible] رہا۔ یونس رضا اس بات کے حامی تھے کہ ناول
[illegible] تاریخ کے اُن واقعات کو موڑ نہ کیا جائے۔ نہ ہی تاریخی
کرداروں کی ضرورت کے مطابق پیش کیا جائے۔ میرے
خیال میں ناول ہے اور تاریخ تاریخ۔ ناول کے
اپنے تقاضے ہوتے ہیں انہیں پورا کرنے کے لئے واقعات
[illegible] ترتیب بھی بدلنی پڑے گی اور کرداروں کے چہرے بھی
مسخ کرنے ہوں گے، کہیں اُجلے اور کہیں بالکل دھندلے
چھوڑ دینے ہوں گے ورنہ ناول کی بنیادی تقسیم
[illegible] ہو کر رہ جائے گی۔ تاریخ اصل واقعات
کا مستند ریکارڈ ہوتی ہے اس میں کہیں بھی تصرف
نہیں ہے۔ اگرچہ بعض ہسٹورین (تاریخ داں) اس
[illegible] کرنے سے نہیں چوکتے۔ تاریخی ناول لکھنے
کا مقصد تاریخ پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ تاریخ کے پس منظر
میں فکشن اپروچ (Fictional Approach)
[illegible] ہوتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اور یونس رضا
کے نظریات سے میں متفق نہیں لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ
[illegible] سے کردار ناول کے کردار ہونے کے باوجود کبھی
[illegible] جسمانی و ذہنی طور پر قاری کو محسوس نہیں ہوتے
[illegible] خواہ مجید بھی ہوں لیکن اس کی [illegible]
[illegible] ناول کی تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔ میں [illegible]
[illegible] ہسٹری کے پوائنٹ آف ویو سے یقیناً اچھوتے
[illegible] کے طور پر ہرگز نہیں (لیکن پتہ نہیں اصل
[illegible] لیا!)

آج صبح دس بجے رشید احمد فیض آباد سے آگئے۔ اختر
[illegible] ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک نوجوانوں کے سے دم خم
[illegible] سائیکل چلاتے ہیں۔ پولیس کوتوال کے عہدے سے
ریٹائر ہوئے انہیں پچیس سال کے قریب ہو گئے ہیں۔ پہلی
[illegible] کے نیا نعا حاصل ہوئے ہیں مولانا عبدالماجد دریابادی

فراق گورکھپوری، علی عباس حسینی، سید احتشام حسین، حیات اللہ
انصاری، سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، کرشن چندر، رشید
صدیقی، خواجہ احمد عباس کے بعد رشید احمد صاحب
گیارہویں بزرگ ادیب ہیں جنہوں نے غریب خانہ پر آکر
عزت بخشی ہے۔ اس فہرست میں مخدوم محی الدین، غلام
ربانی تاباں، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی اور جگن ناتھ
آزاد کو بھی شامل کروں تو ممکن ہے یہ لوگ خود کو بزرگ
کہلوانے سے انکار کر دیں۔ مجھ سے یہ سب دس دس
برس بڑے ہی ہوں گے (ساحر کو چھوڑ کر) لیکن میرا بھی
ابھی انہیں بزرگ کہنے کو جی نہیں چاہتا۔

سید رشید احمد کے ساتھ ایک بجے تک
باتیں ہوتی رہیں۔ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب پر بہت
اچھا ادب تسکا لوتے ہیں اور لکھ بھی سکتے ہیں۔ انھوں نے
اپنا ایک مضمون 'حسو خاں' (مطبوعہ آجکل) خود پڑھ کر
سنایا۔ نثر پڑھنے میں بھی انہیں داستان گویوں کا سا
کمال حاصل ہے۔ انگریزوں کے تحت ملازمت کی ہے
اس زمانے کے کئی دلچسپ واقعات سنائے جو چارباغ
کے علاقے سے متعلق تھے۔ رشید صاحب اس علاقے کے
تھانہ انچارج رہے تھے۔ پولیس اور ادب کے درمیان
کوئی تعلق ہو سکتا ہے جو رہیں اور ادب کے درمیان
میں پیش کر رہا ہوں۔ علامہ سیماب اکبرآبادی بھی ریلوے
کی ملازمت میں تھے۔ [illegible] اسٹیشن پر تعینات تھے
ہندی کے ایک بزرگ ادیب مہاویر پرشاد دویدی
بھی جھانسی میں ریلوے کے محکمے میں تھے جن کے نام
سے ہندی ادب کا ایک یُگ وابستہ ہے۔ پندرہ سال
ہوئے ریلوے پولیس کے ایک داروغہ مفتی صاحب میرے
بہت گہرے دوست تھے۔ اردو کا شاعر ہونے کی وجہ سے
میرے قریب آگئے تھے۔ ان کا اب انتقال ہو چکا ہے۔
سیتاپور میں بھی رہے تھے۔ وہیں ایک مشاعرے میں شرکت

۔۔۔ کے لئے جا رہے تھے راستے میں ہارٹ فیل ہو گیا۔

ہمارے آگرہ کے ریلوے ایڈوکیٹ شکل و صورت سے
نہایت ہی معقول آدمی نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی ناک اور
گردن میں کوئی خاص نقص ہے کہ ہر وقت اوپر کو ناک سڑکتے
رہتے ہیں اور گردن کو بھی بار بار جھٹکا دیتے ہیں۔ ایسے
آدمی عام طور پر سنکی بھی ہوتے ہیں اور بلا کے ذہین بھی۔
آگرہ جا کر میں جب بھی ان سے ملتا ہوں ان کی عادت کا بغور
مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔

آگرہ سے واپسی پر (طوفان اکسپریس) میں ایک سیلز مین
سے دوستی ہو گئی۔ ہم لوگ راستہ بھر تاش کھیلتے آئے
دو اسٹوڈنٹ بھی کھیل میں شامل ہو گئے۔ اسی ڈبے میں
پانچ نوجوان خوش شکل طوائفیں بھی سفر کر رہی تھیں۔
انہیں کی وجہ سے کمپارٹمنٹ میں بھیڑ زیادہ رہی۔ ہمارے
کھیل کو وہ بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہیں۔ شاید وہ بھی کھیلنا
چاہتی تھیں۔ لیکن ہم نے انہیں مدعو نہ کیا۔ ان سے پینے
کے لئے بار بار ٹھنڈا پانی ضرور مانگتے رہے۔ ان کے
پاس پانی کی صراحیاں بھی تھیں اور برف سے بھری ہوئی
تھرماسیں بھی۔ انہوں نے بخوشی ہمیں پانی پلایا۔ ٹنڈلا
اسٹیشن پر چائے بھی پیش کر دی جسے ہم نے شکریہ کے
ساتھ قبول کر لیا۔ پورے سفر میں وہ ہمارے لئے شریف
(Respected) ہمسفر بنی رہیں۔ دوسرے لوگ اگرچہ
ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے گھورتے رہے۔ ہماری
بے نیازی شاید ہمارے نارمل برتاؤ کی ہی وجہ سے ہمارے
نزدیک بیٹھ کر وہ زیادہ 'ایٹ ہوم' فیل کرتی رہیں۔
پانچوں کی پانچوں نہایت خوش شکل اور خوش اخلاق تھیں۔
چار کی رنگت سیاہ تھی اور وہ ایک ہی آدمی کی اولاد
معلوم ہوتی تھیں۔ پانچویں بے حد گوری اور بے بی فیس
تھی۔ ان کا لباس بے حد سادہ تھا۔ میرے سیلزمین ہمسفر نے
انہیں ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ ورنہ میں تو ان
طوائف ہونے پر شبہ نہیں کر سکا تھا۔ کانپور
قریب پہنچتے پہنچتے ان کی دلچسپی کا مرکز دو
لوگ بن گئے جو ان کی طرف حریص نظروں سے دیکھ
رہے تھے۔ انہیں شاید خوش کرنے کے لئے وہ
شوخی پر اتر آئیں۔ ایک دوسرے کی گود میں سر
وہ پیار و محبت کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ پبلک میں بوس و
تک سے بھی گریز نہ کیا۔ لیکن یہ ہم جنسوں تک ہی محدود
مرد مرد سے اور عورت عورت سے اس قسم کی
کا اظہار کر سکتی ہے۔ جس کے لئے قانون حرکت میں
آ سکتا۔ پبلک نیوسنس کا قانون مخالف جنسوں
حرکتوں سے ہی مشتعل ہوتا ہے۔

THESE TRAGIC VISIONS AND
ERSPECTIVES CONTAIN A
IDDEN PHILOSOPHY, FOR THEY
END MEANING TO AN OTHERWISE
'EANINGLESS DOOM—— KARL
ASPERS.

(FROM-TRAGEDY IS NOT
ENOUGH)

(جنوری ۱۹۶۷ء سے ۱۹ اپریل ۶۸ء
تک)



علی عباس حسینی

چند اُردو مخمس

کلیم الدین احمد" اردو شاعری پر ایک نظر" میں اُردو شاعری کے پورے سرمایہ کو "صرف چند دھجیاں اور پرزے" کے گراں قدر خطاب سے سرفراز فرماتے ہیں۔ وہ یوں گُہر ریز ہیں:

"غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی کے علاوہ اردو میں دیگر اصناف بھی موجود ہیں۔ مثلاً مسدس، مخمس، مربع، مثلث، ترجیع بند۔ لیکن ان اصناف کو اردو شعراء نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ عموماً ان صنفوں میں شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن میں ذاتی واقعات و تجربات ہیں اور بعض مثالیں موثر بھی ہیں۔ لیکن عموماً مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں کامیاب ہوں، یا ناکامیاب محض حواشی ہیں اور اُردو شعراء ان کی طرف پوری توجہ نہیں کرتے۔ مسدس میں البتہ چند بند مربوط سے ہوتے ہیں۔ خیالات و جذبات کی ابتدا، ترقی اور انتہا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مسدس میں مثلث، مربع، مخمس، سے زیادہ گنجائش ہوتی ہے اور ترکیب بند کی طرح یہ وسعت دشواری نہیں پیدا کرتی۔ لیکن یہ صنف بھی غزل گو شعراء میں مقبول نہ ہو سکی۔"

"صورت حال یہ ہے کہ اردو شاعری میں محض دھجیاں اور پرزے ہیں۔ غزلیں اور اشعار بے شمار ہیں۔ لیکن صورت غزل میں اس کے نقائص کی وجہ سے اعلیٰ پیمانے کی شاعری ممکن ہی نہ تھی۔ شعر مفرد بھی اپنی کم بضاعتی کی وجہ سے شاعری کے بارگراں کا متحمل نہ ہو سکا.... دیگر اصناف اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے، تو اردو شاعری کی بضاعت صرف اس قدر نظر آئے گی۔ چند قطعے، چند تجدیدیں، چند ہجویں، چند ٹکڑے مثنوی اور مرثیہ کے اور بس! پھر یہ کہنا غلط نہیں کہ اُردو شاعری میں صرف چند دھجیاں اور پرزے ہیں۔"

تنقید کے نام سے یہ ارشادِ کلیمی، اردو شاعری کے پورے سرمایہ کی تنقیص ہی نہیں بلکہ تحقیر و تذلیل و توہین بھی ہے اور صریحی مغرب زدگی کا نتیجہ۔ ہم نے اس کتاب کے مختلف ابواب میں اپنی شاعری اور اس کی مختلف صنفوں پر اعتراضات کئے، جو کلیم الدین احمد نے وارد کئے ہیں، یا دیگر معترضین کی طرف سے وارد کئے گئے ہیں، ان سب کے جوابات تفصیل کے ساتھ دے دیئے ہیں۔ ہمیں ان کے جوابات لکھنے میں ہر قدم پر دو امور کا احساس ہوا۔ ایک تو یہ کہ بعض ناقدین نے ہماری شاعری کو مغربی جریب سے ناپنے کی کوشش کی اور اسے مغربی ترازو میں تولنے کی سعی غیر محمود کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے اور ان کے پیمانے ایک ہیں اور نہ اوزان ایک۔ اور وہ ٹھہرے پرستار مستعار معیار کے۔ ہمنے انہیں تو ہماری چیزیں گھٹیا اور دوسرے درجے کی معلوم ہونگی ہی۔ سوٹ پہننے والا ہمیشہ شیروانی اور انگرکھے میں ملبوس کو نظر حقیر سے

دیکھتا ہے۔ خدا جانے یہ جذبہ کہتری کا نتیجہ ہے یا احساس بہتری کا! — مگر ہے کچھ ایسا ہی ہے۔ دوسرا گروہ معترضین کا وہ ہے، جو کم سواد،
جس نے واقعی اردو شاعری کی صرف چند دھجیاں اور پرزے ہی پڑھے ہیں اور اس کے خزانۂ عامرہ میں، جو لاتعداد لعل و جواہر بھرے پڑے ہیں،
ان پر نظر تک نہیں ڈالی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایسے ہی کم نظروں کو بابصیرت بنانے کے لئے اپنے جوابات کے سلسلے میں مثالوں کے پیش کر
میں قدرے افراط سے کام لیا ہے اور یہ بھی اہتمام کیا ہے کہ وہ مثالیں ایسی نہ ہوں جو عام طلبار اردو کی نظر سے گزر چکی ہوں، بلکہ
کے مطالعہ سے معترضین محسوس کریں کہ وہ اردو شاعری کے بحرِ ذخار میں غواصی کرنے اور وہاں سے گوہرِ آبدار برآمد کرنے کی بجائے
ساحل پر بیٹھے چھوٹی سیپیاں اور گھونگھے ہی جمع کرتے رہے ہیں۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اُردو شعرا نے مثلث، ترکیب بند و ترجیع بند، مخمس و مثمن اس افراط سے نہیں کہے ہیں، جس کثرت سے غزل کہی
ہے۔ یا مسدس نظم کئے ہیں۔ پھر بھی اگر ولی دکنی سے لے کر موجودہ نظم گو شعرا کے کلام تک کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، تو ہم
ہر طرح کے کلام کے پچاس سے زاید ایسے نمونے ملیں گے جنہیں نہ "دھجیاں" کہا جا سکتا ہے، نہ "پرزے" اور نہ محض "مشق"۔

اس مضمون میں ہمیں مخمسات کی چند مثالیں پیش کرنا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ولی دکنی ہی کے ایک مخمس سے اس کی ابتدا
کی جائے:-

ولی دکنی :-

گلشن میں میرے سینے کے صاحب جمال، چل
تجھ دل کے باغ میں تو اب اے نونہال، چل
مجھ طبع کے چمن میں لے رنگیں جمال، چل
میری نگہ کی رہ میں لے فرخندہ حال، چل
ہے روزِ عید آج، اے ابرو ہلال، چل

تجھ زلف مشکبو کی چلی باس گھر بہ گھر
اس بو سے آج مست ہے، کیا جن و کیا بشر
دل تجھ نگہہ کے دام میں ہے، بند سر بہ سر
تیری نگہہ کی دید کو اے نورِ ہر نظر
کیا مشک ہے، لے ملک ختن سے غزال چل

ہے سبزہ زارِ حسن، سراپا سوادِ ہند
نوجوں سے ہے بھرا ہوا سارا بلادِ ہند
عشاقِ باصفا کے ہے سینے میں یادِ ہند
دلبر کی زلف میں نظر آیا سوادِ ہند
اِس راہِ مارِ پیچ میں لے دل سنبھال، چل

بن تیرے دل کو آج نشاطِ طرب نہیں
دل بستگیٔ زلف تری بے سبب نہیں
کہتا ہوں حرفِ راست اگرچہ ادب نہیں
آیا ولی جو تیری طرف تو عجب نہیں
آتے ہیں تیرے کوچے میں اہلِ کمال، چل

میر تقی میر :-

اب میر تقی میر سے ایک ایسا مخمس سنیئے، جس کے جذبہ کی شدت پر عقیدت کی مہر لگی ہے:

یہ بات جھوٹ نہیں، صدق کی صفا کی قسم
ترے ہی لطف کا وابستہ ہوں وفا کی قسم
عبث جو قسمیں ہے دیوے تو مصطفےٰؐ کی قسم
جنابِ پاک بتولؑ و شہِ ولا کی قسم
قسم حسنؑ کی بہ حسینؑ ابن مرتضیٰ کی قسم

ترا ہوں خوار، تیری شان کی مجھے سوگند — مروں ہوں تجھ پہ تری جان کی مجھے سوگند
تجھی کو جپتا ہوں ایمان کی مجھے سوگند — یہی وظیفہ ہے، قرآن کی مجھے سوگند
تجھی سے بندگی رکھتا ہوں میں خدا کی قسم

ہے ہے مدِ نظر تیری زلف و کاکل و خال — پھرا کرے ہے مری آنکھوں میں تیری ہی چال
شبوں کو تیرا تصور، دنوں کو تیرا خیال — مریضِ دل ہوں بڑا، عابدین شاہدِ حال
اسی ستم زدہ بیمار و بے دوا کی قسم

تجھے میں دیکھ تماشے کا کیا رہیتا ہوں — خدا نے دی ہیں مجھے آنکھیں کیا میں اندھا ہوں
نصیب لطف نہ باقرؑ کا ہو جو جھوٹا ہوں — دو چار حشر میں آفت میں ہوں جو ایسا ہوں
امام پنجتن اس اپنے پیشوا کی قسم

جو زلف و مو ہو نظر میں تو صبح و شام کی سوں — پڑا ہو پانوں کہیں تو ترے خرام کی سوں
کلام ہو کسی سے تو مجھے کلام کی سوں — جو سات پانچ ہو جس میں چھٹے امام کی سوں
غبارِ رہ ہوں ترا اس کی خاکِ پا کی قسم

کرے ہے لطف جو ٹک تو بحال آتا ہوں — وگر نہ آپ سے میں لحظہ لحظہ جاتا ہوں
ترے ہی واسطے یہ غم یہ غصہ کھاتا ہوں — گواہ دعوے کا کاظم کو اپنے لاتا ہوں
سمجھ اس کو مان، تجھے اس کی ہے ولا کی قسم

گذرے دریوں تقی کا نقی کو ہوں مملوک — رکھوں ہوں عسکری کے لطف سے امید کوک
طریق سیدی ہادی کا رکھتا ہوں سلوک — جہاں کے لوگ ہیں مملوک، سامنے یہ پلوک
قسم جو کھائے تو ان چار بادشا کی قسم

نہ اپنی تیری بنی، ہر زماں بگڑتے رہے — گمانِ بد سے سدا روٹھتے ہی لڑتے رہے
سرشک آنکھوں سے جیسے ستارے جھڑتے رہے — شبوں کو عذر میں منت آکے پاؤں پڑتے رہے
لے جو ان کو یہی بیچ میں رہا کی قسم

گناہ پہنچے جو اثبات کو تو رکھیو معاف — کدورت اپنی عبث ایک بار کر یک صاف
یہ ایک رات کہاں تک بیانِ روزِ مصاف — نکال تیغ شتابی، نہیں یہ حرفِ گزاف
دِرنگ کیا ہے مگر کھائی ہے خدا کی قسم

بقائے عمر ہزاروں طرح سے سہتا ہوں — گدازِ غم سے ہوں سب آنسوؤں میں بہتا ہوں
ہوئے ہیں برسوں کہ چپکا ہی بیٹھ رہتا ہوں — کہو ہو یہ تو کہو خواہش اپنی کہتا ہوں
ابھی تو کھائی تھی اظہارِ مدعا کی قسم

سرشک نیر میں جس جانے تک نگہ جاوے — تمام پانی ہو دل کاش اس کا یہ جاوے
تو مجھ آئینہ ہو وہ جفائیں سب جاوے — کہاں تلک ترا منہ دیکھ دیکھ رہ جاوے

کچھ اس کے منہ سے حیا کر، تجھے حیا کی قسم!

مرزا رفیع سودا

سودا نے مختلف اصناف سخن مخمس کی صورت میں کہے ہیں ہجو، مرثیہ اور شہر آشوب۔ آخر الذکر کے چند بند سنئے اور ملاحظہ کیجئے کہ وہ آج کل کے حالات پر بھی کس قدر منطبق ہوتا ہے۔

کہا یہ آج میں سودا سے، کیوں تو ڈانوا ڈول   پھرے ہے، جا کہیں نوکر ہو، لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول   کہ میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری ملتی ہے ڈھیریوں یا تول؟

سپاہی رکھتے ہیں نوکر امیر دولت مند   سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند   جو ایک شخص تھا بائیس صوبوں کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

وہ نوکر اب جسے آقا ہر آن پہچانے   جو پوچھو اس سے کہ تم کچھ روپے لگے پانے
کہے ہے آہ وہ بھر کر سوائے آٹھ آنے   روپے کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
کہ اس زمانے میں چپٹا بنے ہے وہ یا گول

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز   تو اس کو سن کے کریں ہوش جغد کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز   کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم   نہ جانے کس نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اگی ہے زقوم   مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول   وہ برقع سر پہ ہے جن کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول   اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجیے مول"

بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں   وہ دل نہیں ہے کہ اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پر آب نہیں   سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ہے اک طرح کا زیادہ نہ بول!

نظیر اکبرآبادی

اب اپنے درویش شاعر نظیر سے "دور مفلسی" کے چند بند سنئے۔

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی   کوٹھے کی چھت نہیں، یہ چھائی ہے مفلسی

دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

دنیا میں اب قدیم سے ہے زر کا بندوبست
اور بے زری میں گھر کا نہ باہر کا بندوبست
آقا کا انتظام نہ نوکر کا بندوبست
مفلس میں جو مفلسی میں کرے گھر کا بندوبست
مکڑی کے تار کا ہے وہ نا استوار بند

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ ور ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشہ والوں کا ہے کاروبار بند

محنت سے ہاتھ پاؤں کی کوڑی نہ ہاتھ آئے
بے کار کب تلک کوئی قرض و ادھار کھائے
دیکھوں جسے وہ کرتا ہے رو رو کے ہائے وائے
آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دشمن کا بھی خدا نہ کرے کاروبار بند

ممکن ہے کہ آپ اساتذہ قدیم کے کلام سے زیادہ لطف نہ لے سکے ہوں۔ حالانکہ ان کے کلام سے ان کے عہد کے معاشرتی حالات، سماجی زندگی، ملازمت کے حصول میں مشکلات اور عام مفلسی اور غربت اور پریشان حالی پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے اکثر آلام ہمارے زمانے میں بھی موجود ہیں گو نظام سیاست بالکل بدل گیا ہے۔ پہلے ہم فرنگیوں کے محکوم تھے، آج ہم آزاد ہیں، خود مختار ہیں، آپ اپنے حاکم اور آپ اپنے محکوم۔ پھر بھی زبوں حالی میں کوئی خاص تغیر نہیں۔ آج بھی ہم پہلے ہی کی طرح مفلس و قلاش ہیں۔ آج بھی گرانی نے ہماری کمر توڑ رکھی ہے۔ آج بھی ہمارے دست کار بیکار ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ، ہمارے گریجویٹ، ہمارے انجینیر بے روزگاری کا شکار ہیں۔

یہ تو جملۂ معترضہ تھا اس مضمون میں اس موضوع پر گفتگو کا محل نہیں اس لئے اب علامہ اقبال کا ایک مخمس ملاحظہ کیجئے

"آدم کا استقبال"

ڈاکٹر محمد اقبال

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

جوش ملسیانی:-

صبوحی کش ہوائے ساغر و مینا میں رہتا ہے
فرشتہ نور بن کر عالمِ بالا میں رہتا ہے
کوئی دوزخ میں، کوئی جنت الماویٰ میں رہتا ہے
نہ گلشن ہی میں رہتا ہے، نہ وہ صحرا میں رہتا ہے
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

کبھی روتے ہوئے ہنگامۂ پر جوش ہو جانا
کبھی سازِ شکستہ کی طرح خاموش ہو جانا
کبھی بیگانۂ صورت سے بھی ہم آغوش ہو جانا
کبھی اپنی نظر سے آپ ہی روپوش ہو جانا
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ خندہ زن ہے عقل و حکمت پر جنوں اس کا
کوئی خمخانۂ معنی ہے جامِ واژگوں اس کا
زمانے بھر میں ہلچل ڈالنے والا سکوں اس کا
لگا دے آگ ہفت افلاک میں سوزِ دروں اس کا
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

چمن کو، شہر کو، بستی کو، ویرانہ سمجھ لینا
بیانِ جنت و دوزخ کو افسانہ سمجھ لینا
خوشی کی عیش کی محفل کو غم خانہ سمجھ لینا
غرورِ ہوش سے دنیا کو بیگانہ سمجھ لینا
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ اس کی چشمِ تر کے آنسو مسکراتے ہیں
ہمیشہ اس کے نالے نغمۂ شیریں سناتے ہیں
ہمیشہ اس کے تقویٰ کی قسم میخوار کھاتے ہیں
ہمیشہ اس کی مے نوشی سے تا شب فیض پاتے ہیں
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

جہانِ رنگ و بو کو دخل کیا اس کی طبیعت میں
جگہ پاتی نہیں جنت بھی اس کے باغِ فطرت میں
نیا سودائی شورش ہے اس کے جوشِ الفت میں
وہ اس دنیا کی حسرت میں نہ اس دنیا کی ... میں

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

نظر کے سامنے جو کچھ ہے اس کے ماسوا سمجھے   حرم کو بتکدے کو وہ کسی کا نقش پا سمجھے

جسے ہم انتہا کہتے ہیں اس کو ابتدا سمجھے   کوئی یہ بھید کیا جانے، کوئی یہ راز کیا سمجھے

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

میکش اکبرآبادی ؎

(۱) "کرشمۂ دل"

بغیر وعدہ نگاہوں میں انتظار لئے   ادا میں کشمکش جبر و اختیار لئے

رباب و جام و شب ماہ و آبشار لئے   مزاج شاعر و طبع شرر بکنار لئے

وہ آرہا ہے مری سمت کوئی نامعلوم

وہ چال جس میں ہے لغزش بھی ہوشیاری بھی   وہ آنکھ جس میں ہے جرأت بھی شرمساری بھی

وہ فکر جس میں ہے دانش بھی خام کاری بھی   وہ ذوق جس میں ہے تقویٰ بھی میگساری بھی

وہ حسن جس میں ہے پوشیدہ عشق کا مفہوم

اگرچہ ہوگئی کچھ کم مرے چراغ کی لو   اگرچہ ہوگئی مدھم مرے شباب کی ضو

اگرچہ سست ہوئی جذب و انجذاب کی رو   اگرچہ پڑنے لگا دل پہ عقل کا پرتو

مگر اسے مرا احوال کچھ نہیں معلوم

یقین کی ضو مرے وہم و گماں پہ چھا ہی گئی   شمیم اس کی مرے پیرہن میں آ ہی گئی

مرے حواس پہ چھائی مجھے ستا ہی گئی   وہ پاس آ کے مری روح میں سما ہی گئی

زہے کرشمۂ دل، آ گیا اب مرا مقسوم

(۴) "جبر آرزو"

تیری تاب حسن سے ہر ایک دل معمور ہے   درد میں بھی لذتیں ہیں، ظلمتوں میں نور ہے

مجھ کو اپنا داغ محرومی، چراغ طور ہے   جو نظر سے دور ہے، وہ میرے دل کے دور ہے

پھر بھی تیری آرزو پر دل مرا مجبور ہے

مجھ کو دنیا میں ہر اک ذرہ مقام غور ہے   عقل ہے تو تخا ہے ... ہے او قلب جو ہے

ہاں مرے ساز جنوں کا نغمہ ہی کچھ اور ہے   بے نیاز بادۂ و خم بے خودی کا دور ہے

پھر بھی تیری آرزو پر مرا دل مجبور ہے

میں خروش نیستاں ہوں تو ہے کلیوں کی مہک   تو نسیم نرم رو ہے، میں ہوں شعلوں کی لپک

میں ہوں بادِ تند و صرصر، تو ہے پھولوں کی مہک   میں شعاع آفتاب اور تو ہے جگنو کی چمک

پھر بھی تیری آرزو پر دل مرا مجبور ہے

دے چکا مجھ کو زمانہ درسِ ہستی و عدم
گر گئے میزاں سے میرے سنگہائے کیف و کم
بار ہے میرے سکونِ قلب پر شادی و غم
چھوڑ آئیں میری راہیں منزلِ دیر و حرم
پھر بھی تیری آرزو پر دل میرا مجبور ہے

جوش ملیح آبادی ۔

وہ آرہا ہے واپس

وہ اک جلوس نکلا، گردوں وہ مسکراتا
وہ سرخ آنچلوں کا پھیلا زمیں پہ سایا
وہ شبنمی افق پر رنگیں غبار چھایا
پھر اوج کہکشاں نے بھولا ہوا ترانا
وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

ظلمت پہ وہ گلابی چادر سی تن رہی ہے
سینے سے زندگی کے اک لو سی چھن رہی ہے
کہسار پہ ایک رنگیں عورت سی بن رہی ہے
"ہر ی زندز مشرق شمعِ سحر زبانہ"
وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

میرے وہ آسماں سے در آئے عہدِ روشن
مثلِ شباب اترا گردوں سے نورِ گلشن
وہ حافظے پہ دوڑا یادوں کا رنگ و روغن
وہ پشتِ شب پہ بولا ماضی کا تازیانہ
وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

دھندلی فضا میں دمکی وہ مشعلِ فروزاں
رخشاں ہیں جوئے گیسو، گیسو میں روئے تاباں
اٹھنے لگیں نقابیں اڑنے لگے گلستاں
افسانوں میں ہے افسوں، افسوں میں ہے فسانہ
وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

ہنس کر وہ آنکھ کھولی افسانہ خوانیوں نے
وہ شوخ و شنگ و شیریں شاداں جوانیوں نے
پچکاریاں اٹھا لیں رنگوں کی رانیوں نے
سرخ انکھڑیوں کو مل کر کھولا شراب خانہ
وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

پلٹے وہ مست لمحے، گل رنگ، سبز دھانی
چھٹکی دیارِ جاں میں وہ چاندنی سہانی
چہکیں وہ آرزوئیں، لہکی وہ نوجوانی
وہ چاندنی میں ابھرا پھولوں کا شامیانہ
وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

وہ پر شکستہ راتیں ہونے لگیں پر رخشاں
ذرے بنے ستارے کانٹے بنے گلستاں
کھلائے ولولوں کے سینے ہوئے فروزاں
کھولا وہ آنسوؤں نے شبنم کا کارخانہ
وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

دوشِ ہوا پہ چمکے مکھڑے وہ گورے گورے
سرشار انکھڑیوں میں دمکے وہ سرخ ڈورے
انگڑائیاں وہ ٹوٹیں وہ بھر گئے کٹورے
ڈوروں کی سرخیوں سے چھلکی مئے شبانہ

وہ آرہا ہے واپس گذرا ہوا زمانہ

جمیل مظہری

مخمس

فنا نے چاہیۓ اس چشم سحر فن کے لئے　　غرور خود گری و ناز خود شکن کے لئے
کرے جو خوں سے فراہم نمو چمن کے لئے　　دلوں میں سوز بھرے گرمیٔ سخن کے لئے
ہزار شمع جلائے اک انجمن کے لئے

بنوائے جلوہ گری خود ہے اس کا افسانہ　　ضمیر عشق میں ڈالی بنائے بت خانہ
لباس گل میں کیا بلبلوں کو دیوانہ　　ہوا جو پیش نظر امتحان پروانہ
تو اس غریب نے سجدے چراغ بن کیلئے

اسی جو سینۂ فطرت سے موج وجدانی　　ملی خلش کو حلاوت تپش کو تابانی
ظہور حسن نے کی ہر طرف درخشانی　　نظر جو آئی اجالے میں اپنی عریانی
حقیقتیں ہوئیں بے تاب پیرہن کے لئے

جنوں و عقل میں اس سلسلے سے راز و نیاز　　حقیقتیں اسی رشتے سے رشتہ دار مجاز
ہو تیرے کاکل پیر پیچ و خم کی عمر دراز　　کہ بین وو ہر کی قید دل سے اے مدبر ناز
چھڑائے جاتے ہیں دیوانے اس رسن کے لئے

یہ آشیاں کے ہیں شعلے کہ میری روح کے خار　　یہ سرخ پھول ہیں یا زخم سینۂ گلزار
جلا جو میرا نشیمن تو میں ہوں شکر گذار　　کچھ اور تیز کر اس آنچ کو ہوائے بہار
کہ آگ چاہیئے تھوڑی سی اس چمن کے لئے

بتوں کا عشق ہو یا ہو خدا کی یاد جمیل　　ہے عارضی ترا ہر جوش اعتقاد جمیل
یہ زندگی ہے عناصر کا اک فساد جمیل　　دماغ و دل میں نہ ہو جس کے اتحاد جمیل
وہ راہبر کے لئے ہے نہ راہزن کے لئے!

نند نرائن ملاّ

"ترانۂ گنہگار"

فطرت ناشکیب ہوں، خاطر بیقرار ہوں　　روح پُر اضطراب ہوں، دیدۂ اشکبار ہوں
کشتۂ آرزو ہوں میں، محو تلاش یار ہوں　　سینۂ ریش ریش ہوں دامن تار تار ہوں
روز ازل سے طالب جلوہ آشکار ہوں

میں ہوں شعلۂ جستجو تاب دوام مجھ سے ہے　　خندۂ صبح مجھ سے ہے گریۂ شام مجھ سے ہے

محفلِ روزگار کا حسنِ نظام مجھ سے ہے
لطفِ صراحی و مے و شیشہ و جام مجھ سے ہے
میکدۂ حیات میں کیفیتِ خمار ہوں

اہلِ طرب کے واسطے بزم نشاط خیز ہوں
طالبِ زخم کے لئے معرکہ دستیز ہوں
میں ہوں کسی شرر فشاں اور کبھی مشک بیز ہوں
گاہ میں فتنہ خیز ہوں، گاہ میں نغمہ ریز ہوں
سیلِ رواں ہوں دشت میں باغ میں جوئے بار ہوں

مجھ کو دیر سے غرض اور نہ کچھ حرم سے کار
میری حیات سے مراد ایک ہے، بس تلاشِ یار
میری امید و بیم کا اپنے ہی دل پہ ہے مدار
میں ہوں نہ طالبِ بہشت اور نہ خائفِ مزار
بوجھ ہوں خاک ہی کا میں اور نہ فلک کا بار ہوں

میری نظر نہ سیج ہے۔ میرا خیال ہے بلند
خاطرِ ناصبور کے خوفِ ل ناپسند
گوشۂ چشم میں نہاں صورتِ اشک تابچند
چڑھ کے مژہ پہ ایک بار دیکھوں سب کشاد و بند
یا تو سپردِ خاک ہوں، یا دُرِ شاہوار ہوں

مجھ میں نہاں ترا وجود، مجھ سے عیاں ترا ظہور
عکس سیاہ میں ترا، تو ہے مرا جمالِ نور
میری نظر پہ کس لئے ہے یہ حجاب تیرہ و دُور
ایک نہ ایک روز میں اس کو اٹھاؤں گا ضرور!
چشم بہ آرزو و پس پردۂ انتظار ہوں

ختم بس اک اذان پہ، ہمت بال و پر نہیں
موت میری حیات کا خاتمۂ سفر نہیں
نورِ سحر کو ظلمتِ شام سے کچھ خطر نہیں
میری فنا فنا نہیں ہے، مجھکو خزاں کا ڈر نہیں
"گلشنِ کائنات میں قافلۂ بہار ہوں"

مجھ کو ہے دل سے ڈر یہی شوقِ وصال دیکھکر
تاب نہ لا سکے گا یہ شکلِ خیال دیکھ کر
میری شکست تو ہے ضرور، نورِ جمال دیکھ کر
آپ لرز رہا ہوں میں اپنا مآل دیکھ کر
ابرِ سیاہ کی مثال بر سرِ کوہسار ہوں

مجھ کو نہیں خطا کی شرم سامنے میرے لئے خدا
میں ہوں تیری شبیہ ایک، اس کو بگاڑ کیا بنا
میرے لئے یہ ننگ ہے ڈھونڈھوں کسی کا آسرا
میں ہوں نہ پیر و شیخ اور نہ مریدِ مصطفےٰ
اپنے ہی دوش پر لئے اپنی خطا کا بار ہوں

لذتِ درد کون دے لطفِ وصال کے لئے
میں نے تو چھوڑ دی بہشت تابِ خیال کے لئے
روح میری ہے مضطرب اپنے جمال کے لئے
جلوۂ رو جہاں ہے کم، چشمِ سوال کے لئے
آرزوئے کلیم کی دہر میں یادگار ہوں

نقش بر آب ہوں مگر عشق کا راز دار ہوں
ہوں تو ذرا سی مشتِ خاک، برق سے ہم کنار ہوں
تو کبھی بجھا نہ پائے گا جس کو میں وہ شرار ہوں
ہستیِ بے ثبات ہوں، جلوۂ پائیدار ہوں
جس میں ہے شانِ کردگار میں وہ گناہگار ہوں

وحید اختر

داد گر کون ہے؟

ایک نظم نما مخمس

اک طرف محفلِ غنچہ دہناں، گل بدناں، سیم تناں
سرِ رہ بارِ صفِ کج کلہاں، مجھے زر پیشہ تہاں
اک طرف قصۂ ہجراں زدگاں، چاک دلاں، نوحہ گراں
سرِ بازار جنوں ہے، ہدفِ خندۂ طفلانِ جہاں
کس کا افسانہ لکھیں، مدح کریں؟

مسندِ عدل پہ ہیں تیرہ دلاں، حق کی طرف شعلہ فشاں
یا بہ زنجیر تقاضائے قلم، روشنیٔ ذہن ہے یاں
جن کی نظروں میں خطا حق طلبی، سب تنگ نظراں
طوقِ زریں ہمہ دم گردنِ مقصد پہ گراں
کس کا افسانہ لکھیں، مدح کریں؟

ان سے تقسیمِ مناسب کا گلہ ہو تو گنہگار بنیں
ہونٹ سی لیں تو ضرورت کا یہ اعلان کہ زیاں کار ہیں
ان کی تعریف پہ خود اپنی ہی نظروں میں سزاوار ہیں
ان سے پوچھیں کہ اصول آپ کا کیا ہے، تو خطاکار ہیں
ہم نوا کس کے بنیں، کس کی سنیں؟

کچھ اگر کہئے تو اندیشۂ بشکستگیٔ رشتۂ جاں
مانعِ بزم نشینی ہے نگاہِ غضبِ ہم قفساں
چپ اگر رہیے تو جو دل میں ہے، اس حق کا زیاں
دعوتِ دشت نوردی ہے، ہوائے طرفِ کوئے بتاں
ہم نوا کس کے بنیں، کس کی سنیں؟

ترکِ گلشن پہ بہ گل چینوں کا فرمان کہ آگے ہے خزاں
ہم نشینی پہ ہیں گلہائے تر و غنچۂ نو طنز کناں
ان کے منہ کون لگے، ہیں وہی محبوبِ دلِ تنگ دلاں
شکر کیجئے کہ گلہ، وہ تو سمجھتے ہی نہیں اپنی زباں
داد گر کون ہے ہم کس سے کہیں؟

فن کی ہو دولتِ بیدار کہ ہو دل کی گراں مایہ زکاں
سنگ ریزوں کی تجارت میں بھلا ان کا خریدار کہاں
شعر ہے خونِ جگر، مشغلۂ خود کشیٔ دیدہ وراں
دوش پر لادے ہوئے ہیں محبتِ ظلم کا اک بارِ گراں
داد گر کوئی ہے، ہم کس سے کہیں؟

قارئین نے قدیم اور جدید سے جدید شعرا کے نمونے آپ نے ملاحظہ کر لئے۔ اگر جذبہ کی شدت، مضامین کی بلاغت، زبان و بیان کی فصاحت، تشبیہات و استعارات کی ندرت، الفاظ کا انتخاب و نشست، حسین خیال کو حسین ترین جامہ پہنانا، حقیقت نگاری و شعری صداقت اور کلام میں

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

شیخ حبیب اللہ

مولانا آزاد کی شاعری

شاخسار نے مولانا کی یاد تازہ کر دی جسے جانے کیوں دنیا انہیں بڑی تیزی سے بھولتی جا رہی ہے۔ افسوس مولانا پر ریسرچ ہو ہی نہیں رہا ہے۔ ترجمان القرآن جلد دوم میں مرحوم نے البیان اور مقدمے کا بار بار ذکر کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کتابیں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں۔ ترجمہ بھی نامکمل ہے۔ جب کہ البیان اور مقدمہ مدون ہو چکے تھے تو ترجمہ بھی مزید مکمل ہو چکا ہوگا۔ مولانا قلم دان وزارت سنبھالنے کے بعد شاید ان کی اشاعت کی طرف متوجہ ہو نہ سکے اور مسودات یوں ہی پڑے رہ گئے۔ آخر یہ مسودات گئے کہاں؟ کیا مولانا نے علمار دین کی نکتہ چینیوں کی یلغار سے تنگ آ کر انہیں تلف کر دیا؟ کوئی بھی اہل قلم اس کی تفتیش پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ مولانا اجمل خان صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا نے قرآن پر بے شمار نوٹ چھوڑے ہیں اور ترجمان کی طباعت ثانی میں شامل کر دیئے جائیں گے۔ مگر اب تک یہ کام بھی نہیں ہو سکا مولانا نے کوئی اور ایسی تصنیف بھی نہیں چھوڑی ہے کہ بقائے دوام کی ضامن ہو۔ مولانا آزاد کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ ان کی تصنیفات کا نچوڑ تالیف کر لیا جائے۔

بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ مولانا نے شاعری بھی کی ہے اس سے پہلے کہ مولانا کی شاعری کی بابت باتیں کی جائیں۔ بہتر ہے کہ مولانا کی آخری وصیت ملت کے نام سے کچھ اقتباس پیش کیا جائے جو ۱۹۴۷ء میں مولانا نے قوم کو دی تھی۔

..... تم زلزلوں سے ڈرتے ہو؟ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو؟ کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود تھا یہ ہاتھوں کے پانی کی سیل کیا ہے؟ کہ تم نے بھیگ جانے سے اپنے پائینچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے سمندروں میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا آئیں تو ان پر مسکرا دیئے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب اٹھی تو رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے شہنشاہوں کے گریبانوں کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے چودہ سو برس پہلے کا نسخہ ہے وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا۔ اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان۔ لا تھنو ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش سے اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تم کو خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمال صالح کی نقدی پر دست یاب ہو سکتی ہے۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہٗ۔

زباں ز نطق فرو ماند و راز من باقی است
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی است

بن۔ اس کے بعد یہ بقعۂ نور ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو
یہ ہے مولانا کی نصیحت۔ اس کی ہدایت جو خطیب اعظم تھا جس
فراموش کر چکے ہیں۔

مولانا محض مفسر قرآن ہی نہیں تھے بلکہ جید ادیب اور شاعر
تھے مولانا حسرت لکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کسی زمانے میں شعر بھی کہتے تھے۔ اور
مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے بعض لوگوں کی زبانی
سنا ہے کہ آج سے تیس پنتیس سال پہلے کے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں جو
مشاعرے ہوتے تھے ان میں وہ ہمیشہ طرح پر غزل کہہ کر لاتے تھے اور
پڑھ کر سناتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر مولانا کے مندرجہ
اشعار پیش کرتے ہیں

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشہ ہے یہاں
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

کلیوں میں اہتزاز ہے پرواز حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو مرغی کے خون سے

مولانا آزاد خود لکھتے ہیں۔ اگر مرغی کی جگہ بلبل کر دیجئے تو
... بندوں کی طرح اچھا خاصا شعر بن جائے گا۔

اے ساقی مست، عشق مستم
مئے دہ مے دہ کہ مے پرستم

ساقی در دست تو چیز است
ساقی ساقی بگو چہ چیز است

ای پیر مغاں نیک فرجام
کایں بادہ ز شیشہ ریخت جام

ایں بادۂ ناب و حال آزاد
یعنی خانہ خراب و آباد

پروفیسر عبدالغفار شکیل لکھتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا کے سلسلے
میں جو یادگار ہمارے سامنے آتی ہے وہ چند رباعیاں ہیں۔

سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں
صحبت دن رات ہے ... (؟)

ہم کو نہیں اعتبار جو چاہو کہو
عاشق سے وہ منہ لگائے یہ باتیں ہیں

آفت ہے قصۂ جوانی میرا
ظاہر ہے حال نوحہ خوانی مرا
اک جان بچاؤں کس طرح میں آزاد
دل کا دشمن ہے یار جانی مرا

غزل

کیوں اسیر گیسوئے خم دار قاتل ہو گیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہو گیا

کوئی نالاں، کوئی گریاں کوئی بسمل ہو گیا
اس کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہو گیا

انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں
نور آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہو گیا

اس نے تلواریں لگائیں اسپر کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدائے دست قاتل ہو گیا

یہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمند زلف کا
لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہو گیا

پروفیسر عبدالغفار لکھتے ہیں
مولانا رانچی میں نظر بند تھے پانچ سال کے بعد ان کی رہائی ہوئی
کے احکام صادر ہوئے۔ مولانا نے داروغہ سے کہا۔ جیل سے رہائی اتنی
جلد۔ نہیں بھائی یہ بات ٹھیک نہیں۔ مجھے ایک دن کی مہلت اور دو
جیل کے بام و در سے میری آنکھیں آشنا ہو چکیں ہیں۔ ان سے آخری
بار رخصت تو ہو لوں۔ جیل کی فصیلوں، جیل کی سلاخوں اور جیل کے
ساتھیوں کو الوداع کہنا ہے۔ اس موقع پر مولانا نے یہ شعر کہا۔

قصد کرتا ہوں جو اس جا سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ تو جا نہیں میں جانے کا

ایک جلسہ میں کئی لوگ جمع تھے۔ مولانا نے ... کیا۔ ...

محمود بالیسری

بنگال کا باغی شاعر قاضی نذر الاسلام

تاریخ میں پہلی جنگ عظیم کے نتائج بڑی اہمیت کے حامل ہیں، پہلی جنگ عظیم نے ساری دنیا کو نئے ذہنی انقلابات سے روشناس کرایا۔ روس کا انقلاب پہلی جنگ عظیم کا ایک اہم نتیجہ تھا جس سے دنیا میں پہلی بار مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کی شاندار فتح ہوئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں مغرب کے سرمایہ دار ممالک مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ کی تجارتی منڈیوں کو حاصل کرنے کے لئے اور اپنی نوآبادیاتی نظام کو استوار کرنے کے لئے آپس میں لڑ بیٹھے۔ ان کے باہمی جھگڑوں سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ نوآبادیوں کے مظلوم عوام کو منظم ہونے اور اپنے مفاد کے لئے جدوجہد کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ جنگ کے خاتمے پر روس میں شاندار انقلاب رونما ہوا۔ اب سرمایہ دار ممالک کو احساس ہونے لگا کہ ان کے ہاتھوں سے زمین کا ایک حصہ نکل گیا ہے اور دوسرے حصے بھی نکلنے والے ہیں۔ اب تک نوآبادیوں کے عوام نے مغرب کی اس مصنوعی دل کشی کو دیکھا تھا جسے ان پر رعب جمانے کے لئے بے تاج کے تاجداروں نے نوآبادیوں میں رائج کر رکھا تھا۔ مظلوم انسان اپنے آقاؤں کے دیش کی بدحالی کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم نے یورپ کے آقاؤں کے اس راز کو فاش کر دیا۔ نوآبادیوں کے مظلوم انسان سپاہی کی حیثیت سے آپ نے آقاؤں کے مفاد کی خاطر مغرب و مشرق کے مورچوں پر گئے اور اس طرح انہیں آقاؤں کے دیش کے عوام کی حالت معلوم ہوئی۔ انہیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ مغرب کی چمک دمک صرف دور کا بہتر ہے ورنہ وہاں بھی غربت ہے مظلوم وہاں بھی کسمپرسی کی زندگی [illegible] نظام حکومت سے

نالاں ہیں۔ اس طرح پہلی جنگ عظیم مغرب اور مشرق کے مظلوم انسانوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن گئی۔ آپس کے میل ملاپ سے یہ لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے لگے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام سے متنفر ہونے لگے۔ ان کے ذہن میں اپنے آقاؤں کے بنائے ہوئے ہتھکڑیوں کو توڑ کر آزاد ہونے کی لگن جاگ اٹھی۔ ان کے دل و جگر میں آگ سی سلگنے لگی۔ یہ ذہنی انقلابات ہیں پہلی جنگ عظیم کے تحفے جنہیں سپاہی اپنے ساتھ لے کر وطن لوٹے۔ ان سپاہیوں میں بنگال کا باغی شاعر نذر الاسلام بھی تھا۔

۲۱ سالہ نوجوان حوالدار نذر الاسلام جنگ کے خاتمے پر ہندستان واپس آیا تو اپنے ساتھ چند نظموں کا ایک مسودہ بھی جو میدان جنگ میں لکھ پایا تھا، لایا۔ یہ مسودہ "اگنی بینا" کے نام سے جب شائع ہوا تو بنگال کے رومان پرور فضا میں ایک ہیجان سی پیدا ہو گئی۔ سویا ہوا بنگال پھر سے جاگ اٹھا۔ بنگال کے رگ و ریشہ میں نیا خون دوڑنے لگا۔ اس سے پیشتر یہ معلوم نہیں تھا کہ بنگلہ زبان کا نسوانی لہجہ بھی رزمیہ شاعری کی صلاحیت رکھتی ہے۔ "اگنی بینا" کی دو نظمیں "اگونی" (آگ) اور "بدروہی" (باغی) ایسی ہیں جنہوں نے بنگلہ ادب کی قدریں بدل ڈالیں۔ بنگلہ ادب دو اسکولوں میں بٹ گیا، ایک ٹیگور کا اسکول اور دوسرا نذر الاسلام کا اسکول۔ دونوں کی فکر بالکل جدا جدا تھیں۔ ٹیگور کے آہنگ اور ساز میں نرمی و دلکشی تھی۔ نذر الاسلام کی طرز فکر میں کوئی فلسفہ نہ تھا۔ وہ عوامی [illegible] تھا۔ اس کی شاعری میں انسان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں۔ بنگلہ [illegible] میں یہ ایک نیا آہنگ تھا۔ نظم بدروہی کا اسلوب بھی بالکل

تھا جو اس سے پہلے بنگلہ زبان میں نہیں ملتا۔ بنگلہ ادب کو ایک خوبصورت موڑ مل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیگور سا سکول کانپ اٹھا مگر خود ٹیگور نے خوش آمدید کہا۔

آئے چوے آئے کرے دھوم کیتو
آندھارے باندھ اگنی سیتو

نظم "بلبلہ ہی" کو پڑھ کر پروفیسر بنے کمار سرکار نے لکھا ہے۔
"بنگلہ ادب میں ہم گذشتہ دس سال سے جس انقلاب کی آس لگائے بیٹھے تھے آج اس کا آغاز ہو گیا ہے۔"

پھر بھی نذر الاسلام کو ٹیگور کے ہمنواؤں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ نذر الاسلام جس وقت صرف تُک بندی کر رہا تھا اس وقت ٹیگور کو نوبل پرائز مل چکا تھا۔ وہ بیکراں شہرت کا مالک بن چکا تھا۔ ان کے ہمنواؤں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیگور کا آفتاب اتنی بلندی پر پہنچ گیا تھا کہ اس کی طرف کیا مجال ہے کہ کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ ایسی حالت میں بھی نذر الاسلام اپنے اصول اور عقیدہ پر جما رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت ہی کم عمری میں نذر الاسلام بنگال کا مقبول ترین شاعر مانا گیا تھا۔

نذر الاسلام کے لئے ۱۹۲۶ء کا سال بڑا ہی منحوس ثابت ہوا۔ اس کے مشفق سی۔ آر۔ داس کا انتقال ہو گیا۔ انقلابی نظموں کی اشاعت کی وجہ سے حکومت نے اس کی چھوٹی سی پنشن بند کر دی۔ حکومت نے اس کی نظموں کے مجموعے ضبط کرنے شروع کر دیئے۔ اس کو جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ ان دنوں نذر الاسلام نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی جس کی وجہ سے فرقہ پرست عناصر اس کی جان لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولویوں نے کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ ان حالتوں کا نذر الاسلام نے خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ اس نے اپنی ایک نظم میں یہ سب باتیں کہی ہیں۔

"میں مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں بلکہ موجودہ دور کا شاعر ہوں۔ مجھ سے سب بدظن ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مجھے جیل کی ہوا کھانی چاہیئے۔ وہ میں سب لکھ سکتا ہوں۔ مجھ میں اسلام کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے مولوی مجھ سے بدظن ہیں۔ ہندو لڑکی سے شادی کرنے کی وجہ سے ہندو مجھے فرقہ پرست کہتے ہیں۔ عورتیں کہتی ہیں کہ میں دشمن نسواں ہوں۔ مرد کہتے ہیں کہ عورت پرست ہوں۔ غرض کہ مجھ پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کی مجھے پرواہ نہیں۔ میری تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ عوام کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں، میری تحریر ان کے لئے پیغام موت بن جائے۔"

نذر الاسلام کو زندگی میں کبھی سکون نصیب نہیں ہوا۔ اس نے ہمیشہ اضطراب کی زندگی بسر کی ہے۔ اس کا بچپن بھی سکون بخش نہیں تھا۔ وہ ۲۳ مئی ۱۸۹۹ء کو مغربی بنگال کے ضلع بردوان میں ایک غریب کسان کے گھر میں پیدا ہوا۔ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے وہ بچپن ہی سے محروم ہو گیا تھا۔ بچپن میں اس کو عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے گھر میں ملی۔ والدین کی وفات کے بعد وہ اپنے چچا کے پاس رہنے لگا۔ چچا نے رانی گنج کے ایک اسکول میں داخل کر دیا لیکن اسے اسکول کی پابند زندگی راس نہ آئی۔ اسے دن بھر شرارت اور کھیل کود سے سروکار تھا۔ امتحان کے پرچوں میں بھی سوالات کے جوابات کی جگہ نظمیں لکھ کر گھر واپس آ جاتا تھا۔ اس وقت سے لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ شریر لڑکا ایک دن بنگال کا عظیم شاعر بن جائے گا۔ نذر الاسلام بچپن ہی سے دیوانہ کی حیثیت سے مشہور تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس وقت اس کی عمر مشکل سے دس بارہ سال کی ہو گی۔ وہ گاؤں گاؤں اپنے ہمجولیوں کے ساتھ لوک گیتوں کی بانسری بجاتا پھرتا رہا۔ ان لوک گیتوں میں روایات، اساطیری کہانیاں، رسم اور رواج غرض کہ بنگال کا مکمل تمدن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا۔ یہ دور نذر الاسلام کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی دور میں وہ دوسروں کے لکھے ہوئے گیتوں کو گنگناتے خود گیت کار بن جاتا ہے اور اس کی شاعرانہ صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ کل کا دکھومیاں آج کا کیشب بن کر اپنے خود نوشتہ گیتوں کو شہر شہر اور گاؤں گاؤں گاتا پھرتا ہے اور ساتھ ہی اپنے لئے کچھ پیسے بھی کما تا ہے۔ اس کے گیتوں میں، اس کی غزلوں میں ڈبڈبائی ہوئی جھیل اور تالاب کی گہرائیاں ہیں۔ آبشار کے مقدس نغمے ہیں! پدما اور میگھنا کی چاندنی ہے۔ اس کے کلام میں موسیقی اور خیالات

میں حسن و عشق کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ نذرالاسلام نے صرف باغیانہ شاعری کی ہے۔ اس نے جہاں انقلابی شاعری کی ہے وہاں بہار آفریں گیت بھی گائے ہیں۔ اس نے گیتوں میں عورت کو اس قدر حسین پیکر کی حیثیت سے پیش کیا ہے کہ اجنتا کے بت بھی شرمسار ہیں۔ اس کی ایک نظم "سنگھار" کا ترجمہ ملاحظہ ہو جسے سلیم اللہ فہمی نے خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔

"میرے سپنوں کی رانی
تجھ کو سو جتن سے سجاؤں گا میں
پیار تا
تیرے جوڑے کی خاطر فلک سے کبھی
توڑ لاؤں گا تاروں کے میں پھول بھی
تیرے کانوں میں جھمکے پہنانے کو میں
چیت کے ماہ کا لہلہاتا مدھر
تیسری شب کا باریک نازک سا چندر
آسماں کی جبیں سے چرا لاؤں گا
میرے سپنوں کی رانی
چاندنی اور جیندن کو حل کر کے پھر
خاص ابٹن بناؤں گا تیرے لئے
جس سے ہوگی بدن کی مہک اور تیز
یہ جو قوس قزح سات رنگوں کی ہے
دیکھنا چھان کر اس کی سب سرخیاں
تیرے تلوؤں پہ لالی چڑھاؤں گا میں

نذرالاسلام کا گناہ بس اتنا ہے کہ وہ شاعر گل و بلبل سے باغی شاعر اس وقت بن گیا جب سرزمین بنگال ٹیگور کی لوریاں سن کر سو رہی تھی۔ ایسے وقت میں اس نے اپنی آتش نوائی سے پورے بنگال کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے پرانی روایتوں کو توڑ کر زندگی کے نغمے گائے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس کی شاعری میں شور ہے، طوفان اور طغیانی ہے اور حسن نہیں ہے۔ اس کی مشہور نظم "بدروہی" (باغی) میں جہاں جوش اور اضطراب ہے، طوفان اور برق ہے۔ وہیں حسن و عشق کی رعنائیاں بھی ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہو نظم (باغی) کے ترجمے کے دو ٹکڑے جنھیں یزدانی جالندھری لکھنوی نے بہت ہی خوب صورت پیرائے میں پیش کیا۔

جواں مرد! کہہ کہ میں ہوں سربلند
ہمالہ پہ پڑتی ہے میری کمند
ستاروں کا دامن کیا میں نے چاک
فراز فلک میرے قدموں کی خاک
جو میں عرش اعظم سے ٹکرا گیا
بہشت و جہنم کو لرزا گیا
ایک آئینۂ عزم و جرأت ہوں میں
جہاں کے لئے وجہ حیرت ہوں میں
جواں مرد! کہہ کہ میں ہوں سربلند

(یزدانی جالندھری)

اور

کبھی جسم دوشیزہ کی سنسنی
محبت کے بوسے نے دے کر جو لی
نظر بازیاں شاید شوخ کی
جو پردے سے جھانکے پھر آنکھیں چرائے
نہ دیکھا کہ دیکھا یہ الجھن رہے
کبھی کچھ کہے دل کبھی کچھ کہے
جتر اور جیت چور کا عشق ہوں
اسی کی مہکتی ہوئی سانس بھی
اسی کی ہوں چوڑی کی جھنکار جو
ہلا دیتی ہے دل کے ہر تار کو
وہ دیہاتی لڑکی وہ مست شباب
وہ رنگت تو ریتی کا ٹیکا شہاب
سمٹتی نہیں ہے کہ رکتی نہیں
جھجکتی نہیں ہے کہ جھکتی نہیں
سبھی کون سے ہیں جو کرتی نہیں

جوانی ہے دیتی دہائے کہیں
نچوڑ اس کی رعنائیوں کا ہوں میں
نکھار اس کی برنائیوں کا ہوں میں
جواں مرد کہسار میں ہوں سربلند
ہمیشہ رہے گا میرا سر بلند
(اثر لکھنوی)

کیا نذرالاسلام کی نظم 'بدروہی' (باغی) میں صرف شوریدہ شورش ہے؟ اور حسن نہیں ہے؟ باغی سے زیادہ زندہ دار مگر خوب صورت نظم بنگالی ادب میں بہت کم ملیں گے۔ بلا مبالغہ، 'باغی' کی عظمت ٹیگور کی 'آزادی' سے زیادہ بلند ہے۔ نذرالاسلام حسن و عشق کی زبان میں زندگی کے مقاصد، انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی شاعری شگفتگی کے ساتھ ساتھ اپنے وطن کی مٹی کی سوندھی مہک بھی ہے۔ شاعری حسن خیال کے ساتھ ساتھ حسن اظہار کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ اس کی شاعری میں تاثر اور گداز پایا جاتا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہے۔ اس کے پاس الفاظ کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے اور اس کی قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ آٹھ صفحے کی نظم 'جھڑ' (طوفان) تین گھنٹے میں لکھ ڈالی وہ بھی بخار کی حالت میں۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب تنقید نگاروں نے بھی جدید ہندوستانی ادب کے تین بڑے مفکر شاعروں میں نذرالاسلام کا بھی شمار کرنے لگے ہیں اور اس کے کلام کو پرکھنے لگے ہیں۔ ہندوستان کے تین مفکر شاعر ٹیگور، اقبال، اور نذرالاسلام تین مختلف رجحانوں کے شاعر تھے۔ اقبال اور نذرالاسلام دونوں حرکت اور عمل کے قائل تھے اور دونوں سرمایہ داری اور سامراجی نظام حیات کے دشمن تھے۔ ان دونوں نے ہندوستانی شاعری کو زندگی کے مقاصد سے مالا مال کیا۔ دونوں میں سیاسی اور سماجی شعور موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام سے الگ رہ کر شاعری نہ کر سکے۔ برخلاف اس کے ٹیگور کی شاعری میں ایک طرح کا جمود پایا جاتا ہے۔ اس میں سیاسی اور سماجی شعور بہت کم ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی بدنظمیوں سے تنگ ضرور ہے مگر وہ تشدد کی آواز بلند نہیں کرتا۔ وہ انقلاب کا نام تو ضرور لیتا تھا مگر انقلابی عناصر دیکھ کر سہم جاتا تھا۔ ان سب بدعنوانیوں اور تاریکیوں کے لئے کوئی راہ عمل تجویز نہیں کرتا بلکہ خاموش رہ کر ان سب کو خدا کے سپرد کر دیتا۔ یوں تو اس نے آزادی کے نغمے بھی گائے ہیں مگر اس نے اپنے ماحول کو بدلنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس کے یہاں ہر جگہ مادی دنیا سے گریز کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس کا دل بھی سرمایہ داری کے خلاف کڑھتا ہے مگر اس نظام کو بدل دینے کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ تاریکیوں کو دیکھ کر سہم ضرور جاتا ہے مگر اسے روشنی میں تبدیل کرنے کا خواہش مند نظر نہیں آتا۔ وہ ان تاریکیوں سے دور خود کو لے جانے کے لئے تصوف کا سہارا لیتا ہے اور عوام کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

مگر نذرالاسلام عوام سے الگ رہ کر خاموش اور بے کار زندگی بسر کرنے کا حامی نہیں ہے۔ اس کے لئے بنگال کی زبوں حالی اور غربت جتنی اہمیت رکھتی ہے اتنی ہی بنگال کی رومان پرور فضا۔ وہ ظلم و ستم اور حیوانیت پر طوفان بن کر جھپٹتا ہے اور ساتھ ہی اسے سکون کے لئے ایک کنواری دوشیزہ کی تلاش بھی رہتی ہے۔ تلاش اور جستجو ہی اس کا مدعا تھا۔ اسے ایک ایسے دل کی تلاش تھی جو اس کی محبت کو اور بڑھا دے۔ ایک ایسی محبوبہ کی جستجو تھی جو اس کے اندھیرے گھر کو اجالا کر دے۔ مگر اسے منزل نہ مل سکی۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ پرمیلا دیوی (اس کی دوسری بیوی) ہی اس کی محبوبہ تھی جس کے ملنے کے بعد اس کی تلاش و جستجو بھی ختم ہو گئی۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو کیونکہ پرمیلا دیوی سے اس کی محبت بے پناہ تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ زندگی کے دوسرے رخ کو پس پشت ڈال کر حسن و عشق کے چکر میں پھنس کر رہ گیا ہو۔ وہ کنواری لڑکیوں کے گلرنگ لب چومنے ہی کو زندگی کا نصب العین نہیں سمجھتا۔ اس کے رومان میں زندگی سے بے پناہ محبت کا سراغ ملتا ہے۔

وہ انسان کو جینے کا گر سکھاتا ہے۔ برخلاف اس کے ٹیگور موت کا استقبال بڑی خوشی سے کرتا ہے۔

وہ کہتا ہے -

"اے موت! میری موت، آ کے دن
میں تیری راہ دیکھتا ہوں"

اگرچہ نذرالاسلام بھی اسی بنگال کا شاعر ہے جس بنگال نے ٹیگور کو جنم دیا مگر دو مختلف ماحول نے ایک کو صوفی اور دوسرے کو باغی بنا دیا۔ ایک کو جذبۂ قرار بخشا تو دوسرے کو زندگی کے قریب لے آیا۔ ایک میں لوریاں گا کر سلا دینا چاہتا ہے تو دوسرا "بدروہی" جیسی نظم کی تخلیق کر کے ہمیں جدوجہد کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ ایک کی شاعری میں طمانیت اور سکون ہے تو دوسرے میں حرکت و عمل کی مہک ہے۔ نذرالاسلام جب رومان کی دنیا بساتا ہے تو اس کی رومانی تخلیقات میں زندگی کا حوصلہ کار فرما نظر آتا ہے اور جب انقلابی تصورات کو ساتھ لاتا ہے تو وہ زندگی کا رہنما اور پیشوا بن جاتا ہے۔ اس کے ندرتِ تخیل، آزادیٔ فکر اور لطافتِ زبان ایسی خوبیاں ہیں جنھیں ہندوستانی ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

بقیہ - مولانا آزاد کی شاعری

ملازم کے ایک سفید ریش بزرگ۔ زرنیک کھا دریائی سے بھرا گلاس لے کر مولانا کے سامنے آئے۔ مولانا نے ارتجالاً یہ مصرعہ کہا ؎

لے کے خود پیرِ مغاں ہاتھ میں مینا آیا

اس تقریب میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی شریک تھے۔
انھوں نے یہ مصرعہ سنتے ہی گرہ لگائی کہ ؎

مے کشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

اتنا ہی نہیں مولانا کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا اور اس فن کا علم بھی تھا۔ مولانا خود بھی ستار بجاتے تھے کیا خوب ہوتا اگر کوئی صاحبِ علم و نظر مولانا پر ریسرچ کرنے کی زحمت گوارا فرماتے تاکہ ہمیں بے شمار نوادرِ سربستہ سے فیض یاب ہونے کی خوش نصیبی حاصل ہوتی۔

بقیہ - نئی لڑکی

ان سے زیادہ بھاگنے کی خواہش میں ان ہی کی جانب ہیں۔"

"تو پھر؟"

میں نے اس سے طنزیہ ملامت سے پوچھا۔

"پھر کیا؟

بزنس مینگ نیٹ کو بیوی کی بجائے داشتہ بن کر رہتی ہے ـــ مجھ سے شادی کر لو اوام کہا، یہیوں نئے نئے سوداگر اپنے پاؤں چل کر تمہارا ـــ دونوں کا دروازہ کھٹکھٹانے آئیں گے ـــ"

"تڑ! ـــ تڑ" میں نے اسے زور سے تھپڑ لگائے۔

کیا یہ مجھے ایسی ویسی سمجھتا ہے ـــ؟ کیا مطلب ہے؟ ـــ میں ـــ م ـــ!

پر میں نے غصے سے سرخ ہو ہو کر سوچا، شادی بہرصورت ایک سہولت ہے۔ یوں بھی ساری عمر پڑا عزت سے ------!

بقیہ - چند اردو مخمسات

دلفریبی و دل نشینی کا موجود ہونا اعلیٰ شاعری کی خصوصیات ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کے مخمسات کو محض مشق "کہنا خود اپنی کم بضاعتی، کوتاہ بینی اور بد ذوقی کا پول کھولنا ہے۔ اہلِ نظر اور صاحبانِ بصیرت ان میں جن خوبیوں کو دیکھ لیتے ہیں وہ اگر مغرب زدہ آنکھوں کو نظر آتیں تو اس کے باعث ہم ان کی خوشی کے لئے ان نظموں کو نذرِ آتش دان تو نہیں کر سکتے!

سید امجد

ماجد الباقری کی غزلیں

تیاگ سے ـــــــ گیان تک

ماجد الباقری نے جس دور میں شاعری کی ابتدا کی وہ
ں کا دور نہ تھا۔ نظم کو علامہ اقبال نے جو موضوعاتی توانائی
ی تھی کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ ترقی پسندوں کو
یاری اور اشتراکی مینی فسٹو کی اشاعت و تبلیغ کے لئے
سے بہتر صنف نظر نہ آتی تھی۔ نظم کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ترقی
وں کے ہاتھوں نظم کی کیا درگت بنی یہ ایک الگ بحث
گر اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ غزل سے لوگوں کی توجہ ہٹتی چلی
ترقی پسندوں میں سے بعض نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر تحریک
ی وہ تر توجہ نظم ہی کی طرف رہی۔ بعد میں میراجی نے بھی
ہی کی طرف توجہ دی اور یوں غزل بتدریج روایتی اور
ہتی چلی گئی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اس دور کی غزل میں پرانی
ں ہی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ایک مشترکہ محبوب
کی امانت ہے اور غزل ایک ایسی کاک ٹیل لگتی ہے
میں کسی کی اپنی ذات یا انفرادیت محسوس نہیں ہوتی۔
دور کی غزل کسی سیاسی جماعت کے جلسے کی سی ہے کہ
ب مقرر ایک ہی نظریہ کو ایک ہی الفاظ میں بیان کرتے چلے
تے ہیں۔ ماجد الباقری بھی اسی مشترکہ پلیٹ فارم پہ ازدحام
م کورس گانے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ ان کی اس دور کی
ل میں انفرادیت کی تلاش خاصا مشکل کام ہے۔

ماجد الباقری کا یہ ابتدائی دور نئے قاری کیلئے اتنی جاذبیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس سے مجھے انکار نہیں کہ یہ دور ان کی فنی ریاضت کا حامل ضرور ہے۔ یہ وہ طلبہ ہے جس پر ماجد نے نئے دور کی تعمیر کی ہے۔ گوتم بدھ نے ایک عمر اپنے آبائی محل میں خوبصورت کنیزوں کے ساتھ عیش و عشرت میں گزاری تھی اور اس کے اسی دور کا ردعمل وہ عظیم جذبہ تھا جو اسے گیان کی راہ پر لے گیا۔ ماجد الباقری بھی اس پرانے ایوان کو تیاگ کر گیان کی اجنبی راہوں پہ گامزن ہوئے ہیں۔ ان کے دور کے بہت سے فنکار ابھی تک اسی پرانے زنگ آلود دریچے میں بیٹھے نئے دور کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر ماجد الباقری کی عظمت یہ ہے انہوں نے حساس فنکار کی طرح نئے تقاضوں کا احساس کر لیا ہے اور اس زنگ آلود پرانے دریچے سے اتر کر نئی زمین پر قدم جما رہے ہیں۔

نئی زمین اپنے تقاضوں کے ساتھ چکنی ہے۔ ہر شخص اس پر قدم جمانے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ نیچے پھسلن ہے اوپر سوا نیزے پہ سورج اور آج کا انسان وقت کے اس کربلا میں اپنی نئی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ آج کا شاعر خود کو ایسے صحرا میں محسوس کرتا ہے جو اندھی

اور گونگی آوازوں کا مسکن ہے ایک خلاء باہر ہے اور
ایک خلاء اندر۔ ماجد الباقری بھی خود کو دونوں خلاؤں کے
دوراہے پر محسوس کرتے ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ گونجتی بے صدا آوازیں
پل پل گزرتی زندگی کا کرب اندھی گونگی دیواروں کے کنوئیں
میں مقید ہونے کا احساس جہاں ہر شخص اپنی بے نور آنکھیں
اپنے ماتھے پر سجائے ایک دوسرے کا متلاشی ایک دوسرے
کے قریب سے گزر جاتا ہے۔ ماجد الباقری کا بنیادی
المیہ ہے ؎

ہر ایک ذہن میں اپنے ہی قید ہے ماجد
فضا کے خول سے باہر ہے راستہ کوئی

کوئی لوے یوں لگتا ہے جیسے ڈبے بجتے ہوں
یا کانوں میں درد نہیں ہے یا سب کان پرائے ہیں

گھنٹی کی آوازیں ہیں یہ چیخ پہ کوئی کان نہ دو
لوہے کے تابوت میں ماجد انسانوں کے سائے ہیں

آج کے مسائل ہر گھر اور ہر صحن میں بھوتوں اور چڑیلوں کی طرح ناچ
رہے ہیں۔ انسان کو زمانے کی ضرورتیں دیمک کی طرح چاٹ گئی ہیں،
چمنیوں کا کثیف دھواں شفق کی سرخی کو نگل گیا ہے۔ دل کا ہر شیشہ گنگناتا ہوا
کو کھا گیا ہے۔ اور انسان ضرورتوں کی موٹی موٹی چہار دیواریوں
کے نیچے دبا ہوا سسک رہا ہے۔ ماجد الباقری انسان کے اس کرب کو
محسوس کرتے ہیں کہ وہ خود ہی اس صحرا کے فرد ہیں۔ انسان ضرورتوں کی
دلدلوں میں ڈوب گئے ہیں مگر ضرورتیں اور مسائل اب بھی انہیں
ڈھونڈ رہے ہیں ؎۔

جھاڑی جھاڑی سونگھ رہا ہوں کوئی بھی خرگوش نہیں
کتوں جیسے پیر کہاں سے ہر جھاڑی تک آئے ہیں

اور

کرنوں کے دھاگوں کو سمیٹے اُون کا گولا ڈوب گیا
ننگی دھرتی لمبی لاتیں دیکھ کے ہم شرمائے ہیں

انسان مر گیا ہے۔ زندہ بھی ہے تو ضرورتوں کے ملبے
دبا ہوا ہے سسکتا ہوا۔ آج کا انسان ضرورتوں کی بیڑیاں
پاؤں میں پہنے ہوئے ان دیکھے راستوں پر گھسٹ رہا ہے
ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔ کوئی آواز اپنی نہیں۔ کوئی
اپنا نہیں۔ بے صدا آوازوں اور بے وجود انسانوں کے اس
دیس میں شاعر خود کو یونانی دیو مالا کے اس کنوئیں میں لٹکا ہوا
محسوس کرتا ہے جس میں پانی بھی ہے اور سیب کے درخت
وہ بھوکا اور پیاسا ہے۔ مگر سیب اور پانی دونوں اس کی پہنچ سے ایک ایک
ہاتھ آگے ہیں۔ وہ انہیں دیکھ تو سکتا ہے مگر چھو نہیں سکتا کہ دیوتاؤں
نے ان کے پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ دیکھو مگر نہ چکھو۔ پاکر بھی نہ پانے
اور مل کر نہ ملنے کا یہ کرب آج کا بنیادی مسئلہ ہے اور ماجد الباقری
کی غزلوں میں یہ مسئلہ مختلف جہتوں میں منعکس ہوتا ہے۔ آبادی
سے دور جا کر خاموش اور ویران کنوؤں میں صدائیں لگانے
عمل اسی بنیادی مسئلہ کا ردعمل ہے ؎

دل کی آوازوں کا گنبد آبادی میں پھٹتا ہے
دور کسی خاموش کنوئیں پہ منہ لٹکا کر گایا کر

خاموش اور ویران کنوؤں میں صدائیں لگانے کے ساتھ
ساتھ نفسیاتی طور پر ذات کی تشخیص کا عمل بھی شروع ہو
گیا ہے۔ آج کے دور میں ہر شخص آئینہ کے کنوئیں میں قید گھٹ گھٹ
کر مر رہا ہے۔ ماجد الباقری کے یہاں بھی اپنی ذات کے اس
آئینہ صفت کنوئیں میں اپنے آپ سے ٹکرا ٹکرا کر کرچی کرچی
ہونے کا احساس کرب کا موجب ہے۔ ہر طرف ایک ہی پرچھائیں
ہے انداز اچھل اچھل کر اسے پکڑ رہے ہیں کہ یہی ہمارا
مقدر ہے ؎

اپنے ہی وجود سے نہ ٹکرا
دیوار میں ثبت آئینہ ہے

جس جا ہے وہاں بھی تمہیں معلوم نہ ہوگی
پرچھائیں ہے دیکھو نہ اسے اور اچھل کے

اور ——

زندگی بھر تعاقب میں اپنے ہی سائے کے ماجد پھرا
مرا سایہ بھی ہر گام بڑھتا گیا ہے وہی فاصلے

اور پھر یہ آئینہ صفت سکوت پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ذات کی دیواریں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی چلی جاتی ہیں کہ مٹی ہی ہماری آخری منزل ہے ؎

سایا بھی مرا اب تو نہیں ہوگا مرے ساتھ
گرتی ہوئی دیوار ہوں دم توڑ رہا ہوں

وہ لمحہ کھل کھل کر اپنے وجود کو خود کاٹنے کے کرب میں بھی امید کی ننھی سی شمع روشن ہے اور یہی ٹمٹماتی روشنی نئے عزم کا عہد نامہ ہے ؎

دھوپ کڑی ہے ننگا سر ہے صحراؤں سے گزروں گا
اے دوپٹے کے پلو کا میرے سر پہ سایا کر

نئے دور کی تیز رفتار، رنگ بدلتی قدروں کی توڑ پھوڑ نے جو فرسٹریشن پیدا کی ہے اس سے ہمارے قدموں کے نیچے سے وہ مسعود زمین نکل گئی ہے جس پر ہمارے پرانے ادب کی بنیادیں استوار تھیں۔ دم توڑتی قدروں کے ساتھ پرانی علامتیں اور پرانے لفظ بھی مر گئے ؎

مردہ پڑے ہیں لفظ کتابوں کی قبر میں
لاشوں کا ایک شہر ہے جو بولتا نہیں

ایسی زباں میں گاؤ سمجھ میں نہ آسکے
چلتی ہوئی زبان تو ٹھکرا رہے دوستو

آج کے فنکار کو نیا عہد نامہ نئی زبان میں لکھنا ہے وہ ایسی ہی دور تک
[illegible]

تباہ شدہ شہر کو پھر سے آباد کرتا ہے — ٹروجن کی جنگ ابھی جاری ہے۔ ٹرائے (TROY) کی اینٹ سے اینٹ بجنے والی ہے اور نئے فن کار کو ابھی نیا شہر بسانے کے لئے کچھ انتظار کرنا ہے۔ انتظار کے یہ لمحے ہی ماجد الباقری کے یہاں کبھی شہر کی موت کا کرب کبھی ہیلن کا نوحہ اور کبھی نئے شہر کا گیت بن کر ابھرتے ہیں۔

آج کے فن کار کو ایک طرف تو خوف زدہ معاشرت میں انسانی جسم کا بچاؤ کرنا ہے اور دوسری طرف دھرتی سے اپنے رشتے کو مضبوط اور گہرا بنانا ہے کہ دھرتی سے پیار ہی ہماری بنیادی پکار ہے۔ ماجد الباقری بھی مختلف جذبوں کی زد میں ہیں۔ مگر ان کی عظمت یہ ہے کہ ان جذبوں کی زد میں گھرا ہونے کے باوجود نیا شہر بسانے کی امنگ ابھرتی نظر آتی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ گھل گھل کر پگھلنے کا احساس، پرانے شہر کی موت کا کرب، زندہ رہنے کی کسک اور نئے شہر کی امنگ ہی ان کی شاعری کا بنیادی تنازع ہے۔

ماجد الباقری کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے حساس فنکار کی طرح نئے دور سے اجنبیت برتنے کی بجائے اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان کے بہت سے ساتھی ابھی تک کنوئیں کے مینڈک کی طرح روشنی سے منہ موڑے اپنے خول میں بند ہیں لیکن ماجد الباقری نے سمندر کی وسعتوں کو چھونے کی کوشش میں خود کو سمندر میں ڈبو دیا ہے۔ فنکار اگر اپنے دور کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے تو وہ فن کار نہیں، نیرو ہے کہ روم کے جلنے پر بھی اس کی بانسری بند نہیں ہوئی تھی۔ ماجد الباقری نے نئے پن سے پرہیز کی بجائے اسے چھونے، چکھنے اور برتنے کی کوشش کی ہے اور یوں وہ پرانے شہر، پرانے محل، اور یشودھرا کو تیاگ کر گیان کی تلاش میں نکلے ہیں — وہ گیان جس نے کپل وستو کے گمنام شہزادے کو عظیم گوتم بدھ بنایا۔

نسیم اشرف

غالب کی شاعری میں اخلاقی قدریں

غالب طاؤس ورباب کے دور میں پیدا ہوا اور طاؤس و رباب کے دور کی شاعری میں غم عشق کو محور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے غم روزگار اس کے موضوع سے خارج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اور اس کے زمانے کے دوسرے شعراء مثلاً مومن، ذوق، شیفتہ وغیرہ کا کلام غم روزگار سے قریباً خالی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس فن میں غم روزگار نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی پیغام بھی نہیں ملے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کے زمانے کی شاعری کو ہدف ملامت بنائیں۔ نہ اس دور کی شاعری کو ہمارے سامنے شرمندہ ہی ہونے کی ضرورت ہے۔ ہر زمانے کا ایک مخصوص تقاضا ہوتا ہے۔ تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ اور اسی سبب سے فکر و عمل کے انداز بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

جب غالب کے بعد بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی زندگی کے آخری ایام میں ہی طاؤس ورباب کے نغموں نے دم توڑنا شروع کر دیا تو اردو شاعری نے غم روزگار کو اپنا موضوع بنا لیا۔ چنانچہ خواجہ حالی وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے بدلتے ہوئے حالات اور ان کے تقاضے کو ٹھیک وقت پر محسوس کیا اور اپنے کلام کو بڑی حد تک ایک پیغام کی شکل میں پیش کیا۔ ان کے بعد اکبر الہ آبادی، اقبال اور متعدد دوسرے شعراء نے بھی پیغام و خطاب کی راہ اختیار کی جس سے فن شعری کو وسعت نصیب نہیں ہوئی بلکہ عوام کی ذہنی اور فکری تربیت میں بھی بڑی مدد ملی۔

اصل موضوع سے ان الفاظ کا تعلق یہ ہے کہ اصو[illegible] ہمیں غالب سے کسی قومی، معاشرتی یا اخلاقی موضوع پر [illegible] خیال کی توقع نہیں رکھنی چاہئے لیکن اس کے کلام کے مطا[illegible] سے جہاں ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اپنے پُر شکوہ اند[illegible] بیان، ندرت خیال اور قدرت زبان کے لحاظ سے وہ ایک منفرد شاعر ہے۔ وہاں ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ غم عشق کے علاوہ کسی نہ کسی حد تک غم روزگار کا بھی نقیب ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ زندگی کے مسائل سے بحث کرتے وقت وہ ایک معلم یا واعظ یا پیغامبر کا سا انداز اختیار نہیں کرتے۔ اپنی رندمشربی، حسن پرستی اور بادہ خواری کا بخوبی احساس ہے اور اخلاق و معاشرت یا زندگی کے کسی اہم مسئلے پر براہ راست اظہار خیال کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ بالواسطہ بھی اس نے جو کچھ کہا ہے اس میں اشارے کنائے سے کام لیا ہے۔ یا اپنے کسی تجربے کو اس پیرائے میں بیان کر دیا ہے کہ ہم خود بخود اس سے کوئی سبق یا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ طریق بیان انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے اور بدرجہ غایت موثر بھی۔

غالب کے کلام میں یا عمومی طور پر یوں کہہ لیجئے کہ

اردو شاعری میں فکری یا نظریاتی تضاد اس ہمہ گیری کے ساتھ
ہوتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے عیب قرار دیا جائے یا
خوبی۔ پھر یہ تضاد بھی ایسا نہیں کہ اسے کسی شاعر کے
ذہنی ارتقا یا اس کے مختلف حالات و تجربات کا نتیجہ قرار دے کر
اپنے آپ کو مطمئن کر لیا جائے بلکہ حالت یہ ہے کہ ایک شاعر ایک
ہی وقت میں رجائیت کا اظہار بھی کرتا
ہے اور قنوطیت کا بھی، خوشی کا بھی اور غم کا بھی، مدح کا
بھی اور ہجو کا بھی، بے نیازی کا بھی اور نیازمندی کا بھی،
خودداری کا بھی اور چاپلوسی کا بھی۔ ایک شاعر کی ایک
ہی غزل میں یہ سارے مضامین یکجا مل جائیں گے۔ اگر اس کیفیت
کو پیش نظر رکھا جائے تو غالب کے کلام میں کوئی غیر متضاد پیغام
نہیں مل سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر چند اشعار کے حوالوں سے
اسے ایک رجائی شاعر ثابت کیا جا سکتا ہے تو ایسے اشعار بھی
مل جائیں گے جو اس کی قنوطیت پر دال ہو سکتے ہیں۔ اس
حقیقت کے باوجود غالب کے ہاں وہ جواہر ریزے پائے
جاتے ہیں جنہیں اردو شاعری کا بہترین سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے
اس وضاحت کے بعد ہمیں غالب کی اخلاقی تعلیم پر روشنی ڈالنی
چاہئے۔ سب سے پہلے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب
ایک بے شکایت زندگی پر یقین رکھتا ہے اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ
بے شکایت زندگی کوئی معمولی مطمح نظر نہیں بلکہ انسانی اخلاق
کا ایک نہایت بلند مقام ہے کسی آدمی کی شخصیت ناپنے
کے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ وہ اپنے ماحول یا اپنی قسمت کے
خلاف شکایت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یا ان سے سمجھوتہ کرکے خوش
رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ جتنی زیادہ اس کی زبان آلودۂ
شکایت ہوگی اتنی ہی اس کی شخصیت بھی کمزور ہوگی۔
شکایت دراصل انتقام ہی کی ایک شکل ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ
جو شخص سیدھے طریقے سے انتقام نہیں لے سکتا وہ گلے
شکوے کرکے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ یہ بھی ماننا
پڑے گا کہ جس طرح ہم انتقام لے کر ایک دوسرے سے دور
ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح شکائتیں کرکے اپنے تعلقات
کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ دوستی اور محبت کا نازک رشتہ
شکایتوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ غالب اس نفسیات سے بخوبی واقف
ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

شکوہ یاراں غبار دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

یعنی دوستوں کا لطف و کرم تو بہرحال عزیز ہوتا ہے لیکن ان کی
بے التفاتی اور سرد مہری بھی کچھ کم قابل قدر نہیں اور باوجودیکہ ان کی
بے اعتنائی اور بے رخی سے میرا دل ویران ہو گیا ہے۔ حرف
شکایت لب پر نہیں لا سکتا۔ اس کے برعکس میں نے شکائتوں کو
اپنے دل میں اس طرح محفوظ کر لیا ہے گویا ویرانہ میں خزانہ دفن ہے۔
شعر میں "غبار دل" کے تعلق سے "ویرانہ" و "گنج" کے لفظ
استعمال کئے گئے ہیں۔ پرانے وقتوں کے لوگ اپنے مال و زر
کو حفاظت کی غرض سے بیابانوں میں جا کر دفن کر دیتے تھے
ان لفظوں میں اسی دستور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

غالب کا یہ خلق مروت صرف دوستوں تک محدود نہیں
عام انسانی تعلقات میں بھی وہ یہی وطیرہ اختیار کرتا ہے جس کسی نے
بھی اس کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی کی اس نے درگزر سے
کام لیا حتیٰ کہ جہاں اسے دادرسی کا یقین ہے وہاں بھی
وہ کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اس کا ایک مشہور شعر ہے ؎

سفینہ جب کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہئے!

مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ ملاح نے میرے ساتھ
بدسلوکی اور ظلم و ستم روا رکھا مجھے اذیت پہنچائی اور مجھے
یہ حق پہنچتا ہے کہ خدا سے شکایت کرکے داد و انصاف
حاصل کروں اور خدا جو عادل ہے اس سے میرا بدلہ بھی لے سکتا
ہے لیکن اس سے کیا حاصل؟ مناسب یہی ہے کہ ملاح کی ایذا
رسانیوں کو فراموش کر دیا جائے۔ بڑائی بدلہ لینے میں نہیں
معاف کر دینے میں ہے۔ تقریباً یہی مفہوم اقبال کے ایک شعر میں پایا جاتا ہے۔

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بھی غالب کا ہم مسلک ہے۔ لیکن ان کے انداز بیان میں مجبوری سی پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس غالب کا عفو و درگزر واضح طور پر رضا کارانہ ہے۔

عفو و درگزر کے علاوہ غالب کے یہاں ہمیں خودداری یا عزت نفس کا پیغام بھی ملتا ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بے نیازی اور بے احتیاجی کی حالت میں تو خودداری قائم رکھی جاتی ہے لیکن اضطرار کی حالت میں بہت کم لوگ اس گوہر بے بہا کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ مجبوری میں سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غالب مجبوری اور اضطرار کی حالت میں بھی خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ محبت سے بڑی مجبوری کیا ہو سکتی ہے؟ یہ وہ کیفیت ہے جس میں انسان آرام و آسائش، نام و ننگ، مال و دولت بلکہ جان تک قربان کر دیتا ہے۔ میر تقی میر نے کہا ہے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

مصحفی کہتا ہے ؎

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

مگر غالب نے ایک نہایت مشکل مرحلے پر اپنی خودداری کا ثبوت دیا ہے۔ اسے منانا تو بڑی بات ہے۔ ناراضی کا سبب دریافت کرنا بھی وضع داری کے خلاف سمجھا ہے ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر نے کتنا خون جگر کھا کے غیرت اور خودداری کی یہ کیفیت برداشت کی ہوگی۔ عشق کی بغاوت فرو کرنے کے لئے عقل نے کن کن مصیبتوں کا مقابلہ کیا ہوگا۔ جذبات کی طغیانیوں میں پامردی کے ساتھ ڈٹ جانا اور عزت نفس کا دامن کسی صورت نہ چھوڑنا وضع داری کی نہایت قابل رشک حالت ہے۔ غالب کے سوا شاید ہی کسی شاعر نے خودداری کی اتنی منفرد اچھوتی مثال پیش کی ہوگی۔

غالب کے یہاں رجائیت یعنی امید پسندی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ وہ عام طور پر زندگی کے روشن پہلو کو پیش نگاہ رکھتا ہے اور تاریک رخ کو اس طرح نظر انداز کرتا ہے گویا وہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امید وہ بنیاد ہے جس پر زندگی کی ساری عمارت قائم ہے۔ یہ چہل پہل، یہ رونق، یہ خوبصورتی، یہ حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور اس کی زندہ اخلاقی قدریں صرف امید کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہیں۔ زندگی میں سے امید سلب کر لی جائے تو انسان کی اولوالعزمی، نیکی، ہمدردی، بھائی چارہ اور احسان و مروت ایسے اوصاف اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ جس شخص کے دل میں امید کی شمع روشن نہیں اس کی اخلاقی قدریں مشکوک سمجھنی چاہئیں۔

غالب کی رجائیت کا یہ عالم ہے کہ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی شعاعیں تلاش کرتا ہے۔ ایک دانشمندانہ کہاوت ہے کہ ہر چمکنے والی بجلی گرتی نہیں اور گرے بھی تو لازم نہیں کہ ہمیں پر گر پڑے۔ غالب کا انداز فکر بھی یہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ رجائیت کردار کی یہ مضبوطی اور قلب و روح کی یہ ہمت زندگی اردو شاعری کے پورے دفتر میں کہیں نہیں ملے گی۔ شعر کا بنیادی خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو آئے مگر یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ وہ ہمیں پر نازل ہوگی۔ ایک روشن تجربہ یہ بھی تو ہے کہ مصیبت سامنے آتی ہوئی دکھائی دی لیکن اپنے دھیان گزر گئی۔ یہ درست ہے کہ ایک آشیانہ بجلی کی

ذہن میں اگر راکھ ہوگیا ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ میرا ہی ہو۔ میں
خواہ مخواہ اپنی جان کیوں ہلکان کروں؟

وہ ہمیں تسلی دیتا ہے کہ مشکلات و مصائب سے گھبرانے کی
ضرورت نہیں بلکہ ان کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ اور یہ تجزیہ ہمیں
بتائے گا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں کہ جو آخر کار آسان نہ ہوگئی۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

وہ گفتگو میں آداب، شائستگی اور مخاطب کا احترام ضروری
سمجھتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

وہ اپنا قصور کسی دوسرے کے سر تھوپنے کا قائل نہیں۔ مرد
وہ ہے جو مردانہ وار اپنی غلطی کا اعتراف کرلے اور اپنی
بجائے کسی بے گناہ کو مصیبت میں مبتلا نہ ہونے دے۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

کسی ہنر میں کمال حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے
اہل کمال سے بغض و کدورت روا رکھی جائے۔ خوبی
جس کسی میں بھی پائی جائے اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایک اور غزل کا مقطع ہے ۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ تلقین بھی کرتا ہے کہ ہر شخص کو کسی
نہ کسی فن میں کمال پیدا کرنا چاہئے تاکہ قدرت و عزت حاصل
کرسکے۔

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

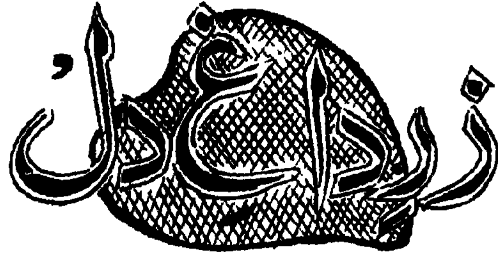
غالب کے کلام میں سچائی کی ترغیب بھی پائی جاتی ہے۔

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر میں دو شعر ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن میں غالب ہمیں
براہ راست خطاب کرکے اخلاقی تعلیم دیتا ہے۔ ان
شعروں میں بدگوئی سننے اور غیبت کرنے کی مناہی کی گئی
ہے۔ غلط کاری کو روکنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اور یہ
نصیحت کی گئی ہے کہ خطا کو بخش دینا چاہئے۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

عبدالعزیز خالد



الف آہ سے شاعر شبِ تنہائی میں
ورقِ دل پہ کریں حرفِ تمنّا ارقام

ناتوانی ہی محبّت کی توانائی ہے
دل حقیقت میں مظفّر ہے بظاہر ناکام

ناز برداریٔ خوباں نہ کرے عشقِ غیور
دلِ زندہ نہ بنے لذّتِ فانی کا غلام

مقصدِ علم ہے انساں کی فلاح و بہبود
رکھّو مدِّنظر اَنتُم بَنُو آدم کو مدام

قلم و عقل ہیں سرآمدِ بزمِ تخلیق
ہیں زمیں کا نمک اربابِ عقول و اقلام

کون تاروں کو بتاتا ہے خلا میں راہیں؟
کون رکھتا ہے مہ و مہر کو مصروفِ خرام
کس کا کرتے ہیں تعاقب یہ شہابِ ثاقب؟
چھلک اٹھتا ہے لہو کس کا اُفق پر سرِ شام؟
رُوح کس راہ سے ہوتی ہے جنیں میں داخل؟
اُولُوا الاَحلام ہی محرم نہ ذواتِ ارحام
فاسدِ ذہن ہے مَے، نافعِ تَن اَحیاناً
جس کے پینے سے نشہ ہو وہ ہے مَے اور حرام
اہلِ فن اور اُولُوا الامر کا آلہا گائیں!
شاہیں آیا کششِ دانۂ زر سے تہِ دام
طالبِ علم ہوں میں، ملتمسِ مال نہیں
زہر ہے میرے لئے رشحۂ کاساتِ کرام
اپنے اَللہ کا عاشق ہوں برَبِّ الکعبہ
عابد و عبد و عبادت کا سمجھتا ہوں مقام
قابَ قوسین اَو اَدنیٰ ہے قدمگہ جس کی
یارب اس خاصۂ خاصانِ رسولاں کو سلام
ہو مبارک ثنوی کو صَنَم و صَنَّامی
میں مُوحّد ہوں مرا کام شکستِ اَصنام

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

گورکن

رات کالی ہے
تیغ برستی ہے
منجمد پتھروں کے ہونٹوں پر
گونگی سرگوشیوں کے سائے میں
دور، اک چیخ شب کو چیر گئی
ایک تارا، خلا میں ٹوٹ گیا
گھور اندھیروں کا جاگ اٹھا افسوں
سرد، بے حس، اجاڑ راہوں میں
بھاری قدموں کی آہٹیں ڈوبیں

پھر وہ تنہا ہے
سخت ہاتھوں میں
پھاوڑا لے کے ایستادہ ہے
گیلی مٹی ہے ناخنوں میں دبی
ہانپتی سانسیں، مضطرب موجیں
منجمد سلوٹوں سے ماتھے کی
سرخ بوندیں لہو کی رستی ہیں

وحشی آنکھیں، دہکتے انگارے
پاس ہی تازہ قبر، غار سیہ
جالے مکڑی کے، رینگتے سائے
علم و دانش کے اونگھتے کھنڈر
برف میں چاند، مرمریں پیکر
رعشہ آلود ہاتھ ابھرتے ہیں
پھڑپھڑاتے ہیں روز و شب کے ورق

پھر کہیں سے کچھ آہٹیں جاگیں
جھم جھمایا الاؤ آنکھوں کا
پھاوڑا پھر فضا میں لہرایا
کالی دھرتی کا سینہ چاک ہوا
پیاسے ہاتھوں نے لاش دفنا دی
آخر شب رات جب تمام ہوئی
چپ کے عالم میں نور کے تڑکے
راہگیروں نے دیکھا، جس سے گئے
لاش کوئی پڑی ہے قبروں پر
جس کی قسمت میں گور ہے نہ کفن

علیم افسر

آسمان، ریت اور شبنم

روتا ہے صدیوں سے فراقِ ابنِ آدم میں

اسے غم ہے

اسکو ترک کر کے اپنا مسکن ابنِ آدم نے بنایا ارضِ خاکی کو

اسے غم ہے

ابنِ آدمِ خاکی نے اپنی عقل و دانش سے سجایا ارضِ خاکی کو

فراقِ ابنِ آدم اس کے دل پر آج بھی اِک بار ہے

سبب تو

وہ روتا ہے شبِ تاریک کے آنچل میں اپنا منہ چھپا کر

وہ اپنا غم بتانا چاہتا تو ہے

مگر ملتا نہیں ہے رازداں کوئی

وہ اپنی چشمِ پُر نم سے گلستانوں کی جانب دیکھتا ہے

مرغزاروں کو بڑی حسرت سے تکتا ہے

یہ قطرہ ہے شبنم ہی تو اس کے غم کے آنسو ہیں

چمن زاروں کی شادابی فلک کے غم کی پروا بھی نہیں کرتی

اور اس پہ برگِ گل سے سنبل و ریحاں سے کہتی ہے کہ

شبنم کو جو آنسو ہیں فلک کے اپنے دامن میں چھپا دکھلاؤ لاؤ دنیا کو

فلک کے غم کی دنیا میں ذرا تشہیر ہونے دو

مگر یہ ریگزارِ تشنہ جو تنہا فلک کا راز داں ہے

جذب کر لیتا ہے اس کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں

فلک کا رازِ غم افشا نہ ہونے کے لئے وہ تلخیوں کے گھونٹ پیتا ہے

تسلی دے کے بہلاتا ہے - سمجھاتا ہے اس کو

اور کہتا ہے

"یہاں کی رسمِ غمخواری نئی ہے - تو فلک نا آشنا معلوم ہوتا ہے"

وہ کہتا ہے

یہاں تو ایسا ہوتا ہے

کہ جن کو ملتی ہیں شادابیاں اکثر وہ ویرانوں کی پروا بھی نہیں کرتے

مگر ویرانے ہی ویرانوں کے غمخوار ہوتے ہیں"

مگر پھر بھی فلک روتا ہے صدیوں سے فراقِ ابنِ آدم میں

نہ جانے اس کے آنسو کب تھمیں گے -

■■■

محمد علوی

اودے پور پیلس

پہاڑی کے دامن میں
ایک جھیل ہو
جھیل کے پاس
چھوٹا سا گھر ہو
گھر کے در پر
چمکتے ہوئے حرف والی
میرے نام کی
ایک تختی لگی ہو
اور دہلیز پہ
بیٹھ کر
اپنے منّے کو نیکر پہناتے ہوئے
تم میرے کان میں کچھ کہو
ایسا ہو
لیکن ایسا نہیں ہے!
پہاڑی بھی ہے
جھیل بھی ہے
مگر
جھیل پہ
اونچے محلوں کا پہرا لگا ہے!!



اور پھر

اِک گلی میں
اک مکان کی
ایک کھڑکی کھل گئی
روشنی کا اِک ستون
ٹوٹ کر
اندھی گلی میں آ گرا
ایک سایہ
ہاتھ پھیلائے بڑھا
منہ اٹھا کر
ایک کتا بھونک اٹھا
اور پھر
گہرا اندھیرا
اور
اک پُر ہول چُپ!!

کرامت علی کرامت

گم گشتہ گہر

[اپنی شاگرد بھاگیہ لکشمی پنڈا کے سانحۂ ارتحال پر]

اے مری دھرتی، مری ماں تو مجھے
کوکھ سے، اپنی جنم دینے کی خاطر
آرتی لے کر کروڑوں سال سورج دیوتا کے ارد گرد
گھوم کر کرتی رہی ہر دم دعا
سادھنا تیری ہوئی مقبول، بر آئی تری ہر کامنا
کوکھ سے تیری جنم میں نے لیا
ہائے مجھ کو کس قدر تو شاد تھی، مسرور تھی،
تجھ سے میری یہ رفاقت تھی مگر نا پائیدار
ایک دن تو نے فنا کے بحرِ بے پایاں کی تہہ میں مجھ کو آخر کھو دیا

اے مری دھرتی، مری ماں
تو کروڑوں بار سورج دیوتا کے ارد گرد
گھوم کر کرتی رہے گی یوں ہی مجھ کو پھر سے پانے کی دعا
وقت کی دیوار سے ٹکرا کے لوٹ آئے گی لیکن تیری ہر اک پرارتھنا
وقت کی دہلیز پہ تو گو ابد تک سر پٹکتی جائے گی
پر نہ مجھ کو پائے گی ....
پر نہ مجھ کو پائے گی ....

■■■

اویس احمد دوراں

تعبیر

دلِ خوں گشتہ و خستہ کو میں کب تک تسلی دوں
کہ یہ صحرائے غم
خونی مناظر
آگ کہساروں کے پتھر کی
نہیں ہے جن کی حد کوئی
گھری ہے جن میں
زخمی
شب گزیدہ
نسل کے افراد ہی کے ساتھ
میری بھی حیات مضمحل لوگو!
میں اپنی آخری سرحد میں اب منزل قریب آئی
میں کب تک جھوٹ بولوں اپنے دل سے اور کہوں
خونی مناظر
غم کے صحرا
آگ
کانٹوں سے نکل آیا

یہ کس منہ سے کہوں ہے شبستاں دو قدم آگے
میں اپنے خستہ و خوں گشتہ دل کو یہ بتا دوں گا
کہ صحرا
آگ
کانٹے
اور پتھر ہی غریبوں کا مقدر ہیں
یہی صد سے حقیقت ہیں
تصور پھول کا
شبنم کا
پیارا ہے بہت لیکن
یہ ہے اس پھول کی مانند جس کی غم نصیبوں کو
جہنم زارِ ہستی میں
کوئی تعبیر ڈھونڈے سے نہیں ملتی
[illegible] اپنے دل کو سمجھاؤں گا انگاروں پہ سو جائے
[illegible] درد و کرب میں جینے کی خو کر لے

■■■

وہاب دانش

پھر بھی جیتا رہا ....

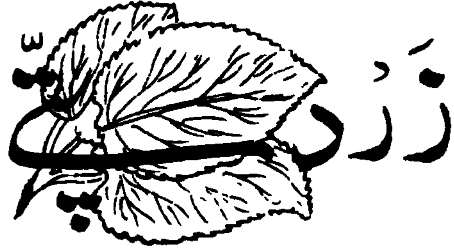
کبھی بےکلوں پانیوں میں اُتر کے
ہتھیلی میں ٹھنڈک کو لینے کی کوشش نہیں کی
زندگی بھر رہا
ریت پر برہنہ
پتھروں پر سُلگتے ہوئے چاند کے لمس کو
پی لیا
لب جلے
تشنگی ہی رہی منسلک جسم سے
پھر بھی جیتا رہا .....
پھر بھی جیتا رہا ......

نرم لہجے کا المیہ

ایک ٹوٹے ہوئے پتے کی صدا خستہ سی
ضد پہ آمادہ ہواؤں میں گھری آٹھ پہر
صبح سے شام تک تلک
قید
بیاباں میں رہی
بین کرتی ہوئی مجبور سی اڑتی ہی رہی

سمت کوئی نہ ملی بند سے گنبد میں اُسے
راستہ کوئی نہ تھا
جس سے نکل کے باہر
نرم سرگوشی بنائے
کہ اُسے کیا رشتہ
برہنہ شاخ سے
اُس شور کے جنگل میں تھا؟

سیّد فضل المتین



خزاں رسیدہ ——
یہ زرد پتّے !
بہارِ رفتہ کے رازداں ہیں
یہ روز و شب کی تمازتوں سے
چراغِ ارماں جلا چکے ہیں
بجھا چکے ہیں۔

یہ وقت کی سرفرازیوں سے
مسرتوں کی ہر ایک محفل سجا چکے ہیں
ہر ایک صدمہ اٹھا چکے ہیں

یہ زندگی آشنا رہے ہیں
یہ زندگی آشنا رہیں گے۔

تلاش

عمر کی جلتی دوپہری میں
چھاؤں چھاؤں ڈھونڈ رہا ہوں
سایہ سایہ دیکھ رہا ہوں
اپنے خوابوں کی تعبیریں
پچھلے جیون کی پرچھائیں

کیسا تبلاؤں ——
کون ہوں ! —— کیا ہوں !!

■■■ ■■■

اختر یوسف

کتنا موسم عجیب ہے

کتنا موسم عجیب ہے دیکھو ——
ان ہواؤں کو ہو گیا کیا ہے؟
ورنہ شب یہ فضاؤں میں اکثر
گرم —— خون سا اُگلتی رہتی ہے
اِن فضاؤں نے اُوڑھ رکھی ہے
نیلی پیلی سی ریت کی چادر
لانبی، کالی، کہ یہ آنتیں ہی
سوکھے پیڑوں کی سوکھی شاخوں سے
ہر گھڑی کیوں لٹکتی رہتی ہیں؟
سب مکانات کٹے لٹے اوندھے ہیں
جو ہمیشہ ہی اپنے پاؤں ہات
بے بسی سے جھٹکتے رہتے ہیں
شاہراہوں پہ پتھروں کے بُت
آدھے دھڑ تک گڑے گڑے سے ہیں
جن پہ پھیلا سا آسماں ہر دم
اپنے ہونٹوں سے پیپ رِسائے
کتنا موسم عجیب ہے، دیکھا ہے؟!

●●●

رشید افروز



پہلی کرن

دن کے ہنگاموں کے بعد
رات جب میں لوٹتا ہوں
پھر وہی روشن سا چہرہ
تیرگی کی کھڑکیوں سے جھانکتا ہے!
اور —— شب بھر
میرے احساسات کے زخموں سے
رِستا ہے لہو!
تب کہیں سورج سے ہوتی ہے جدا!
پہلی کرن!!

●●●

مظفر حیدری

رباعیاں

بچھڑن کی حکایت دل کو ہو یاد رہو
وہ دل کی گرہ کے پیچ کھولو یاد رہو
ہر بات ہے مصلحت کی پیادہ راہ رو
وہ دل میں بسے وہ بات تو بولو یاد رہو

•

کیوں آنکھ سے پھر روح کو گریاں دیکھوں
پھر غم کے بھنور درد کے طوفاں دیکھوں
اب پنچھی کی پروں سے بھی ڈر لگتا ہے
ایسا نہ ہو پھر خواب پریشاں دیکھوں

•

ویران ہے دل جیسے کہ مرگھٹ کوئی
باقی ہی نہیں دل میں لگاوٹ کوئی
اب یادوں کے پنگھٹ پہ بھی سناٹا ہے
پائل کی چھپا چھپ ہے نہ آہٹ کوئی

•

گھٹ جائیگا دم تڑپ تڑپ کر آخر
رک جائیگا دل دھڑک دھڑک کر آخر
مانند چراغ ٹمٹما کر مضطر
بجھ جائیں گے ہم بھڑک بھڑک کر آخر

•

افسر آذری

قطعات

انگ انگ بجتا ہے، ردم ردم گاتا ہے
اک خیال چبھتا ہے، ایک جھلملاتا ہے
آج تو کچھ ایسی ہے اک خلش سی ناصح
دل کے روئیں روئیں میں درد جھرجھراتا

ہر قدم حوصلے بڑھاتا ہوا
دل میں چنگاریاں بچھاتا ہوا
مری آنکھوں نے دن میں دیکھا ہے
خواب سا ایک مسکراتا ہوا

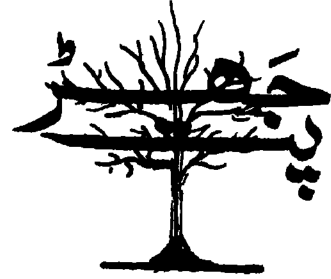
چاندنی رات لے کے آئی ہے
مست خوشبو سی سنہرے بالوں کی
کیا سہانی ہیں تن کے آنگن میں
کیکلیاں[1] پڑی جھالوں میں

••

---

[1] پنجاب کا ایک عوامی ناچ

عروج احمد عروج



سوکھے پیڑ
اور سوکھے پتّے
قدم قدم پر
کھڑے ہوئے ہیں
پڑے ہوئے ہیں
اپنے اپنے غم کو چھپائے
جانے کس کی آس لگائے

پوچھ رہے ہیں
اک دوجے سے
کون ادھر سے گزریگا؟

●●●

قطب شاہین

اہلِ آرزو

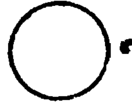
ہوئے ہیں دہر میں جو اہلِ آرزو مصلوب
چمک رہے ہیں ابھی آفتاب کی صورت
ہزاروں لوگوں کی نظروں میں جو لگے معتوب
ہوئے ہیں دہر میں جو اہلِ آرزو مصلوب
نفس نفس ہے نئے درد و جبر سے منسوب
ہے نور بار جبینوں پہ مشعلِ راحت
ہوئے ہیں دہر میں جو اہلِ آرزو مصلوب
چمک رہے ہیں ابھی آفتاب کی صورت

●

کلنڈر

بے پلستر یہ کمرے کی دیوار ہے
جس پہ ہے اک کلنڈر نئے سال کا
اس کی تزئین بھی پھر سے درکار ہے
بے پلستر یہ کمرے کی دیوار ہے
یہ کلنڈر جو وقتوں کا "آزار" ہے
کل ہی ہوگا یہ گزرے ہوئے سال کا
بے پلستر یہ کمرے کی دیوار ہے
جس پہ ہے اک کلنڈر نئے سال کا

●●●



علی جواد زیدی

ہر ایک موڑ پہ ہے خانۂ تباہ کوئی
دیارِ ہوش سے گزری ہے کیا سپاہ کوئی

ضمیرِ ذہن میں نشتر چبھوئے جاتا ہے
گناہ ہے کہ یہ کفارۂ گناہ کوئی

گزرتے جاؤ، لٹے قافلوں کا غم نہ کرو
مسافروں کو ترستی ہے جلوہ گاہ کوئی

یہ شورِ طبع، یہ کربِ عمل، یہ شعلۂ شوق
مجھ ایسے دوست کو کیا خاک دے پناہ کوئی

زوال نے اُسے پہلا نشانہ ٹھہرایا
سنا نہ جس نے زمانے کا انتباہ کوئی

نکالو راہ نئی، منزلوں کے دیوانو!
مٹائے جاتا ہے ایک ایک نقش راہ کوئی

ہزار خوش نظروں کا ہجوم ہے لیکن
نگاہِ غم کو ترستی ہے جلوہ گاہ کوئی

ہمارے عہد کا انساں ہے اپنی دھرتی پہ
کہ اک جزیرے میں معزول بادشاہ کوئی

جنابِ زیدی گوشہ نشیں ولی نہ ہوئے
بنائے ان کے لئے ورنہ خانقاہ کوئی

ساغر نظامی

غزل

رند ہوں اور شیخ روایات کا پابند — میں حال کا فن کار، وہ ماضی کا ہنرمند

انیٔ اوہام، بہر حال ہیں دونوں — میں بندۂ انکار، وہ ایمان کا پابند

فاں نہیں، یہ جشن ہے اور جشنِ سکوں خیز — اس رقص کناں موجۂ گرداب کی سوگند

ات نہیں نغمہ کناں نورِ سحر ہے — موجوں پہ چمکتے ہوئے مہتاب کی سوگند

نگ میں موّاج ہے اِک چشمۂ شیریں — فرہاد کا دروازۂ کہسار نہیں بند

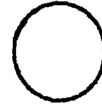
تازہ تمدّن نے اسے روند دیا ہے — تہذیب تھی جو کہنہ روایات کی پابند

ہر ابھی خطّۂ دریوزہ گراں ہے — ہر گام پہ آوارہ ہیں فن کار و ہنرمند

دیٔ اظہار و بیاں کہتے ہیں اسکو — ہے میری زباں بند، نہ پروازِ نظر بند

ہے میرے رخِ خانہ میں خورشیدِ بہاراں

اس چمپئی گردن میں زمرّد کا گلوبند



غلام ربانی تاباں

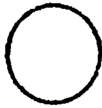
طوفاں کے بعد بحر بدستور ہو گیا
ٹکرا کے اک سفینہ مگر چور ہو گیا

نکھرا ہوا ہے رنگ جفاؤں کا ان دنوں
اب کم نگاہیوں کا گلہ دور ہو گیا

دل یوں بھی بے نیازِ کرم ہائے دوست تھا
کھا کے شکست اور بھی مغرور ہو گیا

دستِ طلب سے دور نہ تھا دامنِ کرم
لیکن میں پاسِ وضع سے مجبور ہو گیا

تاباں عتابِ ناز سے دل کا معاملہ
اک حادثہ پھر آج سرِ طور ہو گیا



علیم اختر مظفر نگری

خاتمِ شوق پہ اک نقشِ نگیں ہے کہ نہیں
ثبت اس در پہ مری لوحِ جبیں ہے کہ نہیں

پوچھ آئینے سے خود مستِ نظر کا عالم
دیکھ بیدار کوئی خوابِ حسیں ہے کہ نہیں

زندگی کارگہِ وہم و گماں ہے لیکن
موت اک آئینۂ حسنِ یقیں ہے کہ نہیں

یہ ترا وعدۂ فردا بصد اقرارِ وفا
اسی اقرار میں پوشیدہ نہیں ہے کہ نہیں

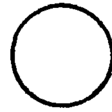
اک زمانے کو یہی جستجوئے شوق رہی
کہیں دنیا میں کوئی تجھ سا حسیں ہے کہ نہیں

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جفا سے پوچھے
خود تمہیں اپنی وفاؤں پہ یقیں ہے کہ نہیں

مسکرا کر نگہِ شوق سے چھپنے والے
میری حیرت ترے جلووں کا امیں ہے کہ نہیں

ثبت تھے جس پہ مرے نقشِ سجود پیہم
آج وہ رہگزرِ شوق کہیں ہے کہ نہیں

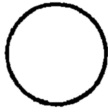
آج پھر عرضِ وفا کر کے یہ دیکھیں اختر
اس فسانے پہ کوئی چیں بہ جبیں ہے کہ نہیں



حرمت الاکرام

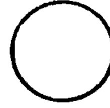
ایسا جاں دادۂ آشوب معانی نہ ملا
مجھ کو اپنا سا کوئی دشمنِ جانی نہ ملا
کوئی تصویر بنائے نہیں بنتی کہ ہمیں
دلِ خوں گشتہ ملا، خامۂ مانی نہ ملا
وہی تاریک جبینی وہی تاریک شبی
زندگی کو صلۂ شعلہ بجانی نہ ملا
سرِ دامانِ مژہ ایک ہی بار آئی بہار
پھر لہو دل کا پئے لالہ چکانی نہ ملا
کیا بجھاتا کوئی سینوں کی بھڑکتی ہوئی آگ
وقت کے دشتِ بلا میں کہیں پانی نہ ملا
پیار کا کھیل بھی اک چیز ہے جینے کے لئے
ہائے وہ دل جسے انعامِ جوانی نہ ملا
دل کے بازار میں اس فن کی نہیں قدر ابھی
عقلِ خوش طبع! مرے خون میں پانی نہ ملا
نازِ خاموش کبھی بھی نہ ہوا رسوا حرمت
دل کے افسانے میں آنکھوں کی کہانی نہ ملا

■■■



کرشن موہن

ہم تو ٹھہرے بھوگ بلاسی
اور تو اِک جوگن بن باسی
وقت کی تیزی ٹھکرانے کو
گاتے ہیں ہم بھیم پلاسی
میرے دل کو محفل میں بھی
نوچے کیوں سوچ اور اُداسی
سادھو سنت بھی دکھیارے ہیں
یہ سنسار ہے ستیہ ناسی
داس بنے ہم، لطف تو جب تھا
یہ دھرتی بن جاتی داسی
شاعر لوگ بہک جاتے ہیں
چلّاتے ہیں پی کے ذرا سی
یہ سنسار ملن کا میلہ
من کا من، تن کا تن آسی
سوکھے پتّھر مینہ کو ترسیں
آنکھیں تیرے ملن کی پیاسی
اپنی کھوج میں گھوم رہے ہیں
پربت پربت کیوں سنیاسی
آخر کچھ آکاش کی باتیں
سمجھے ہیں دھرتی کے نواسی



حیات وارثی

جو عظمتِ انساں کے لئے زندہ رہے ہیں
آئینۂ تاریخ میں تابندہ رہے ہیں

دوشیزۂ صہبا کی طرف آنکھ اُٹھا کر
برسوں نگہِ یار سے شرمندہ رہے ہیں

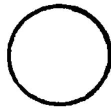
چلتی رہیں حالات کی شب رنگ ہوائیں
الفت کے دیئے پھر بھی درخشندہ رہے ہیں

ہر مصلحتِ وقت سے دامن کو بچا کر
ہم صرف محبّت کے نمائندہ رہے ہیں

جن اشکوں نے پلکوں کی بلندی نہیں چھوڑی
وہ ضبط کی دُنیا میں درخشندہ رہے ہیں

جو عزم سے سُلجھا نہ سکے وقت کی زُلفیں
وہ لوگ اسیرِ غمِ آئندہ رہے ہیں





ماجد الباقری

آنسوؤں کی ایک چادر تن گئی ہے
دیکھنے میں روشنی ہی روشنی ہے

سوکھے پتّے سب ہی اُڑ کر آ گئے ہیں
راستے میں کوئی دیوار آ گئی ہے

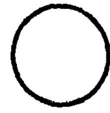
غم کا ریلا ذہن ہی کو لے اُڑا ہے
سوچئے تو آندھیوں کی کیا کمی ہے

چُلّو چُلّو روشنی کو پی رہا ہوں
موجِ دریا قطرہ قطرہ چاندنی ہے

پردۂ سیمیں ہے جیسے یہ زمانہ
روشنی میں چلتا پھرتا آدمی ہے

روشنی میں جسم سے ناآشنا ہے
میرا سایہ ہے کہ کوئی اجنبی ہے

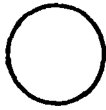
رات میں دھنکا ہوا سورج پڑا ہے
دن میں ماجد دھوپ کالی ہو گئی ہے



جواد حسین کاظمی

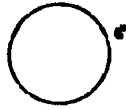
س بس میں جس کے لمس کی اب تک مٹھاس ہے
وہ میرے دل کے کہیں آس پاس ہے
ں میں بس رہی ہے وہی بوئے گلبدن
بلی ہوئی حیات پہ نغموں کی باس ہے
سے کتابِ جسم ہے گویا ورق ورق
سمجھا ہوا تو فقط اقتباس ہے
کا وجود باعثِ تقویتِ جنوں
بکر پہ اس کے میری غزل کا لباس ہے
ئی ہوئی کرن کے ہیں ذرات آس پاس
یک کوٹھری میں طبیعت اُداس ہے
شنی جو شہر میں پھیلی ہے چار سُو
شنی ہی دشمنِ ہوش و حواس ہے
ر تیرا جسم ہو اک بولتا ہوا
ادا ایسی شاعری ہی تجھ کو راس ہے

●●●



قیصر قلندر

ترے وصال کی جو شمع جل گئی ہوتی
شبِ سیاہ کی قسمت بدل گئی ہوتی
زمیں کی بھوک کہاں مٹ گئی ہے قرنوں سے
یہ چھپکلی تو ہمیں بھی نگل گئی ہوتی
شفق کی آنچ سے جلتے جو حسرتوں کے دیئے
حیاتِ موم کی صورت پگھل گئی ہوتی
حسین لمحوں کے ماتم میں آنکھ ہے نمناک
لبوں پہ یاد کی سرخی مچل گئی ہوتی
رہِ وفا میں کھل آئے ہیں آبلوں کے گلاب
بہار، خونِ تمنا اُگل گئی ہوتی
مہکتے رہتے جو محراب دل میں یاد کے پھول
شبِ فراق بھی فوراً بہل گئی ہوتی
ترا گلاب سا چہرہ اگر نظر آتا
حسین خواب کی تتلی اُچھل گئی ہوتی
خبر جو ہوتی کہ روٹھو گی اے عروسِ خیال
حیات، صورتِ گلشن سنبھل گئی ہوتی
لباسِ شعر میں قیصر نے بھر دی رعنائی
اسی کے ساتھ عروسِ غزل گئی ہوتی



پرکاش فکری

۱

اپنے ملبوس کے رنگوں میں اُداسی نہ چھپا
سرد ہونٹوں پہ جمی برف کو اب تو پگھلا

جو دھڑکتا تھا مرے دل میں تمنا بن کر
اس کو دیکھا تو عجب رنج کا احساس ہوا

پھول زخمی تو ہوئے پھر بھی وہ چپ چاپ رہے
سختیٔ سنگ سے گلدان مگر چیخ پڑا

اپنی تصویر کے نیچے یہ عبارت لکھ دوں
زرد دیوار کی آغوش میں کالا سایہ

شام اُتری ہے ہر اک سمت اندھیرا لے کر
دن کے آنے میں ابھی دیر ہے فکریؔ سو جا

...

۲

رات گزرے گی تری یاد کا پیچھا کرتے
نیند آ جائے کسی طور تمنا کرتے

ان درختوں کو چلے چھوڑ کے بھولے پنچھی
جن درختوں پہ کبھی عمر بسیرا کرتے

چاند کے نور میں اُبھی ہے لہو کی سیاہی
جی دہلتا ہے یہاں عشق کا چرچا کرتے

بات بڑھتی نہیں احساس کی حد سے آگے
آنکھ ڈرتی ہے کسی سمت اشارا کرتے

تیز اتنی تھی شب و روز کی گردش فکریؔ
ہم کو فرصت نہ ملی جسم کو دیکھا کرتے

...



مظفر حنفی

نہ مایہ مری پرچھائیں سے لڑتا کیا ہے
فرض کر دم ۔ تجھے چھو لوں تو بگڑتا کیا ہے

میں سیراوں کے جھمیلے میں نہیں پڑنے کا
رنگ کا ہاتھ مرے پاؤں پکڑتا کیا ہے

نہ بھلا کون مرا درد بٹانے والا
اگ پر اوس کی مانند وہ پڑتا کیا ہے

تنے لمحوں کا لہو چوس سکے ، چوسے جا
نت میرا ہے ، نہ تیرا ہے ، جھگڑتا کیا ہے

لی ہے ، ڈوبی ہوئی چٹان سے ٹکرائے گی ناؤ
دبانوں سے ہواؤں کو جکڑتا کیا ہے

رنگ دے لاش کے ماتھے پہ اسے ۔ قصہ پاک
ری کیل کو تابوت میں جڑتا کیا ہے

حجابی کی عنایت بھی ہے کنکر جیسی
نہ پھر پائے نظر میں مری گڑتا کیا ہے



غلام مرتضیٰ راہی

جگ جگ سے چھائے ہیں بادل آشاؤں کے نیل گگن میں
جگ جگ سے اک آگ لگی ہے پیاسی دھرتی کے تن من میں

ٹیڑھی میڑھی چند لکیریں ، آڑے ترچھے کچھ پیرائے
اور تمہیں کیا مل جائے گا سپنوں کے ٹوٹے درپن میں

میرے گھر میں آگ لگی ہے یہ قسمت کا پھیر ہے ، ورنہ
تاروں کی برسات ہوئی تھی رات گئے میرے آنگن میں

تنہائی کی سیج سجی ہے ۔ لیکن اب اس کو کیا کیجئے
کوئی صدا دیتا ہے مجھ کو بہتے لمحوں کی سن سن میں

مجھ تک آنچ نہ آئی لیکن دنیا والے یہ کیا جانیں
کتنے آنسو ابھر ابھر کر ڈوب گئے میرے دامن میں

بجھنے تک شاید کوئی درشن ابھلاشی آ جائے
آشاؤں کی جوت جگا لوں من مندر کے سونے پن میں

راہیؔ مجھ کو قدم قدم پر اپنا سر کیوں یاد آئے ہے
آخر میں نے کب مجنوں پر سنگ اٹھایا تھا بچپن میں

اطہر عزیز

غزل

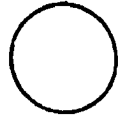
آگ لگا کر گھر کو جب خود گھر والا انجان بنے
اے لوگو پھر تم ہی بتاؤ کیوں نہ وہ گھر شمشان بنے

آج امیدوں کے مرگھٹ پر اڑتے ہیں آہوں کے گدھ
جانے اس مرگھٹ میں کل کن نغموں کا ایوان بنے

اس کی چہرے کی ریکھائیں میں بھی تو اک بار پڑھوں
کاش کبھی تو خوابوں ہی میں وہ میرا مہمان بنے

وقت کی بہکی سانسوں کا تم غم نہ کرو اے ہمنفسو
انہیں سسکتی سانسوں سے تو کتنے سُر او رتان بنے

اطہر کل تک سوچ میں تھا انساں کہ بنے انسان ذرا
آج مگر اس فکر میں ہے، اب کیسے وہ بھگوان بنے



متین سروش

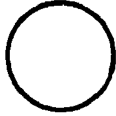
جنون و ہوش میں جو ایک ربطِ پیہم ہے
ے کشتۂ غم کا عجیب عالم ہے

س کے ہاتھ میں ہے نظمِ میکدہ ساقی
س نفس میں نیا تشنگی کا عالم ہے

ے دل ہے سلامت نہ عقل کا دامن
ن شعور، امینِ فروغِ آدم ہے؟!

وہ شمعِ تمنّا، مہکتے زخمِ حیات
د بہار کا پھولوں میں خیر مقدم ہے؟!

ر وشیوۂ اہلِ بہار کیا کہیے
ا کی پاکیٔ داماں کا جیسے ماتم ہے!
کرے ہو نصیب وفا وہ نعمتِ خاص
ت اہلِ جنوں ہیں جو لذّتِ غم ہے
غِ دانش و حکمت کی خیر ہو یارب
شکایتِ مزاجِ ہوائے عالم ہے
شکایتِ بے مہریٔ زمانہ کیا
اپنی شمعِ محبت میں روشنی کم ہے!
ش عالم دیوانگیٔ شوق نہ پوچھ
حیات کا ہر جلوہ آج مبہم ہے!!



اقبال منہاس

سلگتے صحرا میں پانی کے خواب جیسا تھا
چمک دمک میں بدن ماہتاب جیسا تھا

میں پڑھ رہا تھا دکھوں کے ہزار افسانے
کھلا ہوا تھا، جو چہرہ کتاب جیسا تھا

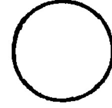
بچھڑ کے مجھ سے عجب اس پہ حادثہ گزرا
وہ جسم سنگ ہے اب، پہلے آب جیسا تھا

کوئی قیام کرے آ کے شب اندھیری ہے
کھلا ہے آج بھی دل کا یہ باب جیسا تھا

دمِ وصال جدائی کا درد تھا دل میں
خوشی کا وقت بھی مجھ پہ عذاب جیسا تھا

جو درد دل میں چھپایا، وہ آگ تھا اقبالؔ
جو لفظ شعر میں آیا گلاب جیسا تھا

■■■



عبدالرحیم نشتر

کس طرح بجھتی نہ ان آنکھوں کی پیاس
تھا لبالب اس کے جسم کا گلاس

ذہن سے میرے چپک کر رہ گیا!
جسم سے چمٹا ہوا اس کا لباس

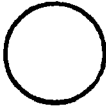
میں بھی قاری ہوں مجھے پڑھ لینے دے
جسم کی پستک سے کوئی اقتباس

آگ سی ہے تن بدن میں کیا کروں
جل رہی ہے فکر، سلگے ہیں حواس

صبح سے وہ چپ اگر ہے۔ چھوڑیئے
شام ہوگی، ٹوٹ جائے گا اُپاس

بھسم کر دے گی اکیلے پن کی آگ
فکر کی سلسلہ کو اب کیجئے نہ کراس

●●●

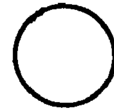


مدھری پرتاپ گلھی

بہار کا ہے تذکرہ، شگفتگی کی بات ہے
مری غزل میں زندگی کے حسن ہی کی بات ہے
جو بدنصیب روشنی کی زد میں آ کے لٹ گئے
انہیں کی محفلوں میں آج روشنی کی بات ہے
حیاتِ شاخِ گل بھی ہے، حیاتِ خار زار بھی
یہ اپنا اپنا ظرف ہے، یہ اپنی اپنی بات ہے
یہ عصرِ نو کی دین ہے، خلوصِ آگہی نہیں
ہر ایک بوالہوس کے لب پہ عاشقی کی بات ہے
یہ سچ کہ مجھ کو زندگی نے غم ہی غم عطا کیا
مگر مری زباں پہ حسنِ زندگی کی بات ہے
خدا کرے کہ جھوٹ ہو، اگر سنا ہے میں نے بھی
ہر ایک کہتا آج تیری بے رخی کی بات ہے

یہی غزل کا حسن ہے، ہر ایک شعر بول اٹھے
نقیبِ فکر و فن ہوں مجھ میں زندگی کی بات ہے

●●●

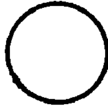


زیب غوری

صدف کی مثل ہے خالی کنارِ چرخ و زمیں
بشر کہ گوہرِ یکتا تھا، کھو گیا ہے کہیں
پڑی ہے داغ کی صورت بساطِ لیل و نہار
نہ کوئی ماہِ درخشاں نہ کوئی مہرِ مبیں
تمام تارِ نفس جھنجھنائے جاتے ہیں
سکوتِ شام ہے یا کوئی نغمۂ شیریں
نہ جانے کون سا غم کھائے جاتا ہے دل کو
غمِ حیات تو کیا ہے، غمِ وفا بھی نہیں
کسی کو بھی نہ ملا زندگی کا کوئی سراغ
ہزاروں آنکھیں سمندر کی تہ میں ڈوب گئیں
عجیب دور ہے، یہ دورِ زندگی دشمن
نہ کوئی شخص جواں ہے، نہ کوئی شخص حسیں
نہ تابِ گریہ، نہ زیبؔ اضطراب کی طاقت
اب اپنے کاٹے سے کٹتی ہے غم کی رات کہیں

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

•••



چندر نایاب

رواں دواں ہیں فروغِ سوزِ جگر سے میری دعا کے آنسو
برس رہے ہیں گھٹاؤں کی طرح چشمِ درد آشنا کے آنسو

نہ پوچھو اُن کی خوشی کا عالم، جنہوں نے منزل کو پا لیا ہے
ہمیں ہیں اک فلسفی کہ جس نے بہائے منزل پہ آ کے آنسو

شفق نگاہوں کی شام ہوتے ہی جیسے کجلا کے رہ گئی ہے
مثالِ انجم جھلک رہے ہیں، جو اُن کی پلکوں پہ آ کے آنسو

ہزار ہا قمقموں سے روشن ہوئے ہیں ماحول کے اندھیرے
جھکایا جب جب بھی میں نے سر کو کسی کے در پہ بچھا کے آنسو

کہیں پتہ لگ نہ جائے ان کو بھی میرے حرماں نصیب دل کا
اسی لئے اُن کے سامنے مسکرا رہا ہوں چھپا کے آنسو

وہ اور ہوں گے جنہیں ہے مرنا، ابھی تو نایابؔ ہم جئیں گے
ہمیں سکھایا ہے دل نے جینا، کھلا کے غم اور پلا کے آنسو

•••

جوگندر پال

نئی لڑکی

اگر آپ میری کہانی سننے پر جھٹ ہی آمادہ ہو گئے ہیں تو اس میں آپ کا کوئی دوش نہیں۔ غالباً آپ سوچ رہے ہیں، خوبصورت لڑکی ہے، شاید اپنی ناکام محبت کا ایک دلچسپ قصہ سنائے گی کہ کس طرح بے چاری کو کسی سنگ دل نوجوان نے بہلا پھسلا کر منجدھار میں ڈوبنے کو چھوڑ دیا ——— واہ بھئی! اپنی کہانی ابھی میں نے شروع نہیں کی مگر آپ مجھ پر پہلے سے ہی ترس کھانے لگے۔ آپ ہی کیا، میں بھی آپ کی جگہ ہوتی تو اپنی خوب صورتی پر ریجھ ریجھ کر میرا دل چاہتا کہ اپنے آپ پر ترس کھاؤں ——— ترس اگرچہ کھانے کی چیز نہیں، پر ہے بڑا پُر ذائقہ ...... میں اپنی خوب صورتی کا ذکر کر رہی تھی۔ بات یہ ہے کہ خوب صورت چہرے سدا کھوئے اور غم زدہ لگتے ہیں اس لیے آپ بھی دھوکا کھا گئے ہیں۔ دراصل میں نے زندگی بھر کسی سے محبت نہیں کی، صرف محبت کے اَن ہونے فلم دیکھنے کی شوقین ہوں تاکہ جی بہلتا رہے اور بس۔ اپنی روز مرہ کی زندگی میں سچ مچ کے ہزاروں جھوٹ بولتی ہوں، یہاں فلمی کہانیوں میں جھوٹ موٹ کا سچ دیکھ دیکھ کر طبیعت کو ذرا فرحت محسوس ہونے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پریاں اور پریمی قصے کہانیوں اور فلموں میں ہی ملتے ہیں۔ اپنے کسی کام کے نہیں، پر پڑھنے اور دیکھنے میں پیارے اور بے ضرر سے معلوم ہوتے ہیں۔

میں اپنی عمر کے اٹھائیسویں سال میں ہوں مگر ابھی تک شادی نہیں کی۔ دو سال اور ڈھب کا آدمی نہ ملا تو میں نے سوچ رکھا ہے کہ شادی کا خیال ترک کر دوں گی۔ شادی کی بات چلی ہے تو مجھے ایک بھولا ہوا چہرہ یاد آ گیا ہے۔ میں نے شاید غلط بیانی سے کام لیا ہے کہ پریمی صرف قصے کہانیوں میں ملتے ہیں۔ سروپ میرا پریمی ہی تو تھا اور تھا بھی میری آپ کی دنیا کا آدمی۔ میں دراصل آپ سے یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ ہماری موجودہ زندگی کی حقیقت پسندی کے باوجود بعض اوقات کئی اَن ہونے واقعات رونما ہو جاتے ہیں یعنی لگاتار جھوٹ بول بول کر زندگی کو اچانک کبھی کبھی بے اختیار یہ خواہش ہونے لگتی ہے کہ کوئی بڑا تگڑا سا جھوٹ بول دے۔ سروپ کے واقعہ میں بھی یہی ہوا۔ دیکھئے نا! ڈھائی سو روپے ماہوار کا بابو عشق کرنے نکل پڑا تھا کوئی موٹا سا بیوپاری [illegible] منظور ہو تو محبت کی بات کوئی زیادہ قابلِ یقین معلوم نہیں ہوتی۔ پر تین ہندسوں کی رقم پہ تو عشقیہ نظم کی چھوٹی سے چھوٹی ترکیب بھی نہیں ہوتا۔ خیر، بات اَن ہونی سہی پر ہو گئی۔

سروپ ہر شام کو مجھے کسی قیمتی ریستوران میں لے جاتا اور میں ——— ؟ میں بخوشی اس کے ساتھ ہو لیتی۔ کیوں نہ؟ گراں قیمت گڈ ٹائم کی فراہمی کے موقعے کو ہاتھ سے جانے دیتی؟ میں یہ سمجھتی رہی کہ وہ میرے ایکس باس کی مانند ایکسپورٹ کے سرکاری لائسنسوں کا بیوپار کرتا ہے، مالدار ہے۔ میری شامیں اس کے دم سے خوشگوار ہیں۔ جب تک یوں بسر ہوتی ہے بسر ہو جاؤ۔ ان دنوں اگر وہ مجھے شادی کا پرپوزل بھی پیش کرتا تو میں بخوشی قبول کر لیتی۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ وہ ایک بار [illegible] میں اس کی بیوی بن کر اس کا جائزہ بھی لیا اور مجھے اس کی [illegible] پر شک کی کوئی گنجائش نظر نہ آئی۔ یہ واقعہ میری کچی جوانی کے دنوں کا ہے، ورنہ آج کل تو ہر مردانہ چہرہ [illegible]

نظروں کی اس حیثیت میں ہیں نظر آتی ہے، جیسے بنک چیک پر اس کی
بیت کی ٹائپ شدہ رقم۔

ہوا یہ کہ انہی دنوں سروپ کا باپ مر گیا تھا اور اس کی ساری عمر
کے جیے کا دو چار ہزار روپیہ سروپ نے میری دو چار ماہ کی خوشنودی
پر صرف کر دیا اور آخر ایک روز وہ مجھے ایک عوامی ریستوران میں لے
گیا جہاں اس کے جان پہچان کے چہرے مجھے دیکھ دیکھ کے مسکرا
مسکرا کر لبوں اور آنکھوں سے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ ان کی حرکات
تمسخر آمیز تھیں اور یوں لگتا تھا کہ میرا تمسخر اڑانے کا یہ حق حاصل کر کے
وہ سوچ رہے ہیں کہ میرے ضمن میں اپنے آپ کو دیگر سب حقوق کا
مالک سمجھ بیٹھے ہیں۔ ایک تو بڑی بے تکلفی سے ہماری میز کے پاس
آ بیٹھا اور مجھے بتانے لگا کہ دفتر میں اس کی اور سروپ کی میز ساتھ ہی
ہے اور پھر نہ جانے پانی کا گلاس پی کر میز پر رکھی ہوئی شکر سے منہ
میٹھا کرنے لگا اور میں اور ریستوران کا بیرا اسے ٹیڑھی نظروں سے
دیکھتے رہے۔

اس عوامی ہوٹل سے جلدی اٹھ کر سروپ مجھے قریب ہی ایک
پبلک پارک میں لے آیا اور بڑے پرائیویٹ لہجے میں مجھ سے گویا
ہوا۔

"مجھے تم سے بڑی محبت ہے چندا۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔ جب تک
اس کے پاس اپنے غریب باپ کے جیے کے پیسے کی فراوانی تھی اس
نے اپنے محبت کے اعلان کو غیر ضروری سمجھا مگر اب اسے اپنی نثری
شاعری کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

"میں ساری عمر تمہیں پلکوں پر بٹھاؤں گا"

مگر مرد کی پلکیں صوفے کا کام دے سکتی ہیں؟

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میں گھبرا کر بیٹھی بیٹھی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز گام اپنی راہ
پر چل دی اور وہ بھی تیز تیز میرے پیچھے ہو لیا۔

اس واقعہ کو کئی سال ہو گئے ہیں۔ مجھ سے سروپ اور اس
کا شہر چھوٹ چکا ہے لیکن اب بھی کبھی کبھار چلتے چلتے اچانک معلوم
ہونے لگتا ہے کہ سروپ میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ "چندا......
......! اری سنو تو! .... ج...... ن......" اور میں
اپنے واہمے پر ہنس دیتی ہوں۔

آپ شاید سروپ پر ترس کھا رہے ہیں۔ آپ بھلا اتنے
بھولے کیوں رہتے ہیں؟ جب بھی دیکھو آپ نے ذہن کے
دانت ہل رہے ہوتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ آپ ترس کھا رہے
ہیں۔ میں آپ کی ڈش نہیں بنی تو آپ نے سروپ کو پلیٹ میں سجا
کر ڈائننگ ٹیبل پر دھر لیا ہے۔ اچھا، آپ ترس مجھ پر کھائیں،
سروپ پر، یا کسی اور پر، ذائقہ ایک ہی رہتا ہے، جیسے آپ نے
کسی تند نشے پر اپنے بزرگوں کی منظوری سے تین چار فیصد الکوہل
والی ڈرنک کو ترجیح دی ہوتا کہ ذہن پر سست رو، بے عمل
سا سرور طاری رہے، آپ کے آس پاس جو کچھ بھی ہے، برا، بھلا،
سب بھلا بھلا معلوم ہو۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ بظاہر اوروں
پر ترس کھا رہے ہوتے ہیں لیکن آپ کے سامنے ہوتا ہے آپ کا
اپنا سایہ، اپنا ہی میلا میلا روپ۔ خود ترسی سے آدمی بے
شکل ہو کر بڑا نیک نکل آتا ہے تین چار فیصد الکوہلک ڈرنک
کے ننھے ننھے قدموں سے آپ کی طرف بڑھتا ہوا سرور احسن سے
گلے مل کر سارا جہان گُڈ اور پُور معلوم ہونے لگتا ہے، بس
اتنی سی بے ہوشی، کہ آدمی اپنی رضامندی سے ذرا سا بے بس
ہو جائے اور گرد و پیش کی اشیا کو ان کی نیکی اور بے چارگی
سے شناخت کرے۔ سب نیک ہیں، آپ بھی، وہ بھی، میں بھی
—— ایک برا ہے تو یہ زمانہ —— ارے!
میں کس رو میں بہہ گئی؟ کہیں ذرا بھی نشیب آ جائے تو پوری کی پوری بہہ
نکلتی ہوں۔ پھر بھی کیوٹی کونٹنٹ کا بیت ہے کہ میرے دل نہیں۔
آپ سوچیے، نہیں، اس میں سوچنے کی بھی ضرورت نہیں، سوچے
بغیر ہی بتائیے کہ دل کے بغیر کون زندہ رہ سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے
کہ یہ لوگ اتنا تو مجھ سے بہ دور ہیں نہ سوشی آ تو جی ہے۔ خیر یہ
سارا قصہ ہی چھوڑیے۔ میں شادی کا ذکر کر رہی تھی۔ میرے
نزدیک شادی کسی جذبے کا نام نہیں۔ شادی اگر سنجل کے کی

جائے تو جینے کی ایک اچھی خاصی سہولت مہیا ہو جاتی ہے اور یہی اس کا صحیح فنکشن ہے۔

پرانے لوگ اپنی اس بنیادی ضرورت کو تقدس کا درجہ دیتے تھے، یعنی جنس اور موسم بہار ان کی مذہبی رسومات سے متعلق تھے۔ مجھے شادی کا تقدس ذاتی طور پر اس لئے قبول ہے کہ اس کے توسط سے بیٹھے بٹھائے ایک آرام دہ، پرسکون لائف فراہم ہو جائے گی سو اپنی شادی کے لئے میری نظر کسی غیر ذمہ دار چھوکرے کی بجائے درمیانی عمر کے متمول لوگوں پر رہتی ہے۔ بنگلہ، کار، وقار، حکومت، فراغت ———— یہ ہے کسی خاتون کی کامیاب شادی کا ماحاصل۔ کوئی خوب رو، بے کار چھوکرا پسند آ جائے تو اس سے ذرا فلرٹ کر کے مطمئن ہو لئے، یہی بہت ہے۔ شادی کے لئے تو پینتالیس پچاس برس کا کارخانہ دار، کامیاب سیاسی لیڈر، یا مستند فلم ایکٹر جو اپنی بڑی عمر کے باوجود بدستور ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا ہو، یا ایسے دوسرے لوگ موزوں ہیں۔

چند ماہ ہوئے میں نے شادی کی نیت سے ایک سنتالیس سالہ فلم سٹار سے تعلقات بڑھانے شروع کئے۔ وہ دمے کا مریض تھا، دانتوں کا سیٹ مصنوعی تھا اور بال صاف ڈائی کئے ہوئے معلوم ہوتے تھے پر وہ ہماری نیشنل فلم ورلڈ کا ایک اہم ہیرو تھا اور انکم ٹیکس کے لاکھوں روپے بچانے کے لئے اس نے اپنے ہاں تین چار اکاؤنٹنٹس کا تقرر کر رکھا تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف بڑھتے چلے آنے کا گرین سگنل دے دیا اور وہ بڑھتا بڑھتا میرے ساتھ آ لگا مگر ہماری دو چار ماہ کی رفاقت کے بعد جب ہم اپنی شادی کا پلان بنا رہے تھے اور جب اس ضمن میں اس کی کوشش سے اخبار والے ہماری شادی کی افواہوں اور مشترک مشاغل کی حاشیہ آرائی کر کر کے یہ ثابت کر رہے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی بنائے گئے ہیں، تو اچانک ہمیں اپنے تعلقات کو ری ویو کرنا پڑ گیا — ہوا یہ کہ مجھے اس ادھیڑ عمر ہیرو کے ساتھ کام کرنے والا ایک نوعمر خوش شکل ولین بھا سا گیا۔ وہ پیشہ ور ولین ہونے کے باوجود بڑا معصوم نوجوان تھا۔ میک اپ کر کے میرا مستقبل کا شوہر، جو سراسر ولین تھا، ہیرو نظر آنے لگتا اور یہ خوب صورت اور بھولا بھالا نوجوان ڈاؤن رائٹ ولین۔ جب نیک آدمی بُرا بُرا سا نظر آئے تو عورت کی نیت اپنے آپ خراب ہونے لگتی ہے، سو میں اس بھولے بھالے خوبصورت ولین کی طرف رجوع کرنے لگی اور ایک دن اکیلے میں ...

قصہ مختصر میرے ہوتے سوتے ہیرو نے اچانک اخباروں میں اعلان دے دیا کہ ہم دونوں کی شادی کی خبریں من گھڑت ہیں اور اس کی محبت اور زندگی کسی ایک لڑکی کی بجائے اس کے کروڑوں فینز کے لئے وقف ہے۔ یوں میرا بنا بنایا کھیل چوپٹ ہو گیا۔ میرے منہ بولے ولین بے چارے کی آمدنی بس اتنی تھی کہ وہ بمشکل اپنی ہی گزر بسر کر سکے۔ مگر اس نے بھی ایک دن سروپ کے مانند فریادی لہجے میں شادی کا پروپوزل پیش کیا، آدمی پسندیدہ تھا اس لئے میں نے اسے سیدھی راہ پر لانے کے لئے صاف پوچھا "کیا تم پانچ ہزار ماہوار کے حساب سے کم از کم پانچ سال کی رقم میرے نام بنک میں جمع کرا سکتے ہو؟"

سنا ہے میرے انکار کے بعد پوور ڈارلنگ کا دل حقیقی معنی میں ٹوٹ گیا اور وہ ٹیڑھی راہ پر لگ گیا اور اچھا خاصا پیشہ ور ولین ہونے کے باوجود اپنے فلموں میں اس کا لہجہ لاشعوری طور پر ہیرو کا سا ہو گیا اور اس طرح اسے اپنے جاب سے ہاتھ دھونا پڑا اور خوب اچھی طرح ہاتھ دھو کر وہ جب اپنے ہوٹل میں کھانے کی میز پر بیٹھا تو مالک نے اسے پیٹ بھر روٹی دینے سے انکار کر دیا۔

تاہم ایک نوجوان مجھ سے خوب ٹکرایا۔

"مادام!" جب میں نے اس سے شادی کرنے سے انکار کیا وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں جانتا ہوں تم کسی بوڑھے بزنس مین سے شادی کرنا چاہتی ہو، مگر تم بے وقوف ہو۔"

"شٹ اپ!"

"یا اندھی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ان بوڑھوں کی شادیاں بچپن میں ہی ہو جاتی ہیں اور جوں جوں یہ بوڑھے ہوتے ہیں، ان کی بیویاں کنٹرولی اور کمرانڈیلی نکلتی آتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی بیویوں سے خوف زدہ رہتے ہیں اور اپنے پیسے بنک میں [illegible]

یوگ راج

مانگے کے بھائی

مانگے کے بھائی یعنی منہ بولے بھائی بہنوں کے رشتے کا میں ہرگز ہی سے قائل نہیں رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں فراڈ زیادہ ہوتا ہے اور سنجیدگی کم۔ کالج میں بہت سے لڑکوں کی یہ عادت تھی کہ جب لڑکی سے قربت یا اس سے گفتگو کرنے کا کوئی اور ذریعہ ہاتھ نہ لگا تو کسی نہ کسی طرح اسے بہن بنا لیا پھر شعوری یا غیر شعوری طور پہ بہن بھائی کے اس رشتے سے پردے کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی بھوک مٹاتے تھے۔ شاید وہ یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ راکھی کے دھاگے کلائی پہ باندھے جاتے اور جذبات کی کوئی کلائی نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود وہ مجھ کا منہ بند کرنے کے لئے بہن بھائی کے مقدس رشتے کے حوالے دیتے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر میں کسی بہن سے محروم ہوتا تو مجھے بھی اس رشتے کی اہمیت کا احساس ہوتا۔ لیکن میرا جواب ہوتا تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو اول تو میں کسی سے راکھی نہ بندھواتا اور بندھواتا تو اسے بہن نہ بنا لیتا۔ کیا راکھی بندھوانے کے لئے بہن ضروری ہے؟ اگر میری کوئی بہن نہیں تو اسے جھٹلایا کیوں جائے۔

مجھے ایسے لڑکوں سے سخت نفرت رہی ہے جو اپنی نفسی بھوک کو اس طرح مٹاتے تھے۔ لیکن میرا نظریہ بدل گیا ہے۔ آج مجھے ایسے لڑکوں سے نفرت کی بجائے ہمدردی ہو رہی ہے۔ ان کی حالت پہ رحم آ رہا ہے۔ بلکہ آج میری بھی وہی حالت ہے۔ میں بھی انہی جذبات کی گرفت میں پڑا ہوا کسی کو بہن بنانے پر تیار ہو گیا ہوں کیوں کہ اس کی بھولی بھالی بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھوں میں بلا کی کشش ہے۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پہ ایک عجیب طرح کی دعوت ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں وہ سکون ہے جو کسی کے جذبات کے پرسکون تالاب میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ جوان ہے۔ جوانی جو لاوے کی مانند کھولتی ہے۔ جھرنوں کی مانند پہاڑوں کا سینہ چیرتی ہوئی پھوٹ پڑتی ہے۔

دراصل میری ایک کہانی جو بھائی بہن کے مقدس جذبے کے گرد گھومتی ہے رادھا کے ماتا جی کو بہت متاثر کیا۔ خدا جانے رادھا کے ماتا جی ضرورت سے زیادہ جذباتی تھیں یا میری کہانی میں ایسے جذبات کا ہیجان زوروں پر تھا۔ وہ کہانی کے مرکزی کردار کو میری ذات سے منسوب کر بیٹھی تھیں۔ اور مجھے اپنا نسبالعین بنا لیا تھا۔ پہلے خط میں ایک طویل داستان تھی۔ سستے قسم کے جذباتی فقروں سے بھرپور بھائی کی بہن کی زندگی میں کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد کوشش کر کے میری ہر کہانی کو بڑے تقدس سے پڑھتی تھیں اور ہر بار لمبے لمبے خط لکھتیں جن میں کہانی کی تعریف کے بعد مجھے بھائی بنانے کی خواہش کا اظہار بڑے دردمندانہ لہجے میں ہوتا تھا مجھ سے بھائی کے پیار کی بھیک مانگی جاتی تھی۔ لیکن میں نے ایسے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ میرا دماغ اس طرح بغیر جانے پہچانے ان دیکھے اجنبی سے رشتہ پیدا کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوتا تھا۔ ٹھیک ہے ان کا اپنا کوئی بھائی نہیں۔ ان کی موسی یا چاچا سے بھی کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی کسی بھائی کی کلائی پہ راکھی نہیں باندھی۔ کبھی کسی بھائی کے ماتھے پہ تلک نہیں لگایا۔ اور انہیں بھائی کا پیار پانے کی بڑی چاہ بھی ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح بھائی کیسے بنائے جاتے ہیں۔

ایک دن ان کے خط کے ساتھ اندر کئی خطوط تھے۔ ان خطوط میں ان کی بڑی بیٹی رادھا کا خط بھی تھا۔ ایک فیملی گروپ بھی تھا جس میں رادھا اپنی ماں کے بالکل پیچھے ایک عجیب انداز سے مسکرا رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے رادھا کا خط پڑھا۔ اوپر لکھے القاب نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑنا چاہا لیکن میں نے اس پہ دو تین بار سیاہی پوت دی۔ خط کو ایک ساتھ کئی بار پڑھ گیا۔ میری تمنائیں کسی بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئیں اور اس خط سے ایک ایسی تسکین حاصل کرنے لگا۔ جس کی مجھے مدت سے تلاش تھی گو باقی خطوں میں بھی ایک عجیب طرح کی خوشی کا اظہار تھا جس کی تلاش میں وہ ایک لمبے عرصے سے تڑپ رہے تھے جیسے میں کافی عرصے سے گم تھا۔ انہیں میرے ملنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن آج اچانک قلمی ملاقات ہو گئی تھی۔ رادھا کے خط میں ایک خوبصورت سی یگانگت تھی۔ جیسے میں اس کی خوشیوں کا مرکز ہوں۔ میں اب بھی جواب نہ دیتا لیکن رادھا کی مسکراہٹ نے مجھ سے خط کا جواب کچھ اس انداز سے مانگا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ اس نے خط کی آخری سطروں میں تو فقط یہی لکھا تھا۔ اور بار بار لکھا تھا۔

"آپ شملہ آئیے۔ اور ضرور آئیے۔ مجھے وشواس ہے کہ آپ آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔"

میں نے خط کا جواب رادھا کے ماتا جی کو دیا لیکن اس میں شملہ آنے کے سلسلے میں بالکل خاموش رہا۔ کچھ دنوں بعد پھر رادھا کا خط آیا۔ وہی اصرار تھا۔ رادھا نے لکھا تھا۔ "اگر آپ نہیں آئیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ ہم سے ناراض ہیں"۔ نہ جانے کیوں میں اس فتوے کی تاب نہ لا سکا۔ اور شملہ جانے کے لئے راضی ہو گیا۔

گاڑی اپنی مدھم رفتار سے چل رہی تھی۔ اور میں ایک ناول پہ نگاہیں جمائے پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کا خوف میرے ذہن پر سوار تھا جیسے میں کوئی چوری کرنے جا رہا تھا۔ میں نے خود کو لاکھ سمجھایا کہ "تم اپنی بہن اور بھانجیوں سے ملنے جا رہے ہو" لیکن اندر ہی اندر کوئی میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ میری ہر دلیل کو جھٹلا رہا تھا۔ رادھا اور اس کے ماتا جی کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا متضاد جذبوں میں کشمکش سی چل رہی تھی۔ میرے دماغ میں ایک نظم سی چل رہی تھی۔ اس نظم میں رادھا بار بار آتی۔ کبھی اپنے دونوں بازو میری گردن میں حائل کر کے اپنی پیشانی میری پیشانی سے ٹکرا کر ترنم بھرے انداز میں کچھ کہہ رہی ہوتی۔ کبھی میں صوفے پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا ہوں اور رادھا اپنی نرم و نازک انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ کنگھی کرتے کرتے اس کا چہرہ خود بخود میری پیشانی کے نزدیک آ جاتا ہے۔ اس کی سانسوں کے شعلے میری پیشانی کو جھلس دینا چاہتے ہیں۔ اس کے ہونٹ میری پیشانی کو چھونے ہی لگتے ہیں تو نہ جانے پیچھے سے کون میرے کان میں کہتا سنائی دیتا ہے۔

"تیری بہن کی لڑکی ہے یہ تمہاری بیٹی ہے۔ اس [illegible] سوچتے ہو؟"

اور میں پریشانی سے سر کو کئی جھٹکے دیتا ہوں تاکہ دماغ صاف ہو جائے۔ یہ آواز پھر زور سے زور سے گونجنے لگتی ہے۔ میں تنگ آ کر اس نظم کو دماغ سے صاف کرنے کی غرض سے کئی جھٹکے دیتا لیکن یہ نقوش مٹتے ہی نہیں۔ آخر گاڑی کی چیخ نے میری [illegible] نے دھیرے دھیرے دم توڑ دیا۔ سواریاں جلدی سے پلیٹ فارم پر کھڑے لوگوں میں اپنوں کو ڈھونڈنے لگیں۔ میں آرام سے اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ سارا ڈبہ خالی ہو گیا تو بڑے آرام سے اٹیچی کیس اٹھا کے نیچے اترا اور سنسان پلیٹ فارم پہ اپنے قدموں کی چاپ سے ترنم پیدا کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں جب بھی کہیں باہر جاتا ہوں تو اچانک آ ٹپکتا ہوں بنا کسی طرح کی اطلاع کے۔ اور یہاں بھی ایسے ہی آیا۔

گو پتہ اتنا مشکل نہیں تھا لیکن مجھے ہمیشہ کی طرح اسی مقام کے اردگرد کئی چکر لگانے پڑے۔ آخر ایک شریف آدمی میرے ساتھ ہو لیا۔ کوٹھی کے پاس پہنچے تو شک سا ہوا کہ یہاں کوئی رہتا بھی ہے۔ ملا پردوں کے دروازوں کے شیشوں میں سے کمرے میں ایک لڑکی پانی پیتی نظر آئی۔ یہ رادھا تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو رادھا دروازہ کھولتے ہی بچوں کی مانند چلائی۔

"ماما جی۔ دنیش ماما جی"

وہ ضرور میرے گلے میں باہیں ڈال کر بچوں کی طرح جھولنے

تھی اگر میرے ساتھ وہ آدمی نہ ہوتا۔ اس کی چیخ نے سب گھر والوں کو
اٹھا دیا۔ مجھے کمرے میں لے جا کر سب نے گھیر لیا۔ طرح طرح کے سوالات
کی بوچھار شروع ہو گئی۔ لیکن میں سب سے بے نیاز صرف یہ سوچ
رہا تھا کہ واقعی ہی یہ رادھا تو بچوں کی طرح بھولی بھالی ہے۔ اس
نے عمر کا ساتھ ہی نہیں دیا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں کہ اس کی عمر
اس وقت سترہ اٹھارہ سال کے قریب ہے۔ اور وہ ایک اجنبی سے
ملتی ہے۔ رادھا کے ماتا جی اور باقی لوگ بھی مجھ سے اسی طرح
ملے جیسے بڑی پرانی رشتے داری ہو۔ سب بچے میری گود میں ایسے ہی گھسے
جیسے میں کہیں بھاگ... اجنبی نہیں سمجھا گیا۔ رادھا کی ان میں بھی بالکل
شرکت تھی۔ میرے آنے پر انہوں نے آس پاس کے کئی لوگوں کو بلا
کر ان سے میرا تعارف کرایا۔ میں ان کا بھائی ہوں۔ ان سب بچوں کا
ماموں۔ ان سب لوگوں میں ایک عجیب طرح کی بے تکلفی سی آ گئی تھی۔
جو میری پریشانی کا باعث بھی تھی۔ ٹھیک ہے کہ انھوں نے مجھے اپنا بھائی
مان لیا ہے۔ اور صدق دل سے اپنا لیا ہے۔ لیکن بات یہیں تو ختم نہیں
ہوتی۔ صرف ایک طرف کی سنجیدگی اور خلوص ہی تو کافی نہیں۔ کم از کم اپنا
سب کچھ ایک اجنبی کے حوالے کرنے سے پہلے، اتنے نازک اور مقدس رشتے
کی بنیاد رکھنے سے پہلے، اس کے دل میں بھی تو جھانک کے دیکھ لیں۔
ضروری تو نہیں کہ اس کا دل بھی انہیں جذبات سے معمور ہو۔ جسے آپ
اپنا ہمراز بنانا چاہتی ہیں وہ کوئی جاسوس بھی تو ہو سکتا ہے۔ ہر آتے
جاتے شخص کو مہمان بنا لینا تو چور کو دعوت دینا ہے۔ کھانا کھا رہے
ہیں تو اکٹھے سو رہے ہیں تو سب کے سب ایک ہی کمرے میں۔ رات
رات بھر باتیں ہو رہی ہیں۔ رادھا کے ماتا جی نے مجھے اپنے خاندان
کا پورا شجرہ نسب بتا دیا۔ اس میں بہت سی راز کی باتیں بھی تھیں۔
میں سمجھتا ہوں کہ ایک اجنبی کو جانچے بغیر بتانا خطرے سے خالی
نہیں۔ گو میرے لئے ایسی فضا سازگار تھی۔ یہ بے تکلفی اور اجنبی پر
اعتماد میرے حق میں سب کچھ ٹھیک تھا لیکن پھر بھی کچھ تو تکلف
ہونا چاہیے۔ اس بیچ میں نے کئی بار رادھا کے چہرے کو اپنی بھوکی
نظروں کا شکار بنانے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کی دھلی دھلی
سی آنکھوں سے بجلی کے کوندے لپکتے اور میری نظروں کو [illegible]
کر دیتے تھے۔

دوپہر کو گھر کے سب لوگوں کے ساتھ بیٹھا میں بھی کھانا کھا رہا
تھا کہ رادھا نے کہا: "ماتا جی آج ہمیں پکچر دکھا دیجئے۔"

میں نے خوف کے زیر اثر کوئی جواب نہ دیا تو رادھا پھر
بولی۔

"اگر پیسے نہیں ہیں تو ماتا جی سے ادھار لے لیجئے۔"

اس پر سب لوگ ہنس دیئے۔ رادھا کے ماتا جی بولے۔

"ہاں ہاں۔ ضرور دکھا دو انہیں فلم۔"

تب میں نے جواب دیا۔

"جیسا آپ کہیں .... لیکن ......"

"لیکن کا انتظام ماتا جی کر دیں گے۔"

رادھا نے شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ رادھا
کی دو چھوٹی بہنوں نے اترے چہرے سے کہا۔...

"لیکن ہمیں تو آج چھٹی نہیں مل سکتی۔"

تو میں نے کہہ دیا کہ کل یا اتوار کو دیکھ لیں گے۔ اس پر
رادھا نے چلاتے ہوئے کہا۔

"ان کو چاہے کل دکھلیئے یا اتوار کو لیکن میں آج ہی
دیکھوں گی۔ کہیئے نا ماتا جی" رادھا نے اپنی ماتا جی کو سفارش کے
لئے کہا۔ ان کے کہنے پر میں تیار ہو گیا۔

گو میرے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا لیکن
میرے سارے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جیسے کوئی پیچھے
سے دھکیل رہا ہو اور میں پکڑے جانے کے ڈر سے دہشت زدہ
تھا۔ سینما ہال میں پہنچے تو پکچر شروع ہو چکی تھی۔ پکچر دھارمک
تھی اس لئے مجھے کسی طرح کی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن رادھا کے لئے
بڑی متبرک شے تھی۔ انٹرول تک تو کئی بار ارادہ کرتا کہ اپنا ہاتھ کسی
بہانے کرسی کے پیچھے سے جا کر اس کے شانوں پہ رکھ دوں یا بالوں
کو چھو لوں۔ لیکن ہر بار خوف سے کپکپی سی پیدا ہو جاتی تھی۔ ماتھے پہ
پسینے کی بوندیں ابھر آتیں۔ انٹرول کے بعد جب ایک دو بار کوشش
کی تو ہر بار ایسا اتفاق ہوا کہ رادھا بات پوچھنے کے لئے یا سمجھانے

کی غرض سے مجھ سے مخاطب ہوتی "ماموں جی" اور میرا ضمیر وہیں میرے ہاتھ کو اپنی پکڑ میں لے لیتا تھا۔

پکچر ختم ہو گئی۔ رادھا بہت خوش تھی۔ اسے پکچر بہت اچھی لگی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"مجھے صرف ایسی پکچریں اچھی لگتی ہیں دوسری پکچریں میں بالکل نہیں دیکھتی۔ میں نے بابوجی کے ساتھ کبھی پکچر دیکھی ہے۔ ماتاجی کے ساتھ بھی دیکھی ہے چاچا جی بھی ایک بار پکچر دکھانے لے گئے تھے۔ بس ایک یہی چاہ تھی کہ ماموں جی کے ساتھ پکچر دیکھوں۔ سو وہ آج پوری ہو گئی۔"

رادھا سمجھ رہی تھی جیسے اس نے بہت بڑا کام سرانجام دیا ہو۔

صبح سے ہی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس لئے کہیں گھومنے باہر جانے کی بجائے کمرہ بند کئے چارپائی پر دراز ہو کر سرسبز چوٹیوں پر گرتی پھواروں کے منظر میں کھویا کھویا سوچ رہا تھا۔

میں کہاں آ گیا ہوں۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ ان کے پاس تو وہ تحفے ہی نہیں جن کی تلاش میں، میں نکلا ہوں۔ میں تو گھر سے چلا تھا شراب خانے کو اور آ گیا ہوں کسی دھرم شالہ میں۔ جہاں سچے گھڑے کی شراب کی بجائے مقدس پاس پانی چرن امرت کے نام سے ملتا ہے۔ میری بھوک تو کسی خوب صورت اور سڈول سے جسم کی قربت چاہتی ہے۔ تشنہ آنکھیں پہلی ہی جھلک میں بھرپور جوانی کا سارا رس نچوڑ لینا چاہتی ہیں۔ لیکن یہاں تو ہر طرح کی بھوک کی تشفی روحانیت کے مشروں سے کی جاتی ہے۔ جو میری بھوک کے لئے بالکل بے مزہ ہیں۔ صرف ایک ہی جذبہ تھا کہ یا تو چوروں کی طرح بھاگ جاؤں یا اپنی بھوک مٹاؤں۔ بیچ کا راستہ مجھے منظور نہیں تھا۔ جب بھی اپنی ساری ہمت کو سمیٹ کر آگے بڑھنے لگتا تو کم بخت ضمیر کا غیبی ہاتھ پیچھے سے پکڑ لیتا۔ میں نے اسے کچلنے کی لاکھ کوشش کی اکثر یقین بھی ہو جاتا تھا کہ کچل دیا گیا ہے لیکن پھر نہ جانے کہاں سے عین وقت پر یہ سر اٹھا لیتا۔

رادھا چاہتی تھی کہ میری کہانیاں ہندی میں شائع ہوں۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ میں اسے اپنی اچھی اچھی کہانیاں ہندی میں لکھوا دوں۔ ایک رات اسی طرح میں اسے اپنی ایک کہانی لکھوا رہا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ گھر کے سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ رادھا میری ہی چارپائی پر بیٹھی دیوار کا سہارا لئے لکھ رہی تھی اور میں آہستہ بول رہا تھا تاکہ سونے والوں کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ کبھی کسی بات پر رادھا کے دبے دبے قہقہے پرسکون فضا میں ارتعاش سا کر دیتے۔ رادھا کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو گئی تھیں اور میں بھی تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن رادھا کہانی کو مکمل کر کے سونا چاہتی تھی۔ میں نے ایک دو بار ہمت کر کے رادھا کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھا تو وہ صرف مسکرا دی۔ اس کی دھلی دھلی مسکراہٹ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

"بس اب تھوڑا سا ہی رہ گیا ہے۔ ختم کر کے ہی سوؤں گی۔"

لیکن میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا۔

رادھا کی مسکراہٹ میری اس جرأت کو لبیک کہے۔ مجھے اور آگے بڑھنے کی دعوت دے۔ اس کہانی کو چھوڑ کر ایک بالکل اچھوتی کہانی کو جنم دے۔ نہ جانے اس کا دل ایسے جذبات سے خالی کیوں تھا اور میرے سینے میں طوفان سا کیوں اٹھ رہا تھا۔ وہ جوان تھی۔ جوانی تو انہیں جذبات کے تلاطم کو کہتے ہیں۔

میں کہانی کو رک رک کر پڑھ رہا تھا نہ ختم کرنے کی نیت سے۔ بیچ بیچ میں ستانے بھی لگتا تاکہ وقت گزرتا جائے اور کہانی ایسے ہی چلتی رہے۔ آخر میرے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ رادھا بالکل میرے جسم سے چھو رہی تھی۔ اس نے ایک دو بار کہا بھی کہ لکھنے دیجئے۔ لیکن میرے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔ بلکہ ہاتھ پھسلتے پھسلتے ایسی جگہ پہ آ گرا کہ رادھا ایک دم مچھلی کی مانند پھسل کر میری گرفت سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے ابھی اس کی آنکھوں سے شعلے لپکیں گے۔ بجلی گرے گی اور مجھے راکھ کر دے گی۔ ابھی وہ اپنی ماتا جی کو جگا کر سب کچھ بتا دے گی۔ پھر گھر کے سب لوگ میری جانب کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اس برسنے رات میں گھر سے نکال دیا جاؤں گا۔ رادھا کی زبان خاموش تھی لیکن میرے کانوں میں بہت سے لوگوں کی آوازیں ایک ساتھ گونج رہی تھیں۔ لعنت و ملامت کر رہی تھیں۔ لیکن

…نہیں؟ انقطاً ایک نیند میں ڈوبے ہوئے بچے کی مسکراہٹ کی مانند
…معصوم مسکراہٹ تھی۔

"ماما جی! میں تو آپ کی بڑی بہن کی بیٹی ہوں"

اور جلدی سے بستر میں منہ سر لپیٹ کر سو گئی۔

رادھا شاید سو گئی تھی لیکن میری آنکھوں میں نیند کی بجائے
…ذہن تھا۔ رادھا کے الفاظ میرے دماغ میں گونجتے رہے مانو
…میرے ننگے جسم پر کوڑے سے مار رہا تھا۔ آنکھیں بند کرنے پر
…بھاگی، تاجی کئی بار میرے سامنے آئیں۔ انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔
…آنسو بہاتی رہیں۔ نہ جانے انہوں نے مجھے گھر چھوڑ دینے کے
…لئے کیوں نہیں کہا۔ میرا ضمیر انصاف کی مانند اپنے ہاتھوں میں سینکڑوں
…منوں کی آگ لئے گھوم رہا۔ ابھی مجھ پر یہ آگ گرا دی جائے گی۔
…میں راکھ ہو جاؤں گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا ضمیر آہستہ آہستہ سلگتا رہا۔ جیسے
مجھے کسی بہت بڑی بھٹی میں لٹکا دیا گیا ہو۔

میں اس کمرے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا۔ برستی رات کے
بھیگے اندھیرے میں بھٹکتا رہا۔ کئی بار جی چاہا کہ میں بھی اسی رات کی
مانند زار و قطار روؤں جو میری حالت پر آنسو بہا رہی تھی۔ اس ماں
کی مانند جس کا اکلوتا بیٹا۔ وہ بیٹا جو اپنی شرافت کے صدقے اپنے حلقے
میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہو۔ جس کے نام پر وہ سر
فخر سے اونچا کرکے چلتی تھی۔ اسی بیٹے نے آج دنیا کی سب سے ذلیل حرکت
کرکے اس بڑھاپے میں اسے دنیا کی نگاہوں سے گرا دیا ہو۔

میں ان گہری کھائیوں میں کود جانا چاہتا تھا لیکن ان کھائیوں
نے بھی مجھ جیسے ذلیل انسان کو اپنی عمیق گہرائیوں میں پناہ دینے سے
انکار کر دیا تھا۔

●●

افسانہ

اثر فاروقی

دوسرا آسمان

وہ تو اچھا ہوا می نے اپنا بر آپ ڈھونڈ لیا۔ ورنہ آپ لوگ تو تلاش ہی میں رہ جاتے، پہلے پہل اماں جب صفیہ کی زبانی یہ الفاظ سنتی تو تلملا کر رہ جاتیں اور اپنی بیٹی کی بے حیائی اور ڈھٹائی پر ان کا دل رد رو دیتا وہ غصہ میں سو سو بار صفیہ کو لعنت ملامت کرتیں۔ ان کا بس چلتا تو بیٹی کا نوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال لیتیں۔ وہ جب تھوڑی دیر پیچ و تاب کھاتیں تو اس کے فوری بعد انہیں اپنا زمانہ یاد آجاتا۔ اس وقت کوئی جوان بیٹی اس طرح کی باتیں ماں کے سامنے کرتی تو اس کی زبان کھینچ لی جاتی۔ جوانی تو ہر لڑکی پر آتی ہے۔ ان پر بھی آئی تھی مگر کیا مجال کہ اس قسم کی الٹی سیدھی یا غلط سلط بات ان کی زبان تک آئی ہو۔ ماں باپ نے جب تک کچھ نہ کہا خاموش رہیں، صبر کیا والدین کی مرضی یا خواہش کے سامنے کوئی لڑکی زبان کھول سکتی ہے کم از کم وہ اسی خیال کی حامی تھیں ان کی اس سعادت مندی پہ نہ صرف والدین بلکہ اڑوس پڑوس کے لوگ اور رشتہ دار بھی عش عش کر اٹھے۔ اسی طرح کی ہزاروں باتیں ان کے ذہن میں آتیں اور یادوں کا یہ سلسلہ دیر تک قائم رہتا۔ یہ تو خیر اس زمانے کی بات ہوئی جب وہ کنواری تھیں مگر شادی کے بعد بھی انہوں نے اپنی ڈگر کو نہیں چھوڑا۔ صفیہ کے ابا ترس ترس گئے کہ وہ ایک بار بھی سہی ان کا نام لے لیتیں۔

مگر ان کی یہ حسرت، حسرت ہی رہی اور کبھی ان کی زبان پر اپنے [illegible] کا نام نہ آسکا۔ ان کی کئی قریبی سہیلیاں صرف اس بات پر ان سے روٹھ گئیں کہ انہوں نے بے حد اصرار پر بھی سہیلیوں کی بات نہیں مانی تھی کہ وہ اپنے شوہر کا نام اپنی آواز میں ان کے کانوں تک پہنچا دیتیں جسے ان کی سہیلیاں یوں تو کئی بار سن چکی تھیں۔ "اوئی ماں تم تو حیا کا مجسم نمونہ ہو۔ یوں تو ہزار [illegible] کے نام لوگی مگر بس شوہر کا نام لیا اور زبان حلق سے باہر آگئی"! ایک دن انہیں خوب جلی کٹی سنی پڑی اور سہیلیوں نے ایک ساتھ سینکڑوں باتیں کر ڈالیں مگر ان کی روش میں رتی برابر فرق نہیں آیا وہ جب اس زمانہ کو یاد کرتیں اور یادوں کا یہ لامتناہی سلسلہ جوں توں کر کے ختم ہو جاتا تو وہ اپنے دل ہی دل میں کوسنے دے ڈالتیں کہ کیسے دن انہیں دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ وہ ہر وقت دعائیں مانگتیں کہ ان کے نصیب کا لکھا ان کے مرنے کے بعد پورا ہو۔ کیا انہوں نے صفیہ کے لئے اپنی کوششوں میں کوئی کسر رکھ چھوڑی تھی۔ بھلا اپنی بچی کی فکر والدین کو نہ ہوگی تو کیا ایرے غیرے لوگوں کو ہوگی۔ پڑوسن سے اسی سلسلے میں کتنی بار انہوں نے کہا سنا تھا۔ وہ پڑوسن سے معاملہ کی نزاکت پہ گفتگو کرتی رہیں۔ اسے وہ کیا کرتیں کہ پڑوسن کی پسند صفیہ کو ایک پل نہ بھائی

کیا ہوا اگر لڑکا ذرا کالا تھا۔ مگر تھا تو بی۔ اے پاس۔ اچھی بھلی نوکری بھی تھی۔ مگر جس دن صفیہ نے یہ ذکر سنا۔ ہزار باتیں پڑوسن کو سنا دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف بر کی بات آئی گئی ہو گئی بلکہ پڑوسن میں اور ان میں صفیہ کی باتوں کی وجہ سے اچھی خاصی جنگ ہو گئی۔

"ایسے کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔" پڑوسن نے غصہ بھرے لہجہ میں اماں سے کہا تھا جس پر صفیہ بگڑ کر بولی تھی۔

"ارے جاؤ جاؤ اپنے ہی پاس رکھو اپنی نیکیاں اور رکھا سا کالا بر کو بھی

بہن۔ ذرا اپنی لاڈلی کو سنبھالو۔ ارے واہ! جوانی کیا جوانی، زبان بھی نہیں سنبھلتی۔" پڑوسن بی جو بگڑیں تو آسمان تک پہنچ گئیں۔ بھلا اس طرح کی بات کوئی ماں برداشت کر سکتی تھی۔ اماں نے بھی پڑوسن کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ روٹھی پیٹتی چلی گئی اور پھر کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا اس طرح ایک پڑوسن جو بے چاری کبھی کبھار اماں کے دکھ درد میں باتوں کے ذریعہ شریک ہو جایا کرتی تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ اماں نے اپنے نزدیک یہی سمجھ لیا تھا کہ ابا نے ایک بار جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا تو وہ بھی کھودا پہاڑ نکلا چوہا کے برابر ثابت ہوا۔

انہوں نے جب اماں سے کہا "اجی میں کہتا ہوں میٹرک پاس ہے تو کیا ہوا۔ اس کی سند کیا دیکھنی ہو۔ اس کے کاروبار کو دیکھو! لاکھوں کا مالک ہے۔ بس یہ سمجھو کہ صفیہ کی قسمت کھل گئی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ستارے ضرور مل جائیں گے۔" مگر جب اماں نے کھری کھری سنا دی تو وہ دنگ رہ گئے۔ "اب تھا تو اپنی چہیتی بیٹی کو بی اے، ایم اے تک نہ پڑھایا ہوتا۔ میں نے منع کیا مگر اس وقت تو بڑا جوش تھا۔ ابھی پڑھ لینے دو۔ تعلیم کبھی بے کار جاتی ہے۔ اور اب چلے ہیں میٹرک پاس کو ڈھونڈنے۔" ابا بیچارے کم سخن اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے۔ خاموش ہو گئے۔ اور پھر کبھی انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔

ویسے بھی ان کا خیال ہے کہ شادی کے بعد چھبیس سال تک جب انہوں نے بیوی کو ناراض نہیں کیا تو عمر کے آخری دنوں میں کیوں انہیں ناراض کر کے حشر میں شرمندگی کا سامان مہیا کریں۔

اب کیا وہ یہ ساری باتیں صفیہ کو بتانے بیٹھتیں۔ جن سے وہ خود بھی واقف تھی۔ کیسی کیسی کوشش انہوں نے نہیں کی۔ اور کیا کیا جتن نہیں کئے کہ صفیہ کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔ مگر جیسے اس کی تقدیر کھوٹی تھی۔ ویسے صفیہ جیسی لڑکیوں کے لئے بر کی تلاش کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ سوچتیں اس میں کیا کمی ہے۔ نظر نہ لگ جائے اس ڈر سے انہوں نے اس کے سڈول بازو پر کالا دھاگا باندھ دیا تھا۔ حسن و جمال کے علاوہ اپنی بچی کو انہوں نے بی اے بھی پاس کروا دیا تھا۔ کیا یہ تمام باتیں ان کی بچی کی شادی کے لئے کافی نہ تھیں۔ مگر وہ کیا کرتیں، زمانہ ہی کچھ ایسا تھا کہ بہت سی باتیں انہیں اپنی مرضی کے خلاف بھی کرنی پڑتیں۔ اب اس بر کی تلاش ہی کو لے لیا جائے یہ بات تو سراسر ان کے اصولوں اور روایات کے خلاف تھی۔ "اللہ اللہ کیا زمانہ آ گیا ہے" وہ کہتیں، "اب لڑکی والے بر تلاش کریں۔ آگ لگے ایسے زمانہ کو اور ایک ساتھ مر جائیں تمام بیٹیاں۔" اور وہ چٹاچٹ اپنے ہاتھ کی انگلیاں توڑ ڈالتیں۔ ان کا زمانہ تھا تو لڑکے والوں کی جوتیاں گھس جاتی تھیں لڑکی تلاش کرتے کرتے تب جا کر بہو کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی تھی۔ اور ہزاروں ارمانوں کے ساتھ والدین اپنی بیٹی کو رخصت کرتے۔ ذرا گڑبڑ ہوتی کہ بیٹی ماں باپ کے پاس واپس آ دھمکتی۔ سسرال والے جب تک ناک رگڑ رگڑ کر سر خم نہ کر لیتے رخصتی نہ ہوتی۔ اور اب تو جیسے لونڈوں کا قحط پڑ گیا ہے۔ ان کا زمانہ تھا تو اناج سستا تھا اور بیٹیاں مہنگی تھیں۔ اور اب صفیہ کے زمانے میں بیٹیاں سستی ہو گئیں تو اناج مہنگا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں مٹھی بھر اناج فروخت کرتیں تو کچھ نہ کچھ دام نکل جاتے۔ مگر اب تو اپنی چیز بھی دو اور دام بھی۔ کم از کم صفیہ کے سلسلے میں انہیں یہی تجربہ ہوا تھا۔ دیر تک وہ اس سودے کے تانے بانے اپنے ذہن میں بنتی رہتیں۔ کبھی کبھی تو وہ صفیہ کی اس بات پر سچ مچ یقین کر بیٹھتیں کہ کنواروں کو چن چن کر فوج میں بھرتی کر لیا گیا ہے۔ سوچتے سوچتے جب وہ تھک جاتیں

اور پڑھائی ختم سمار ہو جاتے تو وہ گھر کے کام میں جٹ جاتیں۔ کیونکہ اُن کے خیال میں غور و فکر سے کبھی کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ کئی باتوں میں غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد انہوں نے طے کیا کہ وہ ایسا نہیں کریں گی۔ مگر نتیجہ ہمیشہ اس کے برعکس نکلا۔ انہوں نے چاہا کہ وہ صفیہ کے لئے ہرگز لڑکے کی تلاش نہیں کریں گی بلکہ اپنے اصولوں کے مطابق اس خیال کو اپنے ذہن میں کبھی نہ آنے دیں گی مگر انہیں اس کے خلاف مجبوراً عمل کرنا پڑا۔ پڑوسن کی منت سماجت کرنی پڑی۔ جس کا نتیجہ بھی ایک زوردار لڑائی کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ انہوں نے چاہا کہ وہ صفیہ کو ملازمت نہ کرنے دیں گی۔ مگر وہ صفیہ کو معلمہ کی حیثیت سے کام کرنے سے نہ روک سکیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ صفیہ کے ابا کے وظیفہ میں اب گھر کا بار اٹھایا نہیں جاسکتا۔ بہر حال حالات سے انہوں نے صلح کر لی اور بدلتے ہوئے زمانے کی روش سے وہ واقف ہو گئی تھیں۔ اب ان کے سامنے اپنی زندگی کے صرف تین مقصد رہ گئے تھے۔ صفیہ کی شادی، اپنی چھوٹی بچی رضیہ کی تعلیم اور شوہر کو حتی الامکان آرام پہنچانے کی کوشش۔ وہ اپنے لئے کبھی کچھ نہ سوچتیں۔ اپنی حد تک جیسی بھی گزرتی قناعت کر لیتیں۔

چنانچہ ایک بار پھر جب صفیہ نے بَر کی تلاش کا احسان جتا دیا تو ان میں وہ پہلی سی چمک نہ ہو گی۔ اور نہ وہ بگڑیں۔ بلکہ وہ اس بات کی سنی ان سنی کر کے انہوں نے صرف اتنا کہا "اری چل مردار اپنا کام کر" مگر اس لہجہ میں وہ پہلی سی گھن گرج نہ تھی۔ کیونکہ صفیہ کے یہ الفاظ سنتے سنتے ان کے کان پک گئے تھے۔ اور پھر حالات نے الگ رنگ چڑھا دی تھی۔ صفیہ کو انہوں نے نرم الفاظ میں ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اور باورچی خانے میں گھس گئیں تاکہ رات کے کھانے کی خبر لے سکیں۔ اب تو انہیں یہ بھی یاد نہ تھا کہ صفائی کے لئے رکھے گئے ملازمین اور ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے رکھی گئی ماما کو رخصت ہوئے کتنے دن ہوتے تھے۔ ابھی وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی ہی تھیں کہ کھٹاک سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور رضیہ اپنی کاپی لئے ان کے پاس آئی جو امی ارشد بھیا بلا وجہ تنگ کر رہے ہیں۔" مگر انہوں نے رضیہ کی اس بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ کیونکہ اس وقت ارشد ہی کے کھانے کا انتظام کر رہی تھیں۔ ارشد سے تو وہ صفیہ کے ذریعہ متعارف ہوئی تھیں اور صفیہ نے جس انداز میں اس کا تعارف کرایا تھا اس کے معنی وہ خوب سمجھتی تھی۔ صفیہ کی زبانی بار بار ارشد کا ذکر سن کر انہیں اس کے رجحان کا اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی تھی۔ اور بڑے بڑے سے اس کی تفسیر انہوں نے صفیہ کے ابا سے بھی بیان کر دی تھی جسے وہ ہوں، ہاں کہہ کر سنتے رہتے تھے۔ جیسے گھر میں ان کا عمل دخل نہ ہو۔ یا پھر تمام معاملات کو انہوں نے اپنی بیوی پر چھوڑ دیا ہو ان حالات میں وہ سوچتی اگر صفیہ اپنا بَر آپ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے تو کچھ برا نہیں کرتی۔

ارشد سے صفیہ کی ملاقات اسکول ہی میں ہوئی تھی ارشد کے والد ملٹری میں ملازم تھے۔ اور جب ان کی بدلی ہوئی تھی تو ارشد کو چلا آنا پڑا تھا۔ اور پھر ملٹری اسکول میں اسے ملازمت ملنے میں دیر نہ لگی۔ اور اتفاق کی بات کہ اس اسکول میں چند روز پہلے صفیہ کا بھی تقرر عمل میں آیا تھا۔ ارشد تھا تو فوجی باپ کی اولاد، مگر دیکھنے دکھانے میں ایسا کچھ خاص نہ تھا۔ سانولا سلونا رنگ اور نقشہ بھی کچھ ٹھیک ہی سا تھا البتہ ڈگری میں وہ نہ صرف صفیہ کے برابر تھا بلکہ ذہانت میں صفیہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

ملٹری اسکول میں تقرر کے بعد جب ارشد کا تعارف تمام لوگوں سے کرایا گیا تو اس نے صرف صفیہ کے متعلق دلچسپی سے سنا۔ اور بہت دیر تک اس کے متعلق جان کر محظوظ ہوتا رہا۔ تعارف کے دوران کھڑی ناک، ابھار آلود آنکھیں، گھنی پلکیں اور سڈول جسم والی صفیہ کو زرق برق لباس میں دیکھ کر ارشد چکرا گیا۔ صفیہ نے اسے سلام کیا تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور بس۔ مگر آہستہ آہستہ ملاقاتوں کا وقت بڑھتا گیا۔ باتوں کے سلسلے دراز ہوتے گئے۔ اور جلد ہی وہ اس قدر قریب آگئے کہ ایک جان دو قالب والی مثال مدرسہ والوں کو ازبر ہو گئی۔ صفیہ نے بھی غیر ارادی طور پر محسوس کیا کہ ارشد میں ایسی مقناطیسی قوت ضرور ہے جو اسے مسلسل اس کی طرف کھینچ رہی ہے۔ مدرسہ کے خالی اوقات دونوں بحث مباحثہ اور گفتگو میں گزار دیتے۔ مدرسہ میں ایک ساتھ داخل ہوتے۔ اور

عورتے تو ایک ساتھ ۔ ارشد کہتا "یہ کتنا دلچسپ سفر ہے۔
ذ ری تھکتا ہی نہیں!" "یہ تو ہمراہی کے انتخاب پر ہے" صفیہ
ہنس کر جواب دیتی۔

"ہاں، بغیر اس کے منزل بھی تو نہیں ملتی۔" ارشد کی اس بات
پر صفیہ کو ایک عجیب مسرت کا احساس ہوتا۔ اور وہ سمجھتی جیسے
اتفاقاً سے منزل مل گئی ہے۔ وہ سوچتی، ارشد نہ آتا تو شاید
میری زندگی نامکمل رہ جاتی۔ دوریاں قربت میں تبدیل ہوتی گئیں
وقت نے تکلفات کے پردے ہٹا دیئے۔ اور ارشد اور صفیہ کی
زندگی اس ندی کی مانند بہنے لگی جس کی راہ میں کبھی کوئی روڑا
نہ آتا ہو۔ حسین شامیں، سہانی راتیں اور عہد و پیماں کی باتوں کے
سنہرے لمحات بن کر تیزی سے گزرنے لگے۔ اور جب اسکول
کی گیارہویں سالگرہ منائی گئی تو انہیں پتہ چلا کہ ان کی پر بہار
زندگی کی یہ دوسری سالگرہ ہے۔ ارشد کا اب صفیہ کے گھر والوں
سے کوئی تکلف نہ تھا۔ اور جب ارشد کو صفیہ کے والدین نے دیکھا
تو اس سے وہ بھی ایک طرح سے مانوس مطلق ہو گئے کیا تو لڑکے
ملتے ہی نہ تھے اور کیا گھر بیٹھے ہی اللہ میاں نے نعمت دیدی۔
ماں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتیں اور قدرت کے انتظامات
پر حیران رہ جاتیں۔

ارشد جب پہلی بار صفیہ کے گھر گیا تو رضیہ سے چھیڑ خوانی
میں اسے بڑا لطف آیا تھا۔ وہ اس وقت آٹھویں درجہ میں پڑھتی
تھی۔ اس کے بعد تو رضیہ کو ستانا اسے زچ کرنا جیسے اس کا معمول
بن کر رہ گیا تھا۔ رضیہ کو تنگ کر کے وہ صفیہ سے مخاطب ہو کر کہتا۔"
میری ڈارلنگ، عورتیں تو مردوں کی جوتیاں ہیں۔ پھٹ
گئیں دوسری لے آئے!" "اسی لئے جوتیوں کے مصرف سے
خوب واقف ہیں۔" رضیہ پھٹ سے جواب دیتی۔ اور اس کے
بعد پیر پر ارشد کا جواب ہو جاتا۔ رضیہ تو بس شعلہ تھی شعلہ۔ جو بھی
سامنے آیا جھلس گیا۔ نہ صرف وہ تیکھی تھی بلکہ اس کے خد و خال بھی
تیکھے تھے۔ اور اس کے گورے چٹے جسم کو نظر سے بچانے کے لئے
اس کے دونوں بازوؤں پر کالا دھاگا باندھتیں۔ اب تو خیر

ارشد کا صفیہ کے گھرانے سے کسی قسم کا تکلف باقی نہ رہا تھا۔ اور کسی
قسم کی غیریت ان کے درمیان حائل نہ تھی۔ جب سے رضیہ ذرا کام
کاج کے قابل ہوئی تھی صفیہ تو ارشد سے گپیں ہانکتی اور سارے کام
رضیہ سے کرواتی۔ "رضو، ذرا ان کے کپڑے تو لیتی آؤ۔ ہاں چائے
بھی لیتی آنا۔ دیکھو آج کھانا تم میز پر لگا دو۔ میں ذرا مصروف ہوں۔
دیکھو تو وہ ڈرائنگ روم میں ہیں یا نہیں۔" رضیہ کو انکار کرنے بنتی نہ
اقرار۔ بس وہ ایک حکم کے تحت کام کرتی رہتی۔ اور جب وہ پڑھائی
کا بہانہ کرتی تو صفیہ کہتی ۔ "ارے ان سے پڑھ لینا۔ دیکھنا تم اوّل
درجہ میں پاس نہ ہوئیں تو مجھ سے کہنا۔"

"رہنے بھی دو۔ میں ارشد بھیا سے پڑھ لوں تو سمجھو بیڑا ہی
غرق ہے۔ میٹرک ہے میٹرک۔ کوئی کھیل نہیں" جب رضیہ نے
میٹرک پر زور دے کر کہا تو صفیہ کو یاد آیا کہ ارشد سے ملاقات کو
اسے تین سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ ان تین سالوں میں اس نے جو جو
تبدیلیاں محسوس کیں، اس نے سرسری جائزہ لیا اور ایک
لمحہ کے لئے کھو سی گئی۔ اب ان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ تھی۔
صرف شرعی و قانونی اعلان باقی تھا جس کی تیاریاں زور و شور کے ساتھ
جاری تھیں۔ صفیہ کے جہیز کی ایک ایک چیز خریدی جا چکی تھی۔
چونکہ یہ پہلا کام تھا۔ اس لئے اماں چاہتی تھیں کہ کسی قسم کی کوئی کسر
باقی نہ رہ جائے۔ اور کیا ان کے دس بارہ بیٹیاں تھیں۔ رہی رضیہ تو
اس کا کسی نے سوچا ہی نہ تھا۔ بھلا ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ادھر اس نے
میٹرک میں قدم رکھا اور ادھر عمر کے سولہویں سال نے اس کا خیر مقدم
کیا تھا۔ اہم جماعت ہونے کی وجہ سے ارشد بھیا پابندی سے پڑھانے
رضیہ کی تو سمجھ پر پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ہر وقت کہتیں "ہماری تو کچھ
سمجھ میں نہیں آتا۔"

صفیہ بگڑ جاتی "ہاں، تو تو ٹھہری کوڑھ مغز۔ بھلا تیری سمجھ میں
کیا خاک آئے گا۔"

رضیہ شرارت سے کہتی۔ "ارے بہن تو خود ہی پڑھ لو نا۔"

صفیہ تو اپنی شادی کی تیاریاں جیسے خود کر رہی تھی۔ تین سال کا
رومان پرور عرصہ جیسے چند گھنٹوں میں گزر گیا تھا۔ وہ ایک ایک چیز

خود اپنی پسند سے انتخاب کرتی۔ جب اسے احساس ہوتا کہ اب وہ ایک غیر معمولی اہم رشتے میں منسلک ہو جائے گی تو اسے ایک انجانی خوشی ہوتی۔ اور اس کا دل کانپ کر رہ جاتا۔ البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جسے ارشد اپنی پسند سے لینا چاہتا تھا۔ اور طے یہ ہوا تھا کہ وہ چیزیں دلی سے لیتا آئے گا۔ کیوں کہ اسے دلی سے اپنے والدین کو بھی لانا تھا۔ جو ایک ہی سال میں تنگ آ کر اپنا تبادلہ دلی کرا چکے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں صفیہ کے یہاں اسے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ وہ کسی غیر کے یہاں ہے۔ کسی سے اجنبیت نہ تھی۔ ہر طرف سے اپنائیت کی موجیں اٹھتیں۔ جو اس کو اپنے آغوش میں لے لیتیں۔

ارشد بضد تھا کہ دلی رضیہ بھی اس کے ساتھ چلے۔ صفیہ کو تو خیر وہ دلہن بنا کر لے جانے والا تھا ہی۔

"ارے واہ۔ میں کیا دلہا والی ہوں۔ نا بھیا، میں تمہاری برات کے ساتھ نہ آؤں گی" رضیہ کہتی۔

"چلی بھی جاؤ"، صفیہ کہتی "نصیبوں سے دلی دیکھنے کو تو مل جائے گی۔"

تعطیلات کے دن تھے۔ رضیہ کا امتحان ہو چکا تھا اور طے پایا تھا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں صفیہ کے ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں۔ ابا تو خیر کبھی کبھی شادی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔ مگر اماں نے تیاریوں میں دن رات ایک کر رکھے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے پڑوسن سے دوبارہ دوستی کر لی تھی۔ تاکہ باتوں کے ساتھ کام بھی چلتا رہے۔ اور پھر شادی کو صرف ایک ہی مہینہ تو رہ گیا تھا۔ اماں چاہتی تھیں کہ ابھی سے کچھ رضیہ کے لئے بھی پیش بندی کر لی جائے۔ کیا پتہ کس وقت گھڑی آ جائے۔ کیوں کہ انہیں پورا احساس تھا کہ عمر میں نہ سہی مگر جوانی کی اٹھان میں رضیہ، صفیہ سے چار قدم آگے ہے!

بڑی منتوں کے بعد رضیہ ارشد بھیا کے ساتھ دلی جانے پر تیار ہو گئی۔ ارشد کے روانہ ہوتے ہی تیاریوں میں اور زیادہ تیزی آ گئی۔ ایک ایک چیز کا جائزہ لیا جانے لگا۔ گھر کی خوبصورتی، مہمانوں کا انتظام، عورتوں کی نغمہ سرائی کے ڈھولک، غرض فہرست دیکھ دیکھ کر سامان ترتیب دیا جاتا رہا اور بار بار

"دیکھو جی۔ کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔ بدنامی ہماری ہی ہو گی"، اماں صفیہ کے ابا سے کہتیں۔

"ہاں، ہاں بھئی دیکھ تو رہا ہوں۔ تم تو جیسے دبلی ہوئی جا رہی ہو" وہ کھانستے کھانستے کہتے۔ اور گھر میں فہرست کے مطابق جہیز کے سامان کا جائزہ لیتے۔

شادی میں پانچ روز رہ گئے تھے کہ صفیہ کو ارشد کا خط ملا۔ لکھا تھا "خود دار لنگ، عجیب اتفاق ہے۔ اسے دراصل قدرت کی ستم ظریفی ہی کہنا چاہئے۔ سوچو کچھ، ہوتا کچھ ہے۔ ہم نے یہاں سول میرج کر لی ہے۔ سچ مانو صفیہ، رضیہ تم سے بڑھیا نکلی۔ اماں نے تو سود عائیں دیں۔ اور ہزار بار کہا، ہاں، تم وہ اپنے جہیز کا سامان بھجوا دینا۔ کیا تم اپنی بہن کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتیں؟!"

بقیہ نقد و نظر

حد تک ... شیانہ تربیت کی ایک بچی بچی سی لڑکی ہے۔ ناول کے بعد یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ثریا محمود ندرت ... طور پر اے۔ آر۔ خاتون سے کافی حد تک متاثر ہیں۔

شروع میں کہانی کی رفتار سست اور انداز بیان کچھ سا ہے جس پر مصنفہ نے جلد ہی قابو پا لیا ہے۔ رزمی کا کردار ہے اور اس کی وجہ سے ناول میں قاری کی دلچسپی برقرار ... جہاں تک ناول کی تکنیک کا سوال ہے تکنیک کو برتنا اور سارے عناصر کو قائم رکھنا جو قاری کو اپنے اندر جذب کئے رہتا ہے، جو ... لانے سے کم دشوار نہیں ہے۔ اس میدان میں بڑے بڑے ... ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ ثریا محمود ندرت نے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے کی کوشش کی ہے اور ان کی کامیاب ... پیش نظر مستقبل میں ان سے اس سے کہیں بہتر تخلیقات کی توقع ... کی جا سکتی ہے۔ انداز بیان شگفتہ اور زبان سلیس ہے مگر ناول ... کتابت کی غلطیاں گراں گزرتی ہیں۔

اے۔ آر۔ خاتون کے ناولوں کے مداح اس ناول کو ... کریں گے۔ تقریباً سوا تین سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ ناول سات روپے میں "مقبول اکیڈمی، چوک انار کلی، المنار مارکیٹ۔ لاہور" سے ...

افسانہ

سنگھ امرتسری

ایمان

محمود عالم نیک دل، خوش اخلاق اور دیانت دار انسان تھا [illegible] لیکن دل بہت بڑا تھا۔ جسمانی طور پر وہ بالکل ہرن سا تھا۔ چہرے [پر] فکر کی تہیں جم چکی تھیں۔ اس کی اقتصادی حالت کبھی اچھی نہیں رہی لیکن وہ اپنی مفلوک الحالی کا رونا روتے کبھی نظر نہیں آتا تھا۔

راستبازی اور ایثار و محبت کو وہ انسانیت کا گہنا سمجھتا تھا [illegible] سوسائٹی کے اونچے اور [illegible] خود سے [illegible] مشہور [illegible]

[illegible] محمود عالم [illegible] [illegible] اچانک اس کی نظر [illegible] ایک [illegible] اور وہ ٹھٹک [illegible] گیا۔ [illegible] نوٹ پرس سے [illegible] انداز [illegible] قرب و جوار میں [illegible] دور [illegible] نہیں تھا۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں [illegible] نے جھک کر وہ پرس اٹھا لیا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے [illegible]

[illegible] ریستوران کی ایک [illegible] کیبن میں بیٹھ کر [illegible] پرس جیب سے [illegible] نکال کر اس نے پیشانی پر پسینے کی ننھی بوندوں کو پونچھا ... پھر ... پانی کا ایک گلاس منگوایا اور [illegible] میں ہی خالی کر دیا۔ کولڈ کافی کے لئے نیا آرڈر بھی دے دیا۔

محمود عالم نے پرس کھول کر نوٹوں کو بار بار گنا۔ دس نوٹ دس سو [illegible] سو والے تھے۔ ایک شناختی کارڈ تھا۔ انگریزی رسم الخط میں لکھی ہوئی دو چٹھیاں تھیں۔ ایک فوٹو تھی، کسی خوش جمال حسینہ کی ...!

بیرا کولڈ کافی کا گلاس رکھ گیا۔ اس نے پرسکون انداز میں ایک سگریٹ سلگائی اور گہرا کش لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ ہزار روپے تو میری حیات غم زدہ کے تشنہ حسرت کی آسودگی بن سکتے ہیں [illegible] کفایت شعاری کے باوجود وہ اپنی [illegible] سالہ زندگی میں [illegible] پیسہ بھی جمع نہ کر سکا تھا۔ اس کا گھر جو ایک بوسیدہ سے [illegible] تھا۔

[illegible] کبھی نہ تھا۔

[illegible] آرزو [illegible] تھی۔

[illegible] سکوں نے ایک معمولی [illegible] کی تاریک زندگی میں امید کی [illegible] پھوٹ نکلیں دل میں مسرور کن خیالات نے ہلچل سی پیدا کر دی [illegible] تمنائیں جاگ اٹھیں۔ وہ [illegible] دل میں [illegible] پروگرام بنانے لگا۔ [illegible] روپوں سے وہ اپنے لئے ایک گرم کوٹ سلوائے گا۔ گرم کوٹ سلوانے کی خواہش ایک عرصے سے [illegible] میں دفن تھی۔ اپنی بیوی فرخندہ کے لئے [illegible] بے حد دلفریب بلاؤز بھی خریدے گا۔ بچوں کے لئے نئی فراکیں، گھر کے لئے ضروری فرنیچر اور ریڈیو بھی لائے گا۔

اچانک فیروزہ کا غمناک چہرہ اس کے ذہن و شعور میں ابھر آیا۔ غریب نے ساری زندگی مصیبتیں اور [illegible] سہی تھیں۔ فاقوں پر گذر

بسر کی تھی۔ لیکن کبھی لبوں تک فریاد نہیں آئی تھی۔

وہ سوچنے لگا ایک نہ ایک دن سب کے دکھوں کا انت ہوتا ہے۔ جب فیروزہ کو معلوم ہوگا۔ کہ غم کے بادل چھٹ چکے ہیں تو اس کا سنجیدہ چہرہ خوشی و شادمانی سے تمتما اٹھے گا۔

اسے بڑی لذت آمیز راحت محسوس ہوئی اور آنے والے لمحات کا تصور کر کے جھوم اٹھا۔ ریستوران سے باہر نکلا۔ تو غیر ارادی طور پر وہ گھر کی طرف چل دیا۔ وہ آلو خریدنے آیا تھا۔ یہ بات بالکل فراموش ہو چکی تھی۔

اچانک ایک نیا خیال بڑی تیزی سے اس کے ذہن میں ابھرا۔ اور پورے وجود پر چھا گیا۔ جیسے کسی آہنی گھنٹے پر ہتھوڑے کی بھرپور ضرب لگے۔ اور چیختی ہوئی آواز فضا پر چھا جائے۔ نئے خیال نے محمود عالم کو بری طرح سے جھنجھوڑ دیا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

"یہ ہزار روپے کسی بے بس یا لاچار باپ کے بھی ہو سکتے ہیں جس نے اپنی بیٹی کے ہاتھوں میں مہندی رچانے کی غرض سے قرض لئے ہوئے ہوں۔ اور کسی ایسے بھائی کے بھی ہو سکتے ہیں۔ جس کی جوان بہن کسی اسپتال میں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا رہی ہو۔ یا کسی ایسی بیوہ کے بھی ہو سکتے ہیں جس کا بے قصور بیٹا پھانسی کے تختے پر چڑھنے والا ہو۔ ان روپوں کی مجھ سے زیادہ دوسروں کو ضرورت ہو سکتی ہے۔ شاید قدرت میرا امتحان لے رہی ہے۔ لیکن میں ڈگمگاؤں گا نہیں، شرافت، اخلاق اور انسانیت کا پرستار تو دشمن کا حق بھی دبا نا گناہ تصور کرتا ہے۔ مجھے ان روپوں کو استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ روپے میرے پاس کسی کی امانت ہیں۔

محمود عالم کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ تھوڑی دیر وہ گم صم کھڑا رہا۔ پھر پرس کھول کر اس نے شناختی کارڈ نکالا۔ پڑھا اور رکشے کا انتظار کرنے لگا۔

شناختی کارڈ پر لکھے ہوئے پتہ پر پہنچنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ڈاکٹر پرمود چکرورتی گھر پر ہی موجود تھے گم شدہ رقم مل جانے سے وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ انھوں نے محمود عالم کو بے شمار دعائیں دے ڈالیں اور انعام کی صورت میں سو روپے کا ایک نوٹ بھی پیش کیا۔

بڑے گمبھیر لہجہ میں اس نے کہا۔ "ڈاکٹر! روپیہ زندگی کے لئے آب حیات ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو مکر و فریب بھری زندگی سے قطعاً پیار نہیں ہوتا۔ اتنا کہہ کر وہ بغیر کسی جواب کا انتظار کئے تیزی سے نکل گیا۔

ڈاکٹر چکرورتی کے بنگلے سے جب وہ باہر نکلا تو اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے من سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اچانک اس کو دوبارہ خیال آیا کہ وہ تو گھر سے آلو خریدنے نکلا تھا۔ اور دو گھنٹے تک خواہ مخواہ الجھا رہا۔ وہ دو گھنٹے لیٹ ہو جانے کے بہانے من ہی من میں تلاش کرنے لگا کیونکہ وہ اپنی بیوی سے حقیقت بیان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

سبزی منڈی سے اس نے ایک دوکاندار سے ایک کلو آلو ایک کلو ٹماٹر اور تھوڑا سا دھنیا، مرچہ خریدا۔ اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر سبزی فروش کو دے دیا۔ وہ ریزگاری گننے میں مصروف ہو گیا اور ادھر آنکھ بچا کر محمود عالم نے جلدی سے چار سو کے نوٹ اس کی جیب میں ڈال دئے۔

راستہ میں یکلخت اس کا ضمیر چیخ اٹھا۔ اور سارا بدن تھرتھرا گیا۔ ذہن میں کوئی سرگوشیانہ انداز میں بول اٹھا۔

"اے ایمان والے" تیرا ایمان ہزاروں روپوں پر تو نہیں ڈولا۔ سو روپوں پر بھی تو ڈگمگایا نہیں۔ اور ڈگمگایا تو صرف چار سو پر۔

محمود عالم کو محسوس ہوا جیسے اس کا وجود بالکل ہلکا ہو گیا ہے تنکے سے بھی ہلکا شاید کوئی تیز رو جھونکا آتا تو وہ اڑ جاتا۔ ••

آگ اور راکھ

نسیم محمد جان

اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسے سزائے موت ملے گی کیونکہ
س نے اقبال جرم کر لیا تھا۔ وہ کمرے کی دیوار گھورتے
گھورتے ماضی کی دبی چنگاریوں کو کرید کرید کر نکالنے لگا۔ سب
ے پہلے اسے کالج کا وہ ہال یاد آیا، جہاں وہ اپنی تقریر سے
جادو جگایا کرتا تھا۔ دلوں میں آگ لگایا کرتا تھا۔ پھر اس
ے ذہن کے پردے پر سیما ابھری، گورا چٹا رنگ، بوٹا سا
قد، اکہرا بدن مسکراتا ہوا چہرہ، یوں تو کالج میں کئی حسین
لڑکیاں تھیں، مگر سیما کی سادگی میں انفرادیت تھی اور
یہی نریندر کے دل کی گہرائیوں تک اترتی چلی گئی۔ کتنا خوش
تھا، وہ اس روز جب سیما اس سے پہلی بار مخاطب ہوئی تھی

"واقعی آج مان گئی۔ آپ بہت اچھی تقریر کر لیتے ہیں"

"پسند آئی آپ کو؟"

"بہت" کہتے کہتے اس نے گردن ایک مخصوص انداز میں ایک طرف جھکا لیا۔

نریندر اس دن ڈائری کے صفحے پر صرف یہی لکھ سکا۔

"واقعی آج مان گئی۔ آپ بہت اچھی تقریر کر لیتے ہیں"

پھر کئی مہینے تک ڈائری لکھتے وقت اس صفحے کو ضرور پڑھ لیتا۔ نہ جانے کیوں ایسا کرنے سے بڑی مسرت ملتی، بڑا سکون ملتا۔ تقریر کے مقابلوں میں اسے کئی انعامات مل چکے تھے

مگر شاید یہ سرٹیفکیٹ نریندر کے لئے سب سے زیادہ قیمتی تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا، وہ زندگی کے اس دور میں تھا جب زندگی بغیر کسی نازک سہارے کے بے لطف، سونی سونی معلوم ہوتی ہے۔ شاید اسی جذبے نے نریندر کو سیما سے قریب کر دیا اور تعلقات اس حد تک بڑھ گئے کہ نریندر اب بغیر کسی جھجک کے اس کے مکان پر آنے جانے لگا۔ اس نے بارہا چاہا کہ سیما سے وہ سب کچھ کہہ دے، جو وہ اس کی غیر موجودگی میں سوچا کرتا ہے۔ مگر اس کا دل اس خوف سے کانپ اٹھتا کہ کہیں سیما برا نہ مان جائے اور سیما کی قربت کے بھی یہ لمحے جو حاصل ہیں کھو بیٹھے۔

مگر اس روز کتنا پریشان تھا، جب انور نے اسے یہ بتایا کہ سیما کی شادی کشور سے طے پا گئی ہے۔ پھر وہ فوراً سیما کے گھر گیا۔ وہ ایک قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بھیگے بالوں کو تولیہ سے جھٹکے دینے میں مشغول تھی۔ ایک دو چھوٹی لٹوں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک کر اس کے شانے کو بھگو رہا تھا۔ نریندر نے سیما کو ہزاروں بار دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا۔ مگر آج اچانک جب اس حال میں ملی، تو اس کے دل کے اندر کی چھپی چنگاریاں اور بھی بھڑک اٹھیں۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ سیما سے کہنے لگا۔

"سنا ہے تمہاری شادی کشور سے ہو رہی ہے"

"کوئی اور بات کیجئے"

"سیما! ..... آخر... تم"، وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

سیما کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ دیوار کی طرف مڑتے ہوئے کہنے لگی "نریندر! تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں نے ہمیشہ تمہیں صرف ایک ہمدرد دوست سمجھا۔ میں کشور کے ساتھ اپنی مرضی سے شادی کر رہی ہوں۔ بلکہ خود میں نے ہی ماں کو رضامند کیا ہے"

اور بغیر ایک پل بھی ٹھہرے کمرے سے آنگن کی طرف نکل گئی۔

پھر نریندر کے سامنے ماں کی تصویر تھی۔ اس ماں کی تصویر جس کے بھولانے کی تمنا وہ پوری نہ کر سکا، جو اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے سادھوؤں اور فقیروں کے یہاں پاگلوں کی طرح برسوں ماری ماری پھری اور اس تمنا کو لیے ساتھ چتا تک لیتی گئی۔

اور اس روز جب سیما گرینڈ ہوٹل کے سامنے ملی تھی، تو کتنی بدل چکی تھی۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ وہ اس دیوی کو پہچان بھی نہ سکا، جو ایک پل کے لئے بھی ان دو برسوں میں اس کے دل و دماغ سے جدا نہ ہوئی تھی۔ جھجکتے جھجکتے اس کی زبان سے نکلا،

"سیما!"

"ارے نریندر"

"ہاں"

اور پھر سیما کے متعلق یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ اس کی خوابوں کی ملکہ ایک آفس میں کلرک ہے۔ کشور دوسری شادی کر چکا ہے اور سیما سے قانونی طور پر الگ ہو گیا ہے۔ جب سیما چائے پی چکی، تو وہ سوچنے لگا "حالات انسان کو کتنا بدل دیتے ہیں اب سیما میں وہ بات نہ رہی، نہ وہ حسن ہے اور نہ وہ کشش ہے"

مگر وہ فوراً اس کا یہ ضمیر ملامت کرنے لگا۔ "پھر تم میں اور کشور میں کیا فرق ہے۔ عشق تو ایک پاک جذبے کا نام ہے جسم سے کم تعلق اس کا۔ تم تو لتنے گرے ہوئے انسان نہ تھے نریندر!" اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سیما کی ساری خوشیاں

واپس لا کر ہی دم لے گا۔ اب وہ پھر سیما کے یہاں جب... آخر ایک دن سیما خود ہی پوچھ بیٹھی۔

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" اور نہ جانے کیوں خود گھبرا گئی۔

"شادی تو کر لوں، مگر پسند کے لائق کوئی لڑکی ہو... تو اتنی بڑی دنیا میں کوئی لڑکی ہی نہیں ملتی... قسم کی لڑکی چاہیے۔"

"بتا دوں"

"ہاں"

"میں تو صرف تم سے ..... " وہ بمشکل... کہہ سکا۔

"تم پھر بہک رہے ہو نریندر!"

"سیما! مجھے غلط نہ سمجھو۔ خواہ مخواہ کشور کمبخت کے لئے زندگی برباد کر دینی کہاں کی عقلمندی ہے۔ سوچ... طرح، مجھے کل اپنا فیصلہ سنا دینا"

پھر اس کے ذہن کے پردے پر وہ رات ابھری۔ ... کی وہ رات کتنی پر سکون تھی۔ وہ نیند کی آغوش میں... تھا کہ اس کے پہلو میں سوئی سیما کی ایک چیخ اٹھی

"کشور! کشور! لوٹ آؤ"

سیما ہوش میں آئی، تو نریندر سے لپٹ گئی... کی طرح جو اپنے آپ میں طاقت نہ پا کر پاس کے کھڑے... سے لپٹ جاتی ہے۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا... بار بار کہہ رہی تھی۔

"میں خواب میں ڈر گئی نریندر"

اور وہ سیما کو اس طرح تسلی دینے لگا جیسے وہ اس... رفیقۂ حیات نہ ہو کوئی بچی ہو۔ اندھیرے میں نریندر کی انگلیاں سیما کی بھیگی پلکوں کو خشک کرنے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں... خوش تھا "کتنی معصوم ہے اس کی سیما"

پھر وہ بڑا البم اس کے نظروں کے سامنے آ گیا۔ وہ خوشت...

بم جسے سیما کو کسی رشتہ دار نے بطور تحفہ دیا تھا۔ اسے اپنے
بم سے بڑا پیار تھا اور کیوں نہ ہوتا لڑکیاں اپنی کنوارے پن
کے زمانے کی چیزوں سے گہرا لگاؤ رکھتی ہی ہیں۔ وہ تو البم
تھا۔ ماضی کی تصویر سب کچھ تو تھا سیما کا اس میں، ہنستا ہوا
بچپن، شرماتا ہوا کنوارا پن اور مسکراتی ہوئی جوانی۔ وہ اپنے
البم کو بڑے شوق سے دکھایا کرتی تھی۔ اس نے اتنی بار
سے دیکھا تھا کہ وہ اب ہر تصویر کی تفصیل خود ہی بتا سکتا
تھا۔ مگر اس روز وہ اپنی ایک سہیلی کے یہاں گئی تھی۔ تنہائی
سے اُکتا کر وہ البم لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے آج ایک نئی بات
محسوس کی، سیما نے صرف شادی کے بعد کی ہی تصویروں کو اس
کی تصویر کے اردگرد لگا رکھا ہے۔ دوسرے صفحے پر دو تصویریں
لگی تھیں۔ ایک تصویر کے متعلق سیما نے بتایا تھا کہ اس کی
یک سہیلی کی ہے۔ دوسری تصویر سیما کی اس وقت کی تھی جب
وہ کنواری تھی۔ اسے یہ ترتیب پسند نہ آئی۔ وہ اس کے کنوارے
پن کو بھی اپنے پہلو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سیما کی تصویر
نکالی۔ تصویر کے نکلتے ہی ایک اور تصویر جو نیچے چھپی تھی،
نکل کر گر گئی۔ چھپی ہوئی تصویر کو دیکھتے ہی اس کی پیشانی
پر بل پڑ گئے۔ تصویر کشور کی تھی۔ اس نے آج پہلی بار محسوس
کیا کہ سیما اب تک کشور کے ہی قریب ہے۔ تصویریں
اس کے ہاتھ ہی میں تھیں کہ وہ آگئی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"میری غیر حاضری میں میری چیزوں کی تلاشی لی جا
رہی تھی؟" نریندر نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا:

"ہاں"

اور پھر اس کی نظروں سے بچاتے ہوئے تصویروں کو دوبارہ
رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ تصویریں اپنی جگہ پر چپک گئیں مگر
نریندر کی دنیا بدل کر۔ سیما کی نظریں جب تصویر پر پڑیں
کہنے لگی۔

"اچھا! میری سہیلی سے نظریں لڑائی جا رہی تھیں —
لن ہے نا گیں، دس لے گی" وہ نریندر کا ہر طرح کا خیال رکھتی

جب وہ ٹور میں جاتا، تو نہایت پابندی سے وقت پر کھانا کھلا
دیتی۔ اکثر رات کو کافی دیر تک انتظار کرتی اور نریندر کے
شامل ہی کھاتی۔ مگر نریندر کو ایسا لگتا، جیسے وہ چلتی پھرتی
لاش ہو، جس کی اپنی کوئی خواہش نہیں۔ جب وہ چاہتا ہے
ہنستی ہے، جب وہ چاہتا ہے، خاموش ہو جاتی ہے۔ کبھی کسی
کام میں بے پروائی نہیں کرتی اور نریندر کے احساس پر بجلی
گر گئی۔ جب اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس نے شادی
کسی عورت سے نہیں بلکہ ایک بچہ دینے والی اور گھر سنبھالنے
والی مشین سے کی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کاش سیما اس قدر
سلیقہ مند اور فرض شناس ہونے کی بجائے ایک شوخ طرار
اور بے پناہ محبت کرنے والی بیوی ہوتی۔ وہ اس کی آنکھوں
میں اپنی محبت کی جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اسے لگتا
کہ وہ ریگستان میں چشمے کی تلاش کر رہا ہے۔ ہاں اسے سراب
ضرور نظر آیا۔ اب وہ مسکرا رہا تھا۔ بچھڑنے والی بات یاد آگئی
تھی۔ غسل کرتے وقت جب اس کا پیر پھسلا تھا، تو سیما کتنے
زور سے چیخی تھی اور خود بھی پھسل کر گر گئی تھی۔ بس یہی تو اس
کی یادوں کے خزانے میں ایک ہیرا تھا، جسے جب بھی اپنے
دل کے اندر جھانک کر دیکھ لیتا، تو خوش ہو جاتا۔

پھر وہ خیالوں کے سمندر میں غوطے لگانے لگا "ڈاکٹر
نرمن بڑا ہی شریف آدمی ہے۔ دوستی نباہنا اس کو کہتے ہیں
وہ اتنا بڑا ڈاکٹر اور میں ایک معمولی انسان۔ مگر جب سیما کو
سینی ٹوریم لے گیا، تو کتنی مدد کی تھی۔ اس نے بار بار کہہ رہا تھا
"نریندر! تم نے کچھ دیر کر دی۔ مگر تمہارا کیا قصور، تم کوئی
ڈاکٹر تو ہو نہیں"،

سیما نے بھی ساری باتیں سن لیں اور نریندر کے ہاتھوں کو
اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہنے لگی:

"میں کتنی ابھاگن ہوں۔ اب تم سے کیا چھپانا۔ لاکھ
کوشش کرنے پر بھی میں کشور کو نہ بھول سکی"

اور آنکھوں میں آنسو لئے اس کے ہاتھوں کو دبانے لگی۔

"نریندر! تم دوسری شادی کر لینا، وعدہ کرو، تاکہ مجھے شانتی ملے"

نریندر نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے لب کانپ رہے تھے۔ شاید جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ کا سہارا بیکار ثابت ہو رہا تھا۔

اب اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے سامنے سیما کی چتا تھی۔ جس کے شعلے لپک لپک کر کہہ رہے تھے نریندر! میں کمزور تھی۔ زہر کا گھونٹ پیتے پیتے سینی ٹوریم پہنچ گئی۔ تم دبے آگ لگا دو ان سارے کشوروں کی زندگی میں جس کی وجہ سے کتنی ہی سیمائیں ہر روز سینی ٹوریم میں دم توڑا کرتی ہیں۔

اس روز سے نریندر مسٹر کشور کی خوبصورت بیوی کا خون کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ کشور بھی سیما کی طرح سسک سسک کر زندگی کے دن کاٹے۔ یہی ایک طریقہ تھا بدلہ لینے کا۔

پھر اس رات کشور ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ "پیراڈائز" میں کچھ پی رہا تھا۔ نریندر کو اس کی بیوی نہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہوئی۔ وہ اس کے بغل میں بیٹھی ہوئی اینگلو انڈین لڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ لڑکی اسے دوسری سیما معلوم ہونے لگی۔ پھر ایک دھماکا ہوا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ کشور کی لاش ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔

نریندر کے سامنے اب ماضی نہ تھا، صرف قید خانے کی سفید دیواریں تھیں، وہ کہہ رہا تھا:

"بھگوان! تو مجھے بار بار جنم دے میں دنیا کے سارے کشوروں کا قتل کر دوں گا۔ تاکہ تیری کسی سیما کو سینی ٹوریم نہ جانا پڑے"

***

بقیہ شیشۂ دل

آمر کراہ اٹھا۔ ساری رات امر مضطرب رہا، دور دور کے عجیب عجیب خیالات اسی کے ذہن میں آتے رہے۔ وہ ساری رات ٹہلتا رہا۔ ایک پل کو اس کی آنکھوں میں نیند نہ آئی۔

دوسرے دن امر نے ڈاکٹر سے کہا "ڈاکٹر! میری لتا کو اچھا کر دو۔ اچھی نہ ہو سکے، تو اسے زہر دیدو!"

"یہ کیا کہہ رہے ہو امر،" ڈاکٹر نے کہا "ہمارا کام لوگوں کو دوا دینا ہے، زہر دینا نہیں"

"نہیں ڈاکٹر! جب تم میری لتا کو اچھی نہیں کر سکتے تو اسے زہر ہی دے دو۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ میری لتا جذام جیسے خطرناک مرض میں مبتلا ہو۔ اس کی انگلیاں چھوٹی چھوٹی ہو جائیں۔ اس کی ناک پچک جائے اور خوبصورت آنکھیں اندر کو دھنس جائیں اور۔ اور ڈاکٹر میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ اتنی خوبصورت عورت جسے ہر کوئی دیکھنا چاہتا تھا

اب لوگ اس سے دور رہیں، کترا کر نکل جائیں۔ نہیں، نہیں اس سے تو اچھا ہے لتا مر جائے ڈاکٹر لتا مر جائے۔ میرے دل کو تو یہ یقین ہوگا کہ لتا خوبصورت مری۔ اس سے کسی نے نفرت نہیں کی۔ کسی نے اس سے دور ہٹ کر اسے راستہ نہیں دیا۔ کسی نے اسے دیکھ کر ناک پر رومال نہیں رکھا۔ کسی نے اس سے ہمدردی نہیں جتائی۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا ڈاکٹر! لتا کو مر ہی جانا چاہیئے۔ تمہیں اسے ختم کرنا ہی ہوگا"

امر ڈاکٹر کے کندھے جھنجھوڑنے لگا۔

ڈاکٹر ششدر ہو کر امر کو دیکھ رہا تھا۔



عظیم زاہدی

شیشہ دل

لوگ سمجھتے تھے لتا اور آمر نے لو میرج کی ہے۔

لیکن یہ بات نہیں تھی۔ لتا نے آمر کی جدائی میں آہیں بھری تھیں، نہ آمر نے لتا کے انتظار کی طویل گھڑیاں محسوس کی تھیں۔ ن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، پرکھا اور پھر شادی کے بندھن بندھ گئے تھے۔ سب سے پہلے ان کی بس میں ملاقات ہوئی تھی روز دونوں ریذیڈنسی سے بس میں سوار ہو کر جاتے۔ آمر سٹیٹ بنک پر اتر جاتا اور لتا نظام کالج تک جاتی۔ آمر بنک میں ملازم تھا اور لتا بی۔ اے کے آخری سال میں تھی۔

ایک دن آمر کچھ دیر سے بس اسٹینڈ پہنچا۔ بس میں بیٹھنے کے لئے اسے جگہ نہیں مل سکی، وہ کھڑا تھا اور بغل کی سیٹ پر لتا بیٹھی تھی۔ کنڈکٹر نے پہلے لتا سے "ٹکٹ پلیز" کہا۔ لتا نے پرس سے پیسے نکالنے لگی، تو کنڈکٹر آمر سے مخاطب ہوا "ٹکٹ پلیز"! آمر نے اپنی جیب سے ایک روپیہ کا نوٹ کنڈکٹر کو دیا اور کہا "اسٹیٹ بنک" کنڈکٹر نے آمر کو باقی پیسے واپس کرتے ہوئے لتا کے نوٹ کی طرف دیکھا، جو پانچ روپے کا تھا۔

"نظام کالج پلیز!" لتا کی آواز ابھری

"میڈم! میرے پاس اتنا چینج نہیں ہے" کنڈکٹر نے کہا "آپ کے ہاں ٹوٹے پیسے ہوں تو دیجئے۔"

"میرے پاس تو چینج نہیں ہے" لتا نے کہا "جو کچھ تھا رکشا والے کو دینے میں ختم ہو گیا۔"

"مجبوری ہے میڈم، میں ڈپو میں واپسی کے لئے لکھ دیتا ہوں" کنڈکٹر نے کہا "یہ منظور نہ ہو تو آپ اگلے اسٹاپ پر بس سے اتر جایئے گا۔"

"آپ ایسا نہ کیجئے" آمر نے کنڈکٹر کی طرف پیسے بڑھاتے ہوئے کہا "ان کے لئے ٹکٹ دے دیجئے۔"

"آپ یہ زحمت کیوں اٹھا رہے ہیں"؟ لتا نے کہا۔

"زحمت کاہے کی" آمر نے کہا "آپ چاہیں تو مجھے کل پیسے واپس کر سکتی ہیں۔" لتا خاموش ہو رہی۔ کرتی بھی کیا۔

دوسرے دن لتا کچھ جلدی میں بس اسٹینڈ پہنچ گئی تھی۔ آمر ابھی نہیں آیا تھا۔

کئی دن تک یونہی ہوتا رہا، کبھی لتا جلدی آتی تو کبھی آمر، اور کبھی بس تیار ملتی دونوں بیٹھتے اور چلے جاتے۔

ایک دن دونوں کچھ جلدی ہی پہنچ گئے۔ لتا نے آگے بڑھ کر ٹکٹ کے پیسے واپس کرتے ہوئے آمر کا شکریہ ادا کیا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے" آمر نے کہا "جیسے اس دن کے بعد سے آپ چینج لے کر گھوم رہی ہیں!"

"یہ بات نہیں" لتا مسکرا دی۔ "نہ جانے آپ کیا سمجھ رہے ہوں گے۔ کئی دن ہو گئے آپ کو پیسے واپس نہ کر سکی۔"

"اوہ! پیسوں کی کیا بات ہے، پیسے تو کئی بار اجنبیوں کو دے دیئے جاتے ہیں اور آپ! آپ تو روز ملتی ہیں"۔

"اجنبیوں کو پیسے دیں، تو واپس کیسے لیں گے"؟

"اسی طرح کسی ضرورت مند کو ضرورت کے وقت دینا ہوا تو سمجھوں گا، پیسے مجھے واپس مل گئے"۔

یہ بات لتا کو بہت پسند آئی اور وہ امر کے کردار کے متعلق سوچنے لگی — جو انسان بظاہر اتنا اچھا ہو، کیا وہ اندر سے بھی اتنا ہی اچھا نہ ہوگا؟

"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟" امر کے سوال پر لتا چونکی!

"جی، میرا نام لتا ہے اور میں نظام کالج میں بی اے کے آخری سال میں پڑھتی ہوں۔

"میرا نام "امر" ہے میں اسٹیٹ بنک میں اکاؤنٹنٹ ہوں"

دونوں رسمی طور پر مسکرا دیئے

یوں ملاقاتیں بڑھتی گئیں —

ایک دن امر موٹر سائیکل لے آیا!

"ارے یہ موٹر سائیکل کہاں سے آگئی؟" لتا نے پوچھا

"بس آگئی!" "کہاں سے آئی ہے یہ نہ پوچھو" امر نے ہنستے ہوئے کہا "بھیا کا تبادلہ گاؤں ہوگیا ہے اور وہ وہاں انہیں موٹر سائیکل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی لئے انہوں نے مجھے دیدیا ہے۔ آج سے یہ اپنی ہوگئی ہے۔ آج سے ہم دونوں کا بس میں جانا بند —! اب ہم موٹر سائیکل پہ جایا آیا کریں گے"!

لتا نے حیرت سے امر کی طرف دیکھی، کچھ ہچکچائی۔ پھر مسکرائی

"چلو چلو جلدی بیٹھ جاؤ" کہکر امر نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کردی لتا اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ موٹر سائیکل جس رفتار سے چل رہی تھی اس سے لتا کا دل دھڑک رہا تھا —۔ نہ جانے کیوں؟

اب روز امر کا معمول ہوگیا تھا کہ وہ بس اسٹینڈ سے لتا کو لے لیتا اور واپسی میں کبھی بس اسٹینڈ یا کبھی لتا کے مکان کے قریب تک چھوڑ آتا۔ پھر دونوں ساتھ ہی تفریح کرنے لگے، کبھی صنعتی نمائش، باغ عام اور کبھی ٹینک بنڈ۔

لتا نے بی اے کر لیا۔ امر ایم کام تھا۔ ایک دن دوستوں نے سُنا، دونوں نے شادی کرلی! اور ہنی مون منانے کے لئے دونوں نے آگرہ، دہلی اور بمبئی کا پروگرام بنا لیا — دونوں بہت خوش تھے

امر کہتا "میں کتنا خوش قسمت ہوں لتا کہ مجھے تم جیسی جیون ساتھی مل گئی — یہ اونچی پیشانی، ستواں ناک اور تمہاری یہ بڑی بڑی خلائی آنکھیں، جو تمہاری ذہانت کا پتہ دیتی ہیں"

"بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے" لتا شرما جاتی امر مسکرانے لگتا —

لتا امید سے تھی اور نو مہینے بعد ان کے جیون کی پھلواری میں ایک کلی مسکرائی۔ لڑکی بالکل لتا کی طرح تھی۔ وہی ناک نقشہ، وہی سب کچھ!! ان کا سونا آنگن پھول سی بچی کی کلکاریوں سے جیسے خوشی سے ہنسنے لگا۔ ان کی زندگی کے چمن میں بہار آگئی —

لیکن اچانک ان کی زندگی میں خزاں کا ایسا جھونکا آیا کہ ساری بہار کو اپنے ساتھ اُڑا لے گیا۔ ایک دن لتا صبح سو کر اٹھی، تو اس کی عجیب حالت تھی۔ اس کا انگ انگ نیلا ہو گیا تھا جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو، لیکن اسے سانپ نے نہیں کاٹا تھا۔ لتا کی یہ حالت دیکھ کر امر اسی وقت اسے جنرل ہسپتال لے گیا اور ڈاکٹر کے کہنے پر اسے ہسپتال میں داخل کر دیا۔ دوسرے دن لتا کے لئے اور تکلیف دہ ثابت ہوا۔ تمام جسم آبلوں سے بھر گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا بورڈ پریشان تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا۔ سوچ رہے تھے کسی جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ ان کی سمجھ میں کوئی علاج نہیں آرہا تھا

"خون کی رپورٹ بتا رہی ہے" ڈاکٹر امر سے کہہ رہا تھا "مریضہ تو بچ جائے گی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہوجائے گی۔ علامات یہی بتا رہے ہیں اس کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں ہے مسٹر امر! ڈاکٹر نے امر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" ہمیں بہت افسوس

فرانسیسی - موپاساں

ترجمہ - طلعت اسلوب

زیتون کے کھیت

ایبے ولبس اپنی ماہی گیر کشتی میں واپس لوٹ رہا تھا۔ گیر ینڈن
لوگ جو بندرگاہ پر کھڑے تھے کشتی کی جانب لپکے تاکہ اس کو کھینچ کر کنارے
لانے میں پادری صاحب کی مدد کریں۔ پروونیل کی یہ بندرگاہ خلیج پسا کے آخری
سرے پر مارسیلز اور ٹیلون کے درمیان واقع تھی۔

ایبے تنہا تھا۔ وہ ساٹھ کے لگ بھگ تھا۔ ماہر ملاح کی طرح نہایت
مستعدی سے کشتی چلا رہا تھا۔ اس کے کسرتی بازو اوپر چڑھی آستینوں سے
نکل رہے تھے۔ اس نے اپنا لمبا چوغہ گھٹنوں سے اوپر کر رکھا تھا۔ اور گریبان
کھلے تھے اس کی تکونی ٹوپی پاس ہی رکھی تھی۔ اس کے بجائے سر پر کارک کا سفید
منڈھا ہوا ہیٹ سر پر رکھا تھا۔ وہ منظر عام سا ہٹا کٹا قومی الجثہ پادری
لگتا تھا۔ اگر دعا نماز کے بجائے وہ مہم سر کرنے جاتا تو شاید یہ کام اس کے زیادہ
شایان شان ہوتا۔ گاہے بگاہے یہ اطمینان کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھ لیتا
کہ اس کی سمت ٹھیک بھی ہے یا نہیں اور پھر بڑے انہماک سے چپو چلانے
لگتا وہ جنوب کے لوگوں پر یہ سکہ جمانا چاہتا تھا کہ شمال کے لوگ بھی بڑے
اچھے ملاح ہوتے ہیں۔ نہایت تیزی سے کشتی ساحل پر لکیر بناتی ہوئی ٹھہر گئی۔
وہ پانچ آدمی جو دیر سے ایبے کے منتظر تھے تحسین و گرم جوشی کے ملے
جلے جذبات کے ساتھ اپنے پادری کے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک پروونیل
لب ولہجہ کی نمائندگی کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ بہت سی مچھلیاں شکار کر کے لائے
ہیں۔؟"

لیبے نے اپنے چپو رکھے۔ اپنا ہیٹ اتارا اور تکونی ٹوپی سر پر رکھ
لی۔ آستینیں نیچے کیں۔ گریبان کے بٹن بند کئے اور جب پہلے کی طرح گاؤں کے
سردار جیسا سراپا اختیار کر لیا تو فخریہ مخاطب کا جواب دیا۔

ہاں ہاں! کیوں نہیں اچھا شکار رہا۔ بہت سی مچھلیاں پکڑی ہیں
وہ پانچوں ماہی گیر جلدی سے کشتی کے نزدیک آئے بالائی حصہ سے جھانک
کر تنقیدی نظروں سے بھری ہوئی مچھلیوں پر نگاہ ڈالی۔

ان میں سے ایک بولا "یہ مچھلیاں میں آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔"

"شکریہ میرے بیٹے" پھر پادری نے سب سے ہاتھ ملائے۔ اور
گھر کی جانب اس آدمی کے ہمراہ چلنے لگا۔ اور باقی سب اس کی کشتی کی جانب
متوجہ ہوئے وہ بڑے وقار سے چھوٹے بڑے قدم رکھتا آگے آگے چلتا رہا۔
کشتی کھینچنے سے ابھی تک اس کے رگ و پے میں حرارت و گرمی موجود تھی۔

زیتون کے درختوں سے شام کی ڈھلتی ہوئی دھوپ چھن چھن کر آ رہی
تھی اس نے کئی بار اپنا ہیٹ اتارا تاکہ خنک ہوا کے نرم رو جھونکے فرحت
بخش دیں۔ اس کے خوبصورتی سے تراشے ہوئے بال، کشادہ و فراخ پیشانی
پادری کے زیادہ کسی بڑے افسر ہونے کی نشان دہی کرتی تھی۔ اب گاؤں
واضح طور پر نظر آنے لگا تھا۔ یہ گاؤں ایک چوڑی وادی میں جس کا ڈھلان
سمندر کی جانب تھا ایک چھوٹی پہاڑی پر واقع تھا۔ وہ جولائی کی ایک شام
تھی۔ دمکتا ہوا سورج پہاڑی کی نوکیلی چوٹی تک پہونچنے کو تھا پادری کی
طویل پرچھائیں سفید سڑک پر ترچھی ترچھی پڑ رہی تھی۔ جو گرد و غبار کے
دامن میں گاہے چھپ جاتی گاہے نمودار ہو جاتی۔ تکونے ہیٹ کا بڑا سا
عکس سیاہ دھبے کی طرح آس پاس کے کھیتوں پر پڑ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ
کھیتوں کی منڈیروں پر لگے زیتون کے پیڑوں سے یہ پرچھائیں آنکھ مچولی کھیل
رہی ہے گھڑی پیڑ پر چڑھتی اور گھڑی بھر بعد نیچے کود جاتی۔ اور پھر دھیرے

دھیرے رینگنا شروع کر دیتی۔ جہاں ایبے کے قدم پڑتے دھول کا دھواں سا اٹھتا اور غبار کا غازہ چوغہ کے حاشیہ پر جم جاتا۔ موسم گرما کی دھول اور غبار پر نہ جنگل کے لئے نئی نہ تھی زمین اب پتھریلی ہونے لگی اسی کے ساتھ غبار بھی کم ہوتا گیا۔ چھوٹے سے ٹیلے پر وہ متوازن قدم رکھتا بلندی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ جیبوں میں تھے اور نگاہیں گاؤں پر جمی تھیں اس کی آنکھوں میں بڑا سکون اور اطمینان تھا۔ یہ وہ گاؤں تھا جہاں بحیثیت ایک پادری کے تیس سال سے رہ رہا تھا بڑی چاہ اور ارمان سے یہ گاؤں اس نے اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا تھا۔ سامنے ہی مخروطی سرے والی گرجا تھی جس کو بستی کے گھر چاروں طرف سے محیط کئے تھے۔ اس کے گھنٹے الگ الگ وضع کے تھے وہ چوکور تھے اور کھردرے پتھر کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ ان کا ایک رخ دور ہی سے نظر آجاتا تھا۔ یہ گھنٹہ گھر کے بجائے کسی پرسطوت قلعے کے برج معلوم ہوتے تھے۔

ایبے بہت مسرور تھا کیونکہ مچھلیوں کی خاصی تعداد شکار کی تھی۔

اپنے حلقہ میں یہ تازہ فتح اس کو عجیب طرح کی آسودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اپنی کہنہ سالی کے باوجود وہ ہٹا کٹا تھا۔ سارے علاقے کے باشندے اس کو بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے وہ پھول کے ڈنٹھل کو پستول کی ایک ہی گولی سے دو کر دیتا۔ بڑی دسی تمبا کو فروش سے اکثر تیغ بازی کا مقابلہ ہوتا یہ شخص فوجی تھا اور فوجیوں کو تلوار چلانے کے گر سکھایا کرتا تھا۔ ایبے کا تیر اکی میں بھی دور دور جواب نہ تھا۔ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر فخر محسوس کر کے عجیب سی سرشاری میں ڈوب جاتا۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ ایبے بڑا دولت مند، بارسوخ اور نامور ہستی سمجھا جاتا تھا بیرن ویلیس کے نام سے موسوم تھا۔ معاملات عشق میں ایک بار سخت ناکامی ہوئی اور تب سے دنیا اور اس کے مکروہات سے جی اکتا گیا۔ اور صرف تیس ۳۲ سال کی عمر میں پادری بن گیا۔ اس کا خاندان شاہی تھا لیکن اس خاندان کے عقائد راسخ تھے۔ کئی پشت سے بیٹے پوتے یا تو فوج میں بھرتی ہوتے یا پھر قانون پڑھتے یا کلیسا میں بھیجے جاتے۔ ماں کا مشورہ تھا کہ وہ پادری بن جائے لیکن خود باپ کی طرح اس کو قانون سے لگاؤ تھا۔ وہ پیرس چلا گیا تاکہ قانون کی تعلیم حاصل کرے ابھی اس کی تحصیل مکمل نہ ہو پائی تھی کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک دلدلی علاقے میں شکار کے لئے گیا تھا وہاں نمونیے کے مہلک مرض میں گرفتار ہوا اور دیکھتے دیکھتے چند گھنٹوں میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کی ماں اس اچانک صدمہ کو نہ سہہ سکی اور وہ بھی شوہر سے جا ملی۔ اب اس قدر کثیر دولت اور جاگیر کے مل جانے سے اس کا دماغ آسمان پر تھا۔ پڑھنے لکھنے کو بالائے طاق رکھ اور مزے سے رئیسانہ زندگی کے مزے لوٹنے لگا وہ خوبصورت اور وجیہ تھا۔ ذہین و طباع تھا لیکن ساتھ ساتھ پرانے خاندانی اصول و عقائد کا بھی حامی تھا جس نے اس کی شخصیت کو بڑا با وقار بنا دیا وہ ہر شخص کو اپنا ہم خیال بنانے اور ہر کسی کو خوش کرنے کا گر جانتا تھا وہ سوسائٹی میں باعزت با اصول امیر کی حیثیت سے کافی ہر دلعزیز تھا

اسی اثنا میں ایک اور رئیس کے یہاں اس کی ملاقات ایک نوجوان کافر ادا اداکارہ سے ہوئی۔ وہ بالکل نوخیز اور ترو تازہ پھول کی طرح تھی اس نے چند دن سے اسٹیج کی زندگی اپنائی تھی لیکن اس کے باوجود بڑی جلدی شہرت و کامیابی حاصل کر لی۔ ایبے انتہا پسند تھا۔ اس نے بڑے جوش و خروش سے محبت کا آغاز کیا وہ خوب صورت تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ تنک مزاج اور ضدی بھی تھی مگر ویلیس کہتا کہ اس کی یہ ضد یہ ادائیں اپنے میں فرشتوں کی سی خصوصیت رکھتی ہیں۔ لیکن وہ خوب جانتی تھی کہ مرد پہ کس قدر فتح حاصل کی جاتی ہے۔ کیسے ان کو متوالا اور دیوانہ بنایا جاتا ہے وہ خوب واقف تھی کہ مرد کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے اس کے عشق کے ولولے کو بھڑکانے کے لئے اگر عورت اپنا جسم ذرا سا عریاں کرے تو اس کا اشتیاق اور بھی سرگرم اور پرجوش ہو جائے گا وہ اس کی داشتہ بن گئی اور اداکاری سے کنارہ کشی کر لی۔ چار سال تک اسی طرح ان کی محبت و الفت جاری رہی۔

ویلیس کو جب معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ حاملہ ہے تو اس نے اپنی خاندانی روایات کو ترک کر کے شادی کر لینے کا مصمم ارادہ کر لیا لیکن اسی اثنا میں اس کو علم ہوا کہ جس دوست نے اس کو متعارف کرایا تھا۔ اس سے برابر خفیہ طور پر ملاقات کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کی بے وفائی کے ثبوت میں کچھ خطوط اس کی الماری سے دستیاب ہوئے۔ وہ غصہ اور رقابت سے دیوانہ ہو گیا۔ بڑی سختی سے اس کی غداری، اس کی ضلالت اور کمینگی پر لعنت اور سرزنش کی لیکن وہ بڑی بے حیا، گستاخ اور دلیر عورت تھی۔ اس نے

ذر ہوکر اس کے غصہ کی مدافعت کی۔ ایبے کی آنکھوں سے نکلتے شعلے اور چہرے
کے وحشیانہ پن کو دیکھ کر وہ عورت اس کے خون کر دینے کے ارادے کو بھانپ
گئی۔ اور جیسے ہی دیلیس کا غیض و غضب نقطۂ عروج پر پہونچا تو اس نے چلا کر
کہا۔

مجھے جان سے مت مارو یہ بچہ تمہارا نہیں اس کا ہے۔
یہ سن کر دیلیس کے ہاتھ رک گئے۔
اس نے ڈری ہوئی آواز میں کہا کہ یہ بالکل تمہارا نہیں ہے۔ اس کا
ہے۔

دانت پیس کر وہ چلایا۔ "بچہ"

"ہاں"

تم جھوٹ کہتی ہو اس کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ اس نے جان
بچانے کی آخر تک کوشش کی۔ اور اپنی بات پر اڑی رہی۔ میں کہتی ہوں یہ اسی
کا ہے ہم اور تم تو بہت دن سے ساتھ رہ رہے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے تم باپ
نہیں بنے اس دلیل میں اس کو صداقت کی جھلک نظر آئی۔ اس کے علاوہ بھی
بہت سے دلائل اس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گئے جس سے یہ بات قطعی واضح
ہو گئی کہ وہ اس بدقسمت بچے کا باپ نہیں ہے جو اس طوائف کے نطفے سے تولد
ہوگا۔ اور اس طرح اس کو ذہنی اور دماغی سکون حاصل ہو گیا۔ اور اس نے
اس ذلیل مخلوق کو مار ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور بہت ٹھہرے ہوئے
اطمینان لہجے میں اس کو مخاطب کر کے کہا۔

"اچھا...... اٹھو...... اور جاؤ اور آئندہ کبھی مجھے اپنی صورت
نہ دکھانا"

وہ سعادت مندی سے اٹھی۔ اور چلی گئی۔ اس کو اپنی ترکیب میں
خاطر خواہ فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے کبھی
نہیں ملے۔

ایبے بڑی دور جنوب کے گرم خطے کے ایک گاؤں میں جو بحرہ
روم کے کنارے واقع تھا۔ قیام پذیر ہو گیا۔ پہلے وہ ایک چھوٹی سی سرائے
میں جہاں سے سمندر کا نظارہ بخوبی ہو سکتا تھا۔ آکر ٹھہر گیا۔ اس کو یہ جگہ
پسند آ گئی۔ اور ایک کمرہ لے کر وہیں چند دن قیام کا منصوبہ بنا لیا۔ وہ اشعار
لکھا اپنی کلفت و رنج اور غم کو بھلانے کے لئے الگ تھلگ اس سرائے میں
پڑا رہتا۔ ہر لمحے اس غدار اور بے وفا عورت کی سحر انگیز یاد، اس کے
ساتھ اختلاط کا لطف اس کے ناز و انداز دل و دماغ پر حاوی رہتے
زیتون کے بھورے بھورے پتوں سے چھن چھن کر آتی دھوپ میں پر ڈیکل
کی وادیوں میں بے مقصد گھوما کرتا۔ اور صرف وہی پریشان کن خیال،
تھکا دینے والی مریضانہ کیفیت اس کے دماغ پر مسلط رہتی۔ دھیرے
دھیرے اس کا جوش عشق سرد پڑتا گیا اس کے قلب کے تیرہ و تار سکوت
کو تقدس اور راسخ عقائد کی دھیمی دھیمی آنچ نے گرما دیا۔ مکر و فریب سے
چھٹکارہ پانے کے لئے اس مذہب کی پناہ گاہ میں آ گیا جس سے عرصہ
ہوا وہ بیگانہ ہو چکا تھا۔ جب وہ بہت غمگین ہوتا تو عبادت میں مشغول
ہو جاتا وہ اکثر تاروں کی چھاؤں میں تنہا دوزانوں ہو کر کلیسا کے لیمپ کی
مدھم روشنی میں بیٹھ جاتا۔ یہ وہ گوشہ تھا جہاں بیٹھ کر لوگ خدا کے
گیت گاتے ہیں۔ یہ جگہ مقدس ہے کلیسا کی محافظ ہے اور یہیں ہمیں
خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے خالق سے ناطہ جوڑ لیا۔ اس کو
اپنے دکھوں کا اپنے غم کا راز داں بنا لیا۔ اپنا پر الم دل خدا کے سامنے
کھول کر رکھ دیا اور اس کی امداد کا طلب گار ہوا۔ اس سے رحم کی،
حفاظت کی اور سکون قلب کی التجا کی اور ہر روز اس کی عبادت و ریاضت
میں خلوص سرگرمی اور حرارت نمایاں ہوتی گئی۔ عورت کی بے وفائی سے
چوٹ کھایا ہوا غمزدہ دل دور جذبات سے مرتعش رہتا۔ آہستہ آہستہ
ریاض اور درویشانہ فضائل اور تقدس اس کے رگ و پے میں سرایت
کرتے گئے۔ اس نے حضرت عیسےٰ کی روح سے نیاز حاصل کر لیا۔ جو اس
گناہ گار کے عیب ڈھانک لیں گے۔ اور اس کے نجات دہندہ ہوں گے۔
اب وہ جسمانی اور روحانی طور پر عشق حقیقی میں گرفتار ہو گیا جس کے بعد
مجازی عشق کی فسوں گری نقش باطل کی طرح دھیرے دھیرے لوح
قلب سے مٹتی گئی۔

اس نے اپنے پرانے فیصلے پر عمل کیا اور اپنی غمگین زندگی کلیسا کے
لئے وقف کر دی۔ مذہب کے لئے اس کے دل میں سچائی، پاکیزگی اور لگن
اسی طرح موجود تھی۔ ایبے نے اپنے اثر اور رسوخ سے کام لے کر پادری
کا عہدہ دیلیس میں سنبھال لیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ پہلے آیا تھا۔ اپنی
دولت کا بیشتر حصہ خیرات کر دیا اور صرف اتنا اپنے پاس رکھا جتنا اس

کی ضروریات کے لئے اور غریبوں مسکینوں کی مدد کے لئے درکار تھا۔

اور اس طرح وہ زہد و تقویٰ، ریاض و عقیدت کے سائے میں پناہ گزین ہو گیا۔ وہ ایک قابل ستائش پادری ثابت ہوا۔ اگرچہ اس کے عقائد اور خیالات محدود تھے ہمارے وجدان، ہمارے ذوق، ہماری خواہشات ہی ہیں در اصل گمراہ کرتی ہیں۔ بے راہ، کورانہ تقلید کرنے والوں کا، زندگی کے گرداب میں پھنسے ہوئے گناہ گاروں کا نجات دہندہ بن گیا۔ لیکن عورت سے وہ بڑا خائف ہو گیا۔ اس کی فطری تندی، سرگرمی اور اس کا جوش نشانہ بازی اور دوسرے کھیلوں کی طرف منتقل ہو گیا۔

باتونی ملاح جو ایبے کے ساتھ تھا برابر کوشش کرتا رہا کہ گفتگو کا کوئی پہلو نکل آئے مگر ایبے کی ہمہ گیر شخصیت سے مرعوب تھا بالآخر جی کڑا کرکے بول ہی اٹھا۔

"کیا آپ کو یہ چھوٹی سی گڑھی پسند ہے" ؟

اس گڑھی میں گنتی کے چند گھر تھے۔ یرونیس کے لوگ تبدیلی آب و ہوا کے لئے گڑھی میں آیا کرتے تھے ایبے نے بھی چھوٹا سا گھر کرائے پہ لے رکھا تھا یہ جگہ کلیسا سے ذرا دور واقع تھی۔ گڑھی میں اس کا قیام مستقل نہ رہتا بلکہ اکثر آتا رہتا تھا۔ یہاں ایک کشش تو یہ تھی کہ نشانہ بازی کی مشق ہو جاتی دوسرے سیر و شکار کی وجہ سے کچھ دن آزادی و اطمینان اور سکون کا سانس لے لیتا۔

ہاں بھئی کیوں نہیں مجھے تو یہ جگہ کافی پسند ہے۔ ایبے نے مختصر جواب دیا۔ پیڑوں کے جھنڈ میں چھپی گلابی رہائش گاہ اب نظر آنے لگی تھی لیکن عمارت کا بیشتر حصہ ابھی زیتون کے پتوں اور شاخوں میں چھپا ہوا تھا۔ ایک لمبی عورت جو میز لگا رہی تھی اندر آتے جاتے نظر آ رہی تھی۔ اس نے بڑے سلیقہ اور کمال احتیاط کے ساتھ ایک رکابی، ایک چھری کانٹا ایک ڈبل روٹی ایک گلاس میز پر چن دیا۔ اس نے کالی مخملی ٹوپی جس کا اوپر حصہ بھوری اون کا تھا سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ جب ایبے گھر کے نزدیک آیا تو اس نے پکار کر کہا۔

مارگریٹ...... سنو !!

مارگریٹ نے نظر اٹھائی اور اپنے آقا کو پہچان لیا۔

آہاہ جناب تشریف لے آئے۔

ہاں بھئی آ گیا اور بہت سی مچھلیاں بھی شکار کر کے لایا ہوں۔ اور دیکھو یہ جو مچھلی ہے نا ذرا اس کو مکھن میں تل لاؤ تو ...... سنا تم نے ......

مارگریٹ نزدیک آئی۔ اور مچھلیوں پر تنقیدی نظر ڈالی۔

لیکن اس وقت کھانے پر ابلا ہوا تیتر بھی موجود ہے مارگریٹ نے اطلاع دی۔

کوئی بات نہیں تازہ مچھلی کی بات اور ہی ہوتی ہے کل تک باسی ہو جائے گی۔ آج جو مزہ ہے کل اس میں نہ ہو گا۔ چلو آج ضیافت ہی سہی ورنہ روز اتنی مچھلیاں ہاتھ نہیں لگتیں۔ عمدہ اور اچھا کھانا کھا لینا گناہ تو نہیں ہے۔

ملازمہ نے ایک مچھلی نکالی اور لے کر جانے لگی مگر فوراً ہی پلٹ آئی اور کچھ یاد کر کے بولی۔ میں تو بھول ہی گئی تھی ایک آدمی چار بار آپ سے ملنے آ چکا ہے۔ ایبے نے بے تعلقی سے دریافت کیا، کون آدمی تھا۔

وہ مجھے تو کوئی اچھا آدمی نہیں لگا۔

کیا فقیر تھا ؟

شاید فقیر ہی ہو۔ میں یقین سے اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتی میرا خیال ہے کہ وہ تو مجرم تھا۔

ایبے یہ سن کر ہنسنے لگا وہ جانتا تھا کہ مارگریٹ فطرتاً بزدل واقع ہوئی ہے چونکہ گڑھی میں اکیلی رہتی ہے اس لئے اس پر خوف کا بھوت سوار رہتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ اس وہم میں مبتلا رہتی ہے کہ کوئی آ کر اس کو قتل کر دے گا۔

ایبے نے ماہی گیر کو تھوڑے تھوڑے دام دے کر رخصت کیا پھر معمول کے مطابق منہ ہاتھ دھویا اور مارگریٹ باورچی خانے میں مچھلی صاف کرنے چلی گئی خون میں لپٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے مچھلی کے سفنے چاندی کے بکھرے ہوئے سکوں کی طرح چمک رہے تھے۔

مارگریٹ وہیں سے چلائی دیکھئے دیکھئے وہ پھر آ گیا۔

ایبے نے مڑ کر دیکھا تو اس کو پرانے اور خراب کپڑوں میں ملبوس ایک شخص اس کے اپنے گھر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ بہت محظوظ ہوا اور دل ہی دل میں ملازمہ کے خدشوں سے متعلق سوچ سوچ کر مسکراتا رہا لیکن

...قیقت یہ تھی کہ وہ واقعی عادی مجرم ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ جیبوں میں ہاتھ
... ٹہلتا ہوا ایپے کے گھر کی جانب بڑھتا آ رہا تھا۔ وہ بالکل نوجوان
...بی اور گھنگریالے بالوں والی داڑھی تھی۔ اس کے بالوں کی لٹیں فلٹ
...ٹ سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ ہیٹ کا رنگ بڑا شکستہ تھا اور اصل رنگ
...ل معدوم ہو چکا تھا۔ بادامی اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ پتلون گھٹنوں پر سے
...س چکا تھا۔ جوتے بٹی ہوئی گھاس کے بنے تھے۔ وہ اگرچہ قبول صورت تھا
...رے سے کثرت شراب نوشی عیاں تھی۔ چندیا پہ بال بہت کم تھے۔ جو اس
...ت کے غماض تھے کہ یہ شخص اوائل عمری میں عیاشی کا عادی رہا ہے کیونکہ
...ی کی عمر بیس پچیس سے زیادہ ہرگز نہ تھی۔ پادری نے بھی اپنا ہیٹ اتار
... ذرا سوچنے لگا یہ معمولی آوارہ گرد ہے یا ناگہانی اور ناخواندہ مہمان
...ے یا کام سے نکالا ہوا مزدور ہے یا عادی مجرم جو جیل سے بھاگا ہو۔

اجنبی نزدیک آ گیا تھا اس نے زور سے کہا "آداب عرض کرتا ہوں"
...دری نے بھی کہا آداب عرض لیکن اس کا دل بالکل نہ چاہتا تھا کہ اس
...ستہ نووارد کو آپ جناب سے مخاطب کرے۔ دونوں ایک دوسرے
...ٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ ایپے کے رگ و پے میں اجنبی کی نگاہوں نے
...س کی تھرتھری پیدا کر دی تھی۔ اس کو ایسا لگا کہ کوئی ان دیکھا دشمن
...س کے روبرو کھڑا ہے طرح طرح کے اندیشے اس کے دماغ میں جنم لینے
...گے۔

آخر کار نووارد بولا آپ نے مجھے پہچانا ؟

پادری نے بھونچکا ہو کر جواب دیا۔ میں ...... میں نے تمہیں
...ی نہیں دیکھا ......

مجھے بالکل نہیں معلوم کہ تم کون ہو ....

ہاں نہیں جانتے ...... میں نے سمجھ لیا...... مگر ذرا مجھے غور
...دیکھئے۔

میں جانتا ہوں بار بار دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں میں نے تمہیں
...گی بھی بار دیکھا ہے۔

ہاں ! ہاں ! یہ بے شک ٹھیک ہے۔ آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا
...یہ آپ کو ایک شخص کی شبیہ دکھاؤں گا جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔
...ڑا اس نے ہیٹ سر پہ رکھ لیا۔ اور اپنے اوورکوٹ کے بٹن کھولے اس کے
نیچے اس نے کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ اس کی ننگی چھاتی اور اندر دھنسا ہوا
پیٹ اور کمر کے چاروں طرف بندھی ہوئی پیٹی جو اس نے پاجامے کے اوپر
باندھ رکھی تھی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا
اس لفافے سے ایک تصویر برآمد کی۔ جو بہت زمانہ گذرنے کے سبب
پیلی ہو چکی تھی۔ اس کے نقوش جگہ جگہ سے مٹ گئے تھے۔ انسانی گوشت
پوست کی قربت کے سبب وہ تصویر گرم تھی۔ اور جسم کی حدت نے عکس کو
دھندلا کر دیا تھا۔ اس نے تصویر ذرا اونچی کر کے پادری کے چہرے
کے روبرو دکھا کر بولا۔

لیجئے دیکھئے۔ کیا آپ اس کو نہیں پہچانتے۔ ایپے نے دو قدم
آگے بڑھائے تاکہ اس کو اچھی طرح دیکھ لے۔ تصویر دیکھ کر ایپے کا چہرہ
ہلدی کی طرح زرد ہو گیا کیونکہ یہ وہی تصویر تھی۔ جو اس نے اس عورت
کو دی تھی جب کہ ان کی محبت خوب پھل پھول رہی تھی۔

ایپے خاموش رہا۔ کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ
سب کیا ماجرا ہے ؟

اس آوارہ گرد نے پھر دہرایا۔ کیا آپ اس کو جانتے ہیں۔
("اس کو" پر خوب زور دیا۔)

پادری نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا... ہاں .... یقیناً۔

کون ہے یہ ؟

یہ میں ہوں۔

کیا واقعی یہ آپ ہیں ؟

یقیناً !!

اچھا تو اس تصویر کو دیکھئے اور پھر مجھے دیکھئے۔

بے چارہ غریب پادری بخوبی دیکھ رہا تھا کہ تصویر اور یہ آدمی جو
کھڑا دانت نکال رہا ہے ایک دوسرے سے توام بھائیوں کی طرح مشابہ
ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کچھ نہ سمجھا۔

ذرا تامل کے بعد پادری نے پوچھا کہ آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

اور تب وہ بدمعاش بڑی مکاری سے بولا۔ میں کیا چاہتا ہوں....
تو سنو سب سے پہلے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے پہچان لیں۔

تم ہو کون آخر ؟

میں کون ہوں ؟ جاؤ سڑک پر جا کر کسی سے دریافت کر لو اپنے ملازم سے پوچھ لو۔ اور اگر چاہو تو شہر کے میئر سے پوچھ لو۔ اس کو یہ تصویر دکھاؤ اور وہ صرف ہنس دے گا لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ آپ مجھے پہچاننا نہیں چاہتے۔ مگر میں آپ کو ابھی بتاتا ہوں سنئے۔

جناب۔ میں آپ کا بیٹا ہوں !! بوڑھے نے ہاتھ ہلا کر مایوسی سے کہا یہ صحیح نہیں ہے اس نوجوان نے پادری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا محترم بزرگ یہ بالکل حقیقت ہے۔ اب آپ کا جھوٹ زیادہ دن نہیں نبھ سکتا۔ آیا خیال شریف میں !

اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ اس کے لب و لہجے میں یقین کامل پنہاں تھا۔ پادری آہستہ آہستہ قدم پیچھے ہٹا رہا تھا۔ اور اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا کہ ہم دونوں میں کون غلطی پر ہے۔ اس نے پھر ایک بار زور دے کر کہا کہ اس کے کوئی بچہ نہیں ہے۔

دوسرا بولا اور نہ شاید کوئی داشتہ بھی تھی ؟

بوڑھے نے پُر استقلال لہجے میں اعتراف کیا اور کہا "ہاں"

اور کیا وہ داشتہ اس وقت حاملہ نہ تھی جب آپ اس کو چھوڑ چلتے بنے تھے۔

تب پچیس سال پرانی چنگاری جو راکھ کے ڈھیر میں دب گئی تھی اچانک سلگ اٹھی۔ اس کا یہ یقین جو اس نے اپنی محبوبہ کو بھی دلایا تھا کہ اب اس کی محبت اور یاد دل سے نکل چکی ہے ایک بار پھر تازہ ہو گئی۔ اس نے چلا کر کہا۔ میں نے بے شک اس کو چھوڑا ہے کیونکہ اس نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھ سے بے وفائی کی۔ وہ بچہ دوسرے کا تھا۔ اگر وہ مجھے یہ یقین نہ دلا دیتی کہ بچہ دوسرے کا ہے تو میں اس کو جان سے مار کر بے وفائی اور غداری کا مزہ چکھا دیتا۔ اور حضرت اس وقت آپ بھی زندہ نہ ہوتے۔ پادری کے لہجے کی صداقت نوجوان کو متاثر کئے بغیر نہ رہی۔ وہ بڑا متعجب ہوا۔ اور آہستہ سے بولا۔ آپ سے یہ کس نے کہا کہ وہ بچہ دوسرے کا ہے ؟

اس عورت نے کھلم کھلا مجھ سے اعتراف کیا۔

تب وہ آوارہ لڑکا ذرا چپ ہوا اور بڑھ چڑھ کر دعوے نہیں کئے۔ صرف اتنا کہا تب اماں کو غلط فہمی ہوئی۔

ایبے نے بھی دھیرے دھیرے غصہ پر قابو پا لیا اور لڑکے سے دریافت کیا کہ تم سے کس نے کہا کہ تم میرے بیٹے ہو ؟

خود میری ماں نے مجھے مرتے وقت مجھے بتایا۔ اور یہ تصویر مجھے دی۔ یہ کہہ کر دوبارہ تصویر نکالی۔ بوڑھے نے وہ تصویر ہاتھ میں لے اور دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کا کرب اور خلفشار بڑھتا رہا۔ تصویر کی اور [illegible] کی مشابہت کو دیکھتا رہا۔ اور اب اس کو یقین ہو چلا کہ یہ اوباش لڑکا اس کا اپنا بیٹا ہے۔ بے چینی اور بے قراری نے اس کی روح کو محیط کر لیا [illegible] کن اور ناقابل بیان بے کلی اور احساس جرم نے اس کے رگ و پے کو [illegible] دیا۔ کچھ وہ سمجھ گیا اور کچھ قیاساً اس پر واضح ہو گیا۔ جدائی کا وحشتناک [illegible] بار پھر اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ اس مکار عورت نے اس کے غیض و غضب کا اندازہ لگا کر جھوٹی داستان بیان کر دی۔ دروغ بیانی نے اس کی جان تو بچالی مگر بیٹا ہوا۔ اور وہ زندہ بھی رہا .... اور ذلیل و حقیر نالی کا کیڑا بن گیا۔ بکرے کی طرح اپنے ساتھ بدبو کے بھبکارے چھوڑتا پھرتا ہے۔

ایبے نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ اندر کمرے میں آؤ تاکہ اطمینان سے بیٹھ کر مفصل بات چیت کریں۔

ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں تو آیا ہی اس لئے ہوں۔

دونوں شانہ بہ شانہ زیتون کے درختوں کے نیچے سے گذرتے ہوئے اندر کمرے میں آ گئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ شفق کی روشنی اب مدھم اور سرخ میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ تب ہی ایبے نے زیتون کے مقدس پیڑوں کی چھاؤں تلے گذرتے ہوئے دعا کی کہ اے خدا تو میری مدد کر۔ پھر اس نوجوان سے [illegible] میں آ کر بولا اچھا تو تمہاری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔

اتنا کہہ کر اس کو ایسا لگا کہ اس کا غم پھر تازہ ہو گیا ہے۔ اس نے [illegible] دل تھام لیا، اس کے قلب کے گوشے گوشے میں اپنی محبوبہ کی یاد کے چراغ روشن ہو گئے اس کے ساتھ گذارے ہوئے عیش و نشاط کے لمحات کی [illegible] میں کروٹ لینے لگی۔

لڑکا بولا۔ جی ہاں جناب میری والدہ مر چکی ہیں۔

کیا بہت دن ہو گئے ؟

ہاں تین سال ہو گئے۔ پادری کے دل میں ایک خدشے نے [illegible]

پھر تم اتنے دن کہاں رہے ؟

دوسرا ہچکچایا۔ اور بولا۔ میں آ نہیں سکا۔ کچھ مجبوریاں تھیں

کی تفصیل بھی بتاؤں گا۔ لیکن فی الحال یہ عرض کرنا ہے کہ میں کل صبح سے بالکل بھوکا ہوں۔

جذبۂ ہمدردی نے بوڑھے کے دل میں ترحم کے جذبات جگا دیئے بولا۔ ہائے میرے بچے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لئے۔

نوجوان کی زبان شاید طنز کرنے سے کبھی نہ چوکتی تھی فوراً بولا میرا خیال ہے کہ ہم دونوں نے اب واقعی ایک دوسرے کو پہچان لیا ہے۔

اس لمحے پادری کو خیال آیا کہ آج کھانا تو خوب اچھا تیار ہے۔ تازہ مچھلی اور گوشت ہے۔ بے چارہ پیٹ بھر کر کھانا کھائے گا۔

ایسے نے مارگریٹ سے کہا کہ کھانے دیوان خانے میں لے آئے۔ مگر حد کا ذرا بھی اثر نہ ہونے پائے اور ہاں دو آدمیوں کے لئے پلیٹیں لانا۔

مارگریٹ کو یہ سوچ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ آج مالک کو کیا ہو گیا ہے جو ایک کار محض انسان کے ساتھ کھانا کھانے والے ہیں۔

ایسے نے انتظار کرنا فضول سمجھا اور خود ہی کھانے پینے کا سامان دیوان خانے میں لگانے لگا۔ چند لمحوں میں کام سے فارغ ہو کر دونوں سامنے بیٹھ گئے۔ گرم گرم سوپ کی بھاپ دونوں کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی۔ سوپ کے چمچے بھر بھر کے اس آزاد منش نوجوان نے شروع کر دیئے۔ ایسے بہت بھوکا نہیں تھا۔ اس لئے دھیرے دھیرے لے کر شوربا پیتا رہا۔

اس نے اچانک نوجوان کا نام پوچھا۔

نوجوان ہنسا۔ ترنوالے نے بھوک کی شدت کم کر دی تھی۔ باپ نہیں تھا کہ کون ہے اس لئے ماں نے اپنا نام بھی ساتھ لگایا۔ دو نام ہیں۔ فلپ اور آگسٹس۔

اتنا سن کر ایسے کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وفور جذبات سے اس دھڑکنے لگا۔ اور وہ بمشکل بولا۔ انھوں نے یہ نام کیوں رکھے۔

سوچیئے ..... جب آپ اماں کو چھوڑ گئے۔ تو انھوں نے دوسرے بتایا کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔ اور وہ اس خوش فہمی میں پندرہ سال پھر میرا آپ سے مشابہ ہوتا گیا۔ تب اس کمبخت نے اپنا بیٹا ماننے سے یا تمہیں یہ ساری تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟

دونوں میں خوب مار پیٹ ہوتی تھی۔ اکثر دونوں کے منہ سے غصہ میں بہت سی باتیں بہت سے راز نکل جاتے۔ اس طرح دھیرے دھیرے میں ساری باتوں سے واقف ہو گیا۔ اور شاید اب آپ کی بھی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔

پادری کے لئے چار منٹ تقریباً آدھے گھنٹے سے عجیب طرح کی اذیت میں مبتلا رہا تھا۔ آوارہ اور اوباش اپنے انداز گفتگو میں زہر گھول کر تضحیک و تذلیل کا پہلو نکال کر جس انداز سے ہر ہر بری بات پر زور دے کر صلواتیں سنا رہا تھا۔ یہ دل خراش جملے پادری کے دل میں ایسا جذبہ ابھار رہے تھے کہ اس کا بے اختیار جی چاہنے لگا کہ اس بدکردار کو جان سے مار دے گلا گھونٹ دے۔ خود اس میں اور نوجوان میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس نے سوچا یہ کتنا خبیث اور بد طینت ہے۔ گندے نالے کی طرح جس میں تعفن ہی تعفن ہے جس میں، بس بھرا ہے۔ اور جس کا اثر قلب و روح کو پاش پاش کر دیتا ہے کیا یہ اس کا بیٹا ہو سکتا ہے؟ اس کو کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پھر زیتون کے مقدس پیڑوں کے متعلق سوچا اور خدا سے دعا کی کہ وہ اس کی رہنمائی کرے۔

فلپ آگسٹس نے سوپ ختم کر کے پوچھا۔ اچھا اور کچھ ہے کھانے کو؟

باورچی خانہ کافی دور تھا۔ اس لئے پادری نے ملازمہ کو بلانے کے لئے ایک گھنٹی کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے پیتل کی گھنٹی پر آہستہ سے چوٹ ماری۔ گھنٹی کی آواز فضا میں دور تک گونج پیدا کرتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ملازمہ بھی آ گئی۔ اس نے مہمان پر تحقیر آمیز نظر ڈالی مجرم صورت نوجوان کو دیکھ کر ان جانے خدشے اور خطرے اس کے دل میں ابھر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وفادار کتے کی طرح اس نے خطرات کی بو سونگھ لی تھی۔ اس نے کھن میں گرم گرم تلی ہوئی مچھلی میز پر چن دی۔ پادری نے چھری سے مچھلی کی قاشیں کر کے اپنے بچے کی پلیٹ میں اور اپنی پلیٹ میں رکھ لیا اور بولا ایسے نے یہ مچھلیاں خود شکار کی ہیں۔

مارگریٹ کھڑی ہوئی تھی۔ آقا نے حکم دیا کہ جاؤ عمدہ سفید شراب لاؤ۔ مارگریٹ کے انداز سے ایسا لگا کہ اس کو یہ بات پسند نہیں آئی وہ انجان بن کر چپ کھڑی رہی۔

ایسے کو دوبارہ اپنی بات دہرانی پڑے گی۔ جلدی جاؤ بھی۔ وہ بوتلیں لانا (کیوں کہ مہمانوں کے ساتھ اکثر خود بھی ایک بوتل پی لیا کرتا تھا) فلپ آگسٹس شگفتگی سے بولا۔ آج بڑے دنوں کے بعد اتنا لذیذ اور عمدہ کھانا کھایا ہے۔

ملازمہ گو چند لمحوں کے بعد ہی شراب لے آئی تھی مگر ایسے کو یہ پل صدیوں کے برابر معلوم ہوئے کیونکہ وہ اماں کی داستان ٹرک کی زبانی سننے کے لئے بے تاب تھا۔ بوتلوں کو کھول لیا گیا ملازمہ اسی طرح تو وارد کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتی رہی۔

تم اب جا سکتی ہو پادری نے کہا۔

مگر مارگریٹ نے سنی ان سنی کر دی۔

پادری نے دوبارہ ذرا تیز لہجے میں کہا۔ "تم اب جا سکتی ہو" تب وہ بادل نخواستہ چلی گئی۔

فلپ آگسٹس ندیدوں کی طرح مچھلی کھا تا رہا۔ اس کا باپ اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے کھلی ہوئی بدکاری عیاں تھی۔ اور شبیہ پادری سے مشابہ تھی۔ اور اس چیز نے اس کو ذہنی خلجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بظاہر وہ چھوٹے چھوٹے نوالے کھا رہا تھا مگر اس کا دماغ کہیں اور سوچوں میں گم تھا۔ وہ دھیرے دھیرے نوالہ چبا تا جاتا تھا لیکن سوال پوچھنے کو بے چین نظر آ رہا تھا۔

آخر کار وہ پوچھ بیٹھا کیا مرض ہوا تھا؟

پھیپھڑے خراب ہو گئے تھے۔

کیا بیماری نے بہت طول کھینچا؟

تقریباً اٹھارہ مہینے۔

یہ مرض کہاں سے لگ گیا تھا؟

اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے!!

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

وہ دونوں مدت دراز گزری ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ لیمنے نے اس کی یاد کو دل سے نوچ کر پھینک دیا تھا۔ سرور آگئیں لمحات کی یاد کو دل سے محو کر دیا تھا لیکن اب جب کہ وہ مر چکی ہے تو اس کا جی چاہا کہ ایک ایک تفصیل معلوم کرے۔

تمہاری ماں اکیلی رہا کرتی تھیں؟

نہیں آخر تک وہ اسی کے ساتھ رہیں۔

اچھا...... آخر تک ساتھ رہیں۔

ہاں اور کیا۔

بوڑھا سوچنے لگا کہ ایک عورت جس نے میرے ساتھ بے وفائی کی وہی دوسرے کے ساتھ مسلسل ۳۰ سال تک کمال محبت و وفادار رہی۔ پادری ایسے نے ذرا ہکلاتے ہوئے دریافت کیا۔ اچھا تو کیا وہ خوش و خرم تھے۔

نوجوان تحقیر آمیز لہجے میں بولا ہاں دونوں میں خوب بنتی بس میرے ہی سلسلے میں تکرار ہو جاتی۔ اگر میرا قصہ نہ ہوتا تو دونوں کی اچھی گزر جاتی۔

تمہارا کیا معاملہ ہوتا تھا؟

ارے ابھی تو بتا چکا ہوں کہ پندرہ سال تک تو مجھ (؟) رہا مگر وہ احمق تھوڑی تھا بہتر قطعی آپ کی شکل تھا بس دونوں بات پر ٹھنی رہتی۔ مار پیٹ تک نوبت آ جاتی۔ میں دروازوں کی دیکھا اور سنا کرتا۔ وہ اماں پر الزام رکھتا کہ تم نے ایسا کیوں کہتی کہ جب تمہیں پتہ تھا کہ میں کسی اور سے منسلک ہوں تو کیو تعلق رکھا۔ اور یہ کسی اور "آپ کی ذات شریف تھی"۔

اچھا تو اس طرح میرا بھی ذکر خیر ہوا کرتا تھا۔

ہاں مگر میری موجودگی میں بڑے محتاط رہتے۔ بس آخر میں اماں نے سارا ماجرا سنایا۔ ورنہ ہمیشہ چھپایا ہی کرتی تھیں۔

تب تمہیں معلوم ہوا ہوگا کہ تمہاری ماں کی زندگی میں کس قدر بے کیفی اور بدمزگی تھی۔

ہاں میں اتنا احمق بھی نہ تھا کہ اتنی بات نہ سمجھتا۔

فلپ جام پر جام چڑھا رہا تھا اس کی آنکھیں اور چہرہ لبے تھے۔

پادری کو خیال ہوا کہ مزید شراب نوشی سے اس کو باز رکھے۔ فوراً ہی ایک خیال اس کے ذہن میں کوند گیا۔ شراب پی کر انسانی جذبا خیالات بے قابو ہو جاتے ہیں۔ ڈھکی چھپی باتیں بھی روشنی میں آ جاتی

اتنا سوچ کر دوسری بوتل بھی گلاس میں انڈیل دی۔
مارگریٹ ابلا ہوا تیتر لائی اور میز پر چن دیا۔ نوجوان کی طرف
چوندھیا کر دیکھا اور بولی۔ دیکھئے تو جناب یہ کس قدر پی رہا ہے ؟
تم جاؤ۔ اور ہمیں سکون سے رہنے دو۔ اتنا سن کر مارگریٹ
دھڑ سے دروازہ بند کر کے پاؤں دھب دھب کرتی چلی گئی۔
پادری نوجوان سے مخاطب ہو کر بولا تمہاری والدہ نے میرے متعلق کیا
کہا تھا ؟

ارے کیا کہتیں۔ وہی کہا جو عورتیں ایسے مردوں کے متعلق کہتی ہیں
جوان کو چھوڑ چلے جاتے ہیں۔ میرے خیالات ان جیسے نہ تھے۔ میرے اور ان
کے عقائد میں تضاد تھا۔ مجھے بڑا تنگ کیا۔ گذرنا مشکل تھا۔
کیا اکثر میرا ذکر کرتی تھیں ؟

ہاں اکثر !
مگر ایسے کہ میں سمجھ نہ پاؤں۔ لیکن میں سب سمجھتا اور جانتا تھا۔
اچھا تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا ؟
شروع میں بڑا اچھا۔ مگر بعد میں ناقابل برداشت۔ جب اماں نے
سمجھ لیا کہ میں اصل جھگڑے کی جڑ ہوں تو گھر سے نکال دیا۔
ہیں ؟ کیسے بھئی ؟

بہت آسانی سے۔ جب میں سولہ سال کا ہوا تو خوب شرارتیں کرتا
اس بےغیرت سور نے مجھے بچوں کی اصلاحی جیل میں بھیج دیا۔ اور اس طرح
مجھ سے چھٹکارہ پا لیا۔ اس نے میز پر کہنیاں رکھ لیں اور دونوں ہاتھوں
میں اپنا چہرہ تھام لیا۔ اس وقت وہ نشے میں مست تھا۔ اور اب اس نے
بے تکان نشے میں بولنا شروع کر دیا۔

وہ بڑی پیاری ادا سے مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں اس کی ماں کا
عکس صاف نمایاں تھا۔ پادری فوراً اس نتیجہ پر پہونچا کہ ناک نقشہ بالکل
اس جیسا ہے مگر مسکراہٹ اور انسان کو مسحور کرنے والی ادائیں ماں سے
ورثے میں پائی ہیں۔

آہا ہا !!!
میں نے بھی وہاں خوب مزے کئے۔ مگر اس اصلاحی جیل میں بیتے
ہوئے سارے واقعات و حالات سناؤں تو ایک اچھا خاصا ناول تیار ہو
جائے۔ وہ لمحہ بھر کو فلسفیانہ سنجیدگی سے (جیسا کہ اکثر شرابی کرتے ہیں) بولا
اگر کوئی کسی سے چھٹکارہ یا نجات حاصل کرنا چاہے تو کبھی بھی اپنے بچوں
کو وہاں نہ بھیجے۔ ہم تین گہرے دوست تھے۔ ایک رات ہم تینوں رات
کے نو بجے مال روڈ پر چہل قدمی کرتے ہوئے ندی کے گھاٹ پر آنکلے۔ ہم
نے ایک بگھی دیکھی۔ اس میں کچھ لوگ تھے جو بےخبر سو رہے تھے۔ کوچوان بھی
محو خواب تھا۔ میں نے گھوڑے کی لگام تھام لی بہت خاموشی سے گھوڑے کو
ہنکا کر کشتیوں کے اڈے کی طرف لے گئے۔ اور ایک کشتی میں میں نے گھوڑے
کو مع پوری گاڑی کے اتار دیا۔ اور بیچ دریا ان کو چھوڑ دیا۔ اس سے
کچھ آواز ہوئی کوچوان چونک گیا۔ اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ
دیتا تھا۔ اس نے چابک ہوا میں لہرایا۔ چابک پڑتے ہی گھوڑا پانی میں کود گیا۔
بگھی مع لوگوں کے ڈوب گئی۔ میرے دوستوں نے جو دوسری کشتی لئے ساتھ
ساتھ آ رہے تھے مجھے اپنے ساتھ کنارے واپس لے آئے۔ میری شرارت پر جی
کھول کر داد دی۔ فضا میں خوب قہقہے بلند کئے۔ مگر میرا منشا اس وقت کسی
کو نقصان پہونچانے کا نہ تھا لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ میری وجہ سے
لوگ ڈوب گئے۔ اس کے بعد عجیب جنون سا مجھ پر طاری ہو گیا۔ اور انتقاماً
جرم کرنے لگا۔ اس غصہ میں کہ مجھ سے کیوں وہ واقعہ سرزد ہو گیا میں نے
بڑی ایری حرکتیں کیں۔ جو کسی طرح بھی مناسب نہ تھیں۔ میں وہ باتیں کبھی
بھی نہ بتاؤں گا بس ان میں سے صرف ایک شرارت کا ذکر کروں گا۔ جس کو
سن کر ابا آپ ضرور خوش ہوں گے ابا میں نے آپ کا خوب بدلہ لیا۔
اس نے خوف زدہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔
فلپ بولنے کے لئے منہ کھولنا چاہتا تھا کہ پادری نے اس کو ہاتھ
کے اشارے سے روک دیا۔ گھنٹی بجا کر مارگریٹ کو بلایا۔ وہ
فوراً ہی آگئی پادری نے ترش روئی سے کہا۔ لیمپ لا کر رکھ دو
اور اگر کچھ اور باقی ہے تو وہ بھی لا کر میز پر چن دو۔ پھر تمہیں آنے
کی ضرورت نہیں ہے مجھے اگر کام ہوگا تو گھنٹی بجا کر بلا لوں گا۔

مارگریٹ نے سفید چینی کا لیمپ جس پر ہرا شیڈ لگا تھا لا کر رکھ
دیا۔ پنیر کا بڑا سا ٹکڑا۔ اور کچھ پھل بھی سلیقے سے میز پر رکھ دیئے۔ اور فوراً
واپس چلی گئی۔

اب تب نوجوان سے مخاطب ہوا۔ ہاں اب بتاؤ کیا کہہ رہے تھے تم ؟

فلپ آگسٹس نے خالی پلیٹ پھر بھر لی۔ شراب سے بھی گلاس پُر کر لیا۔ دوسری بوتل بھی خالی ہوا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس بوتل میں سے پادری نے ایک قطرہ نہ چکھا تھا۔ پیٹ بھر کر کھانا کھانے سے اور کثرت شراب نوشی نے اس کی زبان میں لکنت پیدا کر دی تھی۔ یہ بات آخری۔

.... ہے ..... اور

اور خوب ہی مزے دار ہے .... میں گھر واپس آگیا۔...

دونوں کے ساتھ رہنے لگا۔ اب وہ مجھ سے خوف زدہ رہنے لگے تھے۔..

... ہاں .... خوب ڈرتے تھے مجھ سے .... اس نے دو گھر بنا رکھے تھے۔ ایک نمبر آف سینیٹ کا مکان دوسرا اپنی معشوقہ کا۔ وہ میری ماں کے بغیر ایک پل نہ رہ سکتا تھا...... اس لئے زیادہ تر وقت ہمارے ساتھ ہی گذارتا میری ماں بڑی عقلمند تھی.... بڑی ہی اچھی تھی۔ وہ مردوں کو قابو میں رکھنے کے گُر سے خوب واقف تھی۔ آخر وقت تک اس کی روح تک کو اپنے مضبوط پنجے میں دبائے رکھا۔ .... لیکن مرد بھی بڑے سازدو ح ہوتے ہیں .....۔ ہاں تو میں واپس آگیا۔ میں اب اپنی طاقت سے اپنے حریفوں سے واقف ہو گیا تھا میری مکاری میرے کینے، اور میری قوت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس اثنا میں اماں بیمار ہو گئیں۔ وہ ان کو پر فضا اور روح پرور علاقے میں علاج کے لئے لے گیا۔ اٹھارہ مہینے وہ وہاں رہیں۔ وہ برابر انگلین رہا کرتا اور بلا ناغہ پیرس سے آیا کرتا۔ آہستہ آہستہ اماں کی حالت گرتی گئی۔ ایک صبح دونوں میں بڑی دیر بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد میری طلبی ہوئی اماں نے کہا میرا آخری وقت آگیا ہے۔ اور میں کاؤنٹ کے منع کرنے کے باوجود ایک راز کو افشا کر رہی ہوں۔ کہ تمہارا باپ زندہ ہے اور اس کا فلاں نام ہے۔

اس سے پہلے نہ جانے کتنی بار میں نے پوچھا کہ اماں میرے باپ کا نام بتا دو۔ مگر جو کبھی بتایا ہو۔ بعض اوقات تو میرا دل چاہتا کہ اماں کے منہ پر زور کا چانٹا لگا کر پوچھوں کہ میرے باپ کا نام بتاؤ۔ اور جب میں بہت پوچھتا تو صاف جھوٹ بول دیا کرتیں کہ وہ تو مر چکا ہے کہتی کہ بڑا غریب تھا۔ ایسے ہی چلتا پھرتا بے حوت آدمی تھا۔ میں الھڑ لڑکی تھی غلطی کر بیٹھی۔ دیکھا ابا کتنے دن مجھے فریب دیا۔ اور مرنے سے پہلے بولیں کہ تمہارے باپ کا نام ہے۔

دوسرا لمحہ پاس ہی آرام کرسی پر پڑا تھا۔ بڑے بڑے بولا روزی یہ تم نے برا کیا ہے۔

اور اماں یہ سن کر مارے جوش کے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میری آنکھ اب تک اس نظارے کو فراموش نہ کر سکیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اگرچہ چہرہ بالکل سرخ تھا۔ آنکھوں میں بھی اسی طرح زندگی کی تڑپ اور چمک موجود تھی۔ اماں مجھے بہت چاہتی تھیں کہنے لگیں فلپ ہر کے لئے کچھ تو کرو۔ دوران گفتگو میں اس کو فلپ اور مجھے آگسٹس کہا کرتی تھیں۔ اس کے جواب میں وہ پاگلوں کی طرح دھاڑا اس اوباش کے لئے .... ـــ

اس بدمعاش شرابی کے لئے .... جو ابھی ابھی جیل سے چھوٹ کر آرہا ہو۔ میں کچھ کر دوں .... جتنی گالیاں اس کو یاد تھیں سب مجھے دے ڈالیں مجھے بھی غصہ آنے لگا.....

لیکن اماں نے مجھے ٹھنڈا کر دیا۔ اور اس سے بولیں تو تم یہ چاہتے ہو کہ یہ بھوکا مرے۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں جو اس کو دوں۔

اس پر وہ بولا۔ میں تم کو پچھلے تیس سال سے ۳۵ ہزار ہ سالانہ دے رہا ہوں یہ رقم لاکھوں تک پہونچی ہے۔ تم امیرانہ ٹھاٹھ باٹ سے رہیں میں نے ہمیشہ تم کو چاہا۔ اور میرا خیال ہے کہ ہماری زندگی کافی ہنسی خوشی سے گذری۔

لیکن جہاں تک اس کا تعلق ہے میں اس کو ایک پیسہ نہ دوں گا اسی نے ہماری بعد کی زندگی تباہ و برباد کی ہے۔ مجھ سے اس سلسلے میں یہ کہ نہ کچھ امید رکھو اور نہ کسی بات کے لئے اصرار کرو۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو اسی کے پاس اس کو روانہ کر دو۔ میں تو اس سے کب کا مایوس ہو چکا ہوں۔ میں نے سوچا اب بتائیں گی میرے باپ کے متعلق سب باتیں۔ اب کا بیٹا ہے میرا۔ اور اگر وہ رد پے دالا ہوا تو اپنے تو ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ ہیں آخر کار وہ بولیں۔ تمہارا باپ بیرن ویلیس جو اب شیلون میں ہے۔ اپنے ویلیس کے نام سے مشہور ہے۔ وہ میرا عاشق تھا مگر میں نے اس کو ان کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اماں نے یہ تو بتایا مگر یہ نہ بتایا کہ انھوں نے اب کو دھوکا دیا۔ بات یہ ہے کہ عورت کی فطرت میں مکاری اور بے وفائی بھری ہوئی ہے۔

وہ بولتا جا رہا تھا خوب اپنے اگلے پچھلے عیب دہرا رہا تھا۔

جام پر جام حلق میں اتار رہا تھا۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ دو دن بعد وہ مر گئیں ہم دونوں ساتھ ساتھ قبرستان گئے۔ میں اور وہ ...... کیسی مضحکہ خیز بات تھی ..... وہ گائے کی طرح خوب رو دیا۔ مجھے دیکھ کر سب یہ سمجھے کہ باپ بیٹے ہیں۔ ہم واپس گھر آ گئے۔ ہم دونوں تنہا تھے میرا ارادہ تھا کہ اب یہاں سے روانہ ہو جاؤں میرے پاس صرف ۵ سکے تھے۔ اس سے کچھ پانے کی توقع تو ختم ہو گئی تھی۔ لیکن میرا ہاتھ پکڑ کر وہ اپنی لائبریری میں مجھ کو لایا۔ وہ اپنے ڈیسک کے پاس بیٹھ گیا۔ رقت سے اس کا گلا رندھ گیا کہنے لگا میں تم سے ہرگز ایسا برا سلوک نہ کروں گا جیسا تمہاری ماں کے سامنے کیا تھا۔

اس نے ایک ہزار کا چیک مجھے دیا۔ مجھ جیسے آدمی کے لئے یہ حقیر سی رقم تھی میں نے دیکھا کہ اس کی دراز میں ابھی نوٹوں کی بہت سی گڈیاں رکھی ہیں۔

روپے کی جھلک نے میرے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ اس درندے کو خوب ماروں اور سارے نوٹ اس سے چھین لوں۔ میں نے چیک لینے کے لئے ہاتھ تو بڑھایا لیکن بجائے اس کے کہ میں اس کی دی ہوئی خیرات لیتا اس کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اس کا گلا دبانا شروع کر دیا۔ جب اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اور دیکھا کہ عنقریب ختم ہو جائے گا تو میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اور ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ اس کو ننگا کر کے الٹا لٹا دیا۔

آ ہا ہا۔

میں نے آپ کا خوب بدلا لیا ...... ہنسی کے مارے اس کے پھندا لگ گیا۔ اس کے ہونٹوں کی ظالمانہ اور مکارانہ مسکراہٹ دیکھ کر ایبے کو پھر وہی عورت یاد آ گئی جس نے اس کے دل دماغ کو مسحور کر لیا تھا۔

پھر کیا ہوا ؟

پھر ...... آ ہا ہا ......

آتش دان میں خوب آگ دہک رہی تھی۔ جب اماں کا انتقال ہوا تو وہ بڑی شباب پر تھی۔ میں نے آگ کریدنی اٹھائی اس کو آگ میں رکھ کر خوب گرم کر لیا جب تپ کر لال ہو گئی تو اس کی پیٹھ پر صلیب کے نشان بنانے شروع کر دیئے۔ تو یاد رکھ میرے تو یاد بھی نہیں ...... جس طرح مجرموں کو داغا جاتا ہے۔ میں نے کپڑا اچھی طرح ٹھونس دیا تھا آواز کیسے نکالتا۔ بس ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے بارہ ہزار کے نوٹ لے لئے۔ اب میں چیک سمیت ۱۳ ہزار کا مالک تھا۔ (لیکن افسوس کہ وہ نوٹ میرے کام نہ آ سکے) میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور نوکروں سے کہہ دیا کہ وہ سو رہے ہیں۔ ان کو نہ جگایا جائے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی آبرو کے مارے چپ رہے گا کیوں کہ وہ سینٹ کا ممبر ہے لیکن میں غلطی پر تھا کیونکہ چار دن بھی نہ گذرے تھے کہ پیرس کے ایک ہوٹل میں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میں تین سال جیل میں رہا اسی لئے تو اتنے دن بعد آپ کے پاس آیا۔ اس نے پھر پینا شروع کر دیا۔ اور اب لکنت کے سبب جملوں کا سمجھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا ...... تو ...... ابا ...... کیسی عجیب بات ہے ...... کہ ...... ہمارا ...... باپ پادری نکلا۔ مگر آپ بہت اچھے ہیں ...... بہت اچھے ......

ایبے کا غصہ پھر عود کر آیا۔ اسمیں کی داشتہ مکار اور فریبی تھی ...... اور یہ اس کا بیٹا بھی قابل نفرت ہے۔ لعنت ہے ایسی اولاد پر۔

ایبے کے سامنے بارہا لوگوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ اپنے جرائم کا سرگوشی میں اقرار کیا۔ اور اس نے خدا کے نام پر ان کو معاف کر دیا۔ لیکن اب جب کہ خود اس کا معاملہ درپیش ہے تو وہ کسی قسم کا عفو و رحم محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بعض آفات ناگہانی ایسی ہوتی ہیں کہ ارض و سما کی کوئی طاقت بھی ان سے چھٹکارا نہیں دلا سکتی۔

عام طور سے اس کے مزاج کی تندی پر رحم و عفو کے جذبات غالب آ جاتے تھے اس کے جوش و گرمی سرد پڑ جاتے۔ لیکن اس وقت وہ اس اوباش اور آوارہ لڑکے کے خلاف دل میں باغی خیالات و جذبات کا طوفان برپا ہوتے محسوس کر رہا تھا۔ یہ لڑکا خود اس سے اور اپنی ماں سے مشابہ ہے۔ اور اس ناہنجار عورت نے اس کو اپنی طرح پروان چڑھایا پچیس سال سے وہ سکون و اطمینان کی نیند میں غافل سو رہا تھا کہ اچانک اس صدمے نے اس کو بیدار کر دیا۔

پادری کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس بدمعاش کے ساتھ اس کو سختی کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے اس کی بدمستی اور نشے کا خیال کئے بغیر غصہ میں دانت پیس کر اس سے کہا۔

ابجبکہ تم نے اپنی داستان بیان کردی تو میری بات بھی کان کھول کر سن لو۔
کل تمہیں یہاں سے چلا جانا ہے۔ میں تم کو بتا دونگا کہ آئندہ تمہیں کہاں رہنا ہوگا میں
تمہارے اخراجات کے لئے روپے دونگا۔ وہ رقم اگرچہ زیادہ نہ ہوگی کیونکہ میرے
پاس بہت کم اثاثہ ہے۔ اگر ایک بار بھی تم نے نافرمانی کی تو تم سے میرے تعلقات ہمیشہ کیلئے ختم ہو
جائینگے۔ اسکے علاوہ روپے پیسے کا حساب بھی باقاعدگی سے دینا پڑے گا۔

قلب آگسٹس نشے میں دھت تھا لیکن پادری کے سخت گیر رویہ اور
لہجہ کو بخوبی سمجھ گیا۔ اس کی مجرمانہ رگ ایک بار پھر پھڑک اٹھی۔ ہچکیوں کے
درمیان کہنے لگا۔ آپ پادری ہیں........ مجھ پر اپنے حربے آزما رہے ہیں۔ لیکن
آپ بھی اوروں کی طرح اپنے عقائد تلے دب کر رہ جائیں گے۔

ایسے کو رسن کو بڑا طیش آیا۔ اس کو "ہرکولس" کی طرح رگ و پے
میں خون کی گردش طاقت و حرارت کا احساس ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ اس
بدبخت اور ننگ بشر کو ایک شاخ کی طرح موڑ دے۔ اور اس پر یہ ثابت کر دے
کہ میری بات کا رد کرنا آسان کام نہیں۔ اس نے میز کو اس قدر زور سے ہلایا اور
چیخ کر کہا کان کھول کر سن لو مجھے دنیا کی کوئی ہستی خوف زدہ نہیں کر سکتی۔

شرابی میز کے زوردار جھٹکے کی وجہ سے اپنے کو سادھ نہ سکا
کرسی پر ڈگمگانے لگا۔ اور اس کو یہ احساس ہوا کہ اب پادری کے بس
میں آجائے گا۔ اور اسی احساس نے قتل کر دینے کے عزم کو ابھار دیا۔ اور
اس نے میز پر پڑی چھریوں پر نگاہ ڈالی! پیبے وطیس اس کی حرکات کا بغور
مطالعہ کر رہا تھا۔ آناً فاناً اس نے میز اس کی طرف لڑھکا دی وہ فرش
پر گر پڑا۔ لیمپ بھی نیچے آپڑا۔ اندر گل ہو گیا۔ کچھ لمحے تاریکی میں گلاسوں کے
گرنے اور ٹوٹنے سے جلترنگ سا بجتا رہا پھر ایک ہلکے پھلکے جسم کے نیچے گرنے
کی آہٹ پیدا ہوئی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

لیمپ کے بجھ جانے سے رات کی تاریکی کا احساس بڑھ گیا۔ ہر طرف
گہرا اندھیرا چھا گیا۔ جیسے کوئی ناگوار واقعہ ایک دم رونما ہو جائے اور سب
حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ نوجوان شرابی دیوار کے سہارے دبکا پڑا تھا۔ پادری
اسی طرح اپنی کرسی پر موجود تھا۔ اس پر اس درجہ افسردگی طاری ہوگئی کہ
اس کا سارا طیش، سارا غصہ اداسی کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ غم واندوہ
نے اس کے جوش و خروش کو نگل لیا۔ اس کی تندی حرف غلط کی طرح مٹ
گئی۔ اس کے دل و دماغ کو تاریک رات کی طرح تیرہ و تار خیالات نے آگھیرا

ہجوم کر دیا۔ مقبروں کا سا سکوت چھا گیا۔ جہاں کی ہر شے ساکت رہا
ہوتی ہے۔ دور دور بھی کسی آواز کا پتہ نہ تھا۔ گاڑی کے پہیوں کی
گڑگڑاہٹ، کتوں کے بھونکنے کی آواز یہاں تک کہ پتوں کی سرسراہٹ
بھی ساکت تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہر شے دم بخود ہے۔ سب نے
اپنی سانس کھینچ لی ہے۔ ایسی کیفیت بڑی دیر تک طاری رہی۔ تب اچانک
دور سے گھنٹی کی آواز خاموشی کو چیرتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو گئی۔ پھر کسی
چیز کے گرنے اور کرسی کے الٹنے کی آواز کمرے میں گونج گئی۔

مارگیٹ جو اب بھی مستعدی سے حکم کی منتظر تھی گھنٹی کی آواز سن
کر تیز تیز قدم رکھتی ہوئی آگئی لیکن ہر طرف گہری تاریکی کو دیکھ کر متعجب
ہوئی۔ سہم کر لرزتی آواز میں پکارا۔

کیا آپ اندر ہیں؟

کسی نے جواب نہ دیا۔ کوئی آہٹ نہ ہوئی۔

یا میرے خدا! یہ کیا ہو گیا!! یہ کیا کر بیٹھے؟

آگے جانے کی اس میں قطعی ہمت نہ تھی۔ اس میں اتنی سکت نہ تھی
کہ جا کر لیمپ ہی روشن کر دے۔ ایک ہی خیال اور وہم اس کے ذہن پر
طاری تھا۔ کہ یہاں سے بھاگ جائے۔ کسی طرح جان بچا کر نکل جائے
اس کی ٹانگیں خوف سے تھر تھرا رہی تھیں۔ اور اس کو یہ معلوم ہو رہا تھا
کہ وہ کسی وقت بھی گر پڑے گی۔ آخر پھر ہمت جمع کر کے دوبارہ پکارا

کیا آپ اندر ہیں؟

یہ میں ہوں مارگریٹ!!

اور اسی وقت اس کو احساس ہوا کہ اس کے آقا کسی مصیبت
میں گرفتار ہیں۔ ان کی مدد کرنا اس پر لازم ہے۔ خوف کے باوجود ایسے
موقع پر عورت بڑی دلیر اور باہمت بن جاتی ہے۔ وہ بھاگ کر لیمپ
باورچی خانے سے لے آئی۔

ڈر کے مارے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سانس تیز تیز چل
رہا تھا یا خدا یہ سب کیا ماجرا ہے؟

آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی جب وہ کمرے میں داخل
ہوئی تو اس کا پاؤں کسی لیس دار چیز پر سے پھسل گیا۔ وہ گرتے گرتے بچی
جھک کر دیکھا تو لال فرش پر کوئی گاڑھی سیال شے بہہ رہی تھی۔ اتنی ہی دیر

میں اس کے پاؤں کے چاروں طرف اکٹھا ہو گیا۔ وہ دروازے کی طرف تیزی سے جھپٹی کیونکہ چھٹی حس نے اس کو بتا دیا کہ یہ خون ہے۔ اس خیال نے اس کو دیوانہ بنا دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح گاؤں کی طرف چیختی ہوئی دوڑی۔ درختوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ٹھوکر لگ رہی تھی مگر اس کی نگاہیں گاؤں کی روشنی پر جمی تھی۔ اس کی تیز آواز رات کی تاریکی اور خاموشی میں الو کی منحوس چیخ کی طرح سناٹے کو چیرتی چلی جا رہی تھی اس کے منہ سے بس ایک ہی لفظ نکل رہا تھا۔ بدمعاش .... بدمعاش .... بدمعاش .... گاؤں والے سراسیمہ ہو کر باہر نکلے۔ اس کو پہچان کر وہ لوگ یہ سمجھے کہ پادری کے یہاں کوئی ہیبت ناک واردات ہو گئی ہے۔ ان میں سے چند افراد دو سپاہی ایک فوجی افسر اور میئر اس کی مدد کو دوڑ پڑے۔ زیتون کے کھیتوں کے درمیان واقع گلابی عمارت رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی کھڑکی سے آتی ہوئی تیز روشنی جب سے بجھی تھی تو ایسا لگتا تھا کہ کانچ کی کھلی ہوئی اکلوتی آنکھ بھی پھوٹ گئی ہے۔ وہ گھر اب گھپ اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ یہ لوگ تیز تیز قدم رکھتے ہاتھ میں لالٹین اور ٹارچ لئے اس گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔ زیتون کی پرخم ڈالیاں ہلکی ہلکی روشنی میں دوزخ کے سایوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جو پیڑوں سے چمٹے بیٹھے ہوں۔ اب گلابی عمارت کی بھی دیوار نمایاں ہو گئی تھی۔ دو آدمیوں نے پستول تھام رکھے تھے۔ اور دو نے مارگریٹ کو سہارا دے رکھا تھا جو تقریباً نیم بے ہوش تھی۔

کھلے دروازے میں پہلے قدم رکھتے ہر کوئی جھجک رہا تھا۔ لیکن فوجی افسر نے دوسرے شخص کے ہاتھ سے لالٹین چھین کر دوسرے سے چھڑا لئے بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اور لوگوں کی ہمت بندھی اور وہ لوگ بھی اندر آ گئے۔

بوڑھی عورت نے ٹھیک کہا تھا۔ خون اب جم گیا تھا۔ اور فرش کو قالین کی طرح ڈھانک لیا تھا۔ اور خون کی دھار اب اس اوباش تک جا پہونچی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ خون میں لت پت تھے۔ باپ بیٹے سو رہے تھے۔ ایک نے اپنا گلا کاٹ لیا تھا۔ اور دوسرا نیند کی آغوش میں جا چکا تھا۔ دوسرا نشے میں مست سو رہا تھا۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اس نے اپنی آنکھیں حیرت سے مل کر دیکھا۔ کثرت شراب نوشی سے خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ معاً اس کی نگاہ پادری کے مردہ جسم پر پڑی۔ تو اس کے چہرے پر دہشت اور خوف کے آثار پیدا ہو گئے۔

میئر نے حیران ہو کر دوسرے سے پوچھا یہ آخر بھاگ کیوں نہ گیا۔

فوجی افسر بولا یہ نشے میں بری طرح دھت تو تھا۔

سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور کبھی بھی کسی کے ذہن میں نہ آیا کہ پادری نے خودکشی کی تھی۔

ایک ضروری گذارش

جنوری ۱۹۶۹ء سے "شاخسار" کے صفحات میں میں اضافہ کر کے اس کا زر سالانہ پانچ روپیہ کر دیا جائے گا۔ البتہ اس سے قبل جو احباب خریدار بنیں گے، ان سے صرف تین روپیوں میں سال بھر رسالہ پہنچا کرے گا۔ لہٰذا "شاخسار" کے بہی خواہوں سے گذارش ہے کہ اس اثناء میں اپنے حلقۂ احباب میں "شاخسار" کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں تاکہ اس رعایتی قیمت پر سال بھر کے لئے رسالہ پہنچتا رہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے؟

کیا خبر تھی پرویز شاہدی کی وفات کے بعد ہی بعد چند اور اندوہناک حادثوں سے ہم دو چار ہونے والے ہیں ایسا ہی ایک حادثہ واقع ہوا جب ۲۳ جولائی ۱۹۶۸ء کی شب ۸ بجے اردو کے کہنہ مشق اور ممتاز شاعر جناب شفا گوالیاری بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ شفا صاحب سیماب اکبرآبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے "آیاتِ شفا"، "شاخ زیتون" "نبض حیات" اور "پرچم اردو" اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پانچواں مجموعۂ کلام "زخم گل" ابھی زیر ترتیب تھا کہ موت نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

ابھی شفا صاحب کے غم میں آنسو خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کی سہ پہر کو پروفیسر نجیب اشرف ندوی داغ مفارقت دے گئے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی علامہ سلیمان ندوی کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔

مرحوم اُن چند گنی چنی اور قابل قدر ہستیوں میں سے تھے جن پر اردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ ان کی وفات سے حلقۂ ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بمشکل پُر ہو سکے گا۔

۳۰ اگست ۱۹۶۸ء کو زبان اردو کے ایک اور شیدائی محمد اطہر الامین (ریٹائرڈ پولس انسپکٹر) کا برہم پور (اڑیسہ) میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم ۱۹۶۷ء سے بزم سخن کٹک کے نائب صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے آ رہے تھے۔ ان کی رحلت سے بزم ایک محرک فن ایک مویّد سخن، ایک سرگرم کارکن سے محروم ہو گئی۔

اطہر الامین صاحب کے انتقال کا زخم ہرا ہی تھا کہ بزم سخن نے ایک اور گوہر آبدار کھو دیا۔ بزم کے ایک نوجوان شاعر فرید محمد جنوں ۴ اکتوبر کو صرف ۲۲ سال کی عمر میں دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

ادارۂ شاخسار، چاروں حضرات کے پسماندگان سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور دعاگو ہے کہ خدا مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

امجد نجمی

کرامت علی کرامت

اطہر عزیز

امین حزیں کی یاد میں

امجد نجمی

"بیادِ دوست"

صبح نو کی نکہتیں۔ احباب و مے کی صحبتیں
کچھ پریشاں اور کچھ خواب پریشاں ہوگئیں

سات سال پیچھے کی بات ہے۔ میں اپنے کالج کے شارٹ ہینڈ کلاس میں بیٹھا معروف مطالعہ تھا کہ کرامت علی کرامت ایک نو وارد کو لے کر میرے پاس آئے اور آتے ہی کہا "انہیں پہچانئے"۔ میں نے کرسی سے اٹھ کر نو وارد سے مصافحہ کیا جو بش شرٹ اور پینٹ میں ملبوس تھا۔ میانہ قد، رنگ کسی قدر سیاہی مائل کلین شیو۔ بال کچھ کالے کچھ سفید، آنکھیں چمکدار، ہونٹوں پر تبسم۔ میں نے انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا کہ تشریف رکھئے اور ان کے چہرے مہرے کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ یہ تو فضل الامین کے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ کرامت علی نے پوچھا بڑے یا چھوٹے؟ میں نے کہا ظاہر ہے بڑے ہی ہوں گے۔ اس پر نو وارد خود ہی بول اٹھا "جی ہاں میں ان کا بڑا بھائی ہوں اور مجھے اطہر الامین کہتے ہیں۔ میں فی الحال کورٹ انسپکٹر ہو کر تبادلہ پر کٹک آیا ہوں۔ میں نے کہا آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی آپ ضرور ہمارے جلسوں میں شریک ہوا کیجئے۔ آپ کو علم ہوگا یہاں "بزم سخن" کے نام سے ایک ادبی ادارہ برسوں سے قائم ہے جو اڑیسہ میں اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کچھ نہ کچھ کام کر رہا ہے۔ جواب دیا:

"جی ہاں کرامت صاحب کی زبانی یہاں کے ادبی اور سماجی ماحول کا مجھے علم ہوا ہے اور میں ضرور خوشی کے ساتھ آپ کے جلسوں میں شریک ہوا کروں گا۔"

بس یہ تھی مرحوم سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے دو ہفتے بعد انہوں نے مظہر امام (جو ان دنوں کٹک ہی میں مقیم تھے) محب الرحمٰن کوثر، کرامت علی کرامت اور مجھ کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا میں نے پہلی بار دیوان غالب کا عرشی ایڈیشن اور اقبال کے انگریزی لکچروں کا مجموعہ RECONS TRUCTION OF RELIGIOUS THUUGHTS IN ISLAM یہیں مرحوم کے یہاں دیکھا۔ کچھ دیر شعر و سخن کا چرچا رہا ہم اپنے اپنے اشعار سناتے اور امین صاحب غالب یا اقبال کا کوئی اردو یا فارسی شعر برجستہ سنا کر ہم سب کو حیرت میں ڈال دیتے غالب اور اقبال ان کے محبوب شعراء میں سے تھے ؎

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

اسی اثناء میں مظہر امام کا تبادلہ گوہاٹی اے۔ آئی۔ آر (آسام) ہو گیا۔ ان کے وداعی جلسے کا انتظام، گروپ فوٹو اور عصرانہ وغیرہ کا اہتمام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مرحوم نے انجام دیا تھا۔ اس کے دو ماہ بعد خود امین صاحب کا تبادلہ کٹک سے کیندرا پاڑہ پولیس اسٹیشن ہو گیا۔ وہ جانے کے ایک یا دو ماہ بعد انھوں نے ایک تعزیتی مشاعرہ کا اہتمام کر کے جو پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پر مشتمل تھا بزم سخن کے تمام شعراء کو کیندرا پاڑہ مدعو کیا۔

یہاں سے راقم السطور، مولوی عبداللطیف عارف حفظ الرحمٰن حافظ، کرامت علی کرامت، حفیظ اللہ نیولپوری، ضمیر خاں ضمیر

محمد رفیق درد، رحمان کریم شاکر، بہاء الدین ریاض، اعظم علی جوکر، عبدالصمد ترکمی، وغیرہم تمام شعراء بس سے تشریف لے گئے تھے۔ سب کی آمد و رفت، خورد و نوش کا انتظام خود امین صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے کیا تھا۔ وہاں کا یہ تعزیتی جلسہ بڑا کامیاب رہا اور ہم سب دوسرے دن بس سے کٹک واپس آگئے۔

نومبر کے اوائل میں ایک اور بڑے جلسے اور مشاعرے کا صدارت اڑیسہ کے ایڈوکیٹ جنرل دینا بندھو ساہو نے کی تھی۔ اسی جلسہ میں انھوں نے کیندرا پاڑہ میں ایک اردو پڑھائی گھر اور ایک مکتب کی بنا ڈالی۔ مقامی لوگوں کے علاوہ کٹک کے بہت سے معزز اشخاص بھی مدعو کئے گئے تھے جن میں ڈاکٹر ہلال، ڈاکٹر رضا رسول اور ماسٹر اشرف علی کے نام قابل ذکر ہیں۔ سب کی آمد و رفت کے لئے پانچ چھ کاروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان کے اس پرخلوص اقدام کا اہل کیندرا پاڑہ نے کھل کر استقبال کیا۔ اس کام میں وہاں کے تمام لوگوں نے خوشی سے ان کا ہاتھ بٹایا۔ لوگوں میں شعر و سخن کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا جو آج بھی قائم ہے اور وہاں کا ادبی حلقہ آج بھی اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کر رہا ہے۔ اس جلسے میں انہوں نے ایک مختصر سی تقریر بھی کی تھی جس کا وہاں لوگوں پر گہرا اثر پڑا تھا۔

اس کے آٹھ دس ماہ بعد اطہر الامین صاحب کا تبادلہ ھیرا کنڈ ہو گیا۔ اب وہ مستقل طور پر ہمارے سرگرم کارکن ہو گئے اور بلاناغہ ہر جلسے ہر مشاعرے اور ہر نشست میں شریک ہوتے رہے۔

پھر ۱۹۶۷ء میں بزم کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں بھی مرحوم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پٹنہ سے ویفا کلی یوری مدیر "صبح نو" نے شاعر خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ چیف جسٹس خلیل احمد صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کئے گئے۔ ثقافتی امور کے ڈائرکٹر شری گوری کمار برہما کی صدارت میں یہ جلسہ اپنی طرز کا واحد شاندار اور کامیاب جلسہ ثابت ہوا۔ خلیل صاحب اور شری برہما کی تقریروں سے حاضرین کافی مسحور ہوئے۔

محرک سخن قبلہ احمد صاحب نے دو ہزار کا عطیہ بزم کے نام اعلان کیا۔ ساہتیہ اکاڈمی نے بھی ہمارے پیش کردہ تمام مطالبات پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ غرضیکہ یہ تمام تر کامیابی مرحوم اطہر الامین ہی کی بدولت حاصل ہوئی۔ ان کی اس لگن اور دلچسپی کو دیکھ کر انھیں بزم کا نائب صدر چن لیا گیا جس کے بعد وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بزم کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔

وہ سراپا عمل تھا۔ دوسروں کو عمل پر ابھارتا تھا۔ کام اس کو پیارا اور وہ کام کرنے والوں کو عزیز رکھتا تھا۔ اب وہ کوئی مہینوں سے بیمار تھا لیکن پھر بھی اردو کمیٹی بمبئی کے جلسہ میں شرکت کرنے کے لئے مستعد تھا۔ یوم غالب کی تجویز اسی نے پیش کی تھی لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اجل کے بے رحم ہاتھوں نے قبل از وقت ہم سے اس کو چھین لیا۔ خدا اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

کرامت علی کرامت

بازگشت

(میرے شفیق جناب اطہر الامین صاحب کی یاد میں) (کرامت)

میرے فراق میں آنسو بہا رہے ہو کیوں ؟
یہ کیسے سوچ لیا تم نے میرے بارے میں
کہ میں ہجوم غم و درد سے ہوا ہوں نڈھال
تمہیں تو یاد ہی ہوگا کہ درد و رنج و الم
میرے شعور خودی کو بلند کرتے تھے
ہجوم یاس میں ہنسنے کی میری عادت تھی
شکست حوصلہ میری سرشت میں تھی حرام
میرے فراق میں آنسو بہا رہے ہو کیوں ؟
یہ کیسے سوچ لیا تم نے، ایک ہی دن میں
بدل لئے ہیں یہاں میں نے عمر بھر کے اصول
اصول جن کا تحفظ تھا میرا نصب العین
اصول جن کے لئے چین بھی تھا مجھکو حرام

ہزار آیا کریں رنج و درد کے طوفان
ہمیشہ غم میں بھی میں مسکرائے جاؤں گا
مجھے اجل نہ کبھی کر سکے گی زیر نگیں
خدا کے واسطے اس درجہ میرا غم نہ کرو

مجھے پتہ ہے کہ آنسو کی ہے حقیقت کیا
تم آج اشک بہاتے ہو میری فرقت میں
گذر رہا ہے تمہیں شاق میرا رنج فراق
تمہارے کاسۂ دیدہ سے ہونگے اشک بھی خشک
یہ جانتا ہوں کہ تم مجھکو بھول جاؤ گے
مگر میں ساتھ تمہارے رہوں گا ہر لمحہ
دعائیں میری رہیں گی تمہاری شامل حال
تمہاری یاد کا دامن نہ مجھ سے چھوٹے گا
حیات ایک کڑی دھوپ کی طرح ہے یہاں
پتہ مجھے ہے کہ پاؤں تمہارے نازک ہیں
گراں میں آبلہ پڑ جائے گا تو کیا ہو گا ؟
مجھے ہے فکر کہ پورا نہ ہو سکا جو مشن
جو وقت گذرے گا، اس کا مآل کیا ہو گا
وہ بزم جس کے لئے اپنا خون سینچا تھا
یہ سوچتا ہوں کہ اب اس کا حال کیا ہوگا
تمہاری چیز تمہیں سونپتا ہوں ہمنفسو!
بھلا اب مجھے یہاں اس کا ملال کیا ہو گا!

اطہر عزیز

"نغمہ بجھا و من بجھا"

کچھ سنا تم نے اطہر الامین صاحب کا برہمپور میں انتقال ہوگیا

تجمی

تجمی صاحب کا نوشتہ میز پر رکھا ہوا ہے اور آنکھیں ہیں کہ ایک ٹک رقعہ پر گڑی ہوئی ہیں۔ دل و دماغ میں ایک ہیجان سا برپا ہے۔ زبان گنگ ذہن شل۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے یہ سب کیسے ہوگیا۔ کیا واقعی امین صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گئے۔ کیا واقعی وہ شخص جس کی پوری زندگی دوسروں کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھتے رہنے میں گزری، جس نے اپنی عمر کا گراں مایہ حصہ غمزدوں کے آنسوؤں کو خشک کرنے میں گزارا۔ آج خود ہی اس بے رخی کے ساتھ ہمیں روتا بلکتا چھوڑ جائے گا۔ مگر آہ! یقین کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ افسوس موت نے ہم سے ایک ایسے شخص کو چھین لیا جو ادیب نہ ہوتے ہوئے بھی ادبی ذہنیت کا مالک تھا۔ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی بلند پایہ شعری ذوق رکھتا تھا۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے۔ ریٹائر ہونے کے دو ماہ قبل ان کی طبیعت ذرا بگڑ گئی تھی جس کے سبب بزم کے ماہانہ جلسے سے مسلسل غیر حاضر رہنے لگے تھے۔ مزاج پرسی کے لئے ایک شام ان کے مکان پہنچا دستک دینے پر چادر اوڑھے ہوئے خود ہی باہر چلے آئے۔ علالت کے آثار چہرے سے کمزوری پوری طرح ظاہر ہو رہی تھی مگر کیا مجال جو وہ اپنی زبان سے کبھی اپنی نقاہت کا اظہار کریں۔ مجھ سے اس طرح ملے جیسے بالکل ٹھیک ہوں۔ جب میں نے خود ہی طبیعت کا حال پوچھا تو حسب عادت مسکرا کر کہنے لگے ارے مجھے کچھ نہیں ہوا ہے یہ گھر والے خواہ مخواہ پریشان ہوجاتے ہیں۔ اب یہی دیکھو نا معمولی سا بخار آگیا ہے جو آج نہیں تو کل اتر ہی جائے گا مگر گھر والوں کا اصرار ہے کہ یہ دوا لیجئے اس ڈاکٹر کو دکھائیے۔ یہاں وہاں مت آیا جایا کیجئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ مانتا ہوں آپ ان معمولی بخار وغیرہ سے ہراساں نہیں ہوتے مگر یہ بھی کیا کہ جان بوجھ کر مرض سے بے اعتنائی برتی جائے۔ اس طرح تو آپ کی صحت اور گر جائے گی۔ سن کر مسکرانے لگے گویا کہہ رہے ہوں میں جانتا تھا تم بھی یہی کہو گے۔ اور پھر اس کے بعد مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بزم کا ذکر چھڑا تو خود ہی کہنے لگے میں بھی کتنا بدقسمت ہوں کہ جس وقت بزم کو مجھ سے کوئی سروکار نہ تھا تبھی اس کے ہر جلسے میں شریک ہوتا رہا اور آج جب اس کی آدھی ذمہ داری مجھ پر سونپ دی گئی ہے تو مجھ سے ایک کام بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ میں نے کہا فی الحال آپ بزم کی جانب سے بالکل بے فکر رہیں۔ یوں سمجھئے آپ ہر جلسے میں شریک ہیں۔ طبیعت ذرا سنبھل جائے تو پھر اس طرف توجہ کیجئے گا۔ ان کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے میں چاہتا تھا دو دو باتیں کرکے جلد رخصت ہوں مگر وہ کہاں چھوڑنے والے تھے مجبوراً تھوڑی دیر اور رک گیا۔ پھر تو باتوں کا سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ وقت کا خیال ہی نہ رہا۔ بزم کا ذکر ختم ہوا تو سمبل پور میں اپنے قیام کے بارے میں بتلانے لگے۔ وہاں کے لوگوں کا، وہاں کے کلچر کا، وہاں کے ادبی، تہذیبی، سیاسی ماحول کا حال تفصیل سے سناتے رہے

اور میں سوچتا رہا یہ ایک شخص ناتواں کتنے عظیم خیالات کا مالک ہے کہ جب بھی سوچتا ہے تو پوری قوم کے لئے، تڑپتا ہے تو پورے سماج کے لئے۔ اس کے بعد جب مجھے علم ہوا انہی کی کوشش کی بدولت وہاں ایک اسکول بھی کھولا گیا ہے تو میں انہیں مبارکباد دئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا امین صاحب! کاش آپ جیسا باہمت اور باذوق شخص ہر شہر میں ایک ہو جاتا۔ پھر انہوں نے ایک فوٹو بھی لاکر دکھایا جو وہیں پر لیا گیا تھا اور جس میں مرحوم پورے یونیفارم میں گورنر کے ساتھ کھڑے تھے۔

باتوں کا سلسلہ جب اردو ادب پر آکر رکا تو میں نے ان سے اردو شاعری کی نئی اٹھان اس کی نئی روش کے بارے میں سوال کیا پہلے تو کچھ سوچتے رہے پھر نہایت ہی محتاط لہجہ میں رک رک کر کہنے لگے۔

"بھئی پہلی بات تو یہ ہے ہم ٹھہرے مصروف آدمی۔ مطالعہ کے لئے زیادہ وقت ہی نہیں ملتا اس لئے اپنی نظر گھوم پھر کر چند مشہور اساتذہ ہی پر رکتی ہے جن میں اقبال کا نام مجھے سرفہرست نظر آتا ہے۔ ہاں ادھر چند سالوں سے اردو رسائل میں نئی شاعری کے چند چونکا دینے والے روپ ضرور نظر آرہے ہیں مگر اسے میری بے بضاعتی ہی سمجھئے یا بدقسمتی کہ میں اب تک اس کے بارے میں کوئی خاص نظریہ قائم نہیں کر پایا ہوں۔ میری نظر میں اس قسم کی شاعری سوائے ڈھول پیٹنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ میں نے کہا یہی تو جدیدیت کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے کہ اس کے دونوں رخ پر قاری کی نظر نہیں پڑتی ہے۔ محض ایک ہی رخ سے ہر شخص اندازہ لگانے پر تلا ہوا ہے کہ اس کا دوسرا رخ بھی یہی ہو سکتا ہے۔

اب آپ ہی بتائیے ایک شخص کی پشت ہی سے آپ کیسے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کا چہرہ اس قسم کا ہوگا، اس کی ناک یوں ہوگی اس کے کان یوں ہوں گے۔ پہلے آپ اس رجحان کا مکمل طور پر جائزہ لیجئے اس کا پرخلوص مطالعہ کیجئے پھر اس پر کوئی حتمی فیصلہ جاری کیجئے۔ میں مانتا ہوں جدید شاعری میں خرافات اتنے ہیں کہ ان کی تہہ میں چند اچھی اور مثالی چیزیں دب کر رہ گئی ہیں پھر بھی جتنی فیصدی معیاری اور قابل قدر تخلیقات ہیں انہیں تو آپ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مرحوم کچھ دیر تک میری باتوں کو غور سے سنتے رہے پھر کہا "اچھا آپ یوں کیجئے مجھے کوئی ایک ایسا رسالہ یا کتاب ضرور مطالعہ کے لئے دیجئے جس کے ذریعہ میں اس قسم کی شاعری کے صحیح خد و خال کا بآسانی اندازہ لگا سکوں۔ اور میں یہ وعدہ کرکے کہ انشاء اللہ چند کتابیں آپ کو ضرور بھجوا دوں گا۔ ان سے رخصت ہو گیا۔ مگر افسوس موت نے انہیں اتنا بھی موقع نہیں دیا کہ کم از کم میں اپنا وعدہ پورا کر لیتا۔

مرحوم کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ بڑی سے بڑی پریشانی سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔ انتظامی امور میں تو ان کا ہم پلہ مشکل سے ملے گا۔ چاہے کوئی ادبی جلسہ ہو یا گھریلو تقریب وہ اس خوبی و خوش اسلوبی سے کام کرکے نکل جائیں گے کہ لوگ دنگ رہ جائیں۔

سوچنا تو ان کا ایک معمول بن کر رہ گیا تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے تھے۔ آج اگر کسی اسکول کے لئے فکرمند ہیں تو کل کسی ادارہ کا غم لاحق ہے۔ یہ نہیں کہ بس خوابوں ہی کی وادی میں سیر کرنے کے عادی تھے بلکہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا کر ہی دم لیتے۔

مرحوم کا شعر و ادب سے جنون کی حد تک لگاؤ۔ بزم سخن سے ان کی جذباتی وابستگی محض وقتی نہ تھی بلکہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ ادب کی خدمت صرف ادیب یا شاعر ہو کر ہی نہیں کی جا سکتی ہے بلکہ ایک غیر ادیب، ایک غیر شاعر بھی اردو ادب کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ ایک مرتبہ مرحوم کے اس جنون پر کسی نے مذاقاً ان سے پوچھ دیا "امین صاحب! آپ ایک پولیس انسپکٹر ہوتے ہوئے یہ شعر و ادب کا بکھیڑا کب سے لے بیٹھے! یہ جلسہ جلوس کا اہتمام یہ مشاعرہ کم از کم آپ کے لئے تو کچھ عجیب سا لگتا ہے" تو کیا برجستہ جواب دیا ہے ملاحظہ ہو ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اور یہ واقعہ ہے مرحوم کی یہ لگن بہ دل چسپی محض تفنن طبع نہ تھی بلکہ ان کے سامنے ایک ٹھوس مشن تھا۔ ایک زبردست تحریک ان کے مدنظر تھی کہ چلو کچھ نہ ہو کم از کم اس طرح تو کچھ باصلاحیت افراد اردو کی مساطگی سے لئے آگے نکل آئیں گے اور یہ کوئی معمولی بات نہ ہوتی عجب نہ تھا کہ ان کی اس آواز پر ہر شخص بلا تاویل و عجلت لبیک کہتا مگر وا اے افسوس قسمت نے یاوری نہیں کی ان کی آنکھیں کیا بند ہوئیں کہ ایک مکمل تنظیم کی سانس رک گئی ایک تحریک نے دم توڑ دیا۔

بحیثیت دوست مرحوم کی نجمی صاحب سے گاڑھی چھنتی تھی۔ کوئی بھی کام ہو چاہے اپنا ذاتی معاملہ ہی کیوں نہ ہو نجمی صاحب سے مشورہ کرنا ان کے لئے ضروری ہوتا۔ ان کی فرصت کے اکثر اوقات نجمی صاحب ہی کے کالج میں گذرتے۔ آفس سے لوٹتے وقت یا آفس کو جاتے وقت کالج میں آدھ گھنٹہ گذارنا ان کا معمول بن گیا تھا۔ کبھی کبھی اگر موڈ میں ہوتے تو بڑے ہی دلچسپ انداز میں باتیں کرتے ہوئے نظر آتے۔

ایک دفعہ جب لگاتار تین چار جلسے میں غیر حاضر رہے تو نجمی صاحب نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا "بھئی اس طرح اگر آپ جیسے سخن فہم حضرات محفل سے غائب رہتے گئے تو پھر ہو گیا ہمارا مشاعرہ۔ ادھر آپ نہیں آتے ہیں ادھر کبھی کبھی نقوی صاحب (جعفر رضا نقوی فیر آبادی) بھی عنقا ہو جاتے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں؟ آپ لوگوں کی غیر موجودگی میں محفل کتنی سونی نظر آتی ہے کیسا بے کیفی سی ہر طرف چھائی رہتی ہے۔" چپ چاپ سنتے رہے اور جب نجمی صاحب ذرا خاموش ہوئے تو ایک ادائے بے نیازانہ سے یہ کہکر

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

نجمی صاحب کی تمام خفگی ایک ہی لمحہ میں ختم کر ڈالی۔ مرحوم کی یہی ادائے خاص ہی سبھوں کو ان کا گرویدہ بنا ڈالنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ان کی دلچسپ باتوں میں کچھ ایسی کشش پوشیدہ رہتی تھی کہ کسی اجنبی کو کبھی یہ احساس بھی نہ ہو پاتا کہ وہ ان سے پہلی بار مل رہا ہے اور یہ صفت ہر کس و ناکس میں ملنی مشکل ہے۔

نجمی صاحب کے بعد اگر انھوں نے کسی کو ٹوٹ کر چاہا ہے تو بزم سخن کو۔ وہ اس کی ترقی کے لئے ہر وقت کچھ نہ کچھ پلان بناتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ بزم کی اپنی ایک بلڈنگ کے لئے زمین بھی دیکھ ڈالی تھی مگر افسوس خواب خواب ہی رہ گئے۔ بنے بنائے خاکے اپنے رنگوں میں گڈ مڈ ہو گئے۔

آج بزم سخن روتی ہے کہ اس کا ایک چاہنے والا اٹھ گیا نجمی کی آنکھیں حیران ہیں کہ اس کا رفیق و غم گسار کہاں کھو گیا۔ کرامت کا دل روتا ہے کہ ایک مشفق نے منہ موڑ لیا اور میں سوچ رہا ہوں قسمت کے اس بھیانک طمانچہ کے بعد ہم لوگ زندہ کس طرح ہیں۔

اطہر عزیز

آہ ! نورمحمد جنوں

نورمحمد جنوںؔ بزم کے ایک قدیم غزل گو شاعر تھے۔ تقریباً بارہ سال تک بزم سے وابستہ رہے۔ یوں تو مرحوم نے چند نظمیں بھی کہی ہیں مگر ان میں ان کی انفرادیت ابھرتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ ہاں البتہ ایک نظم جو انھوں نے سنہ ۱۹۶۲ء میں چینی جارحیت پر کہی تھی بلاشبہ تاثر انگیز اور بھرپور ہے یوں تو مرحوم بہت دنوں سے شعر کہہ رہے تھے مگر ان کی شاعری ابھی ابتدائی مراحل ہی پورے طور پر عبور نہیں کر پائی تھی۔ پھر بھی چند اشعار میں ضرور متاثر کرتے ہیں۔

نظامِ گلستاں آباد ہو جاتا تا خرد والو
جنوںؔ کو راز داں اپنا بنالیتے تو کیا ہوتا

مرے دامن پہ تو احسان کر دے
نہیں ہیں پھول تو کانٹوں سے بھر دے

ارمان لیکے آئے تھے کیا کیا نہ گھر سے ہم
مایوس ہو کے لوٹ چلے تیرے در سے ہم

چھوڑا جہاں نے ساتھ خفا ہو گیا نصیب
پرسانِ غم نہ تھا کوئی گذرے جدھر سے ہم

منقولہ بالا اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر مشقِ سخن کچھ دنوں تک اور جاری رہتی تو مرحوم آئندہ چل کر اس سے بہتر اشعار پیش کر سکتے تھے مگر افسوس موت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی۔ بزم سخن اپنے اس ہونہار پودے کے غم میں جتنا بھی آنسو بہائے کم ہے۔

سید شکیل دسنوی

نقد و نظر

عکس ریز ——— مصنف : مظفر حنفی

"عکس ریز" مختصر طنزیہ خاکوں پر مشتمل ایک طویل بیانیہ نظم ہے جس میں موجودہ سماج اور ماحول کی جزئیات کو طنز کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شروع میں جناب احتشام حسین کا تعارف ہے جو حقیقت پسندانہ کم اور رسمی زیادہ ہے۔ اس کے بعد جناب ظ۔ انصاری کی مصنف سے "دو دو" باتیں ہیں جن میں رسمیت کم اور حقیقت پسندی سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

اس نظم کا موضوع کچھ نیا نہیں ہے۔ اس کی داغ بیل عرصہ ہوا اکبر الہ آبادی کے ہاتھوں ڈالی جا چکی ہے۔ ہاں تکنک کچھ نئی ضرور ہے۔ بقول ظ۔ انصاری پانچ مصرعوں میں چٹکیاں بھری گئی ہیں۔ نظم میں عام بول چال کی زبان سے کام لیا گیا ہے طنز، مزاح اور پھکڑ میں بڑا فرق ہے۔ افسوس کہ بعض جگہ ابتذال اور سوقیانہ پن سے دامن بچایا نہ جا سکا۔ مثلاً —

آپ کو ایجنٹ کہتے یا دلال

سیٹھ کو حاجت ہے "کمسن مال کی"
گھر پہ لا سکتے ہیں گیارہ سال کی
اس کی رانیں، اس کے بازو دیکھئے
(یعنی لا کر ترازو دیکھئے)
"اس قدر سستی کہ میری جان مفت
سات اس کے، آٹھ میرے، پان مفت"
دیکھ کر منہ چل دیا پسینہ نکال

آپ کو ایجنٹ کہتے یا دلال

(صفحہ ۱۴۴)

یا

آپ کا ہر دو جگہ ہے سلسلہ
دیکھ لی پتلی کمر تو "مر گئے"
"چھوکری سے چھوکرے کے گھر گئے"
"کم نہیں دلھن سے دولھے کی اٹھان"
"اف یہ سینہ، اف یہ کولھے کی اٹھان"
"اس نئی چولی کو مسکا چاہئے"
"اس حسین لڑکے کو دس کا چاہئے"
غم نہیں تذکیر یا تانیث کا
آپ کا ہر دو جگہ ہے سلسلہ

(صفحہ ۱۴۵)

"عکس ریز" میں سماج کے نمائندہ اور قابل ذکر کرداروں کو طنز کا نشانہ بنانے میں شاعر کسی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے۔ اس نظم کی روشنی میں اگر شاعر کے ذہن کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں CYNICISM کا عنصر غالب نظر آتا ہے اور شاید یہی چیز اس نظم کی محرک بنی ہے۔

ابتدائی دور میں کار ڈرائیو کرتے وقت جس طرح ایک نو مشق انسان کی ساری توجہ سامنے سڑک پہ رہتی ہے اور اسے دائیں یا بائیں جانب دیکھنے کا ہوش نہیں رہتا ٹھیک اسی طرح اس نظم کے خالق کی

ساری توجہ صرف موضوع میں جدت و ندرت پیدا کرنے کی کاوش پر مرکوز رہی ہے اور نتیجہ کے طور پر شعری تقاضوں کے ساتھ انصاف نہیں برتا گیا ہے۔ صرف ندرت و جدت کی شعوری کوشش ایک کامیاب نظم کی ضامن نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ ہی جمال و رعنائی، فکر و احساس جذبہ و تجربہ اور فن کے دیگر لوازم کا ایک متوازن امتزاج بھی ضروری ہے۔

جدیدیت کا علم بردار ہوتے ہوئے بھی منظر حنفی نے زیر تبصرہ نظم کے لئے پابند فارم کا انتخاب کیا ہے۔ یہ چیز اس نظم کی خوبیوں میں اضافہ کرنے میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ ورنہ بہ صورت دیگر یہ نظم اپنا موجودہ مقام حاصل کرنے میں ناکام رہتی۔ مجموعی طور پر یہ نظم اپنی جانب متوجہ تو ضرور کرتی ہے مگر وقتی طور پر — ذہن پر دیرپا تاثرات پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ ایک کامیاب فن پارے کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ قاری کے جذبات و محسوسات کی گہرائیوں تک راہ بنا لے بلکہ جہاں تک پہنچے وہاں اپنے تاثرات کو قائم بھی رکھ سکے۔

بہر حال ہلکے پھلکے ادب کے شائقین اسے ایک نظر دیکھ سکتے ہیں یہ کتاب تین روپے میں "کتاب پبلشرز، چوک، لکھنؤ-۳" سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

شبینے

مصنف: ابر احسنی گنوری

اب تک نعت و حمد اور منقبت وغیرہ پر مشتمل کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں بہزاد لکھنؤی کے نعت و حمد کا مجموعہ قابل ذکر ہے۔ زیر تبصرہ مجموعے میں ایمان افروز اور وجد آفریں نعتیں، غزلیں اور خمسے وغیرہ شامل ہیں۔ اپنی تخلیقات میں نہ صرف یہ کہ ابر نے اپنے پر خلوص جذبات اور والہانہ عقیدتوں کا اظہار کیا ہے بلکہ اظہار میں فن شاعری کے تمام تقاضوں کو بھی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ مجموعے کے شروع سے آخر تک گذرنے کے بعد بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابر احسنی کو اپنے فن پر کس قدر دسترس حاصل ہے اور انھوں نے استعارات و تلمیحات اور علائم و محاورات کو کس چابک دستی کے ساتھ برجستہ استعمال کیا ہے۔

اس رنگ کی شاعری سے ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے یہ مجموعہ کافی اہم ہے اور ان کے لئے پوری پوری تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔

"شبینے" تین روپے میں
ابر احسنی، گنور، ضلع بدایوں (یو۔پی) سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

"زہرہ"

مصنفہ: ثریا محمود ندرت

اردو ادب کے دیگر اصناف کے مقابلے میں صنف ناول نگاری میں خواتین نے اپنا ایک ممتاز اور نمایاں مقام بنا لیا ہے۔ خاتون ناول نگاروں میں اے۔ آر خاتون، قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین اور زبیدہ خاتون وغیرہ سرفہرست نظر آتی ہیں۔ ثریا محمود ندرت بھی اپنے تین ناولوں کے ساتھ اول کی خاتون ناول نگاروں میں اپنا مخصوص مقام حاصل کرنے کی جد و جہد کر رہی ہیں۔

"زہرہ" انکا تازہ ترین ناول ہے۔ کہانی کے تانے بانے ناول کی ہیروئن زہرہ کے گرد بنے گئے ہیں جو ایک سیدھی سادھی اور حالات کے ہاتھوں ستائی ہوئی مشرقی لڑکی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار زہرہ اور رمزی، اے آر خاتون کے مشہور و معروف ناول "افشاں" کے مرکزی کردار افشاں اور فرخ کی یاد تازہ کر دیتے ہیں اے آر خاتون کی افشاں ایک نیک اور معصوم مگر زندگی کی توانائی سے بھرپور مشرقی لڑکی ہے جبکہ ندرت کی زہرہ سیدھی سادھی مگر کسی

بزمِ شاخسار

یوسف جمال ——— راج گانگ پور

"شاخسار" کے زیرِ نظر شمارے میں اکثر حصے میں نظم و نثر جاندار ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ اس شمارے میں میری کہانی "پتھر ٹوٹتے گلی گلی" کی اشاعت بعض احباب کو اس لئے ناگوار گذری ہے کہ اس کے بعض کرداروں کے نام چند حقیقی ناموں سے ٹکرا گئے ہیں، حالانکہ میرا افسانہ قطعی خیالی اور طبعزاد ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بہرکیف میری وجہ سے نادانستہ طور پر کسی شخص کو اگر تکلیف پہنچی تو مجھے اس کا بہت افسوس ہے اور میں معذرت خواہ ہوں۔

یحییٰ امجد ——— سیالکوٹ

شاخسار کا شمارہ نمبر ۳ ملا۔ تحفہ فرمائی کا شکریہ۔ جب میں نے یہ پرچہ پہلی بار دیکھا، پہلے تو اس کا خوبصورت گیٹ اپ اور عمدہ کاغذ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ بھارت میں جہاں اُردو کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں اتنا عمدہ اور جاذبِ نظر پرچہ علم و ادب کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ پھر مطالعہ کیا تو اس کے معیار سے اور مسرت ہوئی۔ سب سے زیادہ تو مجھے اداریہ اور بزمِ شاخسار کے پہلے دو خط پسند آئے۔

مشاعرے کی اہمیت کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ اداریے میں لکھا ہے اُس سے مجھے اتفاق ہے۔ دراصل ماضی میں ہمارے یہاں مشاعرہ ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جو شاعر اور قاری کے درمیان ابلاغ کی اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اسی لئے شاعر پورے معاشرے کا نمائندہ ... معاشرے "میں سے" تھا۔ اور یہ مشاعرے ہی کی برکت تھی [illegible] کو سوسائٹی کی بلند ترین تہذیبی اقدار میں جگہ حاصل تھی اور شاعر کا رتبہ اہلِ علم و فن کے علاوہ عوام کی نگاہ میں بھی بہت بلند تھا اور شعر و شاعری سے شغف اور شعر فہمی لازمۂ شرافت سمجھے جاتے [illegible] جب سے مشاعرے کا وجود بکھرنے لگا ہے شاعر اور عوام کا رشتہ بھی ٹوٹتا جا رہا ہے، اور اب آزاد نظم کا شاعر تو بیچارہ کوہ قاف کی بلند چوٹی سے کھڑے ہو کر چند پیر مرادوں تک ہی اپنی آواز پہنچا سکتا ہے۔ آدمی زاد (یعنی عام قاری) تک بہ مشکل ہی اس کی رسائی ہوتی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اب PUBLIC ... کی بھی روز بروز کمی ہوتی جا رہی ہے۔ بالخصوص شاعری کے مطالعے کا ذوق تو صرف خود شعراء یا نقادوں یا پروفیسروں اور یونیورسٹی کے طالب علموں تک محدود رہ گیا ہے۔ بلکہ اب تو ڈر ہے کہ کہیں معاشرے میں ادب کا مقام ہی معرضِ خطر میں نہ پڑ جائے۔

ادھر عوام (یعنی تعلیم یافتہ عوام) اور شاعر کے درمیان ابلاغ کی اکائی برقرار نہ رہنے کی وجہ سے بعض شاعر جھلا کر ابلاغ کا [illegible] ہی سے انکار کرنے لگے ہیں۔ اور اپنی اس جھلاہٹ کو فلسفہ بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

البتہ یہ مسئلہ بیحد غور طلب ہے کہ آزاد نظم کو مشاعروں ...

ن طرح مقبول بنایا جائے ؟

بزمِ شاخسار میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے چند توجہ طلب
ہی ہیں۔ لیکن ان کی ایک بات کچھ سخن گسترانہ سی ہو گئی ہے۔ یعنی یہ کہ
بات نام کی چیز کا ادب سے کوئی بنیادی تعلق نہیں ہے۔" پھر وہ
ی دلیل یہ دیتے ہیں کہ " جذبات کا اظہار اگر نہ بھی ہو، صرف حقائق
ن تجربات یا صرف مشاہدہ کا اظہار ہو تو بھی شعر، شعر بن سکتا ہے۔"
۔ وہ اپنے اس دعوے کی تائید میں جو شعر پیش کرتے ہیں ان کے
ے میں یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ شعر جذبات انگیز EMOTIVE
ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ جذبات پر مبنی
EMOTIONAL نہیں ۔ لیکن اُن کی اسی بات سے کہ " یہ شعر جذبات انگیز
ہیں" اُن کی پہلی بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ " جذبات نام کی چیز کا
ت کوئی بنیادی تعلق نہیں۔" کیونکہ جو استثناء اُنہوں نے بڑی
سے ڈھونڈی تھی وہ بھی کم از کم " جذبات انگیز" تو ضرور نکلی۔
ئے جذبات اور ادب لازمی ہے۔

پھر اُن کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ حقائق تجربات اور مشاہدے کا
عر میں جذبے کے بغیر ہوتا ہے شاعر کے شعر میں تو صرف وہی
ت یا تجربہ یا مشاہدہ بار پاتا ہے جو اس کے باطن میں جذباتی تجربہ کی
ت میں رہ پا رہا ہو۔ چاہے کوئی شاعر کسی قسم کا اور ایک حقیقت
ے مگر ایک ہلکا سا انشراحِ قلب اور فرحت یا خفیف سا احساسِ
ر دکھ کی چوٹ وہ اپنے دل پر ضرور محسوس کرتا ہے جو اُسے شعر
ر مجبور کرتی ہے۔ شعر اگر شاعر کے باطنی تجربے کی خارجی صورت
ے تو وہ اچھا یا عظیم شعر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ
بات انگیز EMOTIVE شعر تخلیق کے وقت شاعر کے اعماقِ
ر جذبے کی ہلکی اور لطیف یا تند و تیز لہروں کے ساتھ بہہ کر سطح
ہے ۔ اگر کوئی شعر جذبات انگیز ہے اور جذبے پر مبنی نہیں ہے
عر نے صرف حقیقت یا مشاہدے یا تجربے کا بیان بغیر کسی جذباتی
ئے کیا ہے تو یہ محض اتفاقی امر ہے اور استثناء ہے۔ اور استثناء
ر بنا عجیب قسم کی جرأت رندانہ ہے ! ۔ فاروقی صاحب
ہ شعر بطور مثال پیش کئے ہیں اُن میں سے ہر شعر حقیقت تجربے

اور مشاہدے کا مفہوم رکھنے کے علاوہ جذبے کی ہوا کا پالا ہوا بھی
ہے۔ مثلاً دیکھئے ۔

" حقائق و مشاہدات " کے ادراک پر احساسِ تفاخر اور
جذبۂ تادیب ؎

تو پیت فطرت اور خیالِ بسا بلند
اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند (غالب)

" تجربات اور حقائق " کو بطور دلیل کے پیش کیا ہے موت کی برتری
ثابت کرنے کے لئے ۔ موت کی طرف لپکنے کا جذبہ ؎

بہ قدرِ ہر سکون راحت بود بہ نگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مُردن (صائب)

" مشاہدات اور تجربات " کی بنا پر چونکا ہوا خبردار کرنے کا انداز ؎

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

" حقائق " اور احساسِ شکست یا جذبۂ انفعالیت کا امتزاج ؎

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہے ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

" مشاہدات " اور فنائے ہستی کے تصور سے سراسیمگی کی کیفیت خصوصاً
" سی " کی آوازوں کو سنیئے ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

آخری شعر کے لئے فاروقی صاحب نے عنوان قائم کیا ہے " تجربات " ؎

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

یہ عجیب عنوان ہے۔ کیا ان کے خیال میں یہ میرؔ کا عملی تجربہ تھا ؟
کم از کم آج تک پڑھا تو نہیں تھا کہ میرؔ کو کسی گلی میں تلواریں مار مار کر کسی
خون میں نہلا دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی خارجی اور عملی نہیں بلکہ
خالصتاً باطنی اور جذباتی تجربہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ شعر خالص طور پر
جذبات پر مبنی ہے۔ شاعر اپنے کشف VISION میں اپنے تئیں قتل
ہوتا ہوا اور خون میں نہاتا ہوا دیکھتا ہے اور شعر کی صورت میں یوں

فرہاد کنی ہوتا ہے۔ یہ شعر تو نہایت مشتعل قسم کے جذبے پر مبنی ہے۔ آپ کیسے کہتے ہیں کہ یہ غیر جذباتی شعر ہے۔

ویسے یہ میں مانتا ہوں کہ کئی عبارتیں موزوں ہوتی ہیں اور جذبے پر مبنی بھی نہیں ہوتیں اور بظاہر شعر بھی نظر آتی ہیں لیکن کیا یہ واقعی شعر بھی ہوتی ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو شیخ چلی رحمت اللہ علیہ کا مندرجہ ذیل شعر سنیئے اور سر دُھنیئے ۔

اکہتر بہتر تہتر چوہتر
پچھتر چھہتر ستہتر اٹھہتر

آپ کے مقالے "شعری تنقید کے بنیادی مسائل" کی بہت تعریف سنی ہے۔ میں کہاں سے حاصل کر کے پڑھ سکتا ہوں؟

ناظر صدیقی ـــــ ہمیرپور (یو پی)

شاخسار کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔

اس بار شاخسار کے نقش اوّل میں اس قدر ٹھوس اور اہم بات کہی گئی ہے جس سے شاید ہی کوئی ذی ہوش اختلاف کرے۔ یقیناً "مشاعرے کا تعلق اُردو زبان و ثقافت کے خاص مزاج سے بہت گہرا ہے" مشاعرے اس دور میں تفریح طبع کا سامان ضرور ہیں لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بہرحال مشاعرے اُردو ادب کی بقا و ترقی کے لئے ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ مجھے اس تلخ نوائی کے لئے معاف کیا جائے کہ اس دور میں جب اُردو زبان میں عالم جاں کنی سے گذر رہی ہے خاص طور سے مشاعرے اور فلمیں اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے بہترین معاون و مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ میری اس بات پر اہل علم و ادب یقیناً برافروختہ ہوں گے کہ اس دور میں بڑے بڑے شاعر ادیب اُردو کی ترقی کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ شاعر جن کو سربرآوردگان اُردو ادب میں کوئی مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ان شاعروں پر فلمی شاعر ہونے کا الزام آ گیا ہے۔ مجھے دیکھنا ہے کہ لوگ میری اس بات سے اس حد تک متفق ہیں کہ مجروح، شکیل وغیرہ کا بھی اس سے کہیں زیادہ حصہ ہے۔ جتنا فراق، فیض، جوش وغیرہ کا ہے عوام کو اُردو سے روشناس کرانے رکھنے والی یہی شخصیتیں ہیں جو عام لوگوں میں اُردو کی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ آج فلمی اُردو شاعری پر پابندی لگا دیجئے۔ کل مشاعرے بھی ٹھنڈے ہو جائیں گے اور اُردو میں دلچسپی رکھنے والوں کا بھی فقدان نظر آنے لگے گا۔

بہرحال جو شخص بھی اُردو کیلئے کچھ کر رہا ہے اس کو غنیمت جاننا چاہئے۔ کاش جدیدیت ہی اُردو کے لئے کوئی کارنمایاں کر گذرے ؟

یہ محسوس کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ شاخسار کو حسین، نظر فروز اور دلنواز بنانے کے لئے مسلسل جد و جہد میں مصروف ہیں۔ حیرت اس بات کی ہے کہ اتنی قلیل زر سالانہ میں آپ "شاخسار" پڑھنے والوں کو کیسے فراہم کر رہے ہیں۔ آپ نے جس اضافے کا اعلان کیا ہے وہ برائے نام ہے مجھے امید ہے ہر جانب سے اس کا خیر مقدم ہوگا۔

افسانوی حصہ میں مناظر عاشق ہرگانوی کا "بازار اور سانپ"۔ یوسف جمال کا "پتھر لوٹتے گلی گلی" کافی پسند آئے صلاح الدین نیر، محمود سعیدی، علی عباس امید، سلطان احمد اور رمز سیناپوری کی غزلیں پسندیدہ ہیں۔

زیب غوری ـــــ کانپور

شمارہ نمبر ۱-۲ میں شاخسار اپنی بہار پر ہے۔ آپ کا مضمون علم النفسیات کی خشک اصطلاحات اور ریاضی کے پیچیدہ فارمولوں کے باوجود نہایت دلچسپ ہے۔ اُردو انتقادیات میں پہلا نمونہ ہے جو اس قدر تکنیکی انداز سے لکھا گیا ہے۔ میں آپ کی اس دقت سنجی اور کاوش کی داد دیتا ہوں۔

"شاخسار" مجموعی طور پر روز بروز بہتر سے بہتر ہوتا جا رہا ہے، لیکن آپ کی تحریروں سے کہیں یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ آپ جدید ادبی رجحان کے مخالف ہیں۔ شاید یہی وجہ تو نہیں کہ شمارہ نمبر ۱-۲ کے حصۂ غزلیات پر اوس سی پڑ کر رہ گئی ہے۔

ادبی معنویت کی غزلوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ آپ کا شہ زور قلم جدید
ادب کی تنقیص کر چکا آپ جن خرابیوں کے بارے میں قلم اُٹھا چکے ہیں
ان میں سے بیشتر پر لوگ آپ سے متفق ہیں۔ نقد و نظر آپ بڑی محنت سے
لکھتے ہیں۔ یہ حصہ آپ کے رسالے کی خصوصیت بن گیا ہے۔ کتنی ہی
کم فرصتی کیوں نہ ہو، میں شاخسار کا یہ حصہ بطور خاص پڑھتا ہوں۔

—— شمارہ نمبر ۳ میں صبا اکرام کی نظم "اور اس کے بعد" نے
بہت متاثر کیا۔ عزیز الرحمن بہ گلزاپوری کی نظم "باندھ" تکنیک کے
اعتبار سے ایک کامیاب نظم ہے —— لیکن زار غازی پوری کی نظم
"زندگی" اس شمارے کی جان ہے، مجھے یہ نظم بہت پسند آئی۔

سلطان اختر کا یہ شعر پسند آیا ؎

کسی نظر میں خوش اخلاقیاں بھی طنز نہ ہوں
اُداس ہو کے ہی ملئے اداس لوگوں سے

رمز سیتاپوری کی غزل کا مقطع بہت پسند آیا ؎

اے رمزؔ جاگنے سے نہ کم ہوگا دردِ ہجر
لمبی ہے غم کی رات ذرا دیر سو بھی لو

ناظر صدیقی کا یہ شعر بڑا دلچسپ انداز بیاں لئے ہوئے ہے ؎

دل پر نظر پڑی تھی کہ حیران رہ گئے
ہم خود ہی کھو گئے جو تری رہ گذر ملی

انور قریشی —— ناگپور

"شاخسار" ۱۹۸۸ء شمارہ ۳ موصول ہوا۔ نقش اوّل
سے نقش آخر تک ساری چیزیں پوری توجہ کے ساتھ پڑھیں۔ مضامین
انتخاب، ترتیب اور منظومات ہر چیز قابل مطالعہ اور دلچسپ ہے۔
نقش اوّل میں آپ نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ —— "چونکہ
ادبی شاعری عموماً عوام کے لئے نہیں لکھی جاتی اس لئے نئے
شاعروں کو مشاعروں میں اپنی ناکامی پر مایوس نہ ہونا چاہئے۔"
برہنہ اور زیر برہنہ کی بحث کو آپ نے اس شمارے سے ختم
کردیا، اچھا کیا۔ حقیقتاً نظم میں بھرپور آہنگ ہونے کے باوجود
دو دلکشی کا فقدان ہے۔ یہ "(CUT . FIEC E)" کی شاعری
نہ خواص میں مقبولیت حاصل کر سکتی ہے اور نہ عوام کو اپنی طرف
موڑ سکتی ہے۔ دیکھئے کب تک چلتی ہے۔

غزلوں میں حضرت رونق دکنی، محمود سعیدی، علی عباس
امید، ساحل مانکپوری اور تسخیر فہمی کی تخلیقات نے اپنی طرف
خاص طور پر متوجہ کیا۔

کہانیوں میں۔ یوسف جمال، افضال نیازی، مناظر عاشق
ہرگانوی کی کہانیاں زیادہ دلچسپ ہیں۔ مقالے سب ہی اچھے ہیں۔

صبا اکرام —— ڈھاکہ

آپ نے اپنے اداریہ میں بڑی سلجھی ہوئی باتیں کہی ہیں۔ واقعی
لوگوں کو خواہ مخواہ (NUISANCE) پھیلانے کے بجائے
اچھی تخلیقات پیش کرنے میں ENERGY لگانا چاہیئے۔ ساتھ
ہی رسالہ والوں کو بھی چاہیئے کہ وہ ادبی اور نظریاتی بحثوں کو اتنا
ڈھیل نہ دیں جس سے وہ گالی گلوچ کی شکل اختیار کر لیں۔

زیر نظر شمارہ میں وہاب دانش کے مضمون کا انداز بیحد
پسند آیا۔ اس انداز کے مضامین سے جدید قاری کی ذہنی تربیت
میں کافی مدد ملے گی۔ شعری حصے میں سلطان اختر، علی عباس امید،
مدحت الاختر، ساحل مانک پوری، شاہد ماہلی اور صلاح الدین نیر
کی چیزیں پسند آئیں۔

شمس فریدی —— جمشید پور

"شاخسار" کا تیسرا شمارہ دیکھنے کو ملا۔ زیر نظر شمارے کا
اداریہ کافی اہم ہے۔ سانحہ بمبئی کے سلسلے میں آپ نے بڑے خلوص
اور دیانتداری کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے۔ 'سانحہ بمبئی'
اگر کوئی سانحہ ہے تو اس سے کہیں زیادہ بڑا اور المناک سانحہ "مورچہ"
کی معرکہ آرائی ہے۔ آپ نے صحیح فرمایا ہے کہ اتنی توتیں اگر تخلیقی عمل
میں صرف کی جائیں تو اردو ادب کو بہتر فائدہ ہوتا۔

'شاخسار' مجموعی طور پر پہلے سے زیادہ نکھرا ہوا ہے حقیقتہً
نظم و غزل کا انتخاب خوب ہے، افسانے تقریباً سبھی اچھے ہیں لیکن

شعری حصہ کے انتخاب کے لحاظ سے یہ افسانے پاسی لگتے ہیں۔
آپ کے تبصرے دو ٹوک ہوتے ہیں۔

مدحت الاختر ——— کامٹی

شاخسار کا نظموں اور غزلوں کے حصہ کا مطالعہ کرتے وقت ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ ۲۵ فنکاروں میں سے صرف ۷ یا ۸ ایسے ہیں جو جدید یا نئے کہلاتے جاتے ہیں باقی کچھ نیم ترقی پسند، کچھ ترقی پسند اور کچھ روایت پرست شعراء شامل ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک محسوس ہوئی ــــ اور وہ ہے ــــ کلام کی پختگی اور زبان و بیان کے قواعد کی پابندی۔
اس لحاظ سے آپ کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔
نئے شاعروں کی غزلوں کے سوا مجھے صلاح الدین نیر، حافظ رفیق درد اور ناظر صدیقی کے کچھ اشعار بھی اچھے لگے۔ میری غزل کے چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ اس کی زد میں آگیا ہے۔ کورے کاغذ کی بجائے کورا کاغذ چھپ گیا ہے۔ براہ کرم اگلے شمارے میں اس کی تصحیح کر دیں۔

پلم تام نظر ——— کلکتہ

شاخسار پہلی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور یقین جانئے کہ آپ کی ملاقات کی طرح اس شمارے نے بھی مجھے اس قدر متاثر کیا کہ دوسرے سارے رسالوں کو چھوڑ کر کل سے آج تک میں نے اس کو پوری طرح پڑھ کر ہی ختم کیا۔
حصہ منظوم میں عزیز الرحمٰن کی نظم "باندھ" زار غازی پوری کی "زندگی"۔ غزلوں میں رونق دکنی سیمابی، صلاح الدین نیر، علی عباس امید، قیصر شمیم، نصیر پرواز اور رمز سیتاپوری نے متاثر کیا۔ سلطان اختر کو تو غزل کی شکل میں جب بھی دیکھتا ہوں بے اختیار ان کا قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے۔ "زرد" سے زرد ا جانے کی زبان انہوں نے نئی استعمال کی ہے۔ لیکن مجھے پسند نہیں آئی۔ یوں تو فراق نے "رقص و سرود" دوانہ" استعمال کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعر ضرورت کے تحت لفظوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کر سکتا ہے لیکن میں اس سے بیں طرنہ قریشی کے ساتھ ہوں کہ "کسی کو بھی" زبان اور لسانی قواعد کو ستیاناس کرنے کا حق نہیں پہنچتا ہے" "بزم شاخسار" میں تو کچھ ایسی کشش ہے کہ اسے چھوڑ کر اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ یہ آپ کا ہی دل گردہ ہے کہ کٹک جیسے غیر اردو علاقے سے ایسا منفرد ادب کا بھرپور نمونہ نکالتے ہیں۔

وسیم شعلہ ——— جمشید پور

اس شمارے میں رونق دکنی سیمابی کی غزل خوب ہے مندرجہ ذیل شعر تو میری نظر میں بڑی تہہ دار ہے ؎

اوہام کے اندھیرے اجالے میں آگئے
ڈھلکا جو اشک آنکھ سے قندیل ہو گیا

بھائی کرامت علی کا ابھی صرف ایک تبصرہ شہاب جعفری کے مجموعہ پر پڑھا ہے۔ بہت بھرپور تبصرہ ہے۔ میں چار چھ مجموعوں پر تبصرہ کرنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ ایک ہی پر بھرپور انداز سے کیا جائے۔

نعیم اشفاق ——— آسنسول

"شاخسار" کا شمارہ ۳ محب الرحمٰن کوثر کی وساطت سے باصرہ نواز ہوا۔ "آزاد شاعری" کا عروج دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔
"ایک حسین شام" اپنے دامن میں بھرپور معنویت لئے ہوئے ہے۔ افسانے اور مقالے سبھی جاندار ہیں خاص کر "دہاب دانش" کا مقالہ "وقت کی اساطیر کی" "سلطان اختر، مخمور سعیدی اور رمز سیتاپوری نے بڑی مرصع غزلیں کہی ہیں۔ "کرامت علی کرامت" بھی بے انتہا مبارکباد کے مستحق ہیں۔ "شاخسار" کا نکھرا نکھرا روپ ان کے حسن ذوق کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔

افتخار حسین ——— پٹنہ

"شاخسار" کے شمارہ ۳ کا نقش اول غیر جانبداری اور خلاق بینی ہے۔ دہاب دانش کا مضمون خوب تر ہے، مواد و ہیئت دونوں اعتبار سے ضمان اللہ ندیم، متاعِ گم گشتہ کی تلاش اور پیش کرنے قابلِ تحسین ہیں۔ اطہر عزیز کا رپورتاژ بھی اچھا ہے۔ تمیم زیدی اور زار رعنازی پوری کی نظمیں، نثار احمد صدیقی کے بعض افسانچے اور افضال نیازی اور یوسف جمال کے افسانے بےحد پسند آئے۔ مجموعی طور پر شاخسار پسند آیا۔

ماجد الباقری ——— راولپنڈی

"شاخسار" کا تازہ شمارہ ۳ اس مرتبہ خاصی تاخیر سے مجھے ملا ہے۔ جبکہ اس کے ورود کی اطلاعات کوئی دس روز یوم قبل ہی آنا شروع ہو گئی تھیں۔ کاتب صاحب نے اس کے صفحہ ۲ اور ۵ پر میرا نام ماجد کی جگہ "ساجد" لکھا ہے۔ یہ غلطی شاید میرے نام کی اردو ٹائپ کی تجریدی مہر کی وجہ سے رونما ہوئی، جو کہ بیک وقت پھیلتی اور سکڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

کاتب صاحب نے سلطان اختر صاحب کی غزل کے آخری شعر میں "خواب" کی جگہ "نیند" اور "نیند" کی جگہ "خواب" لکھ دیا ہے اور رحمت الاختر صاحب کے چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ میں "کور" کے بعد "سے" لکھنا بھول گئے ہیں اور علامت اضافت سے کام لیا ہے، جو غلط ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شعرا حضرات اسے کاتب کی غلطی تسلیم ہی نہ کریں، تو میں تحریری الجھن پیدا کرنے کی بجائے اپنے الفاظ فوراً واپس لے لوں گا اور کاتب صاحب سے اپنی گستاخی کی معافی چاہوں گا۔

سلطان اختر صاحب کا مصرعہ ہے:

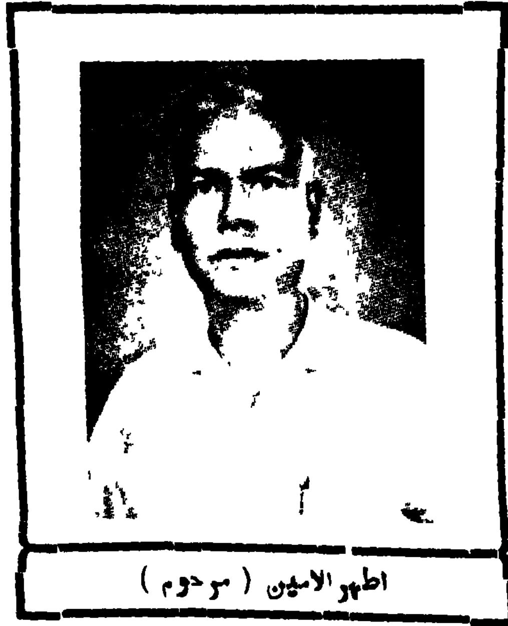
"خزاں کی دھوپ سے زردا گئیں ہری شاخیں"

میں 'زردانا' بمعنی پیلا پڑنا، یا پیلا کرنا' اردو میں ایک نیا مصدر ہے، جسے اور بھی شعرا نے برتا ہے اور میں بھی برتنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے "بزم شاخسار" کے صفحات پر بحث و تحقیق کے ذریعے اس قسم کے دیگر مصادر کی بھی فہرست بنائی جائے، تاکہ ان کے بے تکان اور بے تکلف برتاؤ یا برتاوے سے توسیع زبان کی مہم بھی آگے بڑھتی رہے۔ چند سلنے کے الفاظ جو فوری طور پر ذہن میں آئے ہیں وہ یہ ہیں :- تلاشنا بمعنی تلاش کرنا، دیکھنا (بیائے معروف) بمعنی دکھلائی دینا، لگنا بمعنی معلوم ہونا، سردانا بمعنی سرد کرنا، برفانا بمعنی برف میں لگانا۔ گردانا بمعنی گرد آلود ہونا وغیرہ۔

آخر میں ایکبار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "زردا گئیں" کی ترکیب بہت ہی خوبصورت اور قابلِ تقلید ہے۔

ہدیۂ تشکر

اس دَور میں جب اُردو کشی کی تحریک ہی نہیں، بلکہ مہم چلائی جا رہی ہے، اُردو کے شیدا
کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ جو اس طوفان میں اپنے خونِ دل سے چراغ جلانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔
راج کانگ پور (اُڑیسہ) کے سمنٹ فیکٹری کے کمرشیل منیجر جناب برج رتن صاحب بھی شاید گیسوئے اُر
کے ایسے ہی گرفتاروں میں سے ہیں۔ موصوف راج کانگ پور اور راورکیلا کی ادبی محفلوں کی روح روا
سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے ادارۂ "شاخسار" کو بھی ایک سو ایک روپے کے عطیۂ خصوصی سے نوازاہے
ادارہ آپ کے اس گراں قدر عطیہ کے لئے ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔



اطہر الامین (مرحوم)

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

THE SHAKHSAR CUTTACK-1



خالص تمباکو سے تیار کردہ

اکبری گڑاکو

آپ کے صحت مند دانتوں کا ضامن ہے

دانت کی ہر قسم کی بیماری اور مسوڑھوں کے درد کے لئے اکبری گڑاکو اکسیر کا کام کرتا آیا ہے

یہی وجہ ہے کہ ہمارا یہ مقبول ترین منجن آج ملک گیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔
اس کے استعمال سے فوراً جسمانی تھکن دور ہو جاتی ہے اور طبیعت میں فرحت سرور کی لہریں دوڑ جاتی ہیں
یہی وجہ ہے کہ لاکھوں لوگ روزانہ صبح اس کا استعمال کرتے ہیں۔
آپ بھی ایک بار آزمائیے

پتہ

شمس الدین اکبر خاں اینڈ کمپنی

بالو بازار کٹک

Iqbal Litho Press Patna-4.





نجم آفندی



ناصر شہزاد

اس شمارہ کے چند فنکار



علی عباس امید



ناصر زیدی

قارئینِ "شاخسار" کو "سالِ نو" مبارک ہو (ادارہ)

اُردو زبان کا منفرد اور ادبی جریدہ

دوماہی شاخسار کٹک

چوتھی جلد

شمارہ ۶

مدیر اعلیٰ

امجد نجمی

ترتیب و تزئین

کرامت علی کرامت ——— حیدر نایاب

صلاح کار

حرمت الاکرام | محمد انوار
مظہر امام | احمد حسین آزاد

سال بھر کی قیمت
۳ روپے

اس جلد کی قیمت
۷۵ پیسے

پتے

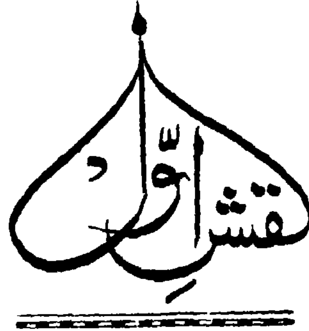
(۱) مدیر "شاخسار" ۔ بخشی بازار، کٹک ۱

(۲) رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک ۱

نجمی، مدیر، مالک و ناشر نے "یونیورسل لیتھو پریس" رمنہ روڈ، پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر "شاخسار" بخشی بازار، کٹک ۱ سے شائع کیا

ترتیب

شاخسار ۱۹۶۸ء —— شمارہ ۶



ریمارک نے اپنے ناول (ALL QUIET ON THE WESTERN FRONT) میں میدان جنگ کی ایک ایسی تصویر پیش کی ہے، جو ناقابلِ فراموش ہے۔ میدان جنگ میں گولے اور بارود کی گھڑگھڑاہٹ سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ ایک غریب الوطن فوجی ہے کہ خندق میں لیٹے ہوئے اپنی بندوق سے مسلسل گولیاں چلا رہا ہے۔ ایسے میں اچانک ایک رنگین اور خوبصورت تتلی کہیں سے اُڑ کے آکر اس کے قریب بیٹھ جاتی ہے۔ فوجی کے دل میں اسے چھونے کی ایک بے پناہ خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن توپوں کی دلدوز آوازوں سے وہ وقتی طور پر سہم جاتا ہے۔ اس کے فوراً بعد اپنی ہمت پر قابو پا کر وہ اس خوبصورت تتلی کو چھونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی وقت دشمن کی گولی اس کا سینہ پار کر جاتی ہے اور دوسرے لمحہ اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس فوجی کے دل میں زندہ رہنے اور زندگی کے آخری لمحوں تک جمالیاتی قدروں کو برقرار رکھنے کی احساساتی تڑپ پائی جاتی ہے۔ ریمارک نے جس طرح روحانی اور جمالیاتی قدروں کی شکست خوردہ فتحیابی کی عکاسی کی ہے۔ اس کا تعلق خالص جدید ذہن کے مثبت ردِ عمل سے ہے۔ لیکن اگر ہم اردو کے جدید شعر و ادب کے سرمائے کا مجموعی طور پر جائزہ لیتے ہیں، تو اس میں ہمیں جدید ذہن کے اس خاص قسم کے مثبت ردِ عمل کا بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ ردِ عمل اس قدر فطری ہے کہ اسے کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ریمارک کے ناول میں موت ایک ٹھوس حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔ پھر بھی جدید انسان کی نظر میں جمالیاتی قدروں کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ موت کی للکار کا جواب جمالیاتی قدروں سے دینا چاہتا ہے۔ مایوسی، بے بسی اور بے یقینی کا احساس اس دور کی ایک ٹھوس حقیقت سہی، پھر بھی شاعری میں ان شکست خوردہ احساسات سے وابستہ منفی رجحانات جدید ذہن کے ان لطیف پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے قاصر ہیں۔ جن کا تعلق انسانی قدروں سے ہے اور جن کے بغیر انسان انسان نہیں رہ سکتا۔

پروفیسر احتشام حسین اور ان کے دیگر رفقاء ترقی پسند تحریک کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ان لوگوں نے ایک مشترکہ اعلان بھی شائع کیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین ان بلند قامت ادبی شخصیتوں میں سے ہیں، جن پر اردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ لہذا کوئی ٹھوس قدم اٹھانے سے پہلے انہیں سوچ سمجھ کر ایسا کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ بین الاقوامی ادب کے اعتبار سے اگر ہم ترقی پسندی کی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ترقی پسندی بھی جدیدیت کی ایک شکل ہے۔ اس لئے جدید شاعری کے دور میں اس تحریک کو الگ طور پر زندہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ ہر شخص کو اپنا سیاسی اور سماجی نظریہ رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اور اگر وہ شخص حساس شاعر بھی ہے، تو اس کے سیاسی اور سماجی عقائد کا اثر براہ راست اس کی زندگی پر اور بالواسطہ اس کی شاعری پر پڑنا فطری امر بھی ہے

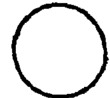
اور لازمی بھی۔ ظاہر ہے کہ جدید شاعر اشتراکیت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ اپنی "انا" کے خول سے باہر نکل کر دورِ حاضر کے عالمی یا قومی مسائل سے شاعرانہ خلوص و صداقت کے ساتھ خود کو وابستہ کر دے، تب بھی وہ "جدید شاعر" کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی خارجی تحریک کے ذریعہ شاعر یا ادیب کے ذہن پر مخصوص قسم کے سیاسی اور سماجی نظریات کو مسلط کرنا، اس کے فن کو لاحق ڈال دینے کے مصداق ہے۔ کیونکہ آرٹ ایک ایسی خود پسند اور خود سر شئے ہے کہ اس کی آزادانہ روش کو کسی بھی خارجی تحریک کے محصور نہیں کیا جاسکتا۔

علاوہ ازیں ترقی پسند تحریک کی از سرِ نو تنظیم میں سب سے بڑا خدشہ موقع پرستوں کی اجارہ دارانہ گروہ بندی اور احباب نوازی کا ہے جس کے لئے جدید شاعری بدنام ہے اور اس سے قبل بھی ترقی پسند تحریک بدنام ہو چکی ہے۔

اس سلسلے میں، میں مزید اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ ہر تحریک کے عروج کے لئے ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ جس میں انسان کا ذہن ماحول کے ردعمل کے طور پر اس تحریک کو لبیک کہنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایسے ہی موقع میں اس مخصوص قسم کی تحریک کا فروغ ممکن ہے۔ ہمیں یہ تجربہ بتاتا ہے کہ ہر ادبی رجحانات جو تحریک کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کا ایک مخصوص عرصۂ حیات ہوتا ہے۔ جس کے بعد اس کا خاتمہ ہونا لازمی ہے۔ بین الاقوامی ادب میں تاثریت، اظہاریت، پیکریت، مکعبیت، مستقبلیت، فوق الواقعیت وغیرہ جتنی ادبی تحریکیں معرضِ الوجود میں آئیں، وہ ایک بار ختم ہونے کے بعد پھر سے زندہ نہ ہو سکیں۔ البتہ آنے والی نسلیں شعوری یا غیر شعوری طور پر وقتاً فوقتاً ان تحریکات سے ضرور اثر قبول کرتی رہی ہیں۔ حالانکہ بظاہر نئی نسلیں اپنے پیش رؤوں سے برگشتہ ہی کیوں نہ ہوں۔ غرض ترقی پسند تحریک کے تعطل کے بعد اب جبکہ اس کی جگہ اردو کی جدید شاعری نے لے لی ہے، پھر سے ترقی پسند تحریک کو زندہ کرنے کی کوشش "سازِ بے ہنگام" نہیں تو اور کیا ہے؟

کرامت علی کرامت

سرخ نشان



اس دائرے میں اگر سرخ نشان ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارے کے ساتھ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ لہٰذا فوراً زرِ سالانہ تین روپے منی آرڈر سے ارسال فرمایئے بصورت دیگر آئندہ شمارہ وی، پی سے بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ اگر کسی وجہ سے تجدید خریداری آپ کو منظور نہ ہو تو صرف ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع فرمائیں۔

(ادارہ)

نازش پرتاپگڑھی

پس منظر

آنسو — میں نے یہ دیکھا ہے
سارے بندھن ٹوٹ چلے ہیں
کتنے ہی چشمے پھوٹ بہے ہیں
پیمانے لبریز ہوئے ہیں
پیمانے بھر کر چھلکے ہیں
ویرانہ نغمہ گاتا ہے
آنسو تارا بن جاتا ہے

آنسو اب بھی دیکھ رہا ہوں
آنسو کب تک دیکھے جاؤں

ربودگی

بھٹکی ہوئی سی چند صداؤں کی بازگشت
ان سرمئی دھندلکوں میں گم ہو کے رہ گئی
سناٹا کھویا کھویا سا، سہمی سی تیرگی

اجڑے ہوئے کھنڈر پہ یہ اک مضمحل سی چھاؤں
افسردگی، اداسی، سلگتا ہوا سکوت
کس درجہ تیز گام ہیں دھندلی کرن کے پاؤں

دوراہا

ہار اشکوں کے پرو لوں کہ نہیں
آرزو، شوق، یقیں — کچھ بھی نہیں
سنگِ در، سجدہ، جبیں، کچھ بھی نہیں

ہوش کچھ اور بھی کھو لوں کہ نہیں
میرا پیمانہ مگر ٹوٹ چکا
ایک اک تارِ نظر ٹوٹ چکا

نیند نزدیک ہے، سو لوں کہ نہیں
نیند نزدیک ہے، سو لوں کہ نہیں

علی عباس امید

صلیب بردوش

جانے کب چھیڑا تھا مطرب نے ترانہ غم کا
از زمیں تا بہ فلک
گونج ہے باقی اب تک
آنکھ میں گرد ہے یادوں کی
دھواں چھایا ہے
ہاتھ میں دامن حسرت ہے
دریدہ وہ بھی

نور برساتی ہوئی رشک ارم تھیں راتیں
گل فشاں خوابوں کی خوشبو بھری چادر کے تلے
آنکھوں ہی آنکھوں میں آنکھوں سے دلوں کی باتیں
روح کے ساز پہ جیسے چھڑے پُرکیف غزل
شبنم کیف،
گل ذہن پہ رقصاں، رقصاں
مسکراتی ہوئی اٹھلاتی تھی خود رات ڈھلے

شاد ماں قافلۂ زیست رواں تھا، لیکن
بڑھ کے قزاقِ حوادث نے سکوں کی مشعل
ہوش کے ہاتھ سے لی، گل کیا، شب خوں مارا
آن کی آن میں سب ہو گئے درہم برہم

آنکھ میں گرد ہے یادوں کی
دھواں چھایا ہے
ہاتھ میں دامن حسرت ہے
دریدہ وہ بھی!
وقت کے موڑ پہ ہے، جسم اسیر ظلمت
آرزوئیں نہ امیدیں نہ تمنا کوئی
پُرشش ہے راہگذر کا نہ پتہ منزل کا
دفن ہے قبر میں سینے کی جنازہ دل کا

جیوتی

آج اک حقیقت ہے
بے نقاب ہے پھر بھی
کل کو پوجتے ہو تم

کل کو پوجنے والو
جسم اور سائے ہیں دو حقیقتیں پھر بھی
کیا مجھے بتاؤ گے
کون ہے اہم ان میں
کس سے پیار کرلو گے؟



نجم آفندی

"فکر و نظر"

زمانے برسوں کے تعلق کو بھلا دیتی ہے
صف اخلاص کی محفل سے اٹھا دیتی ہے
خبر ہے تجھے اک جنبش لب ایک نظر
دوست کو دوست سے بیگانہ بنا دیتی ہے

ہم نے مانا ابھی سویرا ہے بہت
غفلت کی نوازشوں نے گھیرا ہے بہت
اٹھ حسن عمل کی شمع روشن کر لے
جانا ہے جدھر تجھے اندھیرا ہے بہت

گا جو محبت کا کبھی ٹوٹ گیا
بھر میں بنی بات بگڑ جائے گی
پہلے تو ہے جوڑنا ہی مشکل اے دوست
اور جڑ بھی گیا، تو گانٹھ پڑ جائے گی

بہت آساں ہے جلتی دھوپ کو برسات کہہ دینا
کوئی بیجا نہیں اے دوست دن کو رات کہہ دینا
بشر وہ غیر معمولی بشر ہے جس کا شیوہ ہو
سیاست کی فضا میں رہ کے سچی بات کہہ دینا

نمونہ کچھ تماشا تو نہیں
سا ہی اللہ کا بندا تو نہیں
کے حقوق تجھ پہ ہیں غور تو کر
ترا وجود تنہا تو نہیں

کرشن موہن

قطعات

شعر و سخن میں دھیان کس کا رہتا ہے؟
سدھ بدھ کھوئے، من مستی میں بہتا ہے
کوئی بتائے کیا ہے، یہی جینے کا شعار
پھر کہتے ہیں، کوئی نہیں کچھ کہتا ہے

پا چکے تھے جو پیار کھو ہی گئے
زندہ دل بھی اداس ہو ہی گئے
کرشن موہن ہے زیست کا یہ چلن
ہنسنے والے جہاں میں رو ہی گئے

جلوہ ہائے شباب کھو ہی گئے
اپنے جذبات شوخ سو ہی گئے
کرشن موہن ہے من اداس کہ ہم
ہوتے ہوتے بزرگ ہو ہی گئے

سوچ میں اہل عشق کھو ہی گئے
آس میں بھی اداس ہو ہی گئے
سکھ کے رسیا بھی اپنے سپنوں کو
دکھ کی مالاؤں میں پرو ہی گئے

نریش کمار شاد

"والد کے نام"

> ۸ ستمبر ۱۹۶۸ء سے والدِ محترم جناب ڈوگر رام صاحب درد نکودری ایڈیٹر روزنامہ "ہند سماچار" جالندھر سے پُراسرار طور پر غائب ہیں۔ انتہائی دوڑ دھوپ اور تلاش کے باوجود ابھی تک ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ خدا کرے وہ خیریت سے ہوں اور میری یہ فریاد ان تک پہنچ سکے۔ (شاد)

شفیق باپ! کبھی میں نے یہ نہیں دیکھا ہوئی ہو تجھکو گوارا مری پریشانی
ہمیشہ مجھ کو نظر آئی تیری آنکھوں میں نظر نواز بڑی مہربان تابانی
مگر ہے تیرے سبب آج رحم کے قابل
مری نڈھال طبیعت مرا بجھا ہوا دل

عجیب حال ہے دن رات جستجو تیری کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جابجا مجھکو
ہر ایک راہ سے مانوس ہوں مگر پھر بھی سجھائی دیتا نہیں کوئی راستا مجھکو
کہاں سے چل کے پہنچا، کہاں ہوں کیا معلوم
"نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم"

تجھے ترس نہیں آتا ترے تجسس میں گلی گلی جو بایں حال زار پھرتا ہوں
تمام شہر کو حیرت ہے میری وحشت پر تمام شہر میں دیوانہ وار پھرتا ہوں
تری تلاش نے دیوانہ کر دیا ہے مجھے
خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے مجھے

جو دیکھتا ہوں کہیں کچھ نظر نہیں آتا جو سوچتا ہوں، خیالوں کی آنکھ روتی ہے
بھٹک رہی ہے پریشان زندگی ایسے کوئی کٹی ہوئی جیسے پتنگ ہوتی ہے
مرا وجود بھی اب میری دسترس میں نہیں
وہ بے بسی ہے کہ میں خود بھی اپنے بس میں نہیں

میں کھو نہ جاؤں کہیں یاس کے اندھیروں میں بہت شدید ہوا جا رہا ہے غم میرا
مرے شعور کی رگ رگ سے خون جاری ہے میں کیا کروں کہ گھٹا جا رہا ہے دم میرا
میں تھک چکا ہوں نہیں تاب انتظار مجھے
جہاں کہیں ہے خدا کے لئے پکار مجھے

اویس احمد دوراں

روبہ زوال

جب وبا خیز تاریکیوں میں
ستاروں کے دل ڈوبتے جا رہے ہیں
چراغوں کی لو ہچکیاں لے رہی ہے
یہ روشن عناصر
کہاں تک طویل و سیہ رات کی قہرمانی سے آخر لڑیں گے
کبھی تھک گئے ہیں
سپر ڈالتے جا رہے ہیں
کوئی قوت شر ہے جو سارے آئینہ خانہ کو مسمار کرنے پر گویا تلی ہے
یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کہ انسان کی تاریخ پر اب زوال آ رہا ہے
بدی کے سلگتے، دہکتے عناصر
یہی چاہتے ہیں
کہ آرام گاہ بشر اب دھواں بن کے تحلیل ہو جائے دشت فنا میں
نشاط آفریں زندگی پر یہ کیسی کڑی آزمائش کا وقت آ پڑا ہے

سلطان اختر

نظم

شربتی آنکھیں مہکتے گیسوؤں کی نرم چھاؤں
بھیگے ہونٹوں پر کھنکتے قہقہوں کے جلترنگ
دودھیا پیکر
لچکتے جسم
باہوں کے گداز
ریشمی آنچل کی خوشبو سے معطر روز و شب
کتنا شیریں خواب تھا
اور اب
یہ چہرگی سے عاری چہروں کا ہجوم
دا غدار عارض
یہ زلف مستوار
پتلیوں کے رقص سے محروم آنکھیں اشکبار
خون میں لتھڑے ہوئے ہونٹوں پہ زخموں کی قطار
شرمناک آوازیں
بے ترتیب سانسیں
اور برہنہ قہقہے
تعبیر کتنی تلخ ہے

اختر یوسف

میں — تنہائی کا مارا...

میں — تنہائی کا مارا
رات گئے
سنسان سڑک پر تنہا تنہا
گھوم رہا تھا
کالی سڑک چکنی چکنی تھی
دھول کا بالکل نام نہ تھا
اور دور دور تک اغل بغل
پتھر کے تجر دھرتی کے اندر گڑے ہوئے تھے۔
خاموشی کے بھوت ہر اک جا
لمبے لمبے دانت نکالے ہانپ رہے تھے
میں — تنہا تھا،
کھویا تھا اپنے میں بالکل
بمن، تھوڑی دیر کے بعد
ں نے دیکھا
ں کالی چکنی سڑک
یٹھ اینٹھ کے چکراتی سی
،نبد ہے لسنر کی مانند
دئی

— جگہ پر جم سی گئی
— مری آنکھیں ڈر کے مارے
نا بھول گئیں۔
میں نے دیکھا
م کے نیچے

دھرتی نام کی کوئی چیز نہیں تھی
اور معلق میں تھا کھڑا
پھر — میں نے دیکھا
دھرتی والی جگہ کے اندر
جانے کتنے سورج، چاند، ستارے
بالکل مرمانتے سے
دمک رہے تھے، چمک رہے تھے
ہرے بھرے اشجار ہر اک جا
جھوم رہے تھے
باغ تھے بالکل کھلے کھلے
پھولوں کی مہک تھی پگلی پگلی
اونچی نیچی کلیاں تھیں
پگڈنڈیاں تھیں
چھوٹی چھوٹی کٹیاؤں میں
رنگ برنگی آوازوں کی
کومل کومل گونج تھی رقصاں
پنگھٹ پر گاگر کی دمک تھی
کھیتوں میں سرسوں کی چمک تھی
جیسے — چاند کی چاندنیاں ہی
پگھل کے اک دم جم سی گئی تھیں۔
میں نے یہ سب دیکھ کے سوچا

جنّت کا دروازہ شاید
خدا نے بالکل کھول دیا تھا
دل کے بہلاوے کی حقیقت
آج خدا نے دکھلا دی تھی!
سوچ کے یہ سب مارے خوشی کے
میں نے اپنے دونوں پیر
تیزی سے آگے جو کئے تو
مرے پیچھے کوئی چیخا
اور جو، پھر کچھ سہما سہما
گھبرایا سا، میں پلٹا تو
ایک بڑی سی کار کو پیچھے دیکھ کے
سرپٹ بھاگ اٹھا
پھر — مرے پیروں کے نیچے
اور —، مرے آگے
وہی سڑک تھی کالی کالی
جو میلوں تک پھیلی تھی!!

●●●

علیم جہانگیر

ماہ بہ ماہ

کل دیوار پہ پھڑپھڑاتے کیلنڈر سے میں نے
جو پچھلے مہینے کی تاریخ کا پیج پھاڑا
تو اک نیا دن مجھے دیکھ کر مسکرایا
تو ایسا لگا
جیسے اس کے تبسم کی تلخی
گھل گئی ہو نئے ماہ کے تن بدن میں
نیا ماہ وہاں بھی ہے ماہ گزشتہ کا قاصد
وہی بوجھ پھر ....
وہی کوفت پھر ....
وہی کرب پھر ....
کیا یہ مرے ساتھ ہوگا؟

• • •

تنہا تماپوری

سنگِ راہ

میں تو اک ادنیٰ سا سنگِ راہ ہوں
ہر کوئی ٹھوکر لگاتا ہے مجھے
نے کوئی منزل ہے میری، نے کوئی میرا مقام
نے کوئی ساتھی ہے میرا اور نہ کوئی راہبر
میں فقط مکار ہاتھوں میں کھلونا بن گیا
اور کچھ ہاتھوں نے پوجا بت بنا کر بھی مجھے ....
اور کوئی سنگتراش
مجھ میں گوتم اور گاندھی کے نقوش
مجھ میں ٹیپو اور شیواجی کا روپ
مجھ میں لینن اور اسٹالن کا عکس
اس طرح ڈھالا کہ میری شکل آخر مسخ ہو کر رہ گئی
میرا رنگ اور روپ مجھ سے چھین کر
نت نئے سانچوں میں مجھ کو ڈھال کر
میرے "میں" کو موم کی مورت بنایا
تب مجھے ـــ دورِ حاضر کا نیا انسان کہا
حیف، اب مجھ میں نہیں کچھ بھی سکت
مجھ کو لے جاؤ!
کسی گمنام کی، قبر کا کتبہ بنا کر چھوڑ دو!
میں تو اک ادنیٰ سا سنگِ راہ ہوں
بس۔ یہی منزل ہے سنگِ راہ کی !!!

عالم برہ پوری

شناسائی

عجیب زندگی کا وہ موسم تھا یارو!
بہاریں کھلی تھیں
سہانے بدن پر
نفس میں فسوں اور انگڑائیاں تھیں
نظر میں خمارِ جنوں تیارہا تھا
خیالوں کے سورج
سہانے افق پر
شفق گوں خلاؤں میں تھرا رہے تھے
لہو سنسنایا
بدن جھرجھرایا
قدم تھرتھرایا
کہ گہرے اندھیرے میں اب سامنے سے
اُبھرنے لگا تھا
اک انساں کا سایہ
نظر کی صداقت اسے پا چکی تھی
مگر نا سمجھ دل دھڑکنے لگا تھا

•••

عالم برہ پوری

ایک نظم

میں اکثر خیالوں کے طوفاں میں گم
تہوّر کے اڑتے بگولوں پہ بیٹھا
یہی سوچتا ہوں
کہ یہ زندگی بھی عجب زندگی ہے
بظاہر تو ہے عیش کا جام رنگیں
مگر
جام کی مئے الم سے بنی ہے
پھنکارتی کالی زہریلی ناگن
جسے موت کہتے ہیں سادہ زباں میں
ہے اس زندگی کی ترینی پہیلی
یہ انسان
جو عیش و طرب کیف و مستی کا
اک خوبصورت سا پیکر بنا ہے
رہا ہے
رہے گا
ہمیشہ
پہیلی!

•••

شاہد عزیز

اندیشہ

رات دن کی گردشوں میں
چاند آدھا کٹ چکا ہے
اور یہ سورج کہ اپنی راہ پر
چل رہا ہے ایک اندھے کی طرح
کوئی اس کو راستہ دکھلا دو ورنہ
تیرگی کے غار میں
گر جائے گا

•••

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

"ہندوستانی جمالیات کے بنیادی رُجحانات"

"قدیم ہندوستانی جمالیات" میں لفظ "کلا" نہایت اہم لفظ ہے۔ تخلیقی آرٹ کے لئے قدیم ہندوستانی جمالیات نے اسی لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اس کا مفہوم ہے:

- "گیان"
- "نقطۂ خارج یا باطن کو مرکزِ نظر بنانا"

اور

- "تپسیا"

اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

- انسان کا داخلی عمل
- جمالیاتی اظہار
- دروں بینی اور بیروں بینی
- تپسیا

اور

- صاف اور واضح اظہار و ابلاغ

مختلف عہد میں مختلف تشریحیں ہوئی ہیں۔ کبھی انسان کے تخلیقی عمل اور جمالیاتی اظہار کو "کلا" کہا گیا ہے اور کبھی دروں بینی اور تپسیا کو، کبھی تپسیا اور بیروں بینی کو اور کبھی دروں بینی اور واضح اظہار و ابلاغ کو۔ قدیم ہندوستانی جمالیات میں تمام تشریحوں کی اہمیت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ "لفظ" ہر تخلیقی آرٹ کے لئے استعمال ہوا۔ انسان کے پُراسرار تخلیقی عمل، دروں بینی، بیروں بینی سے متعلق ہم اس لفظ سے وابستہ ہیں۔ مسرت آمیز اور بصیرت افروز تجربہ اور اس تجربے کا اظہار۔ اس ایک لفظ میں "موضوع" اور "ہیئت" کی پوری معنویت موجود ہے۔

قدیم ہندی علمائے جمالیات نے مختلف عہد میں اس لفظ سے تخلیقی آرٹ کی تشریحیں کی ہیں۔ اس داخلی پُراسرار عمل کی وضاحت کی ہے۔ جس سے آرٹ وجود میں آتا ہے۔ اس لفظ سے قدیم ہندوستانی جمالیات کے بنیادی اصولوں کے مطالعے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہندوستان کی عظیم اور تہہ دار تہذیب کے پس منظر میں مختلف جمالیاتی نظریوں اور اصولوں کے پیش نظر ہم جمالیاتی قدروں اور فنی روایات کو سمجھتے ہیں۔ اس لفظ سے بڑی مدد ملتی ہے۔

رقص اور شاعری قدیم ترین آرٹ کے مستقبل عنوانات ہیں۔ شیو کے رقص کے بعد مرد اور عورت کے رقص کا آہنگ ہر معاشرے کا آہنگ بن گیا ہے۔ شاعری کی روحانی اور داخلی قدروں سے رنگ اور روشنی کی لہریں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ رگ وید کے نغموں میں جذبہ اور تخیل کی ہم آہنگی "کلا" کے ایک خوبصورت اور نہایت دلکش روپ کو پیش کرتی ہے۔ اوشا "سوریہ" "چندرما" اور دوسرے پیکروں سے مخاطب ہو کر رگ وید کے نغمہ نگاروں نے اپنے وجود اور اپنے باطن کی کیفیتوں سے

آگاہ کیا ہے ۔ "وردنا"، "ویدی جمالیات" کی سب سے عظیم اور تہہ دار
علامت ہے ۔ "زندگی کی تنظیم" کے حسن کا تعلق اسی پیکر سے ہے اس
کے حسن و جمال کا شدید ترین احساس ملتا ہے ۔

'کلا' نے "وردنا" — 'برہما' — 'برہمن' — کے حسن
و جمال کو انسان کی سائیکی سے نکال کر ایک صورت دی ہے ۔ پردوش
اور راد ویشی کی محبت کی لازوال کہانی کو 'کلا' نے جانے کتنے روپ
دیئے ہیں ۔ قدیم ہندوستان میں رقص، موسیقی، شاعری اور اداکاری
سب کا تعلق گہرا ہے ۔ حسن مطلق یا معبود حقیقی کے جلال و جمال نے
ایک طرف اور انسان اور اس کی زندگی اور آکاش اور دھرتی نے
دوسری طرف سائیکی کو متحرک کیا ہے ۔ ایک تہہ دار اور گہرے وژن
کی تخلیق کی ہے ۔ ہیجانات ابھارے ہیں ۔ سوچ اور فکر کو مرتب کیا
ہے — فلسفہ اور مذہب نے سائیکی کے اس تحرک جمالیاتی
وژن کی اس تخلیق اور 'کلا' کے رنگوں، اور اداؤں، متوازن حرکتوں
(MOVEMENTS) کے بعد جنم لیا :-

- روحانیت
- مادیت
- جسم — جنسی اور حسیاتی آرزوؤں اور خواہشوں

کی تکمیل ۔ اس "تین مورتی" کے گرد 'کلا' کے مختلف جمالیاتی تصورات
اور نظریات مختلف عہد میں گھوم رہے ہیں ۔

"ہندوستانی جمالیات" کا مطالعہ کرتے ہوئے ان حقائق
کو سب سے پہلے سامنے رکھنا ہوگا ۔

ہندی علمائے جمالیات نے تخلیقی آرٹ کو مختلف زاویۂ نگاہ
سے سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔ لہٰذا تاریخ جمالیات میں قدیم جمالیاتی
عقلوں کے بہت سے خیالات ملتے ہیں ۔ تخلیقی آرٹ کے اس چیلنج کو
— جس میں گیان، زاویۂ نگاہ، رجحان، تپسیا، سب کی اہمیت
ہے، جو فن کار کے پراسرار داخلی عمل کی پیچیدگی کا احساس دیتا ہے
اس کے لئے جمالیاتی اظہار کی صورت ہے، اور جس کے موضوعات پھیلے
ہوئے، تہہ دار، ہمہ گیر، اونچے اور گہرے ہیں — اپنے اپنے طور پر
... کرنے اور جواب دینے کی کوشش ملتی ہے ۔ قدیم ہندوستانی
جمالیات ہیں ۔

- — فطرت کی نقالی کا تصور بھی ملتا ہے ۔ جسے ... نے یونان میں حسیاتی جمالیاتی تصور کہا تھا ۔
- — جلال و جمال کے التباس کا واضح خیال ...
- — حسن مطلق — برہما، برہمن، وردنا کی پرچھائیں کی بات بھی ملتی ہے ۔
- — تخیل اور مادی حسن کے گہرے باطنی رشتے احساس سے بھی کچھ خیالات ابھرتے ہیں ۔
- — "آزاد علامتی فکر" اور "علامتوں کی باطنی معنویت" اور لفظ اور روح کی آواز کے رشتوں کا ادراک بھی موجود ہے

ادبیات کی تاریخ میں "فطرت کی نقالی" کا تصور ایک
نہایت ہی قدیم تصور ہے ۔ ارسطو سے بہت پہلے ... ق م ...
یونان میں اس تصور کے خاکے موجود ہیں ۔ "نقالی" ایک بنیادی حس
یا جبلت ہے ۔ اس کا احساس بہت ہی قدیم ہے ۔ فطرت کے جلال
و جمال کی نقالی سے آسودگی ملتی ہے ۔ مسرت آمیز لہریں پیدا ہو
جاتی ہیں ۔ حسیات ہیجان کے بعد متوازن ہو جاتی ہیں ۔ بصیرت
حاصل ہوتی ہے ۔ انسان اور فطرت کے باطنی رشتے کا احساس
ہو جاتا ہے اور رموز و اسرار سے آگاہی حاصل ہوتی ہے
میں ان تمام سچائیوں کا احساس نہیں تھا لیکن لاشعور میں یہ تمام
سچائیاں موجود تھیں ۔ تصویر ایسی ہو کہ اس میں فطرت کے اس بھید
عنصر کی پہچان ہو جائے ۔ جسے نگاہوں کا مرکز بنایا گیا ہے ۔ دراصل
یہی خیال پہلے پیدا ہوا ۔ ماضی کو یاد رکھنے اور 'یادوں' میں ایک
رشتہ اور تسلسل پیدا کرنے کے لئے اس جمالیاتی تصور کو زندہ رکھنے
کی کوشش کی گئی ہے ۔ 'کلا' کی تعریف اور اس کی تشریح و تعبیر کے
لئے علمائے جمالیات اور خصوصاً ہندوستانی اور یونانی فلسفی
فن کاروں نے اس 'خیال' کی تائید کی ہے ۔ رفتہ رفتہ لاشعور زیادہ
متحرک ہوتا گیا ۔ 'سائیکی' کے دباؤ سے "وژن" میں اور تہہ داری
اور گہرائی آتی گئی ۔ اور یہ تصور یا خیال، نظریہ یا زاویۂ نگاہ
واضح ہوا کہ فطرت کے جلال و جمال کی نقالی سے 'کلا' میں جمال

روں کی تخلیق ہوتی ہے۔ یا 'کلا' کی جمالیاتی قدریں متحرک ہو جاتی ہیں اس سے مسرت آمیز بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ 'حقیقت' یا 'سچائی' کو حسن میں بدل دینے کا عمل 'کلا' یا آرٹ سمجھا گیا۔
ہندوستانی رقص اور مصوری اور بت سازی میں اس جمالیاتی زاویۂ نگاہ کی بڑی اہمیت ہے۔

'پرانوں' اور قدیم ترین ڈراموں میں اس جمالیاتی فکر کی پہچان ہوتی ہے۔ 'پرانوں' کی ناقابلِ فراموش دوشیزہ چتر لیکھا کو یاد کیجئے جو ایک مصورہ تھی، جس نے راجہ بانا کی بیٹی اوشا کو اساطیری کہانی کے مطابق اسکی سہیلی بن گئی تھی۔ اوشا نے خواب میں خوبصورت شہزادے انی رودھا کو دیکھا اور چتر لیکھا سے کہا کہ وہ تمام دیوتاؤں کے ساتھ ان حسین نوجوانوں کی تصویریں بھی بنائے جن کی صورتیں اس نے تخیل اور جذبے سے پیدا ہوں۔ چتر لیکھا نے تمام دیوتاؤں کی تصویریں بنائیں اور ان تمام صورتوں کو لکیروں اور رنگوں میں جاگر کر دیا جنہیں اس نے اپنے احساسات میں شدت سے محسوس کیا تھا۔ شہزادی اوشا نے ان صورتوں میں ایک 'صورت' کو غور سے دیکھا اور پہچان گئی کہ وہ انی رودھا ہے۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ۔

'سکاسی' اور 'نقالی' کا یہ قدیم ہندوستانی نظریہ پرانوں، قدیم ترین ڈراموں، کالیداس سے قبل بھارت کے 'ناٹیہ شاستر' میں موجود ہے۔ مختلف تصویروں کو مرتب کر کے اس جمالیاتی وجدانی رجحان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ قدیم یونانی تصور کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ دلچسپ بھی ہوگا اور فکر انگیز بھی۔

تخلیقی آرٹ کی جمالیات کا مطالعہ کرتے ہوئے پتن جلی کے خیالات پر نظر ٹھہر جاتی ہے ـــــ شاید آپ کو علم ہو کہ پتن جلی نے اپنے طور پر اس خیال کی تائید بھی کی ہے "پرتی بھم وادت" اہم ترین جمالیاتی اصطلاح ہے۔ ارسطو کی اصطلاح "نقالی" IMITAT.... سے بہت قریب ہے۔ لیکن اس سے زیادہ یہ اس جمالیاتی وجدان کی وضاحت کرتا ہے۔ جس نے ہومر کی جمالیات کو نہایت شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس اصطلاح کو ہندوستان کے قدیم "ماہرینِ جمالیات" نے اعلیٰ اور ادنیٰ شاعری

کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ فطرت اور کائنات کے جمال و جلال نے انہیں اسی شدت سے متاثر کیا تھا کہ جس کارنامے میں انہیں حسن نہیں ملتا اسے معمولی اور سپاٹ شاعری کہتے تھے اور جس تخلیقی کارنامے میں حسن ملتا اسے 'پرتی بھم وادت' کہ کر اس کی خصوصیات پر غور کرنے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ 'نقالی' کا وہ تصور بہت کمزور ہو گیا ہے جس کا مفہوم صرف یہ تھا کہ جو کچھ دیکھو اس کی تصویر اتار دو۔ جذبہ، احساس اور تخیل کے بغیر عکاسی یا نقالی کا تصور بے جان ہو گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ 'کلا' کے لئے گیان اور بھاونا دونوں کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا گیا۔

قدیم ہندوستانی جمالیات میں 'التباس' کا جمالیاتی رجحان بھی ملتا ہے۔ التباس، حقیقت کی ایک سچائی ہے۔ یا سچائی کا ایک احساساتی پیکر ہے۔ حسن کے التباس (ILLUSION) سے لطف لینا اور باطن میں مسرت آمیز لہروں کو محسوس کرنا، فن کار اور قاری کے لئے ضروری ہے۔ ابھینو گپتا کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو تخلیقی آرٹ یا 'کلا' کا یہ رجحان بھی ملے گا۔ چند ہلکے اشاروں سے ایک زاویۂ نگاہ ملتا ہے۔ اس رجحان سے ممکن ہے یہ احساس پیدا کیا گیا ہو کہ جمالیاتی تجربہ بنیادی طور پر حقیقت یا سچائی سے قطعاً بھی گہرا رشتہ رکھتے اظہار اور ابلاغ میں اس کی صورت ایک جمالیاتی اور مسرت آمیز التباس کی ہو جاتی ہے۔ فن کار جب حقیقت کے نزدیک آتا ہے تو وہ اسی جمالیاتی التباس سے حقیقت کو اٹھا لیتا ہے۔ پتھروں میں جو کمسانی صورتیں نظر آتی ہیں وہ اسی جمالیاتی التباس کی وجہ سے نظر آتی ہیں۔ اور فن کار اپنے جمالیاتی التباس کے تجربے کو رنگ، آواز اور دوسرے متحرک پیکروں میں پیش کر کے قاری کو وہی لذت اور مسرت عطا کرتا ہے، جو اسے خود ملا ہے۔ کالیداس کے آرٹ میں دوسری بہت سی روشنیوں کے ساتھ 'فن' کی یہ روشنی بھی موجود ہے۔

ہندوستانی جمالیات میں فطرت اور کائنات اور دیوتاؤں کے جلال و جمال کے موضوعات بہت اہم ہیں۔ برہما، شنکر، یا وشنو کی تخلیقات کے حسن سے انگنت موضوعات ابھرے ہیں۔ ہندوستانی

جمالیات کا یہ پہلو ایک مستقل عنوان ہے ۔ خالق ——— اور اس کی
تخلیق کا حسن ۔ ایک مستقل موضوع ہیں ۔ رگ وید اور اپنشدوں میں
جمالیات کے اس پہلو کی تصویریں ملتی ہیں ۔ دوسرا پہلو وہ ہے جس
میں قدیم ہندوستانی علمائے جمالیات اور قدیم ہندوستانی ادبیات
سے جلال و جمال سے متعلق نظریات، خیالات اور تصورات ملتے
ہیں ۔ میں نے دو جمالیاتی تصورات کے جو چند اشارے آپ کے
سامنے رکھے ہیں ۔ ان سے قدیم ہندوستانی 'ذہن' کو کسی حد تک
سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔ جلال و جمال کے التباس کا تصور کو 'نقالی'
کے تصور میں اضافہ سمجھنا چاہیئے ۔ ان دونوں تصورات کے پیش نظر
حسن مطلق (برہما ۔ برہمن اور درونا) کی بے پناہ عظمت کا بھی
احساس ہوتا ہے اور روحانی، مادی اور دیوی کائناتی زندگی
کے حسن سے شدید عقیدت اور محبت کا بھی علم ہوتا ہے ۔

تیسرا اہم بنیادی جمالیاتی رجحان ——— جمالیاتی عناصر کو
ایک دوسرے سے منسلک کرنے اور انہیں ایک 'وحدت' کی صورت
دینے کا رجحان ہے ۔ جس میں تخیل اور مادی حسن کے گہرے باطنی رشتے
کے احساس اور ادراک کو بہت دخل ہے ۔ قدیم ہندوستانی ڈراموں
کے مرکزی کرداروں اور خصوصاً 'ہیرو' کے کردار کی تشکیل میں یہ
رجحان ملتا ہے ۔ بہت سی خوبصورت باتوں کو ایک جگہ جمع کر دینا
یا بہت سے حسین عناصر کو ایک وحدت بنانے کی کوشش ۔ انسان
کے کردار کا حسن اور دیوتاؤں اور دھرتی کے خوبصورت عناصر سے
اس کا رشتہ ——— اس موضوع کو ڈراموں میں پیش کیا گیا ہے اور
تخیل اور مادی حسن کے گہرے باطنی رشتے کا ایک جمالیاتی رجحان
ابھر کر سامنے آگیا ہے ۔ تخیل انسان یا ہیرو کے کردار کے حسن کو ایک
نیا پیکر عطا کرتا ہے ۔ اس کردار کے احساس اور جذبہ کو خود اس
کردار کے تخیل اور خیال سے ابھارتا ہے ۔ دیوتاؤں کو مادی پیکروں
میں پیش کرتا ہے ۔ ایسی جمالیاتی پیکر تراشی کی بہت سی مثالیں
موجود ہیں ۔ ہر قدیم ڈرامے کا 'ہیرو' اسی 'وحدت' کی علامت ہے
یا 'اکائی' کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے ۔ جس کے احساس کے
ساتھ جانے کتنے خوبصورت، حسین، اور پُر جلال عناصر فن کار

کے سامنے آجاتے ہیں، ظاہر ہے وہ تمام عناصر کو ایک صورت
دے سکتا، وہ انتخاب کرتا ہے ۔ اپنے جمالیاتی وژن اور
لہروں سے ——— آرچ ٹائپ کے دباؤ سے ۔ انتخاب میں
کا تنقیدی شعور کام کرتا رہتا ہے ۔ انتخاب کے بعد ترتیب
کا سوال ابھرتا ہے ۔ تخیل اور جذبے سے ان کی ترتیب ہوتی
لیکن ان عناصر کی پہلی صورتیں برقرار نہیں رہتیں ۔ تخیل اور
حسن کے باطنی رشتے سے پُراسرار داخلی عمل شروع ہوجاتا
اور ان کی صورتیں "آئیڈیل" ہوجاتی ہیں ۔ جمالیاتی تصور
اس رجحان نے قدیم ہندوستانی جمالیات میں اسلوب، الفاظ،
اظہار اور ابلاغ کی زیادہ اہمیت دی ہے ۔ یہ محسوس ہوتا
کہ عناصر کی وحدت کے حسن کو الفاظ ہی سے فن کار ابھارتا
الفاظ کی جادوگری سے عناصر حسن مرتب ہوکر ایک 'وحدت' بن
جاتے ہیں ۔

'فطرت پسندی' اور 'تصوریت' کے درمیان بھی ایک جمالیاتی
رجحان پیدا ہوا ہے ۔ جس سے دونوں میں ایک گہرا رشتہ قائم کرنے
کی کوشش کی گئی ہے ۔ ہندوستانی جمالیات، میں اس رجحان کی
بھی اہمیت ہے، جس نے صدیوں میں جانے کتنے تصورات کو
جنم دیا ہے ۔

اس رجحان کو کوئی ایک نام دینا مشکل ہے ۔ یہ ہندوستانی
جمالیات کا فلسفیانہ رجحان ہے ۔ اس کے کئی رخ اور پہلو ہیں ۔
ہندوستانی جمالیاتی تفکر نے دو اہم پرانے نظریوں "فطرت پسندی"
اور تصوریت کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کرکے دیکھا کہ جمالیات
کو اپنے طور پر سمجھنے کی پہلی فلسفیانہ کوشش کی ہے ۔ عقل، تخیل اور
فکر سے فطرت کے حسن کی بھی تعبیر کی جائے اور تمام ذہنی قوتوں
کام لیا جائے ۔ اس کے لئے 'گیان' کی بھی ضرورت ہے ۔ یعنی علم کی
روشنی بھی ہو، حسن مطلق اور حسن فطرت کی پہچان، سچے گیان
ہی سے ہوسکتی ہے ۔ سوچ، گہری سوچ ——— ایسی سوچ جو تمام روشن
اور نوری لکیروں سے ٹکرائے، متاثر ہو ۔ اور اس سے تمام روشن لکیریں
آکر مل جائیں ۔ موضوع کو اچھی طرح سمجھنا، اس پر سوچنا ۔ اسے ذہن

دیکھوں سے اندر لے جانا اور تمام ذہنی قوتوں سے اسے باہر نکالنا
پُراسرار تخلیقی عمل یہی ہے۔ موضوع پر سوچتے ہوئے بھی ذہنی قوتوں
عقل، تخیل اور فکر کی ضرورت ہے اور اس کے اظہار میں بھی ان کی
ضرورت ہے۔ یہی سچا گیان ہے ــــ لیکن ــ صرف گیان
سے تخلیق نہیں ہوگی، حسن کی سچائی کی پہچان نہیں ہوگی۔ اس کے
لئے 'تپسیا' کی ضرورت ہے، محنت، ریاضت ــ سوچ اور
گہری سوچ ــ 'کلا' فطرت کی نئی دریافت ہے، حسن کا نیا ادراک
ہے۔ دراصل یہی اس رجحان کی معنویت ہے۔ حسن کی نئی
دریافت، زندگی سے گریز نہیں ہے۔ بلکہ 'حقیقت' سے
بے پناہ محبت ہے۔ حسن کی عبادت ہے۔ حسن کا ادراک گیان
اور تپسیا ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس ادراک کے ساتھ ہی الفاظ
کی تخلیق ہوتی ہے۔ حسن کی نئی دریافت، الفاظ کی بھی دریافت
ہے۔ تخلیقی آرٹ میں دو جمالیاتی لکیریں ہوتی ہیں۔ گیان اور تپسیا
سے پایا ہوا 'ایبچ' ــــ اور اس کی آواز ــــ! "ایبچ
کی آواز" سے جمالیاتی قدر پیدا ہوتی ہے۔ 'کنٹاکا' نے
اسی خیال کی حمایت کی ہے۔ ہندوستانی جمالیات کی تاریخ
میں اس فلسفیانہ خیال کی پہچان ادبیات میں زیادہ ہوگی ــ
سنسکرت، تامل، بنگالی زبانوں کے قدیم ادب میں اس خیال
کی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ کہیں موضوع کی اہمیت زیادہ
ہوگئی ہے اور کہیں اسلوب کی، لیکن یہ بنیادی جمالیاتی رجحان
کسی نہ کسی صورت میں موجود ضرور ہے۔

پانچواں اہم جمالیاتی رجحان علامتی جمالیاتی رجحان ہے
قدیم ہندوستانی فن کاروں نے جب یہ محسوس کیا کہ تخلیقی آرٹ
میں "علامیت" موجود ہے تو انہوں نے اپنے طور پر 'کلا' اور
آرٹ کے حسن کے لئے اسے ایک بنیادی جمالیاتی قدر قرار دیا
ان کی حسیاتی پیشکش اور انسان کے جذبہ اور احساس کے
حسیاتی اظہار میں علامتیں موجود ہوتی ہیں۔ نفسیاتی فکر اسی منزل
زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ خیال بھی تھا کہ غیر ارضی عناصر کو ذہن
حرکت، تراش خراش، رنگ، نقوش ...

تو ان کی صورتیں علامتی ہو جاتی ہیں۔ 'خیال' کی علامتی صورت کا
احساس ملتا ہے۔ اس رجحان نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ یہ
علامتی صورت ہی حسن ہے۔ 'سچائی' حسن کی ایسی صورت میں
نمایاں ہوتی ہے۔ 'تخیل' اور حسیاتی کیفیتوں کی اہمیت زیادہ
ہو جاتی ہے۔ 'شیو' کی تیسری آنکھ، جلالت کی علامت تھی۔
ممکن ہے اسی حسیاتی تصور سے علامت پسندی کا جمالیاتی رجحان
ابھرا ہو ــ 'دوزن' نے شیو کی تیسری آنکھ کو دیکھا اور شدت
سے محسوس کیا تھا۔ اسی طرح گوتم بدھ کے مقدس پہیئے (WHEEL)
کی جمالیاتی علامیت کا تصور تاریخ کے مختلف عہد میں ملتا ہے
جلال و جمال کی ان دونوں علامتوں نے ہندوستانی جمالیات
میں سوچ و فکر کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ اعلیٰ تخلیقی آرٹ
کے لئے زبردست روحانی قوتوں اور داخلی آزادی کو ضروری
قرار دیا گیا۔ کشمکش اور خصوصاً فطرت اور تقدیر کے تصادم
میں جو جمالیاتی تجربے سامنے آئے ہیں۔ ان میں یہ رجحان
موجود ہے۔ آفاقی جذبوں کے اظہار اور حسن مطلق کے جلال
و جمال کے پہلوؤں میں یہ رجحان شدت سے محسوس ہوتا ہے
بھرت اور ان کے شاگردوں نے ڈراما، شاعری، موسیقی اور
مصوری کی اعلیٰ قدروں پر سوچتے ہوئے اسی جمالیاتی رجحان
کو پیش کیا ہے "رس" آفاقی خودی، آفاقی جذبہ اور
اظہار بیان کے مختلف پہلوؤں پر ان علمائے جمالیات کی بحثوں
کا تجزیہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے مختلف پہلوؤں کو
اسی رجحان سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک "الفاظ"
کی اہمیت اسی وجہ سے زیادہ ہے۔ ذہنی اور روحانی اور
آفاقی اور غیر ارضی حسیاتی پیکروں کے اظہار کے لئے انہوں
نے الفاظ کی معنویت اور ان کے حسن کو اپنے طور پر سمجھانے کی
کوشش کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اعلیٰ تجربوں کے اظہار سے
الفاظ کے روایتی اور جامد معانی بدل جاتے ہیں۔ ان میں نئی
معنویت آ جاتی ہیں۔ ان کا آہنگ بدل جاتا ہے۔ ان میں بڑی

"لاکسنہ" جیسی اصطلاحوں سے اس جمالیاتی رجحان کی وضاحت
کی گئی ہے۔ "آنند وردھن" نے "دیانہ" کی اصطلاح سے تخلیقی
آرٹ کی علامت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے جمالیاتی
اشاروں یا علامتوں کی تقسیم اس طرح کی تھی۔

(۱) موضوع کی علامیت (وستو)
(۲) الفاظ کی علامیت (النکار)
اور (۳) جذبے کی علامیت (رسادی)

سنسکرت، تامل، تلگو، بنگالی اور دوسری زبانوں کے
قدیم آرٹ کا مطالعہ کیا جائے، تو محسوس ہوگا کہ شعرا نے خصوصاً
"الفاظ" کی علامتی اہمیت اور اظہار بیان کے جمالیاتی اشاروں
کو زیادہ اہم سمجھا ہے۔ جمالیاتی اظہار سے جمالیاتی تجربہ کا پیکر
ابھرتا ہے، اگر لفظ اور جذبے میں ہم آہنگی نہ ہو تو جمالیاتی تجربہ
شاعر کے ذہن میں کچھ اور ہوگا اور اظہار میں کچھ اور۔ آنند وردھن
کی تقسیم بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ تینوں 'کی علامیت' کا جمالیاتی
رجحان ہندوستانی جمالیات میں ایک مستقل عنوان بن گیا ہے۔

اس رجحان کے ساتھ بنیادی جذبوں کے باطنی ادراک
کی قدر و قیمت کا احساس پختہ ہوتا ہے۔ تحت الشعور اور لاشعور
اور نفسیاتی کیفیتوں کی طرف قدیم ہندوستان کے سوچنے والوں
کا یہ نہایت ہی معنی خیز اشارہ تھا۔ یہیں نے اسی رجحان کو
آزاد علامتی فکر اور علامتوں کی باطنی اور داخلی معنویت اور
لفظ اور روح کی آواز کے رشتوں کا ادراک کہا ہے۔ کشمیری
"شیوازم" نے اس رجحان کو اور پختہ کر دیا اور تخلیقی آرٹ میں یہ
ایک بنیادی تصور بن گیا۔

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی جمالیات میں صرف
اسلوب اور اظہار کے حسن کا خیال ہے۔ وہ غلط سوچتے ہیں۔
موضوع، اسلوب اور جذبہ اور تخیل کی وحدت کا احساس ہر دور
میں موجود ہے۔ ہندوستانی جمالیات کے مطالعے کے تین ذرائع
ہیں۔ (۱) تخلیقی آرٹ (۲) فنکاروں کے خیالات،
(۳) علمائے جمالیات (قواعد نویس، ڈرامہ، شاعری،
موسیقی اور سنگ تراشی پر سوچنے والے ان میں شامل ہیں)
تصورات۔ کسی بھی عہد میں موضوع اور اسلوب کا مطالعہ
الگ نہیں ہوا ہے۔ اسلوب یا الفاظ کی جمالیات کو سمجھنے کی
دراصل 'کلا' کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ رجحانات مختلف
اسلوب کی جمالیات پر سوچنے کا مقصد یہی ہے کہ آرٹ کی
کو سمجھا جائے۔ تخلیقی آرٹ کے مطالعے میں یہ ممکن بھی نہیں ہے۔
ایک پہلو کا مطالعہ اس طرح ہو کہ دوسرے پہلوؤں سے کوئی رشتہ
ہی نہ رہے۔

'رس' ہندوستانی جمالیات کی ایک قدیم معنی خیز
ہے۔ اس اصطلاح سے تخیل میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس
ایمائیت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ 'سنگھار رس' (رومانی)
'کرون رس' (ٹریجڈی) 'رودر رس' (پرجلال تجربے)
'ہاسیہ رس' (طربیہ) 'ویر رس' (ایپک) اور دوسری
اصطلاحوں کو اسی لفظ نے معنویت دی ہے۔

'رس' کے لغوی معانی ہیں: مٹھاس، خوشبو، لذت
ہندوستانی جمالیات میں اسے منفرد احساس، جذباتی ارتکاز اور
گیان کے لئے عموماً استعمال کیا گیا ہے۔ قدیم ڈرامہ اور شاعری
کے لئے 'رس' ضروری قرار دیا گیا ہے۔ قدرت یا فطرت کے حسن
میں یہ جمالیاتی عنصر یا خصوصیت نہیں ہے۔ ہندوستان کے قدیم
سوچنے والوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی
ہے کہ انسان کے ذہن ہی سے خارج اور باطن کا ایک رشتہ قائم
ہوتا ہے اور اسی رشتے میں "رس" ہوتا ہے۔ ذہن انسانی
اور باطنی قوتوں کی سنجیدگی سے سوچنے کے بعد 'رس' کا جمالیاتی تصور
پیدا ہوا ہے۔ اس رشتہ کی مٹھاس، خوشبو اور لذت سے تخلیقی
آرٹ میں منفرد احساس کا اظہار ہوتا ہے اور جذباتی ارتکاز کی
صورتیں نظر آتی ہیں۔ فنکار کے سامنے ایک جذباتی فضا ہوتی
ہے، وہ اس فضا سے رشتہ قائم کرتا ہے اور بہت سی تبدیلیاں
آجاتی ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل (بھاؤ) ذہن سے تعلق رکھتا ہے۔
جمالیاتی عناصر سے ذہن کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے، جو جمالیاتی تجربہ

...ہوتا ہے۔ لیکن ذہن ہی مرکز ہوتا ہے۔ عناصرِ فطرت یا جذباتی فضا کی کوئی حقیقت مرکز نہیں بنتی۔ وہ بھی اری بھاؤ سے تخلیقی پیکر یا جمالیاتی تجربہ سامنے آجاتا ہے۔ "رس" جمال ہی کا ایک ... ہے۔ ممکن ہے "شیو" کے آرچ "ٹائپسے" "رس" کا یہ تصور ... ہو۔ کائناتی حرکت، روح کی آزادی اور ذہن یا دل کی مرکزیت (شیو کے رقص کا مرکز) کے حسیاتی اور داخلی احساسات اس اصطلاح کی تہہ دار معنویت سے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔

"ہندوستانی جمالیات" کی پانچ سو سال کی تاریخ میں اس اصطلاح کی معنویت پھیلی ہوئی ہے۔ "ناٹیہ شاستر" (بھرت) میں ڈرامہ کی قدروں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بھرت نے "رس" کی معنویت کو اپنے طور پر سمجھا ہے "برہما" "وشنو" اور "مہیشور" کے پیکروں سے جذباتی رشتے سے ڈراما کی تخلیق ہوئی اور اس کے ساتھ ہی "رس" کی جمالیاتی قدر کا احساس ہوا۔ "ناٹیہ شاستر" نے آنکھ اور کان کے حسیاتی تجربوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ آہستہ آہستہ ہندوستانی جمالیات میں چھونے، چکھنے، اور سونگھنے کے احساسات کا اندازہ ہوا۔ "عورت" کے آرچ ٹائپ نے "حواس خمسہ" کو بیدار کرنے اور "رس" کی معنویت کو تہہ دار بنانے میں یقیناً بڑی مدد دی ہے۔ بھرت نے بھی اسٹیج پر "عورت" کو جذبات کا مکمل پیکر بنانے کا مشورہ دیا ہے۔ "ناٹیہ شاستر" میں "رس" کوئی فلسفیانہ اصطلاح نہیں ہے۔ بلکہ جمالیاتی تجربے کے باطنی حسن کا علامیہ ہے۔ جس سے خارج اور باطن کی ذہنی، جذباتی تخیلی اور احساساتی وحدت کا خیال ابھرتا ہے۔

قدیم ہندوستانی جمالیات میں

"وستو" (مواد۔ موضوع)

"النکار" (ڈکشن)

اور "رس" کی علامتیں جمالیاتی رجحانات کو سمجھنے میں ... مدد کرتی ہیں۔ "رس" ... [illegible]

کو سمجھایا اور فن کار، کائنات اور قاری کے رشتوں میں ایک وحدت پیدا کی۔

"رس" کی جمالیاتی اصطلاح سے قاری (سامعین بھی) کی ذہنی کیفیت اور تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اہم بات ہے کہ تخلیقی اظہار کے بعد ڈرامہ دیکھنے والوں اور نغمہ سننے والوں کا ذہن کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں تین باتوں کی طرف اشارہ ملتا ہے:

- "آرٹ کی فضا"
- "تاثرات"
- "سامعین کا ذہن اور ان کے جذبات"

قاری یا سامعین کا ذہن آرٹ کی مخصوص فضا سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ فضا مختلف ہوتی ہے۔ جذبات میں کچھ رنگوں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ذہن، خوشبو، مٹھاس اور لذت فن کار کے منفرد احساس، جذباتی ارتکاز اور گیان کا مرکز بن جاتا ہے۔ پوری جذباتی فضا (دی بھاؤ اور انو بھاؤ) سے ذہن ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

شیخ حبیب اللہ

علامہ اقبالؒ

عطیہ فیضی صاحبہ مرحومہ علامہ اقبالؒ کا ایک واقعہ بیان کرتی ہیں، جو ۲۳ اگست ۱۹۰۷ء کو جرمنی میں وقوع پذیر ہوا جبکہ علامہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے ریسرچ میں مصروف تھے۔

علامہ کو ایک تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ مگر جب ان کے زفقاء مسکنِ اقبال پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں علامہ کے سامنے ایک کتاب کھلی پڑی ہے۔ آنکھیں کتاب پر مرکوز ہیں، نہ پلک جھپکتی ہے اور نہ ہی آپ گرد و پیش سے باخبر ہیں۔ بالکل ساکت و صامت دنیا و مافیہا سے غافل، یک قلم یک بخت ہے۔ پروفیسر سینے سال اور فرالائن ویگے ناست تو علامہ کی اس ہیئت کذائی پر بالکل گھبرا گئیں اور دوسرے مصاحبین کو بھی بڑی تشویش ہوئی کہ کیا علامہ کو رات سردی لگ گئی اور وہ اکڑ گئے ہیں۔

اسی سے علامہ کے استغراق و مکاشفہ کا اندازہ لگا لیجئے کہ وہ کس پایہ کے بزرگ تھے اور ان کے مطالعہ کی نوعیت کیا تھی۔ ان پر غور و فکر کی کیا کیا کیفیات گذرتی تھیں اور جذب و سرور کے کیسے کیسے ادوار طاری ہوتے تھے۔ نظر و مطالعہ تدبر و تفکر میں آپ کس قدر کھوئے رہتے تھے اور ان کا علمی ذوق کتنا عمیق و بسیط تھا، خود ان کا قول ہے۔ ؎

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومیؔ، کبھی پیچ و تاب رازیؔ

علم چو شمع باید گداخت کی کیفیت دیکھئے:۔

کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

آج کل انسان یورپ جاتا ہے اور انگریزی کا پڑھنے یا افسر ہو جاتا ہے، تو بس ہنس اپنی چال بھول کر کوے کی چال چلتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنے خاندان کو بھی سراپا یورپی بنا ڈالتا۔ اپنی روایات کو ترک کر دینے میں وہ یک گونہ فخر محسوس کرتا ہے۔ ہر چند کہ ان انگریزوں کی ترقی کا راز کچھ اور ہی ہے۔ ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست
نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

بے شمار اہلِ علم آپ کو ایسے ملیں گے جن پر دہریت چھا جاتی ہے۔ مگر علامہ پر علم کی فراوانی کا جادو نہیں چلتا اور پریشانی میں پیچ اٹھتے ہیں۔ ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا! مجھے صاحبِ جنوں کر

ہم لوگوں کو اس کا قطعی علم نہیں کہ علامہ کس پایہ کے
تھے اور ان کا علم کتنا ہمہ گیر تھا۔ مولانا بلگرامی نے ٹھیک
ہی کہا ہے :۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ہر چند علامہ علوم مغربی کے عالم تھے اور ان کو علوم فلسفہ عالیہ پر
کامل عبور تھا۔ پھر بھی کوئی بدیسی فیلسوف انہیں متاثر نہیں کر
سکا۔ بلکہ مولانا روم کے فلسفہ نے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

عطیہ لکھتی ہیں کہ جب اقبال نے صرف تین ماہ میں
جرمن زبان پر ملکہ حاصل کر لیا، تو وہاں کے اہلِ نظر انگشت بدنداں
رہ گئے اور دانش ورانِ جرمن ان کے گرویدہ ہی نہیں بلکہ
پرستار بھی بن گئے۔ علامہ کے صوفیانہ خیالات نے بھی انہیں کافی
متاثر کیا۔ عطیہ کہتی ہیں کہ اقبال نے خود انہیں ایک واقعہ بیان
کیا ہے۔ جس سے ان کے صوفیانہ ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ اس
واقعے اور علامہ کے اپنے بزرگوار کی صحبت نے ان پر صوفیانہ
رنگ چڑھا دیا۔ علامہ کے والد بزرگوار بھی خود کسی بزرگ کی
صحبت میں رہ کر فیضیاب ہوئے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے
جب علامہ کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ عطیہ صاحبہ لکھتی ہیں :۔

ایک دفعہ رات کچھ گڑبڑ سی ہوئی۔ اقبال کی نیند ٹوٹ
گئی دیکھا کہ والدہ محترمہ نیچے اتر رہی ہیں۔ علامہ بھی پیچھے ہو لئے
دیکھا کہ والدہ صاحبہ نیم وا دروازے سے باہر کی طرف دیکھ رہی ہیں۔
دیکھتی ہیں کہ علامہ کے والد محترم کھلی فضا میں استغراق کے عالم
میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے چاروں طرف روشنی کا دائرہ پھیلا
ہوا ہے۔ علامہ والد صاحب کے پاس جانے لگے۔ مگر ان کی والدہ صاحبہ
نے روک لیا اور سمجھا بجھا کر استراحت کے لئے روانہ کر دیا۔ صبح بیدار
ہوتے ہی علامہ والد صاحب کے پاس پہنچے۔ تاکہ رات کے واقعہ کے
بارے میں سوالات کریں۔ دیکھا کہ والدہ صاحبہ پہلے ہی سے موجود

ہیں۔ والد صاحب ان سے گویا ہیں :۔

ایک کارواں کابل سے لاہور آ رہا ہے۔ مگر راہ میں کسی
مشکل میں پھنس گیا ہے اور شہر سے پچیس میل دوری پر رکا ہوا
ہے۔ بدیں سبب کہ قافلہ ایک مریض کو علاج کے لئے شہر لا رہا ہے
اور مریض کی حالت نازک ہے۔ مجھے فوراً روانہ ہو جانا چاہیے
اقبال بھی والد کے ہمراہ ہو لئے۔ خوش قسمتی سے تانگہ خلاف توقع
بہت جلد پہنچ گیا۔ کارواں سے عیاں تھا کہ یہ قافلہ کسی رئیس
کا ہے۔ ان کے والد صاحب نے میر قافلہ سے کہا کہ مجھے مریض
کے پاس لے چلو۔ سردار کو حیرت تو ضرور ہوئی کہ اس نو وارد کو
مریض کے بارے میں کیونکر علم ہوا۔ بہرکیف سردار نے بغیر کسی سوال
کے انہیں مریض تک پہنچا دیا۔ مریض کی حالت انتہائی شکستہ تھی
اور وہ قریب المرگ معلوم ہوتا تھا۔ والد صاحب نے کچھ سفوف
کھانے کے لئے دیا اور تھوڑا سا مریض کے اعضاء پر بھی مل دیا اور
کہا انشاء اللہ مریض کو بہت جلد شفا حاصل ہو جائے گی۔ کسی کو
اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ خود اقبال بھی مشکوک تھے۔ مگر شانِ
خداوندی دیکھئے۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر مریض کی حالت سدھر
گئی۔ واقعی اقبالؒ نے سچ ہی کہا ہے : ؎

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر میں جوانوں کو رام کرتے ہیں

عطیہ صاحبہ علامہ سے اپنی ملاقات کے بارے میں لکھتی ہیں،

مس بیک لندن میں ہندی طلبہ کی مادرانہ شفقت کے
ساتھ دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو مجھے
دعوت نامہ ارسال کیا کہ ایک ذہین شخص بنام اقبال خود تم سے
ملنے آ رہے ہیں۔ میں اقبال سے یکلخت ناواقف تھی۔ اس لئے
مجھے کچھ حیرت سی ہوئی۔ مگر جب خوانِ نعمت پر اقبال سے ملاقات
ہوئی، تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک عالم متبحر عربی فارسی، سنسکرت میں
سرگرم تکلم ہے۔ علم و دانش کی روشنی سے محفل کو منور کر رہا ہے
اپنی عالمانہ گفتگو سے دلوں کو موہ رہا ہے۔ اپنی بذلہ سنجی سے فضا کو
گلزار بنا رہا ہے۔ اقبال جب کبھی موڈ میں ہوتے تو محفل کو گلزار

ہزار رنگ بنا دیتے۔ طنز و مزاح کی نور پاشی ہونے لگتی ؎
"میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا"
علامہ نے خود بھی کہا ہے ؎

نہ کردیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا جذبِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے

عطیہ صاحبہ لکھتی ہیں کہ ایک روز حافظ شیرازی کا ذکر چھڑ گیا اور میں نے شعر خوانی شروع کر دی (کہیں یہ اشعار تو نہیں پڑھے گئے؟) ؎

حافظا، گر معنی داری بیار
ورنہ دعویٰ نیست غیر از قیل و قال

ریا حلال شمارند و جامِ بادہ حرام
زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

فقیہہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد
کہ مے حرام ولے بہ زمالِ اوقاف است

نہ قاضیم نہ مدرس، نہ محتسب نہ فقیہہ
مرا چہ کار کہ منع شراب خوارہ کنم

عطیہ صاحبہ کہتی ہیں کہ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ خود اقبال بھی حافظ کے شیدائی نکلے۔ علامہ نے کہا "میں جب حافظ کے موڈ میں ہوتا ہوں، تو حافظ کی روح میرے قلب کی گہرائیوں میں سما جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ افسوس ہندوستان تا ایں دم اور ایک شاعر سے ناآشنا ہے اور وہ ہے بابا فغانی اور مجھے ہدایت کی کہ میں ضرور بالضرور بابا فغانی کے کلام کا مطالعہ کروں۔ یہ تھی اقبالؒ سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے طعام پر مدعو کیا۔ دعوت بڑی پُر تکلف تھی اب اقبال مجھ سے بے تکلف ہو چکے تھے۔ کہا بھئی میں ایک قالب میں دو فرد ہوں۔ میرا ظاہر دنیاوی ہے۔ مگر باطن میں فلسفی، صوفی منش اور مفکر ہوں۔ ۱۰ اپریل ۱۹۰۷ء کو میں نے بھی انہیں مدعو کیا۔ اس محبت میں مشہور فلسفی طالبات مس لوسٹر اور مس لیوی بھی شریک تھیں اور موسیقار میر شیر نرائتو اور مسٹر ڈل بھی تھے۔ پارٹی بڑی شاندار رہی۔ اس موقع پر اقبال نے ایک دلپذیر نظم بھی کہی۔ موسیقار نے

اس کی پرکیف دھن بھی تیار کر لی اور محفل کو اپنی تازہ بنا دیا۔ میں نے چاہا کہ اس نظم کو لکھ لوں مگر اقبال نظم تو بس اسی موقع کے لئے تھی اور اسے یہیں ختم چاہیئے۔ ۲۲ اپریل ۱۹۰۷ء کو ہم لوگ مع عبد الغ کیمبرج کے لئے روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر ان دونوں کی عالمانہ رہی کہ میں استلذاذِ سمع ہی میں کھو گئی۔ یکم جون کو پکنک منا رہے تھے۔ اقبال، ڈاکٹر آرنلڈ اور دوسر بھی موجود تھے۔ گفتگو موت و حیات پر ہو رہی تھی۔ ڈا اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے۔ آخر میں اقبال سے پوچھا گیا۔ نے کہا "زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کی ابت ۱۹۰۷ء کو میں نے ایک ضیافت دی۔ اس انجمن آرائی م اور انگریز اہل علم شریک تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے گانے اور لارڈ سنہا کی صاحبزادیاں کولا اور رمولا نے ساز بجا اقبال نے حاضرینِ محفل کے ایک ایک فرد سے متعلق ایسے فی ا چست اور برجستہ اشعار کہے کہ ہنسی سے ہمارا بُرا حال ہو گیا۔ کو مس جولی نے دعوت دی۔ اقبال نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لئے مقالہ لکھا تھا۔ اسے ہمیں سنایا۔ معلومات کا بحرِ ذخار تھا۔ جولائی میں انہوں نے اس تاریخِ عالم کی کاپی مجھے مرحمت فر اسی مقالہ پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔ اس مقالہ کے علا انہوں نے مجھے پولیٹکل اکانامی کا مسودہ بھی عنایت فرمایا۔ ان دونوں کتابوں سے عوام نابلد ہیں۔ ۲۳ جولائی ۱۹۰۷ء کو ایک مجلس مذاکرات منعقد کی گئی۔ بیشمار ہندی ہال میں حاضر تھے۔ ایک طالب علم پر میشر دیال نے رسالہ مخزن سے اقبال کی قومی نظمیں سنائیں یہ نظمیں شمالی ہند میں زبان زدِ خاص و عام تھیں اور ان نظموں کی صدا گلی کوچوں میں گونجتی تھی اور لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کے دد جذباتِ بے اختیار کا تلاطم برپا کرتی تھیں کہ ایسا شاذ و نادر دیکھنے میں آیا ہوگا۔ جب لندن میں یہ نظمیں پڑھی گئیں تو سامعین پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور سبھوں نے نظم خوانی شروع کر دی در پُر ترنم غلغلہ بلند ہونے لگا۔ اقبال نے مجھے ایک خط جرمنی زبان میں

تحریر کیا تھا۔ یہ ادبی شہ پارہ تھا اور جرمنی زبان پر اقبال کی قدرت
کاملہ کا ثبوت تھا۔ ڈاکٹر آرنلڈ تو اس خط پر لٹو ہوگئے اور التجا
کی کہ یہ نوشتہ انہیں عنایت کر دیا جائے۔ آرنلڈ نے کہا۔ ہرچند
اقبال میرے شاگرد ہیں۔ مگر میں خود ان کی نگارشات سے کسب فیض
کرتا ہوں۔ یہ خط جرمن ادب عالیہ کی حیثیت سے میرے لئے
سرمایۂ عظیم رہے گا۔

عطیہ لکھتی ہیں کہ اقبال کی ذہانت کا اندازہ نہیں لگایا جا
سکتا۔ ان کی یادداشت اتنی قوی تھی کہ ایک دفعہ جو کچھ پڑھ لیتے
وہ ہمیشہ کے لئے ذہن میں نقش ہو جاتا۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں۔
"عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر زبان سے
نکلیں، اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں، تو سب کے سب دوسرے وقت
یا دوسرے دن اسی ترتیب سے ذہن میں محفوظ ہوتے ہیں۔

الغرض اقبال کیسے بزرگ تھے۔ اس بات کی ابھی تک کوئی
تحقیق ہی نہیں ہوئی ہے۔ اور ہم انہیں شاعر ہی تصور کئے جاتے
ہیں۔ خود اقبال کو اس کا قلق تھا۔ ؎

او نوائے دلبری خواہد ز من
سوز و ساز شاعری خواہد ز من
کم نظر بے تابی جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی فرماتے ہیں "علامہ اقبال
ایک موقعہ پر انجمن اسلام کے کسی جلسہ میں تقریر فرما رہے تھے۔
ایک انگریز عالم بھی موجود تھے۔ انہوں نے اٹھ کر کہا "سر اقبال
جلسہ کے بعد مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اس لئے التجا ہے کہ چلے
نہ جایئے گا۔ جب جلسہ برخاست ہوا تو اس انگریز نے دریافت
کیا "کیا آپ جیسے مفکر عالم و فاضل کو بھی وحی پر اعتقاد ہے"
علامہ نے جواب دیا۔ ہاں ہے! مجھ پر خود اشعار ڈھلے ڈھلائے
اترتے ہیں اور میں نے بارہا کوشش کی کہ ان اشعار کے الفاظ
رد و بدل کر دوں مگر دیکھتا ہوں کہ شعر بے معنی ہو جاتے ہیں پس وحی
کا آقائے نامدار پر عقیدہ ممکن نہیں تصور کیا جا سکتا۔ علامہ نے

ایک اور جگہ فرمایا ہے: ؎

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

علامہ کو جوانوں سے کیا کیا امیدیں نہ تھیں۔ خدا سے
دعا کیا کرتے تھے: ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

خود اقبال کو دکھ تھا، ؎

سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

قیصر سرمست

اقبال متین میری نظر میں

تقسیم ہند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو آگے بڑھایا ہے ان کی پہلی صف میں اقبال متین کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اسی بات کو اگر پیش نظر رکھ کر میرے مضمون پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی اس لئے کہ میں نے اس مضمون میں اقبال متین کو بحیثیت افسانہ نگار کے نہیں بلکہ ایک متوسط گھرانے کے ایک متوسط انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

جس طرح ماہرین حیوانات نے جانوروں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے اسی طرح میں نے بھی اپنے خاندان کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے ایک ایسے ہیں جو مجھے خواہ مخواہ فرشتہ سمجھ کر بیجا میرا لحاظ کرتے ہیں اور ایک ایسے ہیں جو مجھے گالی دینا اور مجھ پر جھوٹے اتہام لگا کر بدنام کرنا ثواب دارین سمجھتے ہیں۔ شیطان پر لاحول بھیجنے کے بجائے مجھ پر لعنت بھیجنا جن کا دین و ایمان ہے۔ کچھ اسی قسم کا زبردست المیہ اقبال متین کو بھی زندگی میں پیش آ رہا ہے۔ ان کے دوستوں سے لے کر وہ رشتہ دار جن کی زندگیاں اقبال متین کی ذات سے وابستہ ہیں انہیں غلط سمجھتے رہے۔ ان کے کعبۂ جیسے جسم کے اندر پڑے ہوئے نیم مردہ دل کو ٹٹولنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ انسان جب کسی کے متعلق یہ رائے قائم کرلے کہ وہ گندم نما جو فروش ہے۔ تو پھر کسی قیمت پر اپنی رائے نہیں بدل سکتا چاہے خدا بھی آسمان کی بلندیوں سے اتر کر اس کی پاکیزگی نفس کا یقین دلائے۔ یہی کچھ اقبال متین کے ساتھ بھی ہوا۔ حالانکہ ان کے جسمانی گنبد میں دفن ان کا دل بعض وقت درد کی شدت سے تڑپ اٹھتا جب درد حد سے سوا ہو جاتا ہے تو ان کی آنکھوں کے کونے بھیگ جاتے ہیں۔ جیسے وہ منے کی خفگی اور نشو اور پپی کی مسکراہٹ پیچھے چپکے سے سب کی نظریں بچا کر اپنے رومال میں دفن کر دیں مبادا اگر کوئی دوسرا ان آنسوؤں کے راستے ان کے راز دل کے جزیرے تک نہ پہنچ جائے۔

جس طرح علامہ نیاز مرحوم نے مومن کے متعلق لکھا مومن کی تنہا وہ خصوصیت جس میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں اس کے انداز بیان کی بلاغت ہے۔" اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اقبال متین کی تنہا وہ خصوصیت جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں ان کے ضبط کی انتہا ہے۔ خواہ دل کے پھپھولے سے سینے کے داغ جل ہی کیوں نہ اٹھیں وہ اپنے اس جہاں رازہ کا سیر نہیں کرواتے جسے اپنے جگر کا لہو دے دے کر اپنے دل میں بسایا ہے۔ اس جہان کو بسانے کے لئے اقبال متین کو اپنے دائمی سکون کی بھینٹ دینی پڑی۔

زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لئے دونوں پہیوں کا اور ٹھیک حالت میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مگر اقبال متین کی زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ اپنی کمزوری کی وجہ سے بالکل ہی ناکارہ ہو ہے جس کی وجہ سے سارا بوجھ ایک پہیے پر آ گیا ہے۔ اس کے ...

دھکیلے جا رہے ہیں بغیر کسی خواہش اور منزل کے۔

ہر انسان زندگی کا بوجھ ڈھو کر چلنے کے لئے پہلے سے ایک
ستہ اور منزل متعین کر لیتا ہے لیکن اقبال متین کی زندگی کا راستہ کسی منزل
م پہنچتا ہوا مجھے تو نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود وہ راستے پر گامزن
اس لئے کہ دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ چل رہے ہیں۔ وہ خود بھی
ں جانتے کہ یہ پرپیچ، پرخطر اور پرخار راستہ انہیں کسی منزل پر
ئیگا یا کسی بھیانک کھائی کی سیر کرائے گا۔

اردو زبان کا یہ انتہائی تاریک پہلو ہے کہ اردو کے بہت
ـیبوں اور شاعروں کے بچے صرف انگلش میڈیم میں زیر تعلیم ہیں
وسے قطعی نابلد ہیں۔ اقبال متین کیا دنیا کا کوئی باپ یہ نہیں چاہیگا
ئے مرنے کے بعد اس کی تخلیقات اسی کی اولاد کے
لائی جائیں تو وہ حقارت سے منہ پھیر کر اور یہ کہہ کر کتاب ردی
ی میں پھینک دیں کہ "وھاٹ نان سنس" یہ کیا بکواس ہے
ان سنس رکھنے والوں سے کوئی یہ تو پوچھے کہ شیکسپیئر
ورڈسوتھ وغیرہ جیسے غیر زبان کے شاعروں اور ادیبوں کی
ـتوں کو سینے سے لگا کر اور ان پر گفتگو کر کے اپنے آپ کو عالم
ظاہر کرنے کی جو کوشش کرتے ہیں۔ اگر شیکسپیئر وغیرہ کی
ہ اپنی مادری زبان سے ناواقف رہ کر اپنے باپ کی
ـتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تو آج وہ ادب پارے
طرح پہنچ پاتے جسے تم سرمایہ افتخار سمجھ کر اپنے سینے
ے لگائے پھرتے ہو۔

اقبال متین کی یہ دلی خواہش ہے کہ ان کے مرنے کے بعد
ان کی اولاد ان کے افسانوں کے ذریعہ ان کی قدر کرے اسی لئے تو
وہ اپنے سب سے چھوٹے دو لڑکوں کو بڑے چاؤ سے اور بڑی
محنت سے اردو پڑھا رہے ہیں۔ اور ان کی ذات سے بے شمار
امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

غم اور خوشی انسان کے لئے کسوٹی کی سی [illegible]
رکھتے ہیں۔ انسان انہیں دو موقعوں پر کھل کر سامنے آتا ہے
صاف طور پر پہچانا جاتا ہے۔ مجھے ان دونوں موقعوں پر

اقبال متین کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انہوں نے خوشی میں بڑے
ظرف سے اور غم میں بڑے صبر و تحمل سے کام لیا ہے۔ بے پناہ خوشی میں بھی
انہیں خوشی سے پاگل ہوتے اور غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑنے پر دوسروں کی
طرح بین کرتے میں نے نہیں دیکھا۔ فرید جانی (اقبال متین کا مرحوم
لڑکا) کے انتقال کے وقت کا ایک ایک منظر میری آنکھوں کے سامنے
فلم کی طرح گھوم جاتا ہے۔ جب بھی میں اس کا خیال کرتا ہوں تو آنکھیں
پرنم ہو جاتی ہیں۔ کوئی تو اپنا سر دیوار سے ٹکرا رہا تھا، کوئی اپنے بال
نوچ رہا تھا۔ اور کوئی غم کی شدت سے بار بار بے ہوش ہو رہا تھا
لیکن ایک اقبال متین تھے جن پر سکتہ سا طاری تھا آج بھی وہ منظر
یاد آتا ہے تو میری روح لرز جاتی ہے۔ اقبال متین کی اس خاموشی
میں جو تڑپ جو کسک پنہاں تھی اسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا
جا سکتا۔ اقبال متین کی اس خاموشی کو دیکھ کر میں فرید جانی کی
بے وقت موت کو بھول بیٹھا تھا۔ اس وقت تو میرا یہی دل چاہتا
تھا کہ اقبال متین کے منہ پر چانٹے مار کر انہیں رونے پر مجبور کر دوں تاکہ
بچے کی جدائی کا غم آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں کی راہ بہہ نکلے۔
فرید جانی کے انتقال کے وقت مجھے اقبال متین کے ساتھ بہت
زیادہ رہنا پڑا تھا۔ ایک مرتبہ میں اور وہ رکشا میں سوار شہر سے باغ
سے آ رہے تھے کہ اسٹیٹ بنک کے قریب سڑک کی دوسری
جانب فرید جانی کے دو ہم جماعت نظر آئے۔ اچانک اقبال
متین رکشا سے چھلانگ لگا کر دیوانہ وار ان لڑکوں کی طرف
بڑھنے لگے۔ اس وقت انہیں موٹروں، بسوں اور دوسری
سواریوں کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ وہ تو کسی طرح ان لڑکوں تک
پہنچنا چاہتے تھے صرف اس لئے کہ وہ لڑکے ان کے مرحوم
بیٹے کے ہم جماعت تھے۔ جب وہ واپس آئے تو ان کا عجیب
حال تھا۔ چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے چراغ بھڑک کے
گل ہو چکے تھے۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا ہی کہا "پیارے
لڑکے مرحوم بادا جانی (فرید کو وہ پیار سے بادا کہتے تھے۔)
کے ہم جماعت ہیں۔ پتہ نہیں اس جملے میں کہاں کا درد سمٹ آیا تھا کہ
میں برداشت نہ کر سکا۔ فرید کے انتقال کے سانحہ کو گزرے آٹھ سال ہو گئے۔

لیکن اقبال متین کے لیے یہ سانحہ اب بھی آٹھ دن سے زیادہ کا نہیں ہوا وجہ ہے کہ آج بھی وہ اپنے فریدہ باوا کی قبر سے لپٹ کر زار و قطار روتے ہیں۔ شاید ان کے آنسوؤں کو اس بات کا پتہ ہے کہ ایک وہی ہے جو انہیں رائیگاں نہیں جانے دیتا بلکہ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور ان کی قدر و قیمت سے واقف ہے اسی لئے تو وہ پھوٹ بہتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید اختر نے اپنے ایک مضمون میں اقبال متین کی شخصیت پر اتنے نقاب ڈال دیئے تھے کہ قاری اقبال متین کو بھول کر وحید اختر کے ڈالے ہوئے نقابوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اقبال متین نے اتنے نقابوں کے پیچھے چھپنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ انہوں نے اپنے لئے صرف ایک نقاب کا انتخاب کیا اور وہ ہے مسکراہٹ۔ ان کے بغیر نمبر کے شیشوں کی عینک کی طرح یہ نقاب بھی ان کے چہرہ پر زیادہ تر چڑھا ہی رہتا ہے۔ مگر میں نے اس نقاب کو اس وقت تار تار ہوتے ہوئے دیکھا ہے جب وہ فریدہ جانی کی قبر پر جاتے ہیں۔

اقبال متین نے اپنی پریشانیوں، ذہنی الجھنوں اور ہر مصیبت کو کسی کی ایک محبت بھری اور تسکین بخش مسکراہٹ کے عوض بھول جانا چاہا۔ اقبال متین کی یہ بڑی ہی معمولی مگر محبت بھری تمنا ان کے حق میں ایسی ہی ثابت ہوئی جیسے کوئی ننھا سا بچہ ہلال کا ہاتھ کی خواہش کرے اور اس کے ماں باپ اس کے سمجھانے اور بہلانے کے لئے اس کے آگے ایک آئینہ لاکر رکھ دیں۔ آئینہ میں ہلال کا عکس دیکھ کر بچہ بہل تو جائے مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آئے کہ ذہن کا یہ چاند مجھ سے اتنی قریب ہو کے بھی اتنی دور کیوں ہے کہ میں اسے پاکر بھی پا نہیں سکتا۔

میں آج تک بھی پیسہ کی قوت کا قائل نہیں تھا۔ مگر اقبال متین کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو قائل ہونا ہی پڑتا ہے جب اقبال متین کے پاس پیسہ تھا تو ان کی برائی بھی ہنر تھی اور آج ...... آج اقبال متین میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ بھی برائیاں پیدا کی جا رہی ہیں جن سے وہ پاک ہے۔ صرف اس لئے کہ اقبال متین تہی دست ہے

جب تہی دستی کی بات آ ہی گئی ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ اقبال متین نے اپنی بیوی کی خوشی اور بچوں کے آرام کے لئے اپنے گھر کو بیچا۔ قرضداروں کے آہنی شکنجے میں پھنسا گھر ا۔ اپنی بے شمار راتوں کی سیاہی کو سفیدی میں بدل دیا اس پر بھی جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ "تم نے کیا کیا؟" تو ان کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی ہنسی رقص کرنے لگتی ہے۔ جیسے وہ کہہ رہے ہیں ؎

نیکی بھی کوئی کر نہ سکے وہ میرے لئے
میں نے گناہ تک بھی کئے جن کے واسطے

مخدوم محی الدین نے اپنی "بزم ناز" کی بزم میں ہنس ہنس کر صرف آہوں کو چھپایا تھا لیکن اقبال متین نے اپنی "بزم ناز" کی بزم میں ہنس ہنس کر نہ صرف آہوں کو چھپایا ہے بلکہ اپنی آنکھوں کے دیئے بھی جلائے اور ارمانوں کا خون ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے

بعض بے حس قسم کے حضرات کے نزدیک زندگی کچھ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جس کا کام ہی سلگتے بکھرنا ہے۔ اقبال متین نے ان کی خاطر اپنی زندگی کو بھی پھلجھڑی بنا ڈالی جو رنگ بکھیرنے کے بعد خود جل بجھنے والی ہے۔ اقبال متین کی زندگی بھی سگریٹ کی زندگی کی مانند ہے جو آگ سے شروع ہو کر خاک پر ختم ہو ہے۔ اور اس دوران جتنے کش لگائے جا سکتے تھے لوگوں نے لگا لئے۔ اور اب مسل ڈالنا چاہتے ہیں اس لئے کہ اب ایک کش بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ نے یہ شعر تو سنا ہوگا ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

بچپن میں مجھے اس شعر کا مطلب سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ مگر اب کوئی دشواری پیش نہیں آتی اس لئے کہ اس کی زندہ تفسیر اقبال متین کی صورت میرے سامنے موجود ہے۔ دشمنی بڑی کرب ناک ہے اور اس کی اذیت ناقابل بیان ہوتی ہے جو دوستی کے پردے میں کی جاتی ہے۔ اس قسم کی دشمنی اقبال متین سے نامی گرامی حضرات نے بھی کی۔ مگر انہوں نے ہر تکلیف کو اپنی

نن کے پیچھے چھپا لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال متین کی آنکھوں
دل میں مجبو نہ ہو گیا ہے کیسے سے کیسا بڑا غم کیوں نہ ہو وہ ان کی
نہ کے شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھوں میں تھوڑی دیر کے لئے
ے لیتا ہے۔ اور اس کے بعد آہستہ سے ان کے دل میں اتر جاتا
بعض وقت میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے سینے سے اس نامراد
دل کو نکال پھینکوں اور انہیں ایسے دل سے محروم کر دوں جو ہر سخت واقعہ
ے اندر دفن کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی حساس انسان محسوس
ے تو کرے ورنہ وہ خود کبھی اظہار نہیں کرتے ۔

میرے نزدیک دو جسموں کے اتصال کا نام "وصل" نہیں۔ دو
وں کا میل تو محض تسکین کی حیثیت رکھتا ہے یہ لطف تو ہم ان ہستیوں سے
حاصل کر لیتے ہیں جن سے ہمارا ذہنی تعلق قطعی نہیں ہوتا۔ میرے
میں وصل کا بڑا ہی لطیف اور پاک تصور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ
ہشات، خیالات، جذبات اور پسند ناپسند وغیرہ کی ہم آہنگی
م وصل ہے اگر میرے اس نقطۂ نظر کو مان کر اقبال متین کی زندگی
لیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ آج تک بھی "وصل" کے سرور آگیں لطف
رام ہیں اور ہمیشہ سے "ہجر" کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ اس
آگ میں ان کا سب کچھ جل چکا ہے سوائے ان دو
ں کے۔ خواہش اور توقع۔ اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو
ن کا ساتھ دینگی اور اگر وہ اپنے ذہن سے انہیں کھرچ
کر پھینک دینا بھی چاہیں تو انہیں کامیابی نہیں ہوگی اس لئے کہ اب
برخوردار ان کے بس کی بات نہیں رہ گئی ہے ۔

امید و بیم نے اقبال متین کو اس طرح مارا ہے کہ وہ آج
ہی گھر کے قریب رہ کر دوسروں سے گھر کا پتہ پوچھتے پھرتے
اقبال متین گھر میں رہ کر بھی بے گھر ہیں۔ اقبال متین منزل پہ پہنچ کر اس
ے منزل سے دور رہے۔ بھٹک کر رکنے یا ٹھہرنے کی کوئی صورت نظر نہیں
اور اب وہی ارمان ان کی جان کے دشمن بن گئے ہیں جنہیں اقبال
نے اپنی زندگی دی تھی ۔

آج ہیں وہی ارمان میری جان کے دشمن
میں نے آج تک جن کو اپنی زندگی دی ہے

بقیہ "جھروکے سے جھروکے تک"

جو نک لگ ہی گئی .... مجھے ہنستے دیکھ کر بھابی پوچھنے لگیں تو میں نے انہیں
اس کا خط بتا دیا۔ وہ چند لمحوں کے لئے چپ ہی رہ گئیں پھر بے اختیار ہنس
پڑیں۔ اب حیران ہونے کی میری باری تھی۔ مجھے یوں حیران سی دیکھ کر بھابی
اپنے کمرے میں لوٹ گئیں اور ایک تصویر لئے لوٹ آئیں۔ میں نے نسیم
بے حد خوب صورت ہے ... میں نے بھابی سے پوچھا یہ تصویر ان کے پاس
کہاں سے آئی... .... تب بھابی نے بتایا نسیم ان کی کلاس فیلو تھی اور
نسیم کا ایک خط بھی مجھے بتایا جس میں نسیم نے منظر کا ذکر کیا تھا..... بھابی
کی تمنا تھی کہ نسیم کو اپنی دیورانی بنا کر لے آئیں۔ لیکن میں نے سختی سے منع
کر دیا۔ پہلے پہل تو میں نے سوچا کہ نسیم کا خط بھابی کے نام منظر کو اور منظر کا
خط نسیم کو بھیج دیا جائے۔ لیکن بھابی کہنے لگیں کہیں مذاق میں کہیں اور نہ بگڑ
جائے........ پھر بھابی اور بھائی جان کی سازشیں شروع ہوئیں تیسرے
ہی دن وہ لوگ نظر کے گھر پہنچ گئے........... اور پھر شادیانے بجنے
لگے ... اپنے کالج کے ساتھیوں میں صرف تم منظر اور میں ہی رہ گئے تھے
اور دوستوں کو ہماری شادی کے بڑے ارمان تھے۔ منظر کی شادی میں جی
بھر کر ہم لوگوں نے خوشیاں منائیں۔ اس وقت تمہاری کمی بے حد محسوس
ہوئی۔ کہو کیسی رہی کہانی اب ذرا اس خط کے ملتے ہی منظر کو خط لکھ دو۔
اس کو لکھنا۔ کیوں صاحب ! کہاں تو لڑکیوں کی طرف نظر نہ اٹھاتے تھے
اور کہاں اندھیرے میں چھپ کر لڑکیوں کو تاکنے لگے ۔

شادی میں بھی میں نے بھی اس سے کہا تھا تو اس نے جھینپ
کر کہا تھا۔ لڑکیوں کو نہیں ......

صرف ایک لڑکی .. بہر حال اب وہ پرانی بات چھیڑ دو تو کھسیا
جاتا ہے ..... مجھے گالیاں دیتا ہے کہ میں سب کو بتا رہا ہوں تمہیں
بتائے بنا میں کیسے رہتا ..

اب شادی کے ہنگامے ختم ہو چکے ہیں۔ تمہیں فرصت سے لکھ رہا
ہوں ..... تو تم جلد ہی منظر کو لکھ رہے ہو نا . . .

تمہارا اپنا - جمیل

(انشائیہ)

اندرجیت دت



سننے میں آتا ہے کہ کرہ ارض پر انسان کو پہلا قدم اٹھانے کی ضرورت سب سے پہلے تب محسوس ہوئی جب اسے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے پس پشت کسی جانور کی آواز سنائی دی اور اس کا ماخذ جاننے کی غرض سے وہ عازم سفر ہونے پر مجبور سا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اس روایت میں کوئی صداقت نہ ہو۔ مگر اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ انسان کا وہ پہلا قدم ایک ایسی منزل کی جانب پہلا قدم تھا جسے روز اول سے لیکر آج تک ان گنت میلوں کی مسافت کے بعد بھی تلاش کرنے میں کوئی کامیاب نہیں ہو پایا۔

انسان اپنی فطرت سے مجبور "نئے پن" کی کھوج میں صدیوں جنگلوں، سمندروں اور فضاؤں میں بھٹکتے رہنے کے باوجود ہنوز یہ یقین کرنے سے قاصر ہے کہ اس نے اس دنیا کی ہر نئی چیز کو پا لیا ہے اتنا طویل سفر اس کی اذیتیں، پریشانیاں حتی کہ موت جیسی بھیانک چیز بھی اس کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکی۔ وہ اس تلاش میں جاں بحق بھی ہو گیا تو اسے یقین تھا کہ اس نے اپنی اولاد یا آئی پود کے دلوں میں ایک ایسا نقش چھوڑ دیا ہے جو انہیں آگے بڑھتے رہنے کی تقویت بخشتا رہے گا۔ انسان اپنی فطرت کے زیر اثر تھوڑے ہی عرصہ میں ایک جیسے ماحول اور معاشرے سے اکتا کر نئے مقامات پر پہنچنے اور نئے پن کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا ہے۔ آج جو کچھ بھی ہمیں میسر ہے اور جو کچھ ہم جانتے ہیں یہ سب ہماری اس عجیب و غریب فطرت ہی کا ثمر ہے۔ آج بھی جب ایک آدمی اپنی ماں یا بیوی کو یہ کہتے ہوئے

سنتا ہے کہ وہ دیواروں کے رنگ و روغن یا دروازوں پر ٹنگے پردوں کی یکسانیت سے اکتا گئی ہے اور اب ان کے نیا رنگ یا کسی نئے ڈیزائن کا پردہ ہونا چاہئے تو اس خواہش کے پس پردہ وہی جذبہ کار فرما ہوتا ہے جس نے دنیا کے بڑے بڑے محققوں کو سمندر کی طوفانی لہروں کا سینہ چیر کر نئے ممالک دریافت اور نئے خزانے تلاش کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور جس کے زیر اثر انسان آج اتنی بڑی دنیا کو تنگ تصور کرتے ہوئے نئے چاند اور نئے پہاڑوں پر پہنچنے کے لئے بے قرار سا نظر آتا ہے۔ خالق ہی جانتا ہے کہ انسان کی اس تلاش کی انتہا کیا ہو گی۔

ایک عظیم فرانسیسی دانشور کو انسان کی اس فطرت کے پس پردہ ایک ایسی انجانی، ان کہی اور انتہائی عمیق خواہش کا احساس ہوا تھا جس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی سرشٹ حائل سفر رہتا ہے جسے اس بڑے مفکر مان ٹیجین (MONTEIGEN) نے دوسرے الفاظ میں ایک ایسی عظیم غیبی طاقت کا نام دیا جس کی وجہ سے یہ ارتقائی سفر ہمیشہ جاری رہا ہے اور جس کے بغیر یہ کائنات بالکل بے حس و حرکت رہ جاتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ ہماری پیدائش کا واحد مقصد کچھ نہ ہو کر "صرف سچائی کی کھوج ہے"۔ مانٹیجین کے یہ مختصر الفاظ اتنے عظیم اور قابل احترام ہیں کہ ہمیں ان کو ذہن نشین کرتے ہوئے اپنے آپ کو ایک ایسا مسافر سمجھنا پڑتا ہے جس کا کام ہر صبح ایک نئی منزل پر روانہ ہونا اور ہر شام ایک نئے مقام پر جا کر دم لینا ہو۔

مانٹیجین نے ہمیں ایک اور اہم سبق بھی دیا کہ اس میں کوئی شک
نہیں کہ ہم سچائی کی تلاش کے لئے معرض وجود میں لائے گئے ہیں لیکن وہ ایک
عظیم طاقت کی ملکیت ہے جس سے ہم اسے کبھی چھین نہیں پائیں گے ۔ یہ عظیم
دانشور شکسپیر کی موت سے چوبیس سال پہلے اس دار فانی سے کوچ کر چکا
تھا۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ سچائی پہاڑ کی چوٹی یا کسی گہرے سمندر
کی تہہ میں بستی ہے بلکہ اس نے کہا کہ سچائی جنت کی بلندیوں پر سکونت
پذیر ہے۔ سچائی خدا ہے اور اس کی تصدیق کرتے ہوئے ہم اپنے خالق
کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں تو سچائی کے بارے میں ہر چھوٹے بڑے مذہبی
اور سیاسی رہنما نے کوئی نہ کوئی قابل قدر بات ضرور کہی ہے لیکن مانٹیجین
جیسی صداقت کے اظہار کا شرف شاید ہی کسی کو حاصل ہو۔

اب ہمیں احساس ہوا تھا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد
کتنا عجیب و غریب اور دلچسپ ہے یعنی ہم اس چیز کی تلاش کے
لئے پیدا ہوئے ہیں جسے ہم کبھی پا نہیں سکیں گے ۔ یہ گم ہونے اور تلاش
کرنے کا اتنا بڑا کھیل ہے جس کا مقابلہ کوئی اور کھیل نہیں کر سکتا
کہ سچائی میں روپوش ہے اور ہم اسے زمین پر کبھی بھی تلاش نہیں کر سکتے
اس نے اس کھیل کو اتنی دلفریبی اور کشش بخشی ہے کہ سب کچھ
جانتے ہوئے بھی ہم اس کھیل کو صدیوں سے بخوشی کھیلتے چلے
آ رہے ہیں اور ہمیں اس میں بے انتہا لذت و مسرت بھی میسر ہوتی
ہے۔ اس کھیل اور خالق کی برتری کا ثبوت ہر زمانے میں ملتا رہا ہے
اٹھارہویں صدی کے ایک جرمن ادیب لیسنگ (LESSING)
نے ذیل الفاظ میں اس حقیقت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے

”اگر خدا اپنے داہنے ہاتھ میں ”مکمل سچائی“ اور بائیں
ہاتھ میں ”سچائی کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والی خواہش“ لئے میرے
سامنے آ جائے اور مجھے دونوں میں ایک کو چننے کے لئے کہے تو میں
اس شرط کے ساتھ کہ مجھے انتخاب میں ہمیشہ غلطی ہوتی رہے خالق کے
بائیں ہاتھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے یہی التجا کروں گا کہ
مالک مجھے وہ دیدے! ”مکمل سچائی صرف تیرے لئے“

لیسنگ کا کہنا ہے کہ انسان کی وقعت اس لئے نہیں کہ
”وہ جتنا جانتا ہے“ بلکہ اس کوشش کی وجہ سے ہے ”جو اس نے اتنا
جاننے کے لئے کی“ کیونکہ وہ سچائی کو حاصل کرنے کی وجہ سے اتنا
عظیم نہیں جتنا کہ وہ اس کی تلاش میں رہ کر اپنے اندرونی صفات
کو جمع کرنے کے قابل ہو سکا جنہوں نے اسے باکمال بنا دیا۔
اس لئے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ چاہے ہم مکمل سچائی کو کبھی
بھی نہ پا سکیں گے لیکن اس کی تلاش میں اس کے چھوٹے چھوٹے ذرے
ہمیں ضرور مل سکتے ہیں اور قدرت پر ہماری فتوحات کا دارومدار
سچائی کے ان چھوٹے ذروں کی فراہمی پر ہوگا مثلاً کسی زمانے میں
انسان کا عقیدہ رہا ہے کہ زمین چپٹی اور ساکن ہے ۔ اسی نا سمجھی کی
وجہ سے وہ سیاروں کی گردش کا احوال جاننے سے قاصر رہا لیکن
جیسے ہی اسے یہ علم ہوا کہ زمین گول ہے اور اپنے محور پر گھومنے کے
علاوہ سورج کے گرد بھی چکر کاٹ رہی ہے۔ تو سیاروں کے بارے
میں معلومات حاصل کرنے کے ایک ایسے دلچسپ سلسلے کا آغاز ہوا
جسے ہم علم سیارگان کہتے ہیں اور جس کا نتیجہ کچھ ہی عرصہ میں انسان کی
باریابی چاند تک ہو جانے کی شکل میں نکلنے والا ہے ۔

سچائی کی تلاش بھی ایک عجیب و غریب تماشا ہے ۔
حالانکہ ہم اس کے اڑتے ہوئے پروں اور سنہرے دامن کو چھو نہیں
پاتے پھر بھی جوں جوں ہم اس کی تلاش میں قدم آگے بڑھاتے ہیں
ہماری رسائی توں توں ایک مقام سے دوسرے مقام اور
ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک ہو جاتی ہے۔ اور
ہم دن بدن اس کائنات اور اس کے سیارگان کی اہمیت
اور رفتار کے بارے میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتے جاتے ہیں۔

ہم شیطانی طاقت کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے
کے قابل نہیں ہو پائے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس کا حل شاید
اگلے ہزار برسوں تک ہماری دانست سے باہر رہے اور ہو سکتا
ہے ہم پر کبھی بھی افشا نہ ہو لیکن ہم اتنا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں
کہ خدا شیطان سے کہیں بہتر و برتر ہے ۔ اس حقیقت کا
اظہار ہم پر کسی اچھے آدمی کو کسی برے آدمی کے مقابلے میں
اونچے درجے پر کھڑا ہوا دیکھتے ہی ہو جاتا ہے ۔ ہمارے

دلوں میں لمحہ بھر کے لئے بھی یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا کہ ایک بدکار کا رتبہ کسی نیکوکار انسان سے اونچا ہو سکتا ہے۔ ایسی باتوں کو ہم حقیقتوں کا نام دیتے ہیں۔ ان سے رہنمائی پاتے ہیں لیکن دنیا کے بیشتر مفکر شیطانی قوتوں کی تفتیش میں رہ کر ایک عجیب لذت کا احساس کرتے ہیں۔ انہیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس تلاش میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگی بلکن اس دلچسپ گورکھ دھندے میں الجھ کر وہ اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننے کی متواتر کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اور ان میں سے تو بیشتر اس فیصلے پہ پہنچے ہیں کہ شیطان کا بالکل اسی طرح کوئی وجود نہیں جیسے اندھیرا کوئی جسامت نہیں رکھتا کیونکہ روشنی کے نہ ہونے کا نام اندھیرا ہے! اسی طرح "اچھائی کا نہ ہونا" برائی کا ہونا ہے۔ ان لوگوں کے باہمی بحث و مباحثے کی وجہ سے ہم سچائی کے بکھرے ہوئے ذرے اکٹھے کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ہم میں معاشرے میں پاکیزگی اور قوانین میں پختگی لانے کی صلاحیتیں پیدا ہوئی ہیں۔

مشہور یونانی عالم ریاضی ایولیڈس (EULLIDES) نے جسے ہم ایولڈ (EULLID) کے نام سے پکارتے ہیں اپنے دور میں چند ٹھوس حسابی نکتے قائم کئے تھے جنہیں ہم منہ بولتی حقیقتیں کہہ سکتے ہیں۔ دو ہزار سال تک ان کے بارے میں کسی قسم شک و شبہ کا اظہار نہ ہو سکا اور اس کی بنا پر ماہرین نے انجینئرنگ کے سینکڑوں کمالات دکھائے۔ لیکن اب ہمیں احساس ہوا کہ ان ٹھوس حقیقتوں میں سے چند ایک غلط ہیں۔ آئیو لڈکی یہ غلطیاں بھی عملی طور پر سچائیاں ثابت ہوئیں۔ پھر بھی ہمیں نظریوں کی حقیقی تلاش میں پھر سے تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نیوٹن کے دل میں پیڑ سے گرتے ہوئے سیب کو دیکھ کر جب یہ خیال آیا کہ سیب زمین کی جانب گرنے کی بجائے آسمان کی طرف کیوں نہیں گیا تو اس نے کشش ثقل کی تھیوری کو جنم دیا جو ایولڈ کی تھیوریوں کی طرح سچی اور ٹھوس تصور کی جاتی رہی لیکن آگے چل کر آئنسٹائن (EINSTIEN) نے ہمیں اس نئی حقیقت سے روشناس کروایا کہ خلا میں ایک چاپ (CURVE IN SPACE) کی وجہ سے اشیا اپنے مرکز کی جانب

کبھی چلی آتی ہے جیسا کہ ناہموار فرش پر لڑھکائے گئے کنکر اسی رخ کی جانب دوڑتے ہیں۔ تو یہاں سوال پیدا ہوا کہ دونوں میں سے کیا سچا ہے، تو اسی طرح اتنا کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی ہمیں پھر سے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو ہمیشہ ہم سے دور رہتی ہے

ان مثالوں سے ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ سچائی اضافی (RELATIVE) ہوتی ہے یعنی مختلف صورتوں پر شکل مختلف ہوتی ہے۔ ایک مداری کی اس شعبدہ بازی سے بخوبی روشنی ڈالی جاسکتی ہے، جب وہ زمین پر ایک اونچا ٹوپ اور ایک واسکٹ رکھ کر تماشائیوں سے یہ پوچھتا ہے کہ دونوں سے کون سی چیز بڑی ہے تو ہر کوئی یہ کہہ اٹھتا ہے کہ "ٹوپ" بڑا ہے حالانکہ واسکٹ لمبائی میں ٹوپ سے کہیں بڑی ہوتی ہے۔ دیکھنے والوں کی نظر کو دھوکا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ زمین پر واسکٹ ٹوپ کی اونچائی کے مقابلے میں چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ اس بات کو اور طرح سمجھنے کے لئے ایک اچھی مثال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب ہم کسی کو تیز دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم کہتے ہیں وہ کتنا تیز رفتار ہے لیکن کبھی ایک گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا اس سے آگے نکل جاتا ہے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک موٹر کار ان دونوں سے آگے نکل جاتی ہے تو ہمیں وہ تیز رفتار آدمی وہیں کھڑے کا کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

سچائی کا اضافی ہونا ہماری سوچ کا اہم جزو ہے۔ اگر ایک آدمی ہمارے پاس آ کر ایک بدصورت تصویر کو اپنی بنائی ہوئی خوبصورت تصویر کہے اور ہم اس کی بات نہ مانیں تو وہ طاقت کے بل بوتے پر ہم سے غلط بات کو صحیح کہلوانے کی کوشش کرے گا۔ اس غلط نظریئے کے تحت دنیا کی تمام لڑائیاں بڑا ان طاقت ور حکمرانوں کا عقیدہ تھا کہ جو بات طاقت اور سختی سے منوائی جا سکتی ہے وہی سچی بات ہوتی ہے۔ مگر یہ عقیدہ سراسر غلط اور جھوٹا تھا۔ اس مصور کی دھونس کا یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی تخلیق کو کسی دوسری اچھی تصویر کے ساتھ رکھ کر اسے احساس دلائیں کہ وہ غلط ہے یعنی ہم اس کے ذہن

وبصورتی اور بدصورتی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ ہم بچائی پر پہنچنے کے اس طریقہ کار کو "پیمانوں سے معیار کا تعین کے (JUDGEMENT BY STANDARDS" سے پکارتے ہیں اور یہ طریقہ کار آج تک تلاش کئے گئے تمام طریقوں یا وضع اور غلط نظریوں کی مار سے بچنے کا بہترین ن ہے۔

تعلیم یافتہ بننے کے اہم مقاصد میں ایک یہ بھی ہے کہ اس ہمارے ذہن میں نئی چیزوں کی اہمیت جاننے کے لئے مخصوص نے مقرر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے اگر ایک طفل باقو کو پنسل تراش کے طور پر استعمال کرنے پر مصر ہوتا ہے تو ہم چاقو کی دوسری خطرناک صلاحیتوں کے بارے میں بتاکر اسے طی کا احساس با سانی دلا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اگر غالب یا میر اور اچھے شاعر کے کلام سے واقف ہوتے ہیں تو کسی نوآموز کلام کو پڑھ کر یا سن کر چاہے وہ کتنا ہی تازہ یا دلچسپ ن نہ ہو اسے بہترین یا بے عیب کہنے کی غلطی سے بچ نکلتے ہیں۔ ہم نے تواریخ کا بغور مطالعہ کر رکھا ہو تو کسی اخبار میں کسی صورت حال کی افواہ پڑھ کر جس میں دنیا کے خاتمہ ہو جانے کا تہ ظاہر کیا گیا ہو خواہ مخواہ خوف زدہ ہونے کی کوفت سے سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں علم ہوتا ہے کہ آنے والے حالات ماضی کے کئی زن سے کم پر خطر نوعیت کے ہوں گے۔

اپنے ذہن میں ایسے پیمانوں کا تعین کئے بغیر ہم نئے خیالات اور ایجادات کی نوعیت و اہمیت کا صحیح اور ٹھیک اندازہ لگانے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم ہمارے ذہنوں کو مستعدی سے تشنہ بے اور ہمیں کسی پختہ فیصلہ پر پہنچنے کے قابل بناتی ہے۔ ہم جتنے زیادہ فنکار اور تعلیم یافتہ ہوتے جاتے ہیں اتنے ہی ہم کم نا تجربہ کار انسان تنگ نظر اور سنکی بننے سے محفوظ ہوتے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی لوگ معاشرتی اور تہذیبی قدروں کو خیرباد کہہ کر شور و غل کی باتیں اور مقابلہ بازی کے نعروں کا سہارا لے کر دوسروں اپنی جانب مبذول کرنے اپنے کی حماقت کرتے ہیں اور

کچھ ناسمجھ لوگ بے اختیار چلا اٹھتے ہیں "یہ نظریئے کتنے بنیادی اور مفید ہیں۔ اور ان کی اندھی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اگر سمجھدار لوگ ان سے بحث کرتے ہیں تو وہ ان کا مذاق اڑاتے ہوئے انھیں چور، لٹیرے اور دبا و ڈالنے والے بھیڑیے کے خطابوں سے نوازنے میں بھی کسر اٹھا نہیں رکھتے وہ سمجھداروں کی بحث سے غلط نظریوں یا برُے خیالات کو دل سے نکالنے پر تیار نہیں ہو پاتے۔ کیونکہ ان میں مسائل کو ایسے پیمانوں سے ناپنے کی صلاحیت نہیں ہوتی جو کہ سمجھدار یا زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں میں ہوتی ہے جب ہم ان لوگوں کے کرداروں کو رام، نانک یا مہاتما بدھ جیسی مقدس ہستیوں کے معیاری پیمانوں کے ساتھ تولتے ہیں تو وہ ہمیں قاتل لٹیرے اور سر پھرے دکھائی دیتے ہیں ان سر پھروں کے پاس سوا اپنی مرضی کے سوا کوئی اور اخلاقی قدروں کا پیمانہ ہوتا ہی نہیں اور وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں میں انتشار پھیلانے والے بن جاتے ہیں۔

اگر ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ کرے تو زندگی معاشرہ اور تہذیب نام کی چیزوں کا شیرازہ بکھر جائیگا۔ اگر ہم صرف رسم بالا معیاری پیمانوں کے بغیر ہندوستان یا ترقی زندگی کا تصور کرنے کی کوشش ہی کریں تو ہمیں جھٹ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان باتوں میں سچائی کا کتنا دخل ہے۔ فرض کیجئے بنک اور تجارتی ادارے ایمانداری سے بے نیاز ہو جائیں۔ ڈاکٹر شراب میں مدہوش ہو کر مریضوں کا علاج کرنے لگیں، ریل گاڑیوں کے انجن ڈرائیور سگنل کی پرواہ کرنا چھوڑ دیں۔ اور پولیس والے خود ہی چور اور رہزن بن بیٹھیں تو کیا ہماری تہذیب کا شیرازہ تار تار ہو کر نہ رہ جائے گا؟ اگر صحیح اور غلط کو ماننے کی روایات مفقود اور ہر کسی کو من مانی کا حق حاصل ہو جائے تو یہ دنیا کیا سے کیا بن جائے گی۔

ہماری تہذیب کی حفاظت کا دار و مدار اخلاقی قدروں کے تئیں وفاداری پر ہے۔ اور اخلاقی قدریں انسان کی سچائی کے لئے مسلسل تلاش کا نچوڑ ہیں۔ ہم سچائی کی تلاش کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں صرف جسمانی اور دنیاوی چیزوں ہی کی بھلائی جاننے کے لئے نہیں

سید جاوید اختر

ناصر زیدی ایک تعارف

ناصر زیدی ایک عظیم شاعر سے ایک عظیم تر انسان ہے۔ وہ عظیم انسان سے عظیم تر شاعر۔ بحیثیت شاعر میں اسے گذشتہ چھ سات برس سے جانتا ہوں اس کا کلام ہندوستان کے چند مخصوص پرچوں میں اور پاکستان کے بیشتر ادبی جرائد میں غالباً ۱۹۵۹ء سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی غزلوں میں بہار کی روح افزا خوشبو، قوسِ قزح کے دل افروز رنگ اور شروع جاڑے کی چاندنی کی ٹھنڈک ہے۔

میری اور اس کی دوستی کا آغاز آج سے قریباً تین برس پہلے ہوا جب میں ماہنامہ ادبِ لطیف کے ادارے میں شامل تھا۔ وہ ان دنوں مشہور فلمی رسالے "شمع" لاہور میں ایک خزاں زدہ بوڑھے برگد کے سائے تلے اپنے ادبی و صحافتی جواہر کی تراش خراش کرتا تھا۔ دوست اصل میں وہ میرے ایک پرانے ساتھی ذکاء الرحمن کا تھا۔ بلکہ ہے۔ اور میرے ساتھ تو جانے کیسے اس کا تعارف ہو گیا لیکن پھر یوں ہوا کہ بہت جلد اس نے مجھے یا میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میں چند خاص وجوہ کی بنا پر "ادبِ لطیف" سے "شمع" میں چلا گیا اور ایک آدھ ماہ کے توقف کے بعد ناصر زیدی "ادبِ لطیف" کے ادارے میں شریک ہو گیا اور ان دنوں وہ یکہ و تنہا اس بوڑھے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہے۔ کبھی پچکا کر کبھی چابک لہرا کر اپنا سفر طے کر رہا ہے بہت سے دوستوں کی طرح میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ ناصر اپنے اس سفر میں کامران رہے گا۔

ناصر زیدی ۱۴ر اپریل ۱۹۴۳ء کو مظفر نگر (یو، پی) کے ایک سید گھرانے میں تولد ہوا۔ ملک تقسیم ہوئی تو ہجرت کا ... سید ناصر رضا زیدی کے والدین لاہور میں سکونت ... لاہور جس کے بارے میں کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ جس نے لا... دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا اور جس نے لاہور کا پانی پی ... گویا پورے عالم کا پانی پی لیا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے ناصر ... کے ایک گرلز ہائی اسکول میں داخل دلا دیا گیا اور میرا ذا... ہے کہ اس اسکول کی سرزمین سے اس کی شاعری کا بیج پھوٹا۔ ... کی عمارت کا پہلا پتھر یہیں رکھا گیا اور یہیں سے ناصر زیدی ... شرافت اور سلیس زبان میں باتیں کرنے کی عادت پید... ہر شخص کو اپنے بچپن کی فضائیں عمر بھر نہیں بھولتیں اور میرا خیال ... اگر ناصر زیدی سے پوچھا جائے کہ تمہارے خوابوں کا وہ کونسا ... ہے جس میں تم نے زندگی کے معصوم دن گزارے ہیں تو ناصر ... کے ذہن میں ایک دم اس گرلز ہائی اسکول کی تصویر ابھر آئے ... کھیل کے سرسبز میدان میں رنگا رنگ تتلیاں اڑتی ہوئی محسوس ... ہوں گی۔ کچھ برس اس گرلز ہائی اسکول میں گزارنے کے بعد ناصر زیدی ... لاہور چلا آیا۔ اور لاہور سے انٹرنس کر کے اسلامیہ کالج میں داخل ... ہو گیا۔ یہاں سے پیام شاہجہان پوری کے خلوص نے اسے ہفت روزہ ... "حمایت اسلام لاہور" سے وابستہ کر دیا۔ پیام صاحب کا عقی... "نوسوی" اور پروفیسر علیم الدین سالک (سابق وائس پرنسپل ... اسلامیہ کالج) کا "علم سلوک" ناصر زیدی کو کوئی صوفی تو نہ بنا ...

ابتدا سے ایک غزل گو شاعر اور ذہین اڈیٹر مزدور بنا دیا۔ پھر وہ ماہنامہ "گل خزاں" کا اسسٹنٹ اڈیٹر بنا اور ابھی اسے مرتب کرتے ہوئے ایک سال ہی گزرا تھا کہ "شمع" کی نظر اس پر پڑی اور وہ قریباً تین برس تک ادارۂ شمع پر جان نثار کرتا رہا۔ اب ماہنامہ "شمع" سے علیحدہ ہوئے اسے دو برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور اس وقت سے اب تک وہ ماہنامہ ادب لطیف کا مدیر ہے۔

ناصر زیدی فطری طور پر غزل کا شاعر ہے۔ وہ ذہن کی بیدار سوچوں کے ساتھ دل کے گہرے جذبات میں ڈوب کر زندگی کے خونیں لمحوں کی واردات بیان کرتا ہے جس پر کبھی تو کلا کھلے ہوؤں، در شفق کی گلرنگی کا گمان ہوتا ہے۔ اور کبھی کسی بے گناہ مصلوب انسان کی لو روتی آنکھوں اور آگ اور خون کے دو دریاؤں سے جنم لیتے ایک تیسرے دریا کا۔

ناصر کی غزلیں پڑھ کر مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناصر کے ہاں زندگی کی جولانیاں ہونے کے باوجود ناکامی عشق کا گمبھیر احساس موجود ہے۔ ذاتی طور پر اس شکست یا احساسِ شکست کی کھوج میں ابھی تک نہیں لگا سکا یعنی ممکن ہے اسی احساسِ شکست نے ناصر کو شاعری کے انداز سکھائے ہوں۔ ذرا آپ بھی اس دریا کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

لٹ چکا ہوں رہِ تمنا میں
آرزو اب تو چھوڑ دے دامن

ناصر ہم احتیاطِ تمنا کے باوجود
ایک حسنِ فتنہ کار کے دھوکہ میں آ گئے

عالم روشن ہیں تمہاری آشاؤں کے سندر دیپ
سہانی یادوں کے کچھ دھندلے سے اجالے ہیں

در جاں کبھی وہ بھی نہ ساتھ دے سکے
مرحلے لاکھ اب کون جہاں میں ہو حبیب؟

عاشقی ناکام ہو کر رہ گئی ؛ زندگی بدنام ہو کر رہ گئی
ہر تمنا اس دلِ بیتاب کی ؛ اک شکستہ جام ہو کر رہ گئی

ہم تو اب خاک ہو چکے ناصر
لوگ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا

دل محوِ غم و یاس ہے آنکھوں میں نمی ہے
اک حسرتِ ناشاد کہ پلکوں پہ تھمی ہے

ترجمانِ غمِ دو جہاں بن گئی
زندگی دکھ بھری داستاں بن گئی۔

مناؤں گا حسرتوں کی برسی
وہ آج کے دن جدا ہوا تھا

بعض اشعار میں یہ احساس ناکامی کسی قدر کم ہے اور شوخی کا سا رنگ پیدا ہو گیا ہے:-

مدت ہوئی کہ آپ نے خط تک نہیں لکھا
اس بے رخی کا کوئی سبب تو بتائیے

خفا نہیں ہے مگر اس ادا کو کیا کہیے
پکارتا ہوں تو وہ مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

بسا ہوا ہے مرے دل میں بوئے گل کی طرح
وہ دور دور ہے مجھ سے مگر جدا بھی نہیں

ان ناکامیوں کے باوجود جیسا کہ مندرجہ بالا شعر سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ناصر زیدی اپنے مخاطب سے اب بھی بے حد مخلص ہے۔ خواہ اس نے میرا جی کی طرح محبوب کو ایک جھلک ہی دیکھا ہو۔

شاید کسی مقام پہ میں کام آ سکوں ؛ مجھ کو بھی ساتھ لیجیے تنہا نہ جائیے

پوچھتا ہوں تجھے خیالوں میں
کر رہا ہوں میں بندگی خاموش

یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے
کہ اب تو ترکِ تمنا کا حوصلہ بھی نہیں

کہاں تلاش کریں جز ترے سکونِ نظر
کہ اس جہان میں کوئی تجھ سا دوسرا بھی نہیں

ناصر رضوی کی شاعری میں سیاسی نظریات کا پرچار کہیں نظر نہیں آتا البتہ ایک چیز ناصر کے کلام میں بیشتر جگہوں پر نظر آتی ہے اور وہ ہے موجودہ ترقی یافتہ دور کی تیز اور آنکھیں چندھیا دینے والی "فلیش لائٹ" کے عقب میں چھپی ہوئی گہری ظلمت کا شعور۔ ناصر کو یہ احساس عموماً اداس اور مضطرب کر دیتا ہے کہ تہذیب کی بیہودہ قدریں انسانیت کے لئے دکھ اور بے مہری کے "راؤنڈ گولڈ" سے سجے ہوئے تحفے لا رہی ہیں۔ انسان اڑ رہا ہے اور کھربوں برس سے ارتقائی منازل طے کرنے والا انسان آج یسوع مسیح کی ایک بھٹکی ہوئی بھیڑ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ناصر کے لفظوں میں ؎

پھیلتی جا رہی ہے تاریکی
شام محسوس کر رہی ہے تھکن

باتیں ہیں اجلی اجلی اور من اندر سے کالے ہیں
اس نگری کے سارے چہرے اپنے دیکھے بھالے ہیں

تاکہیں نہ ہو رسوا ۔ زندگی کا بدل رہا ہے چلن

اے رہروانِ منزلِ شوق کیوں ہے سنسان راستہ کچھ سوچ!

بندیوں میں عزِ لغاتِ عندلیب ۔ فصلِ بہارِ زندگی ہوتی رہی حراں نصیب

بقیہ "سچائی"

بلکہ اپنی روح کی سچائی کو بھی کھو جنے کے لئے۔ وہ کون سے نعرے ہیں جو ہمارے لئے بے معنی ہیں اور وہ کون سے چلن ہیں جو ہماری زندگی میں رکاوٹ اور ہماری زندگی کے لئے گھاتک ہیں اس کے لئے ہم نا قابل تردید سچائیاں تلاش نہیں کر پاتے لیکن ہم یوں اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "حصولِ علم کے لئے محبت" "محبت کے لئے محبت" اور "سچائی پر پہنچنے کے لئے محبت" ایسے عظیم احساسات ہیں جو انسان کو غلط کاریوں سے دور رکھ کر اسکے قدم خوشی اور تسخیر کن منزل کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔

اس دنیا میں کتنے ہی بے وقوف اور کتنے ہی باشعور پیدا ہوئے ہیں اور پیدا ہوں گے مگر ہر شخص اداس رہے گی کیونکہ جاہلیت اور عقلمندی کی سبیج اور جھوٹ سچ اور ناسمجھی کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج حائل رہتی ہے اور ہم میں سے کوئی اس وسیع خلیج کے اس پار یا اس پار کھڑا ہوا ہے۔

مفتون کوٹوی

"موجِ گل" پر ایک نظر

مئی ۱۹۶۵ء میں "موجِ گل" کے نام سے ... سید محمد ایس۔ ایس حسین ریحانی لکھنوی کا مجموعۂ غزلیات شائع ہوا ہے جس میں دو فنی طور پر ... زبان اور فن کے آئینے میں عہدِ حاضر کے تقاضوں کا ادراک اور احترام ... پایا جاتا ہے۔ فن اور فن کار دونوں ہی اپنے نقش و نگار اور حسن و دلچسپی کے ساتھ اس میں جلوہ گر ہیں۔ جناب ریحانی کی پاکیزگی و شائستگی اور ان کے فکر و نظر کی بلندی و خوش ذوقی ——— زبان و بیان کی نفاست و نزاکت کے ساتھ اپنے ... ہے۔ "موجِ گل" اردو غزل میں یقیناً ایک خوشگوار اضافہ ہے حسین و زریں بھی گراں قدر و بیش بہا بھی ———

موجِ گل کے ظاہر و باطن دونوں خوب ہیں۔ جناب ... استاذِ معظم پدم بھوشن حضرت نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے بجا ارشاد فرمایا ہے کہ جناب ریحانی ... خیالات میں علو اور اسلوب ادا میں انفرادیت ہے۔ اور حقیقت کو زیورِ شاعری سے آراستہ کر کے ایک پیکرِ حسن بنا دیتے ہیں۔ موجِ گل کی ترتیب تاریخ وار ہے اور تجزیہ کے لئے یہ ایک بڑی مفید چیز ہے۔ گلستانِ اردو ... باغبانوں نے اپنے فکر و فن سے نکھارا ہے اپنی جگر کا دیا ... سوزوں سے روح بخشی ...

والوں نے اپنے اعتقادات و نظریات سے اسے ... کیا ہے یہ ہمارے ملک کی یکجہتی اور ... اتحاد و اتفاق کا عملی نمونہ ہے ... یہ اس مجموعہ کی پہلی نظم ہے اور اس کے آخری شعر سے اس تقریب خوش خبری میں ایک غزل پڑھتا ہے ... غزل گوئی کی جانب ... ریحانی نے گریز پیدا کیا ہے اس کے بعد جو غزل کہی ہے اس میں ... زور بیان پایا ہے فکر و فن دونوں لحاظ سے اس غزل کا یہ شعر کتنا ... اور ... ہے ~

عزم منزل ... دل میں ... ہے رہبر ... ہر

اس کے بعد کی غزل کا مطلع بھی کہیں ... کا حامل ہے ~

... طرح آشیانے کا
موافق ... آئے ... زمانے کی

کام کو شروع کر دینے کی ترغیب اس شعر میں بھی ہے۔ تدبیر کرنا اپنا کام ہے اسے تکمیل تک پہنچانا خدا کی مرضی ہے۔ ہمیں اپنا فرض ادا کر جانا ہے نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے ~

بنیاد آشیاں تو رکھ دی چمن میں ہم نے
کرنے دو ... جو ... کرتے ہیں

... ساحل کے ... ارث

کیا پہنچیں گے وہ قامت و گیسوئے یار تک
کھاتے ہیں خوف جو رسن و دار دیکھ کر

کر دیا ترک جو کشتی کا سہارا ہم نے
پا لیا بحر موج کے دامن میں کنارا ہم نے

ان کے ہر ایک گام پہ لعل و گہر ملے
پائے بہ آبلہ سے جو گرم سفر ملے

وہ خود تدبیر و عمل کرنے کا سبق دیتے ہیں "پدرم سلطان بود" کے قائل نہیں ہیں ؎

داستان سلف سے کیا حاصل
جب نہیں معتبر تری روداد

کوشش اور جد و جہد کی طرف متوجہ کرنے کے لئے وہ کس خوبصورت انداز میں ترغیب دیتے ہیں ؎

ہیں ایک وہ بھی جو کرتے ہیں مہر و مہ تسخیر
اور ایک ہم ہیں کہ ذروں پہ دستگاہ نہیں

ہیں سنگ و خشت ایک زمانے سے منتظر
تعمیر کر حیات کے عنواں نئے نئے

لیکن یہ مہر و ماہ کی تسخیر اسی وقت مناسب ہے جب انسان انسانیت کا علمبردار ہو، امن و اماں کا پاسبان ہو۔ وہ اگر انسانیت کھو بیٹھا۔ یا اپنی ترقی پسندی سے امن و اماں کے لیے خطرہ بن گیا۔ تو پھر تمام بلند پرواز یاں بیکار ہیں ؎

وہ کیا منزلے کر جاتا ہے اجرام سماوی سر کرنے
جب ظالم انساں امن کا جلوہ دنیا میں دکھلا نہ سکا

تو نے سوچا کبھی اے رہرو ماہ و مریخ
کرۂ ارض کی پستی کا مداوا کیا ہے؟

دل سے بیگانہ ہوا دام خرد میں پھنس کر
اس ترقی پسند انساں پہ ہنسی آتی ہے

جناب ریحانی آسمان، چاند اور ستاروں کی تسخیر سے پہلے زیادہ مقدم اس امر کو سمجھتے ہیں کہ انسان درد آدمیت رکھے۔ انسان نفرت سے دور اور محبت سے لبریز ہو۔ بشر کے غم کا مداوا تلاش کرنا ان کے نزدیک چاند اور مریخ کی وسعت پیمائی سے زیادہ ضروری ہے ؎

وہی بشر ہیں جو بڑھتے ہوئے کفن سر سے
بشر کے غم کا مداوا تلاش کرتے ہیں

بدتر ہے سنگ و خشت سے وہ کائنات میں
خالی غم بشر سے جو قلب بشر ملے

جو کوئی رکھتا ہے انساں کی رفعت پہ نظر
اس کی آنکھوں میں بھلا اوج ثریا کیا ہے

حقیقت میں پیکر ہے انسانیت کا
وہ انساں جو انساں کا غم کھا رہا ہے

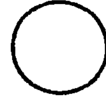
ان معنوی خوبیوں کے علاوہ ان کے کلام میں زبان و بیان کی بھی کئی لطافتیں ہیں محاورہ و روزمرہ کا چٹخارا ملاحظہ کیجیے ؎

گلستاں دیکھتا ہوں تو مرا ماتھا ٹھنکتا ہے
نہ جانے کیوں عداوت ہے عنادل کو عنادل سے

انساں نے ہاتھ سان کے انساں کے خون سے
داماں کائنات پہ دھبہ لگا دیا

لیلٰے سے کوئی پوچھے کیوں زینت محمل ہے
مجنوں کو نہ کچھ کہیے دیوانہ تو دیوانہ

محمد علوی



بکھرتا ہوں پڑا ریگ زار میں اب بھی
کوئی تو ہوگا مرے انتظار میں اب بھی

لرزتا ہاتھ، بھری آنکھ، غمزدہ چہرہ
دکھائی دیتے ہیں مجھ کو غبار میں اب بھی

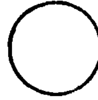
ہر ایک چیز سے اُکتا گیا ہے دل اپنا
وہی کشش ہے مگر حسنِ یار میں اب بھی

مجھے پتہ ہے وہ کب کی چلی گئی ہوگی
کھڑا ہوا ہوں میں بس کی قطار میں اب بھی

ذرا ٹھہر میں ابھی توڑ پھوڑ ڈالوں گا
یہ کائنات ہے میرے حصار میں اب بھی

زمانہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے علوی
ہمارا نام ہے یاروں کے یار میں اب بھی

کرامت علی کرامت



ہاتھ آ گیا ہے جب سے شعورِ خودی کا سانپ
سینے پہ لوٹتا ہے غمِ زندگی کا سانپ

اپنے بدن سے خول اَنا کا اُتار کر
پھنکارتا ہے شام و سحر آگہی کا سانپ

میں کھیلتا ہوں اس سے مگر جانتا ہوں یہ
اک دن مجھے ڈسے گا نئی روشنی کا سانپ

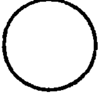
کیوں من کا مور پنکھ نہ اپنے سمیٹ لے
آنگن میں کھیلتا ہے غمِ عاشقی کا سانپ

موجِ سراب کا بھی پتہ دور تک نہیں
شدت سے ڈس رہا ہے مجھے تشنگی کا سانپ

تہذیب کا کھنڈر ہے، نگاہوں کے سامنے
وہ رینگتا ہے دیکھئے، اک خامشی کا سانپ

کیوں نیل کنٹھ بن کے نہ پی جاؤں اس کو میں
جو زہر اُگل رہا ہے غمِ آگہی کا سانپ

ظفر صہبائی



تم ملے تو تم سے مل کر چند لمحے ہنس لئے
ورنہ سنجیدہ تھے اک عرصے سے اپنے قہقہے

زندگی کو آئینہ دکھلائیے لیکن حضور
آپ اگر خود اپنی ہی پرچھائیوں سے ڈر گئے

آدمی خود اپنے ہی اندر سمٹتا جائے ہے
پھیلتے جاتے ہیں جتنے خواہشوں کے دائرے

ریت کے اس پار کیا ہے، جلتے سورج کے سوا
جانے والے اس طرف جا کر پشیماں ہو گئے

چاٹتے ہیں آدمی کا جسم دیمک کی طرح
جن مسائل کو دیا ہے جنم خود اس جسم نے

وقت جب کروٹ بدلتا ہے بدلتے ہیں ظفر
زندگی کے فلسفے، فکر و نظر کے زاویے۔

رئیس امروہوی

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں
وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں

عجب اک سرِّ مبہم ہے مری ذات
نہ سمجھا ہوں نہ سمجھایا گیا ہوں

مرے نقشِ قدم آنکھوں سے اوجھل
مگر ہر موڑ پر پایا گیا ہوں

پسِ دیوارِ فردوسِ معلّٰی
ستونِ عرش تھا ڈھایا گیا ہوں

مگر سنگِ رہِ تقدیر تھا میں
کہ ہر ٹھوکر سے ٹھکرایا گیا ہوں

کبھی ماضی کا جیسے تذکرہ ہو
زباں پر اس طرح لایا گیا ہوں

صلیب و مقتل و زنجیر و زنداں
یہ کن راہوں میں بھٹکایا گیا ہوں

مثال ۔ وحیٔ حقِ انسانیت کے
ہر اک وقفے میں دہرایا گیا ہوں

جو موسیٰ تھا تو ٹھکرایا گیا تھا
جو عیسیٰ ہوں تو جھٹلایا گیا ہوں

جہاں ہے رسمِ قتلِ انبیا کی
وہاں مبعوث فرمایا گیا ہوں

کسی محفل میں دل پر جبر کر کے
رئیس آیا تو بے مایا گیا ہوں

ناصر شہزاد

ابھرے کئی غم صفحۂ ماضی پہ سمٹ کر
کل راہ میں اس نے مجھے دیکھا جو پلٹ کر

پلکوں کی گھنی چھاؤں میں وہ سوچتی اکھیاں
جیسے کہ خنک جل پہ گرے چاندنی چھٹ کر

مت مجھ سے الجھ آ کے تو اقلیمِ سخن میں
رکھ دوں گا میں پانسہ تری عظمت کا الٹ کر

گم ہو گیا کھڑکی میں وہ ہنستا ہوا چہرہ
جب دھول اڑی ریل کے پہیوں سے لپٹ کر

چھوڑے گی نہ پاؤں ترے مہکار زمیں کی
اڑ لاکھ تو آفاق کی وسعت میں اچٹ کر

آباد ہے پربت کی بلندی پہ، وہ بستی
بستی کے تلے بہتی ہیں، دو ندیاں کٹ کر

با دیدۂ نم اٹھ کے وہ رخصت ہوئی مجھ سے
شب اوٹ میں پیڑوں کی چھپا چاند جو گھٹ کر

•••

وحید قیصر

شاخساروں پہ چاندنی کا رقص
یا ترا حسن جلوہ گستر ہے

مسکراہٹ کو دیکھنے والے
زخم لالہ کے دل کے اندر ہے

پھول کا جس کو نام دیتے ہیں
وہ ترا ہی حسین پیکر ہے

میرا نغمہ خزاں کا نوحہ ہے
میرا نالہ فغانِ محشر ہے

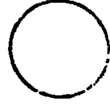
آج دستِ صبا بھی زخمی ہے
دامنِ گل بھی خون سے تر ہے

پھول ہے زخم، چاندنی نشتر
لہر جو ہے وہ ایک خنجر ہے

دلِ فنکاراں کے واسطے قیصر
یادِ یاراں بھی ایک نشتر ہے

•••

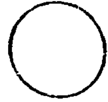
ساحل مانکپوری



ہوں غم ایام کے شعلوں میں تپا ہوں
تب جا کے میں رشکِ مہ و خورشید بنا ہوں
جس راہ پہ کل راہ نما بن کے چلا تھا
اس راہ پہ اپنا ہی پتہ پوچھ رہا ہوں
کل تک تو عطا کی تھی تمہیں روشنی میں نے
مان لیا آج میں بجھتا سا دیا ہوں
اے دوست مرے دل میں نہ چھل ہے نہ کپٹ ہے
کاغذ کی طرح صاف بہت صاف لکھا ہوں
سورج کی طرح آپ مرے ساتھ لیے ہیں
بن برف کی مانند پگھلتا ہی گیا ہوں
مجھے گردشِ ایام اے ساحل
غم دل سے بہت ٹوٹ چکا ہوں

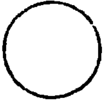
•••

عبد الرحیم نشتر



اپنی لہروں دھوپ میں دامن سکھانے دے ہمیں
یا پھر اپنے ہی لہو میں بھیگ جانے دے ہمیں
کون روکیگا ہوا کے تند جھونکوں کی صفیں
سر پھرے ساگر پہ تھوڑا پھیل جانے دے ہمیں
اپنی موجوں کے حصاروں میں ہمیں محبوس رکھ
دور کے ساحل کا لاشہ مت اٹھانے دے ہمیں
نیم کے پتے نہ جانے کن دشاؤں میں گئے
گمشدہ کڑواہٹوں کا غم اٹھانے دے ہمیں
تو اگر چاہے تو پتھر جسم میں ڈھل جائیں گے
خود کو جادو خیز ہاتھوں سے چھوانے دے ہمیں

امان شام نگری



نغموں کے اودے ٹیکے ہیں مونڈھے سر پہ رات بہت
یاد کی بجلی بن کے تڑپی بھولی بسری بات بہت
ایک صفر کے گم ہونے سے بچ رہتا ہے ایک فقط
اس تعداد کے الٹے نگر میں دس ہیں کم اور سات بہت
حسن کے جھوٹے دعووں کی تعداد بتانا مشکل ہے
جیسے اک شاداب شجر کی ڈال ہوں کم اور پات بہت
سیم و جواہر کی چمکی میں بس کے رہیں کچی کلیاں
اونچے ان کے نعل ہیں ہے اونچی جن کی ذات بہت
آج تو کل راتیں ہیں اندھیری جیسے رات اماوس کی
میرے جیون میں چمکی تھی پونم کی اک رات بہت
نفس کے اندھے ساگر کو گر روک سکو تو روکو تم
خواہش کے رستم کے ہاتھوں کھا جانے ہیں مات بہت
کھلتے لیے زخموں کے غنچے ہر ہر گام پہ راہوں میں
آبلہ پائی کے نغمے تھے منزل تک جذبات بہت

•••

شمارہ ۶ ۱۹۶۸ء

عشرت ظفر

اٹھائے دوش پہ تاریخ حادثات جہاں
گزر رہا ہے دیارِ حیات سے انساں
بچھا رہا ہے فضاؤں میں دام کاہکشاں
ترے گداز بدن کا تبسم پنہاں
لبوں پہ لاکھ لگائے کوئی سکوت کی مہر
مگر خموش نہ ہوگی جراحتوں کی زباں
بھڑک اٹھے نہ کہیں پھر چراغِ زخم کی لو
سنبھل سنبھل کے سناؤ حدیثِ شہرِ بتاں
دھواں دھواں سی ملی ہے فضائے شہرِ جنوں
[illegible]ی ہے رات گئے جب بھی مشعلِ زنداں
[illegible]ہ جہاں ہے کہ ہر شہرِ سنگ و خشت کے بعد
قدم پہ ہے عشرتِ دیارِ شیشہ گراں

•••

ھینس ریحانی

نذرِ غالب

نظر کچھ اور آئے زندگی کا رنگ عالم میں
اگر انساں ہو جائے شریکِ انساں کے غم میں
یہ کیا جبرِ مشیت ہے، اٹھا کر پی نہیں سکتے
اگرچہ فاصلہ کچھ بھی نہیں ہے جام اور ہم میں
پہنچ کر محفلِ ناہید میں اک روز دم لیں گے
ترانے گائے جائیں گے ہمارے خیر مقدم میں
بنا دیں گے گلستاں در گلستاں ہر ستارے کو
نہاں روحِ بہاراں ہے ہماری سعیِ پیہم میں
تمہارے میکشوں کے دامنِ تر سے لپٹ جائے
کہاں ہے تاب آتش شعلہ، نارِ جہنم میں
ہماری حسرتیں یوں تو بہت نکلیں مگر اب بھی
دلِ پُرغم میں کچھ ہیں اور کچھ ہیں چشمِ پُرنم میں
ابھی تو اس نے تسخیرِ فضا کی ابتدا کی ہے
نہ جانے اور کتنا حوصلہ ہے ابنِ آدم میں
کبھی پھولوں کی صحبت میں ہنستے تھے ہم بھی ریحانی
سزا اس کی ابھی تک مل رہی ہے باغِ عالم میں

گوردیو نردھن (پنجابی)

ترجمہ:- آزاد گلاٹی

گرم دھند کی پرچھائیں کو ترس گئے ہیں لوگ
اپنے ہی سورج کی آگ میں سلگ رہے ہیں لوگ
لئے پھرتے ہیں اپنی صلیبیں اپنے کندھوں پر
دیکھیں اس جلتے موسم میں کیا کرتے ہیں لوگ
بیٹھے رہتے جو نظروں جیسے گھنے اندھیرے میں
کھول کے گھر کے دروازے اب بھاگ رہے ہیں لوگ
کھڑے ہوئے بجلی کے ان کھمبوں کی مانند ہی
شہر شہر سڑکوں پر راتوں کو جلتے ہیں لوگ
سامنے بنی ہوئی اک مورت دیکھتا ہوں نردھن
کھنچے ہوئے خاکوں کے اندر رنگ بھرتے ہیں لوگ

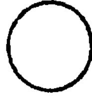
•••

وسیم شعلہ

ان انگاروں سے میں کیوں کھیلتا ہوں
پریشاں ہو کے اکثر سوچتا ہوں
عجب انسان میں واقع ہوا ہوں
کہ اپنی روح کو خود روندتا ہوں
ان احساسات کے آتش کدوں میں
مسلسل جل رہا ہوں، جل رہا ہوں
ہزاروں خواب دھندلائے پڑے ہیں
مگر میں خواب اب بھی دیکھتا ہوں
بچا لو دھوپ کی شدت سے مجھ کو
خیالوں کے بھنور میں گھر گیا ہوں
نہیں اک بوند پانی کی میسّر
سمندر میں تڑپتا مر رہا ہوں
نئی پر اک انوکھا خواب بن کر
مسلسل پھیلتا ہی جا رہا ہوں

■ ■ ■

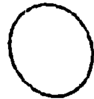
نذیر احمد فراز



اب در و دیوارِ زنداں میں وہ رنگ و بو نہیں　　کوئی دیوانہ اسیرِ حلقۂ گیسو نہیں
ایک سناٹے کا عالم درد کے صحرا میں ہے　　اس بیاباں میں کسی کی یاد کی خوشبو نہیں
جی رہے ہیں اس طرح زندہ دلانِ شہر بھی　　جیسے رقاصہ کے پائے ناز میں گھنگھرو نہیں
اوڑھ لی ہے چاند تاروں نے سیاہی کی ردا　　جگمگانے کے لئے پلکوں پہ بھی آنسو نہیں
موم کر دے عہدِ حاضر کے خداوندوں کا دل　　ساحرانِ وقت کیا ایسا کوئی جادو نہیں

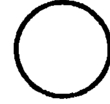
پھر رہے ہیں اے فراز اب بتکدہ در بتکدہ
شاہکارِ سنگ میں محبوبیت کی بو نہیں

رحمت امروہوی



شانِ عشق ہم سے ہے، ہم وفا کے پیکر ہیں، شاعری ہے فن یارو
جوئے شیرِ تخلیقیں، اور یہ قلم تیشہ، ہم ہیں کوہکن یارو
زندگی کی راہوں میں، لاکھ پیچ و خم آئے، حوصلہ نہیں ہارا
کج کلاہ کل بھی تھی، اور اب بھی قائم ہے، اپنا بانکپن یارو
ان کے ساتھ گذرے تھے، گفتگو میں کچھ لمحے، مدتیں ہوئیں لیکن
آتشِ تخیل سے، جل رہا ہے یادوں کا آج بھی بدن یارو
شاعری کے پردے میں، جب بھی کچھ حقائق پر، ہم نے روشنی ڈالی
کتنے دل سلگ اٹھے، اور کتنے ماتھوں پر آ گئی شکن یارو

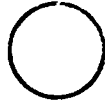
حباب ہاشمی فتحپوری



نمائشِ حسن تو ذرا دیکھو
اپنے گھونگھٹ میں جل رہا ہے چاند
دیکھ کر ڈوبتے ستاروں کو
کفِ افسوس مل رہا ہے چاند
آج ہے یہ ہلال، کل ہے بدر
کتنے عنواں بدل رہا ہے چاند
نور میں ڈھل رہی ہے تاریکی
دھیرے دھیرے پگھل رہا ہے چاند
انجم و کہکشاں کی وادی میں
گرتے گرتے سنبھل رہا ہے چاند
کتنی یادوں کے دیپ روشن ہیں
شاہکارِ ازل رہا ہے چاند
چاند پر یہ گہن نہیں ہے حبابؔ
خون چہرے پہ مل رہا ہے چاند

● ● ●

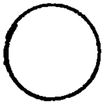
عزیز الرحمن بھاگلپوری



زندگی ایک لچکدار کماں ہو جیسے
کسی چٹخے ہوئے پتھر کا نشاں ہو جیسے
گھر کے آنگن میں ہوا رقص کناں ہو جیسے
ہر صدا پر ترے قدموں کا گماں ہو جیسے
جسم جلتا ہے تو آنکھوں سے شرر اڑتے ہیں
خاکِ دل میں کوئی شعلہ سا نہاں ہو جیسے
یہ مری زیست یہ طوفانِ حوادث یارو
تیز دھارے پہ سفینہ سا رواں ہو جیسے
زندگی سے ہے ہر اک شخص پریشاں خاطر
موت ہی شہر میں اک جنسِ گراں ہو جیسے
سالہا سال سے ویران پڑا ہے یارو
دل کہ اجڑا ہوا سنسان مکاں ہو جیسے
ظلم چپ چاپ عزیزؔ آپ سہے جاتے ہیں
آپ کے پاس قلم ہو، نہ زباں ہو جیسے

● ● ●

رضا اشک سمستی پوری



دامن سے اپنے جھاڑ کے صحرائے غم کی دھول
آؤ، چنو نہ ہم بھی چنیں سرخوشی کے پھول
آخر کو مل سکی نہ بشر کو رہِ نجات
یوں تو ہر ایک دور میں آتے رہے رسول
دامن بچا کے آئیو میرے مزار تک
اے جانِ نو بہار، اُگے ہیں اِدھر ببول
دیکھا کبھی جو دہر کو شاعر کی آنکھ سے
خلاقِ کائنات بھی صدیوں رہا ملول
آئے گا کوئی جام مئے سرخوشی لئے
اے دل کچھ اور دیر ہنڈولے میں غم کے جھول

● ● ●

اجد الباقری

ہوبر کا شاہکار

کافوس کے عجائب خانے میں جہاں دنیا کے دیگر شاہکار [illegible] دیدہ زیب ہیں وہاں ہوبر کا شاہکار بھی اپنی نوعیت کی شے ہے۔ عجیب ہے۔ اس میں چھپی ہوئی کہانی بھی اتنی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے [illegible] سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اگر اس امر کو تسلیم کر لیا جائے کہ سافون کا حسن و جمال اور حسن کار برتان فلسفی کے اقوال و افکار، الیسالوکی کے مجسموں اور ہوبر کی تصاویر سے جو فن ظاہر ہوتا تھا وہ ان کے دور کا صحیح عکاس اور معیار کے اعتبار سے منتہا کا آئینہ دار تھا تو یہ راز بھی افشا ہو جاتا ہے کہ ہوبر کی بنائی ہوئی تصویر شاہ اطلانس کے حجرے میں جب شدید زلزلے کے باعث دیوار سے گر کر ٹوٹ گئی تھی تو اس تصویر میں برتان کی کنپٹی اور آنکھوں کے گڑھوں کے شکستہ نقوش جو کہ ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیاں بن گئے [illegible] ہو گئے تھے۔ ان کی مرمت اور درستی کا کام جس مصور نے پُراسرار طریقے پر شاہ اطلانس کی نگاہوں سے چھپ کر کیا تھا وہ یقیناً ہوبر ہی تھا جو کہ شاہ کے ساتھ بھیس بدل کر ایک سائیس کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا۔ اور اس تصویر کی درستی کے بعد وہ پھر کہیں نظر نہیں آیا۔ سنا ہے شاہ اطلانس اس سائیس کی یاد میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔

تخت و تاج کو خیرباد کہہ کر شاہ اطلانس اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے محلات کی ایک پرسکون کوٹھری میں گزارتے رہے۔ جہاں ان کا کوئی رازدان نہیں تھا۔ صرف ایک بوڑھا سائیس تھا جو حکم شہ پر مرہم [illegible] افزا کرتا تھا۔ اس حجرے میں ہوبر کی بنائی ہوئی ایک تصویر تھی جس کے گرد ہاتھی دانت کی چکنی ہڈیوں کے جو کھٹے لگے ہوئے تھے۔ یہ تصویر اسی سائیس نے پیش کی تھی اور بتایا تھا کہ ہوبر اس تصویر کو مکمل کرنے کے بعد جاں بحق ہو گیا ہے۔ شاہ تنہائی میں اس تصویر کو سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے کئے ہوئے ظلم و ستم کی یادیں تازہ کر کے پچھلے گناہوں کی معافی کے لئے گڑگڑایا کرتے تھے۔ سائیس نے جب کبھی ان سے اس مرقع میں منقش فن کاروں اور شاہزادی سافون کی موت کا ذکر چھیڑا تو شاہ گرج کر کہا کرتے تھے۔

"اگر ہوبر مجھے مل جائے تو میں ہر قیمت پر اسے جان سے مار دوں اور اس تصویر کو ایسی جگہ دفن کر دوں جہاں سے یہ پھر کبھی نہ اکھڑ سکے۔

اور کہتے۔

"ہوبر نے میرے دور کی تاریخ اس طرح اس ایک تصویر میں بند کر دی ہے جس سے میں ہمیشہ ظالم ہی سمجھا جاؤں گا۔"

یہ تصویر روغنی رنگوں کی آمیزش سے تیار کی گئی تھی۔ اس کے بیچوں بیچ شاہ اطلانس کی جمیلہ عالم شاہزادی سافون کا بدن ابھرا ہوا مجسم نظر آتا ہے۔ مجسمے کے گلے میں حمائل اس کے محبوب برتان فلسفی کے ہاتھوں کی ہڈیاں محراب بناتی ہیں جو کہ بڑے بڑے سفید پھولوں کے ہار کی طرح لٹک رہی ہیں اور اسی تناسب سے شاہزادی کی ٹھوڑی اور بائیں طرف کی چھاتی سے چمٹی ہوئی کنپٹی، دانت اور سر کی ہڈیاں ہیں اور ہڈیوں کا باقی ڈھانچہ سفید ہار کی طرح پیروں تک لٹکا ہوا ہے۔ اسے دیکھنے سے پہلی نظر ہی میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص اپنی محبوبہ

کی گردن میں بانہیں حمائل کرکے یونہی لٹکا لٹکا سوکھ گیا ہے۔ سوکھی ہوئی آنکھوں کا زاویہ مجسمے کی آنکھوں میں پیوست نظر آتا ہے۔ بغل میں سہی فلسفی کا حریف الیسمالوکی کھڑا ہوا پھولوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری میں سے آہستہ آہستہ پھولوں کی پنکھڑیاں اس سوکھے ہوئے انسانی ڈھانچے پر نچھاور کر رہا ہے۔ آنسوؤں سے اس کی داڑھی بھیگ رہی ہے اور اس کے بت تراشی کے اوزار شاہزادی ساثون کے قدموں سے ذرا ہٹ کر برتان کے پیروں کی ہڈیوں کے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ قبرستان کی فضا سحر زدہ معلوم ہوتی ہے۔ تین سمتوں سے گرد و غبار میں چمکتا ہوا شاہ اطلانس کے سپاہیوں کا سامانِ ضرب (برچھی، بھالے، نیزے، سنگین، بکتر) نظر آ رہا ہے۔ الیسمالوکی کا دوست ہوبر ایک گوشے میں بیٹھا ہوا یہ مرقع تیار کر رہا ہے۔ غور سے دیکھنے پر تصویر کے مرغولی خطوط کچھ اور پیچیدہ ہونے کے بعد عملی حاضرات کی طرح تمام ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاہی سپاہ ساثون کے مجسمہ کے ساتھ سارے قبرستان کو گھوڑوں کے ٹاپوں سے روندتی ہوئی واپس جا رہی ہے۔ اس تصویر کے پس منظر میں نقوش کے ابہام اور تجریدی جنبشوں سے شاہی ظلم و استبداد، رعایا کی بدحالی، عشاق کی بے چارگی، محبوب کی بے حرمتی، احباب کی دغا، سماج، زندگی اور فن کی ٹوٹ پھوٹ کے تمام پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔

شاہزادی ساثون کو واقعی برتان فلسفی سے حقیقی محبت تھی لیکن الیسمالوکی شاہی قربت اور بت تراشی کے فن میں مہارت کی وجہ سے خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی بنا پر فرمانِ شاہی کے مطابق شاہزادی کو مطلع کئے بغیر اس کی شادی ساثون کے ساتھ ہونے والی تھی لیکن جیسے ہی شاہزادی کو اپنے باپ کی اس زیادتی کا علم ہوا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی مرضی کے خلاف الیسمالوکی سے کرنے کا فرمان جاری کر دیا ہے تو وہ چپ چاپ زہر کھا کر ہلاک ہو گئی۔

شاہی قبرستان میں نصب ساثون کا قد آدم مجسمہ الیسمالوکی کے فن بت تراشی کا شاہکار ہے جو اس نے اپنی خوش فہمی سے ساثون کی دلی محبت کا ادراک کر کے شاہ اطلانس کی خواہش کی تکمیل میں بنایا تھا جس کے ایک ایک نقطے کے اتار چڑھاؤ میں زندگی رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شاہ اطلانس نے الیسمالوکی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ شاہزادی نے آج خودکشی کر لی ہے اور جب مجسمہ تیار ہو جائے اس کی ہلاکت کی ذمہ داری اس پر عائد کر کے طویل مدت کے جیل خانہ میں ڈال دے گا۔ اگر اسے اس بے دردی کا پہلے سے علم تو وہ کبھی ساثون کے مجسمہ میں اپنی جان نہیں کھپاتا۔ مجسمہ کی تیاری کے شاہ نے الیسمالوکی کو جیل خانے کی بھاری سلاخوں میں بند کر دیا۔

جیل خانے کے معیاد پوری کرنے کے بعد جب وہ آزاد ہوا تو شاہ اطلانس کی حالت ہی بدل چکی تھی اب اس کا کوئی رفیق کار یا ہمدم موجود نہیں تھا۔ وہ سیدھا اپنے شاہکار کی زیارت کے لئے شاہی قبرستان گیا اور [illegible] کا ہو رہا۔

ساثون کی آنکھوں کے ذریعہ اب برتان فلسفی کی روح اس مجسمہ میں داخل ہو چکی تھی اور اب شاہی قبرستان میں شاہزادی ساثون کے مجسمہ کے سوا کوئی شاہی مجسمہ موجود نہیں تھا اس علاقے میں وہی ایک آزادی کی علامت تھی۔ شاہزادی کی خودکشی کے چرچے زبان زد عام ہو چکے تھے۔ عوام شاہی عمارتوں اور متعلقہ چیزوں سے غلاظت کی حد تک نفرت کرنے لگے تھے۔

برتان فلسفی جب اس قبرستان سے گزرا تو اس شاہکار مجسمہ کے [illegible] پہچان گیا۔ اسے اپنے تجربات، فن اور ناقدانہ نگاہ پر اعتماد تھا۔ مجسمہ کو [illegible] ہی دیر دیکھنے کے بعد اس نے محسوس کر لیا کہ یہ آنکھیں، یہ خد و خال، [illegible] اور انداز ایک ایسی روح کے آئینہ دار ہیں جس کا تعلق صرف اسی (برتان) کی ذات سے رہنا چاہئے اور جو صرف اسی سے محبت کرنے کے لئے تخلیق ہوئی تھی۔

برتان نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ بت تراش نے آنکھوں کی [illegible] کشش جو کہ صرف برتان کے لئے وقف ہونا چاہئے تھی ایک غیر ضروری لکیر سے اتنی مختلف کر دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والی کو مجسمہ تراش [illegible] حقیقی محبت تھی اور یہ بات برتان کے تجربے کے قطعی خلاف تھی وہ مجسمہ ساز کی اس بد دیانتی پر ناراض نہیں ہوا اس نے پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور ساثون کی آنکھوں کی غیر ضروری لکیروں کو گھس دیا جو کہ مجسمہ ساز سے محبت کی [illegible]

ظفر اقبال

"دکھ کے آنسو"

"چاند کی طرح روشن، پھول کی طرح کومل، دھنک کی طرح رنگین

...تم"

"تو"

بہت ہی حسین، کشمیر کے دل کش مناظر سے، شام اودھ کی رومان...

...پرور مہک سے اور صبح بنارس کی دل فریبی سے بھی زیادہ۔"

"کافی رنگین تمہید ہے، پھر؟"

"اس سے بھی زیادہ من موہنی اور دل کش ہو۔"

"شاعری کے موڈ میں ہو کیا۔ ؟"

"یقین جانو یہ ایک حقیقت ہے۔"

.... یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا آگے بڑھا۔

"مجھے چھونا نہیں۔" دور سے باتیں کرو۔"

"کیوں — ؟"

"ایسے ہی — !"

"میں تم سے قریب تر ہونا چاہتا ہوں۔"

"لیکن۔ میں نہیں چاہتی۔"

"ایسی بھی کیا ناراضگی — ؟"

"ہو لو .... میں منالوں گا۔"

"اب مجھے کچھ نہیں اچھا لگتا۔"

"کیوں — ؟"

"بہت دھوکے کھا لئے ہیں۔"

"مجھ سے بھی — ؟"

"تم جیسے ہزاروں سے۔"

"میں ایسا نہیں ہوں۔"

"مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے۔"

"اب ایسا بھی کیا۔ ؟"

"نہیں مجھے جانے دو۔"

"کہاں — ؟"

"جہاں کوئی نہ ہو۔"

"میں بھی چلوں۔"

"نہیں۔"

"اکیلے دل نہ لگے گا۔"

"تمہیں کیا — ؟"

"میرے دل میں جھانک کر دیکھو، کتنی محبت ہے۔"

"بہت محبت دیکھ لی۔"

"اتنی سنگ دل نہ بنو۔"

"میں سنگ دل نہیں ہوں۔"

"ظالم ہو — ؟"

"نہ ظالم۔"

"پھر کیوں مجھے اپنے پاس نہیں آنے دیتیں۔ ؟"

"مجھے چھوڑ دو میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔"

"کس نے کہا" ؟

"سب ہی کہتے ہیں۔"

"کون ! .... بتاؤ نا ۔ ؟"

"اوہ چھوڑو میرا راستہ ۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ میں بہت ستائی ہوئی ہوں ۔"

"تمہیں کس نے ستایا ہے ۔"

"بھولے نہ بنو تم سب جانتے ہو ۔"

"پھر بھی تمہارے منہ سے سننے میں زیادہ لطف آئے گا ۔"

"میں کہتی ہوں ۔ مجھے جانے دو پریشان نہ کرو ۔"

"میں تو نہ جانے دوں گا ۔"

"واہ ! اچھی زبردستی ہے ۔"

"کچھ بھی سمجھ لو ۔"

"مجھے کیوں ستاتے ہو ۔ ؟"

"میں کیوں ستانے لگا ۔ ؟"

"یہ کہتے ہوئے وہ ذرا ایھر آگے بڑھا ۔"

"مجھے نہ چھونا ۔ دور رہو ۔"

"کیوں تڑپاتی ہو ۔"

"میں نہیں تڑپاتی ۔"

"تو کیا میں ؟"

"میں کہتی ہوں ، میرا راستہ چھوڑ دو ۔"

"لو چھوڑ دیا ..... وہ اس کے سامنے سے ہٹتا ہوا بولا ۔"

"میرے ساتھ نہ آنا ۔"

"یہ شرط مجھے منظور نہیں ۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا ۔"

"آخر کیوں میرے پیچھے پڑے ہو ۔ ؟"

"اچھا اتنا بتاؤ کہاں جاؤ گی ۔ ؟"

"اپنوں سے دور بیگانوں کے دیس میں ۔"

"کیا تمہیں اپنے دیس سے پیار نہیں ۔ ؟"

"یہ کس نے کہا ۔ ؟"

"تمہیں نے ۔"

"نہیں تو .. .. مجھے اپنے دیس سے بہت پیار ہے ۔ بہت اچھا لگتا ہے اس کے روح پرور مناظر ، اس کی دلکشی فضا و دل فریب موسموں نے مجھے دل لگا دیا ہے ۔ کشمیر کی وادی کی خنک خنک اور مست فضائیں میرے اندر کھوئی ہوئی گنگا جمنا کا سنگم ، تاج ، ایلورا ، اٹھلاتی ندیاں گنگناتے رفتار انداز سے بکھرے ہوئے بھورے بھورے پہاڑ میری راگنی میں ان کا سرگم موجود ہے ۔ اور مجھے ان سے ازلی پیار ..... یہ کیا مجھے اپنے وطن کی ہر چیز سے پیار ہے ۔ میں ہر موجود ہوں اور ہر زبان پر رواں ہوں ۔ ہر سانس میں میری دھ میں اپنی وطن پرستی کی بنا پر ہی دنیا کے گوشے گوشے میں جانی جاتی ہوں ۔ لیکن افسوس ! اپنوں نے مجھے دھوکہ دیا ۔ نظر انداز کیا ۔ اور اب مجھے دیس سے یہ کہہ کر نکالا جا رہا ہے کہ میں ہوں ۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا ۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا ۔"

"یہی ہو رہا ہے خدا جانے تم کیسی باتیں کرتے ہو ۔"

"ہم ایسا نہ ہونے دیں گے تم وطن کا بیش بہا سرمایہ ہو ۔ ... کا ترنم ہو ۔ قلم کاروں کے قلم کا جادو ہو ، گیتوں کی تان ہو ۔ ... کا سرور ہو ۔ تمہاری آواز میں شہد جیسی مٹھاس ہے اور ... جیسی شیرینی و لطافت ہے ۔ ہم تمہیں کسی طرح نہ جدا ہونے دیں گے ۔"

یہ کہتے ہوئے وہ گلوگیر آواز کے ساتھ پھر دو قدم آگے بڑھا ..... اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا ۔

"ذرا میرے قریب آؤ ۔"

"نہیں ۔"

"کیوں ۔ ؟"

"میں بدیسی ہوں مجھے ہاتھ نہ لگانا نہیں تو تم بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھے جاؤ گے ۔"

"کون کہتا ہے تم بدیسی ہو ۔ ؟"

"اتحاد دشمن لوگ ۔"

"جو ایسا کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے ۔"

"جب تک تم پر جان فدا کرنے والے موجود ہیں تمہیں کوئی ... نہیں کہہ سکتا ۔"

"کہتے ہیں "

" جو کہتے ہیں شاید انہیں معلوم نہیں کہ تم کرشن کی آنکھ ، بیدی کا بانکپن، فراق کی دھڑکن ، اور آزاد کی روح ہو ۔۔۔۔۔

... تم پر فدا ہونے والے دیونرائن پانڈے جیسے جان نثار ہو جو ... بدیسی نہیں کہہ سکتا ۔ تم دیس کے کروڑوں انسانوں کی ... ان کی تہذیب ہو ، معاشرت ہو ، وقار ہو ، ان کا شعور اور ... ہو ، تمہیں کوئی نہیں چھوڑ سکتا ۔ پریم چند ، تلوک چند ، ... رام ، اندر ناتھ اشک ، دیویندر ستیارتھی ، بھارت سنگھ کھنہ ، ... مدھو سودن ، سنگھ امرتسری ، آنند نرائن ملا جیسے ... کے دلوں میں جب تک تمہاری محبت موجود ہے ، تمہیں کون بدیسی کہہ سکتا ہے اور کیسے چھوڑ سکتا ہے ۔ ؟ "

" کاش ایسا ہی ہوتا ۔ تو میرا دل دکھی کیوں ہوتا ۔ ؟ "

" تم دکھی مت ہو ۔ منشی ہرسکھ رائے ، منشی نولکشور لکھنوی ، منشی رام چند دہلوی ، منشی پیارے لال دہلوی ، لالہ دیوان چند لوری ، موہن لال ، جودھیا پرشاد ، رتن ناتھ سرشار ، اور دیا شنکر نسیم ، جیسے پرستار اس بات کے شاہد ہیں کہ تم بدیسی نہیں ہو ۔۔۔۔ بدیسی کہہ کر تمہیں کوئی نہیں نکال سکتا ۔ "

" اب تم رو رہی ہو ۔ ان آنسوؤں کو پونچھ لو ۔ ورنہ ان آنسوؤں کی قیمت چکانے کے لئے کتنے ہی دیونرائن پانڈوں کو شہید ہونا پڑے گا ۔ "

وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ۔

" نہیں ! اب میں نہ روؤں گی ۔ "

اس نے بڑے عزم سے کہا ۔

" اب تو تم اپنا دیس چھوڑ کر نہ جاؤ گی ۔ ؟ "

" نہیں "

اور میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی مانند جگمگانے لگے !!

بقیہ " موج گل " پر ایک نظر

بیان کی ندرت کی مثال میں صرف دو شعر پیش کروں گا

اب تو ایسے مزاج کا عالم زلف کی برہمی سے ملتا ہے
کچھ سراغ ان کی بے نیازی کا اپنی بیچارگی سے ملتا ہے

کچھ تشبیہوں اور استعاروں کا لطف حاصل ...

لی جھوم کے انگڑائی جو اس ماہ جبیں نے
اٹھتا ہوا اک حسن کا طوفان نظر آیا

نظریں نہیں ہیں جن کی حدود خال و رخ تک
وہ لا بہ بزم ستا لئے ایجاد کر رہے ہیں

خالص زبان و بیان کے ان اشعار میں بھی جن میں غزل کا لب و لہجہ ہے فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضے بھی پوشیدہ ہیں جن سے فنکار کی بلند نظری کا ثبوت بھی ہم پہنچتا ہے اور غزل جیسی صنف ادب کی پاکیزگی اور توانائی کا بھی ۔۔۔۔ کوشش و کاوش اور خون جگر صرف کئے بغیر فن میں یہ رنگینی پیدا نہیں ہو سکتی ۔

جناب ریحانی نے اس شعر میں اسی امر کا اظہار کیا ہے ۔
" موج گل " کی تمام تعریف اسی شعر میں مخفی سمجھئے

مری آنکھ سے اشک خونیں نکل کے
بنے لالۂ و گل زمین غزل کے

بقیہ " نقد و نظر "

... کی ترتیب میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ۔ تقریباً ہر شاعر کی ایک سے زائد تخلیق کے ساتھ اس کی تصویر بھی شامل انتخاب ہے ۔ اعلیٰ کتابت و طباعت کے ساتھ کتاب حسن صورت سے بھی آراستہ ہے ۔

مسز تاج بانو شبنم

جھروکے سے جھروکے تک

نسیم لاج۔ احمد آباد

۱۴ جون ۱۹۶۷ء

پیاری کوثر!

اور کہہ تیرے گلشن میں کتنی کلیوں کا اضافہ ہوا؟ بہت دنوں بعد تجھے لکھ رہی ہوں نا اسی لئے پوچھ رہی ہوں۔ آج تجھے یہ خط لکھنے بیٹھی ہوں تو سوچ سوچ کر شرمائے جا رہی ہوں کہ تو میرا خط پڑھ کر کیا سوچے گی تو کچھ بھی کہہ تجھے تو بتاؤں گی ہی۔ گرما کی تعطیلات شروع ہوتے ہی ماموں جان آ گئے مجھے لینے کے لئے۔ کہنے لگے نسیم! میں جانتا ہوں کہ تو پرسکون ماحول پسند کرتی ہے لیکن میرے ساتھ چل۔ شاید تجھے وہاں کچھ کہانیاں مل جائیں۔ اور دیکھ مجھے کوئی کہانی تو نہ ملی میری ذات خود ایک کہانی بن گئی .... تو سمجھی نہیں .... سمجھ جائے گی...

.... ہاں تو میں گئی ماموں جان کے دواخانے کی شاندار بلڈنگ دیکھی دل جان کی زندگی کا المیہ بھی عجیب ہے۔ وہ ایک لڑکی سے پیار کرتے ہ۔ لڑکی ایک دن ایک مہلک بخار میں مبتلا ہو کر چل بسی۔ ماموں جان نے شادی نہیں کی۔ بس اپنا ایک پرائیوٹ دواخانہ بنا کر ساری زندگی کے لئے وقف کر دی۔ میں گئی تو بلڈنگ کی اوپری منزل کا ایک کمرہ مجھے دیا۔ جہاں کھڑکی کے سامنے میز پر بیٹھی میں کہانیاں لکھا کرتی۔ ایک بصورت نظاروں کو دیکھتے ہوئے ذہن میں کوئی خوب صورت لہلانے لگی۔ میں نے قلم اٹھا لیا .... لکھتے لکھتے میری نظر مقابل کی ایک دوسری بلڈنگ پر جا ٹکی۔ دیکھا تیسرے یا چوتھے نمبر کے فلیٹ میں ایک خوبرو نوجوان کھڑا ہے جس کی نظریں سیدھی مجھ پر پڑی جا رہی ہیں۔ میں گھبرا گئی۔ کچھ نہ سوجھا تو قلم میز پر چھوڑ کر اٹھ آئی اس کے بعد ہر شام کو دیکھا وہ اسی کھڑکی پر کھڑا رہتا ہے۔ اس نے کبھی کوئی گستاخی نہیں کی۔ نہ کبھی اشارے کئے نہ سلام کیا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے اس کا معمول ہو اور وہ کبھی گلی کی چہل پہل سے لطف اندوز ہوتا ہو۔ میں نے کھڑکی میں پردے لگا دیئے۔ لیکن لکھنے بیٹھتی اور ہوا سے پردہ سرسرا جاتا تو میری نظریں بے اختیار ادھر اٹھ جاتیں۔ نظروں سے نظریں مل جاتیں اور میں پسینے میں نہا جاتی........ ایک رات اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے نزدیک جا کھڑی ہوئی، ایک کہانی نامکمل پڑی تھی بس اسے ہی پورا کرنے بیٹھ گئی۔ لکھتی رہی یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ میری کہانی بھی اختتام پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے قلم رکھ کر ایک انگڑائی لی۔ نظر بے اختیار اس جھروکے کی طرف چلی گئی۔ ہائے اللہ کوثر! کیا بتاؤں؟ دیکھا وہ شب خوابی کا لباس پہنے کھڑکی پر موجود ہے۔ اس کے بعد دن کے اجالے میں کھڑکی کے پاس کبھی نہیں گئی۔ رات میں بیٹھ کر لکھا کرتی۔ اس کھڑکی میں اندھیرا دیکھتی تو ایک اطمینان حاصل ہوتا۔ لیکن اب جب ماموں جان کے گھر سے لوٹ آئی ہوں تو نہ جانے کیوں اس کی یاد بے اختیار آئے چلی جا رہی ہے۔ کس سے پوچھوں، وہ کون ہے۔ ماموں جان سے تو پوچھ بھی نہ سکی۔ اب تو بتا کیسے اس دل کو قرار آئے....... ۔

تیرے ان سے یہ خط نہ بتانا .... وہ کیا کہیں گے؟ تمہاری

سہیلیاں کیسی ہیں؟ تیرے چاندستاروں کو دعا اور پیار۔

"تیری ہی نسیم"

اکاؤنٹس آفس۔ حیدرآباد

برانچ حیدرآباد، ۲۰ جون ۱۹۶۷ء

جمیلے ڈیئر!

یار تو مجھے خواہ مخواہ پتھر کہا کرتا تھا۔ اگر میں پتھر ہی ہوتا تو یوں موم کیوں ہو جاتا۔ یہ اور بات تھی کہ اب تک کوئی چوکھٹا ایسا نظر نہ آیا تھا جہاں میں دل کو لگا سکتا۔ چند دنوں پہلے کی بات ہے ایک بڑی پیاری صورت نظر آ گئی تیری عادت ہے تو فوراً پوچھے گا ... کہاں ہے؟ کون ہے؟ کیسی ہے؟ تو ذرا صبر کر، سب بتائے دیتا ہوں۔ وہ کہاں ہے یہ تو میں نہیں جانتا .... ہاں چند دنوں تک وہ میرے فلیٹ کے سامنے والی بلڈنگ میں تھی۔ کون ہے وہ یہ بھی نہیں جانتا ہاں صرف اس کا نام جانتا ہوں اس کا نام نسیم ہے کیسی ہے .... یہ کیسے بتاؤں بس یوں سمجھ لے کہ بڑی پیاری ہے .... بے حد خوب صورت ہے اور .

خیر جانے دے ــــ تجھے میں نے شاید پچھلے خط میں لکھا تھا کہ میں فلیٹ تبدیل کرنے والا ہوں اس دن چوک پر ایک فلیٹ مل گیا۔ اسی شام کو باہر دیکھتا ہوا کچھ سوچ رہا تھا کہ وہ نظر آ گئی ... سامنے دواخانے کی بلڈنگ کے ایک کمرے میں وہ میز پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ وہ مجھے اتنی بھا گئی کہ میں نہ جانے کب تک اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ لمحوں بعد اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور وہاں سے چلی گئی .... کالج سے لوٹ کر گذرنے والوں کی طرح وہ میز پر سے کتابیں اٹھا کر کمرے سے نکل جاتی۔ دو تین دن بعد اس کی کھڑکی پر ریشمیں پردے لہرانے لگے۔ پھر بھی کبھی کبھی نظروں کا تصادم ہو ہی جاتا۔ میری بے چینی بڑھتی گئی .... مجھے محسوس ہونے لگا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے .... میری راتوں کی نیند اڑ گئی ... ایک رات اسی طرح میری نیند اچٹ گئی۔ گرمی سے گھبرا کر کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا .... مجھے حیرت ہوئی دیکھا کہ وہی لڑکی میز پر جھکی کچھ پڑھ رہی ہے یا شاید لکھ رہی ہے .... کھڑکی کے پردے ایک طرف سرکائے گئے تھے۔ میں بھی اندھیرے میں کھڑا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ سویرا ہو گیا۔ پردے کھینچ دیئے گئے اور اب ہم دونوں کا معمول ہو گیا۔ وہ رات میں اٹھ کر کہانیاں ..... ہاں شاید کہانیاں ہی لکھا کرتی اور میں اندھیرا کئے ہوئے اپنی کھڑکی میں کھڑا رہتا۔ آٹھ دن ہوئے وہ یہاں سے چلی گئی ہے ... میں اس دواخانے کے ڈاکٹر صاحب سے اس کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ وہ صرف مریضوں کے لئے بے حد خوش مزاج ہیں دوسرے لوگوں کو کاٹ کھانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب دل پہ چوٹ کھائے ہوئے ہیں لیکن میں بڑی کشمکش میں پڑ گیا ہوں۔ ہر وقت نسیم کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے میں آج کل نسیم کا پتہ لگانے کی فکر میں ہوں۔ اگر تم میری کچھ مدد کر سکو ... یعنی ڈاکٹر صاحب سے مل کر نسیم کے بارے میں کچھ پتہ لگا سکو تو ... اگر آ رہے ہو تو اس خط کے ملتے ہی چلے آؤ۔

تمہارا دوست

"مظہر"

درویش محلہ۔ کریم پور

۷ جولائی ۱۹۶۷ء

مائی ڈیئر ایازت!

ارے اب ایسی بھی ناراضگی کیا؟ میں تمہیں خط نہ لکھ سکا تو تم خط لکھ کر پوچھ سکتے تھے بھائی جان سے کہ جمیل زندہ ہے یا مر گیا۔ اور ڈیئر مدہی مہینہ تو ہو رہے ہیں تمہیں خط لکھے۔ ایسے کون سے سال بیت گئے۔ تم نے اپنے خط میں مجھے کتنی گالیاں دے ڈالی ہیں۔ مانا تم اتنی دور ولایت میں بیٹھے دوستوں کے خطوط کے منتظر رہتے ہو اور خط نہ ملنے پر غصہ بھی ہو جاتے ہو۔ .... چلو تمہارا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ایک دلچسپ کہانی سناتا ہوں۔ تمہیں اپنا دوست مظہر تو یاد ہوگا نا ..... ارے بھئی وہی مظہر جسے ہم لوگ پتھر کہا کرتے تھے۔ اپنا کالج کا ساتھی ... لڑکیوں کے سائے سے دور بھاگنے والا ..... آج کل وہ حیدرآباد میں ہے ..... وہاں کسی لڑکی کو دل دے بیٹھا۔ میرے پاس ہر وقت اس کے خطوط آتے ہیں۔ اس دن مجھے اپنے خط میں اس لڑکی کے بارے میں لکھا۔ خط پڑھ کر مجھے بے حد ہنسی آئی۔ آخر پتھر کو بھی

(باقی ...)

ہندی۔ نوین دوبے میر دل

ترجمہ شمیم احمد پرویز

سرد رات ٹھٹھرتی زندگی۔

پیرس۔ پلاٹ کی آخری نو دس لائنوں کو ختم کر کے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اپنے میں میری بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ "سنا آپ نے آپ کے دوست پروفیسر پریہ درشن نے کالج کی ایک طالبہ سے شادی رچالی۔" بیوی کی یہ بات سن کر میرے ہاتھوں میں تکیے کا غلاف اٹکا سا رہ گیا۔ اور میں بڑبڑا اٹھا۔

پر..... پر..... پریہ درشن" اور شادی سے قبل لڑکی ماں بن چکی تھی۔ بیوی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا شاید شادی کی وجہ یہی رہی ہو۔ بہرحال بیوی نے جو کچھ کہا تھا اس پر مجھے آسانی سے یقین آ گیا، پریہ درشن پروفیسر میرے لئے بعد میں تھا آٹھویں درجے سے ایم اے تک کا ہم جماعت۔ میں نے پریہ درشن کو بہت قریب سے دیکھا تھا وہ اچھی خصلت کا تھا۔ نیپال کے ایک گاؤں ایلام سے پڑھنے آیا تھا وہ اپنے اصولوں کا بہت ہی پابند تھا میری طرح الھڑ نہیں تھا وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کبھی غفلت نہ برتتا تھا۔ اس کے لئے میرے دل میں بے پناہ عقیدت تھی۔ بات چیت کے دوران جب اس سے پوچھا کہ "پریہ درشن چھ برس تمہیں اپنا گاؤں چھوڑے ہو گئے کیا اپنی ماں اور اپنے گاؤں کی یاد تمہیں نہیں ستاتی؟" تو اس کے لبوں پر ہنسی دوڑ جاتی "یار مجھے تو چھ برس ہی ہوئے ہیں ہمارے نیپال کے طالب علم پندرہ پندرہ برس بعد گھر لوٹتے ہیں۔ ہمارا دیش بہت پچھڑا ہوا ہے بھیا اسے آگے بڑھانا ہے۔ مجھے یاد ہے اس وقت ہم فورتھ ایئر میں تھے کالج کے سالانہ جلسے میں ناٹک کی ریہرسل کے پہلے دن جب پریہ درشن نے خود کو دو لڑکیوں کے ساتھ پایا تو میرے لاکھ سمجھانے پر بھی اس نے پارٹ ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پریہ درشن کو لڑکیوں کی قربت ناپسند ہونے کی وجہ اس کا حد سے زیادہ شرمیلا پن تھا۔ کالج کی زندگی ختم ہو گئی اور پریہ درشن پروفیسر ہو گیا لیکن پروفیسر ہو جانے کے بعد اس نے اپنے سلوک میں تبدیلی نہیں آنے دی۔

اور اس کا اخلاق ہمارے ساتھ پہلے ہی جیسا رہا۔ اب جب کبھی وہ میرے گھر آتا تو میری بیوی اسے چھیڑا کرتی "بھیا اب تو شادی کر لو نہیں سہیلی مل جائے گی۔" اور پریہ درشن جھینپ کر کہتا بھابی چھوڑو بھی یہ مذاق ہر وقت سہیلی کی لگی رہتی ہے۔ اور اتنا کہتے وقت وہ عورتوں کی طرح شرما جاتا۔ اتنا شرمیلا اور سنجیدہ مزاج انسان کالج کی اپنی ہی ایک طالبہ سے شادی کرے گا۔

اور وہ بھی پہلے گناہوں میں ملوث ہو کر۔ میں اس پر جتنا سوچتا یہ سوال اور بھی الجھتا جاتا۔ میں بیوی سے کچھ کہنے کے لئے مڑا لیکن وہ تو کب کی کمرے سے جا چکی تھی۔ گلاس میں بھرے دودھ کے دو گھونٹ پی کر میں لیٹ گیا۔ ....

اس واقعہ کے بعد پریہ درشن سے ایک ماہ تک ملاقات نہ ہو سکی۔ اس رات مجھے [illegible] کرنا تھا۔ رات کافی بیت چکی

تھی جیبوں پر بس۔ آفس کی دم گھٹا دینے والی فضا سے باہر نکلا۔ شاید ایک بجا تھا۔ میں نے ٹیکسی کے لئے نظر دوڑائی لیکن رات کے ایک بجے اس کڑاکے کی سردی میں ٹیکسی والے بھی کہیں جھپکیاں لے رہے تھے۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ دور اسٹیشن کی طرف سے سنسناہٹ کرتے ہوئے انجن کی سائیں سائیں سناٹے کا پیچھا کر رہی تھی۔ اگلے چوراہے پر میں مڑنا ہی چاہتا تھا کہ میری نظر پیرے درشن پر پڑی۔ وہ کان تک اوور کوٹ (OVERCOAT) کے کالر چڑھائے بڑھتا آ رہا تھا۔ مجھے تعجب ہوا اور شک بھی، پیرے درشن اتنی رات۔ گلے کے گرد مفلر الجھا سا گھومتا تھا۔ قریب آنے پر میں نے پکارا "کون پیرے درشن؟" وہ جیسے نیند سے جاگا اور چونک گیا۔ میں نے اس کے جواب کا انتظار کرنے سے پہلے ہی کہا "آدھی رات گزرے کہاں سے لوٹ رہے ہو؟" ایک لمحہ کے لئے وہ خاموش رہا پھر بولا "وہ مسٹر گل ہیں نا ان کے ہاں پارٹی تھی وہیں سے آ رہا ہوں۔" اتنا کہتے وقت پیرے درشن کے چہرے کا رنگ کئی بار بدل چکا تھا۔

میں سمجھ کر بھی نہیں سمجھ سکا۔ پارٹی ایسی چیز تو نہیں جس کے بارے میں کہتے ہوئے پیرے درشن کی آواز آسمان کی طرح کانپ رہی ہے۔ "کل اتوار ہے پیرے درشن تم میرے گھر آ سکو گے؟ تمہاری بھابی تمہیں بہت دنوں سے یاد کر رہی ہیں۔" اتنا کہتے وقت میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ پیرے درشن نے جواب دیا "لیکن گھر بلا کر تم مجھ سے جو پوچھنا چاہتے ہو وہ یہاں نہیں پوچھ اور سن سکتے کیا؟" پیرے درشن کے دانت ٹھنڈک کی وجہ سے کٹکٹا اٹھے۔ چوراہے پر بلچی ریستوران ابھی کھلا تھا۔ میں نے پیرے درشن کی پیٹھ تھپتھپائی "چلو وہاں بیٹھ کر کافی کی گرم گرم چسکیاں لیں گے۔ تمہیں بھی تو کافی ٹھنڈک لگ رہی ہے نا؟" پیرے درشن نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میں کافی کا آدھا پیالہ پی چکا تھا لیکن پیرے درشن کا پیالہ ابھی تک جوں کا توں رکھا تھا۔ وہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔ میری آواز نے اس کے خیالوں کا تانا بانا توڑ دیا۔ اس نے آہستہ سے کہا "تم نے سب کچھ سن ہی لیا ہوگا؟" ہاں سب کچھ سنا پیرے تم نے جو کچھ بھی کیا میں تمہارا مخالف نہیں ہوں۔ لیکن تعجب ہے کہ اچانک تم میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی؟ پیرے درشن میری اس بات کا جواب دیئے بغیر ہی کہنے لگا۔ اس کا نام تنوجہ تنوجہ ایک لڑکی ہے جو کبھی میری طالبہ تھی۔ آج وہ میری بیوی ہے۔ اس میں نوجوانی کا ابھار ہے اور ابال بھی۔ وہ ابال جس میں میں سما چکا ہوں۔

پیرے درشن کی آواز میں لرزش تھی۔ "پھر؟" تنوجہ سے میرا تعلق صرف اتنا ہی تھا کہ وہ میری طالبہ تھی۔ تنوجہ میری کافی عزت کرتی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں بیوی بننے سے قبل اس کی عقیدت میں وہی جذبہ کارفرما تھا جو ایک طالب کے دل میں اپنے استاد کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد پیرے درشن خاموش ہو گیا۔ "پھر یہ کیسے ممکن ہو سکا؟" میں نے سوال کیا۔ اس رات والے واقعہ کے تین چار دن پہلے میں نے تنوجہ کو اداس پایا تھا۔ ایک دو دن وہ کالج بھی نہیں آئی تھی۔ آج سے ٹھیک ایک ماہ سات دن قبل اس رات کو جبکہ لگ بھگ گیارہ بجے ہوں گے میں اپنے کمرے کے جنوبی برآمدے کے کنارے کھڑا چھٹکی چاندنی میں ٹیڑھی میڑھی ریلوے لائنوں کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی ایک مال گاڑی ادھر سے گزری تھی، دفعتاً مادر کی جانب سے ایک سفید اور نمایاں سی پرچھائیں سڑک پر آتی ہوئی دکھائی دی ارے! یہ تو کوئی دوشیزہ ہے سفید سلک کی ساڑی پہنے تھی وہ۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ سیدھی ریلوے لائن کی طرف چلی آ رہی تھی۔ مجھے اس کی گھبرائی ہوئی حالت کو دیکھ کر شک ہوا۔ سڑک کو چھوڑ کر اب وہ ریلوے لائن پر آ پہنچی تھی۔ ایک بار اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ڈیم گاؤں ایکسپریس کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ پٹری کے بیچ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بھینچ کر کھڑی ہو گئی۔ پیرے درشن بولتے بولتے لمحہ بھر کے لئے رکا اور پھر تیز تر ہو گیا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر برآمدے میں لڑکھڑا سا گیا۔

نجانے کس جذبے کے تحت میرا دل کانپ اٹھا تھا۔ میں کچھ سوچے بغیر ننگے پیر برآمدے سے بھاگ کر ادھر چل دیا۔ دوشیزہ بے خبر تھی۔ سڑک چھوڑ کر پٹری پر چڑھنے سے پہلے میں نے دیکھا ایکسپریس کی بتی ایک میل سے کم فاصلہ پار کر چکی تھی۔ دوشیزہ موت کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی پٹریاں پار کیں اور دوشیزہ کو کھینچ لیا۔ دوسرے

ہی لمحہ ایکسپریس دھڑ دھڑاتی ہوئی تیزی سے نکل گئی۔ وہ پریشان حال دوشیزہ چلا اٹھی۔ چھوڑ دو مجھے میں مرنا چاہتی ہوں بکھری ہوئی چاندنی میں میں نے دوشیزہ کو پہچان لیا۔ وہ دوشیزہ میری طالبہ تنوجہ تھی۔ ایک لمحہ تک وہ میری جانب دیکھتی رہی پھر وہ لپٹ کر چیخ اٹھی۔

"پروفیسر مجھے مر جانے دو میں نے پاپ ہی ایسا کیا ہے۔ تنوجہ پاگل ہو گئی ہو زندگی جینے کے لئے ہے مرنے کے لئے نہیں۔ شاید تمہیں کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ آؤ میرے ساتھ مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں میں تنوجہ کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ تنوجہ نے کمرے کی کنڈی لگا دی اور دھم سے کرسی پر گر پڑی۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑا ہوا تھا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ایک گلاس میں پانی لا کر دیا۔

"آپ نے یہ اچھا نہیں کیا مجھے موت کے دروازے سے کیوں لوٹا لائے سر ؟

تنوجہ کے لہجے میں بے پناہ غم تھا۔

تمہارا راز کیا ہے ؟

میرا .... میرا .... راز صرف یہی ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ پیرے درشن نے چہرے پر دسمبر کی سرد رات میں بھی پسینے کی بوندیں چھلک آئی تھیں۔

میں اب تنوجہ کا راز سمجھ چکا تھا میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ؟" اور وہ کچھ لمحوں تک خاموش رہی۔

تنوجہ کا چہرہ اداس اداس تھا اس نے شرم و حیا کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہا "میں بیہ دنوں کے بعد ماں بن رہی ہوں۔ میں دیریندر سے پیار کرتی تھی۔ اس کے جھوٹے وعدوں میں پھنس کر میں نے ایک دن اپنی جوانی کا سودا کر ڈالا۔ جب دیریندر کو معلوم ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو اس نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ اور اپنے وعدے سے پھر گیا۔ میں نے سوچا اپنے اس پاپ کو کب تک سماج اور خاندان کی آنکھوں سے چھپا پاؤں گی۔ کون یقین کرے گا کہ میری بھول میں دیریندر کی مکاری اور خود غرضی شامل ہے۔ تب میں نے وہی کرنے کو سوچا جو مردوں کے ہاتھوں ستائی ہوئی نجانے کتنی عورتوں نے کیا ہے۔ لیکن آپ مجھے اس راستے سے لوٹا لائے۔ میں نے تنوجہ سے کہا اس کی دوسری راہ بھی

تو ہو سکتی ہے ؟

"وہ کون سی ؟"

تم کسی شریف نوجوان سے شادی کر ڈالو۔

لیکن اب مجھ سے کون شادی کرے گا ؟"

تنوجہ کے اس جواب نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

جیسے تنوجہ مرد ذات پر طنز کر رہی ہو۔ جس مرد نے لمحاتی لذت و سکون کی خاطر اسے اس خوف ناک راستے پر دھکیل تھا۔ وہی آج اسے سہارا دینے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے چاروں طرف ہزاروں بلکہ لاکھوں تنوجائیں مرد کی اس انسانیت، حرکت پر تھوک رہی ہوں۔

میں نے سوچا لوگ بیوہ سے شادی کر لیتے ہیں، غیر قوم کی لڑکی سے شادی کرتے ہیں۔

لیکن تنوجہ زندگی کے جس موڑ پر آج کھڑی ہے اس سے کون ایسا نوجوان ہوگا جو شادی کر سکے۔ اور تنوجہ کو موت سے بچا لے۔

پیرے درشن نے بات جاری رکھی۔" اور میں نے خود سے سوال کیا زیادہ دور کیوں جاتے ہو ؟ تم بھی تو جوان ہو غیر شادی شدہ بھی اور اونچے خیالات کے مالک بھی۔

کیا تم موت اور زندگی کے بیچ جھولتی ہوئی تنوجہ کو زندگی کے راستے پر نہیں لا سکتے ؟

کیا تم تنوجہ سے شادی کر کے اس کے ناجائز بچے کا باپ سماج کے سامنے خود کو نہیں ٹھہرا سکتے ؟

جس موت کے دروازے سے تنوجہ کو تم کھینچ لائے ہو اسی دروازے میں واپس اپنے ہی ہاتھوں اسے صرف اس لئے بھیج دو گے کہ تم میں اتنی ہمت نہیں کہ تنوجہ کو اپنا سکو ؟"

"تنوجہ تم میری طالبہ ہو مجھے اپنا فرض للکار رہا ہے۔ گرتے ہوئے کو سنبھال لینا انسانیت کی عظیم خدمت ہے۔ میں تم سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں کیا تمہیں منظور ہے ؟

میں نے پوچھا۔ (بقیہ صفحہ ۵۹ پر)

شیریں ظہیر نیازی

گلاس کی کرچیں

رسوئی گھر میں ایک چھناکا گونجا اور ماں جی اچانک اچھل پڑیں!

"ہائے ہا! اس کلموہی نے آج پھر گلاس توڑ ڈالے"۔

غراتی ہوئی ماں جی رسوئی گھر کی طرف دوڑ پڑیں اور پھر کونے میں سہمی سہمی سی کھڑی ہوئی دھان پان سی نمو کو بھاری بھرکم ماں جی نے بالوں سے پکڑ کر آنگن میں کھینچ لیا۔

حرامزادی باپ کے گھر سے قاروں کا خزانہ لے کر آئی تھی کیا؟ گھر کا گھر اس منحوس نے تباہ کر ڈالا کمینی! اتنا قیمتی سٹ تو نے کبھی خواب میں بھی دیکھا تھا؟"

"ہاں بی بی جس نے ان چیزوں کو دیکھا ہی نہ ہو وہ قدر بھی کیا جانے!" محلے کی ایک عورت بول پڑی اور ان الفاظ کے نشتر نمو کے دل میں دور تک اترتے چلے گئے۔

معصوم سی نمو کے پھول سے جسم پر چپل برس رہے تھے اور بھس میں چنگاری ڈال کر لطف اندوز ہونے والی محلے کی عورتیں جلتی پر تیل ڈال رہی تھیں کہ شعلہ اور بھڑک جائے!

"اے ہائے کتنا پیارا سٹ تھا یہ لیکن آج کل کی بہوئیں اونہہ توبہ بچا بھلی ہے یہ بہن گھر سجانے کی بجائے اور اجاڑ کر رکھ دیتی ہیں بیٹھ۔

چھی چھی - یہ بھی کوئی ڈھنگ ہوا - لعنت ہو ایسی پھوہڑ پر دادھا بہن کی بنی بنائی آبرو بگاڑنے والی ہے یہ تو"

یہ بی جمالو قسم کی عورتیں تو بس موقع کی منتظر ہا کرتی ہیں دل لگی کے لئے اور کچھ نہیں تو ساس بہو کا جھگڑا ہی سہی۔

ان سبھوں کی باتوں کو سن سن کر ماں جی کا پارہ اور اوپر ہی چڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے بھاری بھرکم ہاتھ اور تیزی سے گردش کرنے لگے تھے۔

چپل ٹوٹ گیا پر ماں جی کے ہاتھ نہ تھکے

نمو چپ چاپ پٹتی جا رہی تھی ابتک، اور عورتیں اس کے پٹنے کی کچھ منتظر سی نظر آ رہی تھیں۔

"ماں جی ——!"

نمو اچانک ہی چیخ اٹھی اور ماں جی کے ہاتھ کانپ کر رہ گئے۔

وہ حیرت و استعجاب بھری نگاہوں سے اس کا چہرہ تکنے لگیں۔ کیا کہنا چاہتی ہے یہ؟ اس خاموش سی لڑکی کے اندر اتنی قوت کہاں سے آگئی۔ یہ اتنے زور سے چیخی کیوں؟

نمو خود کار مشین کی طرح آنسو بھری آنکھیں تکلیف سے زرد اور جھکے جھکے چہرے کے ساتھ ماں جی کے قدموں پر جھکی ہوئی بولنے لگی۔

ماں جی مجھے پیار چاہیئے مجھے سکون چاہیئے۔ میں جان بوجھ کر گلاس نہیں توڑتی۔ ایسا کبھی نہیں کہ میں ان چیزوں کی قدر نہیں جانتی۔ میں پھوہڑ بھی نہیں ماں جی۔ یہ سب کچھ نہیں اگر کچھ ہے تو وہ یہ کہ یہ کہ ...." اس کی آواز کانپنے لگی تھی اس کی آنکھوں سے دو موتی نکل کر ماں جی کے پیروں پر گر پڑے تھے۔

ہاں ہاں بول کیا کہنا چاہتی ہے تو؟" ماں کا لہجہ اب کچھ نرم ہو چلا تھا۔ ماں جی میری روح پیاسی ہے۔ میری پیاس بجھا دو، مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ مجھے ممتا دیدو ماں! ماں کی ممتا نہ ملی مجھے، بھائی کی شفقت نہ ملی، بہن کی محبت نہ ملی۔ عورت کی زندگی کے لئے صرف پتی کا پیار ہی کافی نہیں ہوا کرتا ماں۔

میں نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہوں" میرا ذہن بھٹکتا رہتا ہے۔ میں اپنے بکھرے ہوئے خوابوں کے تاروں کو اپنی پلکوں میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ اپنے دل کے تاریک غم خانوں میں آرزوؤں کے چراغ جلانا چاہتی ہوں، اپنے ان مہندی رچے ہاتھوں سے روشنی کی کرنوں کو گرفت میں لینا چاہتی ہوں اور ایسے میں مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ میں کہاں ہوں۔

گلاس میرے ہاتھوں سے چھوٹ جانے میں ایک چھناکا گونجتا ہے۔ میں چونک پڑتی ہوں۔ خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ شیشے کی رنگین چیزوں کو دیکھتے ہوئے خوابوں کی حسین دنیا کی سیر کرنے لگتی ہوں۔ جب گلاس ٹوٹتے ہیں تو حقیقت سامنے ہوتی ہے کہ یہ ننھی ننھی کرچیں میرے دل میں چبھ کر رہ جاتی ہیں۔ ان سے لہو پھوٹنے لگتا ہے اور پھر یہ لہو آنکھوں کی راہ سے ابل کر بہہ نکلتا ہے۔

تم مجھے جتنا بھی مار سکو مار لو ماں لیکن پیار کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں سے مجھے محروم نہ کرو۔ گلاس کبھی نہیں ٹوٹیں گے ماں جی" تم صرف اتنا کرو کہ زندگی کے تپتے ہوئے ریگستان میں بھاگتے دوڑتے تھک جاؤں میرے پیروں کے چھالے پھوٹ پڑیں تب تیز و تند ہواؤں کے جھکڑوں کا مقابلہ کرتے کرتے مجھ میں سکت باقی نہ رہے تو اس وقت چند لمحوں کے لئے ہی مجھے اپنے ممتا بھرے ٹھنڈے اور پرسکون آنچل میں کچھ دیر کے لئے چھپا لو۔

بولو نا ماں کیا تم ایسا کر سکوگی؟ تم خاموش کیوں ہو، بولتی کیوں نہیں ماں؟"

اور اسی لمحے محلے کی عورتیں ششدر رہ گئیں جب انہوں نے دیکھا کہ ماں جی نے نمو کو اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا ہے۔

"دیکھ لیا نا۔ اسکی چرب زبانی راد ھا بہن کو مٹھی میں کر لیا نا"

"ہاں بی بی جادوگرنی ہے جادوگرنی"

خاموش رہو کچھ نہ کہو غلطی میری ہے تم لوگ ابھی جاؤ اپنے اپنے گھروں کو، لوٹ جاؤ تم کیا جانو پیار کیا ہے، زندگی کیا ہے۔ آج سے پہلے میں بھی نہیں جانتی تھی۔ ابھی ابھی میں نے زندگی کا راز پایا ہے" ماں جی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور محلے والیاں یوں ان کا منہ تاکنے لگیں جیسے وہ سچ مچ دیوانی ہو گئی ہوں یا نمو نے ان پر جادو کر دیا ہو ——!

نمو بھی تو بڑے ہی باپ کی بیٹی پر اس کی ماں اسے ۳ ہی سال کا چھوڑ کر پرلوک سدھار گئی تھی۔ پتا نے دوسرا بیاہ رچا لیا اور پھر ——

پلکوں کی نوک پر بھی بوجھ نہ بننے والی نمو کے لئے اس کا اپنا ہی گھر اجنبی اجنبی سا بن گیا۔ پیٹ بھرنے کو کھانا اور تن چھپانے کو کپڑے ضرور مل جاتے مگر پیار نہ ملا اور نہ ہی کسی نے اس کی تعلیم کی طرف دھیان دیا، اپنی محنت اور کوشش سے سہیلیوں کا سہارا لیکر اس نے کچھ پڑھ بھی لیا لیکن لوگوں کو اپنا نہ بنا سکی چچا وغیرہ بھی غیروں کا سا برتاؤ کیا کرتے اور وہ تنہا تنہا اور کھوئی کھوئی سی زندگی کے دن بتاتی رہی۔ وقت کا پہیہ کب رکا ہے وہ تو چلتا ہی رہتا ہے اسی طرح تیرہ ۱۳ سال بیت گئے

نمو جوان ہو گئی اور ساتھ ہی سوتیلی ماں کی لعن و تشنیع

پہ بھی شباب آگیا ؟ اب وہ گھر والوں کے لئے آنکھوں میں چبھا کانٹا بن گئی تھی جوان اور حساس لڑکی تھی ، ماں کے تیکھے تیکھے بول اس کی روح تک کو جھنجھوڑ ڈالتے لیکن وہ خاموشی سے زہر پیتی رہی! کون تھا اس کا ہمدرد و غمگسار جس سے دو گھڑی باتیں کرکے اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا کرلیتی اپنے درد کا مداوا کرتی۔

دولت تھی، عزت تھی سب کچھ تھا اگر نہیں تھا تو پیار نہیں تھا شفقت نہ تھی اچھے کھانے اچھے کپڑے اس وقت تک بے معنی ہیں جب تک پیار کی ٹھنڈی چھاؤں نہ ہو۔

پتا جی نے اچھا ہی گھرانہ دیکھ کر بیاہ بھی رچا دیا لیکن وہ تشنہ کی تشنہ ہی رہی۔ اس کا درد بڑھتا ہی گیا۔ شدید اور شدید تر ہوتا گیا اور اب سینے کی یہ ٹیسیں ناقابل ضبط ہو چکی تھیں۔ وہ خیالوں کی دنیا میں کھوئی رہنے لگی ہر پل اور ہر گھڑی آلام کے بازو اس کے احساس کی گردن میں حمائل تھے ان کی جکڑ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی اسے اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہوتا۔ رسوئی گھر میں کام کر رہی ہوتی یا رسوئی سے باہر اس کا ذہن ہر گھڑی گھومتا رہتا برتن اس کے ہاتھ سے گرتے رہتے۔ دھات یا المونیم کے برتن تو زیادہ سے زیادہ ٹیڑھے ہو سکتے ہیں لیکن شیشے کے برتن تو ٹوٹ جانے والے ہوتے ہیں دل کے نازک آبگینوں کی طرح !"

وہ ڈانٹ اور جھڑکیاں سنتی رہتی پر خاموش رہتی برتن کے ٹوٹ جانے کا خود اسے بھی بے حد افسوس ہوا کرتا تھا لیکن وہ مجبور تھی۔ بے بس تھی !

اور آج بھی یہی ہوا تھا !

محلے پڑوس کی عورتیں تو نکتہ ڈھونڈتی رہیں۔ ان کی فطرت میں ہی داخل ہے کہ وہ کسی کے اجڑنے کا تماشہ دیکھیں اس وقت بھی انہیں کچھ ایسی ہی بات کا انتظار تھا۔ لیکن اچانک ہی پانسہ پلٹ گیا۔ اور وہ نمو کو چوکھٹ سے باہر کی بجائے ماں جی کے سینے سے لپٹا دیکھ کر جل بھن کر کباب ہوئی جا رہی تھیں۔

سات سال بیت چکے ہیں کتنے طوفان آئے اور گئے کتنے ہی گھر اجڑے اور بسے۔ وقت بدل گیا لوگ بدل گئے اور نمو۔

نمو بھی اب تین بچوں کی ماں ہے اور گھر میں ماں جی کی طعن و تشنیع کی بجائے بچوں کے معصوم قہقہوں کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔

ماں جی پاندان سامنے رکھے پھولوں کی کیاریوں کے قریب مہندی کی باڑھ کے پیچھے چوکی پر بیٹھی مسکراتی رہتی ہیں۔ نمو سامنے سے گذرتی ہے اور ماں جی ہاتھ پھیلا کر اسے روک لیتی ہیں "اے نمو ذرا میرے قریب تو آ جا میرے سینے سے لگ جا تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ سامنے کھیلتے ہوئے راجے کو دیکھ کر "اے نمو تیرے بچے ہیں کہ گلاب کی کلیاں سچ مچ بڑی نصیبوں والی ہے تو۔ کتنا اچھا لگتا ہے یہ گھر اب کتنا امن ہے کتنا سکوں۔

چھن چھن چھناک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

اف تو وہ ارے اور راجے ٹھہر تو خبر لیتی ہوں تمہاری نہ جانے کیا کیا توڑ ڈالا کمبخت نے ۔ نمو ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھی کہ ماں جی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

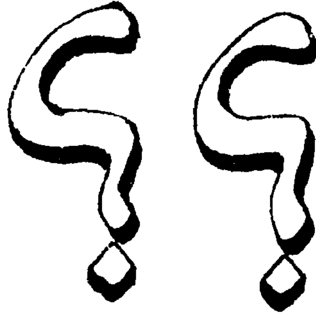
اے ہے نمو اتنی اتنی سی باتوں پر بچے کو ڈانٹا کر یہ بچے ہی تو گھر کا سنگار ہیں۔ گلاس ٹوٹ گئے تو ٹوٹنے دے ان کا کیا ہے پھر آ جائیں گے ۔

اسی طرح ننھے ننھے ہاتھوں سے روزانہ جانے کتنے ہی گلاس ٹوٹتے رہتے ہیں۔ لیکن اب ان کی کرچیں نمو کے دل میں درد نہیں پیدا کرتیں۔

نمو نے نظر اٹھا کر ماں جی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھیں ان کے سفید اور باوقار چہرے پر ممتا کا نور پھیلا ہوا تھا۔

اور پھر ان کی مسکراہٹ نمو کے دل میں دور تک اترتی چلی گئی۔

عبید قمر



وہ نیم بیداری کے عالم میں محو خواب تھی اندر کمرے میں مرکری کی دودھیا روشنی حسن کی تابشں سے شرما کر مدھم مدھم سی نظر آ رہی تھی۔ یکایک متوالی آنکھوں میں میٹھا میٹھا سپنا جاگ اٹھا لب مسکرانے لگے عجیب سا دلفریب تبسم! اور اب ہونٹ کانپ رہے تھے جیسے بس اب یہ احتجاج کر ہی بیٹھیں گے۔

— ہائے ہٹئے بھی — اوہ — کہیں کوئی — آپ بڑے وہ ہیں!"

"جیبں — جیبں؟"

"ہوں —!"

"بری جیبں —"

"اوں ہونہہ !"

"سوگی بھی —"

"اوں ہونہہ !"

"ارے اٹھ جاؤ نا بیٹی!" اور وہ یکایک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"چلو جلدی اٹھ جاؤ بیٹی — ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ اب بہت کم وقت رہ گیا ہے۔"

"ہاں — ممی — آپ —" اور اس نے عجیب سا منہ بنایا جیسے سارے منہ کا مزہ یکایک تلخ ہو گیا ہو۔

بس دیر نہ کرو آؤ" کہتی ہوئی ممی برآمدے کی طرف چلی گئیں۔

اٹھتے ہی وہ دونوں ہتھیلی باندھے کمان کی طرح لہرا گئی اور پھر ہاتھ چھوڑتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر اسے یاد آیا شمیم بھائی نے ایک بار اسے اسی انداز میں دیکھ لیا تھا تو بے خود ہو کر کہا تھا

ادا سے جب وہ لینے لگتے ہیں انگڑائیاں یارب
مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

وہ مسکراتی ہوئی مسہری سے اتری اور آہستہ سے سینڈل پہنا اور پھر دبے دبے قدموں سے ایک مجسم قیامت شمیم بھائی کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی

اس نے دیکھا کمرے میں لائٹ جل رہی تھی شمیم بھائی اپنے بستر پر چادر اوڑھے منہ کے بل تکیہ کا سہارا لئے کاپی پر جھکے ہوئے تھے عجیب محویت کا عالم تھا لیمپ جل رہی ہے،

قلم اور کاغذ سرگوشی میں راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے اور شمیم بھائی کی آنکھیں اسی کا فرادا پر جمی تھیں جیسے قلم طرح طرح کے زیور سے سجا رہا تھا اور ساتھ ہی جیسے سرگوشی میں کہہ بھی رہا تھا —"

بن گیا رقیب آخر ہے تھا جو رازداں اپنا

اور جبیں کا رقیب تو کمبخت نامراد یہ قلم ہی تھا۔ نہ جانے کتنی بار بےچاری شمیم بھائی کے سامنے احتجاج کر چکی تھی۔ میری دانست میں تو مجھ سے رقیب اچھا ہے اور آج پہلی بار جبیں بےچاری نے دیکھ پائی تھی کہ اتنی رات گئے تک شب بیدار ہوا کرتی ہے۔ وہ دبے قدموں شمیم بھائی کے کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی بڑبڑائی۔

حد ہو گئی —— یہ ادیب بھی ——

اور پھر یکایک شمیم بھائی کو محسوس ہوا کہ جیسے قیامت آ گئی، دھرتی ڈولی، بادل گرجا اور بجلی چمکی —— "آہا! آخر آج پکڑ لئے گئے نا آپ!"

شمیم بھائی دھب سے تکیہ پر گر پڑے جیسے دو عاشقوں کے بیچ رقیب رنگے ہاتھوں پکڑا جانے پر بھاگ نہ سکا تو غشی کا بہانا بنا لیا۔ اور قلم ہڑبڑا کر چھلانگ لگا بیٹھا۔ کاپی نے شرما کر جھٹ چادر تان لی

جبیں نے دیکھ تو سب کچھ لیا تھا لیکن شمیم بھائی کے انداز پر اسے بھی شرارت سوجھی۔ وہ عجیب گھبراہٹ کے انداز میں چلانے لگی —— ہائے اللہ کیا ہو گیا آپ کو اب کیا کروں —— ابھی تو اچھے بھلے بیٹھے لکھ رہے تھے کتنا کہتی ہوں رضائی اوڑھ لیجئے۔ اس موئی چادر سے بھلا سردی کیا جائے گی لیکن —— اُف وہ —— اب میں کیا کروں —— ہائے اللہ —— ممی!

"ارے، ارے، ارے —— یہ کیا کر رہی ہو؟"

اور شمیم بھائی نے اٹھتے ہی اس کے لبوں پر انگلی رکھ دی۔

وہ تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی —— "اتنی رات گئے تک آپ لوگ ......"

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

جبیں نے مسکراتے ہوئے شرما کر سر جھکا لیا۔

حیا سے سر جھکا دینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

دھت آپ بڑے وہ ہیں۔ جب میں آتی ہوں کبھی آندھی کبھی طوفان، کبھی زلزلہ آ جاتا ہے اور کبھی تو قیامت ہی بن کر آتی ہوں۔ کیا میں کوئی بلا ہوں ——؟

جبیں بہت پیار سے انداز سے شعلہ شبنم بنتی ہوئی بولی ——

لیکن شمیم بھائی تو جیسے پیچھے ہی پڑ گئے تھے ——

ہاں تم ایک بلا ہو، آفت ہو، قیامت ہو —— اور آسمانی حور جو میرے لئے اور حسین بنا کر بھیجی گئی۔ لیکن دوسروں کے لئے ایک بلا۔ میں کہتا ہوں نا جاؤ کسی راہ گیر سے بھی پوچھ لو۔ سب یہی کہیں گے کہ تم —— تم ایک دہکتا شعلہ ہو، سراپا قیامت ہو!!

یہ سب کچھ اس کے شمیم بھائی نے اتنے ڈرامائی انداز میں کہا کہ جبیں کھلکھلا کر ہنس پڑی —

"اچھا چلئے ابھی چلئے" جبیں تحکمانہ انداز میں بولی۔ شمیم بھائی فوراً ہاتھ جوڑتے ہوئے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے ——

"—— میرے سرکار! کیا ناچیز یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ مجرم کا جرم؟ آخر کیوں اس حقیر کو آدھی رات میں گھر سے بےگھر کیا جا رہا ہے؟

جبیں نے ہنستے ہوئے کہا —— "اللہ حد ہو گئی۔ کیا ابھی آدھی رات ہے؟" اور پھر بائیں ہاتھ کی کلائی آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔ "دیکھیے گھڑی!"

ارے... رے —— اس گھڑی میں تو ساڑھے چار بج رہے ہیں۔

"ہائے کتنا بنتے ہیں جیسے سچ مچ نہیں جانتے کیا وقت ہوا ہے۔ دیکھئے نا پیچھے رکھی ٹائم پیس! —— اسی طرح یہاں ہر گھڑی میں ساڑھے چار بجا ہے۔"

"ارے باپ رے —— اتنا بج گیا؟"

خوب جانتی ہوں رتجگا منایا گیا ہے۔ خیر چلئے چلئے

اٹھئے بھی، سحری نہیں کھائیے گا کیا

آج رمضان شریف کی پہلی تاریخ ہے۔"

"ایں ------ سچ ---؟"

"سچ ---!"

اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

پرسوں عید ہے لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ میں جبیں کو کیا تحفہ دوں گا؟ کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ میں کچھ بھی نہیں دے سکتا ------ بڑبڑاتا ہوا شمیم اپنے بکس کی طرف بڑھا اور بکس کھلتے ہی جبیں کے والد کی دی ہوئی آٹھ سال کی پرانی شیروانی اس کے آنکھوں کے سامنے تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا منہ چڑا رہی ہو۔ اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہو اور وہ جھنجھلا اٹھا۔ پھر اس کی نظریں بکس میں رکھے ہوئے بہت سارے خطوط پر جم کر رہ گئیں۔ طرح طرح کے رنگین لفافے سسکتی اس کی اپنی زندگی کتنی بے رنگ ہے۔ افلاس و ناداری کے سیاہ بادل اس کے مستقبل کے روشن آسمان پر چھاتے چلے جا رہے ہیں یکایک وہ ہنسنے لگا۔ عجیب سی پھیکی ہنسی۔ اور پھر جذبات کی رو میں الفاظ بہہ نکلے

------ ہونہہ! لوگ کہتے ہیں میں بہت بڑا ادیب ہوں ملک کا سب سے ممتاز نوجوان افسانہ نگار! لیکن میں تلاش ہوں بھوکا ہوں۔ مجھے روٹی نہیں مل سکتی۔ ادیب کو اس کے قلم سے روٹی نہیں مل سکتی۔ ہر پیشہ ور کو اس کے پیشہ سے روٹی ملتی ہے لیکن ادیب کو ------ ادیب بھی تو دوسروں ہی کی طرح محنت کرتا ہے۔ وہ تو سماج کا معمار ہوتا ہے۔ سماج میں اخلاق انسانیت اور نیکی کی قدروں کو بلند کرنے کے لئے سارے عالم میں انسانیت کی روح پھونکنے کے لئے تہذیب و تمدن کی آبرو نکھارنے کے لئے وہ دن رات کوشاں رہتا ہے۔ غربت و افلاس کی مسلسل یورش میں بھی اس کا قلم نہیں رکتا لیکن یہ انسانیت کا علمبردار --- امن و آشتی کا پیامبر --- اور ...

پوسٹ مین کی آواز آئی ---- لیٹر لے جائیے"

وہ باہر آیا اور پھر اس کے ہاتھوں میں بہت سارے رنگین لفافے تھے اور ایک معیاری جریدہ، سالنامہ جس کے سرورق پر اس کی تصویر تھی ---- نیچے لکھا تھا۔

مشہور و مقبول افسانہ نگار

شمیم مشرقی۔

اس کی کہانی کو ترتیب میں سب سے پہلا درجہ دیا گیا تھا۔

وہ سالنامہ کے صفحات الٹ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی رونق نہ تھی آنکھوں میں کوئی چمک نہ تھی۔ بس ایک پھیکی سی مسکراہٹ ۔ جیسے خود اپنا تمسخر اڑا رہا ہو۔

یکایک اسے سامنے سے شرمائی شرمائی لجائی لجائی جبیں آتی ہوئی دکھائی دی اس کی پلکیں بار حیا سے بوجھل ہو رہی تھیں اور رخسار پر تمتماہٹ کی سرخی شفق بن کر کھل گئی تھی۔ وہ نظریں نیچی کئے ہوئے بولی ----

"چلئے آپ کو ابو بلا رہے ہیں"

" وہ سالنامہ جبیں کو دیتے ہوئے تیزی سے اندر لپکا۔

"آؤ میاں شمیم بیٹھو۔ کل تمہاری والدہ یعنی چھوٹی بو بو نے ہم سے یہ خواہش ظاہر کی کہ تمہاری اور جبیں کی شادی جلد ہو جانی چاہئے۔ بہت پہلے ہم لوگوں کی بھی یہی خواہش تھی۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ایک ادیب صرف ادیب بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے کچھ اور بھی بننا ہوگا۔"

معاف کیجئے یہ تو کچھ عجیب سی بات ہے۔ جیسے کوئی کہے ---- ایک ڈاکٹر صرف ڈاکٹر بن کر نہیں زندہ رہ سکتا اسے ٹھیکیداری بھی کرنی ہوگی۔ انجینئر کو وکیل بھی بننا ہوگا

حجام کو لانڈری بھی چلانی ہوگی۔ موچی کو باورچی بھی بننا ہوگا اور ایک عطر فروش کو بھنگی کا کام بھی کرنا ہوگا۔
لیکن یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ایک ادیب صرف ادیب بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔"
"جی ہاں بجا ارشاد فرمایا — ٹھوس نہیں بلکہ غور طلب حقیقت!"
تو پھر تمہارا مسئلہ بھی غور طلب ہے بلکہ بیحد غور طلب۔

"جی . . . . . . ؟"

اور کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ جبیں سے ٹکرا گیا
اُفوہ! ذرا دیکھ کر چلا کیجئے نا۔ خودکشی کرنے بھی لوگ جاتے ہیں تو اتنی تیز گامی سے نہیں۔ بلکہ گرد و پیش کی ساری چیزوں پر نظر رکھتے ہوئے کہ دور تک جانا پڑے۔ اور آپ؟ واقعی خودکشی کا ارادہ ہے کیا —— ؟"
لیکن شمیم نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ بڑبڑاتا ہوا تیزی سے نکل گیا ——
ایک ادیب صرف ادیب بن کر زندہ نہیں رہ سکتا سے ڈاکٹر، انجنیئر، وکیل بھی بننا ہوگا۔ یا پھر درزی، دھوبی، حجام، لوہار، سونار، بڑھئی، موچی، یا بھنگی کا بھی کام کرنا ہوگا . . . ."

عید کا دن کتنی خوشیاں لے کر آیا ہے۔ جبیں کے سامنے لاش رکھا ہے اور وہ ہنس رہی ہے۔ دنیا و مافیہا سے بےخبر ہنسے جا رہی ہے۔ کبھی کبھی شمیم کی تصویر کو گھورنے لگتی دریچہ کر وہی ہنسی کا لامتناہی سلسلہ —— لیکن لوگ دراہیں —— محو حیرت ہیں —— ملک کے مایۂ ناز نے خودکشی کیوں کر لی —— ؟؟

بقیہ افسانہ "سردرات ٹھٹھرتی زندگی"

سماج تمہیں چین سے نہ رہنے دے گا وہ تم پر ہنسے گا۔ اور تمہارا جینا حرام کر دے گا۔ مجھے سماج میں اپنی عزت کھو جانے کا خوف نہیں خواہ سماج کچھ بھی کہے مجھے روحانی سکون تو نصیب ہوگا بولو تنوجہ۔ تم تیار ہو؟"
تنوجہ مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ جی بھر کر روئی پھر سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔
"پروفیسر تمہارا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی۔
دوسرے دن ہم نے شادی کر لی صبح سات بجے کی ٹرین سے میں اور تنوجہ ہمیشہ کے لئے شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔
نوکری سے میں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔
میرے دوست اپنی کہانی ختم کر چکا تھا۔
میں نے ایک گہری سانس لے کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
تمہاری قربانی غیر معمولی ہے میرے دنیا میں لوگ چھوٹی چھوٹی قربانیاں دے کر ڈھول پیٹتے ہیں۔
اور تم اتنی بڑی عظیم قربانی کے باوجود بھی خاموش ہو واقعی قربانی اسے ہی کہی جاسکتی ہے۔ قربانی کی صحیح تعریف یہی ہے۔
میں نے گھڑی پر نظر ڈالی میرے دوست کو ٹرین سے جانے میں تین گھنٹے اور باقی تھے۔ ہم دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔
میرے دوست نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

دوست . . . !
جو کچھ تم سے کہہ گیا ہوں کسی اور سے نہ کہنا اس میں تنوجہ کی زندگی تباہ ہونے کا ڈر ہے۔
اس ڈھلتی ہوئی سرد رات کے دھندلے ٹھٹھرتی زندگی کی طرح میرے دوست کی پرچھائیں جب تک نظر آتی رہی میں کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر میں بھی اپنے گھر لوٹ آیا!

اطہر عزیز

نقد و نظر

زندگی سے زندگی کی طرف ۔

نازش پرتاپ گڈھی ۔

قیمت ۔ ایک روپیہ ۔

ناشر :۔ ساہتیہ کار سنسد پرتاپ گڈھ

اپنی اس طویل منظومیہ میں نازش پرتاپ گڈھی نے اگست سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کا ایک تخیلی نو کا پیش کیا ہے۔ نظم کی تاخیر اشاعت کے سلسلے میں موصوف رقمطراز ہیں۔ "اب کہ اردو نظم اپنے انداز فکر اور انداز بیان دونوں ہی کے اعتبار سے کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے، میں اس طویل نظم کو ارباب فکر و نظر کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔" (واضح رہے یہ نظم موصوف نے سنہ ۱۹۵۱ء میں کہی تھی مگر کسی وجہ سے اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہو پائی تھی)۔ میرے خیال میں موصوف کی اس صفائی کی ضرورت ہی نہیں پیش آ رہی ہے حالانکہ احتشام صاحب کے الفاظ میں "غزل کے سامنے غور و فکر سے لکھی ہوئی طویل نظموں کو لوگ نظر انداز کر رہے ہیں"۔ (پیش لفظ) آج واقعی طویل نظموں کی جانب سے غیر ضروری طور پر بے اعتنائی برتی جا رہی ہے، پھر بھی ایک بات مسلم ہے کہ لوگ چاہے ایسی نظموں سے جتنی بھی بے توجہی برتیں چند مخصوص نظمیں کچھ ایسی مقناطیسی انفرادیت کی حامل ہوتی ہیں کہ وہ خود ہی قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہیں۔ "زندگی سے زندگی کی طرف" کا شمار انہیں گنی چنی نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم کے چند اہم پہلوؤں میں پیش کئے گئے مختلف کردار مثال کے طور پر "ماضی کی صحت مند روایات" "بوڑھا دادا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح تاریخ (جو اپنے آپ کو دہراتی ہے) وقت (جو کسی کا انتظار نہیں کرتا) شاعر (جو اپنے زمانے اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے) سختی شب، (جو بالآخر فنا ہوتی ہے) عوام (جو قوت و حیات کی نمائندگی کرتے ہیں) اور "انسان" (جو زندہ رہا کرتا ہے) وغیرہ سات ایسے مختلف کرداروں کی مدد سے نظم کا تاثراتی کیفیات میں جان ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے جہاں نظم کی معنوی افادیت میں اضافہ ہوا ہے وہیں اس کی خارجی کیفیت میں بھی ایک قسم کی توانائی آ گئی ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے، طویل نظموں اور خصوصاً ہنگامی یا واقعاتی نظموں میں غیر ضروری بیانات کی بے جا دخل اندازی سے نظم میں ایک عجیب سی اکتا دینے والی بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس عیب سے یہ نظم قدرے مبرّا ہے۔ نظم کے آغاز سے اس کے اختتام تک کی طویل مسافت میں بڑی حد تک یکسانیت قائم ہے جس کے سبب قاری کا ذہن خود بخود ایک نامعلوم سی تاثر آفریں لذت سے دوچار ہوتا جاتا ہے۔ نظم کا آغاز "بوڑھا دادا" کی تاریخ گوئی سے ہوتا ہے۔ تاریخ، اپنے نرم و نازک لہجہ میں کچھ اس طرح گویا ہوتی ہے ۔

جب کبھی کاکل ہستی نے سنورنا چاہا
جب کبھی انسان نے پستی سے ابھرنا چاہا
جب کبھی ماتھے پہ چمکی ہے صداقت کی کرن
جب کبھی ہونٹ پہ مہکا ہے حقیقت کا چمن
اس گھڑی موت کے بیماروں کو جلال آیا ہے
کالے قانون کے سینے میں ابال آیا ہے

اس طرح تاریخ اپنے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب کو جنبش دیتی ہے۔ اس کے بعد وقت، تختی، شب، عوام بحث میں حصہ لیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور جب نظم کی اٹھان اس نہج پہنچتی ہے جہاں، شاعر کو شریک بحث کی دعوت دی جاتی ہے یہاں قاری کچھ دیر کے لئے چونک اٹھتا ہے۔ "شاعر" کے تیور ملاحظہ ہوں:-

تم مجھے سرکش و گستاخ تو کہتے ہو مگر
کیا ہے ہنگامۂ بازار — یہ تم کیا جانو
نطق میں زہر گھلا کرتا ہے کن لمحوں میں
لفظ کب بنتا ہے تلوار — یہ تم کیا جانو

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

تم نے اوروں سے سنیں درد و الم کی باتیں
درد کس چیز کو کہتے ہیں یہ مجھ سے دیکھو
اشک خونیں کا بیاں تم نے کتابوں میں پڑھا
اشک کیوں آنکھ سے بہتے ہیں یہ مجھ سے پوچھو

نظم میں پیش کردہ دو اہم کردار "تاریخ" اور "شاعر" ہی طور پر قاری کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ طویل نظم تحریک آزادی پر لکھی گئی نظموں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے جس کا مطالعہ بلاشبہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مجلۂ افکار۔ (JOURNAL OF IDEAS)

مرے کالج۔ سیالکوٹ (پاکستان)

یہ مجلہ مرے کالج کا ایک خاص جریدہ ہے جس میں صرف اس کالج کے تلامذہ کی علمی و ادبی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ رسالہ عام میگزینوں (جو عموماً طلبا کی نگارشات پر مشتمل ہوں) کے نسبتاً زیادہ اہم اور چند انفرادی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔ سب سے پہلی خصوصیت اس مجلہ کی یہ ہے کہ اس میں عام کالج میگزین کی طرح افسانے یا نظمیں شائع نہیں ہوتیں۔ بلکہ افسانوں اور نظموں پر دیگر دوسرے موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ زیر نظر شمارہ میں مضامین کے دو حصے ہیں۔ ایک اردو کا دوسرا انگریزی کا اور دونوں حصے بڑے ہی ٹھوس اور جاندار۔ حصہ اردو میں "زیدہ یعقوب" کا شاعر (یحییٰ امجد) "اردو کا صوتی نظام" (آسی ضیائی) "عرشی صدیقی کے افسانوں کا فکری پہلو" (گلزار وفا چودھری) "کچھ نئی غزل کے بارے میں" (اقبال منہاس) اور ٹی۔ ایس ایلیٹ۔ ایک جائزہ (ایم۔ امجد۔ ورک) جیسے پانچ خیال انگیز اور بھرپور مقالے شامل ہیں۔ "کچھ نئی غزل کے بارے میں" جیسے بحث طلب مضمون میں اقبال منہاس نے غزل کی جدید بلکہ جدید ترین روش کا بڑی ہی خوب صورتی سے جائزہ لیا ہے۔ نکھرتے ہوئے رجحانات اور بدلتے ہوئے خیالات کے پیش نظر صنف غزل میں پائی جانے والی صحت مند تبدیلیوں سے متعلق اٹھائے گئے سوالات اور خدشات والات پر موصوف نے کھل کر بحث کی ہے۔ ہاں البتہ تمثیل کے طور پر پیش کئے گئے منتخب اشعار میں دو چار ایسے شعر بھی جگہ پاگئے ہیں جو جیسے تجربے کے اعتبار سے نئے تو ہیں مگر نئی شاعری کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ مثلاً ایسے خوب صورت اور جاندار اشعار:-

کیا خبر ان میں نہاں ہو شرر زیست کوئی
تو نے جن سرد چٹانوں کو تراشا بھی نہیں
(تاب اسلم)

یا

ایک مدت سے دیکھا اسے چاہا لیکن
وہ کبھی پاس سے گزرا تو بلایا نہ گیا
(احمد مشتاق)

کے پہلو بہ پہلو اس قسم کے اشعار

سگرٹوں کے دھوئیں میں رات کٹی
چائے پی پی کے دن یہاں گذرا
سارا دن ہی جیب میں ماچس لئے پھرتے رہے
آخری تاریخ تھی سگرٹ کہیں ملتی نہ تھی

کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ بہرحال اس سے مضمون کی افادیت
میں کوئی خاص فرق پڑتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ غزل کے نئے خد و خال سے
متعارف کرانے میں یہ مقالہ ایک حد تک یقیناً ممد و معاون ثابت ہوگا۔ بقیہ
مضامین بھی کافی فکر انگیز ہیں جن میں۔ ادرنہ کا صوتی نظام خصوصی توجہ
کا مستحق ہے۔ بڑی ہی محنت سے لکھا گیا ہے یہ مضمون۔
حصۂ انگریزی میں جہاں مختلف موضوع پر متنوع مضامین شائع
ہوئے ہیں وہاں ایم۔ اے جے۔ ورک کا TRENDS IN NEW
URDU POETRY خاصا پر مغز اور غور طلب مقالہ ہے۔ اس
مضمون نے جہاں نو در فکر کے رد ایک نقطہ سے باز کئے ہیں وہیں چار چھ
دروازے مقفل بھی کر دیئے ہیں۔ مضمون کے آغاز میں موصوف "رجحان" اور
"تحریک" کے مابین حد فاصل قائم کرتے ہوئے آخر میں ان جملوں پر آ کر
پہنچتے ہیں۔

"...... ....TRENDS ALWAYS FIZZLE AWAY
AND DIE OFF QUIETLY FOR HAVING NO
DEFINITE DIRECTION. OUR NEW
POETRY HAS NO GOAL. NO CRITERION
NO DEPTHS. NO HEIGHTS AND HENCE
THE NAME WE GIVE IT."

چلیے چھٹی ہوگئی۔ جب نئی شاعری کا اپنا کوئی ٹھوس مشن نہیں۔
اس کے آگے کوئی مقصد نہیں کوئی TARGET نہیں تو پھر اس پر بحث کے
لئے دوسرا قدم اٹھانا ہی فضول ہے۔ مگر نہیں، آگے چل کر موصوف نے اس
نئے رجحان کے صاحب بصارت نابیناؤں کو چار مختلف گروہ میں تقسیم کیا
ہے جن کا یہاں ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) وہ اذہان جو پہلے "حلقۂ ارباب ذوق"
(PROGRESSIVE MOVEMENT) سے ملحق رہے
اور جن کا وجود ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کے دوران تسلیم کیا گیا۔
ابن انشاء، ناصر کاظمی۔ مصطفےٰ زیدی۔ منیر نیازی۔ ظفر اقبال۔
شاذ تمکنت۔ وحید اختر۔ مراج کومل۔ قاضی سلیم۔ باقر مہدی۔ شہاب
جعفری۔ بشر نواز۔ عزیز قیسی۔ زبیر رضوی۔ عتیق حنفی۔ محمود ایاز۔ وزیر آغا

اور خلیل الرحمن اعظمی۔

(۲) وہ چہرے جو ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ پہچانے گئے۔
محمد علوی۔ شہر یار۔ کمار پاشی۔ ندا فاضلی۔ عادل منصوری
بشیر بدر۔ بمل کرشن اشک۔ ساقی فاروقی۔ زاہد ڈار وغیرہ۔

(۳) وہ نام جن سے کان ابھی ابھی مانوس ہوئے ہیں۔
عتیق تابش۔ فضل تابش۔ مصحف اقبال توصیفی۔ شمیم حنفی
حسن فرخ۔ تاج محمود، رؤف خلش۔ ناہید ثانی۔ پرکاش فکری
اور دوسرے۔

(۴) وہ آوازیں جو خود ہی لفظ "جدید" کو جدید تحریک
سے تعبیر کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔
افتخار جالب۔ انیس ناگی۔ عباس اطہر۔ گوہر نوشاہی
جیلانی کامران۔ اختر احسن اور احمد ہمیش۔

واضح رہے یہ CLASSIFICATION سراسر
فاضل مضمون نگار کی ذاتی پسند اور نجی رائے پر مبنی ہے اس لئے کسی مشہور
نام کے کسی موزوں گروپ سے OMISSION پر ہمیں حیرت نہیں ہونی
چاہیئے بلکہ مضمون نگار کی اس جرأت مخلصانہ پر داد دینی چاہیئے کہ انہوں
نے یہ توجہ طلب GRADATION قارئین کے سامنے پیش کرنے
کی ہمت تو کی۔

آگے چل کر فاضل مقالہ نگار نے نئی شاعری کے امکانات پر جن
خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اب نئے نہیں رہے بلکہ یہ الفاظ بار بار دہرائے
گئے ہیں اور شاید دہرائے جاتے رہیں گے۔ مثلاً

"THE WEST IS FED UP WITH ITS NEWNESS
WHEREAS THE EAST IS HANKERING
AFTER IT"

"THE NEW POETRY IMPRESSES THE
MIND RATHER THAN THE HEART"

"ANXIETY AND THE SENSE OF INSECURITY
ARE THE COMMON EXPERIENCES OF
THE NEW POET"

"THE BASIC SYMPTOMS OF THE NEW POETRY ARE : SENSE OF DEFEATISM AND FRUSTRATION"

وغیرہ وغیرہ - ایسا لگتا ہے اب یہ جملے جدید شاعری کے TRADE MARKS ہو کر رہ گئے ہیں کہ جب بھی کوئی آپریٹر جدیدیت کا پوسٹ مارٹم کرنے بیٹھتا ہے تو سب سے پہلے تنہائی، نا امیدی، بے بسی، بے یقینی ہی کو اپنا موضوعِ سخن تصور کرتا ہے۔ سب سے پہلی لکیر جو اس کی نوکِ قلم سے نکلتی ہے وہ وہی ہوتی ہے جو اس مضمون میں بھی جلوہ گر ہے کہ

"THERE IS NO MESSAGE IN NEW POETRY"

"THERE IS NO PHILOSOPHY IN NEW POETRY"

حالانکہ یہ بات نہیں - جدید شاعری کے بھی کچھ افادی پہلو ہیں۔ ہر جدید شاعر کا اپنا خاص نظریہ ہے اس کے آگے بھی چند ٹھوس مقاصد ہیں۔ یہ اور بات ہے وہ ایسے مقاصد اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے نئے لہجے، نئے انداز نئی آواز، نئے اسلوب کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر چند سر پھروں نے تنہائی، شکست، بے یقینی وغیرہ کو اپنی شاعری اب فلسفہ کا درجہ دے رکھا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پوری جدید شاعری کی اساس انہیں بے بنیاد مفروضات پر قائم ہے۔ بہرکیف اس مضمون سے نئے "جدیدیت" کی تشریح بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مضمون نگار نے جدید رجحان اور اس رجحان کے سائے تلے پروان چڑھنے والے ذہنوں کو سمجھانے کے بجائے کھلے دل سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور یہ جدیدیت کے لئے کوئی کم خوش قسمتی کی بات نہیں۔

مواد و معیار کے اعتبار سے یہ مجلہ کسی بھی ٹھوس معیاری ادبی ماہنامے سے کم نہیں۔

نقیبِ سحر - (مختلف شعرا کی منتخب غزلوں کا مجموعہ)

مرتبین - حیات وارثی، سعید اختر - قیمت - ڈیڑھ روپے

پتہ - سنڈے نامہ "سنگم" پٹنہ ۴

لگ بھگ بیاسی غزلوں کا یہ مختصر سا مجموعہ آل انڈیا ہندی اردو سنگم لکھنؤ ۳ کی جانب سے پیش کیا گیا ہے۔

مجموعہ کے آغاز میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے مجموعۂ غزل سے زیادہ صنفِ غزل پر اپنے "تاثرات" پیش کئے ہیں۔ نتیجتہً قاری کا ذہن غزل کی لطافت، ندرت اور اس کی چاشنی سے تو ضرور مانوس ہو جاتا ہے مگر مجموعہ کی انفرادیت اور اس کی خصوصیات کی جانب سے پھر بھی مشکوک رہتا ہے۔ آگے چل کر "ردِ عمل" کے تحت ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے اس مجموعہ کا ایک حد تک تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس مجموعہ میں شریک معروف و غیر معروف شعراء کا سرسری طور پر ہی سہی، تعارف کرایا ہے۔ یہ اور بات ہے موصوف کے تعارف کرانے کا انداز کچھ الگ خصوصیت لئے ہوئے ہے۔ بجائے اس کے کہ کس شاعر نے فنِ شاعری میں کتنے سال تک مسلسل ریاضت کی ہے موصوف کی نظر اس پر زیادہ پڑی ہے کہ اس نے کتنے سال تک مشاعروں میں باقاعدہ شرکت کی ہے۔ بہرحال یہ کمی مرتبین نے پوری کر دی ہے یعنی تقریباً ہر غزل کی پیشانی پر شاعر کے نام، حسب نسب اور سن پیدائش کے ساتھ اس کی مدتِ شاعری کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ آپ کو آج اور کل کی شاعری میں فرق کرنے میں آسانی ہو۔

یوں تو مجموعہ میں فراقؔ سے لے کر فائقؔ تک مختلف ذہن و فکر کے شعراء شامل ہیں لیکن ان میں سوائے دو چار کے کسی ایک کی آواز بھی اس کی اپنی آواز نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا لگتا ہے بیاسی غزلوں میں تباسی آوازیں گڈمڈ ہیں۔ پھر اس "آئینۂ خیال" میں مرتبین کا یہ انکشاف کہ "نقیبِ سحر" میں قدیم و جدید دونوں ذہنوں کی نمائندگی "موجود ہے" قاری کو اور الجھا کر رکھ دیتا ہے کہ وہ ایسی پختہ روایت کے کس سرے سے جدت کی تلاش شروع کرے۔ مانا کسی مجموعہ کا محض روایتی قسم کی شاعری سے آراستہ و پیراستہ ہونا کوئی عیب نہیں لیکن یہ بھی کیا کہ روایت پر بھی رعایت رکھ کر مجموعہ کو سطحی اور بے جان اشعار سے بوجھل بنا لیا جائے۔

بہرکیف جہاں ایسے اشعار

جذبۂ شوق تھا طویل ہر کام آیا ہے   آج وہ حسن مجسم لبِ بام آیا ہے

میری تاب دید کو بھی آزما کر دیکھئے
دیکھئے مجھ سے ذرا نظریں ملا کر دیکھئے

صلاحِ ترکِ محبت بجا مگر ناصح
خطا معاف مجھے خودکشی قبول نہیں

ترا ملنا بہت دشوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
یہ حائل بیچ میں دیوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

کی ایک لمبی چوڑی صف پھیلی ہوئی ہے وہیں کسی کسی صفحہ پر دو چار خوبصورت اور ناثر انگیز اشعار بھی آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ اور بات ہے ان دو چار اشعار کے کھنگالنے میں بھی قاری کو شدید ذہنی تنگ و دو سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اتی یاس میں دھندلا سا تری یاد کا چاند
یوں نمودار ہوا، ڈوب رہا ہو جیسے

(ناظر صدیقی)

سورج کے نکلنے پہ بچارہ جلائے تو جائیں
رہنے کو اندھیرے کا بھرم یوں تو بہت ہے

(مظہر امام)

آہ آواز کی صورت روحِ گل پیاسی رہی
بھلا خوشبو ن کے شبنم کے لئے زندہ رہا

(تسنیم فاضلی)

اٹھتے ہیں بگولے تو صحرا کی طرف جائیں
دیوانوں کی دنیا ہے دامن سے گریباں تک

(طرفہ قریشی)

اوراق (خاص نمبر ۳)

مدیران۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ عارف عبدالمتین۔

قیمت۔ تین روپے۔ پتہ۔ چوک انارکلی بازار لاہور

ان دنوں جہاں خاص نمبر بلکہ خاص الخاص نمبر کی ایک وبا پھیلی ہوئی ہے، بہت کم نمبر ایسے ہیں جنھیں ضخامت کے ساتھ ساتھ کم از کم مواد و معیار کے اعتبار سے بھی بطورِ خاص، سے مختص کیا جا سکے۔ ہاں گنتی کے چند جریدے ایسے ضرور ہیں جن کے عام نمبر تک کی افادیت مسلّم ہے۔ "اوراق" کا شمار بھی کچھ انہیں مخصوص جرائد میں ہوتا ہے یہ سال میں صرف چار خاص نمبر پیش کرتا ہے مگر ہر نمبر ایک انوکھی انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میرے خیال میں پاکستانی جرائد میں "نقوش" کے بعد ضخیم اور معیاری خاص نمبر پیش کرنے میں "اوراق" ہی سب سے آگے ہے اور یہی وجہ ہے اس کا ایک ایک ورق توجہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ کسی رسالہ کے عام شمارہ کی تو بات ہی چھوڑیئے اکثر خاص نمبر میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ حصۂ نظم کے مقابلہ میں حصۂ نثر کچھ دب کر رہ جاتا ہے مگر اوراق کے خاص نمبر میں ایک عجیب سی خوبی نظر آتی ہے کہ اس کا حصۂ نثر ہی پورے نمبر کے وقار کو سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں بھی حصۂ نظم بالکل بے جان نہ ہوتے ہوئے بھی نثری حصہ کے مقابل میں کچھ دبا دبا سا نظر آتا ہے۔ "سوال یہ ہے" اوراق کا سب سے نتیجہ خیز اور کارآمد باب ہوتا ہے۔ اس دفعہ اس باب کے تحت "مشتاق قمر" نے "اردو میں انگریزی الفاظ کی آمیزش" پر سوال اٹھایا ہے جس میں حصہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، جمیل ملک، سلیم اختر، انور سدید، ناصر شہزاد، اور جمیل آذر نے اپنے اپنے خیالات کا کھلے ذہنوں کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ دوسرے مقالات میں "اقبال کی چند پیشین گوئیاں" (مولانا غلام رسول مہر) "علامت کا تصورِ زمان و مکان" (ابن فرید) "ناول کی زبان" (ذکار الدین شایاں) اور "حسرت موہانی۔ بڑا آدمی چھوٹا شاعر" (سعد اللہ کلیم) خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

حصۂ نظم میں تیس منفرد آوازوں میں سے چار پانچ کو چھوڑ کر تقریباً باقی تمام آوازیں جانی پہچانی سی لگتی ہیں خصوصاً ن۔م۔ راشد، طراج کومل، مظہر امام، اعجاز فاروقی، ندا فاضلی، وزیر آغا اور انور سدید اپنے مخصوص لب و لہجے کے سبب پہلی ہی نظر میں پہچانے جاتے ہیں۔ غزلیں تقریباً چار درجن تک شامل ہیں جن میں اختر ہوشیارپوری، شاذ تمکنت، تاج سعید، شہزاد احمد، ناصر شہزاد، ساجد الباقری۔ حرمت الاکرام، پرکاش فکری، اقبال منہاس، شوکت خواجہ، عارف عبدالمتین اور فضل جعفری ہی میں کچھ انفرادیت پائی جاتی ہے۔ افسانوی حصہ میں غلام الثقلین نقوی، طراج کومل، فرخندہ لودھی، اقبال متین اور منصور قیصر کا پلہ بھاری ہے۔ خوبصورت طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد

کے بنائے ہوئے سرورق نے تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کے اس نمبر کی خوب صورتی کو کچھ اور بڑھا دیا ہے۔

پنکھڑی گلاب کی ۔ تبسم سحر

قیمت ڈھائی روپے ۔ پتہ

مکتبۂ تبسم پلاٹ نمبر ۱۶۲ ۔ ٹی ۔ پی ۔ ایس نمبر ۳ ۔ ۲۹ روڈ باندرہ ۔ بمبئی نمبر ۵۰

ترقی پسندانہ لب ولہجہ میں کہی گئی یہ طویل مثنوی ایک جواں فکر شاعرہ تبسم سحر (فلمی نام تبسم) کے ساحرانہ ذہن کی پیداوار ہے تبسم نے ادبی حلقوں میں ابھی نیا نیا قدم رکھا ہے۔ کسی شاعرہ کے اداکارہ بن جانے پر ہمیں اتنی حیرت نہیں ہوتی جتنی کہ کسی اداکارہ کے شاعرہ ہو جانے پر کیونکہ اداکاری (وہ بھی فلمی) اور شاعری دو OPPOSITE POLES کی حیثیت رکھتی ہیں آپ شاعری میں اداکاری تو دکھا سکتے ہیں مگر اداکاری میں شاعری ۔۔۔ ذرا مشکل ہے۔ اس لحاظ سے تبسم واقعی قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اداکاری کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی اپنا رشتہ خون جگر استوار رکھا۔ یوں تو کتاب کی ابتدا میں شریمتی نرگس دت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ تبسم نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز تین سال کی عمر سے کیا مگر پوری مثنوی کے مطالعہ کے بعد قاری کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ تبسم نے اداکاری پہلے شروع کی یا شاعری۔ کیونکہ انداز بیان کی ندرت فکر و شعور کی وسعت اور خیالات کی گہرائی کو دیکھتے ہوئے انہیں کسی طرح بھی نو مشق شاعرہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اس مثنوی میں شاعرہ نے پنڈت نہرو، ان کے خاندان، ان کی تحریک آزادی سے متعلق سرگرمی پر روشنی ڈالی ہے۔ نہرو خاندان کے ایک ایک فرد کا جس خوبی کے ساتھ مثنوی میں نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے قاری کا ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لہجہ ترقی پسندانہ ہونے کے باوجود انداز بیان کچھ ایسا تیکھا ہے کہ ایک ایک شعر دعوت فکر دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

پنڈت نہرو پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

وہ اک گلاب مہک جس کی ہر چمن میں ہے
وہ بعد مرنے کے زندہ ہر انجمن میں ہے
محل کو تیاگ کے جیلوں میں زندگی کاٹی
گلوں کو چھوڑ کے کانٹوں کی آبرو رکھ لی
جس انجمن میں گیا فخر انجمن نکلا
ہر اک اندھیرے سے بن کر نئی کرن نکلا
وہ پھول نور نظر تھا جو باغبانوں کا
بنا ہوا تھا جو عنوان سب فسانوں کا

اس طرح "اندرا گاندھی" پر کہے گئے یہ اشعار بھی ہمیں گہرائی تک متاثر کرتے ہیں :-

وہ اک کرن کہ جو سورج بھون سے نکلی تھی
تمام ہند کی تقدیر بننے والی تھی
کسے خبر تھی کہ نازک سی اک حسین کلی
نحیف کاندھوں پہ بھارت کا بوجھ اٹھائیگی
عجیب طرح سے تکتی تھی ہر نئی شئے کو
یا شرابی تکے جیسے ساغرے کو
نظر نے اٹھ کے مہ و کہکشاں کو چوم لیا
قدم کچھ ایسے بڑھے آسماں کو چوم لیا

بعض جگہ چند اشعار فنی خامیوں کے شکار بھی ہو گئے ہیں مگر ان کی تعداد نسبتاً کم ہے مثلاً

لبوں پہ شوخ ہنسی کی مہین سی چلمن
کہ جیسے چومے گلوں کو صبح کی پہلی کرن

(صفحہ ۶۳)

ہر اک گلی ہر اک کوچے میں اک چراغاں تھا
کہ رسم شادی کا آنند بھون میں ساماں تھا

(صفحہ ۳۲)

نرگسوں میں اک انجانا خوف لہرایا
ہزار سمجھا مگر کچھ سمجھ نہیں آیا

(صفحہ ۳۶)

ہر اک بات میں کی پیروی جواہر کی

شمع تھی باولی تو روشنی جواہر کی

(صفحہ ٦٦)

ایسے اشعار کی تعداد زیادہ تو نہیں ہے پھر بھی یہ اتنے غیر اہم نہیں کہ انہیں نظر انداز کیا جا سکے۔ بہ اصغری بیگم صاحبہ (تبسم کی والدہ محترمہ) کے الفاظ میں اگر تبسم کے جسم شاعری کے بجائے اس کی روح شاعری کو دیکھا جائے تو یہ مثنوی تبسم کی بہ شہ کامیاب کوشش کہی جا سکتی ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی شاعری کو غلطیوں اور لغزشوں سے بچائے رکھیں اور پرانی روایت کے ساتھ ساتھ نئے تجربوں نئے تقاضوں کا بھی خیر مقدم کرتی رہیں۔

کتاب اعلیٰ لکھائی، چھپائی کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

خزاں کے پھول بہار کے دن

محمود واجد

قیمت ۔ دو روپے

پتہ ۔ کتاب پبلشرز، چوک لکھنؤ نمبر ٣

تقریباً بیس طویل اور مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو ہند (کلکتہ) کی دوسری پیش کش ہے۔ مجموعہ کے "ابتدائیہ" میں ایم۔ اے۔ مجید افسانہ نگار کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ۔

"..... .. .... افسانوں کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان افسانہ نگار نے فن افسانہ نگاری میں کچھ نئے تجربے کرنے کی کوشش بھی کی ہے .... ۔ ان کے پاس کہنے کی کچھ باتیں ہیں۔

موصوف کے ان الفاظ کے بعد افسانوں کے مطالعہ میں نہ جانے مجھے کیوں بڑی حد تک مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں تو رنگ ہی کچھ اور نظر آتا ہے۔ سوائے تین یا زیادہ سے چار افسانوں (امن کے ہاتھ، مجبوری، درگاہی دادا، اور دیدۂ نم) کے کوئی بھی افسانہ ایسا نظر نہیں آتا جسے تجرباتی تو کیا تاثراتی ہی کہا جا سکے۔ ہاں ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کے پاس کہنے کے لئے باتیں تو بہت ہیں مگر باتوں کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ یوں تو افسانوں میں واقعہ نگاری کی بے جا طوالت کسی طرح بھی قابل تعریف نہیں سمجھی جاتی مگر یہ بھی کیا کہ اپنے بیان کو کچھ اس طرح مختصر کر دیا جائے کہ قاری افسانے کی افسانیت سے زیادہ اس کی ہیئت ہی میں الجھ کر رہ جائے۔ بہرکیف منقولہ بالا چند افسانوں میں تجربات کی کچھ نہ کچھ نئی لہر ضرور پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً "امن کے ہاتھ"، "کاگاٹس" اور "مجبوری" کا دی۔ ڈی مہنت تو قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

TECHNIQUE اور TREND کے اعتبار سے بھی یہ افسانے بقیہ تمام پر حاوی ہیں۔ میرے خیال میں اگر افسانہ نگار نے اپنی اسی روش کے ساتھ ہمیشہ مفاہمت قائم رکھی اور اپنے افسانوں کے طول و عرض کو بے جا کھینچ تان سے محفوظ رکھا تو کوئی تعجب نہیں موصوف کے افسانے بھی ان کی خواہش کے مطابق جدت کی میزان پر پورا اتریں اور انہیں بھی چند معیاری اور گنے چنے افسانوں کی صف میں شامل کیا جا سکے۔

کتابت و طباعت گوارا ہے۔

رنگ زار ۔ مرتب ۔ ریحانی لکھنوی

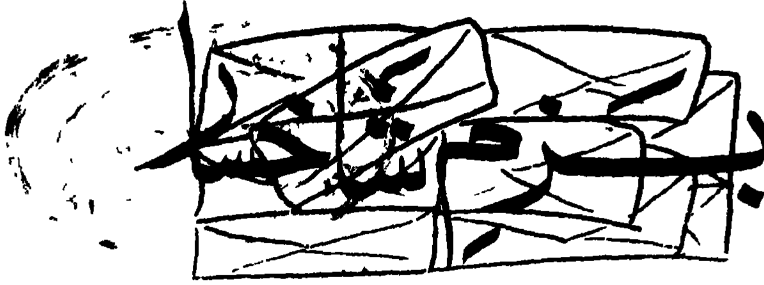
قیمت ۔ درج نہیں   پتہ

عابد روڈ حیدر آباد (اے پی)

اس مجموعہ میں مرتب نے ایک کل ہند [illegible] مشاعرہ میں پڑھے گئے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ مشاعروں پر تبصرے۔ رپورتاژ وغیرہ تو اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں مگر مجموعے بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس لحاظ سے رنگ زار اپنی اس نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

چونکہ مشاعرہ میں اچھی بری، الٹی سیدھی ہر ایک چیز سنائی جاتی ہے اس لئے اس مجموعہ کے انتخاب کے متعلق کچھ کہنا سراسر حماقت ہے۔ مرتب نے مصلحتاً تخلص کے حروف تہجی کے اعتبار سے اس مجموعہ کی ترتیب دی ہے۔ یہ ایک مستحسن طریقہ ہے۔ مگر اس سے ایک نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ اگر کچھ اچھی تخلیقات ادھر ادھر بکھر کر رہ گئی ہیں تو کچھ ہلکی پھلکی اور بے جان سی چیزیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں۔ بہرحال اس۔

باقی ص ٦٨



ساغر نظامی ——— نئی دہلی

شاخسار مجھے برابر مل رہا ہے۔ ہر نمبر ترقی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

میں آپ کی ہمت، محنت اور خدمت کی داد دیتا ہوں۔ چاہے اردو ہندوستان میں باقی رہے یا نہ رہے مگر اردو زبان کے لئے مصائب و ابتلا کے تسلسل کو ملتوی ان میں جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کو دنیا یاد رکھے گی۔

"مہرِ ماہ" (طویل نظم) کے بعد میں نے ادھر کچھ کہا نہیں ہے۔ اصل میں دہلی کے اندر محرکات کی بڑی کمی ہے۔ یہ شاعروں کے رہنے کی جگہ تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو مجاوروں، وزیروں اور کلرکوں کا مدفن ہے اور اتفاق سے موجودہ عہد میں شعر و ادب کی قلمی روایات اس سرزمین سے وابستہ ہیں ان سب کی بنیاد کسی نہ کسی بنیادی مقصد پر مبنی ہے۔ یہاں مرزا جامع اور اردو کے شاعر حشرات الارض کی طرح پیدا ہو رہے ہیں اور سب کا خیال ہے کہ وہ اردو کی سپر ہیں۔ ان کے ہوتے کوئی حادثہ نہیں ہوگا خدا کرے ان کا یہ خیال پورا ہو۔

وحید قیصر ——— راولپنڈی

"شاخسار" کے مطالعے سے ادب کے ان جدید رجحانات کا پتہ چلتا ہے جو آپ کے ملک میں نمو پذیر ہیں۔ یہ رجحانات ہمارے ہاں ادب میں واقع ہونے والے رجحانات سے قدرے مختلف بھی ہیں اور مشترک بھی۔ مثال کے طور پر جہاں تک میں محسوس کر سکا ہوں پاکستانی شعراء کا نوجوان طبقہ جدیدیت کی طرف آپ کے ہاں کی نئی نسل کی طرح بڑی حد تک مائل ہے اور ابھی 'جدیدیوں' سے ادب میں کچھ نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ دیگر پاکستان کے نوجوان شعراء 'بلینک ورس' کی طرف اتنے راغب نہیں جتنے آپ کے ہاں۔ ہم تو یوں محسوس کرتے ہیں جیسے اپنے ہاں آزاد شاعری کا دور آکر گذر گیا ہو۔ مگر آپ کے ملک میں یہ چیز زوروں پر معلوم ہوتی ہے ممکن ہے ہندی شاعری کا اثر ہو۔ شاخسار کا تنقیدی اور شعری حصہ بڑا کارآمد پایا۔ افسانوں میں بھی بعض عمدہ کوششیں تھیں۔ اور کچھ بے مقصد اور بے کار چیزیں جو ہر مجموعے میں ہوتی ہیں اس میں نسبتاً کم ہیں۔

آپ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اپنی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ اپنی زبان و ادب کو بھی جو کبھی پورے برصغیر کی زبان و ادب سمجھا جاتا تھا زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد رئیس ——— دہلی

"شاخسار" کا تازہ شمارہ ملا۔ پچھلے شمارے بھی موصول ہوئے تھے آپ کے اداریے اور مضامین بڑے شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ اس کج فکری اور کج نگاری کے دور میں آپ ادب خصوصاً جدید ادب کے بعض مسائل کے بارے میں جیسی بے باکی اور جس متمدن اور متوازن نقطۂ نگاہ سے اظہار خیال کرتے رہے ہیں دل ہی دل میں اس کی داد دیتا ہوں۔ اس شمارہ میں بھی آپ کا 'نقشِ اول' پڑھ کر میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ بہت سوچی ہوئی، اچھی اور مناسب بات کہی ہے آپ نے۔

رام لعل کی ڈائری کے 'متفرق اوراق' "لمحوں کی آزادی" کو آپ نے مقالے کی سرخی کے تحت شائع کیا ہے۔ واقعی کبھی کبھی ادیبوں کی اس طرح کی تحریریں مقالوں سے زیادہ معلوماتی، خیال انگیز اور نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔ رام لعل کے ان آزاد لمحوں میں ان کے "اندر کے آدمی" سے کہیں زیادہ جامع آدمی نظر آتے ہیں۔ زندہ اور متحرک شکل میں۔ تاہم ان کے ان بظاہر منتشر

اور بے ساختہ تاثرات اور تعصبات کے آئینہ میں اُن کے ذہن کی ترتیب کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جدید افسانہ کی بات انہوں نے بڑے خیالات کو مجروح کیا اور جو رائے قائم کی وہ ان کی ذاتی رائے ہے اور اس کا انہیں حق ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جس سمینار کا انہوں نے ذکر کیا ہے اس میں صرف ان کے افسانے پر بحث ہوئی تھی۔ ایک دو افسانے زیر بحث آئے تھے۔ اور میں نے ان کے افسانوں کے بارے میں بیباکی اور صفائی سے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ مجھے تعجب ہے کہ اس گفتگو سے انہوں نے یہ نتیجہ کیسے نکالا کہ میرے نزدیک اُردو افسانہ پریم چند سے آگے نہیں بڑھا۔ منٹو، عصمت، بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، ندیم وغیرہ نے بلاشبہ اردو افسانہ کو ہر لحاظ سے پریم چند سے آگے کی راہیں دکھائی ہیں۔ بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ رام لعل کے یہ ورق بیحد دلچسپ ہیں۔ اس سلسلہ کو جاری رکھیے اور دوسرے ادیبوں سے بھی اس طرح کی چیزیں منگوائیے۔

دوسرے مقالے و افسانے ابھی نہیں پڑھ سکا ہوں۔ نظمیں اور غزلیں پڑھ ڈالیں۔ ایک دو کے علاوہ مجھے ان ساری تخلیقات میں بھری زندگی کے شعور و احساس کی لہریں مچلتی نظر آتی ہیں۔ محمد علوی کی نظم "ونیہ پور یبلیس" میں نے کئی بار پڑھی اور سیری نہیں ہوتی۔ کئی دوستوں کو سنائی۔ بڑی قابل نظم ہے۔ اس نظام کے مہیب اور جابرانہ طوفانی تضاد پر محیط ان دونوں نظموں کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ترقی پسند شاعری زوال پذیر ہے۔

زیب غوری ———— کانپور

اس شمارے میں آپ کا اداریہ بڑا فکر انگیز ہے اور ایک خوبصورت اور متوازن طرز تحریر کا نمونہ۔

رام [illegible] کی ڈائری دلچسپ ہے۔ لیکن وہ اپنے پرسنل نوٹس میں بھی اپنی CONSCIOUSNESS ختم نہیں کر سکے۔

علیم افسر ———— غازی پوری

"شاخسار" کا مشترکہ شمارہ ملا شکریہ۔ اس شمارے کی سب سے اہم بات کرامت صاحب کا اداریہ اور رام لال صاحب کا مقالہ ان کے سفر کے حالات پر جن میں ادبی سرگرمیوں، ملاقاتوں کی بات ہے۔ مختصر آپ نے اپنے اداریے میں جدیدیت کے رجحان کو سراہتے ہوئے اُردو کے "بد فنکاروں سے حیات کی درخشندگی اور پر امیدی کو اپنے موضوع

میں ہمارے کا مطالبہ کیا ہے لیکن یہ مطالبہ آپ ہر فنکار سے نہیں کر سکتے میں تقلیدیوں اور رسمی شاعروں کو چھوڑتے ہوئے یہ کہوں گا کہ ہر فنکار کا ایک اپنا نظریۂ حیات ہوتا ہے اور جیسا وہ زندگی کو محسوس کرتا ہے ویسا لکھتا ہے اور اگر آج ہر فن کار خواہ وہ شاعر ہو یا افسانہ نگار یاس و حرماں کو زندگی پر محیط محسوس کرتا ہے اور زندگی کی تمام راہیں اگر اسے دھندلی نظر آتی ہیں تو اس کی صداقت کو دوسرے جمال میں جدید حضرات [illegible] نگا۔ [illegible] کی جواب نہیں ہے لیکن سب کو اچھا اور بہتر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ [illegible] بقول باقر صاحب سنجیدہ [illegible] سے بچانا چاہئے "مولانا آزاد کی شاعری" تسلی بخش نہیں ہے۔ [illegible] باقر مہدی کی [illegible] پر رشید احمد کا مضمون اچھا ہے اس سے باقر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے افسانے بس یونہی ہیں کوئی خاص اہمیت کے حامل نہیں معلوم ہوتے۔ محمد علوی، وہاب دانش، کرامت علی کرامت اور عروج پسند آئے۔ غزلوں میں فضا ابن فیضی نے کافی متاثر کیا خاص کر یہ شعر۔

کوئی قیام کرے آگے نہ سے اندھیری ہے
کھلا ہے آج بھی دل کا یہ [illegible] تھا

یہاں انہوں نے ردیف بڑی خوبصورتی سے استعمال کی ہے۔ [illegible] نگری، مظفر حنفی کا رنگ پھیکا ہے۔ حرمت کی غزل جو [illegible] میں چھپ چکی ہے خوب ہے اور دو غزلیں بھی قابل اعتنا ہیں۔"

مدحت الاختر ———— کامٹی

"شاخسار" کا شکریہ [illegible] فکری، اقبال [illegible] مظفر حنفی اور عبدالرحیم نشتر کی غزلیں بہت عمدہ ہیں۔ حرمت الاکرام کی غزل بھی نہایت عمدہ ہے، نظموں میں صرف محمد علوی، وہاب دانش، فضل المتین اور رشیدا افروز کی نظمیں پسند آئیں۔

حق ابروی چھتر پوری ———— چھتر پور

زیر نظر شمارے میں کتابت کی کافی غلطیاں نظر [illegible] ہوگئیں۔ کاش آپ کاتب صاحبان کی توجہ اس طرف مرکوز کراتیں۔ افسر آذری کا مصرع [illegible] پری جمالوں کی ہوگا لیکن کتابت نے اسے کیکیاں بڑی جمالوں میں کر دیا۔ عبدالعزیز خالد صاحب کی نظم "زر داغ دل" (ڈکشنری سامنے رکھ کر پڑھنے کی چیز ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی)۔ نظم ابو آدم ۔ ادوار احلام۔ اولوالامر نافع

تن ؟ حبانا۔ قاب قوسین وغیرہ کے معانی نہیں معلوم ہوں گے۔ ظاہر ہے یہ نظم ان کی سمجھ ہی میں نہ آئے گی۔ یہ صرف اپنی فن دانی قابلیت دکھانے کے لئے لکھی جائے تو لکھی جاتے لیکن اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں ایک ترکیب میری سمجھ میں یہ ہے کہ اگر ان مشکل الفاظ کے معانی حاشیہ میں اردو میں لکھ دیئے جائیں تو کم از کم مجھ جیسے لوگ اس نظم کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

بہت دنوں بعد ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی نظم پڑھی "گورکن" اچھی نظم ہے بلکہ نظم کے بجائے افسانہ کہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ پرکاش فکری کی غزل تنہا رہ غزل کا شعر ہے۔

چاند کے لوٹ آنے (ابھی) سے پہلے کی سیاہی
جی دیکھا ہے یہاں عشق کا چرچا کرنے

اس شعر میں مجھے یہ بھی خامی نظر آ رہی ہے کہ "سیاہی" کو مرد راہی "نظم کیا گیا ہے جب کہ یہ لفظ سیاہی کا ہم وزن ہے۔ اگر پرکاش فکری صاحب اس میں تھوڑی سی ترمیم کریں یعنی بجائے دیدیجئے کہ سیاہی کی جگہ ظلمت کر دیجئے مگر ان کا مفہوم تو ادا ہو جائے گا شعر کے ربط کو وہی سمجھیں

غزلوں میں غلام ربانی تاباں ، حکیم اختر ، غلام مرتضیٰ راہی ، ادیب سہوری اور حرمت الاکرام کی غزلیں پسند کر رہا ہوں۔ حرمت الاکرام صاحب کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ اپنی مطبوعہ غزلیں ہی شاخسار کو روانہ کرتے ہیں۔ ان کی حالیہ شمارہ میں جو غزل ہے وہ ایسا ہی ... آشوب معانی نہ ملا۔ شب خون کے اگست نمبر کے صفحہ نمبر ۴۴ پر دیکھی جا سکتی ہے۔ شب خون میں دو شعر الگ انداز سے ہیں۔

کیا ہو صورت کشتی لیلیٰ ارماں کہ کہیں
دل ہوں گشتہ ملا ، خاتمہ مالی نہ ملا
لذت دل ... دگی گئے نئے ترے کیا کیا
اہل پندار کو انعام تواں نہ ملا

یہ دونوں شعر فنی صناعی اور وسعت معانی کے اعتبار سے شاخسار میں شائع شدہ غزل کے ان اشعار سے بہتر ہیں۔

کوئی تصویر سامنے نہیں بنتی کہ کہیں
دل ہوں گشتہ ملا خاتمہ مالی نہ ملا

پیار کا کھیل بھی اک چیز ہے جینے کے لئے
ہائے وہ دل جسے انعام تواں نہ ملا

افسانوں میں ہنوز میں نے جوگندر پال کا افسانہ "ننگی لڑکی" پڑھا ہے ... "زرد اا" یعنی زرد ہو جانا ... باقری کے نثر صحیح ہو گا۔ ابھی میری نظر سے کسی معتبر شاعر کے کلام میں نہیں گزرا۔
میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ میں نے فلاں افسانہ نظمایا ... پھر مجھے بتایا گیا کہ افسانہ منظوم کیا تھا تو ... صاحب کو ایک نیا مصدر بھیجتا ہوں۔ "نظمانا" یعنی نظم کرنا۔ جیسے بھی فلم سازی۔ میرے ایک دوست کے قطعہ کے دو مصرع ہیں۔

یہی لگی تھی نظر میری بدن کو جس سے
اب تو نظر دل کو مری سبزا بدن لگتا ہے

"نظروں کو بدن لگ" کو عادت کہنا پڑے گا کیا ؟؟

فرحت قمر ____ د

"شاخسار" نظر نواز ہوا۔ رام لال کی ڈائری والی بات پسند آئی۔ ادبی خیالات شائع ہونے چاہئیں۔ نیا پن بھی آتا ہے اس سے ... ادا دب بھی۔ حصہ نظم میں پہلی نظم "گورکن" ایک گہرا تاثر ذہن پر چھوڑ گئی۔ ڈاکٹر حامد کاشمیری کو مبارک باد ___ غلام ربانی تاباں کی غزل نسبتاً ہونے کے باوجود بہت خوب غزل ہے۔ بہت اچھی غزلوں اور نظم "درمیان" اور "بے چہرہ" "اور پھر بھی جاگتا رہا" کا حالی ارتقائی ... مومن کا غیر شاعرانہ پن اور عبدالرحیم نشتر کا صوفیانہ پن ذوق سلیم پر کچھ گراں گزرا۔ نشتر صاحب کے شعر۔

کس طرح بجھتی ان آنکھوں کی پیاس
تھا لبا لب اس کے چہرے کا گلاس
بڑھ کر بے اعتبار اس کے سامنے لکھ بیٹھا
شعر سے آتی ہے سرکہ کی سی باس

بھئی جدیدیت کوئی بری بات نہیں لیکن بے تکا پن برا ہے جی۔

شمیم احمد پرویز ____ پٹنہ

آپ کے دونوں حالیہ شمارے موصول ہوئے۔ خوب رہے۔ اب اپنا شاخسار دن بدن بلندیوں کی طرف پرواز کرتا جا رہا ہے۔ شاخسار ے

افسانے مجھے بہت پسند آتے ہیں اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ جدیدیت کے دلدادہ بھی ہیں بلکہ پرانی روایت کو قائم رکھتے ہوئے جدیدیت اور ترقی پسندی کو رائج کرنے کے قائل ہیں۔ غزلیں اور نظمیں دوسرے رسائل سے میں بہت کم پڑھتا ہوں لیکن شاخسار کی ہر چیز مجھے بھاتی ہے اس لئے غزلیں اور نظمیں بھی پڑھ لیتا ہوں اور خوشی سے جھوم جاتا ہوں۔

یوسف جمال ——— راج گانگ پور

نقش دل دل میں نقش کر گیا۔ اس مرتبہ آپ نے اداریہ بہت احتیاط سے سنبھل سنبھل کر لکھا ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے۔ آپ کے سامنے کوئی بہت بڑا اندیشہ ہے جس کے سبب اپنے خیالات کو پیش کرنے میں ہچکچاہٹ و تذبذب محسوس کر رہے ہیں۔ پھر بھی اشاروں اور کنایوں سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کو "جدیدیت" سے شدید شکوہ ہے۔

اس حقیقت سے کسی ذی فہم کو انکار نہ ہوگا کہ آج کی جدید شاعری (نئی شاعری جو بھی کہہ لیجئے) جس ڈگر پر گامزن ہے وہ ادب کو ابھی تک کوئی عظیم تخلیق نہ دے سکی جس سے جدیدیت کی برتری ظاہر ہو سکے۔ میں جدیدیت کا مخالف نہیں ہوں مجھے صرف اس جدید شاعری سے الرجی ہے جس میں معنویت و اخلاقی قدریں نہیں۔ وسعت فکر ہو نہ کہ "کافی لی اور بسکٹ کھا، نظمیں لکھو اور ریاض کرو" والی شاعری۔

مقالے میں رام لال کی "مجنوں کی آزادی" حاصل مقالہ رہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کی تصنیف و تراجم کے متعلق شیخ حبیب اللہ صاحب مسلم فن کی توجہ جس طرف مبذول کرائی ہے وہ انتہائی ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ہر لحاظ سے ہمیں بے شمار لوگ دوسری زبانوں سے فیض یاب ہونے کی کوشش نہیں ... حاصل ہو سکتی ہے۔ "غالب کی شاعری میں اخلاقی قدریں" نسیم اشرف نے فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غزلیں ذیل سبھی اچھی ہیں لیکن مجھے جن شاعروں نے متاثر کیا ہے وہ یہ ہیں۔ علی جواد زیدی، ساغر نظامی، غلام ربانی تاباں، حمید الاکرام، جواد حسین کاظمی، اطہر عزیز، متین سروش، مہدی پرتاب گڑھی، رب غوری اور حیدر بایاب۔ افسانوی حصہ میں ابھی تک جوگندر پال، دریوگ کو پڑھ پایا ہوں جو اچھے ہیں۔ امید ہے بقیہ افسانے بھی ٹھیک ہوں گے۔ بزم شاخسار میں عبد الباقی فریدی کا سوال "لفظوں کی تلاش" دلچسپ اور قابل توجہ ہے۔

محمد ابراہیم صدیقی ——— الہ آباد

شاخسار کے تیسرے شمارے کے بعد منتظرہ شمارہ ملا۔ مقالوں میں "منیلا دو مخمسات" "مولانا آزاد کی شاعری" اور "بنگال کا باغی شاعر" حاصل شمارہ ہیں۔

اختر فاروقی، در سنگھ امرتسری کے افسانے زیادہ پسند آئے۔ حامدی کاشمیری، سید فضل المتین، شمس فرخ آبادی، عروج احمد عروج کی نظمیں اور علوی جواد زیدی، ساغر نظامی، پرکاش فکری، مظفر حنفی کی غزلیں بھی پسند آئیں۔ شاخسار کی کتابت اور پابندی وقت کے ساتھ اشاعت پر خاص دھیان دیجئے۔ بزم شاخسار کی دلچسپی مسلمہ ہے......

شیخ حبیب اللہ ——— کٹک

شاخسار کے شمارہ نمبر ۳ میں ردولی صاحب کا خط نظر نواز ہوا۔ ایک مدت مدید عرصہ بعد سے میرا بھی یہی خیال ہے کہ اہل ایشیا، خصوصاً اہل ہند یورپ کے دانشوروں سے بیحد مرعوب ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا پنڈت نہرو نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر اہل یورپ کی تصنیفات کا موازنہ ہندوستان کی تصنیفات سے کیا جائے تو بعد المشرقین نظر آئے گا اور آپ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ہندوستانی کتابیں درجہ سوئم کی ہوتی ہیں۔

پنڈت جی کا خیال درست ہے۔ دیکھئے نا ایجادات و انکشافات جو کچھ بھی ہوتی ہیں یورپ میں ہی ہوتی ہیں۔ ادبی شاہکار بھی یورپ ہی کا حصہ ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ عمر خیام، ابن سینا وغیرہ کو اہل یورپ ہی نے دنیا سے روشناس کرایا۔ تاریخ ادب ایران کی ہو تاریخ کی تالیف و تدوین پروفیسر براؤن ہی نے کی۔

... دور کے ہند میں مولانا شبلی اور سرسید ہی ہیں جنہیں اہل یورپ کے ادیبوں اور مفکروں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مگر سرسید کی آنکھیں بھی یورپ کی چمک دمک سے خیرہ ہو گئی تھیں۔ اور یورپ کے سفر ہی نے ان کی طبیعت میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ آپ نے تفسیر کلام پاک کو طرز جدید پر قلم بند کیا۔ مولانا حالی بھی اہل یورپ کے دل دادہ تھے۔

اہل یورپ طالب علم ہوتے ہیں۔ علم کے پیچھے شمع کی طرح پروانوں میں لگے رہتے ہیں۔ اور ہمارے ادیبوں اور عالموں کا کیا حال، فارغ التعلیم ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے دوران تعلیم پڑھ لیا ہے وہ علم و دانش میں مکمل ہو چکے۔ علامہ اقبال

کو بھی اسی بات کا رونا تھا۔ ؎

نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ
شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید
چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

ہماری شاعری کی عمارت کی بنیاد زبان عربی پر چنی گئی ہے۔ مگر زبان عربی مولانا نذیر احمد کے بعد زوال پذیر ہونا شروع ہوئی اور دور نیاز میں ختم ہو گئی۔ اسی وقت سے زوال شاعری بھی شروع ہوا۔ جو ٹی کے جتنے بھی شعراء گزرے ہیں وہ عربی داں تھے۔ شاعری بھی تدریج برہم ہو گئی۔ اب عالمگیر شہرت کا مالک شاعر کیا پیدا بھی ہو گا عربی کے زوال کے بعد فارسی کا تجربہ بھی بس دور نیاز تک رہا۔ اُردو کا دور بھی نیاز ہی پر ختم ہو گیا۔ اب صرف ایک ہستی باقی ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی کی۔ ورنہ دہلی، لکھنؤ میں اُردو مرحوم ہو چکی ہے۔ وہ اُردو جس میں کوثر و تسنیم کی شیرینی اور نزاکت انگریزی تھی۔ اب حال یہ ہے کہ اُردو کے حلقوم پر کند چھری چلائی جا رہی ہے۔

اگلی پیالے سے ادبی رسائل کے رسالے ہیں نمک کے برابر بھی نہیں رہے۔

ہم عربی فارسی سے محروم ہیں اسی لئے ہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سرزمین عرب و ایران میں کوئی اعلیٰ ادیب، شاعر بے بدل مفکر اعظم، ماہر سائنس ہے بھی یا نہیں۔ ہندو پاک کی مملکت میں کوئی اُردو جریدہ نہیں جو عربی فارسی شہ پاروں کے تراجم پیش کرتا ہو۔

رونق صاحب نے دور عروج اُردو دیکھا ہے مگر زمانہ کی گردش بڑی غضب ناک ہے۔ ؎

تو کھا نہیں سکتا تو سنے گا
یہی اک حرف مکرر ہے

جو تو بتلائیے ہماری نئی پود کو کہ علم و ہنر کے نامور مصنف سے کوئی غرض ہے۔ کیا انہیں مولانا سلیم الدین، مولانا حسن نظامی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، اقبال سہیل، ڈاکٹر بجنوری، سر سید اور دیگر لے شمار ادباء، دانشوران کا علم ہے وہ رکیوں جاتے ہیں مولانا محمد علی تو دنیا صرف سیاست داں کی صورت میں دیکھتی رہی ہے۔ مگر مولانا کتنے عظیم ادیب تھے کوئی نہیں جانتا۔ مولانا نذیر کی ادبی عظمت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے! مگر کیا ہمارے نوجوان ادیب ان ادبا کے بارے میں تحقیقی کام کر رہے ہیں؟

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک جام
نکلا جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

اسکول اور کالجوں میں اردو برائے نام ہی پڑھائی جاتی انگریزی البتہ کسی حد تک پڑھائی جاتی ہے۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ ادیب اہل یورپ کی طرف متوجہ نہ ہوں تو اور کیا کریں۔ اپنی تحریروں ان کی رائیوں کا حوالہ نہ دیں تو کیا کریں! مولانا حالی شاعروں کو ہدایت کرتے ہیں: —

"اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم از کم متوسط درجہ کی لیاقت بہم پہنچائی جائے"

مولانا عبدالحق بابائے اُردو نے اپنا دھن من ہی اُردو پر قربان نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی بھی اُردو پر نثار کر دی۔ مگر ہمارے نوجوان کیا کوئی تحقیقی کام مولانا پر کر رہے ہیں؟

مولانا محمد علی نے "ترکوں کی پسند" CHOICE OF THE TURKS لکھتے ہیں مسلسل چھتیس گھنٹوں میں صرف چائے پی پی کر لکھا تھا اور خواب و خور ان پر حرام تھا۔ کیا کسی ادیب نے اسے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے؟ مولانا نے والدہ محترمہ کے سوگ میں بھی مقالہ تحریر فرمایا تھا کیا اسے بھی کسی نے اُردو میں منتقل کیا ہے؟

اگر یہ سب کچھ نہیں کیا گیا ہے اور کیا ہی نہیں جا رہا ہے تو ہمارے ادیب کیا کریں، ہمارے غزلوں سے خوشہ چینی نہ کریں تو اور کیا کریں، ۔۔۔ کس منہ سے ۔۔۔ مغرب کی مکاسب غالب

علامہ اقبال کو بھی یہی رونا تھا ؎

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شئے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

بقیہ افسانہ "ہوبر کا شاہ کار"

غمازی کر رہی تھیں۔ اب ان ہی آنکھوں کی بھرپور کشش ہے۔ ان سے محبتوں کی آئینہ دار بن گئی تھی۔ سانون اسی کی تھی۔ محبہ کی آنکھوں کے وسیع خلد میں اس نے جھانکا۔ وہی مکالمہ گونج رہا تھا جو شاہی محلات میں ۶۰ سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس وقت بر تان کی عمر صرف ۲۵ سال تھی سانون آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ رہی تھی۔

"میں آپ سے والہانہ محبت کرتی ہوں۔ آپ کی محبت میرا ایمان ہے۔ ایسماو کی کی شاہ سے قربت اندر درباریوں کی سازشیں کسی دن آپ کو اور مجھے لے کر بیٹھ جائیگی کوئی نہیں چاہتا کہ ہم آپس میں محبت کریں۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں اور کسی کو علم بھی نہ ہو۔"

اس پر بر تان نے کہا تھا۔

"تم سچ کہتی ہو میں وعدہ کرتا ہوں تم میری محبت پر یقین رکھنا اب محبت کی خاطر میں یہاں سے جاتا ہوں۔ آنسوؤں کو پونچھ لو۔ میں محلوں کی طرف اب کبھی نہیں آؤں گا۔"

ایک ضروری گذارش

جنوری ۱۹۶۹ء سے "شاخسار" کے صفحات میں اضافہ کر کے اس کا زرِ سالانہ پانچ روپیہ کر دیا جائیگا۔ البتہ اس سے قبل جو احباب خریدار بنیں گے انہیں صرف تین روپے میں سال بھر رسالہ پہنچا کرے گا۔ لہٰذا "شاخسار" کے بہی خواہوں سے گذارش ہے کہ اس اثناء میں اپنے حلقۂ احباب میں "شاخسار" کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں تاکہ اس رعایتی قیمت پر سال بھر کے لئے رسالہ پہنچتا رہے۔

(ادارہ)



خالص تمباکو سے تیار کردہ

اکبری گڑاکو

آپ کے صحت مند دانتوں کا ضامن ہے

انت کی ہر قسم کی بیماری اور مسوڑھوں کے درد کے لئے اکبری گڑاکو اکسیر
کا کام کرتا آرہا ہے
ہی وجہ ہے کہ ہمارا یہ مقبول ترین منجن آج ملک گیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔
س کے استعمال سے فوراً جسمانی تھکن دور ہو جاتی ہے اور طبیعت میں فرحت و
سرور کی لہریں دوڑ جاتی ہیں
یہی وجہ ہے کہ لاکھوں لوگ روزانہ صبح اس کا استعمال کرتے ہیں۔
آپ بھی ایک بار آزمائیے

پتہ

شمس الدین اکبر خاں اینڈ کمپنی

بالو بازار۔ کٹک ۲۔ اُڑیسہ